معالم القرآن

پارۂ اول

محمد علی الصدیقی کاندھلوی

ادارہ تعلیمات قرآن
سیالکوٹ۔ پاکستان

مَعالِمُ القُرآن

مُحمّد علی الصِّدّیقی کاندھلوی

اِدارہ تعلیماتِ قرآن

سیالکوٹ۔ پاکستان

انتساب

مرحوم جناب الحاج ڈاکٹر محمد ادریس بٹ قدس اللہ سرہ العزیز کے نام جن کی اہلیہ محترمہ رفعت آرا، دختر جناب ثاقب مرحوم نے ڈاکٹر صاحب مرحوم کے ایصال ثواب کی خاطر معالم القرآن جلد اوّل کی دوبارہ طباعت کے اخراجات کی کفالت فرما کر اپنی دینی حمیت اور محبت اسلام میں ڈوبی ہوئی مخلصانہ دریا دلی اور ہمدردانہ عنایت کی انجمن دارالعلوم الشہابیہ کے لیے یاد تازہ کر دی ہے۔ دعا ہے کہ اللہ سبحانہ مرحوم ڈاکٹر صاحب کو جو اپنے دل میں انجمن کے فلاحی، تعلیمی اور تبلیغی کاموں کو پروان چڑھانے کا خاص جذبہ رکھتے تھے کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ آمین یا رب العالمین۔

ملکیت ـــ ادارہ تعلیماتِ قرآن، سیالکوٹ
تالیف ـــ محمد علی الصدیقی کاندھلوی
عناوین ـــ ۳۸۱
آیات ـــ ۱۴۸
طابع ـــ عبدالرشید خاقان
تزئین و آرائش ـــ سید انور حسین نفیس رقم
کتابت ـــ محمود صوفی
ناشر ـــ عبدالرحمان قاری ایم اے ناظم ادارہ تعلیماتِ قرآن
صفحات ـــ ۶۴۴
تاریخِ اشاعت ـــ اکتوبر سنہ ۱۹۷۴ء
باردوم ـــ اکتوبر سنہ ۱۹۷۶ء
مطبع ـــ معارف پریس، لاہور

قیمت : ۳۶ روپے

ملنے کا پتہ : دارالعلوم الشہابیہ سیالکوٹ شہر

دریا بحباب اندر

سورۂ فاتحہ

سورۂ بقرہ

حرفِ آغاز

باسمہٖ سبحانہٗ

۱۹۳۶ء سے "دار العلوم الشہابیہ" میں قرآن حکیم کے ترجمہ و تشریح کے کام پر لگا ہوا ہوں۔ اس عرصہ میں ایک بار پورے قرآن سے گزر کر دوسری بار آٹھویں پارے تک پہنچا ہوں۔

ایک مدت سے محسوس کر رہا تھا کہ اپنے مطالعہ قرآنی کے نتائج منظرِ عام پر لاؤں لیکن اتنے عظیم کام کے لیے ہمت ساتھ نہیں دیتی تھی۔

انجمن دار العلوم شہابیہ نے "رشاد" نامی ماہنامہ شروع کیا اس میں دعوتِ قرآنی کے عنوان سے تفسیرِ قرآن کا آغاز ہوا۔ احباب نے اسے بہت پسند کیا لیکن "رشاد" ابھی اپنی زندگی کے ابتدائی مراحل میں تھا کہ بعض ناگزیر وجوہ کی بنا پر بند کر دینے کا ارادہ کر لیا اور ارادے کے ساتھ ہی "رشاد" کے حلقہ احباب کو خطوط کے ذریعے اس کی اطلاع کر دی۔ احباب نے "رشاد" کے بند ہونے پر افسوس کا اظہار کیا اور دعوتِ قرآنی کا سلسلہ جاری رکھنے کا مشورہ دیا۔

کام کی عظمت اور اپنی علمی بے مائیگی کے پیشِ نظر طبیعت اس کے لیے تیار نہ تھی لیکن اس خیال سے طبیعت کو بہت بڑی ڈھارس ملی کہ پاک و ہند میں جن بزرگوں نے تفسیری خدمت کی ہے اور جن کی علمی حیثیت مسلّم ہے اور جن کی خدمات وقت کی بے رخی کے ہاتھوں گوشہ گمنامی کی نذر ہو چکی ہیں۔ اگر سب کی نہیں تو کچھ کی عظیم تفسیری خدمت کو یکجا کر کے نئے انداز میں حالات اور تقاضوں کے مطابق گوشہ گمنامی سے نکال کر شاہراہِ عام پر رکھ دیا جائے۔ تو یہ نہ صرف قرآن حکیم کی عظیم خدمت ہوگی بلکہ ان بزرگوں کی خدمات کی بہت بڑی قدردانی ہوگی۔

پیشِ نظر کتاب میں تفسیر و تشریح کی جو کوشش کی گئی ہے اس کی بنیاد یہی ہے اس سلسلے میں اولیت حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کے افادات کو دی ہے اور میں نے کوشش کی ہے کہ ان بزرگوں کے تفسیری افادات پورے پورے اس میں آجائیں۔

ان دو بزرگوں کے علاوہ میں نے جن کے علوم سے استفادہ کیا ہے ان کی کچھ تفصیل یہ ہے :

حکیم الامت حضرت شاہ ولی اللہؒ	شاہ عبدالعزیز محدثؒ	شاہ عبدالقادرؒ
مولانا عبدالحق حقانیؒ	مولانا حسین علیؒ	مولانا اشرف علی تھانویؒ
مولانا احمد علی لاہوریؒ	مولانا احمد سعید دہلویؒ	مولانا ابوالکلام آزادؒ
مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ	مولانا مفتی محمد شفیعؒ	مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ
مولانا عبدالماجد دریا آبادیؒ	مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ	مولانا امین احسن اصلاحی
مولانا نعیم الدین مراد آبادیؒ	پیر محمد کرم شاہ بھیروی	

جس مقام پر تلاش و جستجو کے باوجود ان بزرگوں سے کوئی خاص بات نہ ملی تو جن اعاظم مفسرین سے میں نے استفادہ کیا ہے ان کے نام یہ ہیں :

محمد بن جریر طبریؒ	محمود بن عمر زمخشریؒ	فخر الدین رازیؒ
محمد بن احمد قرطبیؒ	حسین بن مسعود بغویؒ	عمادالدین بن کثیر دمشقیؒ
ابوالبرکات محمود نسفیؒ	قاضی ناصر الدین بیضاویؒ	ابوحیان اندلسیؒ
ابوسعود العمادیؒ	محمود آلوسی بغدادیؒ	محمد بن علی شوکانیؒ
حسن بن محمد نیشاپوریؒ	نواب صدیق حسن خانؒ	قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ
علامہ رشید رضاؒ	علامہ مصطفیٰ المراغیؒ	سید قطب مصریؒ

اسلامی زندگی میں پیش پا افتادہ مسائل کی تحقیق کے لیے جن بزرگوں کے علوم سے خوشہ چینی کی گئی ہے ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں :

ابوبکر الجصاص رازیؒ	ابوبکر بن العربیؒ	حافظ ابن تیمیہؒ
حافظ ابن القیمؒ	حضرت شاہ ولی اللہؒ	مولانا محمد اسماعیل شہیدؒ
علامہ شاطبی غرناطیؒ	مولانا محمد قاسم نانوتویؒ	مولانا بدر عالم میرٹھیؒ
مولانا سید سلیمان ندویؒ	مولانا مناظر احسن گیلانیؒ	مولانا ابوالحسن علی میاں ندویؒ
مولانا منظور نعمانیؒ	مولانا حفظ الرحمان سیوہارویؒ	

اللہ کا لاکھ شکر و احسان ہے کہ اس نے میری علمی بے مائیگی کے باوجود کتاب کی پہلی جلد کی تکمیل کا سامان بہم پہنچایا اور مجھ گنہگار کو توفیق بخشی کہ ان اوراق کو ترتیب دے کر اپنے سیاہ نامۂ اعمال کے دھونے کے لیے آبِ رحمت کے چند قطرے فراہم کر سکوں۔

کام کا نقشہ

قفسِ عنصری میں اگر انفاسِ حیات رواں رہے تو ارادہ یہی ہے کہ انشاء اللہ معالم القرآن کی ایک پارے پر مشتمل ایک جلد ہر چار ماہ کے بعد تیار ہو کر ہدیۂ ناظرین ہوتی رہے گی۔

اس کی ترتیب و تالیف میں جو محنت کی گئی ہے اس کا بڑا صلہ یہی ہے کہ صواب کا سررشتہ ہاتھ سے نہ چھوٹا ہو اور حقیقت کی منزل سے بُعد نہ ہوا ہو۔

میں نے اپنے علم کی حد تک اس کی پوری احتیاط کی ہے کہ کسی مسئلہ میں قلم صراطِ مستقیم سے تجاوز نہ کرے لیکن عالم الغیب جانتا ہے کہ قلم نے کہاں ٹھوکر کھائی ہے اس لیے اس کی بارگاہ میں نہایت عجز سے دُعا ہے کہ خداوندا میری لغزشِ قلم کو دوسروں کے قدم کی لغزش کا سبب کا نہ بنا۔ اہلِ علم سے التماس ہے کہ اگر کوئی قابلِ اصلاح چیز نظر آئے تو اس خطا کار کو مطلع کر کے جزائے خیر کے مستحق ہوں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۝

مقدّمہ

الحمد للہ رب العالمین والسلام علی سید المرسلین وخاتم النبیین وعلی آلہ واصحابہ اجمعین

موضوع:۔

قرآن کا اصل موضوع انسان کے لئے ایسی رہنمائی فراہم کرنا ہے جس کے ذریعے وہ ایسی زندگی گذار سکے جو موجودہ زندگی کے بعد آنے والی دائمی زندگی میں اس کے لئے سودمند ہو اور اس کے نتیجے میں رضائے الٰہی حاصل ہو ۔۔۔۔۔۔ حکیم الامت شاہ ولی اللہؒ نے الفوزالکبیر میں یہ بات صراحت کے ساتھ بتائی ہے۔

قرآن حکیم کے نزول کا مقصد اصلی انسانوں کی تہذیب و تربیت اور ان کے عقائد باطلہ اور اعمال فاسدہ کی اصلاح ہے۔

اسی مفہوم کو شاہ صاحبؒ نے تفہیمات الٰہیہ میں اس طرح پیش فرمایا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے مجھے تفسیر کا علم مختصر الفاظ میں عنایت فرمایا جس کی حقیقت یہ ہے کہ ایمان حقیقی ہر انسان کے دل میں اللہ کی جانب سے ودیعت کیا گیا ہے۔ لیکن مادی زندگی کی چیرہ دستیوں نے انسان پر قبضہ کر لیا ہے اسی کی خاطر اللہ نے قرآن عزیز نازل فرمایا تاکہ اس کے ذریعے ان کی طبیعتوں کو تبدیل کرے۔ (ص۱۲۲، ج۲)

اسی لئے قرآن قوموں کے عروج و زوال سے بحث کرتا ہے۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی کے قوانین، عبادات و اخلاق، معاملات و حقوق اور آداب سے متعلق بنیادی اور اہم ابواب کو پیش کرتا ہے۔

اس کتاب کی جامعیت کا عالم یہ ہے کہ یہ مبارک صحیفہ بندوں سے اللہ کے دوگونہ تعلقات کو استوار کرتا ہے، حاکمانہ تعلقات اور محبوبانہ تعلقات۔

حاکمانہ تعلقات یہ ہیں کہ انسان اس کے بندے اور محکوم ہیں اور اللہ کی ذات حاکم اعلیٰ ہے۔ بندوں کا کام حاکم کی اطاعت ہے

محبوبیت یہ ہے کہ اللہ کی ذات محبوب ہے بندے اس کے عاشق و محب ہیں عاشقوں کا کام محبوب کی عبادت ہے۔

قرآن کے کتاب الٰہی ہونے کی نسبت کا نتیجہ یہ ہے کہ کلام محبوب ہونے کی وجہ سے اس میں شان تعبد ہے اور پیغام حاکم ہونے کی وجہ سے اس میں شانِ تدبر ہے۔

شانِ تعبد کی خاطر قرآن کی تلاوت کرنا بہت بڑی عبادت ہے تلاوت کو نبوت کے مقاصد میں ایک مقصد قرار دیا ہے۔ قرآن نے متعدد آیات میں اس کا تذکرہ یتلو علیھم آیاتہ کے عنوان سے کیا ہے۔ تلاوت کی بناء پر اہل ایمان کی ایک سے زیادہ مقام پر مدح کی گئی ہے اور ان سے تلاوت کا مطالبہ کیا ہے۔ شانِ تدبر کی خاطر تعلیم و تدریس قرآن کو ربانی ہونے کا معیار قرار دیا ہے اور امت سے تفقہ، تدبر اور تفکر کا مختلف عنوانوں سے مطالبہ کیا ہے اور نبوت کے مقاصد میں سے ایک مقصد یہ بتایا ہے کہ یعلمہم الکتاب والحکمۃ تعلیم کتاب سے معانی کتاب اور حکمت سے اسرار کتاب مراد ہے۔ اگرچہ قرآن کے اولین مخاطب عرب تھے مگر کسی کتاب کے سمجھنے کے لئے صرف زبان دانی کافی نہیں ہے جتنی بلند پایہ کتاب ہوتی ہے اتنی ہی شرح و بسط کی محتاج ہوتی ہے۔ اسی لئے قرآن کی تبیین کی نبوت کو فرائض میں شمار کیا ہے۔

انزلنا الیک الذکر لتبین للناس

ہم نے قرآن آپ پر اس لئے نازل کیا ہے تا کہ آپ اسے لوگوں کے سامنے کھول کر پیش کریں

تلاوتِ قرآن اگر قرآن خوانی ہے تو تدبر قرآن قرآن دانی ہے۔ قرآن خوانی اور ہے اور قرآن دانی اور۔ یہ قرآن دانی ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر جیسے جلیل القدر صحابی کے بارے میں آیا ہے کہ۔

آپ پورے آٹھ سال تک سورۃ بقرہ کو سیکھتے رہے۔

ظاہر ہے کہ یہ فہم معانی اور درک مقاصد کی منزل ہونے کی وجہ سے قرآن خوانی نہیں قرآن دانی ہے تابعی کبیر مفسر جلیل حضرت امام مجاہدؒ فرماتے ہیں:۔

میں نے اپنے استاد حضرت عبداللہ بن عباسؓ کو تیس بار قرآن بیان کر کے سنایا۔

حضرت انس بن مالکؓ نے معاشرہ صحابہ کا یہ عام تاثر بیان کیا ہے:۔

جب کوئی سورۃ بقرہ اور سورۃ آل عمران پڑھ لیتا تو ہماری نگاہوں میں اس کی قدر و منزلت قائم ہو جاتی۔

مشہور تابعی ابو عبدالرحمٰن السلمی کہتے ہیں کہ جن صحابہ نے ہمیں قرآن پڑھایا ہے جیسے حضرت عثمان بن عفانؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ان کا اپنی قرآنی تعلیم کے بارے میں انکشاف ہے کہ:۔

جب وہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن کی تعلیم حاصل کرتے تھے تو طریق کار یہ تھا کہ دس آیتوں کی تعلیم ہوتی اور اس وقت تک ان دس آیتوں کی تعلیم سے فراغت نہ ہوتی جب تک ان کا علم و عمل

مکمل نہ ہو جاتا ـــــ اور فرماتے ہیں کہ اس طریق تعلیم کے ساتھ ہم نے قرآن کا علم اور اس پر عمل یکجا حاصل کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کو ایک ایک سورت کی تعلیم میں ایک مدت درکار ہوتی ۔

الحمد للہ قرآن کی شان تعبد اس دور میں بھی جب کہ ہم دور تنزل میں ہیں۔ اور اسلامی زندگی میں ترقی کی منزل کی طرف قدم بڑھانے کی جگہ بچے کھچے اسلام کو بچانے کی فکر میں ہیں۔ تلاوت قرآن کی گرمی کچھ مسلمانوں میں موجود ہے ـــــ لیکن یہ بڑے دکھ کی بات ہے کہ مسلمانوں کی عمومی زندگی کا تدبر قرآن سے رشتہ ٹوٹ چکا ہے۔ یہ صورت حال فی الحقیقت زندگی کی عام شاخوں میں نبوت سے تعلقات منقطع ہونے کا قدرتی نتیجہ ہے۔

اللہ سبحانہٗ ان علماء کو جنت کی مسرتوں سے ہمدوش کرے جنہوں نے امت کے اس ٹوٹے ہوئے رشتہ کو جوڑنے کی علمی اور عملی تدبیریں کی ہیں۔ علمی یہ کہ تشریح و تفسیر کے ذریعے قرآن کا پیغام لوگوں تک پہنچایا اور عملی یہ کہ مدارس میں عربی زبان اور اس کے متعلقات کی تعلیم کی راہ سے لوگوں کو قرآن آشنا بنایا ـــــ لیکن اجتماعی مقاصد کبھی انفرادی فیاضیوں سے پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچتے ہیں۔ اجتماعی مقاصد کی پشت پر جب تک اجتماعی محنت نہ ہو گوہر مقصود ہاتھ نہیں آتا۔

پارہ اوّل ایک نظر میں

اسلامی دعوت، احکام و قواعد کا خلاصہ

اللہ کی ذات :-

چونکہ اللہ کی ہستی کا علم انسان کے لئے خود اپنی ہستی کے علم کی طرح بالکل فطری اور بدیہی ہے جس کیلئے دلیل اور برہان کی ضرورت نہیں ہے اور نبوت کی مخاطب قومیں اللہ کی ہستی کو ماننے والی ہیں اس لیے قرآن نے اپنی دعوت میں اس مسئلہ پر براہِ راست بحث نہیں کی ہے لیکن جا بجا اس نے اس موضوع پر اشارات کئے ہیں۔

یہ بات کون نہیں جانتا ہے کہ ہم پر ایک دور نیستی اور عدم کا گذر ہو چکا ہے۔ اور دوسرا دور آنے والا ہے کہ ہم پھر پردہ عدم میں چلے جائیں گے ــــــ ہمارا وجود دو ہستیوں اور دو عدموں کے مابین اس طرح ہے جیسے دن کی تابناکی دو تاریکیوں کے درمیان محصور ہے۔

یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ کائنات کا وجود ذاتی نہیں ہے بلکہ جس طرح زمین کی روشنی آفتاب کا فیض ہے اور پانی کی گرمی آگ کا فیضان ہے ــــــ اسی طرح دو ہستیوں کے درمیان ہمارا وجود بھی ایسی ذات کا فیض ہے، جس کا وجود اصلی اور خانہ زاد ہے اور وجود اس کے لئے ایسا ہے جیسے آفتاب کے لئے نور، آگ کے لئے حرارت، چار کے لئے جفت ہونا اور تین کے لیے طاق ہونا ــــــ یہی وجودِ اصلی اسلام کی زبان میں اللہ کی ہستی، واجب الوجود اور خدا ہے۔ آیت نمبر ۲۸ میں اسی کی طرف اشارہ ہے (شرح العقیدۃ الاصفہانیہ، حجۃ الاسلام)

اللہ کی صفات :-

قرآن نے اپنی دعوت کے ذریعے قوموں کی جن سنگین غلطیوں کی اصلاح کی ہے ان میں سے ایک صفاتِ الٰہی کا مسئلہ بھی ہے۔ خدا کو ماننے کے باوجود کچھ لوگ سمجھ رہے تھے، کہ جس طرح دنیا میں ایک بادشاہ ہوتا ہے اور حکومت کا کام خود نہیں کرتا بلکہ اس کے وزراء کرتے ہیں اور جس طرح چاہتے ہیں اسی طرح کرتے ہیں۔ اللہ کا معاملہ بھی یہی ہے ــــــ کچھ اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ خدا بھی ویسے ہی طبعی حالات سے دوچار ہوتا ہے جیسے انسان۔ قرآن نے صفات کے موضوع پر اس طرح اصلاح کی کہ بتایا کہ

توحید

رسالت

آخرت کی زندگی

قرآن کا تعارف

صحابہ کا چہرہ

دستوری قواعد

اولی الامر کی صفات

نیابت الٰہی کا نظام چلانے کے لئے صاحب امر میں جن امور کو ملحوظ رکھنا چاہیئے یہ ہیں۔

قوانین کلیہ (یا) قواعد عامہ

۲۔ جو شخص اپنے کاموں سے بُرائی کمائے گا اس طرح کہ گناہ اس کی پوری زندگی کا گھیراؤ کر لیں تو وہ دوزخ میں جائے گا۔ ۸۱

۳۔ جو شخص بھی نبوت کی ہدایت کے مطابق اللہ سبحانہٗ پر ایمان اور آخرت پر یقین رکھے گا اور عمل صالح کی صورت میں اس ایمان ویقین کے تقاضے پورے کریگا تو اسے اپنے ایمان وعمل کا ضرور اجر ملے گا۔ ۶۲

۴۔ جو شخص نعمتِ ایمان پاکر اسے کفر سے تبدیل کریگا۔ یقیناً وہ سیدھے راستہ سے بھٹک جائیگا۔ ۱۰۸

۵۔ جو شخص اپنا دین وایمان بیچ کر شعبدہ بازیوں اور جادوگری کا خریدار بنتا ہے اس کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے۔

۶۔ نجات متوارث کا نظریہ غلط ہے بلکہ نجات کا دروازہ ہر اس شخص کے لئے کھلا ہے۔ جو اللہ سبحانہٗ کے سامنے سر طاعت خم کر دے اور محسن ومخلص ہو۔ ۱۱۲

۷۔ مساجد میں لوگوں کو خدا کی یاد سے روکنے والا کوئی ہو وہ ظالم ترین انسان ہے۔ ۱۱۴

۸۔ قرآن کا منکر خواہ کوئی ہو وہ سرتاسر نقصان میں ہے۔ ۱۲۱

۹۔ قرآن کے ایک حصہ کا انکار بھی ویسا ہی کفر ہے جیسے سارے قرآن کا ۸۵

۱۰۔ ایک نبی کا انکار بھی ویسا ہی کفر ہے جیسے سارے انبیاء کا۔ ۱۳۱

اجتماعی قوانین

امتوں میں فساد کن کن راہوں سے آتا ہے یا وہ کیوں جادۂ تقوی سے کیوں کر ہٹتی ہیں۔ اور اس کے نتیجے میں روحانی قیادت سے محرومیوں کا شکار ہو جاتی ہیں۔ اس موضوع پر کچھ قرآن نے اجتماعی قوانین کی نشاندہی کی ہے۔ یہ گویا قرآن کا پیش کردہ ایک آئینہ ہے اس میں نبی کی امت ہونے کی حیثیت سے ہم اپنا چہرہ دیکھ سکتے ہیں اور اپنے چہروں کو داغوں سے پاک کرنے کی کوشش کر سکتے ہیں:

۱۔ دین کی زندگی دینداری کی نہیں بلکہ کاروباری ہو جاتی ہے۔ ۴۱

۲۔ حق فروشی کے ساتھ حق پوشی کی بیماری پیدا ہو جاتی ہے۔ ۴۲

۳۔ حق کو حق کے نام پر نہیں بلکہ باطل کی آمیزش کرکے حق کے نام پر پیش کیا جاتا ہے۔ ۴۲

۴۔ حق کے علمبرداروں کی زبان پر حق ہوتا ہے۔ مگر ان کی زندگیاں خود حق سے محروم ہوتی ہیں۔ ۴۴

۵۔ نماز جیسی عبادت ان کے لئے سب سے بڑی سرگرانی ہوتی ہے۔ ۴۶

اصطلاحاتِ قرآنی

۱ **اِحیاء** زندہ کرنا۔ مادہ حیاۃ ہے۔ قرآن میں حیاۃ کا استعمال مختلف معانی میں ہے۔

۱۔ قوتِ نامیہ جو نبات و حیوان میں ہوتی ہے۔

۲۔ قوتِ احساس جس کی وجہ سے حیوان کو حیوان کہتے ہیں۔ زمین کی زندگی سے اس کی شادابی اور روئیدگی یعنی قوت نامیہ مراد ہوتی ہے اور مردوں کے زندہ کرنے سے قوت احساس کا عطا کرنا مقصود ہوتا ہے

۳۔ عقل کی قوت کارکردگی جیسے اَوَمَن کان میتاً فاحییناہ میں زندگی سے مراد عقل کی قوت کا ہے

۴۔ بقاء فہم کے ساتھ لذت اندوزی جیسے شہداء میں زندگی سے مراد یہ ہے کہ ان میں فہم باقی ہے اور وہ اللہ کی نعمتوں سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔

۵۔ آخرت کی دائمی زندگی یالیتنی قدمت لحیاتی، اس آیت میں حیات سے حیاتِ اُخروی مراد ہے۔

۶۔ ہلاکت سے نجات دینا جیسے قصاص کو حیاۃ کہا گیا ہے۔ یہاں حیات سے مراد ہلاکت سے بچانا ہے۔

۷۔ حیات جب اللہ سبحانہ کی صفت ہو تو اس سے مراد وہ ذات قدوس ہے جس کے متعلق کبھی موت کا تصور ہی نہیں ہو سکتا۔

۲ **اِحسان** نیکی کرنا بروزن افعال مصدر ہے۔ احسان دو معنی کے لئے آتا ہے ایک غیر کیساتھ بھلائی کرنا۔ دوسرے اچھی بات معلوم کرنا اور نیک کام انجام دینا۔ یہ خاص قرآنی اصطلاح ہے۔ ہماری زبان میں احسان کے معنے کسی کے ساتھ اچھا سلوک کرنا ہیں لیکن قرآن میں جس احسان کا ذکر ہے وہ اس کے علاوہ ہے اس کی حقیقت وہی ہے جو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی یعنی خدا کی بندگی اس طرح کرنا چاہیے کہ وہ قہار و قدوس اور ذوالجلال والجبروت ہماری آنکھوں کے سامنے ہے اور گویا ہم اس کو دیکھ رہے ہیں۔

۳ **اِخلاص** خالص کر دینا، صاف کر دینا، ممتاز کر دینا بروزن افعال مصدر ہے۔ حکیم الامت شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ اخلاص قرآن کی زبان میں نفاق کے عمل کا مدمقابل ہے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نفاق عمل

اور اخلاص دونوں کی علامات بتائی ہیں
مثلاً اخلاص کی علامات یہ تین بتائی ہیں ۔
اوّل یہ کہ اللہ اور اس کا رسُول اس کو سب
سے زیادہ محبوب ہو۔ دوم یہ کہ جس سے
بھی محبت کرے تو اللہ کی خاطر کرے
سوم یہ کہ کفر اس کے لئے ایسا ہی ناگوار
ہو جیسے جسم کے لئے آگ (حجۃ اللہ
البالغہ صہ ۱۶۳) یاد رہے کہ نفاق عملی
نفاق کی کوئی علیحدہ قسم نہیں ہے بلکہ اصل
یہ ہے کہ جب منافقین کے اعمال
مسلمانوں سے بھی سرزد ہونے لگے ۔
تو مجبوراً علماء کو نفاق کی تقسیم کرنی پڑی۔
وہی اعمال جو نفاق اعتقادی کے اثرات
کہلاتے ہیں اگر تصدیق قلبی کے ساتھ بھی
نظر آنے لگیں تو اسی کا نام نفاق عملی ہے
اسی کا مدمقابل اخلاص ہے۔

۴
اِسلام تابعداری کرنا۔ لغت میں اصل معنے اپنے
آپ کو کسی کے سپرد کر دینے اور بالکل
اس کے تابع فرمان ہونے کے ہیں ۔ اللہ
کے بھیجے ہوئے اور اس کے رسولوں
کے لائے ہوئے دین کا نام اسلام اسی
لئے ہے کہ اس میں بندہ بالکل اپنے
آپ کو اللہ کے سپرد کر دیتا ہے اور
اس کی مکمل اطاعت کو اپنا دستور حیات
قرار دے لیتا ہے اور دین اسلام کی یہی
اصل حقیقت ہے اور اسی کا مسلمانوں سے
مطالبہ ہے فرمایا ہے الٰھکم الٰہ واحد
فلہ اسلموا تمہارا معبود یگانہ معبود ہے
لہٰذا تم اسی کے فرمانبردار ہو جاؤ اور اسی
اسلام کے بارے میں ارشاد ہے۔ من
احسن دینا ممن اسلم وجھہ
للہ اور اس سے بہتر کس کا دین ہو سکتا ہے
جس نے اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کر دیا
بہرحال اسلام کی اصل رُوح اور حقیقت یہی
ہے کہ بندہ کلی طور پر اپنے آپ کو اللہ
کے سپرد کر دے اور ہر پہلو میں نبوت کے
لائے ہوئے علم و عمل کے مطابق اس کا
مطیع فرمان ہو جائے (معارف صہ ۶)

۵
اَنفاق خرچ کرنا۔ بروزن افعال مصدر ہے۔ انفاق
میں جان مال کا ہی نہیں بلکہ اللہ کی عطا ہوئی
ساری نعمت کا خرچ کرنا آجاتا ہے، یہ کبھی
واجب ہوتا ہے کبھی مستحب، صرف زکوٰۃ کی
ادائیگی کا نام انفاق نہیں ہے۔ اس کے علاوہ
بھی قرآن میں انفاق کے اور مطالبات بھی
ہیں، زکوٰۃ وہی دے گا جو صاحب نصاب
ہو اور ایک شخص خوشحال ہے اور اس کے
رشتہ دار تنگی و محتاجی میں مبتلا ہیں تو بحیثیت
مسلمان ہونے کے اس کا فرض ہے کہ ان
پر انفاق کرے فقہاء نے اس کے لئے
نفقات کے نام سے پورا نظام انفاق پیش

کیا ہے۔

۶
ایمان باللہ بروزن افعال مصدر ہے اس کے معنے
تصدیق کرنے کے ہیں۔ یعنی خبر دینے
والے کے حکم کا یقین کرنا اس طرح کہ
حکم قبول کیا جائے۔ اور بتلانے والے
کو سچا قرار دیا جائے۔ یہ امن سے بنا
ہے گویا ایمان لانے کا مطلب یہ
ہے کہ جس پر ایمان لایا جائے۔ اس
کو تکذیب و مخالفت سے امن دے
دی جائے۔ اس کے ساتھ کبھی حرف
باء آتا ہے اور کبھی لام۔ اوّل صورت
میں اذعان و یقین کے معنے ملحوظ
ہوتے ہیں اور دوسری صورت میں
اعتراف و تسلیم کے جس سے اس
طرف اشارہ ہوتا ہے کہ بغیر اعتراف
تصدیق کا اعتبار نہیں ہے۔ کبھی
باعتبار حقیقت عرفیہ یا بطور مجاز
وثوق کے معنے میں بھی ایمان آتا ہے
یہ اس حیثیت سے کہ وثوق کرنے
والا امن میں ہو گیا اور قانون کی زبان
میں ایمان نام ہے۔ حضور انور صلی اللہ
علیہ وسلم کی ان تمام تعلیمات کی
تصدیق کرنے کا جن کے متعلق بالتواتر
یہ معلوم ہو کہ یہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم
کی تعلیم ہے۔ جس چیز کا تفصیلی علم ہے
اس کی تفصیلی طور پر اور جس کا اجمالی علم ہے
اس کی اجمالی طور پر تصدیق کرنا۔ جمہور
محققین کا یہی مذہب ہے (روح المعانی)
حکیم الامت شاہ ولی اللہؒ نے حجۃ اللہ
البالغہ میں لکھا ہے کہ زبان نبوت میں
ایمان کے ایک سے زیادہ اطلاقات
پائے جاتے ہیں۔

۱۔ ایمان دنیوی یعنی وہ ایمان جس پر اسلامی
مملکت کی شہریت کے حقوق ایک مسلم
سوسائٹی کے فرد ہونے کی حیثیت
سے حاصل ہوں۔ شہادتین کا اقرار، نماز
اور زکوٰۃ کو عملاً قبول کر لینا اس بات کی
قانونی ضمانت ہے کہ اب اسلامی قانون
میں اس کی جان، مال اور آبرو محفوظ ہے

۲۔ دوسرے وہ ایمان جس پر نجات اخروی
موقوف ہے۔ اسلامیات میں ہر اسلامی
عقیدے، ہر اسلامی عمل و کردار اور ہر
اسلامی اخلاق پر زبان نبوت میں ایمان اسی
معنے میں آیا ہے۔ اسی ایمان کو درخت
سے تشبیہ دی گئی ہے۔ درخت میں
تنا، ٹہنیاں، پتے، پھول اور پھل سب
کچھ ہوتا ہے۔ ________
________ لیکن ٹہنیاں کٹ
جانے پر درخت ناقص ہوتا ہے۔
یہی حال پتوں، پھول اور پھل کا ہے۔

جب تک تنا جڑ کے ساتھ ہے درخت ہے لیکن تنا ہی جڑ سے الگ ہو جائے تو پھر درخت نہیں پہلے ایمان کے مقابلے میں لفظ کفر آتا ہے جب کہ دوسرے معنے کے مقابلے میں کفر نہیں بلکہ نفاق ہوتا ہے اور نفاق اگر اندرونی تصدیق یعنی جڑ ہی ختم ہو جاتے تو اس میں اور کافر میں کوئی فرق نہیں لیکن اگر تصدیق موجود ہے اور اس کے تقاضے ناپید ہیں تو یہ نفاق عمل ہے۔

ایمان بالیوم الآخر یہ ہے کہ اس حقیقت کا یقین کیا جائے کہ یہ دنیا ایک دن قطعی طور پر فنا کر دی جائے گی اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ اپنی خاص قدرت سے پھر سارے مردوں کو جلائے گا، یہاں جس نے جیسا کچھ کیا ہے اسی کے مطابق جزا اور سزا اس کو دی جائے گی۔ چونکہ دین و مذہب کی سارے نظام کی بنیاد اس حیثیت سے جزا و سزا ہی کے عقیدے پر ہے کہ اگر آدمی اس کا قائل نہ ہو تو پھر وہ کسی دین و مذہب اور اس کی تعلیمات و ہدایات کو ماننے اور اس پر عمل کرنے ہی کی ضرورت کا قائل نہ ہوگا اس لئے ہر مذہب میں چاہے وہ خود انسانوں کا خود ساختہ ہو یا اللہ سبحانہٗ کا بھیجا ہوا جزا و سزا کو بطور بنیادی عقیدے کے تسلیم کیا گیا ہے پھر انسانی دماغوں کے بنائے ہوئے مذاہب میں اس کی شکل تناسخ وغیرہ گھڑ لی گئی۔ لیکن اللہ سبحانہٗ کی طرف سے آئے ہوئے ادیان کل کے کل اس پر متفق ہیں کہ اس کی صورت وہی حشر و نشر کی ہو گی جو قرآن نے بتائی ہے۔

اس کا نام اس پارے میں الیوم الآخر اور الآخرۃ آیا ہے۔ آخرۃ کے معنے پچھلی کے ہیں اور یہ لفظاً صفت ہے عربی میں اوصاف کو موصوف کا قائم مقام کر کے اکثر موصوف کو حذف کر دیتے ہیں، مثلاً دنیا کے لفظی معنے قریب ترین کے ہیں اور یہ صفت ہے اس کا موصوف الحیاۃ ہے یا الدار۔ اس لئے الدنیا کا مفہوم الحیاۃ الدنیا قریب ترین زندگی یعنی اس عالم کی موجودہ زندگی یا الدار الدنیا قریب ترین گھر یعنی موجودہ عالم ہے۔ اسی طرح الآخر اور الآخرۃ ہے اس کا مفہوم الیوم الآخر۔ الحیاۃ الآخرۃ اور الدار الآخرۃ ہے۔ پچھلا دن پچھلی زندگی اور پچھلا گھر یعنی موجودہ زندگی کے بعد آنے والی دوسری زندگی۔ قرآن میں یہ لفظ ان ہی معنوں میں ۱۱۲ مقام پر آیا ہے اسلام میں اس آئندہ زندگی کو دو دو شل

میں تقسیم کیا ہے ایک موت سے ملے کر قیامت تک دوسرے قیامت سے لیکر ابد تک۔ پہلے دور کا نام برزخ ہے اور دوسرے کا نام بعث حشر النشر اور قیامت ہے اس طرح انسانی زندگی کی تین منزلیں ہیں ایک دنیا دوسرے برزخ اور تیسرے قیامت۔ ان تینوں میں جو جوہری فرق ہے وہ یہ ہے کہ اس موجودہ دنیا میں جسم نمایاں ہے اور روح پوشیدہ ہے دوسرے عالم میں جس کو برزخ کہتے ہیں، روح نمایاں ہے جسم پوشیدہ ہے۔ لیکن تیسرے عالم یعنی قیامت میں جہاں سے حقیقی اور غیر فانی زندگی شروع ہوتی ہے روح و جسم دونوں نمایاں ہوں گے اور دونوں کی لذت و تکلیف کے مظاہر بالکل الگ الگ ہوں گے۔

ایمان بالکتب

کتاب الٰہی پر ایمان لانے سے مقصود ان تمام صداقتوں اور حکموں کو بجان و دل قبول کرنا ہے جو اس میں مذکور ہیں، یہ گویا پوری شریعت مطہرہ کو قبول کر لینے کا مختصر ترین طریقہ تعبیر ہے اور اس لئے ایمانیات کی بہت سی دوسری باتیں جن کی تفصیل ہر موقعہ پر ضروری نہیں ہے اس ایک فقرے کے تحت آجاتی ہیں۔ قرآن پر ایمان لانے کے معنے یہ ہیں کہ جو کچھ قرآن میں علمی و عملی عقائد و عبادات و احکام سو مذکور ہیں ان سب کو بے کم و کاست ہم تسلیم کرتے ہیں۔ قرآن نے ایمان بالکتب کو ضروری قرار دیا ہے یعنی قرآن کے ساتھ دوسرے پیغمبروں کے صحیفوں کو بھی من جانب اللہ تسلیم کیا جائے نام کی تخصیص کے ساتھ قرآن میں چار آسمانی کتابوں کا ذکر ہے تورات جس کو ایک جگہ صحف موسیٰ بھی کہا ہے اور حضرت داؤد علیہ السلام کی زبور، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی انجیل اور خود قرآن، ان کے علاوہ سورۃ اعلیٰ میں صحف ابراہیم کا بھی تذکرہ ہے۔

یہود تورات کے سوا کچھ نہیں مانتے عیسائی تورات کے احکام نہیں مانتے۔ لیکن اس کی اخلاقی نصیحتوں کو قبول کرتے ہیں، پارسی اوستا کے باہر خدا کے کلام ہونے کا شبہ بھی نہیں کر سکتے اور برہمن وید ول کے باہر خدا کے فیضان کا تصور بھی نہیں کر سکتے لیکن قرآن پر ایمان لانے والا مجبور ہے کہ صحیفہ ابراہیم، تورات، زبور اور انجیل کو خدا کی کتاب یقین کرے اور دوسری اگلی آسمانی کتابوں کی جن میں آسمانی تعلیمات کی خصوصیات پائی جاتی ہوں

تکذیب نہ کرے کہ ان کا کتب الٰہی ہونا
ممکن ہے۔ قرآن کی یہ تعلیم صرف نظریہ
کی حیثیت نہیں رکھتی بلکہ حضور انور صلی اللہ
علیہ وسلم نے قانونی حیثیت سے اسی
بنیاد پر دنیا کی قوموں کو چار حصوں
میں تقسیم کیا ہے اور ان کے علیحدہ علیحدہ
حقوق مقرر کئے ہیں۔ ۱۔ مسلمان
۲۔ اہل کتاب۔ ۳۔ شبہ اہل کتاب
۴۔ عام کفار۔

9
ایمان بالرسل

اللہ سبحانہ کے رسولوں پر ایمان
لانا یہ ہے کہ اس واقعی حقیقت کا یقین
کیا جائے کہ اللہ سبحانہ نے اپنے
بندوں کی ہدایت و رہنمائی کے لئے
وقتاً فوقتاً اور مختلف علاقوں میں اپنے
برگزیدہ بندوں کو اپنی ہدایت اور اپنی
رضامندی کا دستور دے کر روانہ کیا ہے
اور انہوں نے پوری دیانت و امانت
کے ساتھ خدا کا پیغام بندوں تک پہنچا
دیا۔ یہ عقیدہ اسلام کی خصوصیات میں
سے ہے کیوں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ
وسلم کی تشریف آوری سے پہلے دنیا
کی ہر قوم کو بجائے خود خیال تھا کہ وہ
ہی اللہ تعالیٰ کی خاص محبوب اور پیاری
ہے تمام دنیا کی قوموں میں ہدایت ربانی
کے لئے وہ ہی خاص ہیں اس کے علاوہ
دنیا کی ساری قومیں اس فیض سے قطعاً
محروم ہیں لیکن قرآن نے تنگ خیال کے
اس محدود دائرے کو دنیا کی عظیم الشان
وسعت سے بدل دیا۔ قرآن نے بتایا کہ
دنیا کی تمام قومیں خدا کی نظر میں یکساں ہیں
ساری زمین خدا کی ہے اور تمام قومیں
خدا کی مخلوق ہیں۔ اس نے بتایا کہ
روئے زمین کی ہر آبادی میں ہر قوم اور
اور ہر زبان میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے
اس کی راہ دکھانے والے، اس کی آواز
پہنچانے والے اور الناس کو غفلت سے
چونکا دینے والے آئے ہیں اور یہ سلسلہ
جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک برابر
جاری رہا اور آپ اس سلسلہ کی آخری کڑی ہیں

10
امام

پیشوا، مقتدا، رہنما بروزن فعال اسم جس کی
اقتدا کی جائے۔ ام سے بنا ہے عربی
میں ام کا اطلاق ایسی تمام چیزوں پر ہوتا ہے
جو ایک طرح کی جامعیت رکھتی ہوں یا
بہت سی چیزوں میں مقدم اور نمایاں ہوں
یا پھر کوئی ایسی چیز ہو جس کے پیچھے اس
کے بہت سے توابع ہوں چنانچہ سر کے
درمیانی حصہ کو ام الراس کہتے ہیں فوج
کے جھنڈے کو ام کہتے ہیں جس کی پیروی
کی جائے اور جس کے گرد لوگ طاعت و
اقتدا میں جمع ہوتے ہوں وہ امام ہے۔

چاہیے وہ انسان ہو کہ لوگ اس کے قول و
فعل کی اقتدا کریں یا کتاب کہ اس کے امر
ونواہی پر عمل کریں۔ اسلام کی اصطلاحی زبان
میں امامت، خلافت اور امارت کا قریب
قریب تصور ہے امام ہو یا خلیفہ، امیر ہو
یا عامل سب کی ذمہ داریوں کا وزن یکساں
ہے۔ امام رسول کا نائب اور امامت سایہ
رسالت ہوتی ہے۔ نائب ہونے کی
حیثیت میں امام کے احکام اپنے نہیں۔
بلکہ منیب کے ہوتے ہیں۔

مولینا شہیدؒ نے امامت کی ابتدائی
تقسیم امامت حقیقیہ اور امامت حکمیہ
بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ

حقیقی اور واقعی امامت یہ ہے کہ
زندگی کے ہر کمال میں نبوت سے
مشابہت نمایاں ہو جاتے۔

زندگی کے شعبے ان گنت ہیں اس
لئے ہر شعبے کی امامت بھی الگ ہے
مثلاً فقہ میں امام، عدالت میں امام اور دوسرے
شعبوں میں امامت الگ الگ ہے۔

فقہا نے امامت کی دو قسمیں بتائی
ہیں۔ امامت صغریٰ اور امامت کبریٰ
صغریٰ سے مسجد میں نماز کی یا زندگی
کے خاص شعبہ کی امامت مراد ہے جب
کہ کبریٰ سے مراد نظام حیات انسانی

شرعی ہے۔

بغی سرکشی، زیادتی، ضد، مصدر ہے۔ جہاں
میانہ روی چاہیئے وہاں میانہ روی سے
بڑھنے کی خواہش کو بغی کہتے ہیں۔ خواہ
میانہ روی سے تجاوز عمل میں آیا ہو۔ یا نہ
آیا ہو بغی کا استعمال کمیت کیفیت یعنی
مقدار اور وصف دونوں کے متعلق ہوتا ہے
اس کی دو قسمیں ہیں ایک محمود جیسے عدل
کے بجائے احسان کرنا اور فرائض کے
علاوہ نوافل کا بھی پابند رہنا۔ دوسرے
مذموم جیسے حق سے تجاوز کر کے باطل کو
اختیار کرنا یا شبہات میں پڑنا۔ قرآن
عظیم میں اکثر مواقع پہ بغی کا استعمال مذموم
مواقع پہ ہوا ہے۔

لغت میں یہ لفظ حد سے تجاوز اور
ایسی چیز کی تلاش جو اس کا حق نہ ہو۔ اسی
سے زخم کے خراب ہونے اور خرابی میں
بڑھ جانے کو بغی الجرح بولا جاتا ہے۔
اسی لئے قرآن میں بغی آیا ہے۔
یبغون فی الارض بغیر الحق
جب اس کے مفعول پر علیٰ آتے تو اس کے
معنے لوگوں کی جان، مال اور آبرو پر
دست درازی کے آتے ہیں۔ اسی سے
بغا زنا اور بدکاری کو کہتے ہیں۔ کبھی اس
کے دو مفعول آتے ہیں اغیر اللّٰہ

ابغیکم الٰہًا (کیا میں اللہ سبحانہٗ کے غیر
کو تمہارے لئے الٰہ تلاش کر دوں) اس
سے معلوم ہوا کہ بغی حرام وہ گناہ ہے جس
میں حدود حق کو پامال کر دیا گیا ہو۔ یا
انسانوں میں افراد یا جماعتوں کے
حقوق پر غاصبانہ قبضہ کیا جا رہا ہو بغی میں
بغیر حق کی قید قرآن میں تاکید کے
لئے آئی ہے۔ حافظ ابن القیمؒ فرماتے
ہیں کہ بغی زیادہ تر حقوق العباد میں دست
درازی پر بولا جاتا ہے۔ اگر لفظ عُدوان
کے ساتھ استعمال ہو تو بغی کے معنے بالذات
حرام کے ذریعے ظلم کاری کے آتے ہیں
جیسے چوری، جھوٹ وغیرہ۔ سوسائٹی کے
حقوق میں بغی وعدوان کی وہی حیثیت
ہے جو حقوق اللہ میں اثم و عُدوان کی
ہے۔ اللہ سبحانہٗ کا حق ہو یا بندوں کا
یعنی ان دونوں میں حق سے تجاوز اور
حق میں کوتاہی پر بولا جاتا ہے۔

۱۴

تحریف اصل مادہ حرف ہے جس کے معنے کنارے
کے ہیں، یہ مصدر ہے اس کے معنے بگاڑ
دینے کے اور بدل دینے کے ہیں
عام اہل تفسیر نے لکھا ہے کہ یہودی
تورات میں تحریف کرتے تھے۔ قرآن
سے پہلے کوئی کتاب الٰہی دانستہ اور
نادانستہ لفظی تحریفات اور تصرفات
سے پورے طور پر بری نہیں رہی ہے
لاکھوں پیغمبروں میں سے چند کے سوا کسی
کا صحیفہ دنیا میں باقی نہیں رہا اور جو باقی بچ
وہ فنا ہو ہو کر نئے نئے قالب میں بدلتا
رہا ہے۔ تورات جل جل کر خاکستر ہوئی
ہے پھر ان سوختہ اوراق سے تحریر کی گئی
اور ترجموں کی تحریفات سے اپنی اصل
کھو بیٹھی۔ انجیل میں تحریف وحذف تو اسی
زمانہ میں شروع ہو چکا تھا۔ پھر ترجموں
کی کثرت بہتات نے حقیقت بالکل مشتبہ
کر دی۔ تحریف کی دو قسمیں ہیں۔ لفظی اور
معنوی۔ لفظی تحریف کا مطلب یہ ہے
کہ اصل الفاظ میں تبدیلی کر دی جائے
خواہ ایک لفظ کی جگہ دوسرا لفظ رکھ کر یا
کسی لفظ کو حذف کر کے یا کوئی لفظ بڑھا
کر۔ اور تحریف معنوی کا مطلب یہ ہے
کہ الفاظ میں تو کوئی تبدیلی نہ کی جائے۔
مگر عبارت کی کوئی من مانی تفسیر کر دی جائے
جو اصل معنے کے خلاف ہو۔

مولانا رحمت اللہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے
ہیں ——— دوسری قسم کی نسبت
پر تو ہمارے اور عیسائیوں میں کوئی
جھگڑا نہیں ہے، کیونکہ وہ سب تسلیم
کرتے ہیں کہ عہد عتیق کی وہ آیات
جن میں عیسائیوں کے خیال کے مطابق

حضرت مسیح علیہ السلام کی جانب اشارہ تھا اور وہ احکام جو یہودیوں کے نزدیک دائمی اور ابدی ہیں ان کی تفسیر میں یہودیوں کی جانب سے تحریف معنوی کا صدور ہوا ہے اور علماء پروٹسٹنٹ یہ بھی اعتراف کرتے ہیں کہ پاپا کے معتقدین کیطرف سے دونوں عہد ناموں میں اس قسم کی تحریف ہوئی ہے اب تحریف لفظی رہ جاتی ہے جس کا علماء پروٹسٹنٹ بظاہر عام مسلمانوں کو دھوکا دینے کے لئے سختی سے انکار کرتے ہیں اس لئے اس کے ثابت کرنے کی ضرورت ہے ہمارا دعویٰ ہے کہ تحریف لفظی اپنی ساری قسموں سمیت ان کتابوں میں موجود ہے ۔

عہد عتیق یعنی تورات کے تین نسخے ہیں ۔ ۱۔ عبرانی نسخہ جو یہودیوں کے نزدیک بھی معتبر ہے اور علماء پروٹسٹنٹ کے نزدیک بھی ۔ ۲۔ یونانی نسخہ جو عیسائیوں کے نزدیک ساتویں صدی تک معتبر تھا۔ اس وقت عیسائی حضرات عبرانی نسخہ کو تحریف شدہ مانتے تھے ۔ ۳۔ سامری نسخہ جو سامریوں کے نزدیک معتبر ہے ۔ یہ نسخہ دراصل عبرانی نسخہ ہے مگر عہد عتیق کی صرف سات کتابوں پر مشتمل ہے۔ اس میں عبرانی نسخہ کی نسبت بہت سے الفاظ زائد ہیں جو آج کل اس میں موجود نہیں ہیں۔ اکثر محققین اس کو معتبر مانتے ہیں ۔ عبرانی نسخہ کو تسلیم نہیں کرتے ان کا اعتقاد ہے کہ یہودیوں نے عبرانی نسخہ میں تحریف کر دی ہے اور تقریباً سارے علماء پروٹسٹنٹ بعض موقعوں پر اس کے ماننے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور عبرانی نسخہ پر اسے ترجیح دیتے ہیں (اظہار الحق ج ۲ ص ۲۰۲)

شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ یہودی تحریف لفظی ترجمہ تورات میں کرتے تھے اور فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک یہی حق ہے اور تحریف معنوی اس طرح کرتے تھے ۔ کہ معنی میں دور از کار تاویلات کے ذریعے مطالب بدل ڈالتے تھے ۔ حافظ ابن القیمؒ نے حدیث، فقہ اور کلام کے آئمہ کی طرف منسوب کر کے لکھا ہے کہ تحریف و تبدیلی تاویل میں کرتے تھے اور بتایا ہے کہ امام بخاریؒ کا بھی یہی مذہب ہے شاہ ولی اللہؒ نے حجۃ اللہ البالغہ میں احکام الدین من التحریف کا عنوان قائم کر کے تحریف کی حقیقت، تحریف کی صورتیں، تحریف کے اسباب سے تفصیلی بحث کی ہے ۔

تفریق بین الرسل اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا کے رسولوں میں باعتبار تصدیق تفرقہ و امتیاز کرنا یعنی یہ سمجھنا کہ ان میں سے فلاں سچا تھا۔ فلاں سچا نہ تھا یا کسی ایک کی تصدیق کرنی باقی سب کا انکار کر دینا یا سب کی تصدیق کرنی کسی ایک کا انکار کر دینا کوئی شخص اس وقت تک مسلمان نہیں ہوسکتا جب تک وہ دنیا کے سارے پیغمبروں کی یکساں صداقت، حقانیت، راستبازی اور معصومیت کا اقرار نہ کرے اور یہ یقین نہ کرے کہ ان کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے عرب کی طرح ہر قوم کو اپنی ہدایت اور رہنمائی سے سرفراز کیا ہے اور ان کا ماننا ایسا ہی ہے جیسا کہ خدا کا ماننا غرض تفریق یہ ہے کہ انبیاء میں سے کچھ کو ماننے اور کچھ کو نہ ماننے، قرآن نے اس کی مخالفت کی ہے۔ اور عام حکم دیا ہے کہ دنیا کے تمام پیغمبروں اور رسولوں کو یکساں خدا کا رسول صادق اور راستباز تسلیم کیا جائے۔ یہودی حضرت عیسیٰؑ کو نعوذ باللہ جھوٹا اور کاذب سمجھتے تھے اور ان پر طرح طرح کی تہمتیں لگاتے تھے اور اب بھی ان کا یہی عقیدہ ہے یہودیت اور اسلام میں جو اشتراک ہے وہ مسیحیت سے زیادہ ہے اس لئے اگر اسلام کی راہ میں حضرت مسیح علیہ السلام کا نام نہ آتے تو بہت سے یہود مسلمان ہونے کو تیار ہو جائیں مگر اسلام نے کبھی یہ تنگ نظری گوارہ نہیں کیا اور جب تک یہودی سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت، عصمت اور تقدس کا اقرار نہیں لے لیا اس کو اپنے دائرے میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دی چنانچہ خود زمانہ نبوت میں بہت سے یہود آپ کی نبوت پہ ایمان لانے کو تیار تھے مگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ماننے کے لئے تیار نہ تھے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی دوستی کے عظیم الشان فائدوں سے محروم رہنا گوارہ لیا مگر حضرت مسیح علیہ السلام کی سچائی سے محروم رہنا گوارا نہ فرمایا (ابن جریر صـ۱۹۶، ج ۸)

تسبیح یہ مصدر جعلی ہے اس کے معنی سبحان اللہ کہنا ہے اور اللہ سبحانہٗ کی پاکی بیان کرنا ہے یعنی اس کی پاکی اور ہر عیب و نقصان سے اس کی برأت ظاہر کرنا۔ امام راغبؒ فرماتے ہیں کہ سب چیزیں اللہ سبحانہٗ کی تسبیح کرتی ہیں۔ بعض کی تسبیح تسخیری ہوتی ہے۔ اور بعض کی اختیاری۔ آسمان و زمین اور رینگنے والے جانوروں کے بارے میں تو کوئی اختلاف نہیں کہ وہ بالتسخیر تسبیح

گذارہیں کیونکہ ان کے احوال اللہ تعالیٰ کی حکمت پر دال ہیں۔ البتہ اس میں اختلاف ہے کہ آسمان وزمین آیا اپنے اختیار سے بھی اللہ سبحانہٗ کی پاکی بولتے ہیں۔ یا نہیں۔

علامہ مرتضیٰ زبیدیؒ تاج العروس میں رقمطراز ہیں:۔

کبھی تسبیح بول کر اس سے نماز اور ذکر اور تحمید وتمجید مراد لی جاتی ہے۔ اور نمازِ تسبیح اس لئے کہا گیا ہے کہ تسبیح کے معنے اللہ سبحانہٗ کی تعظیم کرنے اور ہر برائی سے اس کی تنزیہہ کے آتے ہیں اللہ سبحانہٗ کی ذات کی معرفت میں سب سے پہلا درجہ تنزیہہ کا ہے اور قرآن کی زبان میں تنزیہہ کو تسبیح کہتے ہیں شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ ایمان کی زندگی میں اللہ سبحانہٗ کی معرفت صرف تسبیح اور تحمید کے ذریعے حاصل ہوتی ہے۔ تسبیح یہ ہے کہ اللہ سبحانہٗ کی طرف انسان کی توجہ اس طرح ہو کہ اسے احاطہ وادراک سے بالا تصور کرے۔ اس کے لئے صفات دائمہ کو بغیر احاطہ اور ادراک کے ثابت کرے اور یقین کرے کہ وہ سنتا ہے لیکن اس کا سننا ہمارے سننے کی طرح نہیں ہے۔ وہ دیکھتا ہے۔ لیکن اس کا دیکھنا ہمارے دیکھنے کی طرح نہیں ہے وہ جانتا ہے لیکن اس کا جاننا ہمارے جاننے سے مشابہ نہیں ہے۔ اس طرح سننے کو ثابت کرنا تحمید اور سننے میں اس کی بے نیازی کی شان کو برقرار رکھ کر ہر قسم کے عیب سے اسے پاک سمجھنا تسبیح ہے امام غزالیؒ نے الجام العوام میں تسبیح کو تقدیس کے نام سے موسوم کیا ہے۔ تسبیح کے ذریعے قرآن نے تنزیہہ کی تکمیل کی ہے تنزیہہ سے مقصود یہ ہے کہ جہاں تک عقل بشری کی پہنچ ہے صفات الٰہی کو مخلوقات کی مشابہت سے پاک رکھا جائے۔ قرآن کی تسبیح تنزیہہ کی تکمیل ہے۔

۱۵ تقویٰ

پرہیزگاری۔ بچنا وقایہ سے بنا ہے اصل میں وقویٰ ہے عربی زبان میں اس کے لغوی معنے بچنا۔ پرہیز کرنا احتیاط کرنا اور لحاظ کرنا ہیں لیکن قرآن کی اصطلاح میں یہ دل کی اس کیفیت کا نام ہے جو اللہ سبحانہٗ کے ہمیشہ حاضر وناظر ہونے کا یقین پیدا کر کے دل میں خیر وشر کی تمیز اور خیر کی طرف رغبت اور شر سے نفرت پیدا کرتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ تقویٰ ضمیر کے اس احساس کا نام ہے۔ جس کی بنا پر ہر کام میں اللہ سبحانہٗ کے حکم کے مطابق کام کرنے کی شدید رغبت اور اس کی مخالفت سے سخت نفرت پیدا ہوتی ہے۔ یہ بات کہ تقویٰ دل کی

اس کیفیت کا نام ہے قرآن کی اس آیت
سے ثابت ہے جو ارکان حج کے موقعہ
پر ہے ۔ مَنْ یُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰہِ
فَاِنَّھَا مِنْ تَقْوَی الْقُلُوْبِ ۔ اس آیت
سے واضح ہے کہ تقوی کا اصل تعلق دل
سے ہے اور وہ سلبی کیفیت کی بجائے
ایجابی اور ثبوتی کیفیت اپنے اندر رکھتا
ہے ۔ اور وہ امور خیر کی دلوں میں رغبت
اور برائیوں سے نفرت کی تحریک سے
ان کو معمور کرتا ہے ۔

قرآن کی تمام تعلیمات کا خلاصہ ہم اگر
ایک لفظ میں کرنا چاہیں تو ہم اسے تقوی کہہ
سکتے ہیں ۔ قرآن کی ہر تعلیم کا مقصد اپنے
ہر عمل کے قالب میں اسی تقوی کی روح
کو پیدا کرنا ہے ۔ قرآن میں سورۂ بقرہ
کا تو موضوع ہی تقوی ہے اس نے سورت
کے آغاز ہی میں اعلان کیا ہے کہ قرآن
کی تعلیم سے فائدہ اٹھانے کی بنیادی
شرط ہی تقوی ہے ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ
اسلام میں عبادات کا سرتاسر منشا تقوی ہے
روزے سے بھی یہی مقصود ہے ۔ حج کا
منشا بھی یہی ہے ۔ قربانی بھی اسی غرض
کے لئے کی جاتی ہے ۔ ایک مسلمان کی
پیشانی جس جگہ اللہ سبحانہ کی عبادت کے
لئے جھکتی ہے اس کی بنیاد تقوی پر ہونی
چاہیئے حج کے سفر اور زندگی کے مختلف
مراحل میں مال و دولت سے زیادہ راستہ
کا زاد راہ تقوی ہونا چاہیئے ۔ آب و زینت
کا سامان ظاہری لباس سے زیادہ تقوی کا
لباس ہونا چاہیئے ۔ اسلام کا تمام اخلاقی نظام
بھی اسی تقوی کی بنیاد پر قائم ہے ۔
فوجداری ضابطہ کی تمام دفعات کا دارومدار
تقوی ہے ۔ دیوانی قوانین کی اصل روح
تقوی ہے ۔ اجتماعی قوانین میں دُنیا میں
امتوں کی تمام تر کامیابیوں اور کامرانیوں
کا مدار اسی تقوی پر ہے ۔ بلائیں یا مصائب
خواہ کتنے سنگین ہوں لیکن نتائج کے لحاظ
سے اہل تقوی ہی کامیاب ہیں ۔ آخرت
کی ساری سرفرازیاں متقیوں کے لئے
ہیں ۔ جنت کی ساری نعمتوں کی حقداری
تقوی کے لئے ہے ۔ اللہ سبحانہ کی محبت
اللہ سبحانہ کی معیت کا شرف تقوی کو حاصل
ہے ۔ قبولیت اہل تقوی ہی کو حاصل ہے

۱۷
خلوفة عربی زبان کا مصدر ہے اس کا مادہ خلف
ہے اسی سے خلیفہ ہے ۔ خلیفہ کے لغوی
معنے نیابت اور قائمقامی کے ہیں ۔ یعنی جو
شخص کسی کا نائب و قائمقام ہو تو اس کو
لغت میں خلیفہ کہیں گے چاہے یہ نیابت
موت و عزل کی وجہ سے ہوئی ہو یا غیبت
کی وجہ سے یا اکرام کی خاطر یا اپنا اختیار

سپرد کر دینے کی وجہ سے ۔ امام راغبؒ
کہتے ہیں کہ خلافت کے معنے نیابت کے
ہیں ، یہ نیابت غیبت کی وجہ سے ہو یا
موت اور عاجزی کی وجہ سے ہو یا پھر
نائب کے اکرام و اعزاز کی وجہ سے ہو ۔
(ص ۵۰)

یہ لفظ بھی قرآن حکیم کے اختیارات
لغویہ میں سے ہے یعنی عربی زبان کے
ان الفاظ میں سے ہے جن کو لغت میں
عام معانی کے لئے استعمال کیا جاتا تھا ۔
لیکن قرآن حکیم نے اپنے خاص اصطلاحی
معنے میں استعمال کیا ہے قرآن کی زبان
میں خلافت سے مقصود زمین میں اللہ سبحانہٗ
کے احکام اختیاری کو تمکن حکومت کے
ذریعے نافذ کرنا ہے ۔ قرآن کے نزدیک
اس کا مقصد یہ ہے کہ دنیا میں نوع انسانی
کی ہدایت و سعادت کے لئے ایک خاص
ذمہ دار حکومت قائم ہو وہ اللہ سبحانہٗ کی
عدالت کو دنیا میں نافذ کرے ظلم و جور
اور ضلالت و طغیان سے اس کی زمین
پاک ہو جائے ۔ ایک عام امن و سکون اور
رحمت و طمانیت دنیا میں پھیل جائے ۔ اور
اللہ سبحانہٗ کا وہ ہمہ گیر قانون عدل جو تمام
کائنات ہستی میں سورج سے لے کر
زمین کے ذرات تک قائم و نافذ ہے ۔
اور جسے قرآن اپنی زبان میں صراط مستقیم
کہتا ہے زمین کے چپے چپے میں جاری
ہو کر زمین کے گہوارہ کو سعادت دامن
کی بہشت بنا دے ۔ سب سے پہلے
خلافت کا یہ منصب اللہ سبحانہٗ کی جانب سے
حضرت آدم علیہ السلام کو ملا ۔ وہی زمین میں
واقعی خلیفہ ہیں اور آپ کے بعد ہر نبی
اپنے سابق کا نائب ظہور اسلام کے ساتھ
حبیب جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم پر نبوت کے ختم ہونے کا اعلان ہوا
تو قرآن نے خلافت کا یہ منصب امت
مسلمہ کے سپرد کر دیا ۔ یہی تمکین فی الارض
ہے یہی استخلاف فی الارض ہے اور اسی
کا نام امامت ہے ۔

علامہ آلوسیؒ خلافت پر بحث کرتے ہوئے
رقمطراز ہیں ۔ ہر نبی زمین کی آبادکاری ،
سیاست ، انتظام اور اللہ سبحانہٗ کے
قانون کے نافذ کرنے میں بواسطہ آدم اللہ
سبحانہٗ کا خلیفہ ہے ۔ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ
فرماتے ہیں کہ نظام خلافت دو وجہ سے
ضروری ہے ایک ملکی و قومی دوسرے
دینی و ملی ۔ ازالۃ الخفاء میں خلافت کی یہ
تعریف کی گئی کہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ عمومی
ریاست جس میں اسلامی علوم کے ذریعے
زندگی میں دین کو قائم رکھا جائے ۔ ارکان

اسلام پروان چڑھیں اور جہاد اور اس کے وسائل کی بہم رسانی یعنی نظام دفاع مرتب ہو، عدالت میں اللہ سبحانہٗ کے قوانین نافذ ہوں اور شہریوں میں نیکی کی تلقین اور برائی پر گرفت کی جائے اور یہ سارے کام ملکی و قومی تقاضے سے نہیں بلکہ نبوت کی نیابت میں ہوں۔

دین لغت میں یہ لفظ ایک سے زیادہ معنے میں استعمال ہوتا ہے۔ الشیخ محمد اعلیٰ التھانوی نے کشاف اصطلاحات الفنون میں دین کے لغوی اطلاقات یہ بتلاتے ہیں:۔

عادت، سیرت، حساب، دبدبہ، فیصلہ، حکم، طاعت، حالت، بدلہ، سیاست، ضابطہ۔

یہ لفظ بھی ان الفاظ میں سے ہے جن کو قرآن نے اصطلاحی معنے کا جامہ پہنا دیا ہے۔ قرآن نے قیامت کو یوم الدین معنی لغوی کے لحاظ سے کہا ہے یعنی وہ دن مکافاتِ عمل اور بدلے کا دن ہوگا۔

قرآن نے دین کا وہ اعلیٰ تصور پیش کیا ہے جس سے پوری دُنیا ناآشنا تھی۔ اب تک دین کے بارے میں جو تصورات علمی طور پر قائم ہوتے ہیں۔ ان کا حاصل یہ ہے کہ دین بندے اور خدا کے درمیان ایک خاص رابطہ کا نام ہے۔ آج بھی دین کے بارے میں عالمانہ انداز میں جو کچھ کہا جاتا ہے وہ صرف یہ ہے کہ غیبی اور ان دیکھی قوتوں سے تعلقات کا نام دین ہے کوئی بتاتا ہے کہ ایسی معلومات جن کا علم عقل ساتھ نہ دے سکے اس کا نام دین ہے ——— یگانے بھی بیگانوں کی دیکھا دیکھی کہہ رہے ہیں کہ دین نام ہے خدا اور بندے کے درمیان خاص تعلقات کا ——— مگر قرآن نے دین کا جو تصور پیش کیا ہے۔ وہ اس سے اعلیٰ ہے قرآن کے پیش کردہ تصور دین کے لئے ضروری ہے کہ اولاً قرآن کے مبادی اور مقاصد پر نظر ہو۔ اور پھر قرآن کے بنیادی کام سے بھرپور واقفیت ہو۔ قرآن کے پیش نظر دو اہم بنیادی کام ہیں:۔

ایک یہ کہ انسانی زندگی میں پھیلی ہوئی غیر معقول رسوم اور بعید از عقل عادات کیخلاف احتجاج کیا جائے۔

دوسرے یہ کہ پوری انسانی سوسائٹی کی ہمہ پہلو اور ہمہ گیر اصلاح کی جائے۔

ان دو کاموں کی بجا آوری کے لئے قرآن نے اپنے اصلاحی نقشہ میں چار مقاصد مقرر کیے ہیں:۔

افکار و نظریات کی اصلاح۔

عابدانہ تعلقات کی ذمہ داریاں اور شعائر۔
سیرت و اخلاق کی درستگی، فضائل کی بہم رسانی اور رذائل سے دوری۔
اجتماعی، مالیاتی، سیاسی حقوق کی نگرانی۔

قرآن اپنے کام اور اپنے مقاصد کو جن ذرائع سے حاصل کرنا چاہتا ہے، وہ صرف پانچ ہیں: زندگی کی حفاظت، خیر کی دعوت، نیکی کی تلقین، برائی پر تنقید، علم و عقل کی پذیرائی۔ اپنے کام اور مقاصد میں ان مبادی کا لحاظ کرنے میں قرآن نے اپنی وضع، اپنے اسلوب، اپنے انداز بیان، اپنے طریق خطاب اور اپنے طریق استدلال، غرضیکہ اپنی ہر بات میں منظرکشی سے کام لیا ہے۔ قرآن کا یہ انداز کہ منظرکشی کے ذریعے اپنے مخاطب کو تاثر دیتا ہے، معجزانہ اسلوب ہے۔ اور قرآن کے ساتھ مخصوص ہے —— یہ قرآن کی معجزانہ منظرکشی ہے کہ اس نے قرآن کو پذیرائی دینے والوں یعنی اہل ایمان کے دلوں میں زندگی اور خیر کی طرف پوری انسانیت کو بلانے کی اس انداز سے تخم ریزی کی ہے اور دنیا میں معروف کو پھیلانے کی اس طریق پر تکوین کی ہے کہ ان میں اس کی لگن اور اس کا عشق پیدا ہو گیا۔ اور وہ دنیا کے سامنے ایک عالمگیر تخیّل کے داعی کی حیثیت سے آ گئے اور ان میں ایسی شدید محبت پیدا کر دی کہ اس کے لئے کوئی قربانی نہ تھی جسے انہوں نے گوارا نہ کیا ہو اور کوئی مشقت نہ تھی جو انہوں نے برداشت نہ کی ہو۔ اس مقصد کی خاطر انہوں نے علم کی روشنی حاصل کی، جاہلیت کی رسوم عادات کو یکدم ترک کر دیا اور چند سال کے عرصہ میں وہ ساری صفات حاصل کر لیں جو دنیا کی ترقی پذیر قوموں میں نمایاں ہوتی ہیں۔ اور اس کے نتیجے میں قرآن کے مخاطب پوری انسانی زندگی اور ساری دنیا کے لئے خیر امت بن کر امامت و قیادت کے منصب پر آ گئے اور قرآن کے پیش کردہ تصور دین نے ان کی اس انداز سے تربیت کی کہ ان میں وضعیت اور صناعیت کی جگہ فطرت کی سیدھی سادی فکری حالت اجاگر ہو گئی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ان کو قرآنی کام قرآنی مقاصد کو سمجھنے میں کوئی دشواری نہ ہوئی اور قرآن کے مطابق دین یعنی نظام تمدن اور طرز زندگی کی تخلیق میں علم و عقل کی حاکمیت بروئے کار آ گئی —— قرآن کے پیش کردہ کام، مقاصد اور مقاصد کی بجا آوری کے لئے مبادی اور اس کی بنیاد پر چلتے ہوئے نظام تمدن اور طرز زندگی کی روشنی میں جب ہم دین کے مفہوم تک رسائی کرتے ہیں۔

تو اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ دین قانون الٰہی
کو کہتے ہیں جو انسانی زندگی میں عقل اور عمل
ترقی کے ذریعے خیر اور سرتاسر خیر کی آبیاری
کرتا ہو۔ قانون کی بنیاد تعزیر و سیاست
پر ہوتی ہے اس میں مکافات عمل اور
طاعت کے معنے موجود ہوتے ہیں۔
سورہ یوسف میں جہاں یہ واقعہ بیان
کیا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے
اپنے چھوٹے بھائی کو اپنے پاس روک
لیا تھا۔ وہاں فرمایا کہ مَاکَانَ لِیَاخُذَ
فِیْ دِیْنِ الْمَلِکِ یہاں بادشاہِ مصر
کے دین سے اس کا قانون مراد ہے۔ دین
کی حقیقت یہی ہے کہ اللہ سبحانہٗ نے
جو قانون انسان کے لئے نبوت کی وساطت
سے روانہ کیا ہے اس کی ٹھیک ٹھیک
طاعت کی جاتے اور صرف طاعت
ہی نہیں بلکہ مخلصانہ طاعت کی جاتے اور
سب سے ہٹ کر کی جاتے۔ قرآن میں
دین کیلئے مخلص اور حنیف کو بطور شرط قرار
دیا ہے۔ یعنی زندگی کے تمام گوشوں۔
عقائد۔ تعلقات بندگی۔ اخلاق اور حقوق
کے لئے جو ضابطہ مقرر کیا ہے اس کا نام
ہی دین ہے۔ اس کی پوری طاعت و عبادت
کے علاوہ دین کا ایسا کوئی سپیشا اللہ سبحانہٗ
کے یہاں قابلِ قبول نہیں ہے جس میں
محبوبیت کے درجہ میں عبادت کی حد تک
اللہ سبحانہٗ سے تعلقات ہوں اور حاکمیت
کے درجہ میں طاعت کی حد تک اور اس سے
تعلقات ہوں۔ اسی کی اقامت کا اَنْ
اَقِیْمُوا الدِّیْنَ میں حکم ہے۔ گویا قرآن
کے نزدیک مقاصد قرآن کی روشنی میں دین
نام ہے بندے کے اللہ سبحانہٗ سے تعلقات
اور بندوں سے بندوں کے اُن حقوق تعلقات کا جو
نبوت نے مقرر کئے ہیں اور ان میں اللہ
سبحانہٗ کی ہدایات کی پابجائی کا ــــ اس
میں سرتاسر علمیت اور عقلیت ہے کوئی
عقیدہ ایسا نہیں جو عقل کے لئے بوجھ ہو۔
اور کوئی عمل ایسا نہیں جو طبیعت کے لئے
شاق ہو۔ ہر طرح کے پیچ و خم سے پاک۔
ہر معنے میں علم و عمل کی سیدھی سے سیدھی
شاہراہ۔ دین کی اسی حقیقت کا ہمارے
محققین نے اقرار کیا ہے اور بتایا ہے۔ کہ
دین الٰہی قانون کا نام ہے چنانچہ صاحب
دستور العلماء نے دین کی اصطلاحی تعریف
یہی کی ہے کہ انسانوں کے لئے اس ضابطہ
خداوندی کا نام ہے جو ان کو بالذات خیر
کی طرف ہانک کر لے جاتا ہے۔ الشیخ
محمد اعلیٰ تھانویؒ نے کشاف اصطلاحات الفنون
میں اسی کے قریب قریب تعریف نقل کی
ہے اور بالآخر علامہ بیامنی صاحب

اشارات المرام نے کھول کر بتایا ہے۔
کہ دین اہل عقل و خرد انسانوں کے لئے
اس قانون الٰہی کا نام ہے جسے لوگ اپنے
ارادے سے اختیار کریں اور خیر تک
رسائی حاصل کر سکیں۔ جن لوگوں کے پیش
نظر قرآن کا بتایا ہوا دین کا یہ تصور نہیں
ہے۔ وہ اسے دوسرے مذاہب پر
قیاس کر کے عظیم غلط فہمی کا شکار ہو گئے ہیں
اور انہوں نے دین کی حیثیت سے اسلام
پر جمود اور انسانی زندگی کے تقاضوں سے
ناموافقت کی پھبتی کسی ہے
وہ سمجھتے ہیں کہ دنیا جن انقلابی قوتوں کے
تصادم اور کش مکش کی آماجگاہ ہے۔ اسلام
میں ان کا حریف بننے کی قوت نہیں ہے
اس میں تطور اور ترقی کی صلاحیت نہیں ہے ۱۸/

رسول رسالت سے بنا ہے رسالت کی تعریف
یہ ہے کہ وہ اللہ سبحانہٗ اور اس کی مخلوق
کے درمیان خدائی سفارت ہے۔
تاکہ اسی کے ذریعے ان کی ان بیماریوں
کا ازالہ ہو سکے جن میں ان کی عقلیں دنیا و
آخرت کی مصالح میں ناکام ہو جاتی ہیں
اس لئے رسول گویا اللہ سبحانہٗ کا سفیر بندوں
کی طرف ہوتا ہے۔

مولانا بدر عالمؒ فرماتے ہیں:۔
اسلام میں رسول نہ خدا کا اوتار ہو سکتا
ہے کہ خدائی اس میں حلول کر سکے اور نہ خود
خدا ہو سکتا ہے کہ ہیکل انسانی میں جلوہ نما
ہو۔ رسول کے بارے میں خدائی کا تصور
عیسائیت کا راستہ ہے اور خدا کے متعلق
یہ عقیدہ کہ وہ رسول کی صورت میں بروز کرتا
ہے۔ برہمو کا عقیدہ ہے۔ اسلام کی تعلیم ان
دونوں سے علیحدہ ہے بلکہ یہ دونوں تصور
اسلام میں بے مصداق۔ ناممکن اور محال ہیں۔
رسول ایک انسان ہوتا ہے اور عام انسانوں
سے اس کی برتری سمجھنے کے لئے یہ کافی
ہے کہ وہ خدا کا فرستادہ اور اس کا پیغمبر
ہے اس کی جانب سے منصب اصلاح
پر کھڑا کیا گیا ہے اس لئے اس کا کمال یہ
ہے کہ وہ انسان ہو کیوں کہ اصلاح کے لئے
صرف علم کافی نہیں احساس کی بھی ضرورت
ہے۔ جو غم نہیں کھاتا وہ ایک غمزدہ کی پوری
تسلی نہیں کر سکتا۔ اسی لئے قرآن نے جا بجا
بعثت کے ساتھ رسولوں کا انسان ہونا ایک
مستقل انعام قرار دیا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ
نے جب بنی اسماعیل میں ایک رسول کے
لئے دعا فرمائی تو انہوں نے خاص طور پر
دعا میں یہ بات فرمائی کہ اے اللہ رسول نبی
اسماعیل میں ان میں سے روانہ فرما۔ پھر جب
اس مقبول دعا کے ظہور کا وقت آیا تو رسول کے
بنی اسماعیل میں سے ہونے کا تاکید کیساتھ

ذکر کیا یعنی فرمایا رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِہِمْ
مطلب یہ ہے کہ یہ رسول انسان ہونے کے ساتھ عربی بھی ہے۔ عربوں میں قریشی اور قریش میں ہاشمی۔

رسول کے انسان ہونے کا عقیدہ ابتداء ہی میں اولادِ آدم کو بنیادی طور پر بتا دیا گیا ہے۔ اسی عقیدے کے مطابق دنیا میں حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک رسول آتے رہے ہیں اور اس سلسلہ کو جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم کر کے بساطِ عالم لپیٹنے کا اعلان کر دیا۔

آپ کی سب سے بڑی عظمت لفظ رسول میں ہے اس لفظ سے محبت اور تعظیم کے وہ سارے تقاضے پورے ہو جاتے ہیں جو ایک کامل سے کامل انسان کے لئے فطرتِ انسانی میں موجزن ہیں اور عبد و معبود کی وہ ساری حدیں بھی محفوظ ہو جاتی ہیں جو کفر و ایمان کے مابین خطِ فاصل بن سکتی ہیں صوفیاء کی خوشنما اصطلاحی تعبیرات وجود کا نقطۂ اوّل، حقیقۃ الحقائق، برزخیۃ الکبریٰ سے آپ کے صحیح مقام کی قطعاً نشاندہی نہیں ہوتی۔ لفظ رسول سے انسانی ذہن نہایت بے تکلفی کے ساتھ اس کے لوازم، اس کے فرائض، اس کی شخصیت سے آشنا ہو جاتا ہے۔ قرآن کریم نے بتایا کہ نسبت رسالت کے بعد رسول کی اطاعت اللہ سبحانہٗ کی اطاعت ہو جاتی ہے بلکہ اس طاعت و محبت کے بغیر اللہ سبحانہٗ کی محبت و طاعت کا کوئی دوسرا راستہ ہی نہیں ہے جیسے رسول اللہ تعالیٰ کا بروز، اوتار اور اس کا بیٹا نہیں ہوتا ایسے ہی وہ وکیل و مختار بھی نہیں ہوتا عربی میں دوسرے کی خدمت انجام دینے کے لئے دو لفظ ہیں، رسول اور وکیل۔ ان کے دونوں کے تصرفات اپنے لئے نہیں بلکہ دوسروں کے لئے ہوتے ہیں، مگر دونوں میں ایک جوہری فرق ہے۔ وکیل کا تصرف بہ نسبت رسول کے زیادہ وسیع اور زیادہ طاقتور ہوتا ہے وکیل اپنے مؤکل کی جانب سے مختار ہوتا ہے۔ جو چاہے بطور خود بھی کر سکتا ہے رسول صرف اس امانت کو پہنچا دینے کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ جو اس کے سپرد ہوتی ہے قرآن نے بتایا ہے کہ آپ اللہ سبحانہٗ کے رسول ہیں وکیل نہیں ہیں مَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ وَكِيْلًا۔ وکالت تو بڑی بات ہے رسولوں میں یہ حوصلہ بھی نہیں ہوتا کہ بے محابا جب چاہیں اللہ سبحانہٗ سے بات کر لیں اس لئے ان کی برداشت کے بقدر اپنے سے ہم کلامی کی صورتیں مقرر کر دی ہیں، اللہ سبحانہٗ کی سنت

یہی ہے کہ رسولوں کو وحی کے ذریعے عالمِ غیب کی باتوں سے مطلع کرتا ہے ۔

جس طرح رسول مختار اور وکیل نہیں ہوتا، اسی طرح وہ صرف ایک مصلح اور ریفارمر بھی نہیں ہوتا۔ ایک ریفارمر اور رسول میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ ریفارمر کی پرورش عام انسانوں کی طرح ہوتی ہے۔ جب کہ رسولوں کی تربیت صفت اصطفاء و اجتباء کے ماتحت ہوتی ہے۔ ان کی نشست و برخاست اور ہر قول و فعل کی اللہ سبحانہٗ نگرانی فرماتا ہے اسی حفاظت کی وجہ سے ان کو مقامِ عصمت حاصل ہوتا ہے

رسالت بندوں کی طرف اللہ سبحانہٗ کی سفارت ہے۔ سفیر کے لئے قابل ہونا تو ضروری ہے۔ مگر ہر قابل کے لئے سفیر ہونا ضروری نہیں ہے یہ سرکار کی اپنی مصلحت اور صوابدید پر موقوف ہے کہ وہ کس کو اس کا اہل سمجھتا ہے۔ خدا کی زمین پر جس قدر رسول آئے ہیں، آپ سب کی سیرت کا بالتفصیل مطالعہ کیجئے لیکن آپ کو یہ کہیں ثابت نہیں ہوگا کہ کبھی کو منصب رسالت کسی رسول کی اتباع کے صلہ میں ملا ہو۔ لفظ رسول کی معنویت بھی یہ بتاتی ہے کہ وہ اس لئے آتا ہے کہ لوگ اس کے توسل سے شریعت پر عمل کرنا اور اللہ سبحانہٗ کی عبادت کرنا سیکھیں اس لئے نہیں کہ شریعت پر عمل کر کے یہ خود خدا کے رسول بن جائیں ۔

خلافت و رسالت میں فرق ہے رسول اپنا خلیفہ خود بنا سکتا ہے مگر رسول کسی کو رسول نہیں بنا سکتا مطلب یہ ہے کہ رسالت نہ پہلے کسب و ریاضت کا نتیجہ تھی نہ اب ہے ہاں پہلے منصب نبوت باقی تھا۔ اس لئے دعا کا موقعہ بھی تھا۔ اب چونکہ منصب نبوت ہی نہیں رہا اس لئے رسالت کی دعا بھی نہیں کی جا سکتی۔ ہاں اس کی جگہ خلافت باقی ہے
اور وہ تاقیامت رہے گی۔ 19

ظن گمان، خیال، اٹکل، تخمینی بات، علم یقین، شک، وہ اعتقاد راجح جس میں اس کے خلاف ظہور پذیر ہونے کا بھی احتمال ہو۔ قاضی ابوبکر بن العربیؒ نے احکام القرآن میں ظن کی جو تعریف کی ہے وہ منطقی ہے۔ جسے اصولیین نے اختیار کیا ہے۔ لیکن قرآن حکیم میں ظن کا استعمال ہر جگہ اس معنے میں نہیں ہے چنانچہ حافظ سیوطیؒ الاتقان میں فرماتے ہیں۔

ظن کے معنے اصل میں اعتقاد راجح کے ہیں یعنی گمان غالب اور کبھی یقین کے معنے میں بھی آتا ہے جیسے اَلَّذِیْنَ یَظُنُّوْنَ اَنَّھُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّھِمْ۔ ابن ابی حاتمؒ

نے امام مجاہدؒ سے نقل کیا ہے کہ قرآن میں ظن کا استعمال یقین کے معنے میں ہوا ہے۔ لیکن یہ کلیہ نہیں ہے۔ زرکشیؒ نے برہان میں لکھا ہے کہ قرآن میں اس فرق کو سمجھنے کے لئے ظن کہاں یقین کے معنے میں ہے اور کہاں شک کے معنے میں ہے دو ضابطے یاد رکھنے چاہئیں۔

۱۔ جہاں ظن کی تعریف آئی ہے اور اس پر ثواب کا وعدہ فرمایا گیا ہے وہاں یقین مراد ہے اور جہاں اس کی مذمت ہو اور اس پر عقاب کی دھمکی ہو وہاں شک کے معنے ہیں۔

۲۔ ہر وہ ظن جس کے بعد اَن خفیفہ ہوگا وہاں شک کے معنے ہوں گے اور ہر وہ ظن جس کے بعد اِنَّ مشددہ ہوگا وہاں یقین کے معنے ہوں گے۔

علامہ سید مرتضیٰ زبیدیؒ تاج العروس میں لکھتے ہیں کہ:

بصائر میں ہے کہ ظن قرآن میں چار طرح استعمال ہوا ہے۔ یقین کے معنے میں، شک کے معنے میں، تہمت کے معنے میں اور گمان کرنے کے معنے میں

امام راغب اصفہانیؒ فرماتے ہیں نشانات اور علامات سے جو کچھ حاصل ہو اس کا نام ظن ہے۔ جب علامات طاقتور ہوں تو اسی کا نام علم ہے اور اگر علامات کمزور ہوں تو اس کا نام وہم ہے پھر جب ظن قوی ہوتا ہے یا قوی کی طرح اس کا تصور کیا جاتا ہے تو اس کے بعد اِنَّ مشددہ اور وہ اَنْ آتا ہے جس کو مشددہ سے مخفف کیا گیا ہو۔ اور اگر ظن ضعیف ہوتا ہے۔ تو پھر اس کے ساتھ اَن کا استعمال ہوتا ہے۔ غرض ظن قرآن میں صرف گمان، شک کے معنے میں نہیں بلکہ علم و یقین کے معنے میں بھی آتا ہے

۲۰ عمل صالح

قرآن کا بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ انسان کی نجات دو چیزوں پر موقوف ہے۔ ایک ایمان اور دوسرا عمل صالح۔ ایمان بنیادی اصولوں پر یقین رکھنے کا نام ہے اور عمل صالح ان اصولوں کے مطابق عمل کا۔ کسی بات کا تنہا علم و یقین کامیابی کے لئے کافی نہیں ہے۔ جب تک اس علم و یقین کے مطابق عمل بھی نہ ہو۔ قرآن نے نجات کا مدار صرف ایمان پر نہیں بلکہ ایمان کے ساتھ عمل صالح پر بتایا ہے اور یہی سب سے بڑی صداقت ہے۔

ہر قسم کی کامیابی کا دارومدار ان ہی دو باتوں پر ہے کوئی بیمار صرف اصول طب کی صحت ماننے سے بیماری سے

نجات نہیں پا سکتا جب تک وہ ان اصولوں کے مطابق عمل بھی نہ کرے۔ اسی طرح صرف اصولِ ایمان کو تسلیم کر لینا انسانی فوز و فلاح کے لئے کافی نہیں ہے جب تک ان اصولوں کے مطابق پورا پورا عمل نہ کرے اس دنیا میں ہر چیز کو ہمارے مادی اسباب کے تابع فرمایا ہے۔ یہاں کی کامیابی صرف دینی عقیدے سے حل نہیں ہو سکتی جب تک اس عقیدے کے مطابق عمل بھی نہ ہو۔ صرف اس یقین سے کہ روٹی ہماری بھوک کا قطعی علاج ہو ہماری بھوک اس وقت تک رفع نہیں ہو سکتی جب تک اس کے لئے جدو جہد نہ کریں۔ اس عقیدے سے کہ ہمارے ٹانگیں ہم کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتی ہیں۔ ہم ایک جگہ سے دوسری جگہ نہیں پہنچ سکتے جب تک ہم اس یقین کے ساتھ خود بھی حرکت نہ کریں اسی طرح اس دنیا میں عمل کے بغیر تنہا ایمان کامیابی کے حصول کے لئے بیکار ہے البتہ اس قدر درست ہے کہ جو ان اصولوں کو صرف صحیح باور کرتا ہے۔ وہ اس سے بہر حال بہتر ہے جو ان کو سرے سے مانتا ہی نہیں ہے کیونکر

اہل الذکر کے کبھی نہ کبھی راہ راست پر آنے کی توقع ہو سکتی ہے اور دوسرے کیلئے تو ابھی پہلی ہی منزل باقی ہے۔ اس لئے آخرت میں بھی وہ منکر کے مقابلے میں شانہٗ اللہ تعالیٰ کے کرم و فضل کا زیادہ مستحق قرار پائے ——

عمل صالح کا مفہوم ذرا بہت وسیع ہے۔ اس میں انسانی اعمال خیر کی تمام جزئیات داخل ہیں۔ فقہا نے اصطلاحاً اعمال صالح کی دو قسمیں بتائی ہیں۔ ایک وہ جس کا تعلق خاص اللہ سبحانہٗ سے ہے اس کو عبادت کہتے ہیں۔ دوسری جس کا تعلق اس کے بندوں سے ہے اس کی بھی دو قسمیں ہیں ایک وہ جس کی حیثیت صرف انسان کے ذاتی فرض کی ہے اور دوسری وہ جس کا تعلق دوسرے کے حق سے ہے۔ پہلے کا نام اخلاق اور دوسرے کا حقوق ہے - - - - انکار و نظریات اور اعمال صالح کی ان تینوں اقسام کے مجموعہ کا نام دین ہے۔ یہ ہماری شومیٔ قسمت ہے کہ عبادات، اخلاق اور حقوق میں ہمارے روابط دین سے ٹوٹ چکے ہیں اور اب ہم اس کوشش میں ہیں کہ اس دین سے جو روابط ہمارے بچے ہوئے ہیں ان کو بچا لیں اور باقی سے دین کے تقاضے کہہ کر پیچھا چھڑا لیں۔

ہمارے ایک معاصر دین کی حقیقت

سمجھاتے ہوئے رقمطراز ہیں :۔

اصل دین اللہ سبحانہ کے آگے جھکنا اور جزا و سزا کے اعتقاد کے ساتھ اللہ رب العزت کے لئے اپنے دل میں اشتیاق و محبت کی ایک کیفیت پیدا کرنا ہے ۔

یہ صورتِ حال فی الحقیقت ہمارے دماغی تنزل کا قدرتی نتیجہ ہے ہم نے جب دیکھا کہ قرآن کے مطالبہ ایمان عمل صالح اور عمل ہیں اعمال ، اخلاق اور حقوق کا ساتھ نہیں دے سکتے تو کوشش کی کہ قرآن کو اس کی بلندیوں سے نیچے اتار لیں کہ ہماری پستیوں کا ساتھ دے سکے ۔ (فاللہ والی المشتکی)۔ ۲

غیب پوشیدہ ہونا ، غیر حاضر ہونا ، انسان کے علم و احساس سے بالا ہونا ۔ وہ چیزیں جو آدمی کی حس اور عقل رسائی سے خارج ہیں اور جن کا علم انبیاء کی اطلاع کے بغیر نہیں ہوسکتا ۔ قرآن کی اصطلاح میں غیب اجمالی اور تفصیلی معنے میں استعمال ہوا ہے ۔ اجمالاً اس کا اطلاق ان امور پر ہوتا ہے جن کا علم انسان اپنے علم کے عام اور طبعی و فطری ذریعوں سے حاصل نہیں کرسکتا ۔ انسانی علم کے طبعی ذریعے وجدان ، حواس اور عقل و استدلال وغیرہ ہیں ۔ ان طبعی ذریعوں سے جو ہر انسان کو ملے ہیں جو علم حاصل نہیں ہوتا اس کو علم غیب کہتے ہیں یعنی اس شے یا ان اشیاء کا علم جو انسان کے ظاہری و باطنی حواس اور دماغی قویٰ کی نگاہوں کے سامنے سے غائب ہیں اور اس کا مقابل لفظ شہادت ہے جس کے معنے حاضر ہونے کے ہیں ۔ یعنی وہ اشیاء جو ہر انسان کے حواس اور قوائے دماغی کے سامنے ہیں ۔ اسی لئے قرآن میں بار بار اللہ تعالیٰ نے اپنے کو عالم الغیب والشہادۃ کہا ہے ۔ یعنی انسانوں کے طبعی ذرائع علم کے سامنے جو حاضر ہے اور جو غائب ہے ان سب کا عالم اور واقف کل وہی ہے ۔ الغرض اجمالاً علم غیب اسی غیبی طریقۂ علم کا نام ہے جو عام انسانوں کو نہیں ملا ہے ۔ تفصیلی حیثیت سے قرآن میں غیب کا اطلاق چار چیزوں پر ہوا ہے ۔

۱ ۔ زمانہ ماضی کے واقعات جن کا علم بعض کو نہ تو حواس کے ذریعے ہوسکتا ہے اور نہ عقل و فکر کے ذریعے ۔ اگر ہوسکتا ہے تو تحریر و روایت کے ذریعے ۔ لیکن جس کے لئے خود تحریر و روایت کا ذریعہ یقینی طور پر مفقود ہو تو اس کے لئے ان کا علم صرف

غیبی ذریعہ ہی سے ہو سکتا ہے۔ اور بس
قرآن میں حضرت نوح علیہ السلام، حضرت
مریم علیہ السلام اور حضرت یوسف علیہ
السلام کے واقعات بیان کرنے کے بعد
ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ
اِلَيْكَ میں اسی طرف اشارہ ہے۔

۲ اسی طرح آئندہ جو واقعات ہونیوالے
ہیں ان کو بھی غیب کہا گیا ہے ان کا علم
دلائل و قیاس کے طبعی ذرائع کے علاوہ
غیر طبعی ذریعہ سے ہوا ہو تو اس کو بھی
علم غیب کہیں گے۔ قرآن میں ایک
موقع پر ان کفار کے جواب میں جو نشانیوں
کے طالب ہیں یہ کہا گیا فَقُلْ اِنَّمَا
الْغَيْبُ لِلّٰهِ ۔ اسی طرح قیامت کو بار
بار غیب کہہ کر غیر خدا سے اس کے
علم کی نفی کی گئی ہے۔

۳۔ ان چیزوں پر بھی غیب کا اطلاق
کیا گیا ہے۔ جو اگرچہ ماضی اور مستقبل
میں نہیں بلکہ زمانہ حال میں موجود ہیں
تاہم انسان کے حواسِ خمسہ اور عقل کی
محدود طاقت سے ان کا علم نہیں ہو
سکتا۔ اس لئے زمانہ حال کے علم کے
لئے جو طبعی شرائط اور قیود ہیں۔ ان
کے بغیر جو علم حاصل ہو گا وہ غیب ہو گا

۴۔ عالم غیب کی آخری چیز وہ امور ہیں
جو غیر مادی ہونے کی وجہ سے ہمارے
حواس اور عقل کے تنگ دائرہ عمل سے
قطعاً باہر ہیں۔ ہم فرشتوں کو نہیں دیکھتے
خدا کی رویت کی صلاحیت نہیں رکھتے۔
جنت و دوزخ ہم کو یہاں نظر نہیں
آتی ہیں۔ یہ تمام امور بھی غیب ہیں۔

رسول کو اللہ سبحانہٗ غیب کی جن
باتوں سے وحی کے ذریعے آگاہ کرتا ہے
وہ ان چاروں قسم کے امور غیب ہوتے ہیں
اور ان کا علم رسول کو وحی کے مختلف اقسام
کے ذریعے عطا کرتا ہے۔ قرآن غیب کے
علم کی خدا کے سوا سب سے نفی کرتا ہے
قرآن میں بار بار حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس
اعلان کی ہدایت ہوئی ہے۔
فَقُلْ اِنَّمَا الْغَيْبُ لِلّٰهِ کہہ دو کہ غیب
خدا کے لئے ہے۔

رسول کہتا ہے۔
لَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ میں غیب دان نہیں
ہوں۔ لیکن اسی کے ساتھ دو موقعوں پر
یہ بھی کہا گیا ہے کہ بایں ہمہ خدا اپنے
برگزیدہ پیغمبر کو غیب کی اطلاع دیتا ہے
لَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ اَحَدًا اِلَّا مَنِ
ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ ـــــ اس
سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے
برگزیدہ پیغمبروں کو غیب کی باتوں کی

اطلاع دیتا ہے اس لئے جن آیات میں غیب دانی کی نفی کی گئی ہے ان سے مراد یہ ہے کہ پیغمبروں کو خود بخود غیب کا علم نہیں ہے البتہ اللہ سبحانہٗ وحی کے ذریعے پیغمبر کو اس کا علم عطا ہوتا ہے اور وحی پیغمبر کی اختیاری چیز نہیں ہے بلکہ یہ اللہ سبحانہٗ کے صوابدید پر موقوف ہے کہ اپنے غیب میں سے جتنا چاہے اور جب چاہے وحی کے ذریعے بتا دے ۔ بایں ہمہ بعض باتوں کے بارے میں یہ قطعی طور پر فیصلہ کر دیا ہے کہ ان کا علم کسی کو نہیں ہے ۔

(۲) **نسخ** لغت میں زائل کرنے اور مٹانے کو کہتے ہیں ـــــ نسخ دو طرح کا ہے ۔ نسخ شرائع ۔ نسخ احکام ۔

نسخ شرائع کا مطلب یہ نہیں ہے کہ شریعت کو اس کے غلط ہونے یا غیر مفید ہونے کی وجہ سے سرے سے مٹا کر کسی دوسری شریعت کو نافذ کر دیا بلکہ مطلب یہ ہے کہ صرف احکام کی جگہ پہ اصل احکام کے دوبارہ نازل ہونے اور دنیا کے حسب حال ناقص کی جگہ کامل اور کامل کے بدلے کامل تر تعلیمات دینے کئے ہیں ۔ اس لئے قرآن پاک کے ناسخ کتب ہونے کے معنے ان کو مٹا دینے والے کے نہیں بلکہ ان کی تکمیل کرنے والے کے ہیں ـــــ مذاہب کی تاریخ جب سے شروع ہوتی ہے ہر مذہب اور اس کی کتاب انسانی عروج و ترقی کی ایک ایک منزل ہے اور قرآن میں اس عروج و ترقی کی وہ انتہائی منزل مقصود ہے جس کے بعد تکمیل دین کی سرحد ختم ہو جاتی ہے ۔ جب کہ خود قرآن کا دعویٰ ہے اور اس دعوے میں کوئی اور کتاب اس کی شریک نہیں ہے ۔ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ ۔

نسخ احکام سے مقصود اصطلاح میں کسی عملی حکم کی مدت کی انتہا بیان کرنا جو تمام شروط کو جامع ہو کیونکہ واقعات و قصص یا امور قطعیہ و عقلیہ میں نسخ ممکن نہیں ہے مثلاً یہ کہ اللہ سبحانہٗ موجود ہے اس کا نسخ نہیں ہے ۔ ایسا ہی امور حسیہ میں نسخ نہیں ہو سکتا ۔ اسی طرح دعاؤں میں اور اُن احکام میں جو اپنی ذاتی حیثیت سے واجب ہیں ۔ ایسے ہی ان احکام میں بھی نسخ ممکن نہیں جو دائمی اور ابدی ہیں اور ان احکام

میں جن کا وقت مقرر ہے اس مقررہ وقت سے پہلے نسخ ممکن نہیں ہے بلکہ نسخ صرف اُن احکام میں ہو سکتا ہے جو عمل اور وجود و عدم دونوں کا احتمال رکھتے ہوں۔ نہ دائمی ہوں اور نہ کسی وقت کے ساتھ مخصوص کیئے گئے ہوں۔ ایسے احکام کو احکام مطلقہ کہتے ہیں۔ ان میں یہ بات ضروری ہے کہ زمانہ اور مکلف اور صورت متحد نہ ہوں بلکہ تینوں میں اختلاف ہو یا بعض میں۔

نسخ اصطلاحی کے یہ معنے ہرگز نہیں ہیں کہ پہلے خدا نے کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کا حکم دے دیا مگر خدا کو اس کا انجام معلوم نہ تھا پھر خدا کی رائے اس کے خلاف قائم ہوئی اس لئے پہلے حکم کو ختم کر دیا۔ یا پہلے کسی کام کے کرنے کا حکم دیا۔ پھر اس کو تینوں باتوں میں اتحاد کے باوجود منسوخ کر دیا۔ ایسا نسخ ہمارے نزدیک جائز نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کی شان اس عیب سے بلند و بالا ہے۔ نسخ کا مطلب صرف یہ ہے کہ خدا کو پہلے یہ بات معلوم تھی کہ یہ حکم انسانوں میں فلاں وقت تک باقی رہے گا پھر ختم کر دیا جائے گا۔ وقت ختم ہونے پر دوسرا حکم آ جاتا ہے۔ جس سے کمی بیشی ہوتی یا حکم کے بالکلیہ ختم ہونے کا علم ہو جاتا ہے تو درحقیقت نسخ صرف پہلے حکم کی مدت اور انتہا کا نام ہے۔ چونکہ ہمیں پہلے حکم کی مدت کے اختتام کا علم نہیں ہوتا اس لئے دوسرا حکم آنے پر ہم خیال کرتے ہیں کہ حکم تبدیل ہو گیا ہے۔ حالانکہ واقع میں حکم نہیں بدلا بلکہ حکم کی مدت ختم ہوئی ہے۔ (اظہار الحق ج ۲ ص ۹۸)

حضرت شاہ ولی اللہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں نسخ کے عنوان پر تفصیلی بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ قرآن کے زمانہ نزول میں نسخ دو طرح سے ہوا ہے

۱- ایک یہ کہ نگاہ نبوت عمومی نظامِ طاعت کے پیش نظر قانون الٰہی کے مزاج کے مطابق عمل کا ایک پیمانہ تجویز کرتی ہے اور اس کا مبنیٰ خود نبوت کا اپنا اجتہاد ہوتی ہے۔ بعد ازیں اللہ سبحانہٗ مسئلہ میں اصل حکم سے نبوت کو مطلع فرماتے ہیں اور اس کے نتیجہ میں نبوت کے اجتہاد پر مبنی سابقہ حکم ختم ہو جاتا ہے۔

۲- دوسرے یہ کہ کوئی حکم مصالح

اور مفاسد کے پیش نظر دیا گیا ہے
وقت گذرنے کے ساتھ مصالح
یا مفاسد تبدیل ہو جاتے ہیں، اس
کے ساتھ پہلے حکم کی مدت ختم ہو
جاتی ہے اور دوسرا حکم آجاتا ہے
دونوں کی شاہ صاحبؒ نے مثالیں
بھی دی ہیں۔ یہاں تک جو کچھ بتایا
گیا ہے، اس کا تعلق پورے نظام
شریعت سے ہے اور اس میں
ابومسلم اصفہانی کو چھوڑ کر امت میں
کبھی دو رائیں نہیں ہوئی ہیں سب
مانتے ہیں کہ شریعت میں نسخ ہوا ہے
باقی رہا موجودہ قرآنی آیات میں
نسخ کا مسئلہ، تو اس میں البتہ علماء کا
اختلاف ہے۔ کچھ کے خیال کے مطابق
پانچ سو آیات تک منسوخ ہیں لیکن محققین
نے اس کو تسلیم نہیں کیا ہے۔ علامہ ابن
العربیؒ نے اس کا انکار کیا ہے اور
آخر میں صرف بیس آیات کو منسوخ
قرار دیا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ
رحمۃ اللہ علیہ نے ان بیس آیات کے
نسخ کو بھی ناقدانہ بصیرت سے
محل نظر بتایا ہے اور لکھا ہے۔
کہ:۔

وعلى ما حررنا لا
يتعين النسخ الا فى
خمس آيات۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سُورۂ فاتحہ کی رُوح

یہ سُورت خُدا تعالیٰ نے بندوں کی زبان سے فرمائی کہ جب ہمارے دربار میں حاضر ہو تو ہم سے یُوں سوال کیا کرو۔ اس لیئے اس سُورت کا نام تعلیم مسئلہ بھی ہے۔ اس سُورت کے آخر میں آمین کہنا مسنون ہے۔ اور یہ لفظ قرآن شریف سے خارج ہے۔ معنے اس لفظ کے یہ ہیں کہ الٰہی ایسا ہی ہو۔ یعنی مقبول بندوں کی پیروی اور نافرمانوں سے علیحدگی میسر ہو۔ اس سُورت کے اوّل نصف میں اللہ تعالیٰ کی ثنا و صفت اور دوسرے حصّہ میں بندہ کی دُعا ہے۔[1]

سورۂ فاتحہ میں پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا ہے پھر صرف اللہ ہی کی عبادت کا اقرار اور اس کا اظہار ہے کہ اس کے سوا کسی کو اپنا حاجت روا نہیں سمجھتے یہ گویا حلفِ وفاداری ہے جو انسان اپنے رب کے ساتھ کرتا ہے۔ اس کے بعد ایک اہم دُعا ہے جو تمام انسانی مقاصد و ضروریات پر حاوی ہے۔[2]

دراصل یہ ایک دُعا ہے جو خدا نے ہر اس انسان کو سکھائی ہے جو اس کتاب کا مطالعہ شروع کر رہا ہو۔ کتاب کی ابتدا میں اس کو رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم واقعی اس کتاب سے فائدہ اُٹھانا چاہتے ہو تو پہلے خداوندِ عالم سے یہ دُعا کرو ——— سورۂ فاتحہ ایک دُعا ہے بندے کیجانب سے اور قرآن اس کا جواب ہے اللہ تعالیٰ کی جانب سے۔[3]

سورۂ فاتحہ ایک دُعا ہے، فرض کرو ایک انسان کے دل و زبان سے یہی دُعا شب و روز نکلتی رہتی ہے اس صُورت میں اس کے فکر و اعتقاد کا کیا حال ہو گا۔ وُہ خدا کی حمد و ثنا میں نغمہ سنج ہے پھر اسے اس کی صفتوں سے پُکارنا چاہتا ہے لیکن اس کی تمام صفتوں میں سے صرف رحمت، عدالت ہی کی صفتیں اسے یاد آتی ہیں۔ پھر وُہ اپنا سرِ نیاز جھکاتا اور اس کی عبودیت کا اقرار کرتا ہے پھر وُہ خدا سے سیدھی راہ چلنے کی توفیق مانگتا ہے۔ لیکن کون سی سیدھی راہ وُہ راہ جو تمام دُنیا کے مذہبی رہنماؤں اور

---

[1] حاشیہ شیخ الہند صا　[2] معارف القرآن م ش ص۲۷　[3] تفہیم القرآن صبا

تمام راست باز انسانوں کی راہ ہے اسی طرح وُہ محرومی اور گمراہی سے پناہ مانگتا ہے[1]

یہ دُعا، اسلام کی تمام تعلیمات کا عطر اور خلاصہ ہے۔ خدا کی حمد و ستائش ہے، توحید ہے، اعمال کی جزا و سزا کا یقین ہے۔ عبادت کی مخلصانہ ادائیگی کا اقرار ہے، توفیق و ہدایت کی طلب ہے، اچھوں کی تقلید کی آرزو اور بُروں کی پیروی سے بچنے کی تمنا ہے۔ جس وقت اس دُعا میں خدا کی پہلی صفت کُل جہانوں کا مربی زبان پر آتی ہے تو اس کی تمام قدرتیں اور بخششیں سب سامنے آجاتی ہیں۔ جہانوں کی وسعت کے تخیل سے اس کی عظمت و کبریائی کی وسعت کا تخیل پیدا ہوتا ہے۔ سارے جہانوں کے ایک ہی پروردگار کے تصور سے کل کائناتِ ہستی کی برادری کا مفہوم ذہن میں آتا ہے۔ انسان ہوں کہ حیوان پھر انسانوں میں امیر ہوں یا غریب، مخدوم ہوں یا خادم بادشاہ ہوں یا گدا کالے ہوں یا گورے عرب ہوں یا عجم کُل مخلوقات کی برادری کی حیثیت یکساں معلوم ہوتی ہے۔ خدا کو رحمان و رحیم کہہ کر پکارنے سے اس کی بے پایاں رحمت اور ناقابلِ بیان کیف و محبت کا سمندر دل کے کوزے میں موجزن ہوجاتا ہے۔ روزِ جزا کے مالک کا خیال ہم کو اپنے اپنے اعمال کی ذمہ داری اور مواخذہ سے مرعوب کر دیتا ہے "ہم تجھی کو پُوجتے ہیں کہہ کر ہم اپنے دل کی زمین سے ہر قسم کے شرک کو بیخ و بُن سے اُکھاڑ دیتے ہیں۔ "ہم تجھی سے مدد چاہتے ہیں" کہہ کر ہم تمام دنیوی سہاروں کو حقیر سمجھتے ہیں اور صرف خدا کا آسرا تلاش کرتے ہیں۔ سب سے آخر میں ہم سیدھی راہ پر چلنے کی توفیق چاہتے ہیں۔[2]

---

[1] ترجمان القرآن ملخصاً صـ۲۲۳ [2] سیرۃ النبیؐ صـ۹۹

سورۃ فاتحہ کی عظمتِ شان

نام

یہ قرآن کی سب سے پہلی سورت ہے اس لیئے اس کا نام فاتحہ ہے کیونکہ قرآن کا آغاز اس سے ہوتا ہے —— اس کے علاوہ بھی اس کے بہت سے نام احادیث میں آئے ہیں۔ حافظ ابنِ حجر عسقلانی نے اُم القرآن، کنز القرآن، وافیہ، شافیہ، کافیہ، سورۃ الحمد، سورۃ الصلاۃ، سورۃ الشفا، الاساس، سورۃ الشکر اور سورۃ الدعا ر لکھے ہیں۔

اُم القرآن اسے کیوں کہتے ہیں اس لیئے کہ ہر وُہ شئے اُم کہلاتی ہے جس کی طرف اس سے تمام چیزیں ملا دی جائیں۔ چونکہ قرآن کی تمام سورتیں نمازیں اٹھ اٹھ کر سورہ فاتحہ سے ملتی ہیں اور سورہ فاتحہ اپنی جگہ قائم رہتی ہے اس لیئے اسے اُم القرآن کہا گیا ہے۔

اور اس لیئے کہ

عربی میں اُم کا اطلاق ایسی تمام چیزوں پر ہوتا ہے جو ایک طرح کی جامعیت رکھتی ہوں یا بہت سی چیزوں میں مقدم ہوں یا پھر کوئی ایسی اُوپر کی چیز ہو جس کے نیچے اس کے بہت سے توابع ہوں چنانچہ سر کے درمیانی حصے کو اُم الراس کہتے ہیں، فوج کے جھنڈے کو اُم کہتے ہیں اور مکہ کو اُم القریٰ کہتے تھے۔ پس اس سُورت کو اُم القرآن لکھنے کا یہ مطلب ہوا کہ یہ ایک ایسی سورت ہے کہ جس میں مطالبِ قرآنی کی جامعیت ہے۔ [1]

اور اس لیئے کہ

یہ سُورت ایک حیثیت سے پُورے قرآن کا متن ہے اور سارا قرآن اس کی شرح ہے کیونکہ پُورے قرآن کے مطالب ایمان اور عملِ صالح میں دائر ہیں اور ان کے بنیادی اصول اس سُورت میں بیان کر دیئے ہیں۔ [2]

---

[1] ترجمان القرآن ص۲۶ [2] معارف القرآن ش ص۱۵

قرآن نے سورۂ فاتحہ کا ذکر ایسے لفظوں میں کیا ہے جس سے اس کی عظمتِ شان کا پتہ چلتا ہے۔

ولقد اٰتیناك سبعاً من المثانی والقرآن العظیم۔

اے پیغمبر ہم نے تم کو سات دُہرائی جانے والی چیز اور قرآنِ عظیم دیا ہے۔

احادیث و آثار سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ اس آیت میں سات دُہرائی جانے والی چیزوں سے مُراد یہی سُورت ہے کیونکہ یہ سات آیتوں کا مجموعہ ہے اور ہمیشہ نماز میں دُہرائی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس سُورت کو السبع المثانی بھی کہتے ہیں۔

ابوسعید بن المعلٰی کہتے ہیں کہ میں مسجد میں نماز پڑھ رہا تھا حضورِ انور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے مجھے پکارا۔ میں نے جواب نہ دیا۔ (نماز پوری کر کے حاضر ہوا اور) عرض کیا یا رسول اللہ میں نماز پڑھ رہا تھا۔ آپ نے فرمایا کیا اللہ سبحانہٗ کا یہ ارشاد نہیں ہے استجیبوا للّٰہ وللرسول اذا دعاکم۔ اللہ اور اس کا رسول جب پکاریں تو ان کو جواب دو پھر آپ نے فرمایا میں تمہیں قرآن کی ساری سورتوں میں عظیم تر سُورت مسجد سے باہر جانے سے پہلے بتاؤں گا۔ پھر آپ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا جب مسجد سے باہر تشریف لے جانے لگے میں نے عرض کیا آپ نے مجھے قرآن کی عظیم تر سورت بتانے کو فرمایا تھا۔ ارشاد ہوا الحمد للہ رب العالمین۔ یہی سبع مثانی ہے اور وُہ قرآنِ عظیم ہے جو مجھے دیا گیا ہے۔[1]

---

[1] ترجمان القرآن صـ۲۵

سُورۂ فاتحہ کا تقابلی مطالعہ

سورۂ فاتحہ ایک خالص دُعائی پیمانہ ہے اور دُعاؤں کی دُنیا میں تمثیلی شکل کی آئینہ دار ہے۔ وُہ مختصر ہے اور تاثیر سے لبریز ہے۔ اللہ کی تمام صفاتِ کاملہ کا مرقع ہے۔ تمام مقاصد اور احکامِ شریعت کی جامع ہے۔ اس کے الفاظ میں ایسی عالمگیری ہے جو ہر وقت ہر حالت میں ہر انسان کے دِل کی نمائندگی کر سکتی ہے۔ ایسے استعارات سے پاک ہے جو ظاہر بینوں کی لغزش کا باعث ہوں۔ اور اللہ کو انسانوں سے رحم و کرم کی صفت قرض لینے پر آمادہ کرتے ہوں۔ نیز وُہ اللہ کی رحمتِ عام کو ایسے عنوان سے ادا کرتی ہے جس میں کائنات کا ایک ایک ذرہ داخل ہے۔ اللہ تعالیٰ کی وُہ تین صفتیں جن کا تصور کیے بغیر اللہ کی معرفت پوری نہیں ہو سکتی ——— یعنی ربوبیت، رحمت اور مالکیت۔ یہ سورت ان سب کی جامع ہے۔ ربوبیت میں وُہ تمام صفتیں داخل ہیں جن کا تعلق پیدائش سے لے کر موت تک ہر مخلوق کے ساتھ قائم رہتا ہے۔ رحمت اس کی وُہ عالمگیر صفت ہے جس میں اس کی تمام اجمالی صفتوں کی نیرنگیاں ظاہر ہوتی ہیں۔ مالکیت اس کی تمام جلالی صفتوں کا مظہر ہے۔ اور پُوری سُورت دُعا کے اغراضِ ثلاثہ حمد، اچھائیوں کے لیے درخواست اور بُرائیوں سے بچانے کی التجا پر مشتمل ہے۔ طرزِ بیان خدا اور بندے کے شایانِ شان ہے۔ درخواستیں حد درجہ مؤدبانہ ہیں۔ اوصافِ الٰہی وُہ ہیں جو ایک دُعا کے مناسب ہو سکتے ہیں۔ دُعا میں عموم ہے وُہ ذاتیات تک محدود نہیں ہے۔ للّٰہیت اور روحانیت کا کمال منتہائے نظر ہے۔ اس لیے دُنیا کی چیزوں کا ذکر نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ اللہ کے اوصاف اور بندے کی التجاؤں میں کمیت اور کیفیت دونوں حیثیتوں سے تناسب موجود ہے ——— یعنی دونوں حصوں نے مناسب جگہ گھیری ہے اور دونوں ٹکڑوں کے مضامین میں ربط اور تعلق قائم ہے۔ اللہ کی عظمت و جلال، رحم و کرم، قدرت و شوکت، شفقت و رافت اور بندے کے خشوع و خضوع، بلند حوصلگی، صداقت طلبی کا ایسا جامع، مختصر اور پُر اثر بیان سورۂ فاتحہ کے سوا کہاں مل سکتا ہے۔[1]

---

[1] سیرت النبی ص۱۰۲ ج ۵

یہ خوش عقیدگی نہیں اظہارِ حقیقت ہے کہ جس حیرت انگیز ایجاز و جامعیت کے ساتھ سورۂ فاتحہ کی سات مختصر آیتوں میں توحیدِ الٰہی اور صفاتِ کمالیہ کو بیان کیا ہے اس کی نظیر سے مذاہب عالم کے دفتر خالی ہیں اور اس سے بڑھ کر تو گویا اس کے برابر بھی مثال پیش کرنے سے دُنیائے مذاہب عاجز ہے۔ مسیحی دُنیا کو بڑا ناز اپنی انجیلی دُعا پر ہے۔ یہاں اس کے الفاظ سورۂ فاتحہ کے مقابلے میں درج کیئے جاتے ہیں۔ ہر منصف مزاج خود فیصلہ کر سکتا ہے کہ قرآن کی فاتحۃ الکتاب اور اس انجیلی دُعا کے درمیان کیا مناسبت ہے۔

سورۂ فاتحہ	انجیلی دُعا (متی)
۱۔ ساری کی ساری تعریف اللہ کے لیئے ہے جو سارے جہانوں کا مربی ہے۔	اے ہمارے باپ تو جو آسمانوں پر ہے تیرا نام پاک مانا جائے۔
۲۔ وُہ نہایت مہربان اور بے حد رحم کرنے والا ہے۔	
۳۔ مالک روزِ جزا ہے۔	تیری بادشاہت آئے تیری مرضی جیسے آسمانوں پر پُوری ہوتی ہے زمین پر بھی پُوری ہو۔
۴۔ بس ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں۔	
۵۔ چلا ہم کو سیدھے راستے پر۔ ۶۔ ان لوگوں کا راستہ جن پر تُو نے انعام کیا۔	ہماری روز کی روٹی آج ہمیں دے دے۔ جس طرح ہم نے اپنے قرضداروں کو معاف کیا ہے تو ہمارے قرض ہمیں معاف کر دے۔ اور ہمیں آزمائش میں نہ لا بلکہ بُرائی سے بچا۔
۷۔ وُہ انعام یافتہ ایسے ہوں جو نہ تیرے معتوب ہوئے ہوں اور نہ گمراہ ہوں [1]	

زمانۂ نزول

یہ پُوری سُورت مکمل طور پر نازل ہوئی ہے اور اس کا زمانۂ نزول آغازِ نبوت کا دور ہے۔ اگرچہ

[1] تفسیر ماجدی

سُورۂ اِقْرَأ کی چند آیات پہلے غارِ حرا میں نازل ہو چکی تھیں۔ لیکن چند روز کے بعد پُوری سُورۂ فاتحہ مع بسم اللہ کے نازل ہوئی۔ اس وقت نبوّت کو دو ساتھی ایک مرد اور ایک عورت مِل چکے تھے۔

ابنِ ابی شیبہ نے مصنف میں، ابونعیم اور بیہقی نے دلائل النبوّت میں بتایا ہے کہ آغاز میں جب حضرت ابوبکرؓ حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کو ورقہ کے پاس لے گئے۔ ورقہ نے آپ سے صورتِ حال دریافت کی تو آپ نے فرمایا کہ:

> جب میں تنہا ہوتا ہوں تو پیچھے سے غیبی آواز سُنتا ہوں یا محمّد یا محمّد جس کی دہشت سے میں بھاگتا ہوں۔ ورقہ نے کہا ایسا نہ کرو ٹھہر کر اس کی بات سنو اور پھر جو کہے اس کی آ کر مجھے خبر دو چنانچہ اس کے بعد آپ ایک جگہ تنہا تھے کہ آواز آئی اے محمد! یہ پڑھیئے۔ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ، اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ تا آخر سُورت۔ اس کے بعد کہا کہ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہو۔ آپ یہ سُن کر ورقہ کے پاس آئے اور سارا واقعہ بتایا۔ ورقہ نے کہا کہ اے محمد تم کو بشارت ہو اور پھر بشارت ہو۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ تم وُہی نبی ہو جس کی بشارت حضرت مسیح ابنِ مریم نے دی ہے۔ اور تمہاری شریعت حضرت مُوسیٰ کی شریعت کی طرح ہے اور میں گواہی دیتا ہوں کہ تم یقیناً نبی مُرسل ہو۔

یہ روایت بتا رہی ہے کہ سُورۂ فاتحہ کا زمانہ نزول ابتدائے نبوّت کے چند روز بعد ہے۔ جب کہ حضرت صدیقِ اکبرؓ اور حضرت خدیجہؓ مشرف بہ اسلام ہو چکے تھے اور ورقہ ابن نوفل زندہ تھے۔[1]

گویا اقرأ باسم ربك والی وحی غارِ حرا میں تکوینِ علم اور امّی میں تخلیق قرأت کے لیئے آئی تھی۔ اور سُورۂ مدثّر کی ابتدائی آیتیں بارِ نبوّت کی ذمہ داریوں کو بتانے کے لیئے آئیں اور سورۂ فاتحہ کا نزول اسی زمانے میں دینِ حق کا تمام خلاصہ سمجھانے کے لیئے ہوا۔

---

[1] معارف م ا صـ۳ ج ا

اٰیاتہا ۷ (۱) سُوْرَۃُ الْفَاتِحَۃِ مَکِّیَّۃٌ (۵) رکوعہا ۱

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان، نہایت رحم کرنے والا ہے۔

[1] قرآنِ حکیم کا یہ افتتاحی فقرہ بجز ایک سُورت کے ہر سُورت کی ابتدا میں دُہرایا گیا ہے۔ یعنی ایک سو تیرہ بار۔ اور سُورۂ نمل میں عبارت کے اندر بطور آیت قرآنی بھی آیا ہے۔ اس کے قرآن میں سے ہونے نہ ہونے کی بابت تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ البتہ گفتگو اس میں ہوئی ہے کہ آیا ہر سُورت کی ابتدا میں اس کی حیثیت بطور ایک مستقل آیت کے ہے یا نہیں[1] امامِ اعظم ابوحنیفہؒ کا مذہب یہ ہے کہ بسم اللہ بجز سُورۂ نمل کے اور کسی سورت کی آیت نہیں ہے بلکہ ایک مستقل آیت ہے جو ہر سورت کے شروع میں دو سورتوں کے درمیان فرق و تمیز کرنے کے لیے نازل ہوئی ہے۔[2]

سُنن ابی داوٗد میں باسنادِ صحیح حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ

حضرت رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم دو سورتوں کے فرق نہ جانتے تھے، یہاں تک کہ بسم اللہ نازل ہوئی۔

اسی وجہ سے بسم اللہ کو نماز میں احناف سورۂ فاتحہ کے ساتھ بآوازِ بلند نہیں پڑھتے، تاکہ جُزوِ فاتحہ ہونے کا خیال نہ ہو۔ اور اسی لیے بسم اللہ کو کسی سُورت کے ساتھ ملا کر نہیں لکھتے بلکہ ہمیشہ علیحدہ دو لائنوں کے درمیان لکھتے ہیں تاکہ سُورت کا حِصّہ ہونے کا شُبہ نہ ہو۔[3]

آغازِ قرآن میں بسم اللہ

قرآن کا آغاز بسم اللہ سے کیوں ہوا؟

[1] تفسیر ماجدی۔ [2] معارف القرآن م ش [3] معارف القرآن م ا

اس لیئے کہ اہلِ جاہلیت کی عادت تھی کہ اپنے کاموں کو بتوں کے نام سے شروع کرتے تھے۔ اس رسمِ جاہلیت کو مٹانے کے لیئے قرآن کی سب سے پہلی آیت جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر اُتری اس میں قرآن کو اللہ کے نام سے شروع کرنے کا حکم دیا گیا۔ اقرأ باسم ربك ۔ علامہ سیوطیؒ فرماتے ہیں کہ قرآن کے سوا دوسری تمام آسمانی کتابیں بھی بسم اللہ سے شروع کی گئی ہیں ——— لیکن کچھ علماء فرماتے ہیں کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم قرآن کی خصوصیات میں سے ہے [1]

ہر کام کا آغاز

یہی وجہ ہے کہ اسلام جو تہذیب سکھانا چاہتا ہے اس کے قواعد میں سے ایک قاعدہ یہ بھی ہے کہ وُہ اپنے ہر کام کی ابتداء اللہ کے نام سے کرے۔ اس کی پابندی اگر شعور و اخلاص کے ساتھ کی جائے تو اس سے تین فائدے ضرور حاصل ہوتے ہیں۔

ایک یہ کہ آدمی بہت سے بُرے کاموں سے بچ جائے گا کیونکہ اللہ کا نام لینے کی عادت اسے ہر کام شروع کرتے وقت یہ سوچنے پر مجبور کردے گی کہ کیا واقعی میں اس کام پر اللہ کا نام لینے میں حق بجانب ہوں؟

دوسرے یہ کہ جائز اور صحیح کاموں کی ابتداء کرتے ہوئے اللہ کا نام لینے سے آدمی کی ذہنیت بالکل ٹھیک سمت اختیار کرے گی اور وُہ ہمیشہ صحیح ترین نقطہ سے کام کا آغاز کرے گا۔

تیسرا اور سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ جب وُہ اللہ کے نام سے اپنا کام شروع کرے گا تو اللہ کی تائید اور توفیق اس کے شاملِ حال ہوگی۔ اس کی سعی میں برکت ہوگی [2]

گویا بسم اللہ سے قرآن کا آغاز ہمیں اس کی ہدایت دے رہا ہے کہ ہم ہر کام کو اللہ کے نام سے شروع کریں ——— اور اس طرح

اسلام نے ہر کام اللہ کے نام سے شروع کرنے کی ہدایت دے کر انسان کی پُوری زندگی کو ایسا بنا دیا ہے کہ وُہ قدم قدم پر اس حلف وفاداری کی تجدید کرتا رہے کہ میرا وجود اور میرا کوئی کام بغیر اللہ تعالیٰ کی مشیت و ارادے اور اس کی امداد کے نہیں ہوسکتا۔ اس ہدایت کے ذریعے اسلام نے انسان کی ہر نقل و حرکت اور تمام معاشی اور دُنیوی کاموں کو بھی عبادت کا رنگ دے دیا۔ عمل کتنا مختصر ہے لیکن فائدہ

---

[1] معارف القرآن م ش [2] تفہیم القرآن

کس قدر بڑا ہے۔ کہ دُنیا بھی دین بن جاتی ہے۔ ایک کافر بھی کھاتا اور پیتا ہے اور ایک مسلمان بھی۔ لیکن مسلمان لقمہ سے پہلے بسم اللہ کہہ کر یہ اقرار کرتا ہے کہ یہ لقمہ زمین سے پیدا ہونے سے لے کر پک کر تیار ہونے تک آسمان و زمین، سیاروں، فضائی قوتوں پر انسانی محنتوں سے گزر کر مجھ تک پہنچا ہے۔ اس کا حاصل کرنا میرے بس میں نہ تھا۔ یہ اللہ ہی کی ذات ہے جس نے ان تمام مراحل سے گزار کر یہ لقمہ مجھے عطا کیا ہے —— غور فرمایئے کہ اسلام کی اس ایک ہی تعلیم نے انسان کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ اس لیئے یہ کہنا صحیح ہے کہ بسم اللہ ایک نسخہ اکسیر ہے جس سے تانبے کا نہیں بلکہ خاک کا سونا بنتا ہے[1]

رحمٰن و رحیم میں فرق

۲ —— رحمٰن و رحیم دونوں مبالغہ کے صیغے ہیں اور رحمٰن میں رحیم سے زیادہ مبالغہ ہے۔ ترجمہ میں ان سب باتوں کا لحاظ ہے (شیخ الہندؒ) یہ دونوں اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں۔ رحمٰن کے معنے عام الرحمۃ کے اور رحیم کے معنے تام الرحمۃ کے ہیں۔ عام الرحمۃ یہ ہے کہ اللہ کی رحمت سارے عالم اور ساری کائنات اور جو کچھ اب تک پیدا ہوا ہے اور جو کچھ ہوگا سب کو حاوی اور شامل ہے۔ اور تام الرحمۃ یہ ہے کہ اس کی رحمت کامل و مکمل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لفظ رحمٰن اللہ کی ذات کے ساتھ مخصوص ہے کسی مخلوق کو رحمٰن کہنا جائز نہیں ہے —— اور اسی لیئے جیسے لفظ اللہ کی جمع اور تثنیہ نہیں آتا لفظ رحمٰن کا بھی تثنیہ اور جمع کا صیغہ نہیں آتا کیونکہ یہ لفظ ایک ہی ذاتِ پاک کے لیئے مخصوص ہے دوسرے اور تیسرے کا وہاں احتمال ہی نہیں ہے۔ بخلاف لفظ رحیم کے کہ اس کے معنے میں کوئی ایسی چیز نہیں جس کا پایا جانا مخلوق میں محال ہو کیونکہ یہ ممکن ہے کہ کوئی شخص کسی سے رحمت کا پُورا پُورا معاملہ کرے۔ اسی لیئے لفظ رحیم انسان کے لیئے بولا جاتا ہے۔ قرآنِ حکیم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیئے یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ بالمومنین رؤف رحیم[2]

رحمٰن و رحیم دونوں رحمت سے مشتق ہیں اور دونوں مبالغہ کے صیغے ہیں۔ اختلاف اس میں ہے کہ مبالغہ کس میں زیادہ ہے۔ رائے عام یہ ہے کہ رحمٰن میں بہ نسبت رحیم کے زیادہ مبالغہ ہے۔ اس لیئے کہ رحمٰن اللہ کے ساتھ مخصوص ہے اور رحیم اللہ کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ اور بعض علماء یہ کہتے ہیں کہ دونوں ہم معنیٰ ہیں جیسے ندمان اور ندیم تاکید کے لیئے دونوں جمع کر دیئے گئے ہیں[3]۔ اگرچہ دونوں اسم

---

[1] معارف القرآن م ش [2] معارف القرآن م ش [3] معارف القرآن م ا

رحمت سے ہیں لیکن رحمت کے دو مختلف پہلوؤں کو نمایاں کرتے ہیں۔ عربی میں فعلان کا باب عموماً ایسی صفات کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ جو محض صفاتِ عارضہ ہوں۔ فعلی ظہور ان کے لیے ضروری نہیں ہوتا جیسے پیاسے کے لیے عطشان۔ غضب ناک کے لیے غضبان۔ سراسیمہ کے لیے حیران۔ مست کے لیئے سکران —— لیکن فعیل کے وزن میں صفاتِ قائمہ وفاعلہ کا خاصہ ہے یعنی عموماً ایسی صفات کے لیئے بولا جاتا ہے جو جذبات وعوارض ہونے کی جگہ صفاتِ قائمہ ہوتے ہیں اور اپنا فعلی ظہور بھی رکھتے ہیں۔ مثلاً کریم کرم کرنے والا۔ عظیم بڑائی رکھنے والا۔ علیم علم رکھنے والا۔ حکیم حکمت رکھنے والا۔ پس الرحمٰن کے معنے یہ ہوئے کہ وُہ ذات جس میں رحمت ہے اور الرحیم کے معنے یہ ہوئے کہ وُہ ذات کہ جس میں نہ صرف رحمت ہے بلکہ جس کی رحمت اپنا فعلی ظہور بھی رکھتی ہے اور تمام کائنات خلقت اس سے فیض یاب ہو رہی ہے [1]

رحمت کے لیئے دو لفظ لانے کی وجہ

اس لیئے کہ انسان کا خاصہ ہے کہ جب کوئی چیز اس کی نگاہ میں بہت زیادہ ہوتی ہے تو وُہ مبالغہ کے صیغوں میں اس کو بیان کرتا ہے۔ اور اگر ایک مبالغہ کا لفظ بول کر وُہ محسوس کرتا ہے کہ اس شئے کی فراوانی کا حق ادا نہیں ہوا تو پھر وُہ اسی معنے کا ایک اور لفظ بولتا ہے تاکہ وہ کمی پوری ہو جائے جو اس کے نزدیک مبالغہ میں رہ گئی ہے۔ اللہ کی تعریف میں رحمٰن کا لفظ استعمال کرنے کے بعد پھر رحیم کا اضافہ کرنے میں یہی نکتہ پوشیدہ ہے [2]

اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ تخلیقِ عالم اور تمام کائنات کو پیدا کرنے اور ان کو پالنے وغیرہ کا منشاء اللہ تعالیٰ کی صفتِ رحمت ہے۔ نہ اس کو ان چیزوں کی خود کوئی ضرورت تھی نہ کوئی دوسرا ان چیزوں کے پیدا کرنے پر مجبور کرنے والا تھا۔ صرف اس کی رحمت کے تقاضے سے یہ ساری چیزیں اور ان کی پرورش کے سارے انتظامات وجود میں آئے ہیں [3]

رحمت کو دو صیغوں سے اس لیئے تعبیر کیا ہے کہ قرآن اللہ تعالیٰ کے تصور کا جو نقشہ ذہن نشین کرنا چاہتا ہے اس میں سب سے نمایاں اور چھائی ہوئی صفت رحمت ہی کی صفت ہے بلکہ کہنا چاہیئے کہ تمام تر رحمت ہی ہے۔

---

[1] ترجمان القرآن [2] تفہیم القرآن [3] معارف القرآن م ش

وَرَحْمَتِیْ وَسِعَتْ کُلَّ شَیْءٍ۔　　　　　اور میری رحمت دُنیا کی ہر چیز کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔

پس ضروری تھا کہ خصوصیت کے ساتھ اس کی صفتی اور فعلی دونوں حیثیتیں واضح کر دی جائیں۔ یعنی اس میں رحمت ہی رحمت ہے کیونکہ وُہ الرّحمٰن ہے اور صرف اتنا ہی نہیں بلکہ ہمیشہ اس سے رحمت کا ظہور بھی ہو رہا ہے کیونکہ الرّحمٰن کے ساتھ وُہ الرّحیم بھی ہے[1]

تین نام لانے کی وجہ

ابتدا میں ان تین ناموں یعنی اللہ، رحمٰن، رحیم کو خاص طور پر لانے کی وجہ یہ بھی بتائی گئی ہے کہ انسان پر تین حالتیں گزرتی ہیں۔ ایک عدم سے وجود میں آنا۔ دُوسری وجود میں آنے کے بعد باقی رہنا اور زندگی کی مقررہ مدت پُوری کرنا۔ تیسری موت کے بعد کی حالت ـــــ ابتدا میں تین ناموں سے تینوں حالتوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ لفظ اللہ میں پہلی حالت کی جانب اشارہ ہے اس لیے تخلیق و تکوین بارگاہِ الوہیت سے متعلق ہے۔ اور لفظ رحمٰن سے دُوسری حالت کی طرف اشارہ ہے اس لیے کہ دُنیا دارِ ابتلاء اور دارِ امتحان ہے جو یہاں سیدھے راستہ پر چلا اس کے لیے آخرت کی ساری منزلیں آسان ہیں۔ نفس و شیطان ہر وقت انسان کی تاک میں ہے اس لیے بندہ ایسی حالت میں بے پایاں اور بے انتہا رحمت کا محتاج ہے۔ اور لفظ رحیم تیسری حالت یعنی آخرت کو یاد دلانے کے لیے لایا گیا ہے۔ خلاصہ یہ کہ لفظ اللہ میں جس کے معنے اس ذات کے ہیں جو تمام صفات کمال کی جامع ہو اور تمام نقائص و عیوب سے پاک ہو۔ تمام مباحث الٰہیات کی طرف اشارہ ہے۔ اور لفظ رحمٰن میں مباحث نبوّت و شریعت کی طرف اشارہ ہے۔ اور لفظ رحیم میں اجمالاً تمام امورِ آخرت کی طرف اشارہ ہے۔ اور یہی تینوں دُنیا میں آنے والے تمام پیغمبروں کی تعلیمات کا لُبِ لباب اور خلاصہ ہیں۔

اسلام کے اس خالص توحیدی کلمہ کے مقابلے میں اب مسیحیت کا فقرۂ افتتاحیہ ملاحظہ ہو۔

شروع باپ بیٹے اور روح القدس کے نام سے

کوئی نسبت ہے اس شرکِ جلی کو اسلام کی توحید خالص سے؟ راقم آثم کے خیال میں یہ بات آتی ہے کہ عجب نہیں جو خالقِ اکبر کی یہی صفات رحمانیت، رحیمیت مسخ ہو کر مسیحیت میں بیٹا اور روح القدس

---

[1] ترجمان القرآن

بن گئی ہوں[1]۔

قریش کی رحمان سے بے خبری

معاملہ کے اس پہلو پر بھی غور کرنا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ کے لیئے رحمٰن کا لفظ اسلام سے پہلے عام طور پر عربوں میں مستعمل نہ تھا۔ اصل میں یہ عبرانی لفظ ہے اور صرف یہود و نصارٰی اور بعض دیگر اربابِ مذاہب اس کو برتتے تھے چنانچہ یمن کے آخری کتبات میں رحمٰن ہی کا نام ملتا ہے۔ سدعرم کے عیسائی کتبات کا آغاز بنعمة الرّحمٰن الرّحیم سے ہوتا ہے اسی لیئے اسلام نے جب ابتدا میں رحمٰن کا نام لیا تو قریش کو تعجب ہوا کہ یہ نیا[2] نام کیا ہے۔ صلح حدیبیہ میں جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عہد نامہ کی پیشانی پر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھا تو قریش نے ماننے سے انکار کر دیا کہ ہم رحمٰن کو نہیں جانتے[3]۔ قرآن میں اس کی تصریح موجود ہے۔

جب ان سے کہا جاتا ہے کہ رحمٰن کو سجدہ کرو تو کہتے ہیں رحمٰن کیا ہے؟ کیا تو جسے بھی کہے گا ہم اس کو سجدہ کریں گے اس سے ان کی نفرت میں اور ترقی ہوتی ہے۔

ایک دوسری جگہ ہے۔

رحمٰن کی یاد سے وہ منکر ہیں۔

قرآن نے ان کو بتایا کہ اللہ کے لیئے تمام اچھے نام بولے جا سکتے ہیں اللہ اور رحمٰن ایک ذات کے مختلف نام ہیں۔

قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى۔

کہہ دو کہ اللہ کہہ کر پکارو یا رحمٰن کہہ کر۔ جو کہہ کر پکارو اس کے لیئے اچھے اچھے نام ہیں۔

قرآن کا آغاز بسم اللہ سے ہوتا ہے۔ ہمارے مفسرین نے رحمٰن و رحیم میں دو ہم معنی صفتوں کی یکجائی کی متعدد تاویلیں کی ہیں۔ اور ان دونوں کے معانی کے درمیان نہایت نازک اور دقیق فرق نکالے ہیں لیکن ہمارے نزدیک یہ سب کوہ کاوی و موشگافی ہے۔ قرآن کے استعمال سے صاف ظاہر ہوتا ہے

---

[1] تفسیر ماجدی　[2] سیرت ابنِ ہشام　[3] صحیح بخاری

کہ اس نے رحمٰن کا لفظ بطورِ صفت نہیں بلکہ بطورِ عَلم استعمال کیا ہے۔ چنانچہ تمام قرآن میں ۵۲ بار یہ نام اللہ کے لیئے آیا ہے۔ اس بنار پر اس کو صفت قرار دینا درست نہیں ہے۔ سورۃ اسرائیل کی اُوپر والی آیت سے یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ رحمٰن اللہ کی صفت نہیں بلکہ علم ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ عرب میں دو متضاد جماعتیں تھیں جس میں سے ایک اپنے معبود کو اللہ اور دوسری الرحمٰن کہتی تھی۔ اسلام ان دونوں کو یکجا کرتا ہے کہ تم جس کو اللہ کہتے ہو اور وُہ جس کو الرحمٰن کہتے ہیں۔ درحقیقت ایک ہی ذات کی دو تعبیریں ہیں اور یہ باہمی اختلاف محض نزاعِ لفظی ہے [1]

---

[1] ارض القرآن

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ ۞ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ ۞

ساری کی ساری[1] تعریف، ستائش صرف اللہ[2] ہی کے لیئے ہے جو تمام کائنات کا مربّی[3] ہے (جس کی تربیت ہر وجود کے لیئے زندگی اور بقا کا سامان کرتی ہے۔ اور تربیت کی ساری ضرورتیں فراہم کرتی ہے) جو بے حد مہربان[4] ہے (جس کی مہربانی سب کو بلاتمیز اپنی رحمتوں سے مالا مال کرتی ہے) جو نہایت رحم کرنے والا ہے۔ (جس کی رحمت سب کے لیئے لگاتار ہوتی رہتی ہے)

۱۔ یعنی سب تعریفیں عمدہ سے عمدہ اول سے آخر تک جو ہوئی ہیں اور جو ہوں گی اللہ ہی کو لائق ہیں کیونکہ ہر نعمت اور ہر چیز کا پیدا کرنے والا اور عطا کرنے والا وہی ہے خواہ بلا واسطہ عطا فرمائے یا بالواسطہ جیسے دھوپ کی وجہ سے اگر کسی کو حرارت یا نور پہنچے تو حقیقت میں آفتاب کا فیض ہے۔

حمد را با تو نسبتے ست درست بر در ہر کہ رفت بر درِ تست

تو اب اس کا یہ ترجمہ کرنا کہ ہر طرح کی تعریف خدا ہی کو سزاوار ہے بڑی کوتاہی کی بات ہے جس کو اہلِ فہم خوب سمجھتے ہیں[1]

الحمد میں ال استغراق کے لیئے ہے یعنی جمیع حمد کوئی سی بھی ہو، کسی قسم کی ہو بظاہر کسی کے لیئے بھی ہو۔ حمد کا درجہ لغوی اعتبار سے مدح اور شکر دونوں سے بلند تر ہے۔ شکر تو کسی متعین نعمت ہی کے

---

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ صا

مقابلے میں بولا جاتا ہے صرف حمد ہی ایسی چیز ہے جو محمود کی عام اختیاری خوبیوں اور فضیلتوں کی بنا پر کی جاتی ہے[1]

عربی میں حمد کے معنے ثنا جمیل کے ہیں یعنی اچھی صفتیں بیان کرنے کے۔ اگر کسی کی بری صفتیں بیان کی جائیں تو یہ حمد نہ ہو گی[2]

حمد کے معنے

الحمد للہ کے معنے یہ ہیں کہ سب تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں۔ یعنی دنیا میں جہاں کہیں کسی چیز کی تعریف کی جاتی ہے وُہ درحقیقت اللہ ہی کی تعریف ہے کیونکہ اس جہانِ رنگ و بُو میں جہاں ہزاروں حسین مناظر اور لاکھوں دلکش نظارے اور کروڑوں نفع بخش چیزیں انسان کے دامنِ دل کو ہر وقت اپنی طرف کھینچتی رہتی ہیں اور اپنی تعریف پر مجبور کرتی ہیں۔ اگر ذرا غور کیا جائے تو ان سب کے پردے میں ایک ہی دستِ قدرت کی کارفرمائی نظر آئے گی اور دُنیا میں جہاں کہیں بھی کسی کی تعریف کی جاتی ہے اس کی حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں جیسے کسی نقش و نگار یا تصویر کی یا کسی صنعت کی تعریف کی جائے کہ یہ سب تعریفیں درحقیقت نقاش و مصوّر یا صنّاع کی ہوتی ہیں۔ اس جملے نے کثرتوں کے تلاطم میں پھنسے ہوئے انسان کے سامنے ایک حقیقت کا دروازہ کھول کر یہ دکھلا دیا کہ یہ ساری کثرتیں ایک ہی وحدت سے مربُوط ہیں اور ساری تعریفیں درحقیقت اسی ایک قادرِ مطلق کی ہیں[3]

حمد کے دواعی

تعریف ہم جس کی بھی کرتے ہیں دو وجوہ سے کیا کرتے ہیں۔ ایک یہ کہ وُہ بجائے خود حُسن و خوبی اور کمال رکھتا ہو۔ قطع نظر اس سے کہ ہم پر اس کے ان فضائل کا کیا اثر ہے۔ دوسرے یہ کہ وُہ ہمارا محسن ہو اور ہم اعترافِ نعمت کے جذبے سے سرشار ہو کر اس کی خوبیاں بیان کریں۔ اللہ تعالیٰ کی تعریف ان دونوں حیثیتوں سے ہے۔ یہ ہماری قدر شناسی کا تقاضا بھی ہے اور احسان شناسی کا بھی کہ ہم اس کی تعریف میں رطب اللسان ہوں اور بات صرف اتنی نہیں ہے کہ تعریف اللہ کے لیے ہے بلکہ صحیح یہ ہے تعریف اللہ ہی کے لیے ہے۔ یہ بات کہہ کر ایک بڑی حقیقت سے پردہ اُٹھایا گیا ہے اور وُہ

---

[1] تفسیر ماجدی صہ۱ ۔ [2] ترجمان القرآن صہ۸ ۔ [3] معارف القرآن م ش صہ۲

حقیقت ایسی ہے جس کی پہلی ہی ضرب سے مخلوق پرستی کی جڑ کٹ جاتی ہے۔ دُنیا میں جہاں جس چیز اور جس شکل میں بھی کوئی حُسن، کوئی خوبی، کوئی کمال ہے اس کا سرچشمہ اللہ ہی کی ذات ہے۔ کسی انسان، کسی فرشتے، کسی سیارے غرض کسی مخلوق کا بھی کمال ذاتی نہیں ہے بلکہ اللہ کا عطیہ ہے۔ پس اگر کوئی اس کا مستحق ہے کہ ہم اس کے گرویدہ اور پرستار، احسان مند، شکرگزار، نیازمند، اور خدمتگار بنیں تو وُہ خالقِ کمال ہے نہ کہ صاحبِ کمال[1]۔

حمد سے سورت کی ابتدا

معرفتِ الٰہی کی راہ میں انسان کا پہلا تأثر یہی ہے یعنی جب کبھی ایک صادق انسان اس راہ میں قدم اُٹھائے گا تو سب سے پہلی حالت جو اس کے فکر و وجدان پر طاری ہو گی وُہ قدرتی طور پر وہی ہو گی جسے یہاں تحمید و ستائش سے تعبیر کیا گیا ہے۔ انسان کے لیئے معرفتِ حق کی راہ کیا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ صرف ایک ہی راہ ہے اور وُہ یہ ہے کہ کائناتِ خلقت میں تدبر و تفکر کرے مصنوعات کا مطالعہ اسے صانع تک پہنچا دے گا۔

اَلَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِھِمْ وَیَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔

ارباب دانش جو کسی حال میں بھی اللہ کی یاد سے غافل نہیں ہوتے کھڑے ہوں، بیٹھے ہوں، لیٹے ہوں (لیکن ہر حال میں اللہ کی یاد ان کے اندر بسی ہوتی ہے) اور جن کا شیوہ یہ ہوتا ہے کہ آسمان و زمین کی خلقت میں غور و فکر کرتے ہیں۔

اب غور کرو ایک طالبِ صادق اس راہ میں قدم اُٹھاتا ہے اور کائناتِ خلقت کے مظاہر و آثار کا مطالعہ کرتا ہے تو سب سے پہلا اثر جو اس کے دماغ پر طاری ہو گا وُہ کیا ہو گا؟ وُہ دیکھے گا کہ خود اس کا وجود اور اس کے وجود سے باہر کی ہر چیز ایک صانع، حکیم اور مدبر قدیر کی کارفرمائیوں کی جلوہ گاہ ہے اور اس کی ربوبیت اور رحمت کا ہاتھ ایک ایک ذرہ حقیقت میں صاف نظر آ رہا ہے۔ بس قدرتی طور پر اس کی رُوح جوشِ ستائش اور محویتِ جمال سے معمور ہو جائے گی اور وُہ بے اختیار پکار اُٹھے گا کہ الحمد للہ رب العلمین۔ ساری حمد و ستائش اس ذات کے لیئے ہے جو اپنی کارفرمائی کے

[1] تفہیم القرآن ص۱۲

ہر گوشہ میں سرچشمہ رحمت وفیضان اور معنے حسن وکمال ہے۔[1]

لفظ اللہ کی تحقیق

۲ — اللّٰه - یہ اس ذات واجب الوجود کا علم ہے جو تمام صفاتِ کمال کی جامع ہے اور ہر قسم کے عیب اور نقص کے شائبہ اور واہمہ سے پاک اور منزہ ہے۔ اور اسی وجہ سے لفظ جلالہ ہمیشہ موصوف ہی واقع ہوتا ہے اور اسمائے حسنیٰ کو بطور صفت اس اسم عظیم کے بعد ذکر کیا جاتا ہے اور یہ اسم عظیم ربِ اعلیٰ کے ساتھ مخصوص ہے۔ اس کا اطلاق ہمیشہ سے صرف اسی ذاتِ پاک کے لیئے ہوا ہے۔ جس طرح کوئی اس کی ذات اور صفات میں اس کا شریک اور سہیم نہیں ہے اسی طرح اس اسم عظیم میں بھی کوئی اس کا قسیم نہیں۔ اسی وجہ سے تمام اولیاء اللہ کا مسلک یہ ہے کہ اسمِ ذات ہی اسم اعظم ہے۔ امام اعظمؒ نے لفظ اللہ ہی کو اسمِ اعظم قرار دیا ہے جیسا کہ امام طحاویؒ نے بیان کیا ہے۔

امام محمد بن الحسنؒ نے امام اعظمؒ کے حوالے سے بتایا کہ اسمِ اعظم لفظ اللہ ہے۔ امام محمدؒ فرماتے ہیں اس لیئے کہ رحمٰن مشتق ہے رحمت سے۔ رب مشتق ہے ربوبیت سے۔ اور اس قسم کی مثالیں دے کر فرمایا کہ لفظ اللہ کسی سے مشتق نہیں ہے۔[2] (مشکل الآثار ص۶۲ ج ۱)

لفظ اللہ، اللہ سبحانہ کے ناموں میں سے سب سے بڑا اور سب سے زیادہ جامع نام ہے۔ بعض علماء نے اسی کو اسمِ اعظم قرار دیا ہے۔ اور یہ نام اللہ کے سوا کسی دوسرے کا نہیں اس لیئے اس لفظ کا تثنیہ اور جمع نہیں آتے۔ کیونکہ اللہ واحد ہے اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔[3]

اللہ خُدا کے لیئے اسمِ ذات ہے کسی اور ہستی پر اس کا اطلاق ہو ہی نہیں سکتا۔ فارسی کے خُدا یا انگریزی کے گاڈ کی طرح اسمِ نکرہ نہیں کہ معبودِ واحد کے علاوہ دوسروں کے لیئے بھی بولا جا سکے۔ اس کی نہ جمع آتی ہے نہ یہ کسی سے مشتق ہے اور نہ اس کا ترجمہ کسی زبان میں ہو سکتا ہے۔[4]

تصویر کا دوسرا رُخ

کیا قرآن نے لفظ اللہ محض اس لیئے اختیار کیا ہے کہ زبان کا مقتضا یہی تھا یا اس سے بھی زیادہ کوئی معنوی موزونیت اس میں پوشیدہ ہے۔

---

[1] ترجمان القرآن۔ [2] ... [3] معارف القرآن م ۱۔ [4] معارف القرآن م ش ص۱۳ [4] تفسیر ماجدی ص۲

سامی زبانوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حروف و اصوات کی ایک خاص ترکیب ہے جو معبودیت کے معنے میں مستعمل رہی ہے۔ اور عبرانی، سریانی، حمیری، عربی وغیرہ تمام زبانوں میں اس کا لغوی خاصہ پایا جاتا ہے۔ یہ الف لام اور ہ کا مادہ ہے اور مختلف شکلوں میں مشتق ہوا ہے۔ کلدانی و سریانی کا الاہیا، عبرانی کا الوہ اور عربی کا الہٰ اسی سے ہے۔ بلاشبہ یہی الاہ ہے جو حرفِ تعریف کے اضافہ کے بعد اللہ ہوگیا ہے اور تعریف نے اسے صرف خالقِ کائنات کے لیئے مخصوص کر دیا ہے۔ لیکن اگر اللہ الہٰ سے ہے تو الہٰ کے معنے کیا ہیں؟ علمائے لغت و اشتقاق کے اقوال مختلف ہیں مگر سب سے زیادہ قوی قول یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کی اصل الاہ ہے اور الاہ کے معنے تحیّر اور درماندگی کے ہیں۔ بعضوں نے اسے ولہ سے ماخذ بتایا ہے اور اس کے معنے بھی یہی ہیں۔ پس خالقِ کائنات کے لیئے یہ لفظ اس لیئے اہم قرار پایا ہے کہ اس بارے میں انسان جو کچھ جان سکتا ہے اور جانتا ہے وُہ عقل کے تحیّر اور ادراک کی درماندگی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ وُہ جس قدر بھی اس ذاتِ مطلق کے بارے میں غور کرے گا اس کی عقل کی حیرانی اور درماندگی بڑھتی ہی جائے گی یہاں تک کہ وُہ معلوم کرے گا کہ اس راہ کی ابتدا بھی عجز و حیرت سے ہے اور انتہا بھی عجز و حیرت ہی ہے۔

اے بروں از وہم و قال و قیلِ من　　　خاک بر فرقِ من و بر تمثیلِ من ![1]

علمی تبحر کی شرمناک مثال

لفظ اللہ کے متعلق مارگولیتھ کی تحقیق کہ یہ اصل میں قریش کے خاندانی دیوتا کا نام تھا اس لیئے محمدؐ کی توحید پرستی کے معنے یہ ہیں کہ انہوں نے دوسرے قبائل کے دیوتاؤں کو مٹا کر اپنے خاندانی دیوتا کو منوایا۔ یورپ کے مشرقی تبحرِ علمی کی شرمناک مثال ہے۔ سب سے پہلا سوال یہ ہے کہ اس عظیم الشان عربی زبان میں حقیقی خدا کے مفہوم کے لیئے کوئی لفظ موجود نہ تھا۔ تم کہتے ہو کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے عرب میں موحدین موجود تھے۔ بہتر ہے لیکن وُہ اپنے خدا کے لیئے اللہ کے سوا کوئی اور لفظ بولتے تھے؟ موجودہ عیسائی ادبائے عرب کے بیان کے مطابق عرب میں عیسائی شعرا بکثرت ہوئے ہیں۔ ہاں سچ ہے عرب میں عیسائی شعرا ہوئے ہیں لیکن کیا ان کی زبان سے لفظ اللہ تم نے نہیں سُنا۔ قرآن نے اللہ تعالیٰ کی صفات خود مشرکین کے اقرار کے مطابق جو بیان کیئے ہیں، وُہ کیا کسی دیوتا پر صادق آسکتے ہیں؟

سب سے آخر یہ کہ اللہ کی اصل الالہ ہے۔ الہ تو صرف عربی زبان میں نہیں بلکہ تمام زبانوں میں

---

[1] ترجمان القرآن

خداتعالیٰ ہی کے لیے بولا جاتا ہے۔ کم ازکم الوہ الوہیم سے تو ناواقفیت نہ ہوگی۔ قریش اپنے دیوتاؤں کے مجسمے بناکر پوجتے تھے کیا اس سب سے بڑے قریشی دیوتا کا بھی کہیں کوئی مجسمہ تھا۔[1]

۳ ـــ ربّ العٰلمین ۔ رب کے معنے عربی لغت کے اعتبار سے تربیت و پرورش کرنے والے کے ہیں۔ اور تربیت اس کو کہتے ہیں کہ کسی چیز کو اس کے تمام مصالح کی رعایت کرتے ہوئے درجہ بدرجہ آگے بڑھایا جائے یہاں تک کہ وہ حدِ کمال کو پہنچ جائے۔ یہ لفظ صرف اللہ تعالیٰ کی ذاتِ پاک کے لیے مخصوص ہے کسی مخلوق کو بغیر اضافت کے رب کہنا جائز نہیں ہے کیونکہ ہر مخلوق خود محتاجِ تربیت ہے۔[2]

رب کا لفظ تین معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ ایک مالک اور آقا۔ دوسرے مربی اور پرورش کرنے والا' خبرگیری اور نگرانی کرنے والا، تیسرے فرمانروا، حاکم، مدبر اور منتظم ـــــــــ اللہ تعالیٰ ان سب معنوں میں کائنات کا رب ہے۔[3]

اُردو میں اس کا ترجمہ پروردگار ہے۔ یہی صحیح ہے لیکن قریب ترین لفظ اس مفہوم کے لیے مربّی کا ہے اور یہی مترجم تھانوی قدس سرہٗ نے اختیار کیا ہے۔[4]

والدین کی تربیت مجازی ہے

تربیت اگرچہ والدین سے بھی ظہور میں آتی ہے مگر والدین کی تربیت نورِ آفتاب کی طرح اصلی اور ذاتی خانہ زاد نہیں ہے بلکہ نورِ زمین کی طرح مستعار اور عطائے غیر ہے۔ جس طرح نورِ زمین آفتاب کا فیض اور عطیہ ہے اسی طرح والدین کی تربیت بھی عطیہ الٰہی ہے۔ واقعی تربیت کے لیے ضروری ہے کہ کسی چیز کو نیست سے ہست کیا جائے اور پھر اس کے لئے تمام اسبابِ تربیت کو پیدا کیا جائے اور پیدا کرنے کے بعد انقطاع کی تمام رکاوٹیں دُور کی جائیں۔ والدین اولاد کی تربیت کرتے ہیں لیکن اولاد کو نہ یہ عدم سے وجود میں لاتے ہیں اور نہ وُہ سامانِ تربیت کے خالق ہیں بلکہ اولاد بھی خدا کی پیدا کی ہوئی ہے اور سامانِ تربیت کا بھی خالق اللہ ہے۔ اس لیئے والدین کی تربیت مجازی ہے۔[5]

ربوبیت کی ہمہ گیری

عربی میں ربوبیت کے معنے پالنے کے ہیں لیکن پالنے کو اس کے وسیع معنے میں لینا چاہیئے اسی لیئے بعض

---

[1] ارض القرآن ص۱۲۲ ج ۲۔ [2] معارف القرآن ص ش۔ [3] تفہیم القرآن [4] تفسیر ماجدی [5] معارف القرآن ص ۱

ائمہ لغت نے اس کی تعریف ان لفظوں سے کی ہے کہ کسی چیز کو یکے بعد دیگرے اس کی مختلف حالتوں اور ضرورتوں کے مطابق اس طرح نشوونما دیتے رہنا کہ اپنے حدِ کمال کو پہنچ جائے۔ اگر ایک شخص بھوکے کو کھانا کھلا دے یا محتاج کو روپیہ دے دے تو یہ اس کا کرم ہوگا جود ہوگا لیکن وُہ بات نہ ہوگی جسے ربوبیت کہتے ہیں۔ ربوبیت کے لیئے ضروری ہے کہ پرورش اور نگہداشت کا ایک جاری اور مسلسل اہتمام ہو اور ایک وجود اس کی تکمیل و بلوغ کے لیئے وقتاً فوقتاً جیسی کچھ ضرورتیں پیش آتی رہتی ہیں سب کا سروسامان ہوتا رہے۔ نیز ضروری ہے کہ سب کچھ محبت و شفقت کے ساتھ ہو کیونکہ جو عمل محبت وشفقت کے عاطفہ سے خالی ہوگا ربوبیت نہیں ہوسکتا۔[1]

العٰلمین۔ مجموعہ مخلوقات کو عالم کہتے ہیں۔ اسی لیئے اس کی جمع نہیں لاتے مگر یہاں عالم سے مراد ہر جنس مثلاً عالمِ جن، عالمِ ملائکہ، عالمِ انس وغیرہ ہیں اس لیئے عالم کی جمع لائے ہیں تاکہ جملہ افراد عالم کا مخلوق بجنابِ باری ہونا خوب ظاہر ہوجائے۔[2]

اس میں دُنیا کی تمام اجناس انسان، آسمان، چاند، سورج اور تمام ستارے اور ہوا، فضا، برق، باراں، فرشتے، جنات، زمین اور اس کی تمام مخلوقات، حیوانات، نباتات، جمادات سب داخل ہیں اس لیئے رب العٰلمین کے یہ معنے ہوئے کہ اللہ تعالیٰ تمام اجناسِ کائنات کی تربیت کرنے والے ہیں۔ اور یہ بھی کوئی بعید نہیں کہ جیسا یہ ایک عالم ہے اسی جیسے اور ہزاروں عالم ہیں جو اس ہمارے عالم سے باہر کی خلاء میں موجود ہوں۔ امام رازیؒ نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ اس عالم سے باہر ایک لامتناہی خلاء کا وجود دلائلِ عقلیہ سے ثابت ہے اور یہ بھی ثابت ہے کہ اللہ کو ہر چیز پر قدرت ہے اس کے لیئے کیا مشکل ہے کہ اس نے اس لامتناہی خلاء میں ہمارے عالم کی طرح کے اور بھی ہزاروں عالم تیار کیئے ہوں۔[3]

رب العٰلمین کا لفظ لاکر قرآن نے گویا بتادیا کہ ہر صفت موجودات کا ایک مستقل نظامِ تربیت ہے اور سب کا آخری سرا اسی قادرِ مطلق، واحد و یکتا کے ہاتھ میں ہے۔ کوئی بھی صنفِ موجودات اس کے ہمہ گیر نظامِ تربیت سے آزاد و مستغنی نہیں۔ یہ تعلیم بھی اسی ایک لفظ سے مل گئی کہ اسلام کا خدا کسی مخصوص نسل، مخصوص قوم، مخصوص قبیلہ کا خدا نہیں ہے۔ یہ حقیقت تاریخِ مذاہب میں بیحد اہمیت رکھتی ہے اسلام سے پہلے جس قدر مذہب جس صورت میں موجود تھے وُہ اس وسیع تخیل ہی سے آشنا نہیں رہے تھے۔ ہر قوم خدا کو صرف اپنا خدا سمجھتی تھی۔ گویا خدا کی حیثیت محض قومی خدا کی رہ گئی تھی۔ اہلِ مصر، ہند، یونان، روما، عرب وغیرہ کی مشرک قوموں کا ذکر نہیں۔ بنی اسرائیل جیسی موحد قوم بھی خدا کے خدائے کائنات ہونے کی

[1] ترجمان القرآن [2] حاشیہ شیخ الہندؒ [3] معارف القرآن م ش

پُوری طرح قائل نہیں رہی تھی۔ قرآن نے ایک لفظ رب العٰلمین لاکر ان سارے مشرکانہ و گمراہانہ عقائد کی تردید کردی[1]۔

۴ـــــ اس آیت میں صفت رحمت کا ذکر دوبارہ کرنے میں شاید اس طرف اشارہ ہے کہ تمام کائنات کی ذمہ داری جو اللہ نے اپنے لیئے رکھی ہے وُہ اپنی کسی ضرورت، دباؤ یا مجبوری سے نہیں بلکہ یہ سب کچھ اس کی صفتِ رحمت کا تقاضا ہے۔ اگر پُوری کائنات نہ ہو تو اس کا کوئی نقصان نہیں اور ہو جائے تو اس پر کچھ بار نہیں ہے[2]۔

صفات کے بیان میں صفتِ ربوبیت کو سب سے پہلے لانا اور اس کے معاً بعد صفاتِ رحمانیت و رحیمیت پر زور دینا خود اس امر کی واضح شہادت ہے کہ عقائدِ اسلام میں ان صفات کا مرتبہ کس قدر بلند ہے اور ان کا درجہ کیسا اہم ہے۔ ان تصریحات کی موجودگی میں اور ان کے تکرار کے بعد مسیحی پادریوں کا یہ کہے جانا کہ اسلام کا خدا صرف قوت اور قہرمانی کا خُدا ہے حقیقت پر کیسا ظلم ہے[2]۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول و عمل سے اسلام کی جو حقیقت ہمیں بتلائی ہے وُہ تمام تر یہی ہے کہ اللہ کی موحدانہ پرستش اور اس کے بندوں پر شفقت و رحمت ـــــ ایک مشہور حدیث جو ہر مسلمان و اعظ و معلم کی زُبان پر ہے ہمیں بتلاتی ہے کہ خدا کی رحمت ان ہی بندوں کے لیئے ہے جو اس کے بندوں کے لیئے رحمت رکھتے ہیں۔ حضرت مسیح علیہ السلام کا مشہور وعظ ـــــ زمین پر رحم کرو تا کہ وُہ جو آسمان پر ہے تم پر رحم کرے ـــــ بجنسہٖ حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان پر بھی طاری ہوا ہے۔ اتنا نہیں بلکہ اسلام نے انسانی رحمت و شفقت کی جو ذہنیت پیدا کرنی چاہی وُہ اس قدر وسیع ہے کہ بے زبان جانور اس سے باہر نہیں ہیں[3]۔

مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝

جو جزا اور سزا کے دِن کا مالک ہے (اور جس کی عدالت نے ہر کام کے لئے بدلہ اور ہر بات کے لیئے نتیجہ مقرر کر دیا ہے)

---

[1] معارف القرآن م ش [2] تفسیر ماجدی [3] ترجمان القرآن

۵ — مالک اور ملک آیت میں دو قرائتیں ہیں۔ اور دونوں صحیح اور متواتر ہیں ایک ملک یوم الدین یعنی روزِ جزا کا بادشاہ۔ دوسرے مالکِ یوم الدین یعنی روزِ جزا کا مالک۔ مالکیت اور بادشاہت کے لیئے روزِ جزا کو اس لیئے خاص کیا ہے کہ اس کے جلال و جمال کا بلا واسطہ ظہور پورا اور کامل عالم کے ہر ہر فرد کے لیئے ہو گا۔[1]

روزِ جزا کے خاص کرنے کی اوّل وجہ تو یہی ہے کہ اس دن بڑے بڑے امور پیش آئیں گے۔ ایسا خوفناک روز نہ پہلے ہوا نہ آئے گو ہو گا۔ دوسرے اس روز بجز ذاتِ پاک حق تعالیٰ کے کسی کو ملک و حکومت ظاہری بھی نصیب نہ ہو گی۔[2]

اللہ کی صفتِ عدالت

اللہ کی تعریف میں رحمٰن و رحیم کہنے کے بعد مالک روزِ جزا کہنے سے یہ بات نکلتی ہے کہ وُہ خدا مہربان ہی نہیں ہے بلکہ منصف بھی ہے اور منصف بھی ایسا با اختیار رہے کہ آخری فیصلے کے روز وہی پورے اقتدار کا مالک ہو گا نہ اس کی سزا میں کوئی مزاحم ہو سکے گا اور نہ جزا میں مانع۔ لہٰذا ہم اس کی ربوبیت اور رحمت کی بنا پر اس سے محبت ہی نہیں کرتے بلکہ اس کے انصاف کی بنا پر اس سے ڈرتے بھی ہیں اور یہ احساس بھی رکھتے ہیں کہ ہمارے انجام کی بھلائی اور بُرائی بالکلیہ اسی کے اختیار میں ہے۔[3]

حاکم یا قاضی خواہ کیسے ہی وسیع اختیارات رکھتا ہو۔ بہر حال اس کے اختیارات محدود ہی ہوتے ہیں۔ اور وُہ مجرم کو حسبِ ضابطہ سزا دینے پر مجبور ہوتا ہے۔ گویا خود حاکم پر حکومت ضابطہ یا قانون کی ہوتی ہے۔ برخلاف اس کے مالک وُہ ہوتا ہے جسے پُورے اختیارات حاصل ہوں۔ مجرم کو چاہے وُہ بخش دے چاہے سزا دے کوئی اس سے بازپُرس کرنے والا اور کوئی اس پر حاکم نہیں۔ حدیثِ مسلم میں آچکا ہے کہ لا مالك الا اللّٰه۔ اور محققین کا قول بھی ایسا ہی ہے کہ بجز اللہ تعالیٰ کے اور کسی کو مالک کہنا یا پُکارنا جائز نہیں ہے۔ اس لفظ کا فارسی ترجمہ بھی اسی لیئے سفیان تابعی سے شہنشاہ مروی ہے۔ اور مفسرین نے بھی معنے مطلق الاختیار کے لیئے ہیں ہندوستان کی بعض مشہور مشرک قوموں کا عقیدہ ہے کہ قانون مکافاتِ عمل کے خلاف خدا بھی نہیں کر سکتا۔ اور کسی خطاوار کو معاف نہیں کر سکتا۔ عیسائیوں کا بھی عقیدہ ہے کہ اللہ انصاف کرنے پر مجبور ہے اور اسی لیئے صفتِ عفو و کرم کے اظہار کے لیئے اسے اپنے اکلوتے بیٹے کو بطور کفارہ کے سب گنہگاروں کی طرف سے پیش کرنا پڑا۔ قرآنِ حکیم کے ایک

---

[1] معارف القرآن م ۱ صـ۱۰۱۔ [2] حاشیہ شیخ الہند صـ۱۔ [3] تفہیم القرآن صـ۱۲

لفظ مالک میں ان سب عقائد باطلہ کی تردید ہے۔[1]

لفظ دین کے معنے

سامی زبانوں کا ایک قدیم مادہ دان اور دین ہے جو بدلہ اور مکافات کے معنے میں بولا جاتا تھا اور پھر آئین و قانون کے معنوں میں بولا جانے لگا چنانچہ عبرانی اور آرامی میں اس کے مشتقات ملتے ہیں۔ آرامی زبان ہی سے غالباً یہ لفظ قدیم ایران میں پہنچا اور پہلوی میں دینیہ نے شریعت اور قانون کا مفہوم پیدا کر لیا۔ خورداوستا میں ایک سے زیادہ موقع پر یہ لفظ مستعمل ہے اور زردشتیوں کی قدیم ادبیات میں انشاء و کتابت کے آئین و قواعد کو بھی "دین دیرہ" کے نام سے موسوم کیا ہے۔ علاوہ ازیں زردشتیوں کی ایک مذہبی کتاب کا نام دین کارت ہے جو غالباً نویں صدی مسیحی میں عراق کے ایک موبد نے مرتب کی تھی۔ بہرحال عربی میں الدین کے معنے بدلہ اور مکافات کے ہیں۔ خواہ اچھائی کا ہو یا برائی کا۔ بہرحال مالک یوم الدین کے معنے ہوئے روز جزا کا مالک۔[2]

دعویٰ اور دلیل

الحمد للہ کے بعد اللہ تعالیٰ کی جن صفات ربوبیت، رحمانیت و رحیمیت اور مالک یوم الدین کا ذکر کیا گیا ہے ان میں باہم ایک خاص منطقی ربط ہے۔ یہ اوصاف دراصل الحمد للہ دعویٰ کے لیے دلائل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

خصوصیت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے لیے حمد ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کی ہر قسم کی پروردگاری، نگرانی اور رکھوالی فرما رہا ہے۔ لیکن اس کی یہ پروردگاری غرض مندوں کی طرح کسی غرض کی وجہ سے نہیں ہے کہ اسے کسی کے ناراض ہونے یا ملک کے باغی ہونے یا شہریوں سے استحصال نہ ہونے کا اندیشہ لاحق ہے بلکہ اس کی پروردگاری صرف اس لیے ہے کہ وہ رحمٰن و رحیم ہے۔ یعنی اگر پردہ ہستی کے پیچھے صرف خالقیت ہوتی رحمت نہ ہوتی تو بلاشبہ کائنات میں فضل و احسان کا یہ عالمگیر نظام نہ ہوتا۔ مگر اس کی رحمت عام انسانوں کی طرح نہیں ہے جس میں توازن نہ ہو بلکہ اس میں سرتاسر اعتدال اور توازن ہے۔ مالک یوم الدین میں اسی اعتدال کی طرف اشارہ ہے۔

---

[1] تفسیر ماجدی ص۲۔ [2] ترجمان القرآن ص۹۔

تین حالتیں

انسان پر تین حالات گزرتے ہیں۔ ماضی، حال اور مستقبل۔ پچھلی تین آیتوں میں انسان کو اس پر متنبہ کیا گیا ہے کہ وُہ اپنے ماضی اور حال میں صرف اللہ کا محتاج ہے کہ ماضی میں اسے عدم سے وجود عطا فرمایا اور حال میں اس کی تربیت کا سلسلہ جاری فرمایا اور مالک یوم الدین میں یہ بتا دیا کہ مستقبل میں وُہ اللہ تعالیٰ ہی کا محتاج ہے اور جب یہ واضح ہو گیا کہ انسان اپنی زندگی کے تینوں دوروں میں اللہ ہی کا محتاج ہے تو اس کا عقلی اور طبعی تقاضا یہی ہے کہ صرف اس کی عبادت کی جائے۔[1]

اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝

(اے اللہ) ہم تیری ہی عبادت[6] کرتے ہیں (تیرے سوا کسی کی عبادت نہیں کرتے) اور تیرے ہی سے مدد[7] چاہتے ہیں (تیرے سوا کوئی نہیں جس سے ہم مدد مانگیں)

۶ ــــــ عبادت نام ہے تذلل، انکسار، افتقار کے آخری درجے کا۔ عبودیت اظہارِ فروتنی کو کہتے ہیں اور عبادت اس سے بھی بلیغ ہے کیونکہ اس کے معنے انتہائی فروتنی کے ہیں۔ جو فروتنی اختیاری نہ ہو بلکہ اضطراری ہو عبادت نہ کہلائے گی۔ اور اسی طرح جو عاجزی و تذلل کسی کے جبر اور دباؤ سے ہو وُہ بھی عبادت نہ کہلائے گی۔ اور جس تذلل سے مقصود تعظیم نہ ہو وُہ استہزاء ہو گا۔[2] ــــــ اردو میں عبادت کے ان معنی کے لیئے پُوجا و پرستش، طاعت و فرمانبرداری، بندگی اور غلامی کی تعبیرات ہیں۔ اس جگہ تینوں معنے درست ہیں یعنی ہم تیرے پرستار بھی ہیں، مطیع و فرمانبردار اور بندے اور غلام بھی۔[3]

توحید کے چار درجے

مشرکینِ مکہ عبادت میں توحید کے قائل نہ تھے وُہ اوروں کی بھی عبادت کرتے تھے اس لیئے یہاں،

[1] معارف القرآن م ش [2] معارف القرآن ص۱ [3] تفہیم القرآن ص۱۲

ایک مؤمن اقرار کرتا ہے کہ ہم مشرک نہیں ہیں کہ تیری بھی عبادت کریں بلکہ موحد، حنیف اور مسلم ہیں ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں۔ توحید کے چار درجے ہیں ایک یہ کہ واجب الوجود اللہ کی ذات ہے اس کے سوا کوئی نہیں۔ دوسرے یہ کہ پوری کائنات کا خالق اللہ تعالیٰ ہے اللہ کے سوا کوئی نہیں ہے۔ توحید کے ان دو درجوں سے آسمانی کتابوں میں کوئی بحث نہیں کی جاتی۔ کیونکہ نبوت کا اس موضوع پر مشرکین اور یہود و نصاریٰ سے کوئی اختلاف نہیں ہے۔ قرآن گواہ ہے کہ یہ ان کے مسلمات میں سے ہے۔ تیسرے یہ کہ اس کائنات کا مدبر اور چلانے والا اللہ ہے۔ اور چوتھے یہ کہ اس کائنات میں عبادت کا مستحق صرف اللہ ہی ہے۔ اللہ کے سوا کوئی نہیں۔ ان آخری دونوں درجوں میں لوگوں کا نبوت سے اختلاف ہے۔ نجومی کہتے ہیں کہ نجوم اور ستارے بھی عبادت کے مستحق ہیں۔ مشرکین تیسرے درجۂ توحید میں نبوت کے ہمنوا ہیں لیکن چوتھے درجہ میں انبیاء سے اختلاف کرتے ہیں۔ مشرکین کا موقف یہ ہے کہ کچھ نیک لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی بہت عبادت کی ہے اللہ تعالیٰ نے ان کی عبادت سے خوش ہو کر ان کو معبودیت کا خلعت عطا کر دیا ہے اس لیئے وُہ بھی عبادت کے مستحق ہیں۔ یہی آخری درجہ توحید کا توحیدِ عبادت کہلاتا ہے۔ نبوت اسی کی دعوت لے کر آئی ہے اور قرآن اسی کا منادی ہے[1]

عبادت کے اصطلاحی معنے

اصطلاحِ شریعت میں عبادت نام ہے اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی بندگی اور عبودیت کے نذرانے کو پیش کرنے اور اس کے احکام کو بجالانے کا۔ اسی لیئے قرآن میں عبادت کا مقابل استکبار آیا ہے۔ اگر استکبار کے معنے اللہ کے مقابلے میں اپنے کو بڑا سمجھنا، اپنی ہستی کو ہی کوئی چیز جاننا اور خدا کے سامنے اپنی گردن جھکانے سے عار کرنا ہے تو عبادت کے معنے اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی عاجزی اور بندگی کا اظہار اور اس کے احکام کے سامنے گردنِ طاعت خم کرنا ہے۔ اس بنا پر صحیفۂ محمدی کی زبان میں عبادت بندے کا ہر وُہ کام ہے جس سے مقصود خُدا کے سامنے گردن خم کرنا اور اس کے احکام کی اطاعت ہو۔ اگر کوئی بظاہر کیسا ہی اچھا کام کرے لیکن اس سے مقصود اپنی بندگی کا اظہار اور خدا کے حکم کی طاعت نہ ہو تو وُہ عبادت نہ ہو گی[2]

عبادت صرف نماز روزے کا نام نہیں۔ امام غزالیؒ نے اپنی کتاب اربعین میں عبادت کی دس قسمیں لکھی ہیں نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، تلاوت قرآن، ہر حالت میں اللہ کا ذکر، حلال روزی کے لیئے کوشش کرنا، پڑوسی اور اور ساتھی کے حقوق ادا کرنا، لوگوں کو نیک کاموں کا حکم کرنا اور بُرے کاموں سے روکنا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ

[1] حجۃ اللہ البالغہ [2] سیرت النبی ص ۲۶

وسلم کی سنت کی پیروی کرنا۔ اس لیئے ایاک نعبد کے معنے ہم صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تیری عبادت میں کسی کو شریک نہیں کرتے کا مفہوم یہ ہوا کہ نہ کسی کی محبت اللہ کے برابر ہو نہ کسی کا خوف اس کے برابر ہو نہ کسی سے اُمید اس طرح ہو نہ کسی پر بھروسا اللہ جیسا ہو، نہ کسی کی اطاعت کو اتنا ضروری سمجھے جتنا اللہ کی عبادت کو نہ اللہ کی طرح کسی کی نذر و منت مانے۔ نہ اللہ کی طرح کسی دوسرے کے لیئے اپنی مکمل عاجزی اور تذلل کا اظہار کرے۔ نہ وُہ افعال کسی کے لیئے کرے جو انتہائی تذلل کی علامات ہیں جیسے رکوع، سجدہ[1]۔

۷۔ آیت کے جز اوّل میں بیزاری اور تبرّی ہے شرک سے۔ اس آخری جز میں بندے کی زبان سے اقرار ہے اپنی بے بساطی، بے قدرتی کا۔ اور اقرار ہے اپنے کو حفاظت اور نصرت کے لیئے اللہ کے ہاتھ میں سپرد کر دینے کا۔ نعبد کے بعد نستعین لانا گویا بندوں کی زبان سے یہ کہلانا ہے کہ ہم عبادت تک میں تیری ہی توفیق تیری ہی اعانت تیری ہی دستگیری کے محتاج ہیں۔ آیت نے جڑ کاٹ دی ہر قسم کی مظاہر پرستی اور مخلوق پرستی کی۔ شرک کی خفی سے خفی راہیں بھی بند کر دی ہیں اور کوئی خفیف سی گنجائش بھی پیر پرستی، پیغمبر پرستی، فرشتہ پرستی، وغیرہ کی باقی نہیں چھوڑی ہے[2]۔

اس آیت شریفہ سے معلوم ہوا کہ اس کی ذاتِ پاک کے سوا کسی سے حقیقت میں مدد مانگنی بالکل ناجائز ہے۔ ہاں اگر کسی مقبول بندے کو محض واسطہ رحمتِ الٰہی اور غیر مستقل سمجھ کر استعانت ظاہری کرے تو یہ جائز ہے کہ یہ استعانت درحقیقت حق تعالیٰ ہی سے ہے[3]۔

اس میں انسان کو تعلیم دی گئی ہے کہ حقیقی طور پر اللہ کے سوا کسی کو حاجت روا نہ سمجھے اور کسی کے سامنے دستِ سوال دراز نہ کرے۔ کسی نبی اور ولی کو وسیلہ قرار دے کر اللہ تعالیٰ سے دُعا مانگنا اس کے منافی نہیں ہے[4]۔

تیرے ساتھ ہمارا تعلق محض عبادت کا نہیں ہے بلکہ استعانت کا تعلق بھی ہم تیرے ہی ساتھ رکھتے ہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ ساری کائنات کا رب تو ہی ہے اور ساری طاقتیں تیرے ہی ہاتھ میں ہیں۔ اور ساری نعمتوں کا تو ہی اکیلا مالک ہے۔ اس لیئے ہم اپنی حاجتوں کی طلب میں تیری طرف ہی رجوع کرتے ہیں۔ تیرے ہی آگے ہمارا ہاتھ پھیلتا ہے اور تیری مدد ہی پر ہمارا اعتماد ہے۔ اسی بنا پر ہم اپنی درخواست لے کر تیرے حضور میں حاضر ہوئے ہیں[5]۔

---

[1] معارف القرآن م ش ص۲۹ [2] تفسیر ماجدی ص۸ [3] حاشیہ شیخ الہندؒ
[4] معارف القرآن م ش ص۲۹ [5] تفہیم القرآن ص۳۴

استعانت کی قسمیں

اس آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سوائے خدا کے کسی سے مدد نہ مانگنی چاہیئے حالانکہ قرآن وحدیث میں جابجا اس کا ذکر ہے کہ ایک دوسرے کی مدد کرو۔ بیمار ہو تو علاج کرو۔ آخر یہ طبیب اور دوا سے استعانت نہیں تو اور کیا ہے؟ لہٰذا یہ تبلایا جائے کہ وُہ کونسی استعانت ہے جو اللہ کے سوا کسی اور سے ناجائز ہے اور کون سی کفر و شرک ہے؟

استعانت کی دو قسمیں ہیں۔ ایک استعانت ماتحت الاسباب یعنی ظاہری اسباب کے تحت کسی سے مدد مانگی جائے۔ یہ وُہ امداد ہے جو تمام انسانوں کو روزمرہ کی زندگی میں ایک دوسرے سے حاصل ہوتی ہے۔ یہ جائز ہے اور ایاک نستعین میں اس استعانت کا حصر مقصود نہیں اور نہ ہی اس کی قرآن میں ممانعت ہے۔ دوسری استعانت مافوق الاسباب یعنی اسبابِ عادیہ کے بغیر کسی کو دُور و نزدیک سے غائبانہ پُکارا جائے اور اس سے استمداد کی جائے۔ یہ استعانت اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے اور اللہ تعالیٰ کے سوا کسی سے جائز نہیں ہے[1]

—— حضرت شاہ عبدالعزیز قدس اللہ سرہ فرماتے ہیں:۔

یہ بات سمجھ لینی چاہیئے کہ اللہ کے سوا کسی اور سے مدد چاہنا اس وقت حرام ہے جب کہ اعتماد اور بھروسا اس پر ہو اور اس کو اللہ کی مدد کا مظہر نہ جانتا ہو۔ اگر توجہ و نظر اللہ پر ہو اور کسی کو محض اللہ کی اعانت کا مظہر جان کر عالمِ اسباب میں مدد مانگے تو نہ خلافِ طریقت ہے اور نہ خلافِ شریعت —— انبیاء اور اولیاء نے بھی اس قسم کی مدد لی ہے۔

اور دوسرے مقام پر فرماتے ہیں:۔

جس چیز سے مدد لی جاتی ہے اگر وُہ ایسی ہے کہ مؤمن و کافر میں سے کسی کو اس میں مستقل ہونے کا شُبہ نہیں ہوتا۔ جیسے بُھوک دُور کرنے کے لیئے غلہ اور اناج سے مدد۔ پیاس بجھانے کے لیئے پانی اور شربتوں سے مدد۔ بیماری دُور کرنے کے لیئے دواؤں سے مدد اور معاشی امور میں سرکار سے مدد۔ یا اطباء اور ڈاکٹروں سے مدد۔ ان تمام میں کسی کو ان کے مستقل ہونے کا وہم بھی نہیں ہوتا۔ اس قسم کی استعانت بلاکراہت جائز ہے کیونکہ یہ حقیقت میں استعانت نہیں ہے محض ظاہری استعانت ہے۔

ہاں اگر استعانت کسی ایسی چیز سے لی جائے جس کا تاثیر میں مستقل ہونا مشرکین کے ذہنوں میں ہو، جیسے

---

[1] جواہر القرآن ص۱۰

ارواح سے یا فلکی روحانیات سے مدد چاہنا یا چلنے پھرنے والی ارواح سے مدد طلب کرنا جیسے شیخ سدو؛ اس قسم کی استعانت عین شرک ہے اور اسلام کے منافی ہے[1]

فیصلہ کُن بات

فیصلہ کُن بات یہ ہے کہ اسباب کے دائرے میں ایک دوسرے سے مدد لینا تعاون ہے اور جائز ہے اور عالمِ اسباب سے بالا میں مدد لینا اللہ کے سوا کسی سے جائز نہیں ہے لیکن اس کی چند صورتیں ذہن میں رکھیئے ہر ایک کا حکم جدا ہے۔

اوّل عالمِ اسباب سے بالا میں اللہ کے علاوہ کسی کو فاعل مستقل اور قادر بالذات سمجھ کر اس سے مدد مانگے اس کے شرک ہونے میں تو کسی کو شبہ نہیں ہے۔

دوسری کہ اللہ کے سوا کسی کو قادر بالذات تو نہیں بلکہ قادر بعطائے الٰہی سمجھے اور یُوں خیال کرے کہ اس کو خدا تعالیٰ نے قدرت و اختیار عطا کیا ہے کہ امور اسباب سے بالا میں ان میں جس طرح چاہے تصرف کرے جیسے بادشاہ اپنے وزراء، احکام کو کچھ اختیارات عطا کر دیتا ہے۔ اسی طرح معاذ اللہ خدا تعالیٰ نے بھی کچھ اختیارات اس کو دیدیئے ہیں اور وُہ بعد عطائے الٰہی مستقل اور مختار ہے۔ مشرکین مکہ اپنے بزرگوں، ملائکہ اور جنات کے متعلق یہی عقیدہ رکھتے تھے۔ قرآنِ حکیم میں اس عقیدے کو جابجا باطل قرار دیا ہے یہ بھی شرک ہے۔

تیسری صورت یہ ہے کہ اللہ کے سوا کسی کو نہ تو مستقل بالذات سمجھے نہ مستقل بالعرض۔ لیکن معاملہ اس کے ساتھ خدا جیسا کرے مثلاً اس کو یا اس کی قبر کو سجدہ کرے یا اس کے نام کی نذر مانے۔ یہ بھی حرام اور شرک ہے۔ اس کا مرتکب حرام کا مرتکب ہے۔

چوتھی صورت یہ ہے کہ غیرِ خدا جس سے مدد مانگی جا رہی ہے اس کے مستقل ہونے کا ایہام ہوتا ہو، جیسے روحانیات سے مدد مانگنا چاہے مانگنے والا ان کو مستقل بالذات نہ سمجھتا ہو لیکن مشرکین چونکہ ارواح کو مستقل سمجھ کر مدد مانگتے ہیں اس لیئے ارواح سے مدد مانگنا بھی حرام ہے اور شرک ہے[2]

اسبابِ عادیہ اور اسبابِ شرعیہ

یاد رہے کہ اسبابِ شرعیہ کا بھی استعانت میں

[1] معارف القرآن م ا صفحہ ۱ [2] معارف القرآن م ا

وُہی حکم ہے جو اسباب عادیہ کا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ اسبابِ عادیہ کا اسباب ہونا عادت سے معلوم ہوتا ہے اور اسبابِ شرعیہ کا سبب ہونا شریعت سے معلوم ہوتا ہے۔ جیسے اسبابِ عادیہ سے استعانت جائز ہے ایسے ہی عالمِ اسباب میں اسبابِ شرعیہ سے بھی استعانت جائز ہے جیسے دُعا۔ رقیہ۔ صبر اور نماز۔ کیونکہ ان کا اسباب ہونا شریعت اور نبوت کی راہ سے معلوم ہوتا ہے۔ لہٰذا جیسے اسبابِ عادیہ سے استعانت جائز ہے۔ حضرت شیخ الہندؒ نے اسی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

ہاں اگر کسی مقبول بندہ کو محض واسطہ رحمت الٰہی اور غیر مستقل سمجھ کر استعانت ظاہری کرے تو یہ جائز ہے کہ یہ استعانت درحقیقت حق تعالیٰ ہی سے استعانت ہے[1]

اس کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں کہ دُعا اسبابِ شرعیہ میں سے ہے اس لیے کسی مقبول بندے کو محض واسطہ رحمت الٰہی اور غیر مستقل سمجھ کر اس سے دُعا کی درخواست کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ ۝

اے اللہ تو ہمیں چلا سیدھے راستہ پر (جس میں کجی نہ ہو اور اونچ نیچ نہ ہو)

---

۸ — بندہ جب جنابِ الٰہی میں یہ کہہ چکتا ہے کہ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِينُ تو خود بخود یہ سوال اُبھر کر سامنے آتا ہے کہ مدد کیسے ہو؟ گویا حق سبحانہٗ بندے سے دریافت کرتا ہے کہ اے بندہ میں تمہاری کیسے مدد کروں؟ بندہ اس کے جواب میں کہتا ہے کہ

اے اللہ تو ہمیں سیدھی راہ دکھا اور اس پر ہمیں چلا۔

اس سے معلوم ہوا کہ انسان اپنی عابدانہ زندگی میں اللہ کی مدد کے بغیر ایک قدم بھی نہیں چل سکتا۔ اس کی دو وجہ ہیں۔

ایک یہ کہ عابدانہ زندگی میں قدم قدم پر انسان کو نفس کے تقاضوں کے خلاف جنگ کرنا پڑتا ہے۔ دوسرے یہ کہ ماحول کے جھمیلوں اور حالات کے گوناگوں چکروں میں عابدانہ زندگی کے لیے انسان کو ماحول اور حالات کا

---

[1] حاشیہ شیخ الہند صہ

مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔

ہدایت کے معنے

علامہ قرطبیؒ کہتے ہیں کہ ہدایت لغت میں ہٹانے اور جھکانے کو کہتے ہیں۔ ہدیہ کو ہدیہ اس لیۓ کہتے ہیں کہ وُہ ایک کی ملکیت سے ہٹ کر دوسرے کی ملکیت میں چلا جاتا ہے۔ آیت کے معنے یوں ہوں گے کہ خداوندا تو ہمارے دلوں کو صراطِ مستقیم پر جھکا دے اور دوسری راہوں سے ہٹا دے۔

لفظ ہدایت کی بہترین تشریح امام راغبؒ نے فرمائی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہدایت کے اصلی معنے ہیں کسی شخص کی منزلِ مقصود کی طرف مہربانی کے ساتھ رہنمائی کرنا ——— اور ہدایت کرنا حقیقی معنے میں صرف اللہ تعالیٰ کا کام ہے جس کے مختلف درجات ہیں[1]

حافظ ابن القیمؒ فرماتے ہیں کہ ہدایت کے مفہوم میں بتانا، دکھانا، چلانا، اسباب مہیا کرنا، دِل میں ڈالنا سب داخل ہیں۔ لیکن ان میں باہم مراتب ہیں۔ بتانا اور چلانا اگر پہلا مرتبہ ہے تو اسباب کی فراہمی کرنا دوسرا مرتبہ ہے۔ صراطِ مستقیم معلوم ہو جاتے اور اس پر لگ جانے کے بعد اس کی دِل میں محبّت پیدا کرنا، اسے چاہتوں کا مرکز بنانا اور دوسری تمام راہوں کے مقابلے میں اسے پسندیدہ بنانا اللہ کی جانب سے وُہ ہدایات ہیں جن کا بندہ قدم قدم پر محتاج ہوتا ہے۔ ان ہی ہدایات کے ذریعے بندہ فلاح وسعادت سے ہمدوش ہوتا ہے۔

یہ اللہ سبحانہٗ کی ہدایت ہی ہے جو ہم میں اجمالی اور تفصیلی حق شناسی کے وسائل مہیا کرتی ہے جن کے ذریعے ہم اخلاق، معاملات، عقائد اور سیاسیات میں اللہ سبحانہٗ کی رہنمائی کے مطابق سرگرمِ عمل ہو جاتے ہیں۔ اور بالآخر علم وعمل کی اس سرگرمی وسرشاری کو وُہ مقام نصیب ہوتا ہے جس کی طرف قرآن میں اشارہ ہے۔

اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ۔

یہی لوگ اپنے مولا کی جانب سے ہدایت پر ہیں۔

اس آیت میں صرف ہدایت کی عظمت نہیں بتائی گئی ہے بلکہ ہدایت کی قسموں کی طرف بلیغ اشارہ کیا گیا ہے۔ لیکن یہاں اقسامِ ہدایت میں وُہ قسمیں مراد نہیں ہیں جن کا تعلق ہمارے وجدان، حواس ومشاعر اور قوتِ ادراک وعقل سے ہے۔ کیونکہ یہ ہدایات تکوینی ہیں۔ آیت میں تشریعی ہدایات مراد ہیں۔

---

[1] معارف القرآن مرش ص۱۰۳

تشریعی ہدایات کیا ہیں ؟

چونکہ ہدایت کے معنے بتانے اور دکھانے کے ہیں لیکن راہ معلوم ہو جانے کے بعد راستہ کا علم نہ تو انسان کو راستہ پر چلاتا ہے اور نہ راستہ میں بھٹکنے سے بچاتا ہے۔ نہ منزل پر پہنچاتا ہے اور نہ راستہ پر چلتے رہنے کی ہمیشہ کے لیئے کوئی ضمانت دیتا ہے۔ اس لیئے راستہ پر چلنے، راستہ میں محفوظ رہنے، منزل پر پہنچنے اور اسی پر ہمیشہ چلتے رہنے کے لیئے ان گنت ہدایات کی ضرورت ہے۔ حافظ ابن القیمؒ فرماتے ہیں:۔

حق شناسی کے بعد حق کی پیروی کا ارادہ رونما کرنا، ارادے کو عزم بنانا، عزم کو عمل کا جامہ پہنانے کے لیئے حالات کو سازگار کرنا اور پھر اس پر ثابت قدم رکھنا اللہ کی ہدایت ہے

اس سے یہ بات بالکل صاف اور واضح ہو کر سامنے آگئی کہ انسان کو ہدایت کی ضرورت صرف راہ شناسی کے لیئے نہیں ہے بلکہ راہ شناسی کے بعد اس پر چلنے، راہ سے نہ بھٹکنے اور اسی پر تادمِ آخریں چل کر منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیئے ہے۔ اور انسان کی یہ ضرورت تمام ضرورتوں سے بالا ہے۔

لوگوں کی یہ سوچ بالکل بے وزن اور مہمل ہے کہ ہدایت یافتہ ہو کر ہم خود ہدایت کے طلبگار کیوں ؟ شاہ عبدالعزیزؒ فرماتے ہیں:۔

مراتب ہدایت بہت ہیں اس لیئے کوئی شخص بھی کسی وقت ہدایت سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔[1]

ہدایت ایسی چیز ہے جو سب کو حاصل بھی ہے اور اس کے مزید درجاتِ عالیہ حاصل کرنے کے لیئے کسی بڑے سے بڑے انسان کو استغنا نہیں ہے اسی لیئے سورۂ فاتحہ کی اہم ترین دعا میں ہدایت کو مانگا ہے جو ایک ادنیٰ مومن کے بھی مناسبِ حال ہے اور بڑے سے بڑے رسول اور ولی کے لیئے بھی اتنی ہی اہم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آخری عمر میں جب سورۂ فتح نازل ہوئی تو فتح مکہ کے فوائد جتلاتے ہوئے یہ بھی ارشاد ہوا کہ

وَيَهۡدِيَكَ صِرَاطٗا مُّسۡتَقِيمٗا

اور دکھائے گا تجھے سیدھی راہ

ظاہر ہے کہ سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم پہلے سے نہ صرف ہدایت یافتہ بلکہ دوسروں کے لیئے مجسم ہدایت تھے۔ اس لیئے اس موقع پر آپ کو صراطِ مستقیم کی ہدایت دینے کے اس کے سوا کوئی معنے نہیں کہ ہدایت کا

---

[1] تفسیر عزیزی

کوئی بہت اعلیٰ مقام آپ کو اس وقت حاصل ہوا[1]

چونکہ روحانی ترقیوں کی کوئی انتہا نہیں ہے اس لیے جو جس مرتبہ پر ہے اس کی دُعا اس سے بھی بلند تر درجہ کی ہوتی ہے اور مومن کی ہوس ہدایت طلبی کبھی نہیں بجھتی۔ یہ اعتراض محض طفلانہ ہے کہ ہدایت یاب کو ہدایت کے لیے درخواست کی ضرورت نہیں ہے[2]

۹ —— ابھی بات پوری نہیں ہوئی۔ یہ بھی معلوم کریجیے کہ مانگنے والا کیا مانگ رہا ہے؟ مانگنے والا صراطِ مستقیم کی درخواست پیش کر رہا ہے۔

صراطِ مستقیم کیا ہے؟ یعنی زندگی کے ہر شعبے میں خیال اور عمل اور برتاؤ کا وُہ طریقہ ہمیں بتا جو بالکل صحیح ہو جس میں غلط بینی، غلط کاری اور بدانجامی کا خطرہ نہ ہو جس پر چل کر ہم سچی فلاح و سعادت حاصل کر سکیں[3]

لغت میں صراط سیدھے اور آسان راستہ کو کہتے ہیں۔ حافظ ابن القیمؒ فرماتے ہیں:۔

صراط اصل میں اس راستہ کو کہتے ہیں جس میں پانچ باتیں ہوں۔ ایک سیدھا ہو۔ دوسرے منزل تک جاتا ہو تیسرے سب سے قریب ہو۔ چوتھے کشادہ ہو۔ پانچویں مقصد تک پہنچنے کے لیے اس کے سوا راستہ کوئی نہ ہو[4]

صراطِ مستقیم

مستقیم استقامت سے بنا ہے اس کے معنے ٹھیک اور سیدھا ہونا ہیں۔ پس صراطِ مستقیم ایسا راستہ جو ٹھیک ہو سیدھا ہو، جس میں اعتدال ہو، افراط و تفریط نہ ہو، زندگی کے تمام گوشوں میں کام آنے والا ہو، فرد اور جماعت دونوں کے حق میں صلاح اور فلاح کی ضمانت دیتا ہو۔ اس میں کجی نہ ہو اور کوئی اونچ نیچ نہ ہو زندگی کے ہر موقعہ پر اور ہر گوشہ کے لیے رہنما ہو۔ منزل تک پہنچانے والا ہو، کشادہ ہو، مقصد تک جانے کے لیے اس کے علاوہ کوئی راستہ نہ ہو۔

چنانچہ یہ حقیقت بالکل واضح ہو جاتی ہے جب صراطِ مستقیم کی اس تفسیر پر نظر ڈالی جائے جو خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہے:۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی انگلی سے ایک لکیر کھینچی اور فرمایا یوں سمجھو کہ یہ لکیر اللہ کا ٹھہرایا ہوا راستہ ہے بالکل سیدھا۔ اس کے بعد اس لکیر کے دونوں طرف ترچھی

---

[1] معارف القرآن م ش صـ۲۳ [2] تفسیر ماجدی صـ۷ [3] تفہیم القرآن صـ۴۱ [4] معارف القرآن م ا صـ۲۹

لکیریں کھینچ دیں۔ اور فرمایا کہ یہ طرح طرح کے راستے ہیں جو بنائے گئے ہیں۔ اور ان میں کوئی راستہ نہیں جس کی طرف بلانے کے لیئے ایک شیطان موجود نہ ہو۔ پھر یہ آیت تلاوت فرمائی۔ وَاَنَّ ھٰذَا صِرَاطِی مُسْتَقِیْمًا[1]

واقعہ یہ ہے کہ نبوت کی تعلیمات کو ظاہر کرنے کے لیئے صراطِ مستقیم سے بہتر کوئی تعبیر نہیں ہوسکتی۔ نبوت کی راہ کا سیدھا ہونا اور انسانوں کی بنائی ہوئی راہوں کا ٹیڑھا ہونا ایک ایسی حقیقت ہے جسے ہر شخص بلاتکلف معلوم کر سکتا ہے۔ نبوت اگر انسان کی ہدایت کے لیئے ضروری ہے تو یہ بھی ضروری ہے کہ اس کی ہدایات بھی صاف اور واضح ہوں۔ اس میں گنجلک نہ ہو، ناقابلِ حل معمہ نہ ہو، اعتقاد میں سہل اور عمل میں آسان ہو گویا یہ ہے وُہ درخواست جو بندہ اپنے خدا کے حضور پیش کرتا ہے اور اس کی گذارش یہ ہے کہ آپ ہماری رہنمائی فرمائیں اور ہمیں بتائیں کہ قیاسی فلسفوں کی اس بھول بھلیوں میں حقیقت کیا ہے۔ اخلاق کے ان مختلف نظریات میں صحیح نظامِ اخلاق کون سا ہے۔ زندگی کی ان بے شمار پگڈنڈیوں کے درمیان فکر و عمل کی صاف اور سیدھی شاہراہ کون سی ہے۔

مولانا تھانوئیؒ فرماتے ہیں کہ مطلب و مقصود صراطِ مستقیم تشریعی ہے نہ کہ تکوینی جو ساری مخلوق کے لیئے خود بخود عام ہے۔

چونکہ دُنیا میں صراطِ مستقیم کا پہچاننا ہی سب سے بڑا علم اور بڑی کامیابی ہے اور اسی کی پہچان میں غلطی ہونے سے اقوامِ عالم تباہ ہوئی ہیں۔ ورنہ خدا طلبی اور اس کے مجاہدات کی تو کافروں میں بھی کمی نہیں۔ اس لیئے قرآن نے صراطِ مستقیم کو پوری وضاحت کے ساتھ ایجابی اور سلبی دونوں پہلوؤں سے واضح فرمایا ہے[2]

صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ ۵

ان لوگوں کی راہ جن پر تو نے انعام فرمایا ہے (یعنی جن پر ہمیشہ سے تیرے منظورِ نظر لوگ چلتے رہے ہیں)

۱۰ —— یہ صراطِ مستقیم کا وُہ چہرہ ہے جو خود قرآن نے پیش کیا ہے یعنی صراطِ مستقیم انعام یافتہ

[1] ترجمان القرآن ص۱۷۱ [2] معارف القرآن م ش ص۳۵

انسانوں کا راستہ ہے۔

یہ انعام یافتہ کون ہیں؟

جن پر انعام کیا گیا وُہ چار فرقے ہیں۔ نبیین، صدیقین، شہدار، صالحین۔ کلام اللہ میں دوسرے موقعہ پر اس کی تصریح ہے ؎

مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا۔

جو کوئی حکم مانے گا اللہ اور اس کے رسول کا تو بلاشبہ وُہ ان لوگوں کے ساتھ ہو گا۔ جن پر خدا نے انعام کیا ہے یعنی انبیار، صدیقین، شہدار اور صالحین کے ساتھ۔ اور جس کو ایسے لوگوں کا ساتھ مِل جائے تو ایسے ساتھی کیا اچھے ساتھی ہیں۔

اس آیت میں انبیار، صدیقین، شہدار اور صالحین کا ذکر کیا گیا ہے اور ان کو انعام یافتہ قرار دیا ہے ان پر اللہ سبحانہٗ نے کیا انعام فرمایا ہے؟

عِلم و عمل کی نعمتیں

ظاہر ہے کہ یہاں انعام سے وُہ عارضی اور نمائشی انعامات مراد نہیں جو پہلے بھی فرعونوں، نمرودوں اور قارونوں کو ملتے رہے ہیں اور اب بھی ہماری آنکھوں کے سامنے بڑے بڑے ظالموں اور بدکاروں اور گمراہوں کو مل رہے ہیں۔ نعمت دراصل اس حالت کو کہتے ہیں جس میں دِل خوشی محسوس کرے۔ ان کو اللہ نے دو قسم کی نعمتوں سے نوازا ہے ایک علم اور دوسرا عمل۔ اسی لیئے یہاں چار طبقوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ دو طبقے یعنی انبیار اور صدیقین علم کا اور شہدار و صالحین عمل کا کمالی نمونہ ہیں۔ مولانا محمد قاسم نانوتویؒ فرماتے ہیں۔

دونوں میں ایک باریک سا فرق ہے جیسے انبیار کی حیثیت علم میں فاعل اور منبع کی ہے۔ صدیقین کا مقام مفعول اور مجمع کا ہے۔ ایسے ہی شہدا کی حیثیت عمل میں فاعل کی اور صالحین کا درجہ مفعول اور مجمع کا

ـــــــــــــــ

؎ حاشیہ مولانا عثمانیؒ

ہے ہے[1]

بہر حال انبیاء و صدیقین علم کا اور شہداء و صالحین عمل کا نمونہ ہیں۔ قرآن نے علم و عمل کے اسی مجموعہ کو نعمت قرار دیا ہے اور اس کے حامل بزرگوں کے راستہ کو صراطِ مستقیم بتایا ہے۔ حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن تمام انبیاء کی ہدایات کا مجموعہ دیا گیا ہے اس لیئے آپ کمالِ علم اور کمالِ عمل لے کر تشریف لائے ہیں۔ آپ کے کمالِ علم اور آپ کے کمالِ عمل کا مجموعہ ہی صراطِ مستقیم ہے۔ اسی بناء پر صراطِ مستقیم کی تفسیر میں کچھ علمائے صحابہ نے حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کا نامِ نامی پیش فرمایا ہے اور حضور علیہ السلام کی ذاتِ گرامی کو صراطِ مستقیم کا مصداق قرار دیا ہے۔ اور چونکہ آپ کی دعوتِ اسلام اسی کمالِ علم اور کمالِ عمل کے مجموعہ کا نام ہے اس لیئے کچھ علماء نے صراطِ مستقیم سے اسلام مراد لیا ہے۔ اور پھر چونکہ اس مجموعۂ علم و عمل کی تشکیل سیاسی حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ کے ذریعے ہوئی ہے اس لیئے کچھ بزرگوں نے صراطِ مستقیم حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ کو بتایا ہے۔ اور جن کی نظر اس مجموعۂ علم و عمل میں سے صرف علم پر تھی انہوں نے صراطِ مستقیم کا مصداق قرآن کو قرار دیا ہے۔ ان میں باہم کوئی تعارض نہیں ہے مقصد ایک ہے عنوان مختلف ہیں۔

فضل و رحمت

یہ بات بھی پیشِ نظر رہے کہ قرآن نے حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالِ علم اور کمالِ عمل کو رحمت اور فضل سے تعبیر کیا ہے۔

اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ وَكَانَ فَضْلُهٗ عَلَيْكَ كَبِيْرًا۔

مگر مہربانی تیرے مالک کی جانب سے اور اس کی بخشش تجھ پر بڑی ہے۔

فضل کہتے ہیں ان خوبیوں کو جو انسان کی ذات میں ایسا جلا پیدا کریں جس سے دوسرے متاثر ہوسکیں اور رحمت نام ہے اس شرف کا جو آدمی کو بغیر محنت خود بخود حاصل ہو جائے۔ نبوت کا علم سرتاسر رحمت ہے کیونکہ وہبی ہے اور عمل اللہ کا فضل ہے کیونکہ محنت اور مشقت کے ذریعے عطا ہوا ہے۔ اس آیت میں یہ بتایا ہے کہ علم وحی اور کتاب کا آنا اگر اللہ سبحانہٗ کی رحمت ہے تو اسی کے نتیجے میں آپ کی محنتوں، مشقتوں کے ذریعے آپ کے دامن میں عمل کا ظہور صرف اللہ کا فضل نہیں فضلِ کبیر ہے۔ آپ کے علم میں اگر شانِ اعجاز ہے تو آپ کے عمل میں شانِ تعبد ہے۔ علم اگر پڑھنے کی چیز قرآن ہے تو عمل برتنے کی چیز سنت ہے۔

---

[1] قبلہ نما

قرآن نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقاصد بعثت میں سب سے اہم اور بنیادی مقصد ہی یہ بتایا ہے کہ آپ لوگوں کو اللہ سبحانہٗ کی جانب سے لائے ہوئے علم و عمل کی تعلیم دینے آئے ہیں۔ قرآن میں یہ بات بہ تکرار کہی گئی ہے

يُعَلِّمُكُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ۔

کتاب سے مراد اگر علم نبوت ہے تو حکمت سے مقصد عمل نبوت ہے۔ آپ کے علم و عمل یعنی اللہ کی رحمت اور فضل ہی پر قرآن میں خوشیاں منانے کا حکم ہے۔

قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا۔

کہہ دو کہ یہ اللہ کے فضل اور اس کی رحمت سے ہے بس اس پر خوشی منانی چاہیئے۔

اسلام میں دو عیدیں

اسلام میں دو عیدیں قرآن کے اسی مطالبے کو پورا کرنے کا عملی شاہکار ہیں۔ ایک نبوت کے کمالِ علم اور دوسری نبوت ہی کے کمالِ عمل کی یادگار میں منائی جاتی ہے۔

علم و عمل میں رشتہ

آیئے قرآن ہی کی روشنی میں نبوت کے لائے ہوئے اس علم و عمل کا باہم رشتہ بھی معلوم کریجیئے۔ قرآن نے بتایا ہے کہ نبوت کا لایا ہوا کمالِ علم اگر مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ اللہ کا اُتارا ہوا ہے تو نبوت ہی کا کمالِ عمل اسی علم کا پرتو اور نقش مَا اَرَاكَ اللّٰهُ اللہ کا دکھایا ہوا اور بتایا ہوا ہے۔ اس لیئے ان دونوں کو ایک دوسرے سے جُدا نہیں کیا جا سکتا۔ ان میں باہم اگر کچھ فرق ہے تو صرف نامہ اور پیام کا ہے۔ علم نبوت اگر نامۂ خداوندی ہے تو عملِ نبوت پیامِ خدا ہے۔ اس بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ نبوت محمدیہ اسلام کے نام پر جو سرمایہ لے کر آئی ہے وُہ سب اللہ کی جانب سے ہے۔ اور دونوں اُمت کو بطریقِ تواتر ملے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ علم نبوت کا تواتر کتابی ہے اور عملِ نبوت کا تواتر عملی ہے۔ اسلام میں جیسے علمِ نبوت کے لیئے قرأ سبعہ کی روایات ہیں ایسے ہی عملِ نبوت کے لیئے محدثین کی روایات ہیں۔ نہ تو قرآن کا قرآن ہونا روایاتِ قرار پر موقوف ہے اور نہ سنت کا عملِ نبوت ہونا محدثین پر منحصر ہے وُہ تاریخ علمِ نبوت ہے اور یہ تاریخ عملِ نبوت ہے

برہانِ علم اور برہانِ عمل

برہانِ علم کو انسانیت میں اُجاگر کرنے کے لیئے علم کا نزول حوادث و واقعات کے تحت بتدریج ۲۳

سال کے عرصہ میں ہوا ہے۔ اگر یہ حقیقت ہے اور حقیقت نہ ہونے کی وجہ کیا ہے جب کہ سینۂ قرآن سے اُبلی ہوئی صدا یہی ہے۔

لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً كَذٰلِكَ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ۔

کیوں نہیں اُترا اس پر سارا قرآن یکبارگی۔ اسی طرح ہم نے اُتارا تاکہ جمائے رکھیں اس سے تیرے دل کو۔

تو پھر اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے کہ نبوت کے کمالِ علم کا ظہور اس لیئے آہستہ آہستہ ہوا ہے کہ اعمال و مظاہر کی تشکیل ساتھ ساتھ ہو کر علم کے حقائق دِل میں پُوری طرح جم جائیں۔

جب علم کے ہر گوشہ کی پُشت پر ایک مقررہ نظامِ عمل کے مظاہر موجود ہوں تو قدرتی طور ہر شخص کو اس سے متمتع ہونے کا موقعہ مِل سکتا ہے۔ اور ہر آنکھ دیکھ سکتی ہے کہ علم کے ساتھ عمل یا رحمت کے ساتھ فضل کی کارفرمائیاں کام کر رہی ہیں۔ چنانچہ وُہ تمام اعمالِ نبوت جن میں مقامِ نبوت کے افادہ و فیضان اور زینت و جمال کا ذکر کیا گیا ہے۔ دراصل اسی استدلال پر مبنی ہیں۔ اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ صرف نظریاتی طاقت سے دُنیا میں اس وقت تک کوئی مؤثر تبدیلی نہیں آسکتی جب تک نظریات کی پُشت پر عمل و کردار کی قوت نہ ہو۔ دُنیا میں کوئی اصول و نظریہ، کوئی دعوت اور دعوٰی عمل میں آئے بغیر کوئی محسوس حقیقت نہیں بنتا۔ علم کے ساتھ عمل کا نمونہ ہی قوت کا ایسا سرچشمہ ہے جس کے ذریعے تاریخ میں عظیم انقلابات آتے ہیں۔ اگر صرف نظریات میں افادی طاقت ہوتی تو کتاب کے ساتھ نبی کی شخصیت نہ ہوتی۔ اور اگر محض عمل ہی میں اصلاح کی ضمانت ہوتی تو نبوت کے ساتھ علم کا نام و نشان نہ ہوتا۔

امرِ واقعہ یہ ہے کہ علم بغیر عمل کے اور عمل بغیر علم کے یا نظریہ بغیر واقعہ کے اور واقعہ بغیر نظریہ کے اصلاح کی راہ میں ادھوری اور نامکمل ہدایت ہے۔ ہدایت کی جامعیت کے لیئے ضروری ہے کہ علم و عمل کی دونوں قوتیں کارفرما ہوں۔

جیسے علم کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں بھرپور صداقت ہو ایسے ہی عمل کی سب سے اُونچائی یہ ہے کہ اس میں حُسن ہی حُسن ہو۔ اسی بنا پر قرآن میں علمِ نبوت کے لیئے صداقت اور عملِ نبوت کے لیئے حُسن کی تعبیر آئی ہے۔ کیونکہ نبوت کا حُسن و جمال افادہ و فیضان ہے نبوت صرف بناتی اور سنوارتی نہیں بلکہ اس طرح بناتی اور سنوارتی ہے کہ اس کے عمل کی ہر کروٹ میں حُسن کی جلوہ آرائی اور اس کے ہر گوشہ میں نظر افروزی کا سامان ہوتا ہے۔ وُہ خُود حسین ہے دوسروں کے لیئے حُسن کار ہے۔ عملِ نبوت کے ایک ایک گوشہ کو دیکھو

یا اس کے مجموعہ پر نظر ڈالو۔ اس کی زندگی کا کوئی موڑ بھی ایسا نہیں ہے جہاں حُسن و جمال بے نقاب نہ ہو۔ عبادت کا نظام اور اس کا اہتمام، تقویٰ اور خشیتِ الٰہی کا چہرۂ خنداں، استقامت و عزیمت کا جلوہ، تواضع و احتسابِ نفس کی پہنائی، شوقِ آخرت اور لقائے الٰہی کا سماں، جذبۂ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا منظر، دُعا، و مناجات الٰہی کا زمزمہ، اخلاق کی رعنائی اور عبدیت کی عطر بیزی، تلاوتِ قرآن کی نغمہ سنجی، علم و عرفان کی بوقلمونی۔ غرضیکہ نبوّت کی ذات اپنے کردار، اخلاق و احوال میں حُسن کی نمائش گاہ ہوتی ہے اس لیئے عملِ نبوت کے لیئے قرآن میں حُسن کی تعبیر ایک واقعی اور سچی تعبیر ہے۔

گویا نبوّت نے دُنیا کو جو کچھ دیا ہے۔ وُہ سچے علمی حقائق اور اچھے عملی نظام کے سوا کچھ نہیں ہے اور کیوں نہ ہو جب یہ حقیقت ہے کہ نبوت نام ہے اللہ تعالیٰ کی نمائندگی کا۔ اللہ کی ذات اگر جامع الکمالات ہے تو ضروری ہے کہ جو جامع الکمالات کا نمائندہ ہو وُہ بھی مجمع الکمالات ہو۔

کمالِ علمی کی حد تک اگر قرآنِ حکیم ایک جامع کتاب ہے تو قرآن کے نقش کو بھی مجمع ہونا چاہیئے تاکہ نمونہ کو مکمل نمونہ اور عمل کو نقشِ قرآن کہا جا سکے۔ بہرحال اسی کمالِ علم اور کمالِ عمل کے مجموعہ کو قرآن میں نعمت کہا گیا ہے اور جن کو یہ نعمت ملی ہے ان کی راہ کو صراطِ مستقیم بتایا ہے۔ اب یہ آپ کے صوابدید پر موقوف ہے کہ آپ اسے اللہ کا دین کہیں، اسلام کہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہیں، کتاب اللہ کہیں، بالآخر حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ کہیں۔ جو کچھ بھی کہیں درست ہے۔

لیکن اتنی بات ضرور یاد رکھیں کہ علم و عمل کو خود صراطِ مستقیم نہیں کہا گیا ہے بلکہ علم و عمل والے بزرگوں انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین کی راہ کو صراطِ مستقیم بتایا ہے۔

ان کی راہ صرف علم و عمل کو مان لینا اور اپنی ذات کی حد تک اپنانا نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ ان کا بنیادی کام علم و عمل کی اس نعمت کو لوگوں تک پہنچانا اور دُنیا کو اس کی دعوت دینا ہے۔ اس کو تمام نبیوں کی بعثت کا مقصد اور مشن قرار دیا ہے۔ اس میں وُہ کامیابی اور ناکامی کے نتائج سے بے پروا ہو کر زندگی بھر لگے رہنے پر مامور تھے۔

اس کام کو تمام نبیوں نے قاطبۃً امیروں میں، غریبوں میں، دُکانداروں میں، دستکاروں میں، کاشتکاروں میں، زمینداروں میں، مزدوروں میں، کارخانہ داروں میں، نوکروں میں، آقاؤں میں، شوہروں میں، بیویوں میں، اولاد میں، والدین میں، شاگردوں میں، استادوں میں، گھر باہر ہر جگہ کیا ہے۔ اور اس میں جان کھپائی ہے، عزت کو تج کیا ہے، مال لُٹایا ہے، رشتہ داروں کو چھوڑا ہے، وطن کو خیرباد کہا ہے۔

امام غزالیؒ فرماتے ہیں دین کا یہ مدار اعظم ہے یہی وُہ مہم ہے جس کے لیئے تمام انبیاء روانہ کیئے گئے۔ اگر اس کی بساط اُلٹ دی جائے اور اس کے علم و عمل کو چھوڑ دیا جائے تو کارِ نبوت معطل ہو کر رہ جائے۔ دین کی

چولیں ہل جائیں اور اللہ کے بندے تباہ ہو جائیں۔

یہی وُہ اصلِ عظیم ہے جو قرآنی دعوت کی اوّلین بنیاد ہے وُہ اُمت کو جو کچھ تبلانا چاہتا ہے اس کا دار و مدار اسی پر ہے۔

قرآن میں انبیاء کے واقعات اور ان کی قوموں کے قصص کی روح یہی ہے اگر اس اصل سے نظر ہٹالی جائے تو قرآنی دعوت کا سارا کارخانہ درہم برہم ہو کر رہ جاتا ہے لیکن دُنیا کی ساری عجیب باتوں میں سب سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ قرآن نے جس قدر اس پر زور دیا ہے اسی قدر دُنیا نے اس سے بے رُخی اخفیا کی حتیٰ کہ اب کہا جا سکتا ہے کہ آج کوئی بات بھی دُنیا کی نظروں سے اس قدر اوجھل نہیں جس قدر انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین کی یہ صراطِ مستقیم ہے۔

آپ غور کریں اگر صرف ذاتی اور انفرادی اصلاح ہی صراطِ مستقیم ہے یا اگر صرف نبوت کے لائے ہوئے علم و عمل کو ماننا اور اس پر ذاتی طور پر عمل پیرا ہونا ان بزرگوں کی صراطِ مستقیم ہے تو پھر چہرۂ نبوت کو دیکھنے والے مسلمان کس مقصد کی خاطر وطن سے بے وطن ہوئے، اپنے کاروبار کو نقصان پہنچایا، اپنا عمر بھر کا اندوختہ لٹایا، اپنی جمی ہوئی تجارتوں پر پانی پھیرا، اپنی کھیتی باڑی اور باغات کو ویران کیا، اپنے عیش و تنعم کو خیرباد کہا، دُنیا کی تمام کامیابیوں اور خوشحالیوں سے آنکھیں بند کر لیں، پانی کی طرح اپنا خون بہایا، اپنے بچوں کو یتیم اور عورتوں کو بیوہ کیا۔ اگر صرف ذاتی علم و عمل ہی کا نام صراطِ مستقیم ہے تو اس ہنگامہ آرائی اور اس محشر خیزی کی کیا ضرورت تھی۔ اس کے حصول کا راستہ تو بالکل بے خطر اور آسان تھا۔ یہ تو مدینے میں مسجدِ نبوی کے زیرِ سایہ اور مکہ میں بیت اللہ کی ہمسائگی میں اچھی طرح آرام سے مل سکتی تھی کیونکہ وہاں کی ایک نیکی پچاس ہزار اور ایک لاکھ نیکیوں کے ہم وزن ہے۔

اس بناء پر یہ کہنا بہت بڑی خوش فہمی ہے کہ ان بزرگوں کے علم و عمل کو صرف ماننا اور اپنانا ہی صراطِ مستقیم ہے۔ صراطِ مستقیم دراصل نبوت کے لائے ہوئے علم و عمل کو ماننا، اپنانا اور سماجی زندگی میں اسے پھیلانے اور نافذ کرنے کے لیے محنت کرنا ان بزرگوں کی وُہ راہ ہے جس کی ہر نمازی نماز کی ہر رکعت میں اللہ سے درخواست کرتا ہے ——— خداوندا مجھے علم و عمل نبوت کو جیسے تو نے ماننے کی اور ماننے کے بعد ذاتی طور پر اپنانے کی توفیق دی ہے ایسے ہی نبوت کے علم و عمل کی خاطر جان کھپانے جان لگانے اور قربانیاں کرنے کی نبیوں والی راہ بتا دے۔ اور ہمیں بھی ان کی طرح قربانیاں کرنے والا بنا دے

غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۝

جو تیرے حضور میں معتوب[11] نہیں ہوئے اور گم کردہ[12] راہ نہیں ہیں ۔

۱۱ —— غیر المغضوب الخ اَلَّذِیْنَ کا بدل ہے یا اس کی صفت ہے اس لیئے اس کے مناسب ترجمہ کیا گیا ہے۔ بعض تراجم دہلویہ میں جو اس کا ترجمہ کیا ہے خلاف ترکیب وخلاف مقصود ہے[1] مطلب یہ ہے کہ یہ فقرہ الذین انعمت علیھم کی صفت یا بدل ہے صراط کا مضاف الیہ نہیں ہے۔ صفت ہونے کی صورت میں معنے یہ ہیں۔ ان انعام یافتہ لوگوں کی راہ جن پر نہ اللہ کا غضب ہوا اور نہ وہ گمراہ ہیں۔ اور مضاف الیہ ہونے کی صورت میں معنے یہ ہیں کہ اُن لوگوں کا راستہ نہیں جن پر تیرا غضب ہوا اور نہ ان کا جو بھٹکے ہوئے ہوں۔ پہلے معنے عربی زبان کے قواعد کے اعتبار سے زیادہ صحیح اور مقصود سے ہم آہنگ ہیں۔ دوسرے معنے نہ قوانین زبان کے لحاظ سے صحیح اور نہ مقصود سے ہم آہنگ ہیں۔

غضب لغت میں سخت ہونے کو کہتے ہیں۔ سخت چٹان کو غَضَبَۃ۔ سخت زہر والے سانپ کو غضوب کہتے ہیں۔ اسی سے غصّہ کو غضب اور غصّہ والے کو غَضْبَانَ کہتے ہیں۔

غضب ایک اضافی کیفیت ہے اپنے اپنے حالات کے مطابق ہر ایک میں غضب کی کیفیت جُدا ہے ظاہر ہے چٹان میں جو غضب ہے وُہ سانپ میں نہیں اور سانپ میں جو غضب ہے وُہ انسان میں نہیں ہوتا ہے۔

اللہ سبحانہٗ کی ذات احساسات سے بالا و بالاتر ہے جیسے ہماری عقلیں اس کی ذات کے ادراک سے عاجز ہیں ایسے ہی اس کی صفت غضب کو بھی ہم نہیں سمجھ سکتے۔ اس موضوع پر ہماری ہر تعبیر میں خود ہمارے محسوسات کی جھلک آجائے گی۔ قاضی بیضاویؒ کا یہ کہنا دماغی سکون کے متلاشیوں کے لیئے بالکل بجا ہے کہ ایسے مواقع پر ہم بات کو ذہن سے قریب کرنے کے لیئے کہہ سکتے ہیں کہ اللہ سبحانہٗ کی صفات میں صرف نتائج ہوتے ہیں وُہ مبادی نہیں ہوتے جن سے مخلوق دوچار ہوتی ہے لیکن دل کے اطمینان کے لیئے وُہ ہی بات اچھی ہے جو علامہ محمود آلوسیؒ نے سلف اُمّت کی طرف نسبت کر کے لکھی ہے کہ ہمیں غضب کا تو پتہ ہے

---

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ

مگر جنابِ باری میں اس کی حقیقت کا پتہ نہیں ہے اُس کا غضب ذاتِ قدوس کے جلال کے مطابق ہوگا جیسے بھی اس کی شانِ عظمت وجلال کا تقاضا ہو۔

۱۲ـــ ضَالِّيْنَ جمع ضَالٌّ کی ہے ضَلَالَةٌ سے بنا ہے۔ عربی زبان میں لفظ ضلالت ایک سے زیادہ معانی پر بولا جاتا ہے۔ علّامہ جمال قریشیؒ فرماتے ہیں:۔

> ضلال کے معنے ضائع ہونا، گم ہونا اور مغلوب ہونا ہے عربی میں دودھ میں اگر اتنا پانی ملا دیا جائے کہ دُودھ میں اس کا اثر نمایاں نہ ہو تو بولا جاتا ہے ضَلَّ الماءُ فی اللبن گویا پانی مغلوب ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے اپنے والد حضرت یعقوب علیہ السلام کی طرف ضلالت کی نسبت اسی معنے میں کی تھی۔ اِنَّ اَبَانَا لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ۔ یعنی ہمارے ابا تو یوسف اور اس کے بھائی کی محبت میں مغلوب ہیں۔ اور یہی مطلب ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس ارشاد کا فَعَلْتُهَآ اِذًا وَّاَنَا مِنَ الضَّآلِّيْنَ۔ یعنی میں نے یہ کام اس وقت کیا تھا جب میں عصبیت میں مغلوب تھا۔ اور ضلال رشاد کی بھی ضد ہے۔

امام راغب اصفہانیؒ لکھتے ہیں:۔

> ضلال کے معنے راہِ راست سے ہٹ جانے کے ہیں۔ ہدایت اور ضلالت ایک دوسرے کی ضد ہیں۔

دراصل جب نبوت اللہ سبحانہٗ کی جانب سے علم وعمل کی صورت میں ہدایت لے کر آتی ہے اس کے سامنے تین قسم کے آدمی ہوتے ہیں۔

کچھ اس سے واقف ہوتے ہیں اور کچھ ناواقف۔ واقف کاروں میں دو قسم کی طبیعتیں ہوتی ہیں۔ کچھ طبیعتیں چوکنی اور چوکس ہوتی ہیں اور عمل کی سرشاریوں سے ہمدوش ہوتی ہیں۔ اور کچھ طبیعتیں سرکش ہوتی ہیں جاننے اور ماننے کے باوجود عمل کی محرومیاں ان کی زندگی کا نشان بن جاتی ہیں اور صرف محرومی ہی نہیں بلکہ اس سے آگے ان میں علم وعمل سے ایک طرح کی کد اور ضد پیدا ہو جاتی ہے اور اربابِ علم اصحابِ عمل کی اپوزیشن بن جاتے ہیں۔

قرآن حکیم علم نافع اور عمل صالح کی سرشاریاں رکھنے والوں کو انعام یافتہ قرار دیتا ہے اور علم رکھتے ہوئے عملی زندگی میں باغیانہ میلانات رکھنے والوں کو مغضوب بتاتا ہے اور علم سے بے بہرہ لوگوں کو قرآن کی زبان میں ضالین کہا جاتا ہے۔ گویا جیسے زندگی میں نبوت کے لائے ہوئے علم وعمل سے رشتوں کی مضبوطی انعام یافتگی کی نشانی ہے اور جیسے نبوت کے علم وعمل کو مانتے ہوئے زندگی میں انکار وسرکشی، بے رُخی اور اجنبیت مغضوبیت

کی علامت ہے ایسے ہی نبوت کے لائے ہوئے عمل سے بے خبری اور ناواقفیت ضلالت کی راہ ہے بالفاظِ دیگر نبی کی اُمت کا علمِ نبوت سے رشتہ ٹوٹ جانا اگر ضلالت ہے تو عملِ نبوت سے زندگی میں بے رُخی غضبِ الٰہی کو دعوت دینا ہے۔ حافظ ابنِ کثیرؒ فرماتے ہیں:۔

مغضوب وہ لوگ ہیں جن کے ارادوں میں فساد ہو، حق شناس ہونے کے باوجود اس سے رُوگرداں ہوگئے ہوں۔ اور ضالّین وُہ ہیں جو راستہ ہی سے بے خبر اور ناواقف ہونے کی وجہ سے سرگرداں و حیراں ہیں۔

علامہ رشید رضاؒ فرماتے ہیں:۔

غیر المغضوب الخ الذین انعمت کی صفت ہے یعنی انعام یافتہ لوگ ایسے ہونے چاہئیں جو غضبِ الٰہی اور ضلالت کا شکار نہ ہوں۔ اللہ کا غضب ان پر ہوتا ہے جو حق سے حق آشنائی کے بعد رُوگرداں ہوجائیں۔ اور جو اللہ کی نعمتوں سے مالا مال ہوکر اُسے چھوڑدیں۔ اس کا سبب چاہے کچھ ہو ـــــ اور ضالّین سے مراد وُہ لوگ ہیں جن کو راہِ حق کا علم ہی نہ ہو ـــــ مولانا محمد شفیع صاحب فرماتے ہیں:۔

مغضوب علیہم سے وُہ لوگ مُراد ہیں جو دین کے احکام کو جاننے پہچاننے کے باوجود شرارت یا نفسانی اغراض کی وجہ سے اُن کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔ یا دوسرے لفظوں میں احکامِ الٰہیہ کی تعمیل میں کوتاہی کرتے ہیں ـــــ اور الضالّین سے وُہ لوگ مراد ہیں جو ناواقفیت اور نادانی کے سبب دین کے معاملہ میں غلط راستہ پر پڑگئے ہیں اور دین کی مقررہ حدود سے نکل کر افراط اور غلو میں مبتلا ہوگئے۔

مولانا محمد ادریس صاحب فرماتے ہیں:۔

مغضوب علیہم سے وُہ فریق مراد ہے جو دیدہ و دانستہ راہِ راست کو چھوڑ دے اور علمِ صحیح کے باوجود ہوائے نفس کی پیروی میں غلط راستہ اختیار کرے ـــــ اور ضالّین سے وُہ گروہ مراد ہے جو سوا السبیل سے ہٹ کر غلط راستہ پر پڑجائے۔

مولانا آزادؒ فرماتے ہیں:۔

مغضوب علیہ گروہ بالکل منعم علیہ کی ضد ہے کیونکہ انعام کی ضد غضب ہے اور فطرت کائنات کا قانون یہ ہے کہ راست بازانسانوں کے حصے میں انعام آتا ہے نافرمانوں کے حصے میں غضب۔ گمراہ وُہ ہیں جو راہِ حق نہ پاسکے اور اس کی جستجو میں بھٹک گئے پس

مغضوب وُہ ہوئے جنہوں نے راہ پائی اور اس کی نعمتیں بھی پائیں لیکن پھر اس سے منحرف ہوگئے اور نعمت کی راہ چھوڑ کر محرومی و شقاوت کی راہ اختیار کر لی۔ گمراہ وُہ ہوئے جو راہ ہی نہ پا سکے اِس سے اِدھر اُدھر بھٹک رہے ہیں اور صراطِ مستقیم کی سعادتوں سے محروم ہو رہے ہیں۔ مغضوب علیہ کی محرومی حصول و معرفت کے بعد انکار کا نتیجہ ہے۔ اور گمراہ کی محرومی جہل کا نتیجہ۔ پہلے نے پاکر رُو گردانی کی اس لیئے محروم ہوا۔ دوسرا پا ہی نہ سکا اس لیئے محروم ہے۔ محروم دونوں ہوئے مگر یہ ظاہر ہے کہ پہلے کی محرومی زیادہ مجرمانہ ہے۔ کیونکہ اس نے نعمت حاصل کرکے پھر اس سے رُو گردانی کی اس لیئے اُسے مغضوب کہا گیا اور دوسرے کی حالت کو صرف ضلالت سے تعبیر کیا گیا۔

ان اقتباسات کے پیش کرنے سے میرا مقصد یہ بتانا ہے کہ قرآنِ حکیم کی سورۂ فاتحہ میں یہ فقرہ غیر المغضوب علیھم الخ کوئی نئی بات بتانے کے لیئے نہیں بلکہ انعام یافتگان کی ایک محسوس نشانی بتانے کے لیئے لایا گیا ہے اور اس کے ذریعے ان لوگوں کی جن پر انعام ہوا ہے اور جن کی راہ صراطِ مستقیم ہے نشانی یہ بتائی گئی ہے کہ ان میں مغضوبیت اور ضلالت نہ ہوگی۔ آیت کا مطلب صاف لفظوں میں یہ ہے کہ ہمیں ان انعام یافتہ لوگوں کی راہ پر چلا جو تیرے حضور نہ مغضوب و معتوب ہوئے اور نہ گمراہ ہیں اور معلوم ہے کہ انعام یافتہ وُہ ہیں جن کا رشتہ نبوت کے لائے ہوئے علم و عمل سے استوار ہو۔

امرِ واقعہ یہ ہے کہ دُنیا میں ہدایت و سعادت سے ہمیشہ دو قسم کے آدمی فائدہ نہیں اُٹھاتے۔ جان بُوجھ کر انکار کرنے والا اور ناواقف۔

جو لوگ علمِ نبوت کو مانتے ہوں، جانتے ہوں پھر ان کی عملی زندگی غلط ہو، ان میں ردّ و انکار پایا جاتا ہو، استکبار اور سرکشی ان کی سرشت ہو، ان کی حالت اس شخص کے مقابلے میں بلحاظ جرم زیادہ سنگین ہے جو علمِ نبوت سے بے خبر اور ناواقف ہے ـــــ اس موقعہ پر حافظ ابن القیمؒ کی یہ تحقیق بے حد وزنی ہے۔

حق کے علم اور اس پر عمل کے لحاظ سے قرآن نے لوگوں کی تین قسمیں بتائی ہیں۔ ایک وُہ جو حق کا علم رکھتے ہوں اور اس پر عمل پیرا ہوں۔ دوسرے وُہ جو علم رکھتے ہوں مگر اس پر عمل پیرا نہ ہوں۔ تیسرے وُہ علم ہی نہ رکھتے ہوں۔

پُوری انسانیت میں یہی تین قسمیں پائی جاتی ہیں اور قرآن کے قصص اور واقعات میں ان تینوں کا چہرہ پیش کیا گیا ہے۔

اسی بنا پر قرآن ہدایت کی ان تمام صورتوں سے یک قلم انکار کرتا ہے جو نبوت کے لائے ہوئے علم و عمل سے ہٹ کر طرح طرح کی فکری گمراہیوں اور عمل کی بے راہ رویوں سے پروان چڑھتے ہیں چاہے اس کا عنوان کتنا ہی خوبصورت کیوں نہ ہو۔ قرآن کے نزدیک جیسے نبوت کے علم سے ہٹ کر انسانی تصور و تخیل کی اساس ہدایت کی راہ نہیں ہے ایسے ہی نبوت کے عمل سے منحرف ہو کر عملی زندگی کا کوئی سانچہ بھی ہدایت کی راہ نہیں ہے ؛ ہدایت کی راہ تو صرف علم و عمل نبوت کی راہ ہے۔ اسی کا نام قرآن کی اصطلاح میں۔ الاسلام ہے۔

اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ

دین تو خدا کے نزدیک اسلام ہے۔

جادۂ عمل کے لحاظ سے اللہ کو یہی پسند ہے۔

رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا

میں نے تمہارے لیۓ اسلام کو دین پسند کیا۔

اس کے علاوہ ہر جادہ، ہر شاہراہ، ہر نظامِ زندگی، ہر دستورِ حیات، ہر آیئنِ بندگی اور ہر قانون اللہ کے یہاں ناقابلِ پذیرائی ہے۔

مَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ۔

جو شخص اسلام کے سوا کسی اور دین کا طالب ہو گا وُہ اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا۔

قرآن نے دُنیا کو اسی کی دعوت دی ہے۔ اس کی تمام پکاروں، تمام خطبوں، تمام وعظوں اور تمام تقریروں کا لب لباب یہی ہے۔ اس موضوع پر قرآن نے جو کچھ بتایا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ دُنیا میں جس گوشے میں بھی اسلام کے نام پر ہدایت آئی ہے اور جہاں بھی حق کی رونمائی ہوئی ہے وہاں نبوت کے علم و عمل ہی کی صورت میں آئی ہے۔ علم وحی کی صورت میں اور عملِ نبوت کی ذات کی صورت میں آیا۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ علم آیا ہو اور عمل نہ ہو یا عمل آیا ہو اور علم نہ ہو۔

فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ وَ اَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ۔

پس خدا نے ان کی طرف بشارت دینے والے اور ڈرانے والے پیغمبر بھیجے اور ان پر سچائی کے ساتھ کتابیں نازل کیں۔

تمام اولادِ آدم کے لیے اللہ سبحانہٗ کی یہی سنت رہی ہے اور تمام انبیاء نے اسی کی تعلیم دی ہے۔ ان ہی کے ماننے اور اپنانے کا نام قرآن کی زبان میں ایمان اور عملِ صالح ہے۔ قرآن اسی کا داعی ہے۔ اسی کا نام صراطِ مستقیم ہے یہ دُنیا کے ہر گوشے میں ایک رہی ہے چاہے وُہ کسی زمانے اور کسی ملک میں ہو۔ اس پر چلنا ہی اللہ کے قانونِ سعادت کے تقاضوں کا جواب ہے یہ راہ نظریاتی طور پر فکری زندگی میں نبوت کے علم کی اور عملی طور پر زندگی کے سارے گوشوں میں نبوت کے عمل کی راہ ہے۔ اسی پر انسان کی نجات کا دارومدار ہے۔ یہ روزِ اوّل سے قائم ہے اس میں کمیت اور کیفیت کے لحاظ سے تو مرورِ زمان و مکان کی تبدیلی کی وجہ سے اختلاف ہوا ہے۔ لیکن حقیقت سب جگہ ایک ہے کہ نجات کی راہ نبوت کی پیش کردہ علم و عمل کی راہ ہے۔ اسی سلسلے کی آخری کڑی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

اِنَّآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ كَمَآ اَوْحَيْنَآ اِلٰى نُوْحٍ وَّالنَّبِيّٖنَ مِنْۢ بَعْدِهٖ ۔

(اے محمدؐ) ہم نے تمہاری طرف اسی طرح وحی بھیجی جس طرح نوحؑ اور ان سے پچھلے پیغمبروں کی طرف بھیجی تھی۔

یہ آیت بتا رہی ہے کہ اللہ سبحانہٗ کی جانب سے ہمیشہ سے ہدایت ایک ہی ہے۔ ہر دور، ہر زمانے، ہر ملک اور ہر قوم میں اللہ کی ہدایت نبوت کے علم و عمل کی صورت میں آئی ہے —— دُنیا میں جو بگاڑ، جو فساد بھی آیا ہے اسی سے انحراف اور روگردانی کا نتیجہ ہے۔ کوئی بات بھی قرآن میں اس درجہ واضح اور صاف نہیں ہے جس قدر یہ بات کہ دین نام ہے نبوت کے علم و عمل کا۔

اسی وجہ سے قرآن کی دعوت کی پہلی بنیاد یہ ہے کہ علم کے نام پر اللہ سبحانہٗ کی جانب سے آئی ہوئی کتابوں کی یکساں طور پر تصدیق کی جائے یعنی یقین کیا جائے کہ جہاں جو پیغام بھی آیا ہے وُہ اللہ سبحانہٗ کی جانب سے ہے۔

اَلَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۔

جو کتاب (اے محمدؐ) تم پر نازل ہوئی اور جو کتابیں تم سے پہلے پیغمبروں پر نازل ہوئیں سب پر ایمان لاتے ہیں۔

اور عمل کی حد تک کسی ایک پیغمبر کا انکار سب کے انکار کے مترادف ہے۔ ایمان یہ ہے کہ عمل کی روشنی نبوت کے نام پر جہاں بھی رُونما ہوئی ہے اس کو مانا جائے اور کسی ایک کا بھی انکار نہ کیا جائے —— اقرار یہ ہونا چاہیئے۔

لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۔

ہم اس کے پیغمبروں سے کسی میں کچھ فرق نہیں کرتے۔

کتابوں میں سے کسی ایک کتاب کا انکار اگر نبوت کے لائے ہوئے علم کا انکار ہے تو کسی نبوت کا انکار نبوت کے عمل کا انکار ہے کیونکہ حقیقت کے لحاظ سے دونوں کا مبدار ایک ہے ——— اسی بنار پر قرآن دونوں کو نور قرار دیتا ہے۔

علم نبوت کو اگر وُہ کتاب مُبین اور نورِ مبین کہتا ہے :-

اَنْزَلْنَآ اِلَیْکُمْ نُوْرًا مُّبِیْنًا۔

ہم نے (کفر وضلالت کا اندھیرا دُور کرنے کو) تمہاری طرف چمکتا ہوا نور بھیج دیا ہے۔

تو عمل نبوت کو بھی وُہ برہان اور نور کہتا ہے :-

قَدْ جَآءَکُمْ مِّنَ اللّٰہِ نُوْرٌ۔

بیشک تمہارے پاس خدا کی طرف سے نور اور روشنی آچکی ہے۔

قرآن نجات وسعادت کی ان تمام راہوں سے انکار کرتا ہے جو ان دونوں روشنیوں سے مستفید نہ ہوں۔ ان کے بغیر انسانی زندگی کے اردگرد اندھیرا اور تاریکی ہی تاریکی ہے۔

اتباعِ ظن اور اتباعِ ہوٰی

پھر یہی وجہ ہے کہ قرآن نے علمِ نبوت سے رشتہ ٹوٹنے کے لیے اتباعِ ظن اور عملِ نبوت سے منحرف ہوجانے کے لیے اتباعِ ہوٰی کی تعبیرات اختیار کی ہیں ——— عالمِ غیب کے بارے میں ساری فکری گمراہیوں کا سرچشمہ اتباعِ ظن ہے۔ علم نبوت سے ہٹ کر جو عقیدہ، جو تخیل، جو تصور بھی پیدا کیا جائے وُہ حقیقت سے دُوری ہے۔ چنانچہ حضرت مسیح علیہ السلام کے بارے میں عیسائیوں کی ساری فکری گمراہیوں کو وُہ اتباعِ ظن قرار دیتا ہے۔ اور کہتا ہے :-

مَا لَھُمْ بِہٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ۔

پیروئ ظن کے سوا ان کو اس کا مطلق علم نہیں۔

راہ کی تمام درماندگیوں کا ایک ہی حل ہے کہ علم نبوت کو مانا جائے اور گمان، خیال، ظن، تخمین اور قیاس سے بالکل کنارہ کش ہوجائے ——— عالمِ شہادت میں ساری بداعمالیوں، بداخلاقیوں، آوارگیوں اور بے راہ رویوں کا اصلی باعث اتباعِ ہوٰی ہے۔ قرآن نے یہودیوں کی زندگی میں عصیان، عُدوان اور

طغیانی کی تاریخی داستان کا سرچشمہ صرف یہ بتایا ہے کہ ان میں اتباع ہویٰ کی بیماری رونما ہو گئی تھی۔
قرآن ایسے تمام مواقع پر جہاں نبوت کے علم سے قطع تعلقات کی شکایت کرتا ہے کتاب کا عنوان لیتا ہے اور جہاں عملِ نبوت سے رشتہ توڑنے پر فردِ جرم عائد کرتا ہے وہاں رسول کا عنوان لے کر آتا ہے

اَفَكُلَّمَا جَاءَكُمْ رَسُوْلٌ بِمَا لَا تَهْوٰى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ ـ

توجب کوئی پیغمبر تمہارے پاس ایسی باتیں لے کر آئے جن کو تمہارا جی نہیں چاہتا تھا تو تم سرکش ہو جاتے رہے۔

یہ اتباع ہویٰ ہی ہے جو صرف انکار پر قناعت نہیں کرتی بلکہ اس میں نبوت کے خلاف ایک طرح کی کد اور ضد پیدا ہو جاتی ہے اور پھر یہ ضد بڑھتے بڑھتے بغض وعناد اور ظلم وفساد کی سخت سے سخت صورتیں اختیار کر لیتی ہے۔ اتباع ہویٰ کا مریض صرف نبوت سے اختلاف نہیں کرتا بلکہ اس کے اندر نبوت کے خلاف ایک غیر محدود جوش پیدا ہو جاتا ہے وُہ اپنی زندگی اور زندگی کی ساری قوتوں کے ساتھ نبوت کی ہلاکت اور بربادی کے درپے ہو جاتا ہے۔

فَلَمَّا جَاءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ

توجس چیز کو وُہ خوب پہچانتے تھے جب ان کے پاس آپہنچی تو اس سے کافر ہو گئے

اس کے نتیجے میں ان کا غرور یہاں تک بڑھ جاتا ہے کہ اپنے علاوہ اور اپنے سے باہر وُہ نہ نبوت کو مانتے ہیں اور نہ اپنے سے باہر کسی کو تسلیم کرتے ہیں بلکہ اپنے سے باہر وُہ کسی شخص کی راستی اور بزرگی کا بھی اعتراف نہیں کرتے اور اس کے نتیجے میں

فَبَاءُوْا بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ ـ

تو وُہ اس کے غضب بالائے غضب میں مبتلا ہو گئے۔

آپ پوچھ سکتے ہیں کہ یہ بیماری نبوت کی زندگی کے ہوتے ہوئے کیوں رونما ہوتی ہے کہ انسان کے سامنے جب راہِ حق اور نبوت کا لایا ہوا عمل سامنے آتا ہے تو دو قسم کی رکاوٹیں اس کا راستہ روک لیتی ہیں پہلی رُکاوٹ خود اس کی طبیعت ہے انسان کی اپنی خواہشیں، اپنے میلانات، اپنے رجحانات نبوت کی پیروی سے روکتے ہیں۔

دوسری رُکاوٹ آدمی کا ماحول گردوپیش ہے اس کی سوسائٹی، اس کی مجلس، اس کا حلقۂ احباب، اس کا حلقۂ فکر، اس کی علمی اور ادبی تنظیم، اس کی تہذیبی وثقافتی زندگی، اس کی اجتماعی اور سیاسی ذہنیت اس کا راستہ روک کر کھڑی ہو جاتی ہے اور عملِ نبوت سے اس کا رشتہ توڑ دیتی ہے۔ قرآن کی زبان میں ان

دونوں کا نام اتباعِ ہویٰ ہے ۔

بہرحال علمِ نبوت سے رشتہ ٹوٹتا ہے تو انسان اتباعِ ظن کا شکار ہو جاتا ہے اور عملِ نبوت سے بیگانگی ہوتی ہے تو آدمی اتباعِ ہویٰ کا بیمار ہو جاتا ہے ۔

دین کی زندگی میں ساری خرابیوں اور ساری گمراہیوں کا سرچشمہ یہی ہیں۔ عقائد کی ساری بدعتیں اتباعِ ظن اور اعمال کی ساری بدعتیں اتباعِ ہویٰ کے پستانوں سے دُودھ پی کر پلتی، بڑھتی اور جوان ہوتی ہیں۔

یہ جو قرآن جابجا اس بات پر زور دیتا ہے کہ دین میں غلو نہ کرو اور اہلِ کتاب سے کہتا ہے ۔

لَا تَغْلُوْا فِیْ دِیْنِکُمْ

اپنے دین (کی بات) میں ناحق مبالغہ نہ کرو اور اتباعِ ہویٰ نہ کرو۔

لَا تَتَّبِعُوْا اَھْوَاءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوْا۔

ایسے لوگوں کی خواہشوں کے پیچھے نہ چلو جو خود بھی گمراہ ہوئے ۔

تو اس سے مقصود اسی حقیقت پر زور دینا ہے کہ علمِ نبوت سے رشتہ ٹوٹتا ہے تو دین میں غلو، افراط اور زیادتیاں رُونما ہوتی ہیں۔ اور عملِ نبوت سے اجنبیت ہوتی ہے تو زندگی نافرمانی، بے راہ روی، فسق و فجور، ظلم و عدوان اور فساد و طغیان کا گہوارہ بن جاتی ہے ۔

سُورۃ البقرۃ

سُورت کا نام

اس سُورت کا نام البقرہ ہے یعنی وُہ سورت جس میں گائے کا ذکر ہے۔ چونکہ یہ واقعہ قرآن میں صرف اسی سُورت میں آیا ہے اس لیئے دوسری سُورتوں سے ممتاز کرنے کے لیئے یہی نام تجویز ہوا۔

سُورت کا موضوع

اس سُورت کا موضوع 'اجتماعی تقوٰی' ہے۔

تقوٰی اصل میں وقوٰی ہے۔ عربی میں اس کے لغوی معنے بچنے، پرہیز کرنے اور احتیاط کرنے کے ہیں۔ لیکن اصطلاحِ قرآن میں یہ دِل کی اس کیفیت یا ضمیر کے اس احساس کا نام ہے جس کی بنا پر ہر کام میں اللہ کے حکم کے مطابق عمل کرنے کی شدید رغبت اور اس کی مخالفت سے شدید نفرت پیدا ہو جاتی ہے۔

اس سُورت کا بیشتر حصہ مدنی زندگی کے بالکل ابتدائی دور میں نازل ہوا ہے۔

نبوّت کی دونوں زندگیوں مکی زندگی اور مدنی زندگی میں بُہت بڑا فرق ہے ــــــ مکی زندگی میں قرآن کی ہدایات عقائد کی اصلاح، انفرادی اعمال کی دُرستگی اور شخصی نجات کے گرد گھومتی نظر آتی ہیں اسی بنا پر مکی زندگی میں ایمانیات پر زیادہ زور ہے۔ ایمان باللہ، ایمان بالرسالت، ایمان بالملائکہ اور ایمان بالیوم الآخر کو تکرار کے ساتھ پیش کیا گیا ہے ــــ لیکن مدنی زندگی میں شخصی نجات، انفرادی اصلاح سے آگے مسلمانوں کو تمام انسانوں کی بھلائی اور بُرائی کا ذمہ دار قرار دیا گیا اور کہا گیا کہ

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ

اے ایمان والو! انصاف قائم کرنے والے اور اللہ کے لیئے گواہ بنو۔

انصاف کے علمبردار بنو۔ تمہارا کام اب صرف انصاف کرنا ہی نہیں ہے بلکہ انصاف کا جھنڈا لے کر اُٹھنا ہے۔ تمہیں اس بات پر کمربستہ ہو جانا چاہیئے کہ ظُلم مٹے اور اس کی جگہ عدل و راستی قائم ہو

عدل کو اپنے قیام کے لیے جس سہارے کی ضرورت ہے مومن ہونے کی حیثیت سے تمہارا مقام یہ ہے کہ وُہ سہارا تُم بنو۔

سُورۂ فرقان میں بھی ہے اس میں اوّلاً یہ بتایا ہے کہ اگر ہم چاہتے تو ایک ایک بستی میں ڈرانے والا رولنہ کر دیتے۔ لہٰذا آپ ان کافروں کی اطاعت نہ کیجیے اور اسلام کی خاطر زور شور اور پُوری طاقت سے محنت کیجیے۔ یہ فرمانے کے بعد اہلِ ایمان کی یہ دُعا بتائی ہے کہ

وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا۔

اور ہمیں متقیوں کی امامت عطا فرما۔

یعنی ہم تقویٰ و طاعت میں سب سے بڑھ جائیں۔ خود ہی نیک نہ ہوں بلکہ ہماری بدولت پُوری دُنیا نیک بن جائے۔ اور ہم کو تقویٰ میں اس درجہ کمال عطا کر پُوری دُنیا تقویٰ میں ہماری کاپی کرے۔ اس سے ضمناً یہ بات بھی نکل آتی ہے کہ مسلمان کا بجائے خود نیک ہونا کافی نہیں ہے اپنے گرد و پیش اور پُورے عالم کی دینداری کی دیکھ بھال ان کے ذمے ہے۔

مدنی زندگی کے اسلام کو مکی زندگی کے اسلام سے یہی چیز ممیز کرتی ہے کہ ان میں پورے عالم کی ہدایت کی لگن اور عشق تھا۔ وُہ اب ایک عالمگیر تخیل کے داعی تھے اور اس تخیل سے ان میں شدید محبت تھی اس نصب العین کی کامیابی اسی وقت ممکن ہے جب خیر و شر کا وُہ تصوّر اور حق و باطل کا وُہ معیار عملاً کارفرما ہو جس کی طرف انہیں دُنیا کو دعوت دینی ہے۔ جہاں باطل نظام نے غلبہ پاکر معیار ترک و اختیار اور اقدارِ حیات کو اُلٹ کر رکھ دیا ہو وہاں نیکی کی طرف دعوت دینا ایک فعلِ عبث ہے۔ جو نظامِ تمدن دُنیا پر غالب ہوگا۔ اور جس قوم کی تہذیبی برتری عملاً قائم ہوگی اس کے اقدار و غایات دوسرے تمام انسانوں کے اقدار و غایات کا ماخذ و منبع ہونگی اور اسی کا معیارِ خیر و شر دُنیا میں رائج ہوگا۔

البقرہ میں پہلے یہ اعلان کہ اس مقصد کی خاطر اتقیاء کی ضرورت ہے اتقیاء کا چہرہ پیش فرمانے کے بعد اتقیاء کی دو مدِ مقابل جماعتوں کا ذکر کیا ہے۔

اس کے بعد پُوری انسانیت کو متقی بننے کا تیر بہدف نسخہ بتایا یعنی عبادتِ خُدا۔ اور چونکہ اللہ کی عبادت انسان اپنی رائے اور قیاس سے نہیں کرسکتا اس کے لیئے نبوت کی ضرورت کی طرف متوجہ کیا۔ نبوّت کے سلسلہ میں انسانیت میں تاریخ نبوت بتاتے ہوئے تخلیق آدم اور خلافت کا ذکر فرمایا۔

اس کے بعد پورے پارے میں بلکہ دوسرے پارے کے دوسرے رکوع کے خاتمہ تک ان نقاط کی نشان دہی کی گئی ہے جو اجتماعی زندگی میں تقویٰ کی تباہی کا باعث ہوتے ہیں اور اس کے لیئے یہودیوں کی تاریخ

ملت سے ایسے چیدہ چیدہ واقعات پیش فرمائے جس نے ان کو اللہ کی نظروں میں گرادیا اور تقویٰ سے محروم ہوگئے۔ تاکہ قرآن کے ماننے والوں کو معلوم ہو جائے کہ اس راہ کی ٹھوکریں کیا ہیں اور پھر ان کے نتائج کیسے ہوتے ہیں؟ ——— اسی بنا پر ان پر فردِ جُرم لگا دینے کے بعد یہ ارشاد ہوا ہے۔

وَلَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَمَثُوْبَةٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ۔

اور اگر وُہ ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو بدلا پاتے اللہ کے ہاں سے بہتر

اور اسی بنا پر ان کے واقعات کے چہرے کا آغاز بھی تقویٰ سے فرمایا اور اس کا انجام بھی تقویٰ پر فرما کر بتایا کہ چونکہ تم متقیانہ سیرت کھو چکے ہو اس لیئے اب تمہیں امامت کے منصب سے معزول کیا جاتا ہے اور اب ان لوگوں کو یہ منصب دیا جاتا ہے جن کے لیئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دُعا فرمائی تھی یعنی اُمتِ مسلمہ۔

اُمتِ مسلمہ کی تاسیس کے سلسلہ میں امامت ابراہیم علیہ السلام، بنائے کعبہ اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا تذکرہ آیا ہے۔

اس کے ساتھ یہودیوں اور یہودیوں کے ساتھ پُوری دُنیا کے لیئے ہدایت وسعادت کا دروازہ بند نہیں کیا بلکہ یہ کہہ کر سب کو دعوت دی ہے کہ :

فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا

سو اگر وُہ بھی ایمان لائیں جس طرح پر تم ایمان لائے ہدایت پائی انہوں نے بھی۔

دوسرے پارے میں اہلِ ایمان کو تقویٰ کی تعمیری اہمیت بتائی ہے۔ اِنشاءاللہ اس کا تعارف آپ دوسرے پارے کے مقدمہ میں پڑھیں گے۔

آیاتہا ۲۸۶　(۲) سُورَةُ الْبَقَرَةِ مَدَنِيَّةٌ (۸۷)　رکوعاتہا ۴۰

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
الٓمّٓ ۚ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛۚ فِيْهِ ۛۚ

اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے۔
الف لام میم۔ یہ کتاب ہے کہ جس کے خدا کی طرف سے ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔

قرآن میں حروفِ مقطعات

الٓمّٓ۔ ان حروف کو مقطعات کہتے ہیں۔ ان کے اصل معنے تک اوروں کی رسائی نہیں ہے بلکہ یہ بھید ہے اللہ اور اس کے رسول کے درمیان جو بوجہ مصلحت وحکمت ظاہر نہیں فرمایا۔ اور بعض اکابر سے جو ان کے معنے منقول ہیں اس سے صرف تمثیل وتنبیہہ وتسہیل مقصود ہے۔ یہ نہیں کہ مراد حق تعالیٰ یہ ہے تو اس کی اب شخصی رائے کہہ کر تغلیط کرنا محض شخصی رائے ہے جو علماء کی تحقیق کے بالکل خلاف ہے[1]۔

حروفِ مقطعات جو سورتوں کے شروع میں آتے ہیں ان کے بارے میں بعض مفسرین کی رائے ہے کہ یہ سورتوں کے نام ہیں۔ بعض حضرات کے خیال میں اسمائے الٰہیہ کے رموز ہیں[2]۔

خطباتِ عرب کے دستور کے مطابق یہ حروف محض افتتاحِ کلام کے لیے لائے گئے ہیں اور یہ بات اس لیے زیادہ دل کو لگتی ہے کہ عرب اگر اس طرزِ خطاب وخطابت سے آشنا و مانوس نہ ہوتے تو تو اس پر اعتراض ضرور کرتے۔ اعتراض کے لیے مخالفین بہانے ڈھونڈھتے رہتے تھے لیکن ایسا اعتراض

[1] حاشیہ شیخ الہند ص۲　[2] معارف القرآن م ش ص۵۳

منقول نہیں ہے[۱]۔

جس زمانے میں قرآن نازل ہوا اُس دور کے اسالیبِ بیان میں اس طرح کے حروفِ مقطعات کا استعمال عام طور پر معروف تھا۔ خطباء اور شعراء دونوں اس اندازِ بیان سے کام لیتے تھے۔ چنانچہ اب بھی کلامِ جاہلیت کے جو نمونے محفوظ ہیں ان میں اس کی مثالیں ملتی ہیں۔ اس استعمال کی وجہ سے یہ مقطعات کوئی چیستان نہ تھے جس کو بولنے والے کے سوا کوئی نہ سمجھتا ہو بلکہ سامعین بالعموم جانتے تھے کہ اس سے مراد کیا ہے۔ بعد میں یہ اسلوبِ بیان عربی زبان میں متروک ہوتا چلا گیا[۲]۔

یہ سورتوں کے نام ہیں

قرآن کی انیس سورتیں ایسی ہیں جن کی ابتداء میں حروفِ مقطعات آئے ہیں۔ منجملہ ان کے سورۃ بقرہ ہے۔ ان حروف کو ان سورتوں کا نام یا عنوان سمجھنا چاہیئے جن میں ان کے مطالب کی طرف اشارہ کیا گیا ہے[۳]۔

بعض سلف جمہور متکلمین، خلیل اور سیبویہ نحوی کی رائے یہی ہے کہ یہ سورتوں کے نام ہیں۔ جو مضامین اس سورت میں بالتفصیل موجود ہیں یہ حروف اس تفصیل کا اجمال ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ نے الفوز الکبیر میں اسی مسلک کو اختیار فرمایا ہے[۴]۔

لیکن مشاہیر صحابہ تابعین میں سے اکثر کا اور جمہور مفسرین کا مسلک یہ ہے کہ یہ حروف ان متشابہات قرآنی سے ہیں جن کا علم عام بندوں کو نہیں دیا گیا ہے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ، حضرت عثمان غنیؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور شعبیؒ، سفیان ثوریؒ، ربیع بن خثیمؒ، اور ابو حاتمؒ سب کا یہی مذہب ہے (قرطبی، ابنِ کثیر)

یہ کہنا کچھ زیادہ باوزن نہیں ہے کہ قرآن کے مخاطب جب ہم ہیں تو ان حروف کو ہمارے لیئے قابلِ فہم ہونا چاہیئے۔ قرآنِ حکیم کے اندر رادر جتنے مضامین ہیں کیا وُہ سب ہر کس و ناکس کی سمجھ میں آ گئے ہیں؟ — یا کائنات خارجی میں جو کچھ موجود ہے کیا ان موجودات میں سب کا معرف بڑے بڑے فاضلوں اور ماہروں کی سمجھ میں آ گیا ہے[۵]؟

قرآن میں بہت سے مقامات ایسے ہیں جہاں فقط ایمان مطلوب ہے۔ اسی طرح حروفِ

---

[۱] تفسیر ماجدی ص۵ [۲] تفہیم القرآن ج۱ ص۴۹ [۳] ترجمان القرآن ج۱ ص۴ [۴] معارف القرآن م ج۱ ص۱۰۲ [۵] تفسیر ماجدی ص۵۔

مقطعات کے نازل کرنے سے مقصود یہ ہے کہ لوگ ان پر ایمان لائیں اور ان کے اللہ کی جانب سے ہونے کا یقین کریں[1]۔

یہ ظاہر ہے کہ نہ تو ان حروف کا مفہوم سمجھنے پر قرآن سے ہدایت حاصل کرنے کا انحصار ہے۔ اور نہ یہ بات ہے کہ اگر کوئی شخص ان کے معنے نہ جانتے گا تو اس کے راہِ راست پانے میں کوئی کمی رہ جائے گی۔ لہٰذا ایک عام ناظر کے لیئے کچھ ضروری نہیں ہے کہ وُہ ان کی تحقیق میں سرگرداں ہو[2]۔

قرآن کا پہلا تعارف

۱ــ ذَٰلِكَ الْكِتَابُ ۔ یہی کتاب فی الواقع کتاب ہے جو کتب الٰہیہ اور آسمانی صحیفوں کے متفرق علوم اور مضامین کی جامع ہے۔ زمخشری کہتے ہیں کہ مطلب یہ ہے کہ کتاب تو بس یہی کامل کتاب ہے اور اس کے سامنے جس قدر کتابیں لائی جائیں گی ناقص ہوں گی۔ بیضاوی فرماتے ہیں کہ یہی وُہ کتابِ کامل ہے جس میں کتاب کے نام سے موسوم ہونے کی صلاحیت ہے محض زبانی یاد داشتوں یا روایتوں کا مجموعہ نہیں بلکہ باضابطہ و مستند نوشتہ، ایک صحیفہ مکتوب ہے ـــــ قرآن مجید نے اپنا پہلا تعارف اسی حیثیت سے پیش کیا ہے کہ وُہ ضبطِ تحریر میں آیا ہوا مرتب ایک کتابی صورت میں صحیفہ آسمانی ہے۔ دوسرے مذہبوں کی الہامی کتابوں کی طرح نہیں کہ صاحبِ مذہب کے دماغ میں ان کے صرف معانی و مطالب ہوں۔ اور کوئی راوی ان سے کوئی ٹکڑا نقل کرے اور کوئی کچھ اور ۔ یہاں تک صدیوں بعد جب جمع و کتابت کی نوبت آئے تو صحتِ لفظی اور استنادِ حرفی تو خیر بہت دور کی بات ہے نفس مفہوم اور معنے تک مسخ ہو کر رہ جائے۔ اور نام تو ایک کتاب کا ہو لیکن اس کی ترتیب و تالیف میں خدا معلوم کتنے انسانی دماغ اور کتنے قلم شریک ہو جائیں۔ دلائل و شواہد کو جانے دیجئے محض دعوٰی کی حد تک بھی دُنیا کی حریف و مقابل کوئی الہامی کتاب نہیں ہے۔ تورات، انجیل ـــــ وید کسی کا بھی یہ دعوٰی نہیں ہے کہ وُہ لفظ بلفظ، حرف بحرف نازل شدہ کتاب ہے اور نہ ان کے پیرو انہیں اس حیثیت سے پیش کر رہے ہیں[3]۔

۲ــ اس کے خدا کی جانب سے ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ یعنی اس کے کلام الٰہی ہونے اور اس کے جملہ مضامین کے واقعی ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ جاننا چاہیئے کہ کسی کلام میں اشتباہ کی

[1] معارف القرآن م ا ص۱۳۔ [2] تفہیم القرآن ص۴۹ [3] تفسیر ماجدی ج۱ ص۵

هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝

پرہیزگار اور محتاط انسانوں کو فلاح اور کامیابی کی راہ بتانے والی ہے۔

دو صورتیں ہیں۔ یا تو خود اس کلام میں کوئی غلطی اور خرابی ہو۔ یا سُننے والے کی سمجھ میں خلل ہو۔ پہلی صُورت میں ریب اور شک کا محل یہ کلام ہے اور دُوسری صورت میں شک کا مقام خود سمجھنے والے کی اپنی سمجھ ہے۔ یہ کلام بالکل حق ہے خواہ کسی کو اپنی کم فہمی سے یہ کلام محلِ شک معلوم ہو۔ اس آیت میں پہلی صُورت کی نفی فرمائی ہے۔ لہٰذا اب یہ شبہ کہ قرآن کے کلامِ الٰہی ہونے میں تو سب کا فرِ دل کو شک و انکار تھا بے محل ہے۔ باقی رہی دوسری صُورت کہ سُننے والوں کی سمجھ میں کمی کی وجہ سے سُننے والوں کو اس کے کلامِ الٰہی ہونے میں شبہ ہے اس کا جواب آگے تیسرے رکوع میں آرہا ہے یعنی وَاِنْ كُنْتُمْ فِىْ رَيْبٍ آیت میں[1]۔

اس حقیقت کو ایک اور پہلو سے دیکھیئے کہ قرآن بجائے خود ایک عالم ہے۔ اس عالمِ قدس کے اندر نہ کسی شک و تردد کی گزر ہے۔ نہ غلیان و اضطراب کا۔ یہاں تو جو کچھ ہے تسکین و اطمینان ہے، علم و ایقان ہے، بصیرت و اذعان ہے، ہر دعویٰ مدلل ہے اور ہر حقیقت ثابت شدہ ہے۔ اب اگر کسی بدنصیب کو اس کے خلاف نظر آتا ہے تو گناہ چشمۂ آفتاب کا نہیں بلکہ قصور اس کی شپرہ چشمی کا ہے[2]۔

اس آیت کا ایک سیدھا سادا مطلب تو یہ ہے کہ بے شک یہ اللہ کی کتاب ہے۔ مگر ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ ایک ایسی کتاب ہے جس میں شک کی کوئی بات نہیں ہے۔ دُنیا میں جس قدر کتابیں امور بعد الطبیعت اور حقائق ماوراء ادراک سے بحث کرتی ہیں وُہ سب قیاس، گمان پر مبنی ہیں۔ اس لیے خود ان کے مصنف بھی اپنے بیانات کے بارے میں شک سے پاک نہیں ہو سکتے چاہے وُہ کتنے ہی یقین کا اظہار کریں۔ لیکن یہ ایسی کتاب ہے جو سرتاسر علم حقیقت پر مبنی ہے۔ اس کا مصنف وُہ ہے جو تمام حقیقتوں کا علم رکھتا ہے۔ اس لیئے فی الواقع اس میں شک کے لیئے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ یہ دوسری

---

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ ص۳ [2] تفسیر ماجدی ج۱ ص۵

بات ہے کہ انسان اپنی نادانی کی بنا پر اس کے بیانات میں شک کریں[1]۔

۳ یہاں سے آخر قرآن تک بندے کی جانب سے کیے گئے سوال اھدنا الصراط المستقیم کا جواب ہے۔ اسی لیئے فاتحہ کے بعد یہ سورت آئی ہے۔ گویا یوں کہا گیا ہے کہ جس راہ نمائی کی تلاش میں ہو وُہ یہ ہے۔ بندہ دُعا کرتا ہے کہ اے اللہ میری رہنمائی فرما۔ جواب میں اللہ سبحانہ پورا قرآن اس کے سامنے رکھ دیتا ہے کہ لو یہ ہے میری رہنمائی جس کی تو نے مجھ سے درخواست کی ہے۔ لیکن جواب میں یہ شرط ہے کہ یہ کتاب متقیوں کے لیئے رہنمائی کا کام کرے گی۔

یعنی جو بندے اپنے خدا سے ڈرتے ہیں ان کو یہ کتاب راستہ بتلاتی ہے کیونکہ جو اپنے خُدا سے خائف ہو گا اس کو امور مرضیہ اور غیر مرضیہ یعنی طاعت و معصیت کی ضرور تلاش ہو گی اور جس نافرمان کے دل میں خوف ہی نہیں اس کو طاعت کی کیا فکر اور معصیت سے کیا اندیشہ ہے[2]۔

مطلب یہ ہے کہ یہ کتاب کوئی تاریخ کا دفتر نہیں کہ اس میں سن وار ترتیب کے ساتھ گذشتہ زمانے کے واقعات درج ہوں، کوئی سائنس کی کتاب نہیں کہ علومِ طبعی کے مسائل کا حل اس کے اوراق میں ڈھونڈھا جائے، کوئی فلسفے کا مقالہ نہیں کہ اس کے پڑھنے والے اشراقیوں اور مشائیوں، یونانیوں اور ہندیوں کے ظنون و نظریات میں اُلجھے رہیں، افسانے اور محاضرات کی کتاب نہیں کہ پڑھنے والے اسے تفریح اور دِل بہلاوے کے لیئے پڑھیں۔ اس کی اصل اور بنیادی حیثیت صرف یہ ہے کہ وُہ ہدایت نامہ ہے، دستورِ حیات ہے، مکمل اور مفصل نقشۂ زندگی ہے[3]۔

اجتماعی زندگی میں تقویٰ

لیکن اس سے فائدہ اُٹھانے کے لیئے ضروری ہے کہ آدمی میں چند صفات پائی جاتی ہوں۔ ان میں سے اوّلین صفت یہ ہے کہ آدمی متقی ہو، پرہیزگار ہو، بھلائی اور بُرائی میں تمیز کرتا ہو، بُرائی سے بچنا چاہتا ہو، بھلائی کا طالب ہو اور اس پر عمل کرنے کا خواہش مند ہو۔ وُہ لوگ جو دُنیا میں جانوروں کی طرح جیتے ہیں جنہیں کبھی یہ فکر لاحق نہیں ہوتی کہ جو کچھ وُہ کر رہے ہیں وُہ صحیح بھی ہے یا نہیں۔ تو ایسے لوگوں کے لیئے قرآن میں کوئی رہنمائی نہیں ہے[4]۔

بہرحال قرآنِ حکیم سے استفادہ کے لیئے اوّلین شرط دِل کے اندر کا تقویٰ ہے۔

---

[1] تفہیم القرآن ج ۱ ص ۴۹ [2] حاشیہ شیخ الہند ص ۳ [3] تفسیر ماجدی ص ۶ [4] تفہیم القرآن ص ۵

الَّذِیۡنَ یُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡغَیۡبِ

(متقی وہ ہیں) جو بن دیکھی[1] حقیقتوں پر ایمان رکھتے ہیں یعنی جو حقائق ان کے حواس و عقل سے بالا ہیں ان کا یقین کرتے ہیں۔

لغت میں تقویٰ کے معنے حفاظت کے ہیں اور اصطلاحِ شریعت میں ان چیزوں سے بچنے کو تقویٰ کہتے ہیں جو آخرت کے لحاظ سے ضرر رساں ہوں چاہے ان کا تعلق عقائد و اخلاق سے ہو اور اقوال، افعال اور احوال سے ہو[1]۔

گویا متقی ایسا آدمی ہوتا ہے جو اپنے فکر و عمل میں بے پروا نہیں ہوتا۔ ہر بات کو درستگی کے ساتھ سمجھنے اور کرنے کی کھٹک رکھتا ہے۔ بُرائی اور نقصان سے بچنا چاہتا ہے اچھائی اور فائدے کی جستجو رکھتا ہے۔ قرآن کہتا ہے ایسے ہی لوگ تعلیمِ حق سے فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔

حضرت عمرؓ نے حضرت ابی بن کعبؓ سے دریافت کیا تھا کہ تقویٰ کی حقیقت کیا ہے؟ اُنہوں نے کہا کہ تم کبھی ایسے راستہ پر نہیں چلے جس میں کانٹے ہوں۔ فرمایا ہاں۔ کہا کہ اس حالت میں تم نے کیا کیا۔ فرمایا میں نے کوشش کی کہ کانٹوں سے بچ نکلوں۔ کہا کہ بس یہی تقویٰ کی حقیقت ہے[2]۔

قرآن میں ایک موقعہ پر هُدًى لِّلنَّاسِ (یعنی قرآن ہدایت ہے انسانوں کے لیے) بھی فرمایا ہے یہ گویا اس طرف اشارہ ہے کہ جو متقی نہیں ہیں وہ درحقیقت انسان ہی نہیں۔ انسانیت اور آدمیت کا تقاضا یہ ہے کہ اپنے خالق اور مالک سے ڈرے اور جو نہیں ڈرتا وہ انسان نہیں ہے جانوروں کی طرح ہے۔ سفرِ آخرت کے لیے تقویٰ کا زادِ راہ اور تقویٰ کا لباس ہی کار آمد اور مفید ہے۔ بغیر زادِ راہ کے جیسے ایک مسافر کا سفر ناممکن ہے اسی طرح بغیر تقویٰ کے توشہ کے آخرت کا سفر ناممکن ہے۔

وَتَزَوَّدُوا فَإِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوَىٰ ۔

[1] معارف م ا ص۱۰۳ ملخصاً [2] ترجمان القرآن ج ۱ ص۱۳۰

اور جیسے ایک معمولی راستہ سے برہنہ گزرنا خلافِ حیا اور بے شرمی ہے ایسے ہی صراطِ مستقیم پر لباسِ تقویٰ کے بغیر چلنا بے حیائی اور بے شرمی ہے[1]۔

ایمان بالغیب

۴ــــ اسلام کی قانونی زبان میں ایمان انقیاد و طاعت کی اُس آخری منزل کا نام ہے۔ جس کے بعد اوامرِ الٰہیہ اور منہیات شرعیہ کے قبول کرنے سے دل میں کوئی کمی باقی نہ رہے۔ مُخبرِ صادق پر وُہ اعتماد ہو جائے کہ دل کی تمام خوش حالی اور رُوح کی کامل مسرت اس کے باور کرنے مان لینے میں منحصر نظر آنے لگے۔ گویا جذبہ وفاداری طلب دلائل کی مہلت ہی نہ دے۔ راہِ حق میں ہر نئی قربانی ایک نئی لذت کا سامان ہو۔ اور ایک ادنیٰ نافرمانی وُہ تلخ گھونٹ بن جائے جو گلے سے نہ اُتر سکے۔ اس آیت میں ان سرفروشوں کی اسی سرمستی کا ذکر کیا گیا ہے یعنی متقیوں کی وہ جماعت ہے جو محض جذبۂ فرمانبرداری میں دیکھی اور ان دیکھی باتوں کی یکساں تصدیق کرتی ہے آنکھ اگر دیکھتی ہے اور تصدیق کرتی ہے، کان اگر سنتے اور مان لیتے ہیں تو یہ ان کا طبعی تقاضا ہے۔ لیکن آنکھیں اگر نہیں دیکھتی ہیں، کان اگر نہیں سنتے ہیں تو پھر ان پر اعتماد کر کے مان لیتے ہیں جن کی صداقت پر سارا جہان قربان ــــ یہی وثوق و اعتماد ایمان کی جان ہے۔ اس لیئے اصطلاح میں خبرِ رسول کو رسول کے اعتماد پر یقینی طور پر مان لینے کا نام ایمان ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ عقلِ انسانی جب نشۂ یقین سے مخمور ہو جاتی ہے تو قلب و نفس بھی اس قدر متاثر ہو جاتے ہیں کہ پھر عالمِ غیب پر ان کو محسوسات کی طرح یقین نصیب ہو جاتا ہے۔ غیب سے مُراد وُہ چیزیں ہیں جو عقل و حواس سے مخفی ہوتی ہیں جیسے جنت دوزخ ملائکہ۔ ان سب کو اللہ اور رسول کے ارشاد کی وجہ سے حق اور یقینی سمجھتے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ ان امورِ غائبہ کا مُنکر ہدایت سے محروم ہوتا ہے[2]۔

مطلب یہ ہے کہ ان حقائقِ غیبیہ کو بغیر دیکھے ماننا اور اس اعتماد پر ماننا کہ زبانِ نبوت خبر دے رہی ہے ایمان بالغیب ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص ان غیر محسوس حقیقتوں کو ماننے کے لیئے تیار ہو صرف وہی قرآن کی رہنمائی سے فائدہ اُٹھا سکتا ہے[3]۔

---

[1] معارف القرآن م الخصاً ص۳۶ [2] حاشیہ شیخ الہندؒ ص۳ [3] تفہیم القرآن ج ا ص۵

ایمان کے معنے

دراصل ایمان کا لفظ امن سے مشتق ہے اس لیئے امانت و اعتماد کے معنے اس میں بہرحال میں موجود ہونے ضروری ہیں۔ محسوسات و مشاہدات میں کسی کی بات مان لینے کو ایمان نہیں کہتے۔ اگر ایک شخص طلوعِ آفتاب کی خبر دیتا ہے تو آپ اس کے جواب میں آمنت نہیں کہہ سکتے۔ ایمان کا تعلق ہمیشہ غائبات سے اور ان حقائق سے ہوتا ہے جو انسان کے حواس سے پوشیدہ اور کبھی براہِ راست عام انسانوں کے مشاہدے میں نہیں آتے۔ غائبات اور ایمان کی اسی خصوصیت کو یؤمنون بالغیب میں بتایا گیا ہے۔ یہاں غیب کا لفظ صرف بطور بیان نہیں آیا ہے بلکہ اس حقیقت کو واضح کرنے کے لیئے کہ ایمان کا تعلق صرف غائبات کے ساتھ ہے۔ مشاہدات کے ساتھ ایمان کا کوئی تعلق نہیں ہے — اگر یہ حقیقت پورے طور پر سمجھ لی جائے تو یہ بات سمجھ لینے میں کوئی دشواری نہ رہے گی کہ دلائل سے گذر کر صرف رسول کے اعتماد پر اس کے اقوال و افعال کو تسلیم کر لینے کا نام ایمان ہے۔ اسی میں انسانی عقول کی آزمائش ہے۔

اگر نبوت اللہ تعالیٰ کی نمائندہ ہے اور نبی جو کچھ کہتا ہے خدا کی طرف سے کہتا ہے تو اس کے اعتماد پر اس کے تمام دین کو تسلیم کر لینا طبیعت کا ایک تقاضا ہونا چاہیئے۔ کسی حقیقت کے مسلّم ہو جانے کے بعد دلائل کی تلاش روشن خیالی نہیں ہے۔ ایمان بالغیب کا راستہ ہی ایک راستہ ہے جس میں روح کو حقیقی اطمینان حاصل ہو سکتا ہے اس لیئے اس فقرے کا مطلب یہ ہے کہ — ایمان ایسے عالم پر رکھتے ہیں جو محسوسات و معقولات سے ماوراء ہے اور جس کی بابت خبریں صرف نبی کے ذریعے معلوم ہو سکتی ہیں۔ غیب لغت میں شہود کی ضد ہے۔ ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو نظر سے چھپی ہوئی ہو یا مشاہدہ و تجربہ سے باہر ہو۔ آیت میں الغیب سے مُراد ائمہ تفسیر نے وُہ عالم لیا ہے جو حواس و عقل سے ماوراء ہے اور جس کی بابت جو کچھ بھی علم ہوتا ہے وُہ نبوت پر آئی ہوئی وحی کے ذریعے ہوتا ہے[1]

لفظ غیب کے معنے لفظ غیب پورے قرآن میں بصورت نکرہ کہیں نہیں آیا ہے۔ ہر جگہ

---

[1] تفسیر ماجدی ج ۱ ص ۲

معروف ہے۔ اس جگہ بھی معرفہ آیا ہے اور مطلب یہ ہے کہ جن چیزوں کا صحیح علم بغیر وحی کے نہیں ہو سکتا۔ احساس اور ادراک کی وہاں تک رسائی نہیں ہوتی ہے اور نبوت وحی کے ذریعے ان کو اطلاع دیتی ہے وُہ نبوت کے بتانے سے مانتے اور یقین رکھتے ہیں[1]۔

حقائق غیبیہ جو مخلوق کی علمی رسائی اور حس سے بالا ہیں۔ ان کا علم اللہ تعالیٰ کو خود بخود ہے یعنی وُہ اپنے علم میں کسی ذریعہ اور وسیلہ کا محتاج نہیں ہے۔ زمخشری نے اسی کی طرف اشارہ کیا ہے کہ غیب سے وُہ مخفی اور پوشیدہ چیزیں مراد ہیں جن تک بلا واسطہ اللہ کے سوا کسی کے علم کی رسائی نہیں ہے۔ المراد به الخفی الذی لا ینفذ فیه ابتداء الا علم اللطیف الخبیر۔ اور یہ بھی لکھا ہے کہ ہمیں تو ان حقائق غیبیہ میں سے صرف ان کا علم ہوتا ہے جو ہمیں بتلائی جاتی ہیں۔ اس لیے کسی شخص کے بارے میں یہ کہنا درست نہیں ہے کہ فلاں غیب دان ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کے لیے غیب دان بولنا جائز نہیں ہے۔ اور میر سیدؒ نے اس کی عقلی وجہ یہ بتائی ہے کہ کسی کو دانائے غیب کہنا اس لیے درست نہیں ہے کہ اس سے بلا واسطہ اس کی علمی رسائی کا دعویٰ ہوتا ہے۔ یہ کہنا تو درست ہے کہ اللہ نے فلاں کو غیب کی بات بتادی ہے لیکن یہ کہنا ٹھیک نہیں ہے کہ فلاں غیب دان ہے۔ پہلی بات میں ذریعہ کا اقرار ہے اور دوسرے پیمانہ میں واسطہ اور ذریعہ کا انکار ہے۔

اگر یہ حقیقت ہے کہ نبی وُہ ذاتِ گرامی ہے جس کا علمی ذریعہ اللہ کی وحی ہو تو پھر یہ کہنا کہ نبی غیب دان ہے میر سیدؒ کے لفظوں میں صریح تناقض ہے کیونکہ نبی کے لیے وحی کو علمی ذریعہ مان کر نبی کو غیب دان کہنے والا اس ذریعہ کی نفی کرتا ہے۔ میر صاحبؒ کے الفاظ یہ ہیں:

لانه یتبادر منه تعلق علمه به ابتداء فیکون تناقضاً[2]

بہر حال آیت قرآنی میں غیب سے مُراد اس عالم کے حقائق ہیں جو حواس وعقل انسانی سے ماوراء ہے یوں سمجھئے کہ

انسان کے علم و ادراک کا ذریعہ حواسِ خمسہ ہیں یعنی دیکھنے، سننے، سونگھنے، چکھنے اور چھونے کی قوتیں۔ جو کچھ ان کے ذریعے معلوم ہو سکتا ہے وُہ اس کے لیے محسوس ہے اور جو معلوم نہیں ہو سکتا غیر محسوس ہے۔ قرآن نے اس مطلب کے لیے غیب اور شہادت کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔

---

[1] لغات القرآن ص۲۸ [2] حاشیہ کشاف ج ۱ ص۹۵

وَيُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُونَ ۝

اور وُہ نمازؔ قائم کرتے ہیں۔ اور جو کچھ ہم نے ان کو (نعمتیں) دی ہیں اس میں سے وُہ خرؔچ کرتے ہیں۔

عالمِ غیب یعنی غیر محسوسات، عالمِ شہادت یعنی محسوسات فرمایا۔ خُدا پرستی کی بنیاد یہ ہے کہ ان حقائق پر یقین رکھے جو اگرچہ اس کے لیئے غیر محسوس ہیں لیکن وجدان ان کی شہادت دیتا ہے اور وحی نے ان کو خبر دی ہے مثلاً خدا کی ذات وصفات، ملائکہ، وحی و نبوت، مرنے کے بعد کی زندگی، عذاب و ثواب، دُنیا کی ابتدائی پیدائش، عالمِ آخرت کے احوال و واردات[1]۔

اقامتِ صلوٰة

۵ — اقامتِ صلوٰة کا مطلب یہ ہے کہ ہمیشہ رعایت حقوق کے ساتھ وقت پر نماز ادا کرتے ہیں[2]۔ قائم رکھنا یہ بھی ہے کہ اس کو پابندی سے ہمیشہ ادا کرتے ہیں اور اس کے شرائط اور ارکان پورے بجالاتے ہیں[3]۔

اقامتِ صلوٰة کے معنے صرف نماز پڑھنے کے نہیں ہیں بلکہ نماز کو ہر جہت اور ہر حیثیت سے درُست کرنے کا نام اقامتِ صلوٰة ہے اور صحیح یہ ہے کہ اس جگہ نماز سے کوئی خاص نماز مُراد نہیں ہے۔ بلکہ فرائض، واجبات اور نفلی نمازوں کو یہ لفظ شامل ہے[4]۔

یہ قرآن سے فائدہ اُٹھانے کی تیسری شرط ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ صرف مان کر بیٹھ جانے والے ہوں وُہ قرآن سے فائدہ نہیں اُٹھا سکتے۔ اس سے فائدہ اُٹھانے کے لیئے ضروری ہے۔ کہ آدمی ایمان لانے کے بعد فوراً ہی عملی طاعت کے لیئے آمادہ ہو جائے اور عملی طاعت کی اوّلین علامت اور دائمی علامت نماز کی ادائیگی ہے۔ ایمان لانے کے بعد چند گھنٹے بھی نہیں گذرتے کہ موذن نماز کے لیئے

[1] ترجمان القرآن ج ۱ صفحہ ۳۰۴ ۔ [2] حاشیہ شیخ الہند صفحہ ۳ ۔ [3] بیان القرآن ج ۱ صفحہ ۳ ۔ [4] معارف القرآن م ش ج ۱ صفحہ ۵۵

پکارتا ہے اور اس وقت فیصلہ ہو جاتا ہے کہ ایمان کا دعویٰ کرنے والا اطاعت کے لیئے بھی تیار ہے یا نہیں پھر یہ مؤذن پانچ وقت پکارتا رہتا ہے۔ اور جب بھی انسان اس کی پکار پر لبیک نہ کہے اسی وقت ظاہر ہو جاتا ہے کہ مدعی ایمان میں طاعت کا مادہ کس قدر ہے۔

صلوٰۃ کے معنے

صلوٰۃ کے لفظی معنے دُعار کے ہیں۔ امام راغبؒ کا بیان ہے کہ بہت سے اہلِ لغت کا بیان ہے۔ کہ صلوٰۃ کے معنے دُعار کرنے، برکت مانگنے اور بزرگی سے یاد کرنے کے ہیں۔ اور وُہ صلوٰۃ جو عبادتِ مخصوصہ ہے یعنی نماز، اس کی اصل بھی دُعار ہے۔ جس طرح کسی چیز کو اس کے بعض اجزار کے نام پر موسوم کر دیتے ہیں اسی طرح یہ عبادت بھی صلوٰۃ سے موسوم ہوئی ہے کیونکہ یہ دُعار پر مشتمل ہے۔ نماز ان عبادات میں سے ہے جس سے کوئی شریعت خالی نہیں رہی۔ گو اس کی صُورتیں ہر شریعت میں مختلف رہی ہیں۔ اور بعض علمار کا خیال ہے کہ صلاۃ کی اصل صلا ہے ان کا بیان ہے کہ صلّیٰ کے معنے ہیں عبادت کے ذریعے صلا کو جو اللہ کی سلگائی ہوئی آگ ہے اپنے اُوپر سے ہٹا دیا۔[1]

بعض علمار کے نزدیک اگرچہ اس مقام پر صلاۃ سے مطلق نماز مراد ہے فرض ہو یا نفل۔ لیکن امام رازیؒ فرماتے ہیں کہ فرض نماز مُراد ہے کیونکہ اولٰئک ھم المفلحون میں جس فلاح کی خبر دی گئی ہے وُہ صرف فرض نماز پر موقوف ہے جیسا کہ صحیحین میں ہے کہ ایک اعرابی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اسلام کے کچھ مسائل اور احکام دریافت کیے۔ آپ نے فرمایا کہ اللہ نے دِن رات میں پانچ نمازیں تم پر فرض کی ہیں۔ اعرابی نے دریافت کیا کہ کیا اور بھی کوئی نماز فرض ہے۔ آپ نے فرمایا نہیں اس کے بعد اس شخص نے زکوٰۃ اور روزے کے بارے میں دریافت کیا اور یہ کہتا ہوا چل دیا کہ خدا کی قسم میں زیادتی اور کمی نہ کروں گا۔ حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اعرابی کی یہ بات سُن کر ارشاد فرمایا کہ:

افلح الرجل ان صدق۔

• اگر اس نے سچ کہا ہے تو فلاح پائی۔[2]

شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ اقامتِ صلاۃ نماز قائم کرنا عربی زبان کے محاورے قامت السوق سے بنا ہے یہ اس وقت بولا جاتا ہے جب بازار میں خوب چہل پہل ہو جائے اور کاروبار عام ہو جائے

---

[1] لغات القرآن ج ۴ ص۲۴ [2] معارف القرآن م ا ج ا ص۱۰۶

اس لیئے اقامتِ صلاۃ کے معنے صرف یہی نہیں ہیں کہ آدمی پابندی کے ساتھ نماز ادا کرے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اجتماعی طور پر نماز کا نظام باقاعدہ قائم کیا جائے۔ اگر کسی محلہ یا بستی میں ایک شخص نماز کا انفرادی طور پر پابند ہو لیکن جماعت نہ ہوتی ہو تو یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہاں نماز قائم کی جارہی ہے۔[1]

بہرحال ان دیکھے خدا کے سامنے جھکنے، سر عبودیت خم کرنے، اس سے گہرا ربط و تعلق پیدا کرنے اور خود افرادِ اُمت میں باہم نظم پیدا کرنے کا بہترین ذریعہ نماز ہے۔ اور بدنی عبادتوں میں یہی فریضہ سب سے اعلیٰ اور ایمان و توحید کا سب سے بڑا عملی مظہر ہے فرد کیلئے اسلامی نماز باجماعت کے جو اخلاقی، طبی، مادی فائدے ہیں۔ نیز مِلت کے لیئے جو معاشرتی، اجتماعی مصلحتیں ہیں ان کی جھلک کہیں دُور سے دیکھ کر یہود، مسیحی اور منکرین تک اس کے دلدادہ ہو گئے ہیں۔ اور ان کے اہلِ علم اپنی تحریروں میں بار بار اس کا ذکر داد اور مدح کے لہجے میں کر چکے ہیں۔[2]

اَنفاقِ رزق

۶۔ رزق کلامِ عرب میں بڑے وسیع معنے رکھتا ہے۔ اس کے اندر ہر قسم کی نعمتیں آجاتی ہیں خواہ ظاہری و مادی ہوں مثلاً مال، صحت، اولاد، یا معنوی و روحانی مثلاً علم و حکمت، فہم سلیم وغیرہ۔ رزقنٰھم میں ہر رزق کو اپنی طرف منسوب کرکے بتا دیا کہ جو نعمت جتنی اور جس قسم کی بھی انسان کو ملتی ہے سب اللہ تعالیٰ کے فیض و عطا کا ثمرہ ہوتی ہے انسان کی اپنی کوئی چیز نہیں ہوتی۔[3]

یہ قرآن کی رہنمائی سے فائدہ اُٹھانے کی چوتھی شرط ہے کہ آدمی تنگدل نہ ہو، زر پرست نہ ہو، اس کے مال میں خدا اور بندوں کے جو حقوق مقرر کیئے جائیں انہیں ادا کرنے کے لیئے تیار ہو، جس چیز پر ایمان لایا ہے اس کی خاطر مالی قربانی کرنے میں دریغ نہ کرے۔[4]

سب طاعتوں کی اصل تین ہیں۔ اوّل جو باتیں دِل سے تعلق رکھتی ہیں۔ دوسری بدن سے تیسری مال سے اس آیت میں تینوں کو بالترتیب بیان کر دیا ہے۔[5]

اَنفاق سے مُراد

صحیح اور تحقیقی بات جسے جمہور مفسرین نے اپنایا ہے یہی ہے کہ اس آیت میں ہر قسم کا وُہ خرچ داخل

---

[1] تفہیمات الٰہیہ [2] تفسیر ماجدی صفحہ ۶ [3] تفسیر ماجدی صفحہ ۷ [4] تفہیم القرآن صفحہ ۴۹ [5] حاشیہ شیخ الہندؒ صفحہ ۳

وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۝

اور وُہ لوگ جو اس صداقت پر ایمان رکھتے ہیں جو تم اللہ کی جانب سے لے کر آئے ہو اور ان تمام سچائیوں پر بھی جو تم سے پہلے دوسرے انبیاء لاتے رہے ہیں۔ اور اس زندگی کے بعد آنے والی زندگی پر بھی بھرپور یقین رکھتے ہیں (نہ کہ موجودہ عارضی زندگی پر)

ہے جو اللہ کی راہ میں کیا جائے خواہ فرض زکوٰۃ ہو یا دوسرے صدقات، واجب یا نفلی صدقات وخیرات۔ کیونکہ قرآن حکیم میں جہاں بھی لفظ انفاق آیا ہے عموماً نفلی صدقات ہیں یا عام معنے میں استعمال ہوا ہے فرض کے لیئے عموماً لفظ زکوٰۃ ہی آیا ہے۔ اس مختصر جملے میں لفظ مما رزقناھم پر غور فرمائیے کہ ایک طرف اس کے ذریعے اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے کا ایک قوی داعیہ انسان کے دل میں اس تاثر کے ساتھ پیدا کیا ہے کہ جو کچھ مال ہمارے پاس ہے یہ اللہ تعالیٰ ہی کا دیا ہُوا اور اس کی امانت ہے۔ اگر ہم تمام مال کو بھی اس کی راہ میں اس کی رضا کی خاطر خرچ کر دیں تو حق اور بجا ہے ——— اور دوسری طرف مِمّا کا اضافہ کرکے یہ بھی فرما دیا کہ اللہ کی راہ میں سب نہیں بلکہ کچھ دینا ہے[1]

یہ آیت دراصل دورِ نبوت کے صحابہ کی مدح میں آئی ہے۔ صحابہ کا حال یہ تھا کہ وُہ بھی جن کے پاس کچھ نہ تھا اللہ کی راہ میں کچھ نہ کچھ دینے کے لیے بیقرار رہتے تھے۔ چنانچہ جب یہ حکم ہوا کہ مُسلمان پر صدقہ دینا واجب ہے تو غریب و نادار صحابہ نے آکر عرض کی کہ اے خُدا کے رسول! جس کے پاس نہ ہو وُہ کیا کرے۔ فرمایا وُہ محنت مزدوری کرکے اپنے ہاتھ سے پیدا کرے خود بھی فائدہ اُٹھائے اور دُوسروں کو بھی صدقہ کرے۔ انہوں نے پھر گذارش کی کہ جس میں اس کی بھی طاقت نہ ہو تو وُہ کیا کرے۔

[1] معارف القرآن م ش ج ۱ ص۵۵

فرمایا کہ وُہ فریاد خواہ حاجت مند کی مدد کرے۔ انہوں نے دریافت کیا کہ اگر اس کی بھی قدرت نہ ہو تو ارشاد ہوا کہ وُہ نیکی کا کام کرے اور بُرائی سے بچے۔ یہی اس کا صدقہ ہے۔ حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کا یہ اثر ہوا کہ صحابہ بازار جا کر مزدوری کرتے اور جو کچھ ملتا اس کو اللہ کی راہ میں خرچ کرتے۔

اللہ کی کتابوں پر ایمان

۷ — پہلی آیت میں ان لوگوں کا بیان تھا جن مشرکینِ مکہ نے ایمان قبول کیا۔ اور اس آیت میں ان کا بیان ہے جو اہلِ کتاب یعنی یہود و نصاریٰ سے مشرف باسلام ہوئے[۱] — مطلب یہ ہے کہ اس آیت میں متقین کی باقی صفات کی نشاندہی کی گئی ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ زمانۂ نبوت میں متقین دو طرح کے حضرات تھے۔ ایک وُہ جو پہلے مشرکین میں سے تھے پھر مشرف باسلام ہو گئے تھے۔ دوسرے وہ جو پہلے اہلِ کتاب یہودی یا نصرانی تھے پھر مسلمان ہو گئے تھے۔ اس سے پہلی آیت میں پہلے طبقہ کا ذکر ہے اور اس آیت میں دُوسرے طبقہ کا[۲]

یہ فرمایا کہ وُہ رسول کے لائے ہوئے ہر پیغام پر ایمان رکھتے ہیں۔ آیت کی عبارت سے یہ مسئلہ صاف ہو جاتا ہے کہ تین چیزیں الگ الگ ہیں۔ ایک کلام کا نازل کرنے والا یعنی اللہ تعالیٰ، دوسرے وُہ جس پر کلام نازل ہوا یعنی اللہ کا رسول، تیسرے خود کلام۔ بروز، تمثل اور حلول و وحدت، سب مشرکانہ و نیم مشرکانہ خیالات کی جڑ اس آیت نے کاٹ ڈالی۔ نہ کلام متمثل ہوا ہے نہ رسول اللہ کا اوتار انسانی قالب میں خدا ہے۔ بلکہ خدا خدا ہے اور رسول ایک مستقل عظیم المرتبت انسانی شخصیت ہے اور انسانی شخصیت پر اللہ کا کلام بذریعہ وحی اُتارا گیا ہے[۳]

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے قرآن کی رہنمائی سے فائدہ اُٹھانے کی پانچویں شرط یہ بتائی ہے کہ آدمی ان تمام کتابوں کو جو خدا نے وحی کے ذریعے حضور نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان سے پہلے کے انبیاء پر مختلف زمانوں اور ملکوں میں نازل کیں ایمان لائے — اس شرط کی بناء پر قرآن کی ہدایت کا دروازہ ان سب لوگوں پر بند ہے جو سرے سے اس کی ضرورت ہی کو نہ مانتے ہوں یا اس کی ضرورت کو تو مانتے ہوں مگر اس کے لیے وحی و رسالت کی طرف رجوع کرنا غیر ضروری سمجھتے

---

[۱] حاشیہ شیخ الہندؒ ص۵ [۲] معارف القرآن م ش ص۵۹ [۳] تفسیر ماجدی ص۷

ہوں اور خود کچھ نظریات قائم کرکے انہی کو خدائی ہدایت قرار دے بیٹھیں۔ یا آسمانی کتابوں کو مانتے ہوں مگر صرف ان کتابوں کو مانیں جن کو ان کے باپ دادا مانتے چلے آئے ہیں اور اسی سرچشمہ سے نکلی ہوئی دوسری ہدایات کے منکر ہوں۔ ایسے سب لوگوں کو مخاطب کرکے قرآن بتا رہا ہے کہ قرآن اپنا چشمۂ فیض صرف ان کے لیئے کھولتا ہے جو اپنے آپ کو خدائی ہدایت کا محتاج مانتے ہوں اور یہ بھی تسلیم کرتے ہوں کہ اللہ سبحانہٗ کی یہ ہدایت ہر انسان کے پاس الگ الگ نہیں آتی بلکہ انبیاء کے ذریعے ہی خلق تک پہنچتی ہے۔ اور پھر وُہ کسی نسلی اور قومی تعصب میں بھی مُبتلا نہ ہوں اس لیئے حق جہاں آیا ہے اور جس شکل میں آیا ہے اس کے آگے سر جُھکا دیں[1]۔

۸۔۔۔آپ سے پہلے انبیاء خواہ وُہ کسی ملک کسی قوم اور کسی زمانہ کے ہوں اور کوئی زبان بولتے ہوں۔ قرآن نے اس آیت کے ذریعے یہ بات صاف کر دی ہے کہ سلسلہ ارشاد و ہدایت کوئی نو پید چیز نہیں بلکہ اس وقت سے قائم ہے جب سے انسان دُنیا میں آیا۔ سلسلۂ وحی کی عمر اتنی ہی قدیم ہے جتنی کہ انسان کی۔ اور مومن کے لیئے تصدیق صرف حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کی کافی نہیں بلکہ سارے انبیاء و رسل اور ان کی وحی کی ضروری ہے خواہ وُہ درجہ اجمال میں ہو[2]۔

ختمِ نبوّت کی طرف بلیغ اشارہ

آیت کے اس اندازِ بیان نے اس اہم اور ضروری مسئلہ کی طرف بھی اشارہ کر دیا کہ حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی ہیں اور آپ کی وحی آخری وحی ہے۔ کیونکہ اگر قرآن کے بعد کوئی اور کتاب یا وحی آنے والی ہوتی تو جس طرح اس آیت میں پچھلی نبوّتوں اور کتابوں پر ایمان ضروری قرار دیا گیا ہے اسی طرح آئندہ نازل ہونے والی کتاب اور وحی پر ایمان لانے کا بھی ذکر ضروری ہوتا۔ لیکن قرآن سب کے سامنے کھلا ہوا ہے دُنیا دیکھ سکتی ہے کہ قرآن نے جہاں ایمان کا ذکر کیا ہے وہاں صرف حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے نازل ہونے والی وحی اور پہلے انبیاء کا ذکر کیا ہے آپ کے بعد آنے والی کسی وحی یا نبی کا کہیں قطعاً ذکر نہیں ہے پھر صرف اسی ایک پر منحصر نہیں بلکہ قرآن نے چالیس پچاس جگہ پر جہاں جہاں یہ تذکرہ چھیڑا ہے وہاں صرف حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے انبیاء پہلی وحی، پہلی کتابوں کا ذکر ہے ہر مقام پر اس کے لیئے من قبل اور من

۱؎ تفہیم القرآن ص۵۱   ۲؎ تفسیر ماجدی ص۷

قبلك کی تعبیر اختیار فرمائی ہے کہیں بھی من بعد — من بعدك نہیں آیا ہے۔ اگر نبوت ختم ہونے کا قرآن میں صراحتہً ذکر نہ بھی ہوتا تو قرآن کا یہ اندازِ بیان کافی ہوتا۔[1]

9 — اس زندگی کے بعد آنے والی زندگی۔ لفظ الآخرۃ قرآن میں کئی جگہ آیا ہے اس سے مُراد وُہ دار آخرت ہے جس کو قرآن دار القرار، دار الحیوان اور عقبیٰ کے نام سے پکارتا ہے۔ پُورا قرآن اس کے ذکر اور اس کے ہولناک حالات سے بھرا ہوا ہے۔ آخرت پر ایمان لانا اگرچہ ایمان بالغیب میں موجود ہے لیکن اسے خصوصیت کے ساتھ صراحتہً اس لیے ذکر کیا گیا ہے۔ کہ یہ اجزائے ایمان میں اس حیثیت سے بہت زیادہ اہم ہے کہ اس سے ایمان کے تقاضے پورا کرنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔[2]

دُنیا کی زندگی کے بعد آنے والی زندگی کو آخرت اسی اعتبار سے کہا جاتا ہے کہ وُہ اس ناسوتی زندگی کے بعد پیش آئے گی۔ قرآنِ عزیز میں اس کا ذکر کہیں الدار الآخرۃ سے آیا ہے اور کہیں صرف الآخرۃ سے۔ جزا و سزا کے لیے ایک مستقل آنے والی زندگی پر یقین رکھنا دینِ صحیح کے لوازم میں سے ہے۔ یہ چھٹی اور آخری شرط ہے۔ آخرت ایک جامع لفظ ہے جس کا اِطلاق بہت سے عقائد کے مجموعے پر ہوتا ہے۔ اس میں حسبِ ذیل عقائد شامل ہیں۔

۱۔ یہ کہ انسان اس دُنیا میں غیر ذمہ دار نہیں بلکہ اپنے تمام اَعمال کے لیے اللہ کے حضور میں جوابدہ ہے۔

۲۔ یہ کہ دُنیا کا موجودہ نظام ابدی نہیں بلکہ ایک وقت جسے اللہ ہی بہتر جانتا ہے یہ ختم ہو جائیگا۔

۳۔ یہ کہ اس دُنیا کی زندگی کے خاتمہ کے بعد اللہ تعالیٰ ایک دُوسرا عالم بنائے گا اور سب کو بیک وقت دوبارہ زندگی دے کر ان کے اعمال کا حساب لے گا۔

۵۔ یہ کہ کامیابی اور اصلی معیار موجودہ زندگی کی خوشحالی اور بدحالی نہیں ہے بلکہ درحقیقت کامیاب وُہ انسان ہے جو اللہ تعالیٰ کے آخری فیصلے میں کامیاب ہوگا اور ناکام وُہ ہے جو وہاں ناکام ہوگا۔

عقائد کے اس مجموعے پر جن لوگوں کو یقین نہ ہو وُہ قرآن سے کوئی فائدہ نہیں اُٹھا سکتے۔ کیونکہ ان باتوں کا انکار تو درکنار ان میں شک و تذبذب کرکے بھی کوئی انسان وُہ راستہ نہیں چل سکتا جو قرآن نے تجویز کیا ہے۔[3]

---

[1] معارف القرآن م ش ج ا صفحہ ۵۶ [2] معارف القرآن م ش ج ا صفحہ ۵۷ [3] تفسیر ماجدی صفحہ ۸ [4] تفہیم القرآن صفحہ ۵۲

ایمان بالآخرۃ

اسلامی عقائد میں یہی وُہ انقلابی عقیدہ ہے جس کے نتیجے میں اسلام کے دورِ اوّل میں ایسا پاکباز معاشرہ منصۂ وجود میں آگیا کہ مسلمانوں کی صورت اور اُن کا چال چلن دیکھ کر لوگ دِل وجان سے اسلام کے گرویدہ ہو جاتے تھے۔

اس پہلو پر غور فرمائیے کہ اس آیت میں بالآخرۃ کے لیے یومنون نہیں فرمایا یعنی یہ نہیں فرمایا کہ وُہ آخرت کی زندگی پر ایمان رکھتے ہیں بلکہ یہ فرمایا کہ بالآخرۃ ھم یوقنون یعنی وُہ آخرت کی زندگی پر یقین رکھتے ہیں۔ کیونکہ ایمان کے مقابلے میں تکذیب آتا ہے اور یقین کے مقابلے میں شک و تردد ہے۔ اس میں اشارہ ہے کہ آخرت کی زندگی کے لیے صِرف تصدیق کرنا مقصد کو پورا نہیں کرتا بلکہ اس کا ایسا یقین ضروری ہے جیسے کوئی چیز آنکھوں کے سامنے ہو متقین کی یہی صفت ہے کہ آخرت میں حق تعالیٰ کے سامنے پیشی اور حساب کتاب پھر جزا و سزا کا نقشہ ہر وقت ان کے سامنے رہتا ہے[1]۔

زمخشری مفسرِ قرآن جن کو اللہ نے عربی زبان شناسی اور قرآنی بلاغت کا عجیب ذوق عطا فرمایا ہے اس موقعہ پر بڑے پتے کی بات فرما گئے کہ عبارت تو بات کو بتانے کے لیے صرف یوقنون بالآخرۃ ہوتی تو بات کا پتہ لگ جاتا۔ لیکن عبارت میں دو تبدیلیاں کی گئی ہیں ایک یہ کہ بالآخرۃ کو پہلے لائے ہیں اور دوسری یوقنون کی پیشانی پر مسند الیہ ھم کا اضافہ کیا ہے۔ پہلی تبدیلی یعنی بالآخرۃ کو پہلے لا کر یہ جتانا مقصود ہے کہ ان کے یقین و اذعان کے دائرے میں آخرت کے سوا کچھ نہیں ہے۔ زندگی کے مختلف اعمال میں آخرت ہی ان کا مرکزی نقطہ ہے اور ان کے مدِمقابل آخرت کی زندگی کے بارے میں بے حقیقت ہیں ان کے سامنے صرف دُنیا کی زندگی اور اس کا عیش و عشرت ہے۔ دوسری تبدیلی یعنی ھُم کے اضافہ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ یہی لوگ یعنی صحابۂ کرام ہی اس یقین کی دولت سے مالا مال ہیں۔ ان کے مدِمقابل آخرت پر یقین کی اس نعمت سے قطعاً محروم ہیں[2] ——— بعض جدید اہلِ باطل نے الآخرۃ کا ترجمہ زمانۂ آخر کی وحی سے کیا ہے تاکہ اس سے ان کی خود ساختہ نبوت کا اجراء قرآن سے ثابت ہو

---

[1] معارف القرآن ج ۱ ص ۱۰۶ [2] کشاف ج ۱ ص ۱۰۸

أُولَٰٓئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِّن رَّبِّهِمْ ۖ وَأُولَٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۝

یہی لوگ اپنے پروردگار کی جانب سے ہدایت پر ہیں۔ اور یہی دُنیا و آخرت میں اپنی مُراد سے ہمدوش ہونے والے ہیں۔

لیکن یہ نہ ترجمہ ہے اور نہ تفسیر۔ یہ صرف قرآن میں تحریف اور اس سے تمسخر ہے[1]۔

۱۰۔ یعنی اہلِ ایمان کے دونوں گروہ مذکورہ بالا دُنیا میں ان کو ہدایت نصیب ہوئی اور آخرت میں ان کو ہر طرح کی مراد ملے گی۔ جس سے معلوم ہوگیا کہ جو نعمت ایمان سے محروم رہے ان کی دُنیا و آخرت دونوں برباد ہیں[2]۔

سُورۂ فاتحہ میں دُعا بندوں کی زبان سے طلب ہدایت کی تھی۔ دُعا معاً قبول ہوئی کتاب ہدایت نازل ہوگئی۔ اب بتایا جا رہا ہے کہ یہ علامات اور شرائط جن میں ہوں گی وُہ ہی ہدایت یاب ہوں گے۔ ان ہدایت یاب لوگوں کی خصوصیات و علامات یہ ہیں۔

۱۔ ان کا ضمیر زندہ ہوتا ہے اور دلوں میں خوفِ خدا ہوتا ہے اس لیئے زندگی میں پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہیں یعنی متقی ہیں۔

۲۔ اس مادی دُنیا سے آگے ان کا اعتقاد عالمِ غیب پر ہوتا ہے یعنی ایمان بالغیب رکھتے ہیں۔

۳۔ ان کے تعلق مع اللہ کا عملاً یوں اظہار ہوتا ہے۔ کہ وُہ نماز قائم کرتے ہیں۔

۴۔ اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کو اللہ کی مخلوق پر صَرف کرتے ہیں۔

۵۔ یہ رسول کے رسولِ برحق اور بہترین معلّم و ہادی ہونے اور قرآن کے کلامِ الٰہی ہونے کا یقین رکھتے ہیں۔

۶۔ پُورے سلسلہ وحی اور نظامِ نبوّت کی تصدیق کرتے ہیں۔

۷۔ ان کا کامل اعتقاد یومِ آخرت پر ہوتا ہے[3]۔

---

[1] تفسیر ماجدی ص۶ [2] حاشیہ شیخ الہندؒ ص۶ [3] تفسیر ماجدی ص۶

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ أَأَنذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿٦﴾

بلاشبہ وُہ لوگ جنہوں نے (ایمان کی جگہ) کفر ہی اختیار کرلیا (اور تسلیم کی جگہ انکار کی راہ کو اپنا لیا) ان کے حق میں آپ کا خبردار کرنا ——— نہ کرنا دونوں یکساں ہیں (کیونکہ انہوں نے سچائی کو قبول کرنے کی استعداد کھو دی ہے ان کے لیئے ہدایت کی ساری کوششیں بیکار ہیں) وُہ ماننے والے نہیں ہیں۔

صحابہ کا چہرہ

اوّلین قرآن کے مخاطبوں میں یہ صفات موجود ہیں۔ اس کے نتیجے میں ان لوگوں کو یہ انعام ملا ہے کہ یہی لوگ اپنے پروردگار کی جانب سے ہدایت پر ہیں۔ اور ان کا ہدایت پر ہونا محض وقتی اور ہنگامی نہیں بلکہ دائمی ہے اور اضطراری نہیں بلکہ اختیاری ہے کیونکہ انہوں نے اپنی فکری صلاحیتوں کے ذریعے اوّل اسے دلائل سے حاصل کیا اور پھر عملی زندگی میں نفس کے سارے تقاضوں کو پامال کرکے اس پر کاربند ہو گئے۔ گویا ہدایت پر ہونا ان سات شرائط، علامات اور خصوصیات کا لازمی نتیجہ ہے۔

۱۱ ——— اُولٰئِكَ اسمِ اشارہ۔ یہی لوگ دوبارہ اس لیئے لائے ہیں کہ یہ ظاہر ہو جائے کہ جس طرح متقین کو ہدایت پر قابو اور قرار حاصل ہے اسی طرح ان کو فلاح کی بھی خصوصیت حاصل ہے اور یہ لوگ دوسروں سے اپنی ان خصوصیات کی وجہ سے ممتاز ہیں[1]۔

مطلب یہ ہے کہ ان کو دُنیا و آخرت میں فلاح کامل ہی ملے گی۔ دُنیا کی تو یہ کہ انفرادی و اجتماعی،

---

[1] معارف القرآن م ا ص ۱۲۴

شخصی اور قومی ہر حیثیت سے جامع ترین و بہترین دستور زندگی کے گذارنے کا حاصل ہو گیا۔ اور آخرت کی فلاح یہ کہ وہاں پورا پورا صلہ مل کر رہے گا۔

فلاح عربی زبان میں بڑے وسیع معنے رکھتا ہے۔ دُنیا و آخرت کی ساری خوبیوں کا جامع ہے۔ اس لیئے المفلحون کا پورا ترجمہ کامیاب، بامراد وغیرہ کسی اُردو لفظ سے ہونا دشوار ہے۔ امام لغت زبیدی کا قول ہے کہ زبان ادب کے ماہروں کا اس پر اتفاق ہے کہ عربی زبان میں جامعیت خیر کے لیئے فلاح سے بڑھ کر کوئی لفظ موجود نہیں ہے۔ مولانا تھانویؒ نے یہ بات خوب لکھی ہے کہ حصر کا تعلق فلاحِ کامل سے ہے نہ کہ فلاحِ مطلق سے[1]۔

کُفر کی تعریف

۱۲۔ کفر کے معنے لغت میں کسی چیز کو چھپانے کے آتے ہیں۔ عربی میں رات کو اسی لیئے کافر کہتے ہیں کہ وُہ لوگوں کی پردہ پوشی کرتی ہے۔ اور کاشتکار کو اس وجہ سے کافر کہا جاتا ہے کہ وُہ بیج کو زمین میں چھپا دیتا ہے۔ اسی اعتبار سے کفرِ نعمت اور کفرانِ نعمت کے معنے شکر ادا نہ کر کے نعمت کے چھپا دینے کے ہیں۔ اور اسی لحاظ سے وحدانیت شریعت اور نبوت کے انکار کو اس کی تصدیق کے ظاہر نہ کرنے کو کفر کہا جاتا ہے[2]۔

امام غزالیؒ نے کفر کی قانونی تعریف یہ کی ہے کہ

حضورِ انور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی لائی ہوئی ہدایات میں سے کسی ایک کا انکار اور اس کی تکذیب کا نام کفر ہے۔

اور امام رازیؒ نے اس سے زیادہ واضح تعریف کی ہے۔

حضورِ انور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی لائی ہوئی ہدایات کی تصدیق نہ کرنا جن کا بدیہی اور قطعی طور پر آپ کی لائی ہوئی ہدایات ہونا معلوم ہو کفر ہے[3]۔

انذار کے معنے ایسی خبر دینا جس سے ڈر پیدا ہو۔ جیسے تبشیر ایسی خبر دینے کو کہتے ہیں جس سے خوشی ہو۔ اُردو زبان میں اس کا ترجمہ ڈرانے سے کیا جاتا ہے لیکن صرف ڈرانے کو انذار نہیں کہتے بلکہ اس ڈرانے کو کہتے ہیں جس کا منشار رحمت و شفقت ہو جیسے والدین بچوں کو آگ، سانپ

---

[1] تفسیر ماجدی [2] لغات القرآن ج ۱ صفحہ ۲ [3] معارف القرآن م ۱ ج ۱ صفحہ ۵

اور بچھو سے ڈراتے ہیں۔ جو ڈاکو انسانوں کو دھمکاتے اور ڈراتے ہیں اس کو انذار نہیں کہتے۔ انبیاء کو خاص طور پر نذیر کہا گیا ہے کیونکہ وُہ از راہِ شفقت آیندہ آنے والے مصائب سے ڈراتے ہیں اور اس میں اشارہ ہے کہ مصلح، مبلغ اور واعظ کے لیئے ضروری ہے کہ اس کے دِل میں مخاطبوں کی خیر خواہی اور ہمدردی کا جذبہ موجزن ہو[1]۔

ان کافروں سے خاص وہ لوگ مُراد ہیں جن کے لیئے کُفر مقرر ہو چکا ہے جیسے ابوجہل اور ابولہب وغیرہ۔ ورنہ ظاہر ہے کہ بُہت سے جو لوگ کافر تھے مشرف باسلام ہوتے اور ہوتے رہتے ہیں[2]۔

خاص لوگ اس وقت مراد ہوں گے جب اس فقرے میں سواءٌ علیھم ءَ انذرتھم ام لم تنذرھم کو خبر بنایا جائے اور اس کے بعد آنے والے جملہ کو اسی کی تاکید قرار دیا جائے۔ اکثر ائمہ تفسیر نے یہی راہ اختیار کی ہے اور لا یؤمنون کو تاکید و تفسیر بتایا ہے لیکن ایک دوسری ترکیب بھی ان ہی بزرگوں سے یہ منقول ہے کہ سواءٌ علیھم الخ جملہ معترضہ ہے جو اپنے پہلے فقرے کی حالت کو بیان کرنے کے لیئے آیا ہے۔ اس صُورت میں معنے یوُں ہوں گے کہ جنہوں نے کفر کیا اور ایسا کفر کہ ان پر تیرا ڈرانا نہ ڈرانا برابر ہو رہا ہے وُہ ایمان نہیں لاتے ہیں۔ اور یہ حقیقت ہے کہ جس کے دِل میں دغدغہ، اندیشہ اور خطرہ نہ ہو وُہ کبھی فائدہ نہیں اُٹھا سکتا۔ ہاں جب دِل کی حالت تبدیل کر لیتا ہے تو وُہ بھی فائدہ اُٹھا لیتا ہے۔ اس طرح یہ حکم خاص حالت کے بارے میں ہے۔ یہ درست ہے کہ

اس آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کو تسلی دینے کے لیئے یہ بتلایا گیا ہے کہ یہ ضدی اور معاند کفار جو حقیقت کو پہچاننے کے باوجود کُفر و انکار پر جمے ہوئے ہیں یا اپنے تکبر اور گمراہی کی بنار پر کسی حق بات کو سُننے کے لیئے تیار نہیں ہیں ان کی اصلاح اور ایمان کے متعلق جو آپ کوشش فرما رہے ہیں اس کے کوشش ہونے میں کوئی کلام نہیں لیکن ان کے لیئے مؤثر ثابت نہ ہو گی[3]۔

کیونکہ جو لوگ دلائل حق پر غور نہیں کرتے اور باطل پر جمے رہتے ہیں ان کی دل سے قبولِ حق کی استعداد روز بروز کم ہوتی جاتی ہے یہاں تک کہ بالکل مُردہ ہو جاتی ہے جو اللہ تعالیٰ نے ہر شخص میں اس کی پیدائش کے ساتھ رکھی ہوئی ہے ——— ترکیب خواہ کوئی ہو مطلب ایک ہی ہے خاص افراد ہوں یا خاص احوال، مآل ایک ہی ہے۔

یہاں حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلّم کو یہ بات بتلائی گئی ہے کہ آپ کچھ بھی کر ڈالیئے ان کے حق میں

---

[1] معارف القرآن م ش صفحہ ۶۴　[2] حاشیہ شیخ الہند صفحہ ۵　[3] معارف القرآن م ش صفحہ ۶۴

خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ؕ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ؗ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۟

(وہ ایمان کیوں نہیں لاتے؟ اس لیئے کہ) اللہ نے ان کے دلوں پر کانوں پر مُہر لگا دی ہے —— اور ان کی آنکھوں پر پردہ پڑا ہوا ہے اور ان کے لیئے سخت سزا ہے۔

سب یکساں ہے۔ یہ بدبخت اپنی حق شناسی کی صلاحیت کو ضائع کر چکے ہیں۔ ظاہر ہے فرد سے متعلق ہو یا فرد کی حالت سے یہ خبر ہے جو اللہ تعالیٰ اپنے اپنے نبی کو دی ہے۔ مرضیٔ الٰہی سے اس کا دُور کا بھی تعلق نہیں ہے۔ علم اور مرضی کے درمیان زمین و آسمان کا فرق ہے۔ طبیب حاذق اپنے علم کی رُو سے مدتوں پیشتر خبر دے دیتا ہے کہ فلاں بدپرہیز خود راستے مریض اچھا نہ ہوگا۔

حضرت تھانویؒ نے کیا اچھی بات ارشاد فرمائی ہے ان کافروں کا ناقابلِ ایمان ہونا اللہ تعالیٰ کی اس خبر کی وجہ سے نہیں ہوا بلکہ خود اللہ تعالیٰ کا یہ خبر دینا ان کافروں کے ناقابلِ ایمان ہونے کی وجہ سے ہوا۔ اور ناقابلِ ایمان ہونے کی صفت خود ان کی شرارت، عناد اور مخاصمتِ حق کے سبب پیدا ہوئی [1]

اس لیئے اگر یُوں کہہ دیا جائے کہ ڈر نہ ہونے کی وجہ سے جنہوں نے چھ شرطیں جن کا اُوپر ذکر ہوا ہے پُوری نہ کیں ان سب کو یا ان میں سے کسی ایک کو بھی قبول کرنے سے انکار کر دیا وُہ اس نعمت سے محروم رہیں گے اور اس کتابِ الٰہی سے کوئی فائدہ نہ اُٹھا سکیں گے۔ کیونکہ اس کتابِ الٰہی سے فائدہ اُٹھانے کی لازمی شرط یہ ہے کہ دل میں ڈر ہو، بھلائی اور بُرائی میں تمیز کرتا ہو، بُرائی سے بچنا چاہتا ہو، بھلائی کا طالب ہو۔ اور جس میں ان باتوں میں سے کوئی نہ ہو وُہ اس کتاب سے فائدہ نہ اُٹھائے گا اور

---

[1] تفسیر ماجدی ص

نبوت کی دعوت پر ایمان نہ لائے گا۔

انکار و کفر کی یہ حالت کب اور کہاں رُونما ہوتی ہے۔ اسی سوال کا جواب اگلی آیت میں ہے۔

۱۲۳۔ ان کے دلوں پر مُہر کر دی یعنی حق بات کو نہیں سمجھتے اور کانوں پر مُہر کر دی یعنی سچی بات کو متوجہ ہو کر نہیں سنتے۔ اور آنکھوں پر پردہ ہے یعنی راہِ حق کو نہیں دیکھتے۔[1]

ایمان نہ لانے کی وجہ

ایمان نہ لانے کی وجہ اس آیت میں یہ بتائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں اور کانوں پر مُہر لگا دی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ پڑا ہوا ہے۔ سوچنے اور سمجھنے کے جتنے راستے تھے وُہ سب بند ہیں۔ اس لیئے ان سے اصلاح کی توقع رکھنا دردِ سر ہے۔[2]

اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد پہلے جملے کی دلیل ہے یعنی ان کافروں کے حق میں ڈرانا یا نہ ڈرانا اس لیئے برابر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے تمرّد اور عناد کی سزا میں ان کے دلوں اور کانوں پر مہر لگا دی ہے اور ان کی آنکھوں پر ایک خاص قسم کا پردہ ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کی سرکشی اور عناد کی سزا میں ان پر علم اور ہدایت کے دروازے بند کر دیئے نہ آنکھ کے راستے سے ہدایت پہنچ سکتی ہے نہ کان کے راستے سے۔[3]

مطلب یہ ہے کہ جب انہوں نے ان شرطوں کو رد کر دیا جن کا قرآن سے فائدہ اُٹھانے کے لیئے اُوپر ذکر کیا گیا اور اپنے لیئے قرآن کے پیش کردہ راستہ کے خلاف دوسرا راستہ پسند کر لیا تو اللہ نے ان کے دلوں اور کانوں پر مُہر لگا دی۔ اس مہر لگنے کی کیفیت کا تجربہ ہر اُس شخص کو ہو گا جسے کبھی تبلیغ کا اتفاق ہوا ہو۔ جب کوئی آپ کے پیش کردہ طریقے کو جانچنے کے بعد ایک دفعہ رد کر دیتا ہے تو اس کا ذہن کچھ اس طرح مخالف سمت میں چل پڑتا ہے کہ پھر آپ کی کوئی بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی۔ آپ کی دعوت کے لیئے اس کے کان بہرے، آپ کے طریقے کی خوبیوں کے لیئے اس کی آنکھیں اندھی ہو جاتی ہیں اور صریح طور پر محسوس ہوتا ہے کہ فی الواقع اس کے دل پر مہر لگ گئی ہے۔[4]

جمہور مفسرین اور متکلمین یہ فرماتے ہیں کہ اس آیت میں دلوں، کانوں پر مہر لگانے اور آنکھوں پر پردہ ڈالنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فی الواقع ان کے دلوں اور کانوں پر کوئی مہر اور آنکھوں پر

---

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ ص۵ [2] معارف القرآن م ش ص۹۲ [3] معارف القرآن م ا ص۵۳ [4] تفہیم القرآن ج ا ص۵۰

کوئی پردہ ڈال دیا ہے بلکہ مقصد یہ ہے کہ متکبرین، معاندین، ہوا پرست اور دشمنان دین اپنی طبعی کجی کی وجہ سے اس درجہ اور اس حالت کو پہنچ گئے تھے کہ ہر بُرائی ان کو اچھی نظر آتی تھی۔ اور اللہ کی نافرمانی میں ان کو مزہ آتا تھا۔ اخلاقِ ذمیمہ اور رذائل ان کی طبیعتوں کا تقاضا بن کر رہ گئی تھی۔ ان کی حالت اس نجاست کے کیڑے کی طرح تھی جسے گندگی سے طبعاً رغبت اور خوشبو سے نفرت ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کافروں کی اس حالت کو بطور استعارہ ختم اور غشاوۃ سے تعبیر فرمایا ہے اور مطلب یہ ہے کہ جیسے مہر اور پردہ بیرونی اشیاء سے مانع ہوتا ہے اسی طرح ان کی یہ حالت ایمان وہدایت سے ان کے لیئے رکاوٹ بنی ہوئی ہے[1]

در اصل انہوں نے شرارت اور عناد سے خود ہی اپنی صلاحیتوں کو تج کر لیا تھا۔ اس استعداد وصلاحیت کی بربادی کا کام خود انہوں نے کیا ہے اور بالارادہ کیا ہے۔ لیکن چونکہ ہر چیز کا خالق اللہ تعالیٰ ہے اس لیئے اس آیت میں ختم کی نسبت اپنی طرف کر کے خلق وتکوین کا اظہار فرمایا ہے یہ دُنیا دار اسباب ہے جو کچھ ہوتا ہے اسباب کے تحت ہوتا ہے یہاں بھی ان کا ہی کردار ختم کا سبب ہے ورنہ اللہ کا مہر لگانا ان کے کام کا سبب نہیں ہے۔[2]

اللہ کی طرف سے مہر لگ جانے کا فعل بندہ کے کفر اختیاری کے بعد ہوتا ہے اس کا نتیجہ ہوتا ہے نہ اس کا سبب۔ فطرتِ سلیم ہر انسان کو عطا ہوئی ہے اور اس میں دلائل حق پر غور وفکر کی استعداد بھی شامل ہے۔ لیکن انسان جب ارادہ وعقل کا غلط استعمال کرنے لگتا ہے اور آسمانی ہدایتوں اور خدائی نشانیوں سے لگاتار مُنہ موڑتا ہوا شیطانی قانون پر ہی چلنے کی ٹھان لیتا ہے تو سلسلہ غضبی کے تحت آجاتا ہے۔ انبیاء کے سلسلۂ رحمت سے خارج ہو جاتا ہے اور نصرت الٰہی اس کا ساتھ چھوڑ دیتی ہے۔ اب ہر روشنی اسے تاریک اور ہر تاریکی اسے روشن نظر آتی ہے۔ اس نے اپنے لیئے جو کچھ اختیار کیا وہی اللہ تعالیٰ بھی اپنے قانون تکوین کے تحت دینے لگتا ہے۔ یہی معنے انسان کے عقل وحواس پر مُہر لگ جانے کے ہیں[3]

کُفر کا خاصہ

ان دونوں آیتوں سے یہ بات کھُل کر سامنے آگئی کہ کُفر اور گُناہ کا ایک خاصہ یہ بھی ہے کہ اس

---

[1] معارف القرآن ج ۱ ص۱۱۹ [2] بیان القرآن ملخصاً ج ۱ ص۸ [3] تفسیر ماجدی ص۳۷

سے اصلاحِ حال اور نیکی کی توفیق سلب ہو جاتی ہے۔ انسان آخرت کے حساب و کتاب سے بے پروا ہو کر اپنی نافرمانیوں اور گناہوں میں بڑھتا جاتا ہے اور گناہ میں سے گناہ ہونے کا احساس بھی اس کے دل میں مر جاتا ہے۔

حدیث میں ہے کہ انسان جب کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کے قلب پر ایک سیاہ نکتہ پڑ جاتا ہے اور جس طرح سفید کپڑے پر ایک سیاہ نکتہ انسان کو ناگوار نظر آتا ہے اسی طرح انسان کو پہلے گناہ کے نکتہ سے بھی پریشانی اور ناگواری ہوتی ہے۔ لیکن اگر وُہ گناہ سے توبہ نہیں کرتا اور دُوسرا گناہ کر لیتا ہے ایک اور سیاہ نکتہ اس کے دل پر پڑ جاتا ہے اور اسی طرح گناہوں سے نکتوں میں اضافہ ہوتا رہتا ہے یہاں تک کہ گناہ سے لگے ہوئے نکتوں کی سیاہی کی لپیٹ میں پورا دِل آجاتا ہے اور حال یہ ہو جاتا ہے کہ نیکی اور بدی کا امتیاز اس کے دِل سے اٹھ جاتا ہے۔ دِل کی اسی سیاہی کا قرآن نے ان لفظوں میں پتہ دیا ہے (ان علیٰ قلوبھم ما کانوا یکسبون[1])۔

کُفر کے درجے

دونوں آیتوں پر ایک بار مجموعی نظر ڈالو اور اسلوبِ بیان پر غور کرو۔ اگرچہ قرآن نے یہاں محض کُفر کا لفظ استعمال کیا ہے اور کُفر کے معنے انکار کے ہیں۔ لیکن انکار دو طرح کا ہوتا ہے۔ ایک انکارِ محض ہو۔ ایک انکار جارحانہ ہو۔ اس آیت میں اِنکار جارحانہ ہے۔

اِنکارِ محض سے مقصود یہ ہے کہ ایک شخص نبوت کی تسلیم قبول نہیں کرتا اس لیئے کہ اس کی سمجھ میں نہیں آتی۔ یا اس لیئے کہ اس میں طلبِ صادق نہیں ہے۔ یا اس لیئے کہ جو راہ چل رہا ہے اسی پر قانع ہے۔ بہرحال کوئی وجہ ہو لیکن وُہ نبوت سے متفق نہیں ہے۔

جارحانہ انکار سے مقصود وُہ حالت ہے جو صرف اتنے پر قناعت نہیں کرتی بلکہ اس میں نبوت کے خلاف ایک طرح کی کد اور ضد پیدا ہو جاتی ہے اور پھر یہ ضد بڑھتے بڑھتے بُغض و عناد اور ظلم و شرارت کی سخت سے سخت صورتیں اختیار کر لیتی ہے۔ اس طرح کا مخالف صرف یہی نہیں کرتا کہ وُہ نبوت سے اختلاف رکھتا ہے بلکہ اس کے اندر نبوت کے خلاف بُغض و عناد کا ایک غیر محدود جوش پیدا ہو جاتا ہے۔ وُہ اپنی زندگی اور زندگی کی ساری قوتوں کے ساتھ نبوت کی بربادی و ہلاکت کے درپے

---

[1] معارف القرآن م ش ۶۵

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿۸﴾

کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ پر اور آخرت کے دِن پر ایمان رکھتے ہیں (لیکن) وُہ قطعاً ایمان دار نہیں ہیں۔

ہو جاتا ہے۔ نبوت کتنی ہی اچھی بات کہے وُہ جھٹلاتا ہے کتنا ہی اچھا سلوک کیا جائے وُہ اذیت پہنچاتا ہے۔ روشنی کو تاریکی کہا جائے تو وُہ کہتا ہے کہ تاریکی سے بہتر کوئی چیز نہیں ہے۔ کہا جائے کہ کڑواہٹ سے مٹھاس اچھی ہے تو اسے کڑواہٹ میں دُنیا کی سب سے بڑی لذت محسوس ہوتی ہے۔

یہی حالت ہے جسے قرآن انسانی فکر و بصیرت کے تعطل سے تعبیر کرتا ہے اور اسی کے لیئے وُہ دِلوں پر، کانوں پر مہر لگانے کا استعارہ بلیغ استعمال کرتا ہے اسی کو شارحین قرآن نے کفر جحود کہا ہے۔

دُنیا میں جب کبھی سچائی کی کوئی دعوت ظاہر ہوتی ہے تو کچھ لوگوں نے اسے قبول کر لیا ہے کچھ نے انکار کیا ہے لیکن کچھ ایسے لوگ ہوئے جنہوں نے اس کے خلاف طغیان و جحود اور ظلم و شرارت کی جتھہ بندی کر لی۔ قرآنی دعوت کے ظہور کے وقت یہی تینوں جماعتیں سامنے آئیں اس نے پہلی جماعت کو اپنی آغوش لے کر اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ کا مژدہ سُنایا۔ دوسری جماعت کو دعوت و تذکیر کا مخاطب بنایا۔ اور تیسری جماعت کے ظلم و طغیان پر حسب حالت و ضرورت زجر و توبیخ کی۔ ان دو آیتوں میں قرآن نے اسی تیسری جماعت کا چہرہ پیش کیا ہے۔ اگر ایسے گروہ کے لیے اس کے لب ولہجہ کی سختی رحمت کے خلاف ہے۔ تو بلاشبہ اس معنے میں قرآن رحمت کا معترف نہیں ہے۔ یقیناً اس ترازو سے اس کی رحمت نہیں تولی جا سکتی[1]۔

[1] ترجمان القرآن ج ۱ ص ۱۱۲

جناب نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلّم مدینے پہنچے تو اسلامی دعوت ایک نئے مرحلے میں داخل ہو چکی تھی مکہ میں تو معاملہ صرف اہلِ مکہ سے تھا مگر مدینے میں اہلِ کتاب یہودی اور عیسائی بھی تھے یہ دونوں جماعتیں ایمان و خدا پرستی کی مدعی تھیں۔ اتباعِ شریعت کا دم بھرتی تھیں، تورات وانجیل کو کتابِ الٰہی مانتی تھیں اور اپنے سوا سب کو دین کی صداقت سے محروم سمجھتی تھیں مگر دونوں نے دین داری کی حقیقت کھو دی تھی اور اعتقاد و عمل کی تمام سچائیوں سے محروم ہوگئے تھے۔

اس گروہ کی حالت کو نفاق سے تعبیر کیا گیا ہے لیکن اس نفاق سے وہ نفاق مقصود نہیں ہے جو مکہ اور مدینہ کے بعض منافقوں کا تھا کہ بظاہر مسلمان ہوگئے دل میں منکر تھے۔ وہ دوسرا گروہ ہے اور اس کا ذکر آلِ عمران اور نساء وغیرہ میں آئے گا[1]

مدینہ منورہ میں یہودیوں کی آبادی تھی۔ یہاں ان کا بیت المدارس تھا جہاں علمائے یہود اپنی مذہبی کتابیں عربی زبان میں ترجمہ کرکے لوگوں کو سناتے تھے۔ مدینہ میں یہودیوں کے تقدس کا اتنا اثر تھا کہ اوس و خزرج کے قبیلوں میں لوگ نذر مانتے تھے کہ بچہ اگر زندہ رہا تو اس کو یہودی بنائیں گے۔ شہر مدینہ سے شام تک کے اکثر سبز باغات یہودیوں کے قبضے میں تھے بنو قریظہ، بنو قینقاع اور اہلِ خیبر تمام کے تمام یہودی تھے[2]

قرآن نے شروع سے ان آیات تک تین جماعتوں کا ذکر کیا ہے۔

۱۔ طالبِ حق اور اللہ کی عبادت کی سرشاریاں رکھنے والے۔

۲۔ عام مشرکینِ عرب جن کے پاس ایمان و خدا پرستی کی کوئی تعلیم موجود نہ تھی محض رسوم اوہام کے پجاری اور آباء و اجداد کی ریت پر مرمٹنے والے۔ ان میں سے اکثر کی طبیعتیں گمراہی و فساد کی پختگی سے اس قدر مسخ ہوگئی تھیں کہ کتنی ہی اچھی بات کہی جائے ماننے والے نہیں تھے۔ چنانچہ وہ خود کہتے تھے تمہاری دعوت کے لیے نہ تو ہمارے دلوں میں جگہ ہے نہ کانوں میں سماعت۔

۳۔ اہلِ کتاب یعنی الہامی کتابوں کے پیرو۔

قرآن نے تینوں کا چہرہ بیان کرنے کے بعد سب سے پہلے یا ایھا الناس کہہ کر دوسری جماعت کو دعوت کا مخاطب بنایا۔ بعدازیں یا بنی اسرائیل کے عنوان سے تیسری جماعت

---

[1] ترجمان القرآن [2] ارض القرآن ج ۲ صـ ۱۸۹

يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۝

(یہ مدعیانِ ایمان) اللہ کو اور اہلِ ایمان کو دھوکا دیتے ہیں حالانکہ (فی الواقع وُہ کسی کو بھی دھوکا نہیں دے رہے ہیں) وُہ خود ہی دھوکے میں پڑے ہوئے ہیں لیکن وُہ اسے بُوجھ نہیں سکتے (یعنی انہیں اس کا شعور نہیں ہے) [۱۵]

کی طرف رُخ کیا۔ اور سب سے آخر میں یا ایھا الذین آمنوا سے پہلی جماعت کو ہدایات دی ہیں اور یہ ہدایات سیاسی، معاشی، معاشرتی اور اجتماعی احکام پر مشتمل ہیں۔

۱۴ — اب منافقوں کا حال اس کے بعد تیرہ آیتوں تک ہے۔ مطلب یہ ہے کہ زبان سے ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن دِل سے ایمان نہیں لاتے جو حقیقت میں ایمان ہے۔ صرف زبان سے فریب دینے کے لیئے ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں [۱]

یعنی ان کے دِل میں ایمان کا ذرہ برابر گذر نہیں ہے ایمان ان کو چھو بھی نہیں گیا۔ ظاہر سیاق کا تقاضا تھا کہ آمنا کی تردید میں ما آمنوا کہا جاتے لیکن یہاں تاکید کے لیئے بجائے فعل کے اسم فاعل لائے ہیں تاکہ ان لوگوں سے ایمان کی نفی ماضی، حال اور مستقبل ہر زمانہ سے متعلق نکل آئے [۲]

پہلی آیت میں ان کے دعویٰ ایمان کی نفی کی گئی تھی۔ ان آیات میں اس کی وجہ بیان کی ہے گویا اس اُٹھے ہوئے سوال کا جواب دیا جا رہا ہے کہ ان مدعیانِ ایمان کے بے ایمان ہونے کی وجہ کیا ہے۔ زمخشری نے اس کو استئناف قرار دیا ہے۔ ۹

فریب کاری

۱۵ — یعنی ان کی فریب کاری نہ خدائے تعالیٰ کے اُوپر چل سکتی ہے کہ وُہ عالم الغیب ہے اور نہ

---

[۱] حاشیہ شیخ الہندؒ صلا [۲] تفسیر ماجدی صث

اہلِ ایمان پر کہ اللہ تعالیٰ مؤمنین کو بواسطۂ پیغمبر اور دیگر دلائل و قرائن سے ان کے فریب سے آگاہ کر دیتا ہے۔ بلکہ ان کی فریب کاری کا وبال اور اس کی خرابی درحقیقت ان ہی کو پہنچتی ہے مگر وُہ اس کو اپنی غفلت اور جہالت اور شرارت سے نہیں سوچتے اور نہیں سمجھتے۔ اگر غور کریں تو سمجھ لیں کہ اس فریب کاری سے مسلمانوں کو نقصان نہیں پہنچتا بلکہ اس کا نتیجۂ خراب ہم کو پہنچ رہا ہے۔ شاہ عبدالقادرؒ کے فہم کی یہ نزاکت ہے کہ یہاں یشعرون کا ظاہر ترجمہ چھوڑ کر بوجھنا فرمایا ہے[1]

آیت میں بجائے یعلمون کے یشعرون لائے ہیں۔ شعور عربی زبان میں علمِ حسّی کو کہتے ہیں۔ اور اسی کا نام اُردو میں احساس ہے۔ مشاعر انسان کے حواس کو کہتے ہیں۔ اس لفظ کے لانے میں نکتۂ بلاغت یہ ہے کہ ان کو اس مکر و فریب سے جو نقصان پہنچ رہا ہے اور پہنچے گا وُہ بالکل مادی ہونے کی طرح صاف اور صریح ہے۔ لیکن یہ احمق فرطِ غفلت سے اس کا احساس بھی نہیں رکھتے[2]

مطلب یہ ہے کہ وُہ اپنے آپ کو اس غلط فہمی میں مُبتلا کر رہے ہیں کہ ان کی یہ منافقانہ روش ان کو مفید ہوگی حالانکہ دراصل یہ ان کو دُنیا میں بھی نقصان پہنچائے گی اور آخرت میں بھی[3]

آیت میں اہلِ ایمان کو دھوکہ دینا یہ ہے کہ مادی اور سیاسی فوائد حاصل کرنے کے لئے اپنے آپ کو اسلامی سوسائٹی کا فرد ظاہر کرتے ہیں۔ اس قدر گراوٹ کے شکار ہیں کہ اپنے خیال میں اللہ کو بھی دھوکہ دینے کی جُرأت کر رہے ہیں۔

ختم نبوت

آیت سے معلوم ہوا کہ جو لوگ آج حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت کے جاری ہونے کے معتقد ہیں اور آپ کے بعد کسی شخص کو نبی مانتے ہیں اور اس کے باوجود مسلمان ہونے کا اقرار کرتے ہیں یہ مُسلمانوں کو دھوکہ دے رہے ہیں اور اس اقرار کے ذریعے سیاسی، معاشی اور مادی فوائد حاصل کرنا ان کے پیشِ نظر ہے۔

امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جو منافق تھا وُہ اس زمانہ میں زندیق ہے یعنی زندیق وُہ ہے جو منافقوں کی طرح دعویٰ تو مسلمان ہونے کا کرے اور اندر سے کافر ہو۔

---

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ صہ [2] تفسیر ماجدی صہ [3] تفہیم القرآن ج ۱ ص

فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللَّهُ مَرَضًا ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ بِمَا كَانُوا يَكْذِبُونَ ﴿١٠﴾

ان کے دلوں میں ایک بڑی بیماری ہے سو اللہ نے (اسلام کو سربلند کر کے) ان کی بیماری[16] میں اور اضافہ کر دیا اور ان کے لیئے دردناک سزا ہے اس لیئے کہ وہ جھوٹ کہتے تھے یعنی اپنی نمائش میں سچے نہ تھے۔

۱۶ — یعنی ان کے دلوں میں نفاق اور دینِ اسلام سے نفرت اور مسلمانوں سے کینہ اور عناد۔ یہ مرض پہلے سے موجود تھے۔ اب نزولِ قرآن اور ظہورِ شوکتِ اسلام اور ترقی و نصرت اہلِ اسلام کو دیکھ کر ان کی وہ بیماری اور بڑھ گئی[1]

دِل کی بیماری

یہ بھی ایک اُٹھے ہوئے سوال کا جواب ہے۔ پیچھے فرمایا کہ وہ فریب خوردہ ہیں لیکن ان کو اپنے فریب خوردہ ہونے کا احساس نہیں ہے سوال ہوا کہ کیوں احساس نہیں ہے؟ جواب میں ارشاد فرمایا کہ ان کو اس لیئے احساس نہیں ہے کہ وہ بیمار ہیں اور بیماری نے ان کی قوتِ ادراک کو ختم کر دیا ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی بیماری میں جھوٹ، فریب، دھوکہ کی وجہ سے اور اضافہ ہو گیا۔

یہ بیماری منافقت کی بیماری ہے اور اس بیماری میں اللہ کے اضافہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ ان کو فوراً سزا نہیں دیتا بلکہ ان کو ڈھیل دیتا ہے اور اس ڈھیل کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ لوگ اپنی چالوں کو بظاہر کامیاب ہوتے دیکھ کر اور زیادہ منافق بنتے چلے جا رہے ہیں[2] ——— اور اس کے ساتھ یہ بھی کہ

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ صلا

منافقوں کی بیماری میں اضافہ دو طرح سے ہوتا رہا ہے ایک یہ کہ جوں جوں اسلام کو غلبہ ہوتا رہا ان لوگوں کے دلوں کی کڑھن اور جلن بڑھتی گئی۔ اور دوسرے یہ کہ کلام الٰہی کی ہر ہر آیت کے نزول کے ساتھ ان کے غیظ و غضب میں اور اضافہ ہوتا گیا۔ شارحین قرآن نے یہ دونوں پہلو اختیار کیے۔ فَزَادَهُمُ میں حرفِ فا بہت اہم ہے۔ یہ گویا اس کا اعلان ہے کہ آگے جس بات کا ذکر ہے وُہ محض بطور ثمرہ اور نتیجہ کے پیدا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف بیماری میں اضافہ کرنے کی نسبت صرف مجازی حیثیت کی ہے یعنی اللہ نے وُہ حالات و اسباب پیدا کر دیئے جن سے ان بدنصیبوں نے اپنی بیماری بڑھانے کا کام لیا۔ اگر وُہ عقل و ارادے سے صحیح کام لیتے تو ان ہی اسباب وحالات سے ہدایت بھی پا سکتے تھے۔ یہ سزا بھی جو کچھ ملی ٹھیک جُرم کے مناسب حال ملی[1]

بیماری اور مرض اصل میں اعتدال سے ہٹ جانے کا نام ہے۔ قرآن وسُنّت میں ان نفسانی کیفیات کو بیماری بتایا گیا ہے جو خود انسان کے کمال نوعی میں رکاوٹ بن جائیں اور جن کی وجہ سے انسان انسانیت سے ہٹ کر حیوانیت اختیار کر لیتا ہے۔

حضرت جنید بغدادیؒ فرماتے ہیں کہ دلوں کی بیماریاں نفسانی خواہشات کی پیروی سے رُونما ہوتی ہیں جیسے جسمانی بیماریاں اخلاط کی بے اعتدالی سے پیدا ہوتی ہیں۔[2]

اس آیت میں دلوں میں پوشیدہ کُفر کو ان کے دلوں کی بیماری بتایا ہے[3]

دِل سے مُراد سینہ کے اندر کا وُہ مضغہ گوشت نہیں ہے جو طبی اصطلاح میں دِل کہلاتا ہے بلکہ وُہ دِل مُراد ہے جو محاورہ زبان میں احساس عقل اِرادہ سب کا مرکز ہے انسانی بول چال میں دل اسی کو کہا جاتا ہے اور افعال ارادی کا صدور اسی سے ہوتا ہے۔

۱۷۔ اس جھوٹ کہنے سے وُہ اسلام کا جھوٹا دعویٰ آمنا الخ مراد ہے یعنی دردناک سزا ان کے نفاق کی سزا ہے نہ مطلق جھوٹ بولنے کی۔ حضرت شاہ عبدالقادرؒ کو اسی باریک فرق کو بتانا منظور ہے جو یکذبون کا جھوٹ بولنے کی جگہ جھوٹ کہنا ترجمہ فرماتے ہیں فجزاہ اللہ ما ادق نظرہٗ

یہ عذاب الیم جس کا یہاں ذکر ہے ان کو مطلق کُفر پر نہیں بلکہ ان کی منافقت اور ایمان کی جھوٹی نمائش پر ہوگا۔ کافروں کے لیئے جس عذاب کی خبر دی گئی ہے وُہ عظیم ہے اور ان کے لیئے جس کی وعید آئی ہے وُہ الیم ہے اور الیم کے معنے دردناک کے ہیں۔ خوب سمجھ لیا جائے جو منافق تھے وُہ کافر

---

[1] تفسیر ماجدی صـ۹ [2] معارف القرآن م ش صـ۱۴۹ [3] حاشیہ شیخ الہندؒ صـ۲

وَ اِذَا قِیْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ قَالُوْۤا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ۝ اَلَاۤ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَ لٰكِنْ لَّا یَشْعُرُوْنَ ۝

اور جب ان لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ ملک میں دنگا اور ابتری نہ ڈالو (اور اپنی بدعنوانیوں اور غنڈہ گردیوں سے باز آجاؤ) تو کہتے ہیں کہ اجی ہم ہی تو (ملک کی ترقی اور عوام کی) اصلاح کا کام کر رہے ہیں[۱۸] ـــــ یاد رکھو یہی لوگ (ملک میں) فساد ی ہیں۔ لیکن ان کو اپنے فسادی ہونے کا احساس نہیں[۱۹]۔

تو تھے ہی۔ لیکن کافر ہونے کے علاوہ کچھ اور بھی تھے یعنی دھوکہ باز، فریب کار اور جھوٹے۔ عذابِ عظیم ان کو ان کے کفر کی وجہ سے ہوگا اور عذابِ الیم ان کی منافقت کی وجہ سے ہوگا۔ گویا منافقوں کو دونوں عذابوں کا مجموعہ ہوگا[۱]۔

اس سے یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے کہ آیت میں منافقین کے عذاب کی وجہ بما کانوا یکذبون جھوٹی نمائش بتائی ہے۔ حالانکہ ان میں کفر اور حسد اور دوسرے جرائم بھی موجود تھے۔ اس میں یہ اشارہ پایا جاتا ہے کہ دین کی زندگی کی جھوٹی نمائش ان کا اصلی جرم تھا اور اس بُری عادت نے ان کو کفر و نفاق تک پہنچا دیا تھا۔ یہ جھوٹی نمائش ابتداءً کم ہوتی ہے مگر آہستہ آہستہ اس کا دائرہ بڑھتا جاتا ہے اور اس کی شدت بھی زیادہ ہوتی جاتی ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی سنت ہے جو ہمیشہ جاری رہتی ہے[۲]۔

آیتِ گرامی کا حاصل یہ ہے کہ ان کا دل بیمار ہے البتہ ان کی زبانیں تندرست نظر آتی ہیں۔ قلب کے بیمار پڑ جانے کے بعد صرف اعضاء و جوارح کی صحت کارآمد نہیں ہو سکتی۔ چونکہ ان کا قلب بیمار ہے اور باہر سے تندرست نظر آتے ہیں اس لیئے ان کی بیماری کا ظاہری صحت کی وجہ سے

[۱] تفسیر ماجدی ص ۹ [۲] معارف القرآن م ش

ادراک نہیں ہوسکتا۔ اور جب دل بیمار ہو تو جوارح کی سلامتی بے سود ہے۔ قاضی بیضاویؒ فرماتے ہیں کہ اس جماعت کے دل کفر، اعتقاد بد اور حضورِ انورﷺ کی عداوت کے مریض تھے۔

شہری زندگی کا فساد

جو لوگ اللہ سبحانہٗ کی ذاتِ گرامی کے بارے میں مخلص نہ ہوں ان میں فساد و صلاح کی قوت تمیز ملیا میٹ ہوجاتی ہے وہ خیر و شر اور صلاح و فساد کا پیمانہ اپنی خواہشات، اپنے ذہنی رجحانات کے تابع رکھ کر بتاتے ہیں۔

۱۸ــــ منافقین چند وجوہ سے فساد کرتے ہیں۔ اوّل نفسانی خواہشات میں منہمک تھے اور انقیاد و احکام شرعیہ سے کاہل اور متنفر تھے۔ دوم مسلمانوں اور کافروں دونوں کے پاس جاتے تھے اور اپنی قدر و منزلت بڑھانے کو ہر ایک کی باتیں دوسروں تک پہنچاتے تھے۔ سوم کفار سے نہایت مدارات اور ملاطفت سے پیش آتے تھے اور امورِ دین کی مخالفت پر کفار سے اصلاً مزاحمت نہ کرتے تھے۔ اور کفار کے اعتراضات و شبہات کو جو دین کی باتوں پر ہوتے تھے مسلمانوں کے روبرو نقل کرتے تھے تاکہ ضعیف الاعتقاد اور کمزور احکامِ شرعیہ میں متردد ہوجائیں۔ اور جب ان باتوں سے ان کو کوئی روکتا تو جواب دیتے کہ ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں اور چاہتے ہیں کہ تمام قوم و ملک مثل زمانہ سابق شیر و شکر ہو کر رہیں اور نئے دین کی وجہ سے جو مخالفت بڑھ گئی ہے وہ بالکل جاتی رہے۔ چنانچہ ہر زمانہ میں دنیا طلب اور ہوا پرست ایسا ہی کرتے ہیں[1]۔

یعنی ان کے منافقانہ کردار کی وجہ سے قسم قسم کے فسادات اور طرح طرح کے فتنے رونما ہونے لگے اور کسی خیر اندیش نے ان کو فہمائش کی کہ اس قسم کی کارروائی ملک میں فساد کا باعث ہوتی ہے۔ اسے چھوڑ دو۔ تو اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ ہم ہی تو مصلح ہیں۔ غرض ان کی غباوت یا شرارت اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ فساد کو اصلاح سمجھتے ہیں[2]۔

اس آیت سے دو باتیں معلوم ہوئیں۔ ایک یہ کہ منافقین کی حرکات فی الواقع ملک میں فتنہ و فساد کا باعث بنی ہوئی تھیں۔ دوسری یہ کہ منافقین یہ حرکات فتنہ و فساد کی نیت سے نہ کرتے تھے بلکہ ان کو یہ معلوم بھی نہ تھا کہ فتنہ و فساد ان کے کردار کا نتیجہ ہے وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ[3]۔

---

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ ص۴ [2] بیان القرآن ص۸ [3] معارف القرآن۔

اس سے معلوم ہوا کہ اسلامی قانون کے علاوہ کسی جاہلی دستور پر قائم رہنا اس کے طور وطریقوں کی اشاعت کرنا فساد فی الارض کے مترادف ہے۔ امنِ عالم اور نظامِ اقوام قائم اسی وقت ہو سکتا ہے جب انسانی زندگی نبوت کے لائے ہوئے نظامِ حیات کو اپنائے اس سے انحراف بلکہ سرِمو تجاوز کرنا بھی دُنیا کو بدنظمی، ابتری، کشت وخون اور ہر قسم کی طبقاتی جنگ کو دعوت دیتا ہے چنانچہ دُنیا اس کا بارہا تجربہ کر چکی ہے۔ اسلام کے اس پہلو پر کہ وُہ نظامِ عالم کا بہترین ضامن ہے ہمارے زمانے میں علامہ اقبالؒ نے شاعرانہ زبان میں خوب لکھ دیا ہے[1]۔

وُہ چاہتے ہیں کہ سب شیر وشکر ہو جائیں آپس میں کوئی اختلاف نہ رہے۔ اس نئے نظامِ حیات کی وجہ سے جو جھگڑا اور اختلاف پیدا ہو جائے وُہ ختم ہو جاتے اور ملک اپنی پہلی حالت پر لوٹ آئے اور سلسلہ معاش وتجارت حسبِ سابق جاری ہو جائے[2] ——— اسی کا نام ان کی سیاسی زبان میں اصلاح ہے۔ گویا ان سے جب مطالبہ کیا جاتا ہے کہ زندگی کی درستگی کے لیئے نبوت کے لائے ہوئے علم وعمل کو دُنیا میں قائم ہونے دو، اس کی راہ میں رُکاوٹ نہ بنو اور اس کے خلاف لوگوں کو نہ اُکساؤ۔ کیونکہ یہی وُہ نظامِ حق ہے جس کے ذریعے ہر قسم کا فساد اور معاشرے کا ہر طرح کا بگاڑ درست ہو سکتا ہے۔ یہ قائم ہو گا تو بگاڑ ختم ہو گا، افتراق کے جراثیم مر جائیں گے، اوہام ورسوم کی بندگی مٹے گی، انسان حریتِ ضمیر، حریتِ فکر اور حریتِ رائے سے مالا مال ہو گا۔ ان کا جواب یہ ہوتا ہے کہ ہم ہی تو لوگوں کی اپنے سربراہوں، اپنے لیڈروں اور اپنے رہنماؤں کی ہدایات کے مطابق اصلاح کر رہے ہیں۔

۱۹——— یہ جواب بعینہ وُہ ہے جو آج بھی خدا معلوم اُمت کے اندر کتنے منافقوں کی زبان پر ہے دین میں قدم قدم پر رخنے ڈالتے جاتے ہیں اور زبان پر وہی دعویٰ اصلاح اور تعمیر کا۔ نحن مصلحون کے معنے یہی ہیں کہ یہ لوگ مُفسد ہونے کے باوجود مصلح ہونے کے مُدعی ہیں سیاسی اصلاح، تہذیبی اصلاح، معاشرتی اصلاح اور دُوسری وُہ تمام اصلاحیں جن کا دعویٰ آج بھی ہر درو دیوار سے ہوتا رہتا ہے وہاں بھی اصلاح کے یہی نعرے تھے۔ دونوں جگہ ایک رُوح کام کر رہی ہے۔

حکیم الاُمت حضرت شاہ ولی اللہؒ نے شہری زندگی کے جس فساد کی نشاندہی کی ہے وُہ اس نظامِ حیات ہی سے انحراف کا نتیجہ ہے جسے نبوت علم وعمل کی شکل میں لے کر آئی ہے شاہ صاحبؒ

---

[1] تفسیر ماجدی ص۹ [2] معارف القرآن ج ۱ ص۵۹

وَاِذَا قِيۡلَ لَهُمۡ اٰمِنُوۡا كَمَاۤ اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوۡۤا اَنُؤۡمِنُ كَمَاۤ اٰمَنَ
السُّفَهَآءُ ؕ اَلَاۤ اِنَّهُمۡ هُمُ السُّفَهَآءُ وَلٰـكِنۡ لَّا يَعۡلَمُوۡنَ ۝

اور جب ان لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ تم بھی[۲۰] ایمان لے آؤ جیسے اور لوگ[۲۱]
ایمان لے آتے ہیں۔ تو کہتے ہیں کیا ہم بھی اسی طرح ایمان لے آئیں اور نبوت کی لائی
ہوئی دعوت حق کا ساتھ دیں جیسے یہ کم عقل[۲۲] لوگ ایمان لے آئے ہیں اور ہم بھی
بیوقوف ہو جائیں۔ یاد رکھو فی الواقع یہی لوگ بیوقوف[۲۳] ہیں (اگرچہ اپنی جہالت اور
بڑائی کی وجہ سے) ان کو اس کا علم نہیں ہے۔

فرماتے ہیں۔

شہری زندگی کا سب سے بڑا فساد یہ ہے کہ بالا دست طاقت عمدہ عمدہ زیور، اچھی پوشاک، بہترین مکان، لذیذ خوراک اور عورت کی نازک اندامیوں میں لگ جاتی ہے۔

اور یہ بھی بتایا ہے کہ

جب بالا دست طاقت یہ مشغلہ اختیار کرے گی تو لوگوں میں معاشی فساد پیدا ہو جائے گا اور اصلاح ناپید ہو جائے گی۔

اور پھر یہ بھی لکھا ہے کہ

بالا دست طاقت کا یہ میلان پوری شہری زندگی میں پھیل جائے گا اور اس طرح پھیلے گا جیسے ہڑکائے کتے کے کاٹنے سے ہڑک پھیل جاتی ہے۔

اس سے بڑا فساد اور کیا ہو سکتا ہے۔

۔ اصلاح تو حقیقت میں یہ ہے کہ دینِ حق جملہ ادیان پر غالب ہو اور تمام دنیوی اغراض اور منفعتوں کے مقابلے میں احکامِ شرعیہ کی زیادہ رعایت کی جائے۔ اور دین کے بارے میں کسی کی موافقت و

مخالفت کی پروا نہ ہو ؎ خاک بر دلداریِ اغیار باش ـــــ کا مصداق بن جائے[1]

کج فکری

پہلی آیت میں اہلِ ایمان نے ان کو رذائل سے بچنے کی تلقین کی تھی اور بتایا تھا کہ شہری زندگی میں برائیوں سے بچ کر رہنا چاہیئے۔ اور زمانۂ جاہلیت کے رسوم و دستور کو چھوڑ دینا چاہیئے۔ اس سے ملک و عوام میں بدنظمی، ابتری، کشت و خون اور ہر قسم کی طبقاتی جنگ کو پنپنے کا موقعہ ملتا ہے۔ اس آیت میں ان کو ایمان کی دعوت دی جا رہی ہے گویا پہلی آیت میں منکرات سے بچنے کا مطالبہ کیا اور اس میں فضائل فراہم کرنے کی پیش کش کی گئی ہے۔ اس سے اشارتاً یہ بھی معلوم ہوا کہ اجتماعی زندگی میں اصلاح کی اصل ترتیب یہی ہے کہ پہلے برائیوں کو ختم کرنے کی فکر کی جائے پھر خوبیوں کو فراہم کرنے کی تدبیر کی جائے۔ فقہانے بھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے کہ مفاسد کے دُور کرنے کے لیئے پہلے کوشش کی جاتے مصالح کی فکر نہ کی جائے۔

۲۰ــ ایمان کا دعویٰ تو وُہ پہلے بھی کرتے تھے کہنے والوں کا مطلب یہ تھا کہ ایمان دِل سے لاؤ، دیانت اور راستی کے ساتھ رسول کی رسالت کو تسلیم کرو۔ انقیاد باطن، التزام طاعت، عہدِ وفاداری وُہ اوصاف ہیں جن کے بغیر ایمان صرف علم ہی کا ایک درجہ رہتا ہے۔ ایمان کے لیئے ضروری ہے کہ یہ علم ایسی صفت نفس بن جائے کہ دِل اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دے۔ ان کو نبوت کا، قرآن کے کتابِ الٰہی ہونے کا، آخرت میں مجازات کا علم تھا۔ لیکن انقیاد قلبی اور التزام طاعت نہ تھا۔ ایمان صرف اس کا نام ہے کہ قلب و زبان تصدیق سے آراستہ ہوں اور عہدِ وفاداری کرتا ہو اگر قلب تصدیق کے لیئے آمادہ نہیں تو صرف زبان کا اقرار کسی کو ایماندار نہیں بناتا ۔ کہنے والوں نے کہا کہ آمنوا ایمان لاؤ ـــــ لیکن من گھڑت اور خود ساختہ ایمان نہیں بلکہ کَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ ایسا ایمان لاؤ جیسا لوگ سچائی اور خلوص کے ساتھ ایمان لاتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایمان کے دعوے کے صحیح یا غلط ہونے کے لیئے اصلی معیار صرف صحابۂ کرام کا ایمان ہے۔ جو اس کے مطابق نہیں وُہ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے نزدیک ایمان نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص قرآنی نظریات کا مفہوم قرآنی بیان یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی تشریحات کے خلاف پیش کرے

---

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ ص۵

جناب نبیؐ کریم صلی اللہ علیہ وسلّم مدینے پہنچے تو اسلامی دعوت ایک نئے مرحلے میں داخل ہو چکی تھی مکہ میں تو معاملہ صرف اہلِ مکہ سے تھا مگر مدینے میں اہلِ کتاب یہودی اور عیسائی بھی تھے یہ دونوں جماعتیں ایمان و خدا پرستی کی مدعی تھیں۔ اتباعِ شریعت کا دم بھرتی تھیں، تورات و انجیل کو کتابِ الٰہی مانتی تھیں اور اپنے سوا سب کو دین کی صداقت سے محروم سمجھتی تھیں مگر دونوں نے دین داری کی حقیقت کھو دی تھی اور اعتقاد و عمل کی تمام سچائیوں سے محروم ہو گئے تھے۔

اس گروہ کی حالت کو نفاق سے تعبیر کیا گیا ہے لیکن اس نفاق سے وُہ نفاق مقصود نہیں ہے جو مکہ اور مدینہ کے بعض منافقوں کا تھا کہ بظاہر مسلمان ہو گئے دل میں منکر تھے۔ وُہ دوسرا گروہ ہے اور اس کا ذکر آلِ عمران اور نساء وغیرہ میں آئے گا[۱]

مدینہ منورہ میں یہودیوں کی آبادی تھی۔ یہاں ان کا بیت المدارس تھا جہاں علمائے یہود اپنی مذہبی کتابیں عربی زبان میں ترجمہ کرکے لوگوں کو سُناتے تھے۔ مدینہ میں یہودیوں کے تقدس کا اتنا اثر تھا کہ اوس و خزرج کے قبیلوں میں لوگ نذر مانتے تھے کہ بچہ اگر زندہ رہا تو اس کو یہودی بنائیں گے۔ شہر مدینہ سے شام تک کے اکثر سبز باغات یہودیوں کے قبضے میں تھے بنو قریظہ، بنو قینقاع اور اہلِ خیبر تمام کے تمام یہودی تھے[۲]

قرآن نے شروع سے ان آیات تک تین جماعتوں کا ذکر کیا ہے۔

۱۔ طالبِ حق اور اللہ کی عبادت کی سرشاریاں رکھنے والے۔

۲۔ عام مشرکین عرب جن کے پاس ایمان و خدا پرستی کی کوئی تعلیم موجود نہ تھی محض رسوم و اوہام کے پجاری اور آباء و اجداد کی ریت پر مرمٹنے والے۔ ان میں سے اکثر کی طبیعتیں گمراہی و فساد کی پختگی سے اس قدر مسخ ہو گئی تھیں کہ کتنی ہی اچھی بات کہی جائے ماننے والے نہیں تھے۔ چنانچہ وُہ خود کہتے تھے تمہاری دعوت کے لیے نہ تو ہمارے دلوں میں جگہ ہے نہ کانوں میں سماعت۔

۳۔ اہلِ کتاب یعنی الہامی کتابوں کے پیرو۔

قرآن نے تینوں کا چہرہ بیان کرنے کے بعد سب سے پہلے یا ایھا الناس کہہ کر دوسری جماعت کو دعوت کا مخاطب بنایا۔ بعد ازیں یا بنی اسرائیل کے عنوان سے تیسری جماعت

۱؎ ترجمان القرآن ۲؎ ارض القرآن ج ۲ صفحہ ۱۸۹

يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۝

(یہ مدعیانِ ایمان) اللہ کو اور اہلِ ایمان کو دھوکا دیتے ہیں حالانکہ (فی الواقع وُہ کسی کو بھی دھوکا نہیں دے رہے ہیں) وُہ خود ہی دھوکے میں پڑے ہوئے ہیں لیکن وُہ اسے بُوجھ نہیں سکتے (یعنی انہیں اس کا شعور نہیں ہے)۱۵

کی طرف رُخ کیا۔ اور سب سے آخر میں یاایھا الذین آمنوا سے پہلی جماعت کو ہدایات دی ہیں اور یہ ہدایات سیاسی، معاشی، معاشرتی اور اجتماعی احکام پر مشتمل ہیں۔

۱۴ــــ اب منافقوں کا حال اس کے بعد تیرہ آیتوں تک ہے۔ مطلب یہ ہے کہ زبان سے ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن دِل سے ایمان نہیں لاتے جو حقیقت میں ایمان ہے۔ صرف زبان سے فریب دینے کے لیئے ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں۔[۱]

یعنی ان کے دِل میں ایمان کا ذرہ برابر گذر نہیں ہے ایمان ان کو چھو بھی نہیں گیا۔ ظاہر سیاق کا تقاضا تھا کہ آمنّا کی تردید میں ما آمنوا کہا جاتے لیکن یہاں تاکید کے لیئے بجائے فعل کے اسم فاعل لائے ہیں تاکہ ان لوگوں سے ایمان کی نفی ماضی، حال اور مستقبل ہر زمانہ سے متعلق نکل آئے۔[۲]

پہلی آیت میں ان کے دعویٰ ایمان کی نفی کی گئی تھی۔ ان آیات میں اس کی وجہ بیان کی ہے گویا اس اُٹھے ہوئے سوال کا جواب دیا جارہا ہے کہ ان مدعیانِ ایمان کے بے ایمان ہونے کی وجہ کیا ہے۔ زمخشری نے اس کو استناف قرار دیا ہے۔

فریب کاری

۱۵ــــ یعنی ان کی فریب کاری نہ خدائے تعالیٰ کے اُوپر چل سکتی ہے کہ وُہ عالم الغیب ہے اور نہ

[۱] حاشیہ شیخ الہندؒ صـ۵ [۲] تفسیر ماجدی صـ۴۳

اہلِ ایمان پر کہ اللہ تعالیٰ مومنین کو بواسطہ پیغمبر اور دیگر دلائل و قرائن سے ان کے فریب سے آگاہ کر دیتا ہے۔ بلکہ ان کی فریب کاری کا وبال اور اس کی خرابی درحقیقت ان ہی کو پہنچتی ہے مگر وُہ اس کو اپنی غفلت اور جہالت اور شرارت سے نہیں سوچتے اور نہیں سمجھتے۔ اگر غور کریں تو سمجھ لیں کہ اس فریب کاری سے مسلمانوں کو نقصان نہیں پہنچا بلکہ اس کا نتیجہ خراب ہم کو پہنچ رہا ہے۔ شاہ عبد القادرؒ کے فہم کی یہ نزاکت ہے کہ یہاں یشعرون کا ظاہر ترجمہ چھوڑ کر بوجھنا فرمایا ہے۔[1]

آیت میں بجائے یعلمون کے یشعرون لائے ہیں۔ شعور عربی زبان میں علم حسی کو کہتے ہیں۔ اور اسی کا نام اُردو میں احساس ہے۔ مشاعر انسان کے حواس کو کہتے ہیں۔ اس لفظ کے لانے میں نکتہ بلاغت یہ ہے کہ ان کو اس مکر و فریب سے جو نقصان پہنچ رہا ہے اور پہنچے گا وُہ بالکل مادی ہونے کی طرح صاف اور صریح ہے۔ لیکن یہ احمق فرطِ غفلت سے اس کا احساس بھی نہیں رکھتے۔[2]

مطلب یہ ہے کہ وُہ اپنے آپ کو اس غلط فہمی میں مُبتلا کر رہے ہیں کہ ان کی یہ منافقانہ روش ان کو مفید ہو گی حالانکہ دراصل یہ ان کو دُنیا میں بھی نقصان پہنچائے گی اور آخرت میں بھی۔[3]

آیت میں اہلِ ایمان کو دھوکہ دینا یہ ہے کہ مادی اور سیاسی فوائد حاصل کرنے کے لئے اپنے آپ کو اسلامی سوسائٹی کا فرد ظاہر کرتے ہیں۔ اس قدر گراوٹ کے شکار ہیں کہ اپنے خیال میں اللہ کو بھی دھوکہ دینے کی جُرأت کر رہے ہیں۔

ختم نبوت

آیت سے معلوم ہوا کہ جو لوگ آج حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت کے جاری ہونے کے معتقد ہیں اور آپ کے بعد کسی شخص کو نبی مانتے ہیں اور اس کے باوجود مسلمان ہونے کا اقرار کرتے ہیں یہ مُسلمانوں کو دھوکہ دے رہے ہیں اور اس اقرار کے ذریعے سیاسی، معاشی اور مادی فوائد حاصل کرنا ان کے پیشِ نظر ہے۔

امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جو منافق تھا وُہ اس زمانہ میں زندیق ہے یعنی زندیق وُہ ہے جو منافقوں کی طرح دعویٰ تو مسلمان ہونے کا کرے اور اندر سے کافر ہو۔

---

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ ص۵ [2] تفسیر ماجدی ص۸ [3] تفہیم القرآن ج ۱ ص۵۳

فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ ۙ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۙ۵
بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ﴿۱۰﴾

ان کے دلوں میں ایک بڑی بیماری ہے سو اللہ نے (اسلام کو سربلند کرکے) ان کی بیماری[16] میں اور اضافہ کر دیا اور ان کے لیئے دردناک سزا ہے اس لیئے کہ وُہ جھوٹے کہتے تھے یعنی اپنی نمائش میں سچے نہ تھے۔

۱۶ — یعنی ان کے دلوں میں نفاق اور دینِ اسلام سے نفرت اور مسلمانوں سے کینہ اور عناد۔ یہ مرض پہلے سے موجود تھے۔ اب نزولِ قرآن اور ظہورِ شوکتِ اسلام اور ترقی و نصرت اہلِ اسلام کو دیکھ کر ان کی وُہ بیماری اور بڑھ گئی[1]

دِل کی بیماری

یہ بھی ایک اُٹھتے ہوئے سوال کا جواب ہے۔ پیچھے فرمایا کہ وُہ فریب خوردہ ہیں لیکن ان کو اپنے فریب خوردہ ہونے کا احساس نہیں ہے سوال ہوا کہ کیوں احساس نہیں ہے؟ جواب میں ارشاد فرمایا کہ ان کو اس لیئے احساس نہیں ہے کہ وُہ بیمار ہیں اور بیماری نے ان کی قوتِ ادراک کو ختم کر دیا ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی بیماری میں جھوٹ، فریب، دھوکہ کی وجہ سے اور اضافہ ہو گیا۔

یہ بیماری منافقت کی بیماری ہے اور اس بیماری میں اللہ کے اضافہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وُہ ان کو فوراً سزا نہیں دیتا بلکہ ان کو ڈھیل دیتا ہے اور اس ڈھیل کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ لوگ اپنی چالوں کو بظاہر کامیاب ہوتے دیکھ کر اور زیادہ منافق بنتے چلے جا رہے ہیں[2] —— اور اس کے ساتھ یہ بھی کہ

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ ص۴

منافقوں کی بیماری میں اضافہ دو طرح سے ہوتا رہا ہے ایک یہ کہ جوں جوں اسلام کو غلبہ ہوتا رہا ان لوگوں کے دلوں کی کڑھن اور جلن بڑھتی گئی۔ اور دوسرے یہ کہ کلام الٰہی کی ہر ہر آیت کے نزول کے ساتھ ان کے غیظ و غضب میں اور اضافہ ہوتا گیا۔ شارحینِ قرآن نے یہ دونوں پہلو اختیار کیے۔ فَزَادَهُمُ میں حرفِ فا بہت اہم ہے۔ یہ گویا اس کا اعلان ہے کہ آگے جس بات کا ذکر ہے وُہ محض بطور ثمرہ اور نتیجہ کے پیدا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف بیماری میں اضافہ کرنے کی نسبت صرف مجازی حیثیت کی ہے یعنی اللہ نے وُہ حالات و اسباب پیدا کر دیئے جن سے ان بدنصیبوں نے اپنی بیماری بڑھانے کا کام لیا۔ اگر وُہ عقل و ارادے سے صحیح کام لیتے تو ان ہی اسباب و حالات سے ہدایت بھی پا سکتے تھے۔ یہ سزا بھی جو کچھ ملی ٹھیک جُرم کے مناسب حال ملی[1]۔

بیماری اور مرض اصل میں اعتدال سے ہٹ جانے کا نام ہے۔ قرآن وسُنّت میں ان نفسانی کیفیات کو بیماری بتایا گیا ہے جو خود انسان کے کمال نوعی میں رکاوٹ بن جائیں اور جن کی وجہ سے انسان انسانیت سے ہٹ کر حیوانیت اختیار کر لیتا ہے۔

حضرت جنید بغدادیؒ فرماتے ہیں کہ دلوں کی بیماریاں نفسانی خواہشات کی پیروی سے رُونما ہوتی ہیں جیسے جسمانی بیماریاں اخلاط کی بے اعتدالی سے پیدا ہوتی ہیں۔

اس آیت میں دلوں میں پوشیدہ کُفر کو ان کے دلوں کی بیماری بتایا ہے[2]۔

دِل سے مُراد سینہ کے اندر کا وُہ مضغہ گوشت نہیں ہے جو طبی اصطلاح میں دِل کہلاتا ہے بلکہ وُہ دِل مُراد ہے جو محاورہ زبان میں احساس عقل اِرادہ سب کا مرکز ہے انسانی بول چال میں دِل اسی کو کہا جاتا ہے اور افعال ارادی کا صدور اسی سے ہوتا ہے۔

۱۷ــــ اس جھوٹ کہنے سے وُہ اسلام کا جھوٹا دعویٰ آمنا الخ مراد ہے یعنی دردناک سزا ان کے نفاق کی سزا ہے نہ مطلقَ جھوٹ بولنے کی۔ حضرت شاہ عبدالقادرؒ کو اسی باریک فرق کو بتانا منظور ہے جو یکذبون کا جھوٹ بولنے کی جگہ جھوٹ کہنا ترجمہ فرماتے ہیں فجزاہ اللہ ما ادق نظرہٗ یہ عذاب الیم جس کا یہاں ذکر ہے ان کو مطلقَ کُفر پر نہیں بلکہ ان کی منافقت اور ایمان کی جھوٹی نمائش پر ہوگا۔ کافروں کے لیئے جس عذاب کی خبر دی گئی ہے وُہ عظیم ہے اور ان کے لیے جس کی وعید آئی ہے وُہ الیم ہے اور الیم کے معنے دردناک کے ہیں۔ خوب سمجھ لیا جائے جو منافق تھے وُہ کافر

[1] تفسیر ماجدی ص۹　[2] معارف القرآن م ش ص۴۹　[3] حاشیہ شیخ الہندؒ ص۶

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ قَالُوا إِنَّمَا نَحْنُ
مُصْلِحُونَ ﴿١١﴾ أَلَا إِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُونَ وَلَٰكِن لَّا يَشْعُرُونَ ﴿١٢﴾

اور جب ان لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ ملک میں دنگا اور ابتری نہ ڈالو (اور اپنی بدعنوانیوں اور غنڈہ گردیوں سے باز آجاؤ) تو کہتے ہیں کہ اجی ہم ہی تو (ملک کی ترقی اور عوام کی) اصلاح کا کام کر رہے ہیں[1] ــــــ یاد رکھو یہی لوگ (ملک میں) فساد ی ہیں لیکن ان کو اپنے فسادی ہونے کا احساس نہیں ہے[2] ۔

تو تھے ہی۔ لیکن کافر ہونے کے علاوہ کچھ اور بھی تھے یعنی دھوکہ باز، فریب کار اور جھوٹے۔ عذاب عظیم ان کو ان کے کفر کی وجہ سے ہوگا اور عذاب الیم ان کی منافقت کی وجہ سے ہوگا۔ گویا منافقوں کو دونوں عذابوں کا مجموعہ ہوگا[1] ۔

اس سے یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے کہ آیت میں منافقین کے عذاب کی وجہ بما کانوا یکذبون جھوٹی نمائش بتائی ہے۔ حالانکہ ان میں کفر اور حسد اور دوسرے جرائم بھی موجود تھے۔ اس میں یہ اشارہ پایا جاتا ہے کہ دین کی زندگی کی جھوٹی نمائش ان کا اصلی جرم تھا اور اس بری عادت نے ان کو کفر و نفاق تک پہنچا دیا تھا۔ یہ جھوٹی نمائش ابتداً کم ہوتی ہے مگر آہستہ آہستہ اس کا دائرہ بڑھتا جاتا ہے اور اس کی شدت بھی زیادہ ہوتی جاتی ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی سنت ہے جو ہمیشہ جاری رہتی ہے[2] ۔

آیتِ گرامی کا حاصل یہ ہے کہ ان کا دل بیمار ہے البتہ ان کی زبانیں تندرست نظر آتی ہیں۔ قلب کے بیمار پڑ جانے کے بعد صرف اعضاء و جوارح کی صحت کارآمد نہیں ہو سکتی۔ چونکہ ان کا قلب بیمار ہے اور باہر سے تندرست نظر آتے ہیں اس لیے ان کی بیماری کا ظاہری صحت کی وجہ سے

---

[1] تفسیر ماجدی ص ۹　[2] معارف القرآن م ش

ادراک نہیں ہوسکتا۔ اور جب دل بیمار ہو تو جوارح کی سلامتی بے سود ہے۔ قاضی بیضاویؒ فرماتے ہیں کہ اس جماعت کے دل کفر، اعتقاد بد اور حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کی عداوت کے مریض تھے۔

شہری زندگی کا فساد

جو لوگ اللہ سبحانہٗ کی ذاتِ گرامی کے بارے میں مخلص نہ ہوں ان میں فساد و صلاح کی قوت تمیز ملیا میٹ ہوجاتی ہے وہ خیر و شر اور صلاح و فساد کا پیمانہ اپنی خواہشات، اپنے ذہنی رجحانات کے تابع رکھ کر بناتے ہیں۔

۱۸۔ منافقین چند وجوہ سے فساد کرتے ہیں۔ اوّل نفسانی خواہشات میں منہمک تھے اور انقیاد و احکامِ شرعیہ سے کاہل اور متنفر تھے۔ دوم مسلمانوں اور کافروں دونوں کے پاس جاتے تھے اور اپنی قدر و منزلت بڑھانے کو ہر ایک کی باتیں دوسروں تک پہنچاتے تھے۔ سوم کفار سے نہایت مدارات اور ملاطفت سے پیش آتے تھے اور امورِ دین کی مخالفت پر کفار سے اصلاً مزاحمت نہ کرتے تھے۔ اور کفار کے اعتراضات و شبہات کو جو دین کی باتوں پر ہوتے تھے مسلمانوں کے روبرو نقل کرتے تھے تاکہ ضعیف الاعتقاد اور کمزور احکامِ شرعیہ میں متردد ہوجائیں۔ اور جب ان باتوں سے ان کو کوئی روکتا تو جواب دیتے کہ ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں اور چاہتے ہیں کہ تمام قوم و ملک مثل زمانہ سابق شیر و شکر ہو کر رہیں اور نئے دین کی وجہ سے جو مخالفت بڑھ گئی ہے وہ بالکل جاتی رہے۔ چنانچہ ہر زمانہ میں دنیا طلب اور ہوا پرست ایسا ہی کرتے ہیں۔[1]

یعنی ان کے منافقانہ کردار کی وجہ سے قِسم قِسم کے فسادات اور طرح طرح کے فتنے رونما ہونے لگے اور کسی خیر اندیش نے ان کو فہمائش کی کہ اس قسم کی کارروائی ملک میں فساد کا باعث ہوتی ہے۔ اسے چھوڑ دو۔ تو اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ ہم ہی تو مصلح ہیں۔ غرض ان کی غباوت یا شرارت اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ فساد کو اصلاح سمجھتے ہیں۔[2]

اس آیت سے دو باتیں معلوم ہوئیں۔ ایک یہ کہ منافقین کی حرکات فی الواقع ملک میں فتنہ و فساد کا باعث بنی ہوئی تھیں۔ دوسری یہ کہ منافقین یہ حرکات فتنہ و فساد کی نیت سے نہ کرتے تھے بلکہ ان کو یہ معلوم بھی نہ تھا کہ فتنہ و فساد ان کے کردار کا نتیجہ ہے وَلٰکِنْ لَّا یَشْعُرُوْنَ۔[3]

---

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ صفحہ ۲ [2] بیان القرآن صفحہ ۸ [3] معارف القرآن۔

اس سے معلوم ہوا کہ اسلامی قانون کے علاوہ کسی جاہلی دستور پر قائم رہنا اس کے طور و طریقوں کی اشاعت کرنا فساد فی الارض کے مترادف ہے۔ امنِ عالم اور نظامِ اقوام قائم اسی وقت ہو سکتا ہے جب انسانی زندگی نبوت کے لائے ہوئے نظامِ حیات کو اپنائے اس سے انحراف بلکہ سرِ مو تجاوز کرنا بھی دُنیا کو بدنظمی، ابتری، کشت و خون اور ہر قسم کی طبقاتی جنگ کو دعوت دیتا ہے چنانچہ دُنیا اس کا بارہا تجربہ کر چکی ہے۔ اسلام کے اس پہلو پر کہ وُہ نظامِ عالم کا بہترین ضامن ہے ہمارے زمانے میں علّامہ اقبالؒ نے شاعرانہ زبان میں خوب لکھ دیا ہے[1]۔

وُہ چاہتے ہیں کہ سب شیر و شکر ہو جائیں آپس میں کوئی اختلاف نہ رہے۔ اس نئے نظامِ حیات کی وجہ سے جو جھگڑا اور اختلاف پیدا ہو جائے وُہ ختم ہو جاتے اور ملک اپنی پہلی حالت پر لوٹ آئے اور سلسلہ معاش و تجارت حسبِ سابق جاری ہو جائے[2] ——— اسی کا نام ان کی سیاسی زبان میں اصلاح ہے۔ گویا ان سے جب مطالبہ کیا جاتا ہے کہ زندگی کی درستگی کے لیئے نبوت کے لائے ہوئے علم و عمل کو دُنیا میں قائم ہونے دو، اس کی راہ میں رُکاوٹ نہ بنو اور اس کے خلاف لوگوں کو نہ اُکساؤ۔ کیونکہ یہی وُہ نظامِ حق ہے جس کے ذریعے ہر قسم کا فساد اور معاشرے کا ہر طرح کا بگاڑ درست ہو سکتا ہے۔ یہ قائم ہو گا تو بگاڑ ختم ہو گا، افتراق کے جراثیم مر جائیں گے، اوہام و رسوم کی بندگی مٹے گی، انسان حریتِ ضمیر، حریتِ فکر اور حریتِ رائے سے مالا مال ہو گا۔ ان کا جواب یہ ہوتا ہے کہ ہم ہی تو لوگوں کی اپنے سربراہوں، اپنے لیڈروں اور اپنے رہنماؤں کی ہدایات کے مطابق اصلاح کر رہے ہیں۔

۱۹ ——— یہ جواب بعینہٖ وُہ ہے جو آج بھی خدا معلوم اُمت کے اندر کتنے منافقوں کی زبان پر ہے دین میں قدم قدم پر رخنے ڈالتے جاتے ہیں اور زبان پر وہی دعویٰ اصلاح اور تعمیر کا۔ نحن مصلحون کے معنے یہی ہیں کہ یہ لوگ مُفسد ہونے کے باوجود مصلح ہونے کے مُدعی ہیں سیاسی اصلاح، تہذیبی اصلاح، معاشرتی اصلاح اور دُوسری وُہ تمام اصلاحیں جن کا دعویٰ آج بھی ہر در و دیوار سے ہوتا رہتا ہے وہاں بھی اصلاح کے یہی نعرے تھے۔ دونوں جگہ ایک رُوح کام کر رہی ہے۔ حکیم الاُمت حضرت شاہ ولی اللہؒ نے شہری زندگی کے جس فساد کی نشاندہی کی ہے وُہ اس نظامِ حیات ہی سے انحراف کا نتیجہ ہے جسے نبوت علم و عمل کی شکل میں لے کر آئی ہے شاہ صاحبؒ

[1] تفسیر ماجدی ص۹ [2] معارف القرآن ج ۱ ص۵۹

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ آمِنُوا كَمَا آمَنَ النَّاسُ قَالُوا أَنُؤْمِنُ كَمَا آمَنَ السُّفَهَاءُ ۗ أَلَا إِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَاءُ وَلَٰكِن لَّا يَعْلَمُونَ ﴿١٣﴾

اور جب ان لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ تم بھی[٢٠] ایمان لے آؤ جیسے اور لوگ[٢١] ایمان لے آتے ہیں۔ تو کہتے ہیں کیا ہم بھی اسی طرح ایمان لے آئیں اور نبوت کی لائی ہوئی دعوتِ حق کا ساتھ دیں جیسے یہ کم عقل[٢٢] لوگ ایمان لے آئے ہیں اور ہم بھی بیوقوف ہو جائیں۔ یاد رکھو فی الواقع یہی لوگ بیوقوف[٢٣] ہیں (اگرچہ اپنی جہالت اور بڑائی کی وجہ سے) ان کو اس کا علم نہیں ہے۔

فرماتے ہیں۔

شہری زندگی کا سب سے بڑا فساد یہ ہے کہ بالا دست طاقت عمدہ عمدہ زیور، اچھی پوشاک، بہترین مکان، لذیذ خوراک اور عورت کی نازک اندامیوں میں لگ جاتی ہے۔

اور یہ بھی بتایا ہے کہ

جب بالا دست طاقت یہ مشغلہ اختیار کرے گی تو لوگوں میں معاشی فساد پیدا ہو جائے گا اور اصلاح ناپید ہو جائے گی۔

اور پھر یہ بھی لکھا ہے کہ

بالادست طاقت کا یہ میلان پوری شہری زندگی میں پھیل جائے گا اور اس طرح پھیلے گا جیسے ہڑکلائے کتے کے کاٹنے سے ہڑک پھیل جاتی ہے۔

اس سے بڑا افساد اور کیا ہو سکتا ہے۔

۔ اصلاح تو حقیقت میں یہ ہے کہ دینِ حق جملہ ادیان پر غالب ہو اور تمام دنیوی اغراض اور منفعتوں کے مقابلے میں احکامِ شرعیہ کی زیادہ رعایت کی جائے۔ اور دین کے بارے میں کسی کی موافقت و

مخالفت کی پرواہ نہ ہو ۔ خاک بر دلداریِ اغیار باش ——— کا مصداق بن جائے[1]

کج فکری

پہلی آیت میں اہل ایمان نے ان کو رذائل سے بچنے کی تلقین کی تھی اور بتایا تھا کہ شہری زندگی میں برائیوں سے بچ کر رہنا چاہیئے۔ اور زمانۂ جاہلیت کے رسوم و دستور کو چھوڑ دینا چاہیئے۔ اس سے ملک و عوام میں بدنظمی، ابتری، کشت و خون اور ہر قسم کی طبقاتی جنگ کو پنپنے کا موقعہ ملتا ہے اس آیت میں ان کو ایمان کی دعوت دی جا رہی ہے گویا پہلی آیت میں منکرات سے بچنے کا مطالبہ کیا اور اس میں فضائل فراہم کرنے کی پیش کش کی گئی ہے۔ اس سے اشارتاً یہ بھی معلوم ہوا کہ اجتماعی زندگی میں اصلاح کی اصل ترتیب یہی ہے کہ پہلے برائیوں کو ختم کرنے کی فکر کی جائے پھر خوبیوں کو فراہم کرنے کی تدبیر کی جائے۔ فقہا نے بھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے کہ مفاسد کے دور کرنے کے لیے پہلے کوشش کی جاتے مصالح کی فکر نہ کی جائے۔

۲۰ — ایمان کا دعوٰی تو وہ پہلے بھی کرتے تھے کہنے والوں کا مطلب یہ تھا کہ ایمان دل سے لاؤ، دیانت اور راستی کے ساتھ رسول کی رسالت کو تسلیم کرو۔ انقیاد باطن، التزام طاعت، عہدِ وفاداری وہ اوصاف ہیں جن کے بغیر ایمان صرف علم ہی کا ایک درجہ رہتا ہے۔ ایمان کے لیے ضروری ہے کہ یہ علم ایسی صفت نفس بن جائے کہ دِل اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کردے۔ ان کو نبوت کا، قرآن کے کتابِ الٰہی ہونے کا، آخرت میں مجازات کا علم تھا۔ لیکن انقیاد قلبی اور التزام طاعت نہ تھا۔ ایمان صرف اس کا نام ہے کہ قلب و زبان تصدیق سے آراستہ ہوں اور عہدِ وفاداری کرتا ہو اگر قلب تصدیق کے لیئے آمادہ نہیں تو صرف زبان کا اقرار کسی کو ایماندار نہیں بناتا — کہنے والوں نے کہا کہ آمِنُوْا ایمان لاؤ ——— لیکن من گھڑت اور خود ساختہ ایمان نہیں بلکہ كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ ایسا ایمان لاؤ جیسا لوگ سچائی اور خلوص کے ساتھ ایمان لاتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایمان کے دعوے کے صحیح یا غلط ہونے کے لیئے اصلی معیار صرف صحابۂ کرام کا ایمان ہے۔ جو اس کے مطابق نہیں وہ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک ایمان نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص قرآنی نظریات کا مفہوم قرآنی بیان یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریحات کے خلاف پیش کرے

---

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ مکہ

اور یہ کہے کہ میں تو یہ مانتا ہوں تو یہ ماننا شرعاً معتبر نہ ہوگا۔ جیسے قادیانی گروہ حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم النبیین ماننے کا دعویٰ کرتا ہے لیکن اس کا مفہوم قرآن کے بیان حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریح کے خلاف ایسا پیش کرتا ہے جس سے مرزا قادیانی کے لیے نبی ہونے کی گنجائش نکل آئے۔ قرآن کی تصریح کے مطابق وہ ہرگز مومن نہیں ہو سکتے ـــــ خلاصہ یہ کہ ایمانِ صحابہ کے خلاف کسی کا ایمان قابلِ اعتبار نہ ہوگا[1] ـــــ اور اس سے آج بھی یہی کہا جائے گا کہ آمِنُوْا كَمَا اٰمَنَ النَّاسُ۔

۲۱ـــ اور لوگ ایمان لائے ہیں۔ النَّاسُ سے ساری نوعِ انسانی مُراد نہیں بلکہ وہ متعین و مخصوص افراد مراد ہیں جو مخاطبوں کے لیے جانے پہچانے تھے یعنی مہاجرین و انصار۔

۲۲ـــ سچے مسلمانوں کو کم عقل اور بیوقوف کہا ہے۔ کیونکہ وہ یعنی مُسلمان اللہ کے احکام پر دل و جان سے ایسے فدا تھے کہ ان کو اس معاملہ میں لوگوں کی مخالفت اور اس کے نتائج بد کی کوئی پروا نہ تھی۔ اور وہ زمانے کے بوقلموں انقلابات کو ہیچ سمجھتے تھے۔ برخلاف منافقین کے کہ وہ مسلمان اور کافروں سے ظاہرداری کا معاملہ کرتے تھے اور اغراض نفسانی کی وجہ سے آخرت سے بالکل بے فکر تھے۔ یہ ابن الوقتی اور مصلحت بینی اس درجہ غالب تھی کہ ایمان اور اسلامی قانون کی پابندی کو ضروری نہ سمجھتے تھے صرف زبانی دعوے پر قناعت کر رکھی تھی[2]۔

سفہاء کہہ کر اُس وقت کے پکے اور سچے مسلمانوں پر طنز کی ہے یعنی حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ پر۔ یہی سُنّت آج تک چلی آ رہی ہے۔ ترقی پسندوں، روشن خیالوں کے دربار سے آج بھی جمود پسند، رجعت پسند، تاریک خیال وغیرہ کیسے کیسے خطابات ہیں جو اہلِ حق کو دیئے جاتے ہیں۔ کیا کہنے ہیں ان کی کم فہمی کے۔ پہلے افساد کو اصلاح کہہ رہے تھے اب احمق بالائے حمق یہ ہے کہ عقل اور دُور اندیشی کو بے عقلی بتا رہے ہیں۔ سفیہ اس کم عقل کو کہتے ہیں جسے اپنے نفع و نقصان کی تمیز نہ ہو[3]۔

گویا وہ اپنے نزدیک ان لوگوں کو بیوقوف سمجھتے تھے جو سچائی کے ساتھ اسلام قبول کر کے اپنے آپ کو تکلیفوں، مشقتوں اور خطرات میں مبتلا کر رہے تھے۔ ان کی رائے میں یہ سراسر احمقانہ فعل تھا کہ محض حق پرستی کی خاطر تمام ملک کی دُشمنی مول لی جائے۔ ان کے خیال میں عقل مندی یہ

---

[1] معارف القرآن صـ۷ـ [2] حاشیہ شیخ الہندؒ صـ۵ـ [3] تفسیر ماجدی صـ۹

وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚۖ وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ ۙ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۱۴﴾

اور جب یہ لوگ اہلِ ایمان سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان[41] لائے ہیں (لیکن) جب اپنے سرغنوں[42] کے ساتھ تنہائی میں ہوتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم تو تمہارے ساتھ[43] ہیں۔ ہم تو ان کے ساتھ (اظہارِ ایمان کرکے) صرف تمسخر[44] کررہے ہیں۔

تھی کہ آدمی حق اور باطل کی بحث میں نہ پڑے بلکہ ہر معاملے میں صرف اپنے مفاد کو دیکھے[1]۔

۲۳ یعنی یہی فی الواقع بیوقوف ہیں کہ دُنیوی پادر ہوا، اغراض اور وقت کی مصلحتوں کی وجہ سے آخرت کا خیال نہیں کرتے۔ فانی کو لینا اور باقی کو چھوڑنا کتنی بڑی حماقت ہے؟ اور مخلوقات سے ڈرنا اللہ علام الغیوب سے نہ ڈرنا کتنی بڑی جہالت ہے؟ لوگوں کی خاطر احکم الحاکمین اور اس کے مقبول بندوں کی مخالفت کرنا اور اپنے تئیں صلح کُل قرار دینا کیسی نادانی ہے لیکن یہ اس درجہ بیوقوف ہیں کہ ایسی موٹی بات بھی نہیں سمجھتے[2]۔

اس آیت سے منافقین کی کج فکری ہی کا پتہ نہیں چلتا بلکہ جراب کے اس پیمانہ سے سماجی زندگی میں ان کی برتری کی بھی بُو آتی ہے۔ ریاست اور سرمایہ کے نشے میں وُہ یہ بات کہہ رہے ہیں یہ بے باکانہ گفتگو غریب مسلمانوں سے کرتے تھے۔

آوارگی

ان کی اخلاق باختگی کا یہ حال ہے کہ اپنے کمینہ پن، دھوکہ اور فریب کاری کو ذہانت تصور کرتے ہیں۔ حالانکہ درحقیقت یہ ذلت اور کمزوری ہے۔ بااخلاق کبھی دھوکہ باز اور سازشی نہیں ہوتا لیکن یہ

---

[1] تفہیم القرآن [2] حاشیہ شیخ الہندؒ ص۵

ان میں اس قدر اخلاقی پستی ہے کہ ان کی ایک ذہنیت یہ تھی کہ

۲۴۔۔۔ یہ عام مسلمانوں کے مقابلے میں تو اکڑتے رہتے تھے لیکن مسلمانوں میں جو صاحب اثر و اقتدار ہوتے ان کے آگے خود جھک جاتے اور ان سے خُلق سے پیش آتے۔ پہلی آیت میں ان کے کردار کا اکڑنے کا نقشہ ہے اور اس آیت میں ان کے جھک جانے اور تملق کا تذکرہ ہے۔ آغاز میں بھی ان کا دعویٰ آمنّا باللہ نقل فرمایا۔ اس جگہ پھر نقل کیا ہے یہ تکرار نہیں ہے پہلے صرف ان کا عقیدہ بیان کرنا مقصود تھا اور اب ان کا اخلاق و کردار بتانا پیشِ نظر ہے[۱] ۔۔۔۔۔ یا یُوں کہہ دیجئے کہ آمنّا سے یہ لوگ مسلمانوں کو اس بات کا یقین دلانا چاہتے تھے کہ اب ہم نے دورُخی اور نفاق کی زندگی چھوڑ دی ہے کیونکہ ان کا زبانی ایمان تو پہلے بھی معلوم تھا[۲] ۔۔۔۔۔ مگر پہلی بات جو حضرت تھانویؒ نے فرمائی ہے سیاق کے زیادہ مناسب ہے۔

۲۵۔۔۔ سرغنوں یعنی شیاطین۔ مراد ان سے یا تو وُہ کُفار ہیں جو اپنے کُفر کو سب پر ظاہر کرتے تھے اور یا وُہ منافقین مُراد ہیں جو ان میں رئیس سمجھے جاتے تھے[۳]۔

شیطان عربی زبان میں سرکش، متمرد اور شوریدہ سر کو کہتے ہیں۔ انسان اور جن دونوں کے لیے یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ اگرچہ قرآن میں یہ لفظ زیادہ تر شیاطین جن کے لیئے آیا ہے لیکن بعض مقامات پر شیطان صفت انسانوں کے لیئے بھی استعمال کیا گیا ہے اور سیاق و سباق سے بآسانی معلوم ہو جاتا ہے کہ کہاں شیطان سے انسان مُراد ہیں اور کہاں جن۔ اس مقام پر شیاطین کا لفظ ان بڑے بڑے سرداروں کے لیئے استعمال ہوا ہے جو اس وقت اسلام کی مخالفت میں پیش پیش تھے[۴]۔

یہاں شیاطین سے مُراد رؤسائے یہود لیئے گئے جو اپنی سرکشی و طغیانی کے لحاظ سے خود ہی شیطان بنے ہوئے تھے نیز ان کے کاہن جن کے یہ لوگ بہت معتقد تھے[۵]۔

۲۶۔۔۔ ہم تو تمہارے ساتھ ہیں یعنی کفر و اعتقادِ دین کے معاملہ میں ہم بالکل تمہارے ساتھ ہیں تم سے کسی حالت میں جُدا نہیں ہو سکتے۔ مسلمانوں کے ساتھ تو محض ظاہر داری کے طور پر مصلحتاً اپنا مُسلمان ہونا ظاہر کرتے ہیں ورنہ حقیقتاً تو ہم تمہارے ہی ہم خیال، ہم عقیدہ اور ہم مذہب ہیں۔ اِنَّا مَعَکُمْ۔

۲۷۔۔۔ یعنی ظاہری موافقت ہم جو مسلمانوں سے کرتے ہیں اس سے یہ نہ سمجھنا کہ ہم واقع میں ان کے موافق ہیں۔ ہم ان سے تمسخر کرتے ہیں اور ان کی بیوقوفی سب پر ظاہر کرتے ہیں کہ باوجودیکہ ہمارے

---

[۱] بیان القرآن ص۹ [۲] جواہر القرآن ص۲۳ [۳] حاشیہ شیخ الہندؒ ص۵ [۴] تفہیم القرآن ج ا ص۵۵ [۵] تفسیر ماجدی ص۱۰

اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَيَمُدُّهُمْ فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ ﴿۱۵﴾

(حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ وُہ نہیں بلکہ) اللہ ان کو بنا رہا ہے[۲۸]۔ یعنی یہ کہ اللہ نے سرکشی میں ان کی رسی ڈھیلی[۲۹] چھوڑ رکھی ہے۔ اور ان کا حال یہ ہے کہ وُہ عقل کے اندھے[۳۰] ہیں۔

افعال ہمارے اقوال کے مخالف ہیں مگر وُہ اپنی بیوقوفی سے صرف ہماری زبانی باتوں پر ہمیں مسلمان سمجھ کر ہمیں کچھ نہیں کہتے۔ مالِ غنیمت میں حصّہ دیتے ہیں اور ہم سے شادیاں کرتے ہیں اور ہم ان کے راز کی باتیں اُڑا لاتے ہیں اور وُہ اس پر بھی ہماری فریب کاری کو نہیں سمجھتے — گویا دل و جان سے تو آپ پر فدا ہیں باقی مسلمانوں کو بنانے کے لیئے ان کی سی کہہ دیتے ہیں۔

آیت میں فِیْ طُغْیَانِہِمْ کا تعلق یَمُدُّھُمْ سے ہے۔ بعض تراجم جدیدہ میں اس کو یَعْمَھُوْنَ کے متعلق کرکے ترجمہ اس طرح کیا کہ — وُہ اپنی سرکشی میں سرگرداں ہو رہے ہیں — یا وُہ اپنی سرکشی میں اندھوں کی طرح بھٹکتے چلے جاتے ہیں — یا وُہ اپنی سرکشی میں حیران و سرگرداں ہو رہے ہیں۔ یہ معنے معتزلہ کے موافق اور اہل السنّت کے خلاف ہیں۔ اور اہلِ عرب کے استعمال میں بھی اس کے جواز کی سند نہیں ہے۔ شاہ عبدالقادرؒ نے یہ معنے کیے ہیں — ڈھیل چھوڑتا ہے ان کو تکبری اور گمراہی میں حیران، بہکے ہوئے — شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ نے اس پر متنبہ فرمایا ہے۔

۲۸— چونکہ اللہ سُبحانہٗ نے مومنین کو فرمایا کہ منافقین کے ساتھ مسلمانوں جیسا برتاؤ کریں ان کے مال و جان سے ہرگز تعرض نہ کریں۔ اس سے اپنی حماقت سے یہ سمجھ بیٹھے کہ ایمان لانے سے جو فوائد مسلمانوں کو ہوئے ہیں وُہ سب فائدے ہمیں بھی صرف زبانی دعوئ اسلام سے حاصل ہو گئے۔ اس بنا

پر وُہ بالکل مطمئن ہوگئے حالانکہ انجام کے اعتبار سے یہ معاملہ منافقین کے لیئے خطرناک اور ان کو بلاؤں میں پھنسانے کے لیئے ہے۔ اس کا انجام نہایت خراب ہے۔ تو اب آپ ہی انصاف کیجئے کہ یہ تمسخر حقیقت میں کس سے ہوا مسلمانوں سے یا منافقوں سے۔ اور یہ تمسخر کرنے اور بنانے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس تمسخر کا بدلہ اور سزا ان کو دے گا[1]

یا یُوں سمجھئے کہ اللہ کا دُنیا میں استہزا یہ ہے کہ

ان کو خوب مال و دولت دیا تا کہ خوب مغرور اور بدمست ہو جائیں اور پھر دفعتہً ان کو پکڑ لیا جائے گا لوگ اس قسم کی دولت کو نعمت سمجھتے ہیں اور درحقیقت وُہ عذاب و نقمت ہے[2]۔

یا یُوں کہہ دیجئے کہ

ان کو مہلت دی گئی ہے جب خوب کُفر میں کامل ہو جائیں گے اور جُرم سنگین ہو جائے گا یکبارگی پکڑ لیے جائیں گے۔ چونکہ اللہ کا یہ معاملہ ان کے استہزار کے مقابلے میں تھا اس لیئے اس کو بھی استہزا کہہ دیا گیا[3] —— کیونکہ مجازات، سزا، معاوضہ کے موقعہ پر لغتِ عرب میں یہ محاورہ عام ہے کہ فعل کی جزا کو اصل فعل ہی کے نام سے پُکارتے ہیں جیسے نَسُوا اللهَ فَنَسِيَهُمْ[4]

۲۹ — اللہ نے ان کی سرکشی میں ان کی رسی ڈھیل چھوڑ رکھی ہے۔ یہ اللہ کا قانون تدریج، قانون امہال اور قانونِ مد ہے۔ اس آیت میں اسی کی طرف اشارہ کیا ہے اور ان کے بارے میں مسلمانوں کو خبر دی ہے کہ جزاءِ عمل کا قانون ان کی طرف سے غافل نہیں ہے وُہ بتدریج اس نتیجہ تک پہنچیں گے جو سرکشی کا لازمی نتیجہ ہے۔ اگر یہ قانُون یہاں کام نہ کرتا تو دُنیا میں ایک وجود بھی فرصتِ حیات سے فائدہ نہ اُٹھاتا۔ ہر غلطی، ہر کمزوری، ہر فساد اچانک بیک دفعہ بربادی و ہلاکت کا باعث ہو جاتا۔ یہ اللہ کے قانونِ امہال کی دی ہوئی ڈھیل ہے اس لیئے — تا کہ متنبہ و خبردار ہو کر اصلاح و تلافی کا سامان کریں[5]۔

۳۰ — عقل کے اندھے ہیں۔ یہ ترجمہ ہے يَعْمَهُونَ کا۔ یہ عمہ سے بنا ہے اُس کیفیت کو کہتے ہیں کہ انسان کو راستہ سُجھائی نہ دے۔ اور وُہ اِدھر اُدھر اندھوں کی طرح ٹٹولتا اور ہاتھ پاؤں مارتا پھرے۔ وحی کی روشنی سے محرومی کے بعد انسان کی واقعی یہی حالت ہوتی ہے۔ اپنی محدود عقل کے سہارے وُہ چاروں طرف ہاتھ پاؤں مارتا ہے۔ طرح طرح کے نظریے قائم کرتا ہے اصول

---

[1] حاشیہ شیخ الہند ص۵ [2] معارف القرآن م ا ص۳ [3] بیان القرآن ص۲ ج۱ [4] تفسیر ماجدی ص۱۰ [5] ترجمان القرآن ص۲

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلَالَةَ بِالْهُدَىٰ فَمَا رَبِحَت تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوا مُهْتَدِينَ ﴿١٦﴾

(یقین کرو کہ) یہی لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی مول لی ہے لیکن نہ تو ان کی تجارت[1] سُود مند نکلی اور نہ ہدایت پر قائم رہے[2]

وکلیات بناتا ہے ہر طرف ظن وتخمین کے گھوڑے دوڑاتا ہے کھلا ہوا راستہ کوئی نہیں سُجھائی دیتا ہے۔ شک، ارتیاب، بے اطمینانی کے دلدل میں اور زیادہ پھنستا ہے[3]

خسارے کی تجارت

یہ سرکشی میں ڈھیل ہی کا نتیجہ ہے کہ ان لوگوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی خرید لی ہے۔ ہدایت کی راہ ان کے سامنے واضح تھی۔ یہ اگر چاہتے تو ہدایت کو اپنا سکتے تھے لیکن انہوں نے جان بُوجھ کر ہدایت کے بدلے گمراہی کو خریدا۔ اور ایسا کاروبار کیا جیسے کوئی بیوقوف تاجر کرتا ہے۔

۱۴۱ — تجارت سے مراد گمراہی کا ہدایت کے بدلے مول لینا ہے[4] ——— گویا ان کو تجارت کا بھی سلیقہ نہیں ہے کہ ہدایت جیسی اچھی چیز چھوڑ دی ہے اور گمراہی جیسی بُری چیز لے لی ہے ——— یعنی یہ ان کی بدبختی کی انتہا ہے کہ انہوں نے ہدایت و ایمان جیسی جنسِ بے بہا قیمت میں دے کر خریدی بھی تو کیسی نکمی اور بے حقیقت چیز گمراہی و کفر۔ عرب کے باشندوں کا خوب کاروبار پھیلا ہوا تھا اور تجارت کی اصطلاحیں ان کی زبان و ادب کا ایک جُزو بن گئی تھیں جیسا کہ آج انگریزوں کا کاروبار خوب پھیلا ہوا ہے اور کاروباری اصطلاحیں انگریزی زبان و ادب کا جُزو بن چکی ہیں[1]

[1] تفسیر ماجدی [2] حاشیہ شیخ الہندؒ ص۵ [3] بیان القرآن ص۹ [4] تفسیر ماجدی ص۱۰

مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا فَلَمَّآ أَضَآءَتْ مَا حَوْلَهُۥ
ذَهَبَ اللَّهُ بِنُورِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِي ظُلُمَٰتٍ لَّا يُبْصِرُونَ ﴿١٧﴾ صُمٌّۢ
بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُونَ ﴿١٨﴾

ان کی حالت اس شخص جیسی[۳۳] ہے جس نے (رات کی تاریکی میں) آگ روشن کی ہو اور جب اس کے ارد گرد میں اُجالا ہو گیا تو ایسا ہوا کہ اللہ نے ان کی روشنی چھین لی[۳۴] (آگ بجھ گئی اور روشنی جاتی رہی) اور ان کو تاریکیوں میں چھوڑ دیا کہ ان کو کچھ بھی نظر نہیں آتا ہے۔ بہرے،[۳۵] گونگے اندھے ہو کر رہ گئے ان سے واپسی کی کوئی توقع نہیں[۳۶] ہے۔

۳۲— انہوں نے بظاہر ایمان قبول کیا اور دِل میں کُفر کو رکھا جس کی وجہ سے آخرت کی زندگی میں خرابی اور دُنیا کی زندگی میں خواری سے دوچار ہوئے کہ حق تعالیٰ شانہٗ نے اپنے کلام پاک میں ان کے حالات سب کو بتا دیئے۔ ایمان لاتے تو دارین میں سُرخرو ہوتے۔ اس لیئے ان کی تجارت سے ان کو کوئی فائدہ نہیں نہ دُنیا کا نہ آخرت کا۔ اور ان کو یہ احساس نہ ہوا کہ صرف دعویٰ ایمان کو کافی سمجھ کر اس خرابی اور رسوائی کا شکار نہ ہوتے[۱] ——— اور راہ یابی سے محروم کیسے نہ ہوتے جب کہ قوتِ ارادہ سے صحیح کام نہ کرکے خود ہی گمراہی خرید رہے تھے۔ تجارت سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ اصلی سرمایہ محفوظ رہے اور نفع اس پر بڑھتا رہے۔ یہاں نفع کا کیا ذکر عقلِ سلیم کے سرمایہ کو بھی اُلٹا برباد کر ڈالا[۲]۔

[۱] حاشیہ شیخ الہندؒ ص۵ [۲] تفسیر ماجدی ص۱۔

دراصل یہ آیت ایسے ہی بطور نتیجہ آئی ہے جیسے مومنین مخلصین کا اوصاف و خصائص کے ذریعے تعارف کرانے کے بعد فرمایا تھا کہ ——— اُولٰٓئِكَ عَلٰی هُدًی مِّنْ رَّبِّهِمْ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۔اور دوسرے طبقہ کے معاندانہ کفر کو ذکر کرنے کے بعد بتلایا تھا کہ ——— خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰی سَمْعِهِمْ الخ ٹھیک ٹھیک اسی طرح اس طبقہ کے سارے خصائص ذکر کرنے کے بعد ان کے بارے میں فرمایا ——— اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰی الخ

یعنی اس طبقہ کے ایمان کا جھوٹا دعویٰ کرنے، فریبی، دغاباز ہونے، دل کا بیمار ہونے، فسادی ہونے اور فسادی ہو کر مصلح بننے کا دعویٰ کرنے، راست بازی کو بیوقوفی اور نفاق و عیاری کو دانشمندی سمجھنے، راست بازوں کی تحقیر اور اہلِ ایمان کا مذاق اُڑانے کی اصلی اور بنیادی وجہ یہ ہے کہ ان کو ہدایت کے مقابلے میں ضلالت پسند ہے اس لیئے ساری بُرائیوں کی آماجگاہ بنے ہوئے ہیں حقیقت میں انہوں نے منافع اور مصالح کے پیشِ نظر ایک کاروبار کیا ہے لیکن یہ کاروبار ان کو راست نہیں آیا۔ نفع تو درکنار زبانی اقرار کا اصلی سرمایہ بھی گیا۔ یا یوں کہہ دو کہ عقلِ سلیم کا سرمایہ بھی کھو بیٹھے۔

نفاق کی نفسیاتی کیفیت

نفاق کی نفسیاتی کیفیت کو دو مثالوں سے واضح کیا ہے۔ یہ دو مثالیں دو جماعتوں کے احوال و ظروف کی تشریح کرتی ہیں۔ دونوں ایمان کی مدعی ہیں۔ اتباعِ شریعت کا دم بھرتی ہیں لیکن دونوں ایمان سے محروم اور علم و عمل سے بیگانہ ہیں۔ دونوں کی محرومی الگ الگ ہے ایک کی محرومی حصول معرفت کے بعد انکار و سرکشی کا نتیجہ ہے اور دوسری کی محرومی نادانی اور جہل کی وجہ سے ہے۔ ایک نے پاکر رُوگردانی کی ہے اس لیے محروم ہے اور دوسرا پا ہی نہ سکا۔ اس لیے محروم ہے۔ محروم دونوں ہیں مگر پہلے کی محرومی زیادہ مجرمانہ ہے کیونکہ اس نے نعمت پاکر اس سے رُوگردانی کی ہے۔ اس لیئے یہ مغضوب اور معتوب ہے اور دوسرے کی حالت محض ضلالت کی ہے۔ غضب اور ضلالت دونوں کے لیئے دو مثالیں پیش فرمائی ہیں۔ ایک آگ کی اور دوسری پانی کی

۳۳ ——— جو لوگ علم و معرفت کی جگہ جہل و کوری اور روشنی کی جگہ تاریکی پر قناعت کرتے ہیں اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا کہ نامرادی و محرومیوں کی وادیوں میں گم ہو جاتے ہیں۔ ان کی محرومیوں

کو ان لوگوں کے مشابہ بتایا ہے جو بیابان کی سخت تاریکیوں میں ہوں وہاں کوئی بندۂ خدا آگ روشن کرے تاکہ لوگوں کو راستہ نظر آئے۔

جب آگ روشن ہو جائے اور آس پاس میں اُجالا ہو کر راستہ نظر آنے کو ہو۔ یکا یک آگ بُجھ جائے اور تاریکی چھا جائے، راستہ بالکل نظر نہ آئے، اندھیرا ہی اندھیرا ہو جائے اور لوگ اندھیرے میں ٹھوکریں کھانے لگیں۔ یہی حال ان کا ہے کفر و جہالت کی اٹاٹوپ تاریکیوں میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایمان کی آگ روشن کی جس سے گرد و پیش کی ہر چیز نظر آنے لگی۔ وحی کے ذریعے عقائد، اعمال، اخلاق خوب واضح ہو کر سامنے آگئے۔ یہ ان کی شقاوت اور محرومی ہے کہ اس عالمِ نور میں بھی ان پر منزل گم ہی رہی اور ان کی گوہرِ مقصود تک رسائی نہیں ہوتی۔

دراصل فضا میں تاریکیاں چھائی ہوئی تھیں۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اندھیرے میں ایمان کی آگ روشن کی۔ اس روشنی سے آپ کا اِرد گرد منور ہو گیا۔ لیکن منافقین اس عالمِ نور میں اندھے ہو گئے اور راہِ عمل مفقود ہو گئی یعنی جب ہدایت کا نور ہر طرف پھیل گیا تو بجائے اس کے کہ اس سے مستفید ہوتے انہوں نے خود اپنی اندرونی بصیرت کو ضائع کر دیا اور اس روشنی سے محروم ہو گئے[1]

شاہ عبدالقادرؒ فرماتے ہیں:-

اللہ نے نبی سے دینِ اسلام روشن کیا اور خلق نے اس میں راہ پائی اور منافق اس وقت اندھے ہو گئے۔ آنکھوں میں روشنی نہ ہو تو مشعل کیا کام آئے ——— اس مثال کو یوں بھی سمجھایا گیا ہے کہ منافقوں کی مثال ایسی ہے کہ کوئی شخص اندھیری گھنگھور رات میں آگ روشن کرے جنگل میں راستہ دیکھنے کی خاطر۔ اور جب آگ روشن ہو جائے اور راستہ نظر آنے کو ہو تو خدا تعالےٰ نے اسے بُجھا دیا اور اندھیری رات میں جنگل میں کھڑا رہ گیا کہ کچھ نظر نہیں آتا۔ ایسے ہی منافقین نے مسلمانوں کے خوف سے کلمۂ شہادت کی روشنی سے کام لینا چاہا مگر سرِ دست معمولی فائدہ اُٹھانے پائے تھے کہ نورِ کلمۂ شہادت اور منافع سب نیست و نابود ہو گئے اور مرتے ہی عذابِ الیم میں مُبتلا ہو گئے۔[2]

یہ بھی بتایا گیا ہے کہ

جس طرح یہ شخص اور اس کے ہمراہی روشنی ہونے کے باوجود اندھیرے میں رہ گئے۔ اسی طرح منافقین حق واضح ہونے کے بعد ظلمتِ ضلالت میں جا پھنسے۔ اور جس طرح اس اندھیرے میں ان

---

[1] حاشیہ جواہر القرآن ص۲۲ ۔ [2] حاشیہ شیخ الہندؒ ص۵

آگ جلانے والوں کے چشم و گوش و زبان سب بیکار ہو گئے اسی طرح ظلمت ضلالت میں پھنس کر ان لوگوں کی یہ حالت ہو گئی صُمٌّ بُکْمٌ الخ[1]

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کے حکم سے اسلام کی مشعل کو روشن کیا جس کی وجہ سے حق و باطل اور ہدایت و ضلالت خوب روشن ہو گئے اور تمام مخلوق نے اس میں راہ پائی۔ لیکن منافق اندھے ہو گئے۔ اللہ نے ان کے نورِ بصیرت کو سلب کر لیا۔ آفتاب نبوت و ہدایت نے اگرچہ تمام عالم کو روشن کیا مگر جب تک آنکھ میں نور اور بینائی نہ ہو تو آفتاب کی روشنی کیا کام آئے[2]۔

مطلب یہ ہے کہ جب ایک اللہ کے بندے نے روشنی پھیلائی اور حق کو باطل سے، صحیح کو غلط سے، راہِ راست کو گمراہیوں سے چھانٹ کر بالکل نمایاں کر دیا تو جو لوگ دیدۂ بینا رکھتے تھے ان پر ساری حقیقتیں کھل گئیں۔ مگر یہ منافقین جو نفس پرستی میں اندھے ہو رہے تھے ان کو اس روشنی میں کچھ نظر نہ آیا[3]۔

یہاں یہ ارشاد ہو رہا ہے کہ جب حقانیت کی آگ خوب روشن ہو گئی اور ہدایت کا نور ہر طرف پھیل گیا تو بجائے اس کے کہ اس سے مستفید ہوتے منافقین نے خود اپنے اندرونی حاسہ بصارت کو ضائع کر دیا اور اس روشنی سے محروم ہو گئے[4]۔

۳۴ ــــ اللہ نے ان کی روشنی چھین لی ــــ روشنی چھین لینے کی نسبت اللہ تعالیٰ کی جانب محض تکوینی حیثیت سے ہے یعنی جب منافقوں نے گمراہ رہنا چاہا اور دعوتِ حق کو قبول و توجہ کے کانوں سے نہیں سُنا تو اللہ کی مشیت نے بحیثیت علّۃ العلل کے اس پر نتیجہ بھی وہی مرتب کر دیا۔ رضائے الٰہی کو اس میں مطلق دخل نہیں ہے[5]۔

روشنی چھین لینے کے الفاظ سے کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ ان کی تاریکی میں بھٹکنے کی ذمہ داری خود ان پر نہیں ہے۔ اللہ نورِ بصارت اسی کا سلب کرتا ہے جو خود حق کا طالب نہیں ہوتا، خود ہدایت کی جگہ گمراہی کو اپنے لیے پسند کرتا ہے خود صداقت کا روشن چہرہ نہیں دیکھنا چاہتا جب انہوں نے نورِ حق سے منہ پھیر کر ظلمت باطل ہی میں بھٹکنا چاہا تو اللہ نے انہیں اسی کی توفیق عطا فرما دی[6]۔

۳۵ ــــ بہرے ہیں یعنی صدائے حق گویا سُنتے ہی نہیں ہیں۔ گونگے ہیں کلمہ حق و ایمان ادا کرنے

---

[1] بیان القرآن ص۱؎ [2] معارف القرآن م ا ص۱۰۲ [3] تفہیم القرآن ج۱ [4] تفسیر ماجدی ص۱ [5] تفسیر ماجدی ص۱ [6] تفہیم القرآن ص۵۵

سے ان کی زبانیں گنگ ہیں اور دیدۂ حق کی طرف سے ان کی آنکھیں اندھی ہو چکی ہیں[1] ــــــ کیونکہ جب ان کی روشنی چھین لی گئی تو ایسے مدہوش ہو گئے کہ سارے حواس کھو بیٹھے لہٰذا اب حق کو نہ دیکھ سکتے ہیں اور نہ سُن سکتے ہیں اور نہ کسی سے دریافت کر سکتے ہیں[2] ــــــ اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ بہرے ہیں جو حق بات نہیں سُنتے، گونگے ہیں جو سچی بات نہیں کہتے، اندھے ہیں جو اپنے نفع و نقصان کو نہیں دیکھتے۔ سو جو شخص بہرا بھی ہو گونگا بھی ہو وُہ کس طرح راہِ راست پر آئے۔ صرف اندھا ہو تو کسی کو پکارے یا کسی کی بات سُنے تو اب ان سے ہرگز توقع نہیں ہے کہ حق کی طرف آئیں[3]۔

۳۶ ــــــ دراصل جو اللہ کی دی ہوئی عقل کو تاراج کر کے تاریکیوں میں گم ہو جاتا ہے اس کے لیئے بڑی سے بڑی مشعل بھی سودمند نہیں ہوتی۔ فی الواقع یہ لوگ علم آنے کی ساری راہوں پر پہرہ بٹھا دیتے ہیں نہ آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ نہ کانوں سے سُنتے ہیں اور نہ مُنہ سے بولتے ہیں۔

انصاف سے بتایئے کہ ایسا بے خبر اور گمراہ شخص جو آنکھوں سے نہ دیکھتا ہو، زبان سے نہ بولتا ہو اور کسی کی نہ سُنتا ہو اسے راہ کیونکر مل سکتی ہے۔ تم راہ دکھانے کے لیئے اشارہ کرو وُہ دیکھتا نہیں ہے۔ پکارو وُہ سُنتا نہیں ہے۔ خود پکارنا چاہے تو پکار سکتا نہیں۔ نہ اس کے پاس حق گو زبان ہے نہ حق نیوش کان ہے اور نہ حق شناس نگاہ ہے۔ اس سے ہرگز ہرگز یہ توقع نہیں ہے کہ باطل سے حق کی طرف، کُفر سے ایمان کی طرف، شرک سے توحید کی طرف، بدعت سے سُنت کی طرف، ظلم سے عدل کی طرف اور بُرائیوں سے نیکیوں کی طرف پلٹ آتے اور واپس ہو جائے۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ کوئی اسے جبراً اُٹھا کر روشنی میں پھینک دے۔ تو ہدایت ایسی چیز نہیں کہ جبراً کسی کے حلقوم میں اُتار دی جائے۔

یہ ان لوگوں کی ضلالت اور گمراہی کے لیئے مثال ہے جو حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ایمان کے مدعی تھے لیکن نبوت کے لائے ہوئے علم و عمل کو جہل و کوری پر قناعت کی وجہ سے قبول نہ کرتے تھے۔ اس میں ان لوگوں کے لیئے بڑی عبرت ہے جو ایمان کے مدعی ہو کر نہ قرآن سنتے ہیں نہ قرآن پڑھتے ہیں اور نہ قرآن دیکھتے ہیں۔ عقائد میں چند توہمات، اعمال میں چند رسوم کی حد تک دین کے نام پر قناعت کیئے ہوئے ہیں۔

---

[1] تفسیر ماجدی ص۵۰ [2] معارف القرآن م ا ص۶۱ [3] حاشیہ شیخ الہند ص۵

أَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ فِيهِ ظُلُمٰتٌ وَّ
رَعْدٌ وَّبَرْقٌ ۚ يَجْعَلُونَ أَصَابِعَهُمْ فِيٓ اٰذَانِهِمْ مِّنَ الصَّوَاعِقِ
حَذَرَ الْمَوْتِ ۗ وَاللّٰهُ مُحِيطٌ بِالْكٰفِرِينَ ﴿۱۹﴾ يَكَادُ الْبَرْقُ
يَخْطَفُ أَبْصَارَهُمْ ۗ كُلَّمَآ أَضَآءَ لَهُمْ مَّشَوْا فِيهِ ۙ وَإِذَآ
أَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوا ۗ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَ
أَبْصَارِهِمْ ۗ إِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿۲۰﴾

یا (پھر ان لوگوں کی مثال ایسی سمجھو) جیسے[۳۷] بارش آسمان سے برس رہی ہو اور اس کے ساتھ کالی کالی گھٹائیں، بادلوں کی گرج اور بجلی کی چمک بھی ہو۔ (ایسے سمے میں) ان کا یہ حال ہے کہ موت کے اندیشہ سے کڑک اور گرج کے سبب اپنی انگلیاں کانوں میں ٹھونس رہے ہیں حالانکہ اللہ نے تو منکرین کو ہر طرف گھیرا ڈال رکھا ہے (اس کی گرفت سے کیسے بچ سکتے ہیں) جب بجلی زور سے چمکتی ہے تو ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ (گویا) قریب ہے کہ وہ ان کی بینائی اُچک لے جائے۔ جب (فضا میں) ذرا چمک ہوتی ہے تو چل پڑتے ہیں اور جب تاریکی چھا جاتی ہے تو ٹھہر جاتے ہیں۔ اللہ اگر چاہے تو یہ بالکل اندھے اور بہرے ہو جائیں یقیناً اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

پہلی مثال آگ کی تھی۔ یہ دوسری پانی کی ہے۔ پہلی مثال ان لوگوں کی نفسیات کو واضح کرنے کے

لیئے بیان فرمائی ہے جو دعوتِ حق کو نادانی کی بنا پر نہیں اپناتے ۔ یہ دوسری مثال ان لوگوں کے لئے جو انکار و سرکشی سے دعوت کا مقابلہ کرتے ہیں۔ تمثیل میں آگ اور پانی کو اختیار کیا گیا ہے۔ آگ جیسے مادۂ نور ہے پانی ایسے ہی مادۂ حیات ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسی تعلق سے قرآن کو اور قرآن کی حامل ذات کو نور کہا ہے۔ اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَیۡکُمۡ نُوۡرًا مُّبِیۡنًا۔ اور قَدۡ جَآءَکُمۡ مِّنَ اللّٰہِ نُوۡرٌ اور ایسے ہی قرآن کو روح اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ذریعۂ حیات بتایا ہے۔ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلَیۡکَ رُوۡحًا مِّنۡ اَمۡرِنَا۔ اور اِسۡتَجِیۡبُوۡا لِلّٰہِ وَ لِلرَّسُوۡلِ اِذَا دَعَاکُمۡ لِمَا یُحۡیِیۡکُمۡ۔ گویا جیسے قرآن اور نبوت دلوں میں روشنی اور نورانیت کا ذریعہ ہے ایسے ہی قرآن اور نبوت مُردہ دلوں کی زندگی کا سامان ہیں۔ جو لوگ اس سے فیض یاب ہوں وُہ نورانی ہیں۔ ہمیشہ ان کی روشنی ان کے آگے رہنمائی کے لیئے موجود ہوگی۔ یَسۡعٰی نُوۡرُهُمۡ بَیۡنَ اَیۡدِیۡهِمۡ۔ اور جو ان دونوں کی روشنی سے رُوگرداں ہوں وُہ تاریکیوں میں ہوں گے۔ ایسے ہی جو لوگ قرآن اور صاحبِ قرآن سے استفادہ کرتے ہیں وُہ زندہ ہیں اور جو ان سے روگرداں ہیں وُہ موت کا شکار ہیں اس لیئے گمراہوں کے لیئے آگ کی مثال اور سرکشوں کے لیئے پانی کی مثال اظہارِ واقعہ اور حقیقت ہے۔ آیئے شارحینِ قرآن سے استفادہ کیجئے اور اس پر علیحدہ علیحدہ نہیں مجموعی نظر ڈالیئے۔

۴۷ ـــ آسمان سے مینہ شدت کے ساتھ پڑ رہا ہو، کئی طرح کی تاریکیاں بھی اس میں ہوں مثلاً بادل بھی تہ برتہ ہو خطراتِ باراں کی بھی بہتات ہو اور رات بھی اندھیری ہو، شدید تاریکی کے ساتھ بجلی کی کڑک اور چمک بھی ایسی ہولناک ہو کہ وُہ لوگ موت کے خوف سے کانوں میں اُنگلیاں دیتے ہیں کہ آواز کی شدت سے دم نہ نکل جائے۔ اسی طرح پر منافقین تکالیف و تہدیداتِ شرعیہ کو سُن کر اور اپنی خواری و رُسوائی کو دیکھ کر اور اغراض و مصالحِ دنیوی کو خیال کر کے عجیب کشمکش اور خوف پریشانی میں مُبتلا ہیں اور اپنی بیہودہ تدبیروں سے اپنا بچاؤ کرنا چاہتے ہیں مگر حق تعالیٰ کی قدرت سب طرف سے کُفار کا احاطہ کیئے ہوئے ہے۔ حاصل یہ ہے کہ منافقین اپنی ضلالت اور ظلماتی خیال میں مُبتلا ہیں لیکن جب غلبہ نورِ اسلام اور ظہورِ معجزات کو یہ دیکھتے ہیں اور تاکید و تہدید شرعی سُنتے ہیں تو متنبہ ہو کر ظاہر میں صراطِ مُستقیم کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ اور جب کوئی اذیت و مشقت دنیوی نظر آتی ہے تو کفر پر اڑ جاتے ہیں۔ جیسے شدتِ باراں اور تاریکی میں بجلی چمکی تو قدم رکھ لیا پھر کھڑے ہو گئے۔ مگر چونکہ اس کو سب کا علم ہے اور اس کی قدرت سے کوئی چیز باہر نہیں ہے تو ایسے حیلوں اور تدبیروں سے کیا کام نکل سکتا ہے[1]۔

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ

جس طرح یہ لوگ بارش کے طوفان اور بادل کے اندھیرے میں کبھی چلنے سے رُک جاتے ہیں کبھی موقع پاکر چلنے لگتے ہیں۔ اسی طرح یہ شک تردد میں پھنسے ہوئے ہیں۔ منافقین بھی کبھی غلبہ اسلام کے آثار وعلامات اور ان میں حقانیت اسلام کی جھلک دیکھ کر اس طرف کو بڑھنے لگتے ہیں۔ اور کبھی نفسانی اغراض کی اندھیری میں پڑکر پھر قبولِ حق سے رُک جاتے ہیں[1]۔

ان آیاتِ شریفہ میں دینِ اسلام کو بارانِ رحمت کے ساتھ تشبیہ دی ہے اور ان کے شبہات اور نفسانی اغراض کو ظلمات کے ساتھ۔ اور عذابِ الٰہی سے ڈرانے والی آیات کو رعد کے ساتھ اور غلبۂ اسلام اور فتوحات کو برق کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔ جب عذاب سے ڈرانے والی آیات نازل ہوتی ہیں تو یہ منافق ان کو سُننا نہیں چاہتے۔ کانوں میں اُنگلیاں دیتے ہیں اور جب کبھی غلبہ اسلام کی برق کوندنے لگتی ہے اور اسلام کا نُور چمکنے لگتا ہے تو اسلام کی طرف جُھک جاتے ہیں اور جب اغراض نفسانی کی ظُلمت اور تاریکی کا غلبہ ہوتا ہے تو رُک جاتے ہیں[2]۔

بارانِ رحمت سے اشارہ ہے طلوعِ اسلام کی طرف۔ تاریکیوں، گرج اور بجلی سے اشارہ ہے ان شدائد کی طرف جو آغازِ اسلام میں اُمت کو برداشت کرنے پڑتے تھے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وُہ شرعی پابندیاں مُراد ہوں جو اظہارِ اسلام کے بعد منافقین پر بھی عائد ہوجاتی تھیں۔ مثلاً ادائے نماز، فریضۂ جہاد، ترکِ امارت قدیم، اطاعتِ رسول وغیرہ۔ کانوں میں اُنگلیاں ٹھونسنے کا مطلب یہ ہے کہ منافقین اپنی بزدلی، پست ہمتی، دُوں فطرتی کی بنا پر اسلام لانے میں ہر وقت خطرے ہی دیکھ رہے ہوں۔ ایک معنے یہ بھی بتائے گئے ہیں کہ منافقین قرآن مجید کے بیانات اور احکام ومواعید کی تصریحات سننے ہی سے بچنا چاہتے تھے اور کانوں میں اُنگلیاں دے لیتے تھے۔ اس ڈر سے کہ کہیں یہ کلام اثر نہ کر جائے اور انہیں اسلام لاتے ہی نہ بن پڑے۔ بجلی کے بینائی کو اُچک لینے میں یہ بتایا جارہا ہے کہ غلبۂ اسلام کی قوت وشدت کے آثار منافقین کی آنکھوں کو خیرہ کرنے کے لیئے کافی ہیں[3]۔

اس مثال میں بارش سے مُراد اسلام ہے جو انسانیت کے لیئے رحمت بن کر آیا ہے۔ اندھیری گھٹا، کڑک اور چمک سے مُراد مشکلات ومصائب کا وُہ ہجوم اور وُہ سخت مُجاہدہ ہے جو تحریکِ اسلامی کے مقابلے میں اہلِ جاہلیت کی شدید مزاحمت کے سبب پیش آرہا تھا۔ مثال کے آخری حصے میں ان منافقین کی اس کیفیت کا ذکر کیا گیا ہے کہ جب معاملہ ذرا سہل ہوتا ہے تو یہ چل پڑتے ہیں اور

---

[1] معارف القرآن م ش ج۱ ص۲۷ [2] معارف القرآن م ا ج۱ ص۹۶ [3] تفسیر ماجدی ص۱۱ ۔

جب مشکلات کے بادل چھا جاتے ہیں یا ایسے احکام دیئے جاتے ہیں جن سے ان کی خواہشاتِ نفس اور ان کے تعصباتِ جاہلیت پر ضرب پڑتی ہے تو ٹھٹک کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔[1]

بارش میں زمین اور زمین کی تمام مخلوقات کے لیئے زندگی ہے لیکن جب برستی ہے تو بادل گرجتے ہیں، بجلی چمکتی ہے، گھٹاؤں سے تاریکی چھا جاتی ہے۔ مستعد طبیعتیں یہ حالت دیکھ کر گھبراتی نہیں ہیں اور سمجھ جاتی ہیں کہ یہ بارانِ رحمت کی برکتوں کا پیش خیمہ ہے وُہ کوشش کرتی ہیں کہ وقت کی برکت سے جس قدر فائدہ اُٹھایا جا سکتا ہے اُٹھالیں لیکن جو لوگ دِل کے کچے اور استعداد سے محروم ہوتے ہیں وُہ بارش کی برکتوں کو تو بھول جاتے ہیں۔ اس کے ظہور کے ہنگاموں سے ڈرنے لگتے ہیں۔

فرمایا یہی حال ان محروموں کا ہے یہ مدعیانِ ایمان و شریعت دعوتِ حق کے منتظر تھے لیکن جب ظاہر ہوئی اور قدرتی طور پر اس کے ساتھ ابتدارِ ظہور کے مصائب و محن بھی نمودار ہوئے تو ان کی نظر اس کی برکتوں کی طرف نہیں گئی۔ مصائب و محن کی آزمائشوں سے سہم کر رہ گئے ٹھیک اسی طرح جیسے ایک بدبخت بارش کے موسم میں کاشت کاری کرنے کی جگہ بادل کی گرج سے ڈرا سہما کسی کونے میں دُبکا پڑا ہو۔

فرض کرو ایک شخص اسی عالم میں جا رہا ہے جب بجلی کی چمک سے راستہ نظر آتا ہے تو وُہ ایک دو قدم چل لیتا ہے۔ جب غائب ہو جاتی ہے تو ٹھٹک کر رہ جاتا ہے۔ اس کے پاس نہ تو اس کی کوئی روشنی ہے جو راہ دکھائی دے نہ عزم و ہمت ہے جو بڑھائے لے چلے۔

فرمایا یہی حال ان لوگوں کا ہے جو دینِ حق کی روشنی کھو چکے ہیں اور جن کے دلوں میں خدا پرستی کی رُوح باقی نہیں رہی۔ یہ بات نہیں ہے کہ دوسرے گروہ کی طرح چلتے نہ ہوں۔ چلتے ہیں مگر اس طرح کہ جب کبھی بجلی کوندگئی دو چار قدم اُٹھا دیئے پھر وہی تاریکی اور وہی سراسیمگی۔[2]

دراصل یہ مثال ایک تشبیہ مرکب ہے یعنی حالات کے مِلے جُلے مجموعہ کو ایک دوسرے حالات کے مجموعہ سے تشبیہ دی ہے۔ اس مثال میں بارش، تاریکی، گرج، بجلی اور کڑک کے الفاظ، کانوں میں اُنگلیاں ٹھونسنے، آنکھوں کے خیرہ ہونے، روشنی ہونے پر چل دینے، تاریکی چھا جانے پر ٹھہر جانے کی تعبیرات سب ایسی تعبیرات ہیں جن کے ساتھ حالات کو تشبیہ دی گئی ہے۔ جب تک ان کے مشبہات معین نہ ہوں اس مثال کا حُسن نکھر کر سامنے نہیں آسکتا ہے۔ بارش سے مُراد وحی و

---

[1] تفہیم القرآن صفحہ ۵۶ [2] ترجمان القرآن صفحہ ۳۰۶

نبوت اور ایمان کی دعوت ہے۔ تاریکی، گرج اور کڑک سے وہ مشکلات مراد ہیں جو ایمان و نبوت کی راہ میں مخالفین کی مزاحمت سے پیش آرہی تھیں۔ یہ سمجھایا گیا ہے کہ جس طرح مردہ زمینوں کو بارانِ رحمت نئی زندگی بخشتی ہے اسی طرح نبوت مردہ دلوں کو نئی زندگی مرحمت کرتی ہے جس طرح بارش کا گرمیوں کی بے قراریوں میں انتظار ہوتا ہے اسی طرح نبوت کا کفر و ظلم کی اٹاٹوپ تاریکیوں میں انتظار ہو رہا تھا یہودی صدیوں سے ایک جانے ہوئے نبی کا انتظار کر رہے تھے۔ آخری نبی اور آپ کی نبوت کی علامتوں سے اپنے ہی دینی نوشتوں کے ذریعے خوب واقف تھے۔ حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری بالکل اچانک نہیں ہوئی بلکہ آپ کی آمد کی پہلے سے انتظار ہو رہی تھی۔ اس مثال میں آپ کی تشریف آوری کو بارانِ رحمت سے تشبیہ دی ہے۔ ظاہر ہے کہ جب بارش آتی ہے تو اپنے ساتھ بادلوں کی گرج، بجلی کی چمک، خوفناک کڑک اور ہولناک تاریکیاں لے کر آتی ہے۔ نبوت کی بارانِ رحمت اس لیئے آتی ہے کہ مردہ دلوں میں روحِ حیات پیدا ہو۔ لیکن اس کے ساتھ مشکلات کے جھکڑ، تکالیف کی تاریکیاں اور مصائب کی ہولناک گرج بھی آتی ہے۔ مشکلات و مصائب دیکھ کر گھبرا جانا اور ان سے سہم کر نبوت کی آئی ہوئی بارانِ رحمت سے روگرداں ہونا بہت بڑی بدبختی ہے۔ نبوت کی کامیابی دیکھ کر نبوت کی طرف مائل ہو جانا اور حالات کی تبدیلی سے گھبرا کر پیچھے ہٹ جانا ابن الوقتی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ کبھی منافع کی توقع میں اور کبھی مصالح کے چکر میں قدم اٹھانا اور راہ کی مشکلات سے گھبرا کر ٹھہر جانا محرومی کی نشانی ہے۔ جب نبوت کو مادی کامیابی ہوتی ہے اور راحت و آرام کے آثار نظر آتے ہیں اور مادی، معاشی، سیاسی اور اجتماعی فوائد نبوت سے وابستہ ہو جاتے ہیں تو نبوت کی طرف مائل ہو کر نبوت کو زندہ باد کہنے لگتے ہیں لیکن جب حالات میں ذرا تبدیلی آتی ہے اور راحت و آرام کی جگہ مشکلات سے دوچار ہونا پڑتا ہے تو نبوت کی طرف اٹھے ہوئے قدم یکایک رک جاتے ہیں اور خالص کافرانہ زندگی شروع ہو جاتی ہے۔ اس مثال میں بجلی کی خیرہ کن چمک سے اسلام کی صداقت و حقانیت کے تابناک دلائل کی جانب اشارہ کیا گیا ہے۔ اور برقی روشنی میں ان کی رہروی اور اس کے غائب ہو جانے کے بعد ان کے توقف سے اس حقیقت کی جانب توجہ دلائی گئی ہے کہ یہ محض مادہ پرست، ابن الوقت اور مصلحت کوش ہیں۔ جب اسلام کی مادی فتح مندیاں اور کامیابیاں دیکھتے تو ان کے حلقوم اضطراراً اسلام کی حمایت میں نعرے لگا لگا کر خشک ہو جاتے ہیں۔ حق کی طلب سے ان کے دل خالی ہیں مصلحت منفعت یا پھر مرعوبیت کچھ دیر کے لیئے ان کو نبوت کا ہمنوا بنا دیتی ہے اب بھی اگر مشیت الٰہی

یہی ہوتی تو ان کو بینائی اور شنوائی سے محروم کر دیا جاتا مگر اللہ کی یہ سنت نہیں ہے جو کسی حد تک دیکھنا اور سُننا چاہتا ہے اسے دیکھنے اور سننے نہ دے ۔

ان آیات میں آج کل کے ان روشن خیال مذبذبین اور متشککین کے لیئے بڑی عبرت ہے جو حق کے حق ہونے کے لیئے مادی غلبہ، ظاہری شوکت، معاشی خوش حالی اور سیاسی برتری کو بمنزلہ شرط سمجھتے ہیں۔ دنیوی کامیابیاں، معاشی خوشحالی اور سیاسی برتری کی حیثیت مقصود کی نہیں بلکہ ذریعہ کی ہے ورنہ یہ چیزیں حق کے حق ہونے کا معیار نہیں ہیں۔ نبوت، اسلام، قرآن اپنی جگہ حق ہیں چاہے ان کے ساتھ مصائب و محن ہوں، تکالیف و شدائد ہوں ۔

غالباً وُہ مثال جو ارشادِ نبوت میں نبوت ہی کے علم و عمل کی نگرانی اور حفاظت کے لیئے حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ سے صحیحین میں آئی ہے اسی آیی مثال سے مستنبط ہے۔ جس میں بتایا گیا ہے کہ باطل قوتوں کے طوفان میں نبوت کے لائے ہوئے علم و عمل کے بقا کا کیا قانون ہے۔ مثال میں بارش، زمین، زمین کی قسمیں مشبہ بہا ہیں۔ نبوت کا لایا ہوا علم و عمل، اس کی روایت، اس کا حفظ اور اس کی درایت و فقہ کو ان سے تشبیہ دے کر سمجھایا ہے۔ ارشاد ہے :۔

> جو علم و عمل اللہ نے مجھے دے کر روانہ فرمایا ہے اس کی مثال بارش کی سی ہے جو زمین پر برستی ہے زمین کے ایک حصہ نے جو بہت اچھا تھا خوب پانی چوسا، گھاس اور سبزہ اُگایا۔ اور ایک حصہ جو بنجر تھا اس نے پانی کو سمیٹ لیا۔ اس کے ذریعے اللہ سبحانہ نے دوسروں کو فائدہ پہنچایا۔ خود پانی پیا اور دوسروں کو پلایا۔ لیکن زمین کا ایک حصہ جو چٹیل تھا۔ اس نے نہ پانی روکا اور نہ گھاس اُگایا۔ یہی مثال اس شخص کی ہے جس نے اللہ کے دین میں تفقہ پیدا کیا اور اللہ تعالیٰ نے اسے فائدہ دیا۔ اس نے خود سیکھا دوسروں کو سکھایا اور یہ اس شخص کی مثال ہے جس نے ادھر سر اُٹھا کر نہیں دیکھا اور اس ہدایت کو نہیں اپنایا جسے مجھے دے کر روانہ کیا گیا ہے۔[1]

اس مثال کے ذریعے حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اُمت کو سمجھایا ہے کہ جب بارش ہوتی ہے اور زمین کے لیئے شادابی اور گل ریزی کا سامان ہونے لگتا ہے تم دیکھتے ہو کہ زمین بارش کے پانی کے فائدہ کے لحاظ سے تین حصوں پر منقسم ہو جاتی ہے۔ ایک پانی کو چوس کر پیداوار کرنے

---

[1] صحیح بخاری ج ۱ صـ۲۶

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ
قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّ
السَّمَاۗءَ بِنَاۗءً ۠ وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَاۗءِ مَاۗءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ
رِزْقًا لَّكُمْ ۚ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝

اے انسانو[38]! تم اپنے رب کی بندگی کرو[39] جس نے تم کو اور ان سب کو جو تم سے پہلے گذر چکے ہیں پیدا[40] کیا ہے تاکہ تم متقی[41] بن جاؤ (وہ ربّ جس نے صرف پیدا ہی نہیں کیا بلکہ) جس نے (تمہیں عدم سے وجود میں لانے کے لیئے) زمین[42] کو بچھونا اور آسمان کو چھت بنایا۔ اور اسی نے آسمان سے پانی برسایا[43]۔ پھر پانی کے ذریعے طرح طرح کے پھل تمہاری غذا کی خاطر بنائے (جب تم کو عدم سے وجود میں وہی لایا ہے اور تمہاری بقا کا سارا سامان اسی کی پروردگاری کر رہی ہے) تو تم یہ[44] جانتے ہوئے کہ (تخلیق اور ربوبیت میں) اس کا کوئی ہمسر نہیں ہے اللہ کی عبادت میں اللہ کا کسی کو ہمسر و ہم پلہ اور مقابل[45] نہ بناؤ۔

والی۔ دوسری پانی کا ذخیرہ رکھنے والی۔ تیسری ناقابلِ کاشت اور ناقابلِ ذخیرہ۔ ایسے ہی نبوت کے علم و عمل کی بارش کے لیئے انسانی قلوب کی زمین بھی تین حصوں میں منقسم ہے۔

۱. وہ جو قرآن و سنّت کا ذخیرہ رکھتے ہیں۔
۲. وہ جو قرآن و سنّت سے مسائل کا اخراج کرتے ہیں۔
۳. وہ جو نہ ذخیرہ رکھتے ہیں اور نہ ہی استنباط و استخراج کرنے والوں میں سے ہیں۔

پہلی قسم کا مصداق حفاظِ قرآن، مجددین، اصحابِ حدیث اور محدثین ہیں۔
دُوسری قسم کا مصداق مجتہدین اور فقہاء ہیں۔
تیسری قسم کا مصداق اُمت کا وُہ طبقہ ہے جو مسلمان ہونے کے باوجود علم نبوت سے بہرہ ور نہیں ہے۔ یہ مثال اُمت اجابت کے لیے ہے ——— جبکہ قرآن میں مثال اُمتِ دعوت کے لیے ہے۔

دعوتِ عبادت

اس سے پہلے آیات میں قرآن نے نبوت کے مخاطبوں کو تین قسموں میں تقسیم کر کے یہ دعویٰ کیا تھا کہ نبوت کی تعلیمات سے زندگی میں صرف وُہ فیض یاب ہو سکتے ہیں جو متقی ہوں، سمجھ کر قدم اُٹھاتے ہوں، اچھے بُرے، نفع ونقصان، نشیب و فراز کا خیال رکھتے ہوں۔ ان کے لئے فلاح و ہدایت کی ضمانت دی اور تقوٰی کے عملی نمونے پیش کئے۔

ان آیات میں بلاتمیز پُوری انسانیت کو مخاطب کر کے متقی بننے کا عملی پروگرام اور بے خطا نُسخہ بتایا ہے کہ اللہ کی عبادت کرو۔ امام محی السنہ بغویؒ معالم التنزیل میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے ناقل ہیں کہ قرآن میں جہاں بھی عبادت کا ذکر ہے اس سے توحید مُراد ہے۔ مطلب یہ ہے کہ توحیدِ عبادت مُراد ہے۔ اس آیت میں جیسا کہ آگے بزرگوں کی تشریح میں پڑھیں گے توحیدِ عبادت کی دعوت دی ہے اور اس پر توحیدِ خالقیت اور توحیدِ ربوبیت کو بطورِ دلیل پیش کیا ہے۔ یعنی فرمایا یہ ہے کہ اللہ کی عبادت کرو کیونکہ وُہ تمہارا اور سب کا خالق اور رب ہے اس لئے تمہاری عبادت کا مستحق بھی وہی ہے۔

ذرا ٹھہر جائیے ان اصطلاحات کا مطلب سمجھ کر قرآنی آیات کی تشریحات پڑھیئے۔
جیسا کہ سورۂ فاتحہ کی تشریح میں تین اشارات میں بتایا گیا ہے کہ توحید کے چار درجے ہیں:۔
۱۔ توحیدِ وجود یعنی واجب الوجود ایک ہی ذات ہے اللہ کی ذات کے سوا جو کچھ جتنا اور جیسا کچھ کائنات میں ہے مخلوق ہے اور ممکن ہے۔ خود بخود واجب صرف اللہ کی ذاتِ گرامی ہے۔ اسی کا وجود اصل اور اپنا ہے باقی کا وجود عارضی اور عطیہ خداوندی ہے۔
۲۔ توحیدِ خالقیت یعنی عرش وفرش اور تمام کائنات ہستی کا اللہ ہی خالق ہے اللہ کے سوا کوئی دوسری ہستی خالق نہیں ہے۔

۳- توحیدِ ربوبیت یعنی ساری کائنات کو پیدا کرنے کے بعد باقی رکھنے والا اور اس کے نظام کو چلانے والا صرف اللہ ہی ہے۔

۴- توحیدِ عبادت یعنی ہمارے نیازمندانہ اعمال اور عابدانہ عجز و نیاز کا مستحق صرف اللہ سبحانہ ہے۔ دعاؤں، طلب گاریوں، نذروں اور نیازوں میں اس کا کوئی ساتھی اور ساجھی نہیں ہے۔ عظمتوں اور کبریائیوں، کارسازیوں اور بے نیازیوں کا ہر اعتقاد اس کے لیے ہے۔

توحید کے پہلے دو درجوں میں نبوت کا کسی سے کوئی اختلاف نہیں ہے بلکہ خود قرآن گواہ ہے کہ یہ دونوں درجے مشرکین، یہودی اور عیسائیوں کے مانے ہوئے مقدمات ہیں۔

حکیم الامت حضرت شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں:-

توحید کے ان دونوں درجوں کو نہ تو آسمانی کتابیں موضوعِ بحث بناتی ہیں اور نہ ان میں مشرکین، یہودی اور عیسائی مخالف ہیں بلکہ قرآن کا دعویٰ ہے کہ یہ ان کے تسلیم شدہ مقدمات ہیں[1]۔

توحید کے دو درجے یعنی توحیدِ ربوبیت اور توحیدِ عبادت دونوں لازم و ملزوم ہیں ——— ھما متشابکتان متلازمتان ——— دونوں میں فرق یہ ہے کہ توحیدِ ربوبیت ایک فکری اور اعتقادی پیمانہ ہے جب کہ توحیدِ عبادت فکر و عمل دونوں کا پیمانہ ہے۔

توحیدِ عبادت میں نبوت کا عیسائیوں، یہودیوں اور مشرکوں سے اختلاف ہے۔ تمام انبیاء اسی کی دعوت لے کر آئے ہیں۔

انبیاء کے مخاطبین عبادت میں اشخاص پرستی، آثار پرستی اور مظاہر پرستی کر رہے تھے۔ حکیم الامت شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں:-

مشرکین عرب زیادہ تر اشخاص پرست تھے۔ اس بارے میں ان کا ذہنی رجحان یہ تھا کہ ربوبیت کے سلسلہ میں نظامِ کائنات کے اہم اور بزرگ ترین کام اللہ تعالیٰ انجام دے رہے ہیں لیکن کچھ کام اللہ تعالیٰ نے ان شخصیتوں کے سپرد کر دیئے ہیں جو دنیا میں اللہ کی عبادت کر کے اللہ کے مقرب ہو گئے تھے اللہ نے ان سے خوش ہو کر ان کو الوہیت کی خلعت عطا فرما دی ہے۔

اس ذہنی رجحان کی بنیادوں پر ان کا کہنا بقول شاہ صاحب یہ تھا۔

یہ بزرگ ہستیاں ہمارے عابدانہ اور نیازمندانہ اعمال کی مستحق ہیں۔ اللہ کی کوئی عبادت ان کی

---

[1] حجۃ اللہ البالغۃ ص۵۹

ط

عبادت کی آمیزش کے بغیر قبول نہیں ہوتی۔ اللہ کا تقرب ان شخصیتوں کی عبادت کے ذریعے ہوتا ہے یہ سُنتے دیکھتے، اپنے عابدوں کی مدد کرتے اور شفاعت کرتے ہیں[1]۔

ان ہستیوں کی حجری تصاویر بنا رکھی تھیں اور ان کے ساتھ عابدانہ تعلقات تھے۔

چونکہ عبادت کے اس پیمانہ میں دو چیزیں بالکل الگ الگ ہیں۔ ایک حجری اشخاص یعنی ان کے مجسمے ان کی تصویریں۔ دُوسرے ان اشخاص کی شخصیتیں۔ اس بنا پر قرآن نے دونوں کی رعایت سے تعبیر کا پیمانہ بنایا ہے۔ جب وُہ اشخاص یعنی مجسموں اور تصاویر و تماثیل کا ذکر کرتا ہے۔ تو اس کے لیے ایسے الفاظ لاتا ہے جو عربی زبان میں غیر ذوی العقول کے لیئے بولے جاتے ہیں جیسے مؤنث کے صیغے اور لفظ ما بمعنی وُہ چیز۔ جیسے لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ (میں نہیں عبادت کرتا ان چیزوں کی جن کی تم عبادت کرتے ہو) اور جب ان مجسموں کی شخصیتوں کا ذکر کرتا ہے تو ایسے الفاظ استعمال کرتا ہے جو مذکر کے ہوں اور ذوی العقول کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ جیسے لَآ اَعْبُدُ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ (میں نہیں عبادت کرتا ہوں ان ہستیوں کی جن کو تم اللہ سے ورے ورے پکارتے ہو) ان تمہیدی فقرات کے بعد اب آیت کی تفسیر پڑھیئے۔

۳۸ اے انسانو! قرآن کا مخاطب سارا عالمِ انسانیت ہے کوئی مخصوص نسل جیسے بنی اسرائیل اور کوئی مخصوص قوم جیسے عرب نہیں۔ یہ طرزِ خطاب خود ایک دلیل ہے تخاطب کے عام ہونے پر[2]۔

اب سب بندوں کو مومن ہوں یا کافر یا منافق خطاب فرما کر توحید جنابِ باری سمجھائی جاتی ہے خلاصہ معنے یہ ہے کہ اللہ نے تم کو اور تم سے پہلوں کو سب کو پیدا کیا اور تمہاری ضروریات اور کل منافع کو بنایا پھر اس کو چھوڑ کر دوسرے کو معبود بنانا جو تم کو نہ نفع پہنچا سکے نہ مضرت۔ کس قدر حماقت اور جہالت ہے حالانکہ تم یہ بھی جانتے ہو کہ اس جیسا کوئی نہیں ہے[3]۔

اگرچہ قرآن کی دعوت تمام انسانوں کے لیئے عام ہے مگر اس سے فائدہ اُٹھانا یا نہ اُٹھانا لوگوں کی اپنی آمادگی پر اور اس آمادگی کے مطابق اللہ کی توفیق پر منحصر ہے۔ لہٰذا پہلے انسانوں کے درمیان فرق کر کے واضح کر دیا کہ کس قسم کے لوگ اس کتاب کی رہنمائی سے فائدہ اُٹھا سکتے ہیں اور کس قسم کے نہیں اُٹھا سکتے۔ اس کے بعد تمام نوعِ انسانی کے سامنے وُہ اصلی بات پیش کی جاتی ہے جس کی طرف بلانے کے لیئے قرآن آیا ہے[4]۔

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ ص۵۹ [2] تفسیر ماجدی ص۱۱ [3] حاشیہ شیخ الہند ص۶ [4] تفہیم القرآن ص۵۷

اس آیت میں تینوں گروہوں کو خطاب کر کے وُہ دعوت پیش کی گئی ہے جس کے لیے قرآن نازل ہوا۔ اس میں مخلوق پرستی سے باز آنے اور ایک خدا کی عبادت کرنے کی دعوت ایسے انداز سے دی گئی ہے کہ اس میں دعوے کے ساتھ اس کے واضح دلائل بھی موجود ہیں جن میں ادنیٰ سمجھ بُوجھ والا انسان بھی ذرا سا غور کرے تو توحید کے اقرار پر مجبور ہو جائے۔[1]

۳۹۔۔۔ عبادت مصدر سے بنا ہے۔ بندگی اور پرستش کو کہتے ہیں۔ ۔۔۔ امام راغبؒ لکھتے ہیں ۔۔۔ عبودیت اظہارِ فروتنی کا نام ہے اور عبادت اس سے بھی بلیغ ہے اس کے معنے انتہائی فروتنی کے ہیں۔ قاموس میں عبادت کے معنے طاعت کے بیان کیے گئے ہیں لیکن ابن الاثیرؒ کے نہایہ میں یہ الفاظ ہیں کہ لغت میں عبادت نام ہے اس طاعت کا جو عاجزی کے ساتھ ہو۔ علامہ ابن الاثیرؒ کی یہ تعریف بہت جامع ہے۔ امام راغب اصفہانیؒ اور مجدالدین فیروز آبادیؒ نے اس کے صرف ایک جُز کو بیان کیا ہے۔ قاضی شوکانیؒ نے فتح القدیر میں حافظ ابن کثیرؒ کے حوالہ سے شرعی تعریف یہ کی ہے۔ شریعت میں عبادت وُہ ہے جو انتہائی محبت، عاجزی اور خوف پر مشتمل ہو۔[2]

اُردو میں طاعت کے لیے بندگی اور عاجزی کے لیے پرستش اور پُوجا کے الفاظ بولے جاتے ہیں۔ قرآن میں یہ دونوں معنے مقام کے تقاضے سے الگ الگ ہوتے ہیں۔ اور اس کا لحاظ شاہ عبدالقادرؒ نے اپنے ترجمہ قرآن میں رکھا ہے۔ وُہ کہیں ترجمہ کرتے ہیں کہ پُوجا کرو۔ اور کہیں فرماتے ہیں کہ بندگی کرو۔ ترجموں میں یہ فرق غالباً شاہ ولی اللہؒ کے بتائے ہوئے اشخاص اور شخصیتوں کے ضابطے پر مبنی ہے۔

۴۰۔۔۔ تخلیقی کام خالص خدائی کارنامہ ہے ہمسر و مساوی تو درکنار تخلیق کے کام میں اللہ کا کوئی معاون اور ماتحت بھی نہیں ہے ۔۔۔ یہ توحید خالقیت سے توحید عبادت پر استدلال ہے مطلب یہ ہے کہ چونکہ اللہ کے سوا خالق کوئی نہیں اس لیے تمہاری عاجزانہ نیازمندیوں اور تمہاری طاعت و فرمانبرداریوں کا مستحق بھی اللہ کے سوا کوئی نہیں ہے۔ اور اس سے پہلے لفظ رب کہہ کر توحید ربوبیت کی طرف اشارہ کیا ہے گویا کہا جا رہا ہے کہ تمہیں یگانہ اللہ کی بندگی اور پرستش اس لیے کرنی چاہیے کہ تمہیں نیست سے ہست اسی نے کیا ہے اور ہست بنانے کے

---

[1] معارف القرآن ص۸۲ [2] لغات القرآن [3] تفسیر ماجدی ص۱۱

بعد تمہاری بقا کا سامان بھی اسی نے کیا ہے۔ اور صرف تمہیں ہی نیست سے ہست نہیں کیا تم سے پہلے اَلَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِکُمۡ کو بھی نیست سے ہست کرنے والا وہی ہے۔ یہ لفظ لا کر قرآن نے اس طرف بھی اشارہ کر دیا کہ توحید کا سبق ماضی، حال، تاریخ اور مشاہدہ دونوں سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

۴۱۔ تاکہ تم متقی بن جاؤ۔ لَعَلَّ کا یہ ترجمہ شاہ عبدالقادرؒ نے کیا ہے اور حضرت شیخ الہندؒ نے بھی یہی ترجمہ فرمایا ہے۔ لیکن دوسرے بزرگوں نے اس ترجمہ سے پرہیز کیا ہے اور تاکہ سے ہٹ کر عجب نہیں، توقع ہے، اُمید ہے، کیا ہے۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ 'تاکہ' سے ان بزرگوں نے اللہ کے حکمِ عبادت میں غرض کی آمیزش محسوس کر لی ہے۔ یہ درست ہے کہ اللہ کا کوئی حکم غرض پر مبنی نہیں ہوتا اور اس کا ہر حکمِ عبادت میں غرض کی آمیزش سے بالا ہوتا ہے۔ ـــــــــ

ـــــــــ اور اس کا ہر حکم ہر قسم کی غرض کی آلودگی سے پاک ہے لیکن جن بزرگوں نے 'تاکہ' اختیار کیا ہے ان کی دقیق نظر اس پر ہے کہ اللہ کا کوئی حکم غرض کی آلودگی کا داغ تو یقیناً نہیں رکھتا۔ لیکن اس کا کوئی حکم مصلحت سے خالی نہیں ہوتا۔ اس کے سارے احکام مبنی بر مصالح ہوتے ہیں حجۃ اللہ البالغہ میں شاہ ولی اللہؒ نے اس پر سیر حاصل بحث فرمائی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ عبادت کا حکم اس مصلحت کی خاطر دیا جا رہا ہے کہ اس کے ذریعے تم متقی بن جاؤ گے۔ ابن جریرؒ نے انہیں معنی کو یہ بتا کر اپنایا ہے تکونوا من المتقین۔ گویا متقی بننے کا طریقہ یہی ہے کہ ـــــــــ

تم ہر وقت یہ بات پیشِ نظر رکھو کہ اللہ تمہارا پروردگار ہے ایک لمحہ کے لیے بھی تم اس کی پروردگاری سے بے نیاز نہیں ہو، اسی نے تم کو اور تم سے پہلوں کو محض اپنی قدرت سے عدم سے نکال کر وجود کا لبادہ پہنایا ہے اپنی زندگی میں اس سے نیاز مندی اور فرمانبرداری کے تعلقات استوار کرو۔ اگر ایسا کرو گے تو متقی بن جاؤ گے۔

۴۲ ـــ آیت کے اس ٹکڑے کی جان جَعَلَ لَکُمُ ہے۔ زمین یا آسمان کی ہیئت بیان کرنا یا ان کی ارضیاتی یا فلکیاتی ماہیت کو بیان کرنا مقصود نہیں ہے۔ بتانا صرف یہ ہے کہ زمین ہو یا آسمان کچھ بھی از خود نہیں بنا ہے بلکہ جو کچھ، جیسا کچھ اور جتنا کچھ بھی ہے اللہ کا بنایا ہوا ہے۔ اور اسی قادرِ مطلق کے زیرِ فرمان ہے اور لَکُمُ کہہ کر یہ بتایا ہے کہ زمین و آسمان انسان کے لیے بنے ہیں۔ انسان زمین و آسمان کے لیے نہیں بنا ہے مقصود اس کائنات کا انسان ہے باقی کائنات اس کی خادم ہے پھر یہ کیسی شدید حماقت ہے کہ انسان عابدانہ تعلقات اللہ سے توڑ کر مخلوق سے قائم کرے۔

۴۳ــــ اس نے آسمان سے پانی برسایا یعنی کسی اور نے نہیں۔ مقصود اس حقیقت کی تعلیم ہے کہ آسمان و بارش سب اللہ کی مخلوق ہیں۔ نہ کوئی اکاش دیوتا ہے نہ اندر دیوتا۔ نہ ہوا کوئی چلاتا ہے نہ بارش کوئی برساتا ہے بلکہ یہ کلدانیوں، مصریوں، ایرانیوں، ہندیوں، یونانیوں اور رومیوں کی گھڑی ہوئی خرافات ہیں۔ عربی میں السماء اس بلند چیز کو کہتے ہیں جو انسان کے سر کے اوپر ہو۔ یہ بادل سے پانی کے اُترنے، بخارات کے منجمد ہوتے اور پھر گرمی پاکر برس پڑنے کے یا اور اسی طرح کے اور درمیانی واسطوں کے ہرگز منافی نہیں ہے۔[1]

۴۴ــــ تم یہ جانتے ہوئے یعنی جب تم خود بھی اس بات کے قائل ہو اور تمہیں معلوم ہے کہ یہ سارے کام اللہ ہی کے ہیں تو پھر تمہاری عبادت اسی کے لیے خاص ہونی چاہیئے۔ دوسرا کون اس کا حقدار ہوسکتا ہے کہ تم اس کی بندگی بجا لاؤ۔[2]

تُم خوب جانتے ہو کہ تمہارا اور سب چیزوں کا پیدا کرنے والا صرف ایک وہی وحدہٗ لاشریک لہٗ ہے اور ان انعامات و انتظامات میں کوئی اس کا شریک و سہیم نہیں ہے بس ان انعامات کے شکر میں خاص اسی کی عبادت کرو کسی دوسرے کو شریک نہ کرو۔[3]

یعنی اس بات کو جانتے ہو کہ ان تصرفات کا اللہ کے سوا کوئی کرنے والا نہیں ہے تو اس صُورت میں تمہیں یہ کب زیب دیتا ہے کہ اللہ کے مقابلے میں دوسروں کی عبادت کرو۔[4]

۴۵ــــ ہم پلہ، نِدِ مقابل۔ دوسروں کو اللہ کا نِدِ مقابل بنانے سے مراد یہ ہے کہ عبادت کے مختلف اَقسام میں سے کسی قسم کا رویہ خدا کے سوا دوسروں کے ساتھ برتا جائے۔ آگے چل کر خود قرآن ہی میں تفصیل سے معلوم ہوجائے گا کہ عبادت کی وُہ اقسام کون کون سی ہیں جنہیں صرف اللہ کے لیے مخصوص ہونا چاہیئے اور جن میں دوسروں کو شریک کرنا وُہ شرک ہے جسے قرآن روکنے آیا ہے۔[5]

نِدّ عربی زبان میں مثل اور مشابہ کو اور مخالف اور مقابل کو کہتے ہیں۔ چنانچہ انداد کے معنے اضداد اور اشباہ دونوں کئے گئے ہیں۔ ہم نے ترجمہ میں دونوں کو سمو دیا ہے۔ لفظ کی جامعیت میں نکتہ یہ ہے کہ شرک دُنیا میں دو قسموں کا رائج رہا ہے۔ کچھ قوموں نے اپنے معبودوں کو محض خدائے اصغر یا ماتحت خُدا تسلیم کیا ہے جیسے مشرکینِ عرب اور مجوسیوں نے اہرمن کو یزداں کے حریف اور

---

[1] تفسیر ماجدی ص۱۱ [2] تفہیم القرآن ص۵۹ [3] معارف القرآن ج ۱ ص۸ [4] بیان القرآن ص۱۱ [5] تفہیم القرآن۔

وَاِنۡ كُنۡتُمۡ فِىۡ رَيۡبٍ مِّمَّا نَزَّلۡنَا عَلٰى عَبۡدِنَا فَاۡتُوۡا بِسُوۡرَةٍ مِّنۡ
مِّثۡلِهٖ ۖ وَادۡعُوۡا شُهَدَآءَكُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ
﴿۲۳﴾ فَاِنۡ لَّمۡ تَفۡعَلُوۡا وَلَنۡ تَفۡعَلُوۡا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِىۡ وَقُوۡدُهَا
النَّاسُ وَالۡحِجَارَةُ ۖۚ اُعِدَّتۡ لِلۡكٰفِرِيۡنَ ﴿۲۴﴾

اور اگر تمہیں[1] (اس کلام کے خدا کی طرف سے ہونے میں) کوئی تردد ہے جو ہم نے اپنے بندے[2] پر آہستہ آہستہ اُتارا ہے (تو آؤ اور اس کا فیصلہ کر لو اگر یہ خُدا کا کلام نہیں ہے اور کسی شخص کا خود ساختہ و پرداختہ ہے آؤ زیادہ نہیں) اس جیسی[3] ایک ہی سُورت بنا لاؤ اور اس کے لیے اللہ کو چھوڑ کر اپنے تمام حمائتیوں اور ہم نواؤں کو بُلا لو۔ اگر تم سچے[4] ہو (تو آؤ یہ کام کر کے دکھاؤ) لیکن اگر تم نے ایسا نہ کیا اور حقیقت یہ ہے کہ تُم ایسا قطعًا نہ کر سکو گے تو اس آگ[5] سے ڈرو جس میں ایندھن کا کام انسانوں اور پتھروں سے لیا گیا ہے اور نبوت کے منکروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔

اور ند مقابل کی حیثیت سے پیش کیا ہے[1]۔

رسالت اور اس کی دلیل

آغازِ قرآن میں قرآن کے بارے میں یہ دعوٰی کیا گیا ہے کہ لاریب فیہ اس کتاب کے کتاب

[1] تفسیر ماجدی ص۱۲

الہٰی ہونے میں کوئی شُبہ نہیں ہے۔ فی الواقع یہ کلام الہٰی ہے اور چونکہ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ اس لیے یقیناً اللہ کے نام سے لوگوں کے سامنے پیش کرنے والی ہستی اللہ کی فرستادہ ہے۔

تمام اولادِ آدم کی ساری علمی طاقتوں کو مخاطب کر کے کہا ہے کہ اگر کسی کے دل میں اس کلام کے کلامِ الہٰی ہونے میں شُبہ ہے تو اس کا حل یہ ہے کہ سارا قرآن نہ سہی صرف ایک سُورت ہی بنا کر لاؤ جس میں قرآن جیسی معانی کی بلندی، مطالب کی جامعیت اور مضامین کی نُدرت ہو۔

قرآن نے اوّلاً مکہ میں یہ چیلنج دیا تھا کہ

اگر تمام انسان اور جن اکٹھے ہو کر چاہیں کہ اس قرآن کے مانند کوئی کلام پیش کریں تو کبھی پیش نہیں کر سکیں گے (سُورہ اسراء)

اس کے بعد مکہ میں ہی فرمایا کہ اگر پُورے قرآن کا نہیں تو دس سُورتیں اس جیسی بنا کر لاؤ۔ (سُورہ ہُود)

اس کے بعد مکہ ہی میں فرمایا کہ

قرآن جیسی ایک سُورت ہی بنا کر پیش کر دو۔ (سُورہ یونس)

اس کے بعد سُورۂ طور مکہ ہی میں نازل ہوئی۔ آخری طور پر جو بات کہی گئی یہ تھی اور ہے۔

فَلْيَأْتُوا بِحَدِيثٍ مِّثْلِهِ إِن كَانُوا صَادِقِينَ ۔

اگر سچے ہیں تو اس جیسی ایک بات ہی لا کر پیش کریں۔

یہ سب مخاطبات مکہ میں مشرکین سے تھے۔ سُورۂ بقرہ مدینہ میں نازل ہوئی ہے اور مدینہ میں زیادہ تر خطاب یہودیوں سے ہے وُہ بھی قرآن کے کتابِ الہٰی ہونے سے اپنے علم کے غرّے میں مُنکر تھے۔ ان کی خاطر یہاں اس چیلنج کو دُہرایا ہے تاکہ ثابت ہو جائے کہ قرآنِ حکیم وُہ کتاب ہے۔ جس میں تہذیب، اخلاق، تمدّن، معاشرت، حکومت و سیاست، معرفت و رُوحانیت، تزکیۂ نفوس، تنویرِ قلوب غرض کہ وصولِ الہٰی اور تنظیم و رفاہیتِ خلائق کے وُہ تمام قوانین و ضوابط موجود ہیں جن سے تخلیقِ دُنیا کی غرض پُوری ہوتی ہے۔ اور جن کی ترتیب و تدوین کی ایک امی قوم کے امی فرد سے کبھی توقع نہیں ہو سکتی۔ گویا یہاں قرآن کے تمام وجوہ اعجاز میں سے قرآن کے علمی اعجاز کو اُجاگر کر کے یہ جتانا مقصود ہے کہ اس جیسی کتاب کو ایک ایسے شخص نے دُنیا کے سامنے پیش کیا ہے جو زندگی میں کبھی ایک دن بھی کسی مدرسہ کا طالب علم نہیں رہا۔ بلکہ ایسی بستی میں پیدا ہوا ہے جہاں کوئی مدرسہ اور مکتب نہ تھا۔ نہ علمی چرچے تھے اور نہ علمی صحبتیں تھیں۔ عمر کے چالیس برس

سال پورے ہونے پر اچانک اس کی زندگی میں ایک غیر معمولی تبدیلی آگئی اور اس نے نبوت کا اعلان کر دیا۔ اس نے قرآن سنانا شروع کیا اور دعویٰ کیا کہ یہ میرا کلام نہیں اللہ کا کلام ہے۔ اور جس طرح اللہ کی زمین جیسی زمین، اللہ کے سورج جیسا سورج اور اللہ کے چاند جیسا چاند بنانے سے دنیا عاجز ہے اسی طرح اللہ کی کتاب جیسی کتاب بنانے سے بلکہ اس جیسی ایک سورت بنانے سے بھی دنیا عاجز رہے گی۔

قرآن کے وجوہ اعجاز اگرچہ مختلف ہیں لیکن یہاں ان میں سے صرف قرآن کے اعجاز علمی کو سامنے رکھ کر یہ چیلنج دیا گیا ہے کیونکہ مخاطب وہ لوگ ہیں جو سلسلہ وحی و نبوت کے قائل ہیں۔ علوم انبیاء اور معارف اولیاء کی علم برداری کا دعویٰ کرتے ہیں، مالدار ہیں، ساہوکار ہیں، تجارت کے بڑے ماہر ہیں، حجاز کی آبادی میں بیت المدراس کے نام سے علمی مرکز چلا رہے ہیں، ملک کی عام آبادی ان کے علم و فضل کی قائل اور ان کی دینی واقفیت سے مرعوب ہے۔

علمی اعجاز تمام نبیوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت ہے۔ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس اللہ سرہ العزیز کا حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے علمی اعجاز پر یہ بیان بے حد اہمیت رکھتا ہے۔

اعجاز علمی میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا نمایاں مقام اس بات کی صاف طور پر نشان دہی کر رہا ہے کہ کمال کے سارے مراتب آپ پر ختم ہو چکے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ تمام صفات کمال کی آخری سرحد صفت علم ہے۔ کیونکہ عمل کے سارے کمالات علم کے محتاج ہیں۔ محبت، شوق، ارادہ، قدرت، سخاوت و شجاعت، حلم اور حیا وغیرہ سب علم کے نتائج و ثمرات ہیں۔ جیسے کمال علم کا مقام کمال عمل سے اونچا ہے اسی طرح وہ ذات گرامی جو کمال علم سے آراستہ ہو دوسروں سے درجہ، مرتبہ میں بلند تر، بزرگ تر اور بالاتر ہو گی۔ یہ ایک ٹھیٹھ عقلی بات ہے اس میں کوئی کلام نہیں۔ کلام اگر ہو سکتا ہے تو صرف کمال کے ثبوت میں ہو سکتا ہے۔ نبوت کی جانب سے اسی ثبوت کا نام اعجاز قرآن ہے۔ اگر کسی خوشنویس کے مقابلے میں کوئی نہ آئے تو یہ اس کے بے نظیر اور یکتائے روزگار ہونے کی علامت ہے۔ جب قرآن جیسی پہلے کوئی کتاب نہ تھی۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کو تحدی کے ساتھ پیش کیا اور پوری انسانیت اس کے مقابلے میں عاجز ہو کر رہ گئی تو اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اس کمال علمی میں یکتا اور بے نظیر ہیں نہ پہلے کوئی شخص کمال علمی میں آپ کا ہمسر ہوا اور نہ بعد میں کوئی ہو سکتا۔ یہ اعجاز علمی آپ کی یکتائی

برتری اور آپ کی خاتمیت کی سب سے زیادہ واضح اور روشن دلیل ہے۔

۴۶ — یعنی اگر تمہیں قرآن کے کلام بشری ہونے کا خیال ہے تو تم بھی ایک سُورت ایسی فصیح وبلیغ تین آیت کی مقدار بنا دیکھو۔ اور جب تم باوجود کمال فصاحت وبلاغت چھوٹی سی سُورت کے مقابلہ سے بھی عاجز ہو جاؤ تو پھر سمجھ لو کہ یہ اللہ کا کلام ہے کسی بندے کا نہیں۔ اس آیت میں آپ کی نبوّت کو مدلّل فرما دیا[1]۔

یہ خطاب یَا اَیُّھَا النَّاسُ کے تحت ساری دُنیا سے ہو رہا ہے صرف اہلِ عرب یا قریش سے نہیں۔ ارشاد ہو رہا ہے کہ اگر تمہارے خیال میں یہ کلامِ الٰہی نہیں تو یقیناً ایک انسانی تصنیف ہو گی۔ اور جب ایک انسان ایسی تصنیف پر قادر ہے تو دوسرا بھی ہو سکتا ہے چہ جائیکہ لاکھوں فائق انسانوں کا ایک پورا مجمع[2]۔

کلمہ اسلام کے اجزائے ترکیبی دو ہیں۔ ایک توحید باری دوسرے رسالت محمدی۔ توحید کا بیان اُوپر کی دو آیتوں میں ہو چکا اب دعوت تصدیق رسالت کی دی جا رہی ہے[3]۔

معنے یہ ہیں کہ اگر تمہیں اس قرآن کے کلامِ الٰہی ہونے میں کوئی تردّد ہے اور یہ سمجھتے ہو کہ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بنا لیا ہے تو اس کا فیصلہ بڑی آسانی سے اس طرح ہو سکتا ہے کہ تم بھی اس قرآن کی چھوٹی سے چھوٹی سورت جیسی بنا لاؤ۔ اگر تم کامیاب ہو گئے تو پھر تمہیں یہ حق ہو گا کہ تم اس کو بھی کسی انسان کا کلام قرار دو۔ اور اگر عاجز ہو گئے تو سمجھ لو کہ یہ انسان کی طاقت سے باہر ہے۔ اللہ ہی کا کلام ہے[4]۔

کیونکہ آخر تم بھی عربی داں ہو بلکہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم تو مشّاق بھی نہیں اور تم تو مشّاق ہو جب اس کے باوجود نہ بنا سکو گے تو فیصلہ ہو جائے گا کہ یہ اللہ کی جانب سے معجزہ ہے اور بلاشبہ آپ پیغمبر ہیں[5]۔

اس سے پہلے مکہ میں کئی بار یہ چیلنج دیا جا چکا تھا کہ اگر تم اس قرآن کو انسان کی تصنیف سمجھتے ہو تو اس کے مانند کلام تصنیف کر کے دکھاؤ۔ اب مدینے پہنچ کر اس کا پھر اعادہ کیا جا رہا ہے[6]۔

۴۷ — اپنے بندے پر جن کا نام گرامی محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ مقام حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے قُرب و اختصاص کو ظاہر کرنے کا ہے۔ کیونکہ آیت میں نہایت پُر زور اور دائمی چیلنج منکرین کو

---

[1] حاشیہ شیخ الہند ص۶ [2] تفسیر ماجدی ص۱۱ [3] معارف القرآن م ش ص۸۵ [4] بیان القرآن ص۱۲ [5] تفہیم القرآن ص

دیا جا رہا ہے۔ لیکن اس انتہائی زور اور اہمیت کے موقعہ پر بھی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن عبد کے معزز لقب سے نواز رہا ہے۔ نہ خدا کا بیٹا نہ خدا کے مثل نہ خدا کے بروز و اوتار اور نہ خدا کے وزیر، مشیر۔ بلکہ محض عبد اور محض بندے[1]۔

۴۸ — قرآنِ حکیم اپنی زبان کی فصاحت اور حسنِ انشار کے لحاظ سے بھی یقیناً بے نظیر ہے۔ جیسا کہ عرب کے بڑے بڑے زبان و ادب کے ماہر تسلیم کر چکے ہیں۔ لیکن یہاں جو تحدی کی جا رہی ہے اس کا مخاطب صرف عرب نہیں بلکہ سارا عالم ہے اس لیے قرآنِ مجید کے اعجاز کو یہاں صرف انشار و فصاحت تک محدود رکھنا اس کے عام اور عالمگیر چیلنج کو محدود کرنا ہے۔ قرآن نے آغاز میں اپنا تعارف یہ پیش کیا ہے کہ یہ کتاب ہدایت ہے یعنی انفرادی، اجتماعی دونوں زندگیوں کا جامع نظام نامہ مکمل ہمہ گیر ہر جہتی دستور العمل۔ یہ اس کی اصل حیثیت ہے اس کے علاوہ اور جس قدر حیثیتیں ہیں تبعی اور ضمنی ہیں وُہ یہاں اپنے اسی سب سے بڑے وصف کو پیش کر رہا ہے اور پکار کے کہہ رہا ہے کہ جو ہدایات و بصائر میری ایک سورت کے اندر موجود ہیں۔ تم اگر اپنی متحدہ کوشش سے بھی اس کے مقابلے کی کوئی چیز لا سکتے ہو تو لاؤ پیش کرو۔

۴۹ — یعنی اگر اپنے دعوے میں سچے ہو کہ یہ بندے کا کلام ہے تو جس قدر قابل اور شاعر فصحار و بلغار موجود ہیں خدا تعالیٰ کے سوا سب سے مدد لے کر بھی ایک چھوٹی سی سُورت ایسی بنا لاؤ۔ یا یہ مطلب ہے کہ اللہ کے سوا تمہارے جتنے معبود ہیں سب سے تضرع و زاری کے ساتھ دُعا مانگو کہ اس مشکل کام میں تمہاری کوئی مدد کریں[2]۔

اس جگہ شہدار سے مراد یا تو عام حاضرین ہیں کہ سارے جہان میں جس جس سے تم اس کام میں مدد لینا چاہو لے سکتے ہو۔ اور یا اس سے مراد ان کے معبود ہیں[3]۔

قرآن کا سیدھا سادا دعویٰ یہ ہے کہ وُہ انسان کا نہیں خدا کا کلام ہے اور اپنے اس دعوے پر دلیل اس نے کیسی قطعی اور عام و خاص کی سمجھ میں آنے والی پیش کر دی ہے کہ اگر کوئی اسے امکان بشری کے اندر سمجھتا ہے۔ تو ذرا اس کا ہلکا اور ادنیٰ نمونہ ہی سب کی متحدہ کوشش سے پیش کر دکھائے۔ قرآن کے چیلنج کو ساڑھے تیرہ سو سال سے اُوپر ہو چکے ہیں اور دُنیا کے کتب خانے اس کتاب سازی کے عہد میں قرآن کے برابر کیا معنی۔ تقریباً برابر کتاب سے بھی یکسر خالی ہیں[4]۔

---

[1] تفسیر ماجدی ص۱۲ [2] حاشیہ شیخ الہند ص۶ [3] معارف القرآن ص۱۵۸ [4] تفسیر ماجدی ص۱۲

۵۰ — بچو اور ڈرو دوزخ کی آگ سے جو سب آگوں سے تیز ہے۔ اس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں۔

اس میں یہ لطیف اشارہ ہے کہ وہاں صرف تم ہی دوزخ کا ایندھن نہ ہوگے بلکہ تمہارے وہ بت بھی وہاں تمہارے ساتھ ہی موجود ہوں گے جنہیں تم نے اپنا معبود بنا رکھا ہے۔ اس وقت تمہیں خود ہی معلوم ہو جائے گا کہ خدائی میں یہ کتنا دخل رکھتے ہیں۔

اعجازِ قرآنی پر بحث انشاء اللہ پارہ ۱۵ میں آئے گی۔ یہاں ہم اس موضوع پر حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے علوم سے خوشہ چینی کرتے ہیں۔

معجزاتِ علمیہ کا معجزاتِ عملیہ سے افضل ہونا

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ معجزہ اور انبیاء کے معجزات سے کس قدر بڑھا ہوا ہے؟ سب جانتے ہیں کہ علم کو عمل پر شرف ہے یہ ہی وجہ ہے کہ ہر فن میں اس فن کے استادوں کی تعظیم کی جاتی ہے۔ ہر ہر سررشتہ میں افسروں کو باوجودیکہ ان کے کام بمقابلہ خدمات اتباع بہت کم محنت ہوتی ہے۔ تنخواہ زیادہ دیتے ہیں۔ یہ شرف علم کو نہیں تو اور کیا ہے؟ خود انبیاء ہی کو دیکھو اُمتی بسا اوقات مجاہدہ و ریاضت میں ان سے بڑھے ہوتے نظر آتے ہیں مگر مرتبہ میں انبیاء کے برابر نہیں ہو سکتے۔ وجہ اس کی بجز شرفِ علم و تعلیم اور کیا ہے؟ الغرض بوجہ علم و تعلیم ہی انبیاء اُمتیوں سے ممتاز ہوتے ہیں بوجہ عبادت و ریاضت ممتاز نہیں ہوتے۔ اگر یہ ہے تو پھر علم عمل سے بالضرور افضل ہوگا۔ اس لیے معجزات علمیہ معجزات عملیہ سے کہیں زیادہ ہوں گے۔

معجزاتِ علمیہ و عملیہ کی تفسیر

معجزات عملی اس کو کہتے ہیں کہ کوئی شخص دعویٰ نبوت کر کے ایسا کام کر دکھائے کہ اور سب اس کام کے کرنے سے عاجز آ جائیں۔ اس صورت میں معجزاتِ علمی اس کا نام ہوگا کہ کوئی شخص دعویٰ نبوت کر کے ایسے علوم ظاہر کرے کہ اور اقران و امثال اس کے مقابلے میں عاجز آ جائیں۔

تفاضلِ علوم باعتبار تفاضلِ معلومات

مگر علوم میں بھی فرق ہے یعنی جیسے گلاب ہو یا پیشاب ہو دیکھنے میں دونوں برابر ہیں مگر جس

کو دیکھتے ہیں اس میں اتنا تفاوت ہے کہ اس سے زیادہ اور کیا ہوگا۔ ایک پاک اور خوشبودار دوسرا ناپاک اور بدبودار۔ ایسے ہی علمِ صفاتِ خداوندی اور علمِ اسرارِ احکامِ خداوندی اور علمِ معلوماتِ باقیہ میں یہ بھی فرق ہے بلکہ غور سے دیکھئے تو اس سے زیادہ فرق ہے اس لیے گلاب و پیشاب میں اتنا تو اتحاد ہے کہ یہ بھی مخلوق وُہ بھی مخلوق۔ خالق اور مخلوق میں تو اتنا بھی اتحاد اور مناسبت نہیں۔

باعتبار حاوی علومِ کثیرہ ہونے کے قرآن شریف کا اعجاز

علاوہ بریں قرآن شریف جو معجزاتِ علمی میں بھی افضل و اعلیٰ ہے ایسا بُرہان قاطع کہ کسی سے کسی بات میں اس کا مقابلہ نہ ہوسکا۔ علومِ ذات و صفات و تجلیات و آغاز آفرینش و علم برزخ و علم آخرت و علم اخلاق و علمِ احوال و علمِ افعال و علم تاریخ وغیرہ اس قدر ہیں کہ کسی کتاب میں اس قدر نہیں۔ کسی کو دعویٰ ہو تو لائے اور دکھائے۔

باعتبار فصاحت وبلاغت قرآن شریف کا اعجاز

فصاحت و بلاغت کا یہ حال کہ آج تک کسی سے مقابلہ نہ ہوسکا مگر ہاں جیسے اجسام و محسوسات کے حُسن و قبح کا ادراک تو ایک نگاہ اور ایک ترجمہ میں بھی متصور ہے اور روح کے کمالات کا ادراک ایک بار متصور نہیں۔ ایسے ہی ان معجزاتِ علمی کی خوبی جو متضمن علوم عجیبہ ہوں ایک بار متصور نہیں۔ مگر ظاہر ہے کہ یہ بات کمال لطافت پر دلالت کرتی ہے نہ کہ نقصان پر۔

قرآن شریف کی فصاحت وبلاغت صاحبِ ذوقِ سلیم بداہۃً سمجھ سکتا ہے

بالجملہ اگر کسی بلید کم فہم کو وجوہِ فصاحت و بلاغت قرآنی ظاہر نہ ہوں تو اس سے اُس کا نقصان لازم نہیں آتا کمال ثابت ہوتا ہے۔ علاوہ عبارتِ قرآنی ہر کس و ناکس رند بازاری کے نزدیک بھی اسی طرح اور عبارتوں سے ممتاز ہوتی ہے جیسے کسی خوشنویس کا خط بدنویس کے خط سے پھر جیسے تناسب خط و خال معشوقاں اور تناسب حروف خوشنویساں معلوم ہوجاتا ہے اور پھر کوئی اس کی حقیقت اس سے زیادہ نہیں بتاسکتا کہ دیکھ لو یہ موجود ہے۔ ایسے ہی تناسبِ عبارتِ قرآنی جو وُہ ہی فصاحت و بلاغت ہے ہر کسی کو معلوم ہوجاتا ہے پر اُس کی حقیقت اس سے زیادہ کوئی نہیں بتلاسکتا کہ دیکھ لو یہ موجود ہے۔

وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ
تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۭ كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا ۙ قَالُوْا ھٰذَا الَّذِيْ
رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ ۙ وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا ۭ وَلَهُمْ فِيْهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ڎ
وَّھُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝

اور ان لوگوں کو جو کفر سے ہٹ کر ایمان کی راہ پر لگ گئے اور نیک عمل کئے ہیں ان کو (آگ کی جگہ) ایسے باغوں کی بشارت دیدیجئے جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔ جب کبھی ان باغوں کا کوئی پھل ان کے حصّے میں آئے گا تو بول پڑیں گے یہ تو وُہ ہی ہے جو ہمیں اس سے پہلے مل چُکا ہے (اور یہ اس لیئے کہیں گے کہ) واقعی ان کے سامنے ملی جُلی چیزیں آئیں گی۔ اور مزید برآں۔ ان کے لیے نیک اور پاکیزہ بیویاں ہوں گی۔ اور ان کی راحت ہمیشہ کی راحت ہو گی۔

قرآن شریف کلامِ الٰہی ہے اور تورات و انجیل کتاب الٰہی

الغرض معجزات علمی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور سب سے زیادہ ہیں کیونکہ کلام ربانی اور کسی کے لیئے نازل نہیں ہوا۔ چنانچہ خود اہلِ کتاب اس بات کے معترف ہیں کہ الفاظِ تورات و انجیل منزل من اللہ نہیں۔ وہاں سے فقط الہام معانی ہوا اور یہاں اکثر انبیاء یا حواریوں نے ان کو اپنے الفاظ میں ادا کر دیا۔

اور شاید یہ ہی وجہ ہو کہ دعویٰ اعجاز تورات و انجیل نہ کیا گیا۔ ورنہ ظاہر ہے کہ اس معجزہ سے بڑھ کر اور کوئی معجزہ نہ تھا۔ چنانچہ اُوپر معروض ہو چکا۔

صاحبِ اعجازِ علمی کا صاحبِ اعجازِ عملی سے افضل ہونا

اور بایں وجہ کہ علم تمام اُن صفات سے اعلیٰ ہے جو جو مربّی عالم ہیں یعنی ان صفات کو عالم سے تعلق ہے جیسے علم و قدرت ارادت مشیت کلام کیونکہ علم کو معلوم اور قدرت کو مقدور ارادہ کو مراد اور مشیت کو مرغوب اور کلام کو مخاطب کی ضرورت ہے اس لیے وُہ نبی جس کے پاس معجزہ علمی ہو تمام اُن نبیوں سے اعلیٰ درجہ میں ہوگا جو معجزہ عملی رکھتے ہوں گے۔ کیونکہ جس درجہ کا معجزہ ہوگا وُہ معجزہ اس بات پر دلالت کرے گا کہ صاحب معجزہ اس درجہ میں یکتائے روزگار ہے۔ اور اس فن میں بڑا اسرار ہے اس لیے ہمارے حضرت رسول اللہ علیہ وسلم کی افضلیت کا اقرار بشرطِ فہم و انصاف ضرور ہے۔

قرآن کا یہ عام اسلوب ہے کہ وہ مسئلہ کی توضیح کے لیے تصویر کے دونوں رُخ پیش کرتا ہے۔ تصویر کا یہ رُخ دکھلانے کے بعد کہ نبوت کی دعوت کو قبول نہ کرنے پر سزاؤں کے مستحق ہیں فوراً تصویر کا دُوسرا رُخ بھی پیش فرما دیا کہ جو لوگ نبوت کو مان چکے ہیں اور جو کچھ مان چکے ہیں اس کی ہدایات کے مطابق اپنی اجتماعی، انفرادی زندگی بنا رہے ہیں اور اس طرح ایمان وعملِ صالح میں باہم رشتہ مضبوط کر رہے ہیں وُہ قابلِ مبارکباد ہیں۔

۱۵　بَشِّرْ تو بشارت دے تَبْشِیْرٌ سے ہے۔ انسانی طبیعت کا خاصہ ہے کہ جب اس کو کوئی خوش کن خبر پہنچتی ہے تو وفورِ مسرت سے اس کے جسم میں خون دورہ کرنے لگتا ہے اسی لیے ایسی خبر سُنانے کو جس کو سُن کر انسان کے چہرے پر فرحت و انبساط کے آثار نمودار ہو جائیں تبشیر کہتے ہیں۔ یہ بھی واضح رہے کہ تبشیر کے لفظ میں کثرت سے بشارت دینے کے معنے ملحوظ ہیں۔

آیت میں ایمان اور عملِ صالح والوں کو بشارت دی گئی ہے۔ قرآن میں عمل صالح کو ایمان کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ اس سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ عمل کے صالح ہونے کی بنیادی شرط ایمان ہے۔ کوئی عمل اگر ایسا کیا جاتا ہے کہ جس کی تہ میں جذبہ ایمانی نہ ہو تو وُہ عملِ صالح نہیں عمل صالح کی نقل ہے۔ اور جس طرح نماز کی نقل محض نماز نہیں ایسے ہی نیکی اور عملِ صالح کی نقل بھی عملِ صالح نہیں ہے۔ عملِ صالح یہی ہے کہ ضابطۂ شریعت کے مطابق ہو۔

لے لغات القرآن۔

فقہا نے آیت میں عطف سے جو یہ بات سمجھی ہے کہ ایمان و عمل دو الگ الگ چیزیں ہیں بالکل درست ہے لیکن ان دونوں میں الگ الگ ہونے کے باوجود باہم جو رشتہ ہے اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ

ایمان و عمل میں باہم اصل و فرع کا رشتہ ہے۔

یعنی ایمان صرف اس خشک تصدیق کا نام نہیں ہے جس میں عملِ صالح کی شاخیں نہ ہوں بلکہ ایمان اُس تروتازہ ایقان و اذعان کا نام ہے جس میں اعمالِ صالحہ کی بے شمار شاخیں ہوں۔ اس پر رنگ برنگ کی عبادات کے پھول کھلیں اور ایسے ایسے اعمال کی بہار آئے کہ راستہ سے کانٹا ہٹا دینا ان میں ایک ادنیٰ ترین عمل شمار ہو۔ یوں سمجھو کہ اصل ایمان ہے جس کی جڑوں کی سیرابی اعمالِ صالحہ کی آبیاری سے ہوتی ہے۔ اگر ایمان ہو اور اعمالِ صالحہ نہ ہوں تو وہ ایک ایسا درخت ہو گا جس کی ترقی اور نشوونما کی اُمید نہیں ہے۔ اور اگر صرف عملِ صالح ہے اور ایمان نہیں تو ریگ میں پانی کی روانی ہے جس کا وجود و عدم یکساں ہے۔

۵۲ — باغات اور ان کے نیچے نہریں۔ باغات جنات کا ترجمہ ہے۔ جنات جنۃ کی جمع ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ قرآن میں جنات جمع کے لفظوں سے اس لیے آیا ہے کہ جنتیں سات ہیں۔ جنت الفردوس، جنت عدن، جنت النعیم، دار الخلد، جنت الماویٰ، دار السلام اور علیین[1]۔

جنت لغت میں جن سے بنا ہے جس کے معنے کسی چیز کا حواسِ ظاہری سے پوشیدہ رکھنا ہے اور جنت اُس باغ کو کہتے ہیں کہ درختوں نے اس کی زمین کو ڈھانپ لیا ہو۔

اس کا تعلق عالمِ غیب سے ہے اسے جاننے کا نہیں بلکہ ماننے کا مطالبہ ہے۔ اس لیے آیاتِ قرآنی اور ارشاداتِ نبوت میں اس کے اور دوزخ کے بارے میں جو کچھ بتایا گیا ہے اسے مان لینا چاہیئے۔

۵۳ — ہمیں اس سے پہلے مل چکا ہے یعنی جنتیوں کو جب کوئی پھل پھلواری کھانے میں آئے گا تو انہیں پچھلا مزہ بھی تازہ ہو جائے گا اور اس کی شکل دیکھتے ہی وہ بول اُٹھیں گے کہ یہ تو وہ ہی لذیذ میوہ ہے جس کا مزہ ہمیں خوب یاد ہے۔ یہ قبل والے پھل دُنیا کے باغوں کے بھی ہو

---

[1] مفردات القرآن راغبؒ

سکتے ہیں اور آخرت کے باغوں کے بھی۔ اہلِ تفسیر سے دونوں منقول ہیں[1]۔

۵۴ — ملی جلی — یہ ترجمہ ہے متشابھًا کا۔ جنت کے میوے دُنیا کے میووں سے شکل صورت میں ملتے جلتے ہوں گے مگر لذت میں زمین و آسمان کا فرق ہو گا۔ یا جنت کے میوے باہم ایک شکل و صورت کے ہوں گے اور مزہ جُدا جُدا۔ تو جب کسی میوے کو دیکھیں گے تو کہیں گے وُہ ہی قسم ہے جو پہلے دُنیا میں یا جنت میں کھا چکے ہیں اور چکھیں گے تو مزہ اور ہی پائیں گے[2]۔

یہ تشابہ محض اہلِ جنت کے خیال کے مطابق نہ ہو گا۔ واقعہ اور نفس الامر بھی یہی ہے۔ یہ کس لیے ہو گا؟ بعض نے کہا کہ دُنیا کے پھل پھلواریوں۔ اور بعض کا قول ہے کہ جنت ہی کے میوے ایک دُوسرے کے مشابہ ہوں گے۔ لیکن اگر دُنیا ہی کے پھلوں سے تشابہ مُراد لی جائے تو یہ لحاظ رکھنا ضروری ہو گا کہ مشابہت صرف صوری اور ظاہری ہو گی۔ ورنہ اصل لذت، ذائقہ، خوشبو وغیرہ کے لحاظ سے جنت اور دُنیا کی نعمتوں میں آسمان و زمین کی نسبت ہے۔ چنانچہ محققین نے کہہ دیا ہے کہ دونوں میں اشتراک صرف نام کا ہو گا[3]۔

یعنی نرالے اور اجنبی پھل نہ ہوں گے جن سے وُہ نامانوس ہوں شکل میں انہی پھلوں سے ملتے جلتے ہوں گے جن سے وُہ دُنیا میں آشنا تھے۔ البتہ لذت میں وُہ ان سے بدرجہا بہتر ہوں گے دیکھنے میں مثلاً آم، انار اور سنترے ہی ہوں گے ہر پھل کو دیکھ کر پہچان لیں گے کہ یہ آم ہے اور یہ انار ہے اور یہ سنترہ ہے مگر مزے میں دُنیا کے آموں، اناروں اور سنتروں کو ان سے کوئی نسبت نہ ہو گی[4]۔

یہ جو فرمایا ہے کہ ان کو ملتا جلتا پھل ملے گا سو اکثر لُطف کے واسطے ایسا ہو گا کہ دونوں بار کے پھلوں کی صورت ایک سی ہو گی جس سے وُہ بعد میں سمجھیں گے کہ یہ پہلی ہی قسم کا پھل ہے مگر کھانے میں مزہ اور ہو گا جس سے حظ و سرور مضاعف ہو جائے گا[5]۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ یہ تشابہ اور تماثل صرف رنگ اور صورت میں ہو گا۔ مزہ اور لذت میں ایک دُوسرے سے بالکل جُدا ہوں گے[6]۔

۵۵ — عربی متن میں ازواج کا لفظ آیا ہے جس کے معنے جوڑے کے ہیں۔ اور یہ لفظ شوہر

---

[1] تفسیر ماجدی ص۱۳ [2] حاشیہ شیخ الہندؒ ص۶ [3] تفسیر ماجدی ص۱۳ [4] تفہیم القرآن ص۵۹۔
[5] بیان القرآن ص۱۳ [6] معارف القرآن م ا ص۷۔

إِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖٓ أَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا ۭ فَأَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَيَعْلَمُوْنَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ وَأَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَيَقُوْلُوْنَ مَاذَآ أَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ۘ يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا ۙ وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ۭ وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ إِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ﴿۲۶﴾

بیانِ حقیقت میں اللہ اس بات سے نہیں شرماتا ہے کہ کسی (حقیقت کو ذہنوں میں اُتارنے کے لیے) مچھر کی یا اس سے بڑھ کر کسی اور چیز کی مثال بیان کرے۔ جو لوگ ایمان لے آئے ہیں وہ تو بس جانتے ہیں کہ یہ حق ہے ان کے پروردگار کی جانب سے۔ لیکن جن لوگوں نے حق سے انکار کیا تو وہ کہتے ہیں کہ اس مثال سے اللہ کا کیا مطلب ہے؟ بہتوں کے حصے میں اس سے گمراہی آئے گی اور بہتوں کے سامنے اسی کے ذریعے سعادت کا راستہ کھل جائے گا (لیکن یاد رکھو) گمراہی ان ہی کے حصے میں آتی ہے جو ہدایت کی تمام حدیں توڑ کر حکم عدولی کرتے رہتے ہیں۔

اور بیوی دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے مگر وہاں یہ ازدواج پاکیزگی کی صفت کے ساتھ ہوں گے۔ اگر دنیا میں کوئی مرد نیک ہے اور اس کی بیوی نیک نہیں ہے تو آخرت میں ان کا رشتہ کٹ جائے گا اور اس نیک مرد کو کوئی دوسری بیوی دے دی جائے گی۔ اگر یہاں کوئی عورت نیک ہے اور اس کا شوہر بد ہے تو وہاں اس بُرے شوہر کی صحبت سے خلاصی پا جائے گی۔ اور کسی نیک مرد کو اس کا شریکِ زندگی بنا دیا جائے گا۔ اور اگر یہاں دونوں نیک ہیں تو وہاں

ان کا رشتہ ابدی و سرمدی ہو گا۔[1]

بعض روشن خیالوں کو پاکیزہ بیویوں سے نہ معلوم اتنی شرم کیوں آئی کہ انہوں نے اس معنے ہی کا انکار کر دیا۔ اور "ازواج مطہرہ" کی تفسیر عجیب توڑ مروڑ کر کی ہے گویا بہشت میں رضائے الٰہی کے مقام میں ہر قسم کی انتہائی لذت، مسرت اور راحت کے موقعہ پر بیویوں اور پھر پاکیزہ بیویوں کا ملنا کوئی بڑی ہی شرم و غیرت کی بات ہے۔ جنت کے نفس وجود ہی سے اگر کسی کو انکار ہے تو بات اور ہے لیکن اگر جنت کا اقرار ہے تو پھر وہاں کی کسی لذت، کسی نعمت، کسی راحت سے انکار کے کوئی معنے نقلاً اور عقلاً درست نہیں ہیں۔ جنت نام ہی مادی اور روحانی ہر قسم کی لذتوں، مسرتوں اور راحتوں کے گھرانے کا ہے۔ یا پھر یہ کہ بیوی کے نعمت اور اعلیٰ نعمت ہونے سے انکار ہے۔ اگر ایسا ہے تو اس عقیدے کا رشتہ اسلام سے نہیں بلکہ مسیحیت سے ہے۔ زوجیت جب اللہ کا ایک اعلیٰ انعام ہے تو آخر جنت میں کس جرم کی پاداش میں اس سے محرومی ہو گی۔[2]

قرآن نے آغاز میں یہ دعویٰ کیا کہ یہ کتاب بلاشبہ اللہ کی جانب سے ہے اور اس پر قرآن نے لوگوں کے سامنے استدلال پیش کیا۔ استدلال اس قدر سادہ، اس قدر فطری اور اس قدر مؤثر اور دل آویز ہے کہ ایک ان پڑھ عامی، ایک عالم اور ایک محقق سب اس سے یکساں طور پر مستفید ہو سکتے ہیں۔

قرآن کے کتابِ الٰہی ہونے کے بارے میں چیلنج آپ پڑھ چکے ہیں۔ یہی قرآن کا کلامِ الٰہی ہونے پر استدلال ہے۔ مدعی کی دو ذمہ داریاں ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ اپنے دعوے پر دلیل پیش کرے، دوسرے یہ کہ مخالف کی دلیل کا جواب دے۔ قرآن کے کلامِ الٰہی ہونے پر دلیل پیش کرنے کے بعد ان آیات میں مخالفین کی جانب سے اٹھے ہوئے سوال کا جواب دیا جا رہا ہے۔ یہ مخالف کون تھے؟ یہودی، منافق اور مشرکین تینوں کا نام لیا گیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ تینوں ہوں لیکن چونکہ سورۃ البقرہ کا زمانۂ نزول حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کی مدنی زندگی ہے اس لیے قرینِ قیاس یہی ہے کہ اصل اعتراض اٹھانے والے یہودی ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی یہی رائے ہے۔

اعتراض یہ تھا کہ چونکہ قرآن میں بہت سی حقیر چیزوں کا ذکر ہے جیسے مکھی اور مکڑی۔ اس لیے قرآن کلامِ الٰہی نہیں ہے۔

---

[1] تفہیم القرآن [2] تفسیر ماجدی صہ۱۳

اس اعتراض کا پس منظر یہ تھا کہ قرآنِ حکیم نے حسب مسائل کی وضاحت کے لیے اپنے اپنے موقع پر انسانی بول چال کے مطابق مثالیں پیش کیں۔ ضلالت اور سرکشی کے لیے آگ اور پانی کی مثال دی۔ بڑی بڑی اور چھوٹی سے چھوٹی چیز کا ذکر کیا۔ جانوروں میں ایک طرف ہاتھی، اُونٹ، شیر اور دوسری طرف چیونٹی، مکھی، مچھر کا ـــــ مثال میں چونکہ زبان استعارے، تشبیہ اور کنایہ کی ہوتی ہے اس کی مخاطب کو چوٹ زیادہ لگتی ہے اس لیے دُکھن زیادہ ہوتی ہے۔ یہودیوں کی بے عملی کے لیے بھی قرآن نے سُورۂ جمعہ میں گدھے کی مثال دی تھی۔ سُنی تو چمک پڑے اور تڑپ گئے لیکن کھل کر سامنے نہیں آئے مشرکین کا سہارا لے کر کھڑے ہو گئے کہ یہ کلامِ الٰہی کیونکر ہو سکتا ہے اس میں تو خسیس چیزوں کا ذکر ہے۔ شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں :-

کافراں چوں ذکر ذباب وعنکبوت در قرآن شنیدند طعن کردند

کافروں نے جب قرآن میں مکھی اور مکڑی کا ذکر سُنا تو طعنہ زنی کی۔

ان آیات میں قرآن نے ماحول میں اُٹھے ہوئے اسی سوال کا جواب دیا ہے۔

۵۶ ـــ اس آیت میں اس معارضہ کا جواب دیا گیا ہے جو کفار کی طرف سے پہلی آیت پر ہوا۔ خلاصہ اس کا یہ ہے کہ جب چھوٹی سی سورت بھی ان سے اس جیسی نہ بن سکی تو انہوں نے کہا کہ اگرچہ ہم اس کے مقابلے میں عاجز ہیں لیکن ہم ایک دوسری دلیل سے قرآن کا کلامِ الٰہی نہ ہونا ثابت کریں گے۔ اور وُہ یہ کہ بڑے لوگ اپنے کلام حقیر چیزوں کے ذکر سے دامن بچا کر رکھتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ جو سب سے برتر ہیں وُہ اپنے کلام میں مکھی اور مکڑی کا ذکر کیسے کر سکتے ہیں ـــــ ان کے اس معارضہ کا جواب یہ دیا ہے کہ اس میں کوئی شرم اور عار کی بات نہیں کہ حق تعالیٰ مچھر یا اس سے بڑی چیز جیسے مکڑی مکھی کی مثال بیان فرمائے۔ کیونکہ مثال کا مقصد تو صرف بات کی توضیح ہوتا ہے اور یہ مقصد جبھی حاصل ہوتا ہے کہ مثال اور ممثل لہٗ میں پوری مطابقت ہو۔ ممثل لہٗ حقیر ہوگا تو مثال بھی حقیر ہوگی ورنہ تمثیل ہی بے ہودہ سمجھی جائے گی۔ ہاں اگر تمثیل میں یہ ہوتا کہ مثال اور مثال دینے والے میں موافقت ضروری ہے تو اس اعتراض کی کوئی گنجائش ہوتی لیکن اس کا کوئی بیوقوف بھی قائل نہیں ہے۔ تورات۔ انجیل اور کلامِ حکماء میں ایسی مثالیں بکثرت موجود ہیں کہ اس کے خلاف مُنہ پر بات لانا کفار کی حماقت اور فساد کی بات ہے۔ مَا فَوْقَهَا کے معنے یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ مچھر سے حقارت اور چھوٹائی میں زیادہ ہو جیسے مچھر کے بازو کہ بعض حدیثوں میں اس کا دُنیا کی تمثیل میں ذکر آیا ہے [1]

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ

قرآن میں متعدد مقامات پر توضیحِ مدعا کے لئے مکڑی، مکھی اور مچھر کی جو تمثیلیں دی گئی ہیں۔ ان پر مخالفین کو اعتراض تھا کہ یہ کیسا کلامِ الٰہی ہے جس میں ایسی حقیر چیزوں کی تمثیلیں ہیں وہ کہتے تھے کہ اگر یہ خدا کا کلام ہوتا تو اس میں یہ فضولیات نہ ہوتیں [1]

حالانکہ مثال کی غایت ہی یہ ہے کہ وہ مسئلہ کو ذہن کے سامنے زیادہ کھول کر اور زیادہ وضاحت کے ساتھ لے آئے۔ اب یہ مقصد جس مثال سے بھی پورا ہو سکے اسی کو بہترین کہا جائے گا چاہے مثال میں پیش کی جانیوالی چیز بجائے خود کیسی ہی ہو۔ مچھر بظاہر ایک حقیر اور بے حقیقت سی مخلوق ہے۔ اب جہاں مخلوق کی بے حقیقتی بیان کرنا ہوگی وہاں موزوں مثال مچھر ہی کی ہوگی۔ امام رازیؒ نے یہ بات خوب لکھی ہے کہ صانعِ عالم، خلاقِ علیم کی بنائی ہوئی کوئی چیز بھی درحقیقت حقیر و بے حقیقت نہیں ہے۔ بلکہ جو چیز بظاہر جتنی چھوٹی ہوگی اسی قدر اس کا بیان کمالِ علم، کمالِ حکمت کی کچھ اور زیادہ دلیل ہوگا [2]

ف۵۔ یعنی ایمان والے تو ان مثالوں کو حق اور مفید سمجھتے ہیں اور کفار بطور تحقیر کہتے ہیں کہ ایسی حقیر مثالوں سے خدا کی کیا غرض ہے؟ جواب دیا گیا ہے کہ اس کلام سراپا ہدایت سے بہتیروں کو گمراہی میں ڈالنا اور بہتوں کو راہِ راست دکھلانا مقصود ہے یعنی اہلِ حق اور اہلِ باطل میں تمیز تام منظور ہے جو نہایت مفید اور ضروری ہے [3]

مطلب یہ ہے کہ جو لوگ بات کو سمجھنا نہیں چاہتے، حقیقت کی جستجو ہی نہیں رکھتے۔ ان کی نگاہیں تو بس ظاہری الفاظ میں اٹک کر رہ جاتی ہیں اور وہ ان چیزوں سے الٹے نتائج نکال کر حق سے اور زیادہ دور چلے جاتے ہیں۔ برعکس اس کے جو خود حقیقت کے طالب ہیں اور صحیح بصیرت رکھتے ہیں ان کو انہی باتوں سے حکمت کے جوہر نظر آتے ہیں اور ان کا دل گواہی دیتا ہے کہ ایسی حکیمانہ باتیں اللہ ہی کی طرف سے ہو سکتی ہیں۔

قرآن نے جا بجا یہ حقیقت واضح کی ہے کہ ہدایت و سعادت کی راہ عقل و علم کی راہ ہے اور گمراہی و شقاوت کا سرچشمہ جہل و کوری ہے اور حواس و تفکر کو بےکار کر دینا ہے۔ جو لوگ خدا کی دی ہوئی عقل سے کام نہیں لیتے یا ہوائے نفس سے اس درجہ مغلوب ہو جاتے ہیں کہ ذہن و ادراک کی قوتیں بیکار ہو جاتی ہیں وہ کبھی ہدایت نہیں پا سکتے [4]

قرآن نے ان کے اس اعتراض کا ایسا معنی خیز جواب دیا ہے کہ جس سے اللہ سبحانہٗ کا

---

[1] تفہیم القرآن ص۵۹ ج۱، [2] حاشیہ شیخ الہند ص۷، [3] تفہیم القرآن ص۶۰۔ [4] ترجمان القرآن۔

قانون ہدایت وسعادت کھل کر سامنے آگیا ہے۔ دنیا کی زندگی میں ہر گوشے کی طرح ہدایت وضلالت کا بھی ایک قانون ہے ہر عہد اور ہر ملک میں ایک جیسے نتائج رکھتا ہے اس کے احکام میں کبھی تبدیل نہیں ہوتی۔ طالبینِ ضلالت کے لئے ضلالت کے دروازے اور ہدایت کے طلبگاروں کے لئے ہدایت کی راہیں کھولنا اللہ کا قانون ہے۔ گمراہی صرف ان کے حصے میں آتی ہے یا گمراہ وہ ہوتے ہیں جو خود گمراہ رہنا چاہتے ہیں۔ اللہ سبحانہٗ کسی پر گمراہی کو تھوپتا نہیں ہے۔ بار بار کی ارادی نافرمانیوں اور عدول حکمیوں سے اندر کا نور بجھ جاتا ہے اور طبیعت میں حق کی طلب اور صداقت کی تلاش باقی رہتی ہے بلکہ اس کے برعکس باطل پر جمود پیدا ہو جاتا ہے۔ وَمَا يُضِلُّ بِهِ إِلَّا الْفَاسِقِينَ کا یہی منشا ہے۔

آیت میں دونوں جگہ اضلال اور ہدایت کے تذکرے کے ساتھ کَثِیْرًا کا لفظ لا کر بتا دیا کہ اہل ضلالت تو فی الواقع عددی اعتبار سے اکثریت میں ہوتے ہیں اور اہل حق اگرچہ عددی لحاظ سے اکثریت میں نہیں ہوتے کیونکہ ایک کی زیادتی دوسرے میں کمی کی علامت ہے لیکن عددی قلت کے باوجود اہل حق اپنی معنوی خوبیوں، اخلاقی بزرگیوں، ایمانی قوتوں اور روحانی نورانیتوں کی وجہ سے ان سے زیادہ نفع رساں اور نفع بخش ہوتے ہیں۔ گویا اگر اہل باطل میں مادی کثرت ہوتی ہے۔ تو اہل حق میں معنوی۔ اسی بنا پر جنگ میں تخفیف کے بعد ایک حق پرست کو دو کے مقابلے میں اور تخفیف سے پہلے ایک حق پرست کو دس کے مقابلے میں کافی بتایا گیا ہے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ اہل حق کی معمولی سی تعداد نے دنیا کی امامت کے فرائض انجام دیتے ہیں۔

دراصل جو لوگ اللہ کی دی ہوئی عقل سے کام نہیں لیتے ان کے ساتھ یہی معاملہ ہوتا ہے اور اللہ کی دی ہوئی عقل سے کام لے کر جو یقین کی بنیاد پر دلائل کی عمارت اٹھاتے ہیں ان کا نعرہ یہی ہوتا ہے کہ أَنَّهُ الْحَقُّ مِن رَّبِّهِمْ۔ جب کسی حقیقت تک یقین کے ساتھ رسائی ہو جاتی ہے تو پھر دلائل کا راستہ خود بخود مختصر ہو جاتا ہے۔ امام شعرانی رح لکھتے ہیں کہ مومن کامل وہ ہے جس کے نزدیک عالم غیب یقین میں عالم شہادت کے برابر ہو جاتے علامہ اقبال مرحوم نے اسی صفت یقین کو اس شعر میں پیش کیا ہے ؎

غلامی میں نہ کام آتی ہیں تدبیریں نہ شمشیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

الَّذِينَ يَنقُضُونَ عَهْدَ اللَّهِ مِن بَعْدِ مِيثَاقِهِ وَيَقْطَعُونَ مَا أَمَرَ
اللَّهُ بِهِ أَن يُوصَلَ وَيُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ أُولَٰئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ ﴿٢٧﴾

فاسق کون ہیں؟ ——— فاسق[۵۸] وہ لوگ ہیں جو اللہ کے عہد[۵۹] کو اپنی زندگی کی مختلف شاخوں میں اپنی بدعملی سے باوجود اس کے استحکام[۶۰] کے توڑتے رہتے ہیں ——— اور ان تعلقات کو جن کے جوڑنے کا اللہ نے حکم دیا ہے۔ کاٹنے[۶۱] میں بے باک ہیں اور ملک میں اپنی بدعملیوں[۶۲] سے فساد برپا کرتے ہیں۔ فی الواقع یہی لوگ سرتاسر نقصان[۶۳] اٹھانے والے ہیں۔

---

۵۸ فاسق فسق سے بنا ہے۔ ائمہ لغت لکھتے ہیں کہ فاسق کے استعمال کی اسلام سے پہلے عربی زبان میں عادت نہ تھی۔ فیروزآبادیؒ فرماتے ہیں کہ عرب جاہلیت کے نثر اور نظم میں عربی ہونے کے باوجود لفظ فاسق استعمال نہیں ہوا ہے اور ابن الاعرابیؒ نے کہا ہے کہ زمانہ جاہلیت کے ادبی ذخیرے میں لفظ فاسق نہیں ہے۔ فسق بحیثیت فعل بے جان چیزوں کے سلسلے میں ضرور مستعمل تھا۔ لیکن بحیثیت اسم فاسق کا استعمال کلام عرب میں انسان کے لئے نہیں ملتا ہے۔ گویا اس اصطلاحی معنے میں جس میں اس کا استعمال اب عربی بلکہ اردو میں عام ہے یہ تمام تر ایک اسلامی لفظ ہے اور ان چند لفظوں میں سے ہے جو قرآن نے آکر عربی زبان کو دیئے۔ علامہ زبیدیؒ نے تصریح کی ہے کہ اس کا اطلاق عربی میں اسلام سے پہلے نہیں ہے۔ اس لئے فاسق کے اسلامی اطلاق کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے

اسلام کی اصطلاحی زبان میں شریعت کی حدود سے باہر ہو جانے والے کو فاسق کہتے ہیں۔ یہ لفظ اگرچہ دونوں یعنی کافر اور مومن عاصی پر قرآن میں بولا گیا ہے۔ لیکن کافر کا فسق مومن عاصی کے فسق سے زیادہ سنگین ہوتا ہے۔

۵۹ بادشاہ اپنے ملازموں اور رعایا کے نام فرمان یا ہدایت جاری کرتا ہے ان کو عربی محاورے میں عہد سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ کیوں کہ ان کی تعمیل رعایا پر واجب ہوتی ہے یہاں عہد کا لفظ انہی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اللہ کے عہد سے مراد اس کا وہ مستقل فرمان ہے جس کی رو سے تمام

نوعِ انسانی صرف اسی کی بندگی وطاعت کرنے پر مامور ہے [1]

عہد سے اس جگہ وہ وصیت مراد ہے جس کی حق تعالیٰ نے اپنے تمام پیغمبروں کے ذریعے تاکید کی۔ کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو اور اس کے پیغمبروں کی تصدیق کرو۔ کچھ کے خیال میں عہد سے مراد وہ عہد ہے جو اللہ تعالیٰ نے تورات میں یہودیوں سے لیا تھا کہ نبی آخر الزمان پر ایمان لانا۔ کچھ کہتے ہیں کہ عہد سے عہد الست مراد ہے [2]

اس عہد کا ذکر قرآن میں دوسری جگہ آیا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی پشت سے سب کو نکال کر توحید کا اقرار لیا تھا [3]

معاھدہ طاعت، عہد ایمان، توحید کا حاسہ فطری۔ اقرار توحید و ربوبیت تو الیا سیدھا سادہ صاف مسئلہ ہے کہ ہر انسان کی فطرت سلیم اس عقیدہ پر گواہ ہے [4]

[60] باوجود اس کے استحکام کے۔ اس سے اس طرف اشارہ ہے کہ آدم کی تخلیق کے وقت تمام نوعِ انسانی سے اس فرمان کی پابندی کا اقرار لیا گیا ہے۔

اسی عہدِ فطرت کی توثیق ہر دور اور ہر زمانہ میں انبیاء کے ذریعے سے ہوتی رہی ہے۔ گویا یہ عہد اتنا مضبوط اور مستحکم ہے کہ فطرت انسانی میں ودیعت کر دیا گیا ہے اور فطرتِ انسانی کی اصلی آواز تصدیق و ایمان ہے۔ انکار و کفر نہیں ہے۔ اس بنا پر کوئی انسان اپنی غفلت کے لئے معذور نہیں ہو سکتا اور یہ نہیں کہہ سکتا کہ آباؤ اجداد کی گمراہی سے میں گمراہ ہو گیا ہوں۔ کیوں کہ اس کے باوجود کہ باہر گمراہی کے کتنے ہی عوامل جمع ہو جائیں۔ لیکن اس کی فطرت کی اندرونی آواز (عہد اللہ) کبھی دب نہیں سکتی بشرطیکہ وہ خود اس کے دبانے کے درپے نہ ہو جائے اور اس کی طرف سے کان بند نہ کر لے۔

[61] اس میں تمام تعلقات شرعیہ: جو درمیان عبد اور رب کے ہیں یا باہم اقارب میں ہیں یا عام اہل اسلام یا بنی آدم سے ہیں یا باہم انبیا علیہم السلام میں ہیں داخل ہو گئے [5]

آیت کے وسعت مفہوم میں سارے حقوق اللہ اور حقوق العباد داخل ہیں۔ یعنی وہ سارے فرائض جو ہر انسان پر خالق و مخلوق دونوں سے متعلق رہتے ہیں۔ جیسے قطع رحم کرنا، انبیاء، علماء، واعظین اور مومنین، نماز اور دیگر جملہ امورِ خیر سے اعراض کرنا [6]

---

[1] تفہیم القرآن ص۶۰ [2] معارف القرآن ج ا ص۱۵۸ [3] بیان القرآن ص۱۵ [4] تفسیر ماجدی ص۱۲۔
[5] بیان القرآن ص۱۵۔ [6] حاشیہ شیخ الہندؒ ص۷۔

خلاصہ یہ ہے کہ جن روابط کے قیام و استحکام پر انسان کی اجتماعی و انفرادی فلاح کا انحصار ہے اور جنہیں درست رکھنے کا اللہ نے حکم دیا ہے۔ ان پر یہ لوگ تیشہ چلاتے ہیں۔ اس میں دریا کوزہ میں بند کر دیا گیا ہے۔ گویا انسانی تمدن و اخلاق کی پوری دنیا پر جو دو آدمیوں کے تعلق سے لے کر عالمگیر بین الاقوامی تعلقات پر پھیلی ہوئی ہے صرف یہی ایک جملہ حاوی ہو جاتا ہے۔ روابط کو کاٹنے سے مراد محض شہری زندگی میں معاشرتی تعلقات کا انقطاع نہیں ہے بلکہ تعلقات کی صحیح اور جائز صورتوں کے علاوہ جو صورتیں بھی اختیار کی جائیں گی وہ سب اسی ذیل میں آجائیں گی۔ کیونکہ ناجائز اور غلط روابط کا انجام وہی ہے جو قطع روابط کا ہے۔ یعنی بین الانسانی معاملات کی خرابی اور نظام اخلاق و تمدن کی تباہی [1]

اللہ سبحانہ کے اوامر دو طرح کے ہیں۔ تکوینی اور تشریعی۔ نتائج کا مقدمات عقلیہ پر مرتب ہونا، دلائل کا اپنے مدلولات سے لگاؤ رکھنا۔ اسباب کے ذریعے مسببات تک رسائی ہونا۔ غایات کے وسیلے سے منافع اور مضار کا پتہ لینا ——— وہ تکوینی اوامر ہیں جن کی تعمیل انسان کی فطری ذمہ داریوں میں داخل ہے۔ اور تشریعی اوامر وہ ہیں جن کی اللہ تعالیٰ نے انبیاء کی طرف وحی فرمائی ہے۔ اگر ایک شخص نبی کی صداقت کو دلائل سے ثابت ہو جانے کے بعد نہیں مانتا یا مقدمات تسلیم کر کے نتائج کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کرتا۔ حق کو حق کی راہوں سے حاصل نہیں کرتا یہ شخص فی الواقع فطری اوامر کی قطع و برید کر رہا ہے

[1] فساد سے مراد یہ ہے کہ لوگوں کو ایمان سے نفرت دلاتے تھے اور مخالفین اسلام کو ورغلا کر اہل ایمان سے مقابلہ کراتے اور حضرات صحابہؓ اور صلحائے امت میں عیوب نکال کر تشہیر کرتے تھے تاکہ آپ کی اور دین اسلام کی بے وقعتی لوگوں کے ذہن نشین ہو جاتے اور مسلمانوں کے راز مخالفوں تک پہنچاتے اور طرح طرح کی رسوم و بدعات خلاف طریقہ اسلام پھیلانے میں سعی کرتے تھے [2]

ظاہری فساد یہ کرتے کہ کسی پر ظلم کرتے۔ کسی کی آبرو ریزی کرتے۔ کسی کی حق تلفی کرتے۔ اور باطنی یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کفر کرتے۔ آپ سے عداوت اور کینہ رکھتے۔ [3]

اس فساد کے اندر روحانی، مادی ہر قسم کے مفاسد شامل ہیں۔ اسلام کی حقیقت ہی چونکہ یہ ہے کہ وہ زندگی کا ایک مکمل دستور العمل ہے اور ایک ہمہ گیر نظام حیات ہے اس لئے اس کی موجودگی میں اس سے اعراض و انحراف کے کھلے معنے یہ ہیں کہ کسی ناقص دستور زندگی کو قبول کر لیا گیا ہے۔ اس ناقص نظام زندگی کا قدرتی نتیجہ انفرادی انتشار اور اجتماعی انحلال کے سوا کچھ نہیں ہے آج سب کا مشاہدہ ہے کہ دنیا اتنی ترقیوں

---

[1] تفہیم القرآن صفحہ ۶۴، [2] حاشیہ شیخ الہندؒ صفحہ ۷، [3] بیان القرآن صفحہ ۱۰۔

كَيْفَ تَكْفُرُونَ بِاللَّهِ وَكُنْتُمْ أَمْوَاتًا فَأَحْيَاكُمْ ۖ ثُمَّ يُمِيتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيكُمْ ثُمَّ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴿٢٨﴾ هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُمْ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا ثُمَّ اسْتَوَىٰ إِلَى السَّمَاءِ فَسَوَّاهُنَّ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴿٢٩﴾

لوگو! ——— تم اللہ (کی عبادت میں یگانگت) کا کیسے انکار کر سکتے ہو؟[۶۴] جب کہ صورت حال یہ ہے کہ تم موجود نہ تھے[۶۵] اس نے بلا شرکت تم کو وجود بخشا پھر وہی تم کو زندگی کے بعد مارتا ہے[۶۶] اور پھر وہی موت[۶۷] کے بعد تمہیں دوبارہ زندہ کرے گا پھر اسی کے حضور میں تمہیں پیش[۶۸] ہونا ہے (اور صرف یہی نہیں بلکہ) وہی ہے جس نے زمین کی ساری کی ساری چیزیں تمہاری خاطر پیدا کی ہیں[۶۹]۔ پھر وہ آسمان کی طرف متوجہ[۷۰] ہوا۔ اور سات آسمان ٹھیک بنا دیئے (جن میں کہیں کوئی رخنہ نہیں ہے) اور وہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔

۶۲ اور علمی کمالات کے باوجود کیسے فسادوں کا گہوارہ بنی ہوئی ہے۔

۶۳ مطلب یہ ہے کہ ان حرکات ناشائستہ سے اپنا ہی کچھ کھوتے ہیں توہین اسلام اور تحقیر صلحائے امت کچھ بھی نہ ہوگی۔ صرف یہ ہی ہوا کہ دنیا کی راحت اور آخرت کی نعمت سب سے ہاتھ دھو بیٹھے[1]۔

گردو پیش میں اٹھتے ہوئے سوال کا جواب دینے اور قرآن کے کلام اللہ ہونے کے دلائل پیش فرمانے کے بعد پھر اصل مسئلہ کی طرف لوگوں کو متوجہ کیا ہے کہ نبوت اصل میں یہی دعوت لے کر آئی ہے یہی تمام نبیوں کی پکار رہی ہے۔ میری مراد ہے یگانہ خدا کی عبادت۔ اسی مسئلہ میں نبوت کا اپنے مخاطبوں سے

[1] حاشیہ شیخ الہند ؒ صفحہ ۷۔

اختلاف ہے۔ حافظ ابن کثیرؒ نے تَکْفُرُوْنَ کی یہ تشریح کرکے کہ اللہ کے ساتھ اوروں کی کیسے عبادت کرتے ہو۔ اسی طرف اشارہ کیا ہے۔ مولانا اشرف علی تھانوی قدس اللہ سرہ العزیز نے یہی بات سمجھی ہے فرماتے ہیں کہ اس کے احسانوں کو بھلا دیتے ہو اور غیروں کا کلمہ پڑھتے ہو ـــــ جن بزرگوں کی نظر اس پہلو پر نہیں ہے ان کو کفر و انکار کی توجیہات کرنی پڑی ہیں مثلاً یہ کہ ان لوگوں نے لفظاً خدا کا انکار نہیں کیا مگر رسول اور خدا کے انکار کو خدا ہی کا انکار قرار دے کر ایسا خطاب کیا گیا ہے ـــــ ان کے پیش نظر یہ بنیادی حقیقت ہوتی تو کسی تاویل کی ضرورت ہی پیش نہ آتی۔ دراصل کہا یہ جارہا ہے کہ دلائل واضحہ اور براہین قاطعہ کی موجودگی میں تمہارا اللہ کی عبادت میں شرک کرنا اور اس سے کافرانہ تعلقات رکھنا بڑا ہی عجیب ہے۔

۶۴ یعنی کفر و انکار کی جرأت کیسے کرتے ہو۔ سوال سے مقصود ان کی اس سفاہت پر استعجاب ہے کہ اللہ کو خالق کائنات مانتے ہو۔ رب مانتے ہو اور سب کچھ مانتے ہو لیکن عابدانہ تعلقات دوسروں سے قائم کرتے ہو۔ حیرت ہے کہ اللہ کی مخلوق۔ مملوک اور مرزوق ہو کر بندگی اور پرستش میں اللہ کے ساتھ دوسروں کی ملاوٹ کرتے ہو۔ یہ ان کی سفاہت پر تنبیہ اور توبیخ ہے اور بتانا یہ ہے کہ اس کے احسانوں کو بھلا دیتے ہو۔ غیروں کا کلمہ پڑھتے ہو حالانکہ اس کے استحقاق عبادت میں یکتا ہونے پر دلائل قائم ہیں [1]

۶۵ کہ تم موجود نہ تھے۔ اس نے تم کو وجود بخشا۔ اموات میت کی جمع ہے مردہ اور بے جان کو کہتے ہیں مراد یہ ہے کہ انسان اپنی حقیقت پر غور کرے تو معلوم ہوگا کہ اس کے وجود کی ابتداء وہ بے جان ذرات ہیں جو کچھ منجمد چیزوں کی شکل میں کچھ بہنے والی چیزوں میں، کچھ غذاؤں کی صورت میں تمام دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان بے جان ذرات کو کہاں کہاں سے جمع فرمایا۔ پھر ان میں جان ڈالی۔ ان کو زندہ انسان بنادیا [2] ـــــ اور یا مطلب یہ ہے کہ تم صلب پدر میں تھے۔ تمہاری تشکیل بھی نہ ہوئی پھر رحم مادر میں تمہیں حیات عطا فرمائی۔ نعمتوں میں سب سے مقدم حیات ہے کہ دوسری تمام نعمتوں سے استفادہ اس کے بعد ممکن ہے [3]

۶۶ یعنی جس نے پہلی بار تمہارے بے جان ذرات کو جمع کیا ان میں جان ڈالی ہے وہ اس عالم میں تمہاری عمر کا وقت مقررہ پورا ہونے پر تمہیں مارے گا [4]

---

۱ بیان القرآن ص۲۶ ج۱ ۲ معارف القرآن مفتی ص۱۵۱، ۳ تفسیر ماجدی ص۱۴۲۔ ۴ معارف القرآن کش ص۱۱۵

مطلب یہ ہے کہ تم بے جان اجسام تھے۔ حس و حرکت کچھ نہ تھی۔ اول عناصر تھے اس کے بعد والدین کی غذا بنے۔ پھر نطفہ، پھر خون بستہ، پھر گوشت پھر روح ڈالی گئی جس سے رحم مادر اور اس دنیا میں زندہ رہے پھر دنیا میں جب مرنے کا وقت آئے گا، وہ تمہیں مار ڈالے گا؎۱

مقصد یہ ہے کہ خلق، احیاء، افناء کی سب طاقتیں اللہ تعالیٰ کے پاس ہیں یہ نہیں جیسا کہ بعض مشرک قوموں کا عقیدہ ہے کہ موجد و خالق برہما جی ہیں۔ قائم اور باقی رکھنے والے وشنو جی اور موت و ہلاکت دینے والے شیو جی ہیں؎۲

ف۶۷ تمہیں دوبارہ زندہ کرے گا۔ یعنی پھر ایک عرصہ کے بعد قیامت کو اسی طرح تمہارے جسم کے بیجان ذرات کو جمع کر کے تمہیں زندہ کرے گا۔ اس طرح ایک موت تمہاری ابتداء میں تھی دوسری موت دنیا کی عمر پوری ہونے کے وقت اور دوسری زندگی قیامت کے روز ہو گی۔ پہلی زندگی اور موت کے درمیان چونکہ کوئی فاصلہ نہ تھا اس لئے حرفِ فاء استعمال کیا اور فرمایا فَاَحْيَاكُمْ اور چونکہ دنیا کی حیات اور موت کے درمیان اسی طرح اس موت اور قیامت کے روز کی زندگی کے درمیان کافی فاصلہ تھا اس لئے ثُمَّ استعمال کیا گیا

ثُمَّ يُمِيتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيكُمْ ؎۳

ف۶۸ پھر اسی کے حضور میں تمہیں پیش ہونا ہے۔ یعنی قبروں سے نکل کر اللہ تعالیٰ کے روبرو حساب و کتاب کے واسطے کھڑے کئے جاؤ گے۔ لہٰذا اب خود ہی انصاف کرو کہ جب تم اوّل سے آخر تک مرہون ہوا ہر حالت اور ہر حاجت میں اس کے محتاج ہو پھر اس پر بھی کفر کرنا اور اس کی نافرمانی کرنا کس قدر تعجب خیز ہے؎۴

ف۶۹ اس آیت میں دوسری نعمت بیان فرمائی ہے یعنی اللہ نے تم کو پیدا کیا ہے اور تمہارے انتفاع کے لئے زمین میں ہر قسم کی چیزیں بکثرت پیدا فرمائی۔ مطعومات، مشروبات اور ملبوسات اور ہر چیز کے لئے آلات و سامان؎۵

یہ آیت ہر قسم کے شرک کی جڑ کاٹنے کے لئے کافی ہے۔ بتایا یہ جا رہا ہے کہ تم خود ساری کائنات ارضی کا مقصود ہو۔ پھر یہ کیسی حماقت ہو گی کہ جو کچھ تمہارے لئے ہے تم اسی کو اپنا مقصود و مطاع بنا لو۔ اس فرش زمین پر جو کچھ ہے سب انسان ہی کے لئے ہے نہ یہ کہ انسان کسی اور مخلوق کے لئے ہے اور مشرک اس فطری اور قدرتی ترتیب کو الٹ دیتا ہے؎۶

؎۱ حاشیہ شیخ الہندؒ ص۸ ؎۲ حاشیہ شیخ الہندؒ ص۸ ؎۳ معارف القرآن م ش ص۱۱۶
؎۴-؎۵ حاشیہ شیخ الہندؒ ص۸ ۔ ؎۶ تفسیر ماجدی ص۷۴ ۔

قرآن کے بیان کردہ اس دعویٰ سے کہ خَلَقَ لَکُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ سے جلدی نہ گذر جائیے۔

دراصل انسانی زندگی کا نقطۂ آغاز اور انجام بیان فرمانے کے بعد زمین کی گود میں انسان کی حیثیت اور مقام کو بیان فرمایا ہے اور اس کے لئے بطور تمہید یہ پرشوکت تعبیر اختیار فرمائی۔ اس میں تمام انسانوں کو خطاب ہے کہ زمین میں جو کچھ بھی جیتا، چلتا اور جلیا کچھ ہے وہ انسان کے لئے ہے۔ انسان ان کی خاطر نہیں ہے انسان کی حیثیت اس مکان میں خادم کی نہیں بلکہ مخدوم کی ہے۔ انسان اس ساری کائنات ارضی کے لئے مطاع و مقصود ہے یہی اس ساری بارات کا دولہا ہے۔ مافی الارض اس لئے ہے کہ انسان اپنے مقصد زندگی کی کامیابی کے لئے اس سے فائدہ اٹھائے۔ انسان کا مقصدِ حیات اللہ کی عبادت ہے اور مافی الارض کا مقصد تخلیق انسان کی خدمت ہے۔ جب تک یہ کائنات انسان کے مقصد کی تکمیل، اس کی پا بجائی کا ذریعہ ہے تو یہ پوری کائنات انسان کے لئے رحمت ہے۔ اللہ کا انعام ہے اور جب بھی مافی الارض خود مخدوم اور انسان کو اپنا خادم بنا کر انسان کے مقصدِ حیات کی تکمیل میں رکاوٹ بن جائے تو یہ ہی زحمت ہے۔

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس اللہ سرہ العزیز نے اسے جس انداز سے سمجھایا ہے اس کا قریبی مفہوم یہ ہے کہ آیتِ کریمہ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ (میں نے انسانوں اور جنات کو اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا ہے) کا یہ صاف اعلان ہے کہ انسان کا مقصد حیات اللہ سبحانہٗ کی عبادت ہے اور عبادت نام ہے بندگی اور پرستش کا۔ اگر دنیا اور اس کی ساری موجودات اس آیت خَلَقَ لَکُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا کی وجہ سے انسان کے لئے ہے اور یقیناً ہے تو بلاشبہ یہ سب سامان عبادت ہے اگر یہ سامان عبادت فراہم نہ کیا جاتا تو انسان فی الواقع فرض عبادت کے لائق ہی نہ ہوتا۔ حاصل یہ ہے کہ فرش زمین کی ساری تخلیقی غرض اللہ سبحانہٗ کی عبادت ہے غرض صرف یہ ہے کہ انسان کی تخلیق عبادت کے لئے ہے اور مافی الارض کی تخلیق انسان کے لئے ہے یعنی انسان کے مقصدِ تخلیق کو پورا کرنے کا ذریعہ ہے۔ جیسے روٹی کھانے کے لئے پکائی جاتی ہے لیکن اس کی خاطر چولہا، چمٹا، پکنی اور توا مہیا کئے جاتے ہیں یہ سب پکانے کا ذریعہ ہونے کی وجہ سے کھانے کے لئے ہے۔ ٹھیک ٹھیک ایسے ہی فرش زمین کی ساری چیزوں کی تخلیق کو بھی عبادت کے لئے کہا جائے گا۔ اگر فرش زمین کی موجودات انسان کے مقصد تخلیق عبادت کو پورا نہ کر رہے ہوں اور عبادت کا ذریعہ نہ ہوں تو اللہ سبحانہٗ کی نظر میں اس کی کوئی قیمت نہیں ہے اور یہ سب کچھ انسان کے لئے نعمت ہونے کی بجائے سرتا سر زحمت ہے۔

زمین سے انتفاع کی صورتیں مافی الارض سے فائدہ اٹھانے کی قرآن نے دو صورتیں بتائی ہیں ایک یہ کہ جسمانی

نشوونما کے لئے خود اس کی ذات سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ غذائی مواد کے ذخیرے حاصل کرے۔ طاقتور بننے کے وسائل مہیا کرے۔ دوسرے یہ کہ عقلیت کو فروغ دینے کے لئے ما فی الارض کو فکر و نظر اور استدلال و اعتبار کا مرکز بنائے۔ اس سے معرفت کے دروازے کھلتے ہیں اور یہ حقیقت کھل کر سامنے آجائے گی کہ یہ تمام کارخانہ ہستی اور اس کا عجیب و غریب نظام بغیر کسی اعلیٰ مقصد کے نہیں ہے اور جب یہ حقیقت کھلے گی تو روح عبادت کے جوش سے معمور ہو جائے گی۔

آیئے اب ذرا اس پہلو پر بھی غور فرمائیے کہ علماء نے فرش زمین کی تخلیق کے سلسلہ میں لَکُم کے زور سے یہ بھی معلوم کیا ہے کہ دنیا کی تمام چیزوں میں اصل یہ ہے کہ وہ انسانوں کے لئے حلال اور مباح ہیں کیونکہ وہ اسی کے لئے پیدا کی گئی ہیں بجز ان چیزوں کے جن کو اللہ نے حرام کر دیا ہے اس لئے جب تک کسی چیز کی حرمت اللہ کے قانون سے ثابت نہ ہو وہ انسان کے لئے حلال ہے۔

اس طرح گویا اس آیت میں مذہب کے اس تصور کا رد ہو رہا ہے کہ روحانی سعادت اور قرب الٰہی اس وقت نصیب ہو سکتا ہے جب زمین اور زمین کی چیزوں کو چھوڑ دیا جائے قرآن لَکُم کے زور سے بتا رہا ہے کہ زمین کی چیزیں اور اس کی آسائشیں، سعادت اور روحانیت کے خلاف نہیں ہیں بلکہ ان کو کام میں لانا عین منشاء ایزدی کی تعمیل ہے۔ زمین کی چیزیں اس لئے ہیں کہ کام میں لائی جائیں۔ یہ آیت قرآن کا ایک انقلاب انگیز اعلان ہے۔ جس نے انسان کی دینی ذہنیت کی بنیادیں الٹ دی ہیں۔ وہ ما فی الارض جسے نجات و سعادت کی خاطر چھوڑا جاتا تھا اب اسی میں نجات و سعادت کو تلاش کرنے کا حکم ہو رہا ہے

ثُمَّ پھر آسمان کی طرف متوجہ ہوا۔ اِسْتَوٰی کے معنی قصد کیا۔ توجہ کی، التفات کیا آتے ہیں۔ السماء آسمان، ابر، بارش۔ امام راغبؒ لکھتے ہیں ہر چیز جو بالا ہے وہ سماء ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ ہر سماء اپنے نیچے کے اعتبار سے سماء ہے اور اپنے اوپر کی نسبت سے ارض ہے۔ نیز بارش کو سماء کہا گیا ہے۔ اور گھاس کو بھی سماء کہتے ہیں۔ وہ سماء جو ارض کے مقابل ہے مؤنث ہے اور کبھی مذکر بھی آتا ہے اور جمع دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے اور کبھی اس کی جمع سمٰوٰت بھی آتی ہے۔ جو سماء بمعنے بارش ہے۔ وہ مذکر ہی استعمال ہوتا ہے۔ ابن خالویہ کہتے ہیں کہ وہ چیز جو تجھ سے اوپر ہو سماء ہے اسی لئے قرآن میں گھر کی چھت کو بھی السماء کہا گیا ہے۔[1]

سات آسمانوں سے کیا مراد ہے؟ اس کا تعین مشکل ہے انسان ہر زمانے میں آسمان یا بالفاظ

---

[1] لغات القرآن

دیگر مادراستے زمین کے متعلق اپنے مشاہدات یا قیاسات کے مطابق مختلف تصورات قائم کرتا رہا ہے جو برابر بدلتے رہتے ہیں۔ لہٰذا ان میں سے کسی تصور کو بنیاد قرار دے کر قرآن کے ان الفاظ کا مفہوم متعین کرنا صحیح نہ ہوگا۔ بس اتنا سمجھ لینا چاہیئے کہ اس سے یا تو یہ مراد ہے کہ زمین سے ماورا جس قدر کائنات ہے۔ اسے اللہ نے سات محکم طبقوں میں تقسیم کیا ہے یا یہ کہ زمین اس کائنات کے جس حلقے میں واقع ہے وہ سات طبقوں پر مشتمل ہے۔[1]

موجودہ زمانے میں اجرام سماویہ کی ابتدائی تخلیق کے بارے میں جو نظریے تسلیم کیے گئے ہیں۔ ان کی بنیاد پر کوئی فیصلہ صحیح نہیں ہے۔ یہ نظریے کتنے ہی مستند کیوں نہ ہوں اور نظریات سے جزم و یقین کے ساتھ حقائق کا فیصلہ نہیں ہو سکتا۔ پھر اس کا کیا فائدہ کہ ان کی روشنی میں قرآن کے مجملات کی تشریح کی جائے قدیم اہل ہیئت نے سات آسمانوں سے مراد سات مشہور سیاروں کے مدار لئے ہیں یعنی کرہ قمر، کرہ عطارد کرہ زہرہ، کرہ شمس، کرہ مریخ، کرہ مشتری اور کرہ زحل۔

یہاں یہ بات بھی دھیان میں رکھنے کی ہے کہ:

اس آیت میں زمین کی پیدائش پہلے اور آسمانوں کی بعد میں ہونا بلفظ ثُمَّ بیان کیا گیا ہے اور یہی صحیح ہے۔ اور سورہ والنازعات میں جو یہ ارشاد ہے وَالْأَرْضَ بَعْدَ ذَٰلِكَ دَحَاهَا یعنی زمین کو آسمانوں کے بعد بچھایا اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ زمین کی پیدائش آسمانوں کے بعد ہوئی ہو بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ زمین کی درستگی اور اس میں سے پیداوار وغیرہ نکالنے کا کام آسمان کی تخلیق کے بعد ہوا ہے اگرچہ زمین کی تخلیق آسمانوں سے پہلے ہو چکی تھی (بحر محیط وغیرہ)۔[2]

(۱) صفت خلق کے بعد صفت علم کو بتایا ہے۔ اس فقرے میں دو اہم حقیقتوں پر متنبہ فرمایا گیا ہے ایک یہ کہ تم اس خدا کے مقابلے میں کفر و بغاوت کا رویہ اختیار کرنے کی جرأت کیسے کرتے ہو جو تمہاری تمام حرکات سے باخبر ہے۔ جس سے تمہاری کوئی حرکت چھپی ہوئی نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ جو خدا تمام حقائق کا علم رکھتا ہے، جو درحقیقت علم کا سرچشمہ ہے۔ اس سے منہ موڑ کر بجز اس کے کہ تم جہالت کی تاریکیوں میں بھٹکو اور کیا نتیجہ نکل سکتا ہے جب اس کے سوا علم کا اور کوئی منبع ہی نہیں ہے۔ جب اس کے سوا اور کہیں سے علم کی وہ روشنی نہیں مل سکتی جس میں تم اپنی زندگی کا راستہ صاف دیکھ سکو تو اس سے روگردانی میں تمہیں کیا فائدہ ہے۔[3]

---

[1] تفہیم القرآن ص۶۱　[2] معارف القرآن ص۱۱۵ ج۱　[3] تفہیم القرآن ص۶۱ ج۱

وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً ۖ قَالُوٓا أَتَجْعَلُ فِيهَا مَن يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ۖ قَالَ إِنِّيٓ أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿٣٠﴾

اور اس حقیقت پر بھی غور کرو کہ جب تمہارے پروردگار نے فرشتوں[۲] سے کہا میں زمین میں ایک جانشین[۳] اور نائب بنانے والا ہوں۔ انہوں نے عرض کیا کہ کیا آپ[۴] زمین میں ایسی ہستی کو نائب بنانے والے ہیں، جو اس میں خرابی پھیلائے گی اور خون ریزیاں کرے گی حالانکہ ہم آپ کی حمد[۵] و ثنا کے ساتھ تسبیح کرتے رہتے ہیں اور آپ کی پاکی کا اقرار کر رہے ہیں، اللہ نے فرمایا کہ میری[۶] نظر جس حقیقت پر ہے تمہیں اس کی بالکل خبر نہیں ہے۔

آدم کی خلافت کا اعلان

انسان صرف جسم کا نام نہیں ہے بلکہ جسم اور روح دونوں کے مجموعے کا نام ہے۔ گذشتہ آیات میں انسان کی جسمانی زندگی کے بتانے، اس کے باقی رکھنے کا ذکر تھا۔ اس آیت میں انسان کی حیاتِ روحانی کے لئے سامان کا تذکرہ ہے۔ جیسے جسمانی ہونے کی وجہ سے انسان جسم کی ضرورتیں رکھتا ہے۔ اور ان ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے عناصر اور فرشِ زمین کی تمام چیزیں اللہ نے انسان کے لئے بنائی ہیں۔ ایسے ہی روحانی ہونے کی وجہ سے انسان روح کے تقاضے رکھتا ہے اور ان تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے اس کی روح بیتاب ہوتی ہے۔ ان روحانی تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے اللہ نے وحی کا انتظام کیا ہے۔

انسان اگر جسمانی حیثیت سے فرشِ زمین اور یہاں کی موجودات سے فائدہ اٹھا سکتا ہے تو روحانی

حیثیت سے نبوت کے ذریعے عالم غیب کی چیزوں سے متمتع، اخلاق الٰہیہ سے مستفید اور صفات ربانیہ سے آراستہ ہو سکتا ہے۔ جیسے انسان کا جسمانی کمال زمین سے استفراغ اور استفادے کے بغیر ادھورا اور نامکمل رہتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح انسان کا روحانی کمال نوامیس الٰہیہ اور نبوت سے استفادے کے بغیر ناقص اور لچر ہے ان آیات میں روحانی ارتقاء کے اسی نظام کو بیان فرمایا ہے اور انسان کی حقیقت اور کائنات میں اس کی حیثیت ٹھیک ٹھیک بیان کر دی گئی ہے اور نوع انسانی کی تاریخ کا وہ باب پیش کیا گیا ہے جس کے معلوم ہونے کا کوئی دوسرا ذریعہ انسان کو میسر نہیں ہے۔

ملائکہ جمع ملک کی۔ الوکۃ سے بنا ہے۔ جس کے معنے پیام رسانی کے ہیں۔ فرشتوں کو ملائکہ کہتے ہی اس لئے ہیں کہ ان کا اصل کام پیام رسانی ہے اور یہ خالق کائنات کے پیغامات مخلوق تک پہنچاتے ہیں فرشتے نوری مخلوق ہیں وجود خارجی رکھتے ہیں۔ عادتاً انسانوں کے لئے غیر مرئی ہیں جب ضرورت مختلف شکلیں اختیار کر سکتے ہیں ان کی تعداد اللہ ہی کے علم میں ہے وجود میں انسان پر تقدم زمانی رکھتے ہیں۔[1] یہ محض مجرد قوتیں نہیں ہیں جو تشخص نہ رکھتی ہوں بلکہ یہ شخصیت رکھنے والی ہستیاں ہیں جن سے اللہ تعالیٰ اپنی اس عظیم الشان سلطنت کے تدبیر و انتظام میں کام لیتا ہے یوں سمجھنا چاہیئے کہ یہ سلطنتِ الٰہی کے اہل کار ہیں جو اللہ کے احکام نافذ کرتے ہیں۔ جاہل لوگ انہیں خدائی میں حصہ دار بنا بیٹھے ہیں اور بعض نے ان کو خدا کا رشتے دار سمجھا۔ ان کو دیوتا بنا کر ان کی پوجا شروع کر دی۔[2]

تیسرے پروردگار نے فرشتوں سے کہا۔ تاکہ وہ اپنی رائے ظاہر کریں ورنہ اللہ تعالیٰ کو تو انکے باطن کا علم ہے اور حقیقت میں ان سے مشورہ لینا نہ تھا۔ اس کی حاجت ہی کیا ہے بلکہ اس کا احتمال بھی محال ہے۔[3]

یہ بات فرشتوں سے اس لئے فرمائی کہ کائنات ارضی و سماوی کے منافع فرشتوں کے ہاتھ میں ہیں، اس لئے جب تک فرشتے اللہ تعالیٰ کے خلیفہ کی طاعت نہ کریں اس وقت تک خلافت کا کام سرانجام نہیں پا سکتا۔[4]

درحقیقت یہاں مشورہ لینا مقصود نہیں ہے مگر صورت مشورے کی بنائی گئی جس میں مخلوق کو سنت مشورہ کی تعلیم کا فائدہ ہو سکتا ہے۔[5]

---

[1] تفسیر ماجدی ص۱۵، [2] تفہیم القرآن ص۶۲ ج۱، [3] بیان القرآن ص۱۸
[4] معارف القرآن م ا ص۸۵۔ [5] معارف القرآن ش ص۱۲

دراصل یہ معاملہ ایک ایسے عالم سے تعلق رکھتا ہے جس کے لئے ہماری تعبیرات کام نہیں دے سکتی ہیں۔ ہماری ہر تعبیر کسی ایسی حالت کا تصور پیدا کرتی ہے جو عام طور پر ہمیں پیش آتی ہیں لیکن اللہ سبحانہٗ اور اس کی صفات تو اس کی نوعیت ہی دوسری ہے اور وہ ہمارے محسوسات اور مفہومات کے دائرے سے بالکل باہر ہے۔ اس بارے میں ہماری کوئی تعبیر بھی حقیقت حال کی کامل تعبیر نہیں ہو سکتی۔

فرشتوں سے کہنے کی نوعیت کا بھی معاملہ کچھ ایسا ہی ہے کیونکہ ہمارے عرف و تخاطب کے اعتبار سے اگر یہ مشورہ ہے تو اس کا اللہ کے بارے میں ہماری عقل تصور بھی نہیں کر سکتی اس کا احتمال بھی محال ہے اور اگر فرشتوں کو پتہ دینا ہے اور فرشتوں کی جانب سے اعتراض ہے تو یہ نہ جناب الٰہی کے شایان شان اور نہ فرشتوں کے اس مقام کے مناسب ہے جس کا قرآن نے پتہ دیا ہے۔

دراصل اس سارے معاملہ کا خلقت و تکوین سے تعلق ہونے کی وجہ سے عالم غیب سے رابطہ ہے اور عالم غیب کے بارے میں ہماری معلومات کا ذریعہ صرف نبوت ہے اور اس موضوع پر کوئی ارشاد نبوت نہیں ہے۔

جسمانی حیات کے تذکرے میں ربّکم تم سب کا رب فرمایا اور یہاں حیاتِ روحانی کے سلسلے میں ربّک تیرا رب فرمایا۔ اس میں بڑی گہری معنویت ہے۔

حیات جسمانی کے سامان سے بالذات انسانوں کا ہر ہر فرد استفادہ کر رہا ہے لیکن حیات روحانی سے استفادہ ہر شخص بالذات نہیں بلکہ بواسطہ نبوت کرتا ہے۔ بالذات صرف نبوت کی ذات کرتی ہے باقی نبوت کے ذریعے سے کرتے ہیں۔ اس لئے دونوں حالتوں میں ربّکم اور ربّک سے فرق کر دیا اور تعبیر کا یہ اختلاف بتا رہا ہے کہ فی الواقع کائنات میں خلافت عظمیٰ کا اصل مقام آپ کو ملا ہے۔

ہے ایک جانشین اور نائب بنانے والا ہوں۔ عربی میں لفظ خلیفہ ہے اور خلیفہ اسے کہتے ہیں جو کسی کے ملک میں اس کے سپرد کردہ اختیارات اس کے نائب کی حیثیت سے استعمال کرے خلیفہ مالک نہیں ہوتا بلکہ اصل مالک کا نائب ہوتا ہے اس کے اختیارات ذاتی نہیں ہوتے بلکہ مالک کے عطا کردہ ہوتے ہیں وہ اپنے منشا کے مطابق کام کرنے کا حق نہیں رکھتا بلکہ اس کا کام مالک کے منشا کو پورا کرنا ہوتا ہے اگر وہ خود اپنے آپ کو مالک سمجھ بیٹھے اور تفویض کردہ اختیارات کو

من مانے طریق پر استعمال کرنے لگے تو یہ سب غداری اور بغاوت کے افعال ہوں گے [1]۔

یہ ایک بڑی نعمت کا ذکر کیا جا رہا ہے جو تمام بنی آدم پر کی گئی اور وہ حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش کا قصہ ہے اور ان کو خلیفہ بنایا گیا۔ پہلی آیت میں خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا فرمایا تھا اس میں کسی کو انکار پیش آئے تو قصہ آدم سے اس کا جواب بخوبی مل گیا [2]۔

یہیں سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ انسان کو جو قوتیں ملیں گی وہ اس منصب خلافت کے مطابق ہی ملیں گی۔ انسان خود اپنے نوعی ارتقاء، اپنی صلاح و فلاح کے لئے اس کا محتاج تھا کہ اپنے کسی ہم جنس کے واسطے سے شریعت الٰہی کا استفادہ کرے۔ سلسلۂ نبوت اسی غرض کے لئے قائم ہوا تھا۔ [3]

اس فقرے کے ذریعے کہ میں ایک جانشین بنانے والا ہوں یہ بتایا گیا ہے کہ میں زمین میں اپنا ایک نائب بنا رہا ہوں جو میرے نائب ہونے کی حیثیت سے زمینی کائنات پر حکومت کریگا اور میرے احکام نافذ کرے گا۔ اس فقرے کے ذریعے موجودات میں انسان کی حیثیت اور اسکا مقام بتایا گیا ہے کہ وہ فرش زمین پر اللہ کا نائب ہے۔ انسان سے پہلے دو قسم کی مخلوق کا ہونا قرآن سے معلوم ہوتا ہے ملائکہ اور جنات۔ اگر فرشتے ایک نوری مخلوق ہیں تو جنات ناری ہیں اور ان دونوں میں زمین سے استفادے کی صلاحیت نہیں ہے۔ انسان ان تمام چیزوں سے فی الواقع استفادے کی صلاحیت رکھتا ہے اس لئے خلافت کے لئے انسان کو منتخب فرمایا جسمانی ہونے کی وجہ سے وہ تمام عناصر اور فرش زمین کی ہر چیز سے استفادہ کر سکتا ہے اور روحانی ہونے کی وجہ سے نہ صرف عالم بالا کی تمام چیزوں سے متمتع ہو سکتا ہے بلکہ اخلاق الٰہیہ اور صفاتِ الٰہیہ سے آراستہ ہونے کی پوری پوری قابلیت اس میں موجود ہے اور عشق خداوندی اور اس کی محبت کے جوش و ولولہ کی سرشاریوں میں اس قدر بلند مرتبہ طے کرتا ہے کہ اسے دیکھ کر فرشتے بھی عش عش کرتے ہیں۔

[4] فرشتوں نے عرض کیا۔ یہاں عموماً ذہنوں میں یہ سوال ابھرتا ہے کہ فرشتوں کے اس کہنے کی نوعیت کیا تھی۔ علماء نے بتایا ہے کہ ملائکہ کو جب یہ خلجان ہوا کہ ایسی مخلوق جس میں مفسد اور خونریز تک ہوں گے۔ ہم ایسے مطیع اور فرمانبردار کے ہوتے ہوئے ان کو خلیفہ بنانا۔ اس کی وجہ کیا ہوگی؟ بطریق استفادہ یہ سوال کیا اعتراض ہرگز نہ تھا [4] ______ یہ فرشتوں کا اعتراض نہ تھا۔

---

[1] تفہیم القرآن ص ۶۱ ج ۱، [2] حاشیہ شیخ الہند ص ۸، [3] تفسیر ماجدی ص ۸۱، [4] حاشیہ شیخ الہند ص ۸

بلکہ استفہام تھا۔ فرشتوں کی کیا مجال کہ اللہ تعالیٰ کی کسی تجویز پہ اعتراض کریں[1]۔

مطلب یہ ہے کہ ہم تو سب آپ کے فرمانبردار ہیں سو اگر یہ کام ہمارے سپرد کیا جائے تو ہم سب لگ لپٹ کر اس کو انجام دیں گے اور وہ لوگ سب اس کام کے نہ ہوں گے۔ البتہ جو مطیع ہوں گے وہ تو جان و دل سے اس میں لگ جائیں گے مگر جو مفسد و ظالم ہوں گے ان سے کیا امید ہے کہ وہ اس کام کو انجام دیں۔ خلاصہ یہ کہ جب کام کرنے والوں کا ایک گروہ موجود ہے تو ایک نئی مخلوق کو جن میں کوئی کام کا ہوگا کوئی نہ ہوگا۔ اس خدمت کے لئے تجویز فرمانے کی کیا ضرورت ہے ——— یہ نہ بطور اعتراض کے کہا اور نہ بطور استحقاق کے۔ بلکہ یہ ایسی بات ہے کہ کوئی حاکم نیا کام تجویز کر کے اس کے لئے متقل عملہ بڑھانا چاہے اور اپنے پرانے عملہ سے اس کا اظہار کرے وہ لوگ اپنی جاں نثاری کی راہ سے عرض کریں کہ حضور جو لوگ اس کام کے لئے تجویز ہوتے ہم کو معلوم ہوا ہے کہ کچھ تو اس کو بخوبی انجام دیں گے اور کچھ بالکل ہی کام بگاڑ دیں گے۔ ہم کس بیماری کی دعا میں حضور کے اقبال سے اس کام کو انجام دے سکتے ہیں۔ کبھی کسی خدمت میں ہم غلاموں نے عذر نہیں کیا اگر یہ نئی خدمت بھی ہمارے سپرد ہوگی تو ہمیں کوئی عذر نہ ہوگا اس طرح فرشتوں کا یہ کہنا اظہار نیازمندی کی خاطر تھا[2]۔

فرشتوں نے إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً سے یہ سمجھا کہ جب وہ خلیفہ زمین سے پیدا ہوگا۔ تو اس میں لذات نفسیہ سے متنفع ہونے کی خواہش اس کی جبلت میں مرکوز ہوگی۔ جب ان لذتوں کی اس کو ضرورت ہوگی۔ تو قوت شہویہ جوش میں آئے گی اور جو شخص ان لذتوں میں مانع ہوگا۔ تو قوتِ غضبیہ جوش میں آئے گی اور مدافعت کے لئے جنگ و جدال ہوگا۔ اس لئے فرشتوں کو شبہ ہوا کہ زمین کی عمارت و آبادکاری کے لئے ایسے شخص کو خلیفہ بنانا خلاف حکمت معلوم ہوتا ہے[3]

اور واقعہ یہ ہے کہ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً کی تجویز سامنے آتے ہی فرشتوں کی نگاہ خلافت کی حقیقت اور اس کے ذاتی لوازم تک پہنچ گئی۔ خلافت کا لفظ سنتے ہی وہ سمجھ گئے کہ یہ نیابت اعمال، ذاتی افعال لازمہ میں نہ ہوگی بلکہ ان اعمال و افعال میں ہوگی جو دوسروں سے تعلق رکھتے ہیں مثلاً ہدایت، اصلاح، عدل، قضاء وغیرہ وغیرہ۔ ہدایت ہو نہیں سکتی جب تک کہ ضلالت کا وجود نہ ہو اور اصلاح کے لئے ضروری ہے کہ فساد ہو اور عدل کے لئے ضروری ہے کہ ظلم ہو۔ اضداد کے اس ہنگامہ میں خلافت کا کام ہوگا اور خلیفہ اپنے فرائض انجام دے گا۔ یہ سمجھ کر انہوں نے اس ہنگامہ

---

[1] تفہیم القرآن ص ۶۲، [2] بیان القرآن ص ۱۰، [3] معارف القرآن م ص ۸۶۔

اضمار اد برپا کرنے کی حکمت دریافت کی۔

یہاں اس سوال کو بے حد اہمیت حاصل ہے۔ کہ فرشتوں کو اس کی کیسے خبر ہوئی کہ انسان خونریزی کرے گا۔

اس کا جواب جمہور محققین کے نزدیک ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو انسان کے حالات اور اس کے ہونے والے معاملات سے باخبر کردیا تھا[1]

یہ بات کسی طرح ان کو اللہ تعالیٰ نے معلوم کرادی ہوگی کہ بنی آدم میں برے بھلے سب ہی طرح کے ہوں گے[2]

بنی آدم کے بارے میں فساد برپا کرنے اور خونریزی کرانے کا لفظ یہ انھوں نے جنات پر قیاس کر کے قائم کیا تھا۔ کیوں کہ پہلے زمین پر جن آباد تھے اور ان کا فساد فی الارض اور خون خرابہ فرشتے دیکھ چکے تھے[3] ——— رہا یہ امر کہ ملائکہ کو بنی آدم کا حال کیوں کر معلوم ہوا۔ اس میں بہت سے احتمال ہیں جنات پر قیاس کیا یا حق تعالیٰ نے پہلے بتا دیا تھا یا لوح محفوظ پر لکھا دیکھا یا سمجھ گئے کہ حاکم و خلیفہ کی ضرورت جبھی ہوگی۔ جب ظلم و فساد ہوگا یا حضرت آدم علیہ السلام کے قالب کو دیکھ کر بطور قیافہ سمجھ گئے ہوں[4]

[5] یہ فقرہ کہ ہم آپ کی حمد و ثنا کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں۔ فرشتوں کی جانب سے اقرار ہے کہ ہم خدام تو اپنی سرشت کے لحاظ سے بجز حضور والا کی تسبیح و تقدیس کے اور کچھ کر ہی نہیں سکتے۔ اس سے فرشتوں کا مدعا یہ نہ تھا کہ خلافت ہمیں دی جائے ہم اس کے مستحق ہیں بلکہ ان کا مطلب یہ تھا کہ حضور کے فرامین کی تعمیل ہو رہی ہے آپ کے احکام بجالانے میں ہم پوری طرح سرگرم ہیں مرضی مبارک کے مطابق سارا جہان پاک صاف رکھا جاتا ہے اور اس کے ساتھ آپ کی حمد و ثنا اور آپ کی تسبیح و تقدیس بھی ہم خدام ادب کر رہے ہیں[5]

[6] فرشتوں کو اللہ سبحانہٗ کی جانب سے سردست یہ بالاجمال جواب دیا گیا کہ ہم خوب جانتے ہیں کہ اس کے پیدا کرنے میں جو حکمتیں ہیں تم کو ابھی تک وہ حکمتیں معلوم نہیں ہیں، ورنہ اس کی خلافت اور افضلیت میں شبہ نہ کرتے[6]

یہ فرشتوں کے شبہ کا جواب ہے یعنی فرمایا کہ خلیفہ مقرر کرنے کی ضرورت و مصلحت میں جانتا۔

---

[1] معارف القرآن ص ۱۲۳، [2] بیان القرآن ص ۱، [3] جواہر القرآن ص ۱۹، [4] حاشیہ شیخ الہند ص ۸
[5] تفہیم القرآن ص ۶۱، [6] حاشیہ شیخ الہند ص ۸،

ہوں تم اسے سمجھ نہیں سکتے۔ اپنی جن خدمات کا تم ذکر کر رہے ہو وہ کافی نہیں ہیں بلکہ ان سے بڑھ کر کچھ مطلوب ہے اسی لئے زمین میں ایسی مخلوق پیدا کرنے کا ارادہ کیا ہے۔ جس کی طرف کچھ اختیارات منتقل کئے جائیں۔

مطلب یہ ہے کہ تمہیں اس کی کیا خبر کہ عبدیت کے علاوہ نیا کام خلافت الٰہی کا جو اس نئی مخلوق سے لیا جانے والا ہے۔ احساس کے لئے جن صلاحیتوں اور جس قسم کی استعداد کی ضرورت ہے۔ وہ تمہارے اندر کہاں تک موجود ہیں (ابن کثیر)

یعنی تم کو معلوم نہیں ہے کہ منصب خلافت کے لئے ایسی ہی حقیقت جامعہ مناسب ہے جو جسمانیت اور روحانیت دونوں کی جامع ہو اور قوت عقلیہ کے ساتھ اس میں قوت شہویہ اور غضبیہ بھی ہو۔ جس نوع کا مزاج ان مختلف قویٰ سے مرکب ہوگا وہی عالم کے انتظام اور تدبیر و تصرف پر قادر ہوگا۔

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِىْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ۝ قَالَ يٰٓاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۚ فَلَمَّآ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۙ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّىْٓ اَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۙ وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ۝

اور آدم علیہ السلام نے اللہ کی تعلیم سے تمام کی تمام چیزوں کے نام سیکھ لیے تو اللہ نے پھر ان کو فرشتوں کے رُوبرو پیش کیا اور فرمایا کہ اگر تم اپنے شُبہ میں سچے ہو تو مجھے بتلاؤ ان کے نام کیا ہیں؟ فرشتوں نے عرض کیا کہ خدایا ساری پاکیاں تیری ہی ہیں ہم تو اتنا ہی جانتے ہیں جتنا تُو نے ہمیں علم دیا ہے، علم تو تیرا ہی ہے اور حکمت کا خزانہ تُو ہی ہے۔ جب فرشتے اظہارِ عجز کر چکے تو حکمِ الٰہی ہوا کہ اے آدم تم اب فرشتوں کو ان کے نام بتا دو جب آدم علیہ السلام نے ان کے سامنے اپنی معلومات کا اظہار کر دیا تو اللہ نے فرمایا کہ کیا میں نے تم سے نہ کہا تھا کہ میں آسمانوں اور زمین کے تمام غیب جانتا ہوں۔ اور جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو وہ بھی میرے علم میں ہے اور جو کچھ تم چھپاتے ہو وہ بھی میرے علم سے باہر نہیں ہے۔

علمی کمال کی نمائش

فرشتے اللہ سبحانہٗ کی صفتِ قدرت کا مظہر ہیں اور انسان اللہ کی صفتِ علم کا۔ اور معلوم ہے کہ قدرت علم کے توابع میں سے ہے کیونکہ علم کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ سب سے بالا اور سب سے مستغنی ہے۔ سب صفتیں اس کے نیچے اور اس کی محتاج ہیں۔ اگر کسی چیز کا علم نہ ہو تو نہ اس کا ارادہ

ہو سکتا ہے اور نہ اس پر قدرت ہو سکتی ہے۔ علم اپنے ہونے کے لیے نہ ارادے کا محتاج ہے اور نہ قدرت کا۔ اس لیے مدارِ خلافت علم کو قرار دے کر فرشتوں کے سامنے حضرت آدم علیہ السلام کی شانِ علمی اور کمالِ علمی کی نمائش کی ہے۔ چونکہ حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق، تعلیم، ان کا مسجودِ ملائکہ ہونا اور ان کے ہبوط کے معاملات کا تعلق عالمِ شہادت سے نہیں بلکہ عالمِ غیب سے ہے۔ اس لیے ہم اپنے ادراکی وسائل سے کوئی خاص روشنی نہیں ڈال سکتے۔ جو کچھ، جیسا کچھ اور جتنا کچھ اس موضوع پر زبانِ وحی اور ناموسِ نبوت کی جانب سے رہنمائی حاصل ہوگی۔ اسی پر ایمان لائیں گے۔

اس راہ میں تاویل نہیں بلکہ سلف صالحین کے مسلک کے مطابق تفویض ہی میں سلامتی ہے یعنی جو کچھ فرمایا جا رہا ہے اسے مانا جائے کیونکہ اس کی کیفیت اور نوعیت تک ہمارے علم کی رسائی نہیں ہے۔

عام لوگ یہاں مغالطہ کے شکار ہیں وہ خلافِ عقل اور ماورائے عقل میں فرق نہیں کرتے۔ عالمِ غیب ماورائے عقل تو ہے لیکن خلافِ عقل نہیں ہے۔ خلافِ عقل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ عقلِ انسانی اس کو محال سمجھتی ہو اور ماورائے عقل یہ ہے کہ عقل کی رسائی سے باہر ہو۔

ف ۔ خلاصہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو ہر چیز کا نام مع اس کی حقیقت اور خاصیت کے اور نفع و نقصان کے تعلیم فرمایا۔ اور یہ علم ان کے دل میں بلا واسطہ کلام القا فرما دیا۔ کیونکہ بدون اس کمالِ علمی کے خلافت اور دنیا پر حکومت کیونکر ممکن ہے۔ اس کے بعد ملائکہ کو اس کی حکمت پر مطلع کرنے کی وجہ سے ملائکہ سے سوال کیا کہ اگر تم اپنی اس بات میں کہ تم کارِ خلافت انجام دے سکتے ہو سچے ہو تو ان چیزوں کے نام و احوال بتاؤ۔ لیکن انہوں نے اپنے عجز و قصور کا اقرار کیا اور خوب سمجھ گئے کہ اس علمِ عام کے بغیر کوئی خلافت کا کام نہیں کر سکتا۔ اور اس علمِ عام سے قدرِ قلیل ہم کو اگر ملا بھی ہے تو اتنی بات سے ہم خلافت کے قابل نہیں ہو سکتے۔ یہ سمجھ کر بول اٹھے کہ تیرے علم و حکمت کو کوئی نہیں پہنچ سکتا[1]

گزشتہ آیت میں فرشتوں کے شبہ کا اجمالی جواب تھا۔ اس آیت میں تفصیلی جواب ہے۔ یا یوں کہو کہ پہلا جواب حاکمانہ تھا اور یہ جواب حکیمانہ ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام کو صرف نام نہیں بلکہ ان چیزوں کے نام اور ان کی حقیقت اور اوصاف و خواص اور آثار اور طریقۂ استعمال بتایا[2]

---

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۸ [2] معارف القرآن م ۱ ص ۸۹

فرشتوں کو تفصیلی علم کرانے کے لیے ایک خاص واقعہ کا اظہار کیا گیا کہ تمام کائنات عالم کے نام اور ان کے خواص و آثار جن کے علم کی صلاحیت صرف آدم علیہ السلام ہی میں ودیعت کی گئی تھی فرشتوں کی فطرت و جبلت اس کے مناسب نہ تھی وہ سب حضرت آدم علیہ السلام کو سکھائے مثلاً دُنیا کی نافع و مضر چیزیں اور ان کے خواص و آثار، ہر جاندار اور ہر قوم کے مزاج و طبائع اور ان کے آثار۔ ان چیزوں کے معلوم کرنے کے لیے طبیعتِ مَلَکی متحمل نہیں تھی۔ فرشتہ کیا جانتے کہ بھوک کیا ہوتی ہے، پیاس کی تکلیف کیسی ہوتی ہے، نفسانی جذبات کا کیا اثر ہوتا ہے۔ یہ علم صرف آدم علیہ السلام ہی کو سکھایا جا سکتا تھا ان ہی کو سکھلایا [1]

یعنی حضرت آدم علیہ السلام کو اشیاء کائنات کے اسماء اور آثار و خواص کا علم دے دیا۔ حضرت آدم علیہ السلام ہی پہلے انسان تھے اس لیے ابوالبشر کہلاتے ہیں۔ حافظ بدرالدین عینیؒ نے یہی کنیت بتائی ہے۔ علامہ بغویؒ نے حضرت ابن عباسؓ سے آپ کی کنیت ابو محمد روایت کی ہے۔ حضرت قتادہؒ کا بیان ہے کہ جنت میں حضرت آدم علیہ السلام کے علاوہ اور کسی کو کنیت سے یاد نہیں کیا جائے گا۔ آپ کی کنیت جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کا شرف ظاہر کرنے کے لیے ابو محمد ہو گی ـــــ لفظِ آدم کے متعلق علمائے لغت میں اختلاف ہے کہ عجمی ہے یا عربی۔ ابو منصور جوالیقیؒ نے کتاب المعرب میں تصریح کی ہے کہ انبیاء کے سارے نام عجمی ہیں البتہ چار نام اس سے مستثنٰی ہیں۔ آدم، صالح، شعیب اور محمد علیہم السلام ـ جوہریؒ نے بھی اس کو عربی نام بتایا ہے۔ لیکن علامہ زمخشریؒ نے کشاف میں تصریح کی ہے کہ آدم عربی نہیں قطعاً عجمی نام ہے [2]

اسماء جمع اسم کی ہے۔ اسم کا مفہوم عربی زبان میں اُردو کے نام سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔ اسم وہ ہے جس کے ذریعے سے کوئی چیز پہچانی اور جانی جائے۔ اسم کے ساتھ اگر مسمّٰی کا علم نہ ہو تو محض اسم ایک آواز کانوں تک رہے گی اور ذہن کے سامنے کوئی مفہوم نہ ہو گا۔ امام راغبؒ نے اسی لیے اس پر شرح و بسط سے کلام کر کے آخر میں لکھا ہے کہ اسم کی معرفت بغیر مسمّٰی کے نہیں ہو سکتی۔ آیت کی تفسیر میں محققین نے معلومات اشیاء مراد لی ہیں اور اسماء کے ساتھ مسمّیات اور ذوات و خواص اشیاء کو شامل کیا ہے اور اشیاء کے اسماء سے مراد ان کے آثار و خواص کا علم لیا ہے [3]

انسان کے علم کی صورت صرف یہی ہے کہ وہ ناموں کے ذریعے سے اشیاء کے علم کو اپنے

---

[1] معارف القرآن م ش ص ۱۲۳ [2] لغات القرآن ج ۱ ص ۵۷ [3] تفسیر ماجدی

ذہن کی گرفت میں لاتا ہے۔ لہٰذا انسان کی تمام معلومات دراصل اسمائے اشیاء پر مشتمل ہیں۔ حضرت آدم علیہ السلام کو سارے نام سکھانا گویا ان تمام اشیاء کا علم دینا تھا۔[1]

۷۸ؔ۔ فرمایا کہ اگر تم اپنے شبہ میں سچے ہو یعنی اپنے اس خیال میں کہ ہم اصلاح طبائع و انتظام شرائع کی خدمت جس کے لیے نائب کی تجویز ہو رہی ہے انجام دے سکیں گے۔[2]

سوال یہ ہے کہ فرشتوں کے سامنے کیا چیز پیش کی جا رہی ہے۔ اگر چیزوں کے محض نام ہوتے تو لفظِ قرآنی عرضھا ہوتا۔ ضمیر ھم ذوی العقول کے لیے آتی ہے اور غیر ذوی العقول ضمناً اور تبعاً داخل ہیں۔ یہ دلیل ہے اس بات کی کہ پیش صرف نام نہیں ہوئے بلکہ اصل موجودات۔ گویا پہلے صورتِ مثالی سے حضرت آدم علیہ السلام کو تمام مخلوقات کے نام و خواص بتائے گئے۔ پھر خود ان مخلوقات و موجودات کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا گیا۔[3]

۷۹ؔ۔ فرشتوں کے اس جواب سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر فرشتے اور فرشتوں کی ہر صنف کا علم اسی شعبے تک محدود ہے جس سے اس کا تعلق ہے مثلاً ہوا کے انتظام سے جو فرشتے متعلق ہیں وہ ہوا کے متعلق سب کچھ جانتے ہیں مگر پانی کے متعلق کچھ نہیں جانتے۔ یہی حال دوسرے شعبوں کے فرشتوں کا ہے۔ انسان کو ان کے برعکس جامع علم دیا گیا ہے۔ ایک ایک شعبے کے متعلق چاہے وہ اس شعبے کے فرشتوں سے کم جانتا ہو مگر مجموعی حیثیت سے جو جامعیت انسان کے علم کو بخشی گئی ہے وہ فرشتوں کو میسّر نہیں ہے۔[4]

یعنی اللہ اس سے پاک ہے کہ تیرا کوئی کام عبث اور خلافِ حکمت ہو۔ ہمارا علم ہماری استعداد کے مطابق ہے اور حضرت آدم علیہ السلام کا علم اُن کی استعداد کے مطابق ہے اور استعدادوں اور صلاحیتوں کا تفاوت اور اختلاف تیرے علم اور حکمت پر مبنی ہے۔ آپ مالکِ مطلق ہیں جس میں جو استعداد چاہیں وہ پیدا کر دیں۔[5]

۸۰ؔ۔ اے آدم تم اب ان فرشتوں کو ان کے نام بتلا دو۔ یہاں اس شبہ کی کوئی قیمت نہیں ہے کہ جب فرشتوں میں اس علمِ خاص کی مناسبت ہی نہ تھی تو بتلانے سے کیا فائدہ۔ اگر بتلانے سے وہ سمجھ سکتے ہیں تو یہ دعویٰ صحیح نہ رہا کہ ان کو اس سے مناسبت نہ تھی۔ بات یہ

---

[1] تفہیم القرآن ص ۶۴ [2] بیان القرآن ص ۱۹ [3] تفسیر ماجدی ص ۱۶۔ [4] تفہیم القرآن ص ۶۴
[5] معارف القرآن ج ۱ ص ۹۰

ہے کہ بعض اوقات خود تو ایک آدمی ایک علم کو نہیں سمجھتا مگر دوسرے کو تقریر کرتے ہوئے قرآن سے سمجھ لیتا ہے کہ یہ شخص واقعی اس علم میں بڑا ماہر ہے لہٰذا بتلادو کے معنے یہ نہیں ہیں کہ ان کے ذہن میں اتار دو اور سمجھا دو بلکہ مراد یہ ہے کہ ان کے رُوبرو اس کا اظہار کرو۔[1]

یہ مظاہرہ فرشتوں کے پہلے شبہ کا جواب تھا گویا اس طریقے سے اللہ تعالیٰ نے ان کو بتادیا کہ آدم کو صرف اختیارات ہی نہیں دے رہا ہوں بلکہ علم بھی دے رہا ہوں۔ اس کے تقرر سے فساد کا جو اندیشہ تمہیں ہوا وہ اس معاملہ کا صرف ایک پہلو ہے، دوسرا اصلاح کا بھی ہے اور وہ فساد کے پہلو سے زیادہ وزنی اور زیادہ بیش قیمت ہے۔ حکیم کا یہ کام نہیں ہے کہ چھوٹی خرابی کی وجہ سے بڑی بہتری کو نظر انداز کر دے۔[2]

۸۱؎۔ یعنی جب آدم علیہ السلام نے ملائکہ کو اشیا کے عالم کے متعلق سب اُمور بتا دیئے۔ تو فرشتے دنگ رہ گئے اور حضرت آدم علیہ السلام کے احاطۂ علمی پر عش عش کرنے لگے تو اللہ تعالیٰ نے ملائکہ سے فرمایا کہ میں نہ کہتا تھا کہ میں جملہ اُمور مخفی آسمان وزمین کا جاننے والا ہوں۔[3]

آیت اِنِّیۡۤ اَعۡلَمُ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ میں جو بات اجمالی طور پر بتائی گئی تھی اب اس کی تفصیل ہوگئی اور ضمناً ان مسائل کی تعلیم آگئی کہ علمِ کل صرف ذاتِ باری کا خاصہ ہے اور خالق کے لامحدود لامتناہی علم سے اعلیٰ سے اعلیٰ مخلوق کے علم کو بھی کوئی نسبت نہیں ہے۔ اور اس سے علم کی فضیلت عبادت پر ثابت ہوئی۔ دیکھئے عبادت میں فرشتے اتنے بڑھے ہوئے ہیں کہ معصوم ہیں مگر چونکہ انسان کی تربیتِ اللہ کی صفتِ علم نے کی ہے اس لیے مرتبۂ خلافت انسان ہی کو عطا ہوا اور ملائکہ نے اسے تسلیم کیا۔

گویا اس مظاہرہ سے علم کی فضیلت اور بزرگی معلوم ہوئی۔ فرشتوں نے تسبیح و تقدیس پیش کی تو اللہ سبحانہٗ نے اس کے جواب میں حضرت آدم علیہ السلام کے علمی کمال کو ظاہر فرمایا اس سے معلوم ہوا کہ علمی کام کرنا تسبیح و تحمید سے افضل ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ تسبیح و تقدیس عبادت ہے اور عبادت اللہ کی صفات میں سے نہیں بلکہ مخلوق کی صفت ہے برخلافِ علم کے کہ وہ اللہ سبحانہٗ کی صفات میں سے ہے۔ اگرچہ اللہ سبحانہٗ کو ہم معلّم نہیں کہہ سکتے کیونکہ اسمائے الٰہیہ توقیفی ہیں لیکن تعلیم کی نسبت فعلی اللہ سبحانہٗ کی طرف آئی ہے مگر بطور صفت معلّم نہیں آیا ہے۔ اس

---

[1] بیان القرآن ص ۲۱　[2] تفہیم القرآن ص ۶۴　[3] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۸

لحاظ سے معلم اللہ سبحانہ کی نیابت کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عالم کا درجہ عابد سے اونچا مانا گیا ہے۔

مسند احمد بن حنبلؒ میں کثیر بن قیسؓ کے حوالہ سے ایک مبسوط حدیث میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد آیا ہے کہ طالب علم کے لیے اللہ کے فرشتے اپنے بازو بچھا دیتے ہیں۔ علامہ قرطبیؒ فرماتے ہیں کہ فرشتوں کی جانب سے خصوصیت سے اہلِ علم اور علم کی خاطر تواضع اور نیازمندی کا یہ مظاہرہ صرف اس لیے ہوا ہے کہ فرشتوں سے اللہ سبحانہ نے آدم علیہ السلام کے علمی کمال کی نمائش کے بعد تواضع اور نیازمندی کا بھی مظاہرہ کرایا تھا۔ علم اور اہلِ علم کی خاطر فرشتوں میں یہ ادب اسی کی یادگار ہے۔ اب بھی جب اور جہاں کہیں علم کی نمائش ہوتی ہے فرشتوں میں وہی انکسار و تواضع آجاتا ہے۔ طلبِ علم اور علمی مشغولیتوں پر فرشتے جھومتے اور خوشیاں مناتے ہیں۔

علم کی بزرگی کی ایک وجہ عبادت کے مقابلے میں یہ بھی بتائی گئی ہے کہ علم ایک فعل متعدی ہے۔ اور عبادت ایک لازمی افعال میں سے ہے۔ افعال متعدیہ میں دوسروں کا فائدہ اور اجتماعی و عمومی منفعت ہوتی ہے۔ اور افعالِ لازمہ میں خود ذاتی صلاح و فلاح کی ضمانت ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ افعالِ متعدیہ کا مقام افعال لازمہ سے بزرگتر ہے۔ علماء نے عبادات میں نافع ترین عبادتؐ کو افضل ترین عبادت قرار دیا ہے۔ اور اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ عابد کا عمل ذاتی ہوتا ہے اور دوسروں کو فائدہ پہنچانے کا عمل متعدی ہوتا ہے اور دونوں میں کوئی نسبت نہیں ہے۔ اسی بنا پر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے بلکہ یوں کہا جائے تو بیجا نہیں ہے کہ آپ کا ارشاد قرآن کے اندازِ بیان سے مستنبط ہے۔ آپ نے فرمایا ہے کہ عالم کی فضیلت عابد پر ایسی ہے جیسے چاند کی فضیلت ستاروں پر۔ حضرت علیؓ بن ابی طالب سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ ایک شخص کا تیرے ذریعے ہدایت پر آجانا تیرے لیے سُرخ اونٹوں سے بہتر ہے۔ یہ قاطبۃً سب انبیاء کا کام ہے۔ انبیاء اسی لیے آتے ہیں کہ علم خداوندی کے ذریعے لوگوں کی ہدایت کا کام کریں اور اللہ کے بندوں کے اللہ سبحانہ سے تعلقات استوار کریں۔

علم کی اسی فضیلت کی وجہ سے خلافت حضرت آدم علیہ السلام کو ملی ہے اور اسی کو مدارِ خلافت قرار دیا گیا ہے۔ مولانا محمد قاسمؒ فرماتے ہیں،

علم میں انسان نمبر اوّل ہے اس لیے خلافتِ خداوندی کا مستحق اس کے ہوتے ہوئے اور کوئی نہیں ہو سکتا۔

شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ جس طرح جہاد اور اقامتِ عدل کے شعبوں کو سنبھالنا حضور انورؐ

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ۭ اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ ڭ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ۝

اور پھر اس پر غور کرو کہ جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ[۲۵۲] کرو۔ وہ سب سجدہ ریز ہو گئے لیکن ابلیس[۲۵۳] نے سجدہ نہیں کیا۔ اس نے ہمارا کہنا نہیں مانا اور اکڑ گیا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ وہ منکروں[۲۵۴] میں سے تھا۔

کی خلافت ہے اسی طرح کارِ نبوت کے دوسرے شعبوں مثلاً تعلیم و تربیت، دعوت و ارشاد کا سنبھالنا اور اس راہ میں اخلاص سے رضائے الٰہی کی خاطر محنت کرنا بھی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی خلافت ہے۔

یاد رکھئے جیسے علم مدارِ خلافت ہے ایسے ہی علم ہی انسان کے اشرف المخلوقات ہونے کی وجہ ہے۔ شرف دو طرح کا ہوتا ہے۔ ایک وہ جو قرب کی وجہ سے ہو دوسرے وہ جو فضل کی وجہ سے ملے۔ فرشتوں کو عبادت میں قرب کا اور آدم علیہ السلام کو فضل کا شرف حاصل ہے۔ اسی پیمانے سے حضرت عائشہؓ اور حضرت فاطمہؓ کو ناپ لیجئے۔ حضرت فاطمہؓ کو اگر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے قربِ نسل حاصل ہے تو حضرت عائشہؓ کو فضلِ علمی کا شرف حاصل ہے۔ حضرت صدیق اکبر اور حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہما کے بارے میں بھی آپ اسی طرح معاملہ کو سلجھا سکتے ہیں کہ حضرت علیؓ کی بزرگی کا مدار قربِ نسب ہے اور یہ بھی ایک بڑا شرف ہے اور حضرت ابوبکرؓ کی فضیلت کا مدار ان کا فضلِ علم ہے۔ ظاہر ہے کہ جب فضل اور قرب میں آمنا سامنا ہو گا تو پلڑا فضل ہی کا بھاری ہو گا۔ مسئلہ کی قرآن کی روشنی میں اس واقعی نوعیت کو سمجھ لینے کے بعد بہت سے مسائل میں آپ مفاہمت کی راہ معلوم کر سکتے ہیں۔

وفاداری کا مظاہرہ

حضرت آدم علیہ السلام کی علمی توانائی منظرِ عام پر آنے کے بعد صلاحیتِ خلافت ثابت

ہو چکی تو ضرورت محسوس ہوئی کہ فرشتوں سے حضرت آدم علیہ السلام کے لیے وفاداری اور طاعت شعاری کا ایک عام مظاہرہ کیا جائے۔ اس آیت میں وفاداری کے اسی مظاہرے کا تذکرہ ہے۔

مولانا محمد قاسمؒ فرماتے ہیں:

خلافتِ خداوندی اس کا حصّہ ہے جو علم میں اوروں سے ممتاز ہو۔ یہ بات سوائے حضرت آدم کے اور کسی میں نہ تھی اس لیے یہ دولت ان کے حصّے میں آئی۔ لیکن جب خلافت ملی تو جیسے جانشینانِ شاہی کے لیے بعد جانشینی آدابِ شاہی بجالانے ضروری ہوتے ہیں ایسے ہی اللہ سبحانہٗ کے جانشین کے لیے آدابِ خداوندی بجالانے کا حکم ہوا۔

۸۲۔ جب حضرت آدم علیہ السلام کا خلیفہ ہونا مسلّم ہو چکا تو فرشتوں اور ان کے ساتھ جنّات کو حکم ہوا کہ حضرت آدم علیہ السلام کی طرف سجدہ کریں اور ان کو قبلہ سجود بنائیں جیسا کہ سلاطین اپنا ولی عہد مقرر کرتے ہیں۔ پھر ارکانِ دولت کو نذریں پیش کرنے کا حکم ہوتا ہے تاکہ کسی کو سرتابی کی گنجائش نہ رہے۔ چنانچہ سب نے سجدہ مذکور کیا سوائے ابلیس کے۔ کیونکہ وہ اصل میں جنّات سے تھا۔ اور فرشتوں سے میل ملاپ زیادہ رکھتا تھا۔ اور سبب اس سرکشی کا یہ ہوا کہ جنّات چند ہزار سال سے زمین میں کارفرما تھے اور آسمان پر بھی جاتے تھے —————— جب ان کا فساد اور خون ریزی بڑھی تو ملائکہ نے بحکمِ الٰہی کچھ کو مار ڈالا اور کچھ کو جنگل، پہاڑ اور جزائر میں منتشر کر دیا۔ ابلیس ان جنّات میں بڑا عالم و عابد تھا۔ اس نے جنّات کے فساد سے اپنی بے لوثی ظاہر کی۔ فرشتوں کی سفارش سے بچ گیا اور ان ہی میں رہنے لگا اور اس لالچ سے کہ اب جنّات کی جگہ صرف اُسے زمین میں کارفرما بنایا جائے گا عبادت میں بہت کوشش کرتا رہا اور زمینی خلافت کا منصوبہ بناتا رہا۔ جب حکمِ الٰہی حضرت آدم علیہ السلام کی نسبت خلافت کا معلوم ہوا تو ابلیس مایوس ہو گیا اور ریاکاری کی عبادت کے رائیگاں جانے پر جوشِ حسد میں سب کچھ کیا اور ملعون ہوا[1]

اس کا مطلب یہ ہے کہ زمین اور اس سے تعلق رکھنے والے طبقۂ کائنات میں جس قدر فرشتے مامور ہیں ان سب کو انسان کا مطیع ہو جانے کا حکم دیا گیا۔ چونکہ اس علاقہ میں انسان کا خلیفہ بنایا جا رہا تھا اس لیے فرمان جاری ہوا کہ صحیح یا غلط جس کام میں بھی انسان اپنے ان

---

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۸

اختیارات کو جو ہم نے اس کو عطا کیے ہیں استعمال کرنا چاہے اور ہم اپنی مشیت کے تحت اُسے ایسا کرنے کا موقع دیں تو تمہارا فرض ہوگا کہ تم میں سے جس جس کے دائرۂ عمل سے وہ کام متعلق ہو وہ اپنے دائرے کی حد تک اس کا ساتھ دے۔ وہ چوری کرنا چاہے یا نماز پڑھے، نیکی کرنا چاہے یا بدی کے ارتکاب کے لیے جائے، دو صورتوں میں جب تک ہم اسے اس کی پسند کے مطابق عمل کرنے کا اذن دے رہے ہیں تمہیں اس کے لیے ساز گاری کرنی ہوگی۔

مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ ایک فرمانروا جب کسی شخص کو اپنے ملک کے کسی صوبے یا ضلع کا حاکم مقرر کرتا ہے تو اس علاقے میں حکومت کے جس قدر کارندے ہوتے ہیں ان سب کا فرض ہوتا ہے کہ اس کی اطاعت کریں۔ اور جب تک فرمانروا کا منشا یہ ہے کہ اسے اپنے اختیارات کا موقعہ دے اس وقت تک اس کا ساتھ دیتے رہیں۔ البتہ جب اور جس کام کے بارے میں بھی فرمانروا کا اشارہ ہو جائے کہ اسے نہ کرنے دیا جائے تو وہیں ان حاکم صاحب کا اقتدار ختم ہو جاتا ہے اور انہیں محسوس ہوتا ہے کہ سارے علاقے کے اہل کاروں نے گویا ہڑتال کر دی ہے۔ فرشتوں کو آدم علیہ السلام کے لیے سربسجود ہو جانے پر جو حکم دیا گیا تھا اس کی نوعیت کچھ اس قسم کی تھی۔ ممکن ہے کہ صرف مسخر ہو جانے کو سجدہ سے تعبیر کیا گیا ہو مگر یہ بھی ممکن ہے کہ اس انقیاد کی علامت کے طور پر کسی ظاہری فعل کا بھی حکم دیا گیا ہو اور یہی زیادہ صحیح ہے[1]

کیونکہ سجدہ کے لفظی معنے محض تواضع اور تذلل کے ہیں۔ سجدہ نماز کو بھی سجدہ اس لیے کہتے ہیں کہ وہ تواضع اور تذلل کا بہترین مظہر ہے۔ خود محاورۂ قرآن میں سجود کا اس معنی میں استعمال عام ہے اور یہاں بھی صحیح بات یہی ہے کہ یہ سجدہ اپنی ہیئتِ معروفہ کے ساتھ زمین پر پیشانی کے ساتھ نہ تھا بلکہ صرف جھکنے کے معنے میں ہے۔ لیکن جن لوگوں نے اسے سجدہ متعارف کے معنے میں لیا ہے۔ انہوں نے بھی تصریح کر دی ہے کہ یہ سجدہ عبادت نہیں بلکہ سجدہ تعظیمی ہے۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ یہ واقعہ عالمِ ارواح کا ہے عالمِ ناسوت کا ہے ہی نہیں ہے اور تکلیفاتِ شرعیہ کا تعلق اسی عالمِ ناسوت سے ہے۔ عالمِ ارواح عالمِ غیب ہے اور عالمِ غیب کے حالات کے بارے میں ہم اپنی رائے سے کچھ نہیں کہہ سکتے۔ اور اس سارے معاملہ کا تعلق اسی عالم سے ہے۔ ہم خدا کے فرشتوں سے کہنے، فرشتوں کے پوچھنے، اللہ کا

---

[1] تفہیم القرآن ص ۶۵

جواب دینے، آدم علیہ السلام کو تعلیم دینے، تعلیم کے بعد ملائکہ کے رُوبرو پیش کرنے جیسے سارے اعمال کی جب کوئی نوعیت اور کیفیت اس بنا پر مقرر نہیں کرسکتے کہ ان ہونے والے احوال کا تعلق عالمِ غیب اور عالمِ ارواح سے ہے تو پھر سجدہ کی کیفیت سے بحث کا دروازہ کیونکر کھول سکتے ہیں۔

آیئے اس مسئلہ کے اس پہلو پر بھی غور فرمایئے۔

ہم یہ ضرور مانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ فرشتوں سے حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرایا گیا اور اس سجدہ کی کیفیت کے لیے نہ ہم آدم علیہ السلام کو قبلہ بنانے کی تاویل کرتے ہیں اور نہ ہم لام کو الیٰ کے معنے میں بناتے ہیں۔ ہم مانتے ہیں کہ آدم علیہ السلام کو فرشتوں نے سجدہ کیا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ سجدہ کی نوعیت کیا تھی؟ یہ کس قسم کا سجدہ ہے؟ وہ بات جو حضرت شیخ الہندؒ نے فرمائی کہ اس کی نوعیت نذرانے پیش کرنے کی ہے یا وہ جو مولانا مودودی نے بتائی کہ جب صدرِ مملکت گورنر یا ڈپٹی کمشنر مقرر کرتا ہے وہ علاقہ کی تمام مشینری کو حکم دیتا ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے۔ سجدہ کی نوعیت کچھ اسی قسم کی تھی۔ یا جو نکتہ مولانا مفتی محمد شفیع نے پیدا فرمایا کہ یہ سجدہ تعظیمی تھا۔ یہ سب باتیں اپنی جگہ درست ہیں لیکن حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس اللہ سرہٗ العزیز نے اس بات کو جس لطیف انداز میں پیش فرمایا ہے وہ آپ ہی کا حصہ ہے۔ فرماتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام کو فرشتوں کا سجدہ، سجدۂ عبادت نہیں بلکہ سجدۂ خلافت ہے۔

سجدۂ خلافت کیا ہے؟ یہ بھی حضرت مولانا ہی کی زبانی سنیئے، فرماتے ہیں کہ:

سجدے کی دو قسمیں ہیں۔ سجدۂ عبادت اور سجدۂ خلافت۔ دونوں میں مسجود اور مسجود لہٗ ہوتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ سجدہ عبادت میں مسجود واقعی اور بالذات ہوتا ہے اور سجدۂ خلافت میں مسجود عرضی اور مجازی ہوتا ہے۔

لیکن یہاں شاید آپ ذہن میں یہ خلش ضرور محسوس کریں گے کہ یہ سجدہ واقعی سجدہ عبادت نہیں بلکہ سجدۂ خلافت ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ اللہ سبحانہٗ نے وفاداری کے مظاہرے کی یہ صورت کیوں اختیار کی۔ اس کا جواب اوروں نے بھی دیا ہے لیکن جو حُسن حضرت نانوتوی قدس اللہ سرہٗ العزیز کے جواب میں ہے وہ کہیں دیکھنے میں نہیں آیا۔ فرماتے ہیں کہ جب حضرت آدم علیہ السلام خلیفہ اور قائم مقامِ خداوند ذوالجلال ہوئے تو جیسے جانشینانِ شاہی کے لیے جانشینی کے بعد آدابِ شاہی بجا لانے ضروری ہوتے ہیں۔ خصوصاً ان کے ذمہ جن کو اس معاملہ میں شُبہ کی نظر سے دیکھا جاتا ہو۔ فرشتوں نے چاہے کسی وجہ سے کہا تھا لیکن خلافت آدم علیہ السلام کے اعلان پر یہ کہا تھا کیا آپ

اس ہستی کو خلیفہ بنائیں گے جو زمین میں فساد مچائے گی، خوں ریزی کرے گی۔ اب خلافت کی تاج پوشی کی رسم میں ان ہی کو مخاطب کر کے کہا اُسْجُدُوْا لِاٰدَمَ - یہ ان کا آدم علیہ السلام کی خلافت میں نیک نیتی پر مبنی شبہ تھا۔ اس لیے ضروری ہوا کہ فرشتے حضرت آدم علیہ السلام کو سجدۂ خلافت کریں تاکہ ان کا انکار عملاً اقرار بن جائے۔ اور یہ بھی معلوم ہو جائے کہ اگرچہ فرشتے معصوم ہیں اور انسان سراپا گناہ ہیں۔ لیکن چونکہ فرشتے مظہرِ قدرت ہیں اور انسان مظہرِ علم ہے اور قدرت علم کے توابع میں سے ہے اس لیے فرشتوں کا فرض ہے کہ وہ انسان کے فرمانبردار بن کر رہیں۔ الغرض مسجودیتِ آدم وہ حق خلافت خداوندی ہے اور خلافتِ خداوندی علم کا نتیجہ ہے۔

قرآن میں حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں اور والدین کا مصر پہنچنے کے بعد حضرت یوسف علیہ السلام کو جس سجدہ کرنے کا ذکر ہے وہ بھی سجدۂ خلافت ہے۔ آدم علیہ السلام کی خلافت میں ملائکہ اور جنات کو کلام تھا۔ وہاں دونوں کو سجدہ کرنے کا حکم ہوا۔ صراحتہً اگرچہ صرف فرشتوں کا ذکر ہے لیکن ابلیس کے استثنا نے یہ بات کھول دی ہے کہ سجدہ کا حکم اس وقت کی تمام ذوی العقول مخلوق کو ہوا تھا۔ فرشتے اور جنات سب داخل تھے لیکن ذکر صرف فرشتوں کا ہے کیونکہ وہ سب سے اشرف تھے۔ اور قاعدہ ہے کہ جب حکم اعلیٰ کو دیا جائے تو ادنیٰ خود بخود داخل ہو جاتے ہیں۔

حضرت یوسف علیہ السلام کی خلافت میں برادرانِ یوسف کو کلام تھا اس لیے مناسب معلوم ہوا کہ برادرانِ یوسف ان کو سجدہ کریں تاکہ وہ سرکشی نیاز و اطاعت میں تبدیل ہو جائے اور یہ معلوم ہو جائے کہ ہر چند برادرانِ یوسف صاحبِ انوار و برکات ہیں مگر یوسف علیہ السلام میں کوئی اور ہی حسن کار فرما ہے۔ جیسے حضرت آدم علیہ السلام میں تسبیح و تحمید کے مقابلے میں علم بنائے خلافت تھی ایسے ہی حضرت یوسف علیہ السلام میں بھی بھائیوں کی بزرگی کے مقابلے میں علم ہی کو مدارِ خلافت بنایا گیا۔ قرآنِ حکیم کا یہ اعلان

ذٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِيْ رَبِّيْ

اور

وَيُعَلِّمُكَ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ

اس پر گواہ ہے

شاید آپ یہ خلش محسوس کریں کہ اگر بنائے خلافت علم ہے تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کو اس بنیاد پر مسجودِ کائنات ہونا چاہیے کیونکہ آپ کی ذاتِ گرامی منبع العلوم ہے اور آپ کو قرآن نے عَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ کے خطاب سے نوازا ہے۔ اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ علم میں تمام انبیاء میں کوئی آپ کا ہمسر نہیں ہے۔ واقعی آپ کو مسجودِ ملائکہ، مسجودِ خلائق ہونا چاہیے لیکن ایسا نہیں ہوا کیونکہ حضرت آدم علیہ السلام کی خلافت میں ملائکہ اور جنات کو کلام تھا۔ اور حضرت یوسف علیہ السلام کی خلافت میں یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کو کلام تھا۔ گویا دونوں کی اپوزیشن موجود تھی۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلّم کی علم و کمال میں چونکہ کوئی اپوزیشن موجود نہ تھی۔ اس لیے سجدۂ خلافت کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی اور آپ کی ہمسری کا مدعی کون ہو سکتا ہے۔ مولانا محمد قاسمؒ فرماتے ہیں کہ:

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلّم اور دوسرے انبیاء اور ملائکہ میں فرق وہی ہے جو بادشاہ اور اس کے خادموں میں ہوتا ہے۔ جیسے خادموں کو بادشاہ کی ہمسری کا خیال نہیں آسکتا، ایسے ہی بمقابلہ رسولِ عربی اگر گزشتہ انبیاء موجود بھی ہوتے تو ان کو اس کا وسوسہ تک نہ آتا۔ اور یہ ممکن ہی کیونکر ہے۔ قمر اور کواکب میں آفتاب عالمتاب کی ہمسری کا یارا کب ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلّم کے سوا جو مخلوق بھی ہے فرشتے ہوں یا جنات یا پھر اولادِ آدم، سب کے سب کمالاتِ علمی و عملی میں سرکار محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کے دروازے کے دریوزہ گر ہیں۔

چونکہ عالمِ وجود میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلّم کی ہمسری کا مدعی کوئی نہ تھا اس لیے سجدۂ خلافت کی ضرورت پیش نہ آئی اور عالمِ غیب میں اگر ہمسری نہ ہونے کی وجہ سے سجدۂ خلافت کی ضرورت نہ تھی تو ادھر عالمِ شہادت میں کمالِ عبدیت کی وجہ سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلّم کو یہ ادا پسند نہ تھی اس لیے نہ اُدھر سے حکم آیا اور نہ اِدھر سے اپنے لیے سجدۂ خلافت کو پسند کیا گیا۔

دراصل حضور انور صلی اللہ علیہ وسلّم کی تشریف آوری سے پہلے توحیدِ عبادت کے بارے میں فکرِ انسانی اس درجہ بلند نہیں ہوا تھا کہ مجاز کا پردہ ہٹا کر حقیقت کا جلوہ دیکھ لینا۔ اس لیے مراسمِ عبادت میں خالق اور مخلوق کے درمیان ایجابی خط کے علاوہ کوئی سلبی امتیازی خط نہیں تھا۔ مثلاً صفاتِ الٰہی کی بنیاد تمام تر تشبیہہ و تمثیل پر تھی۔ تورات کو دیکھئے کہ ایک طرف زبور کے ترانوں میں اللہ سبحانہ کے لیے شائستہ صفات کا تخیل موجود ہے لیکن دوسری طرف کوئی مناجات اور دُعا نہیں جو انسانی اوصاف سے خالی ہو حتیٰ کہ حضرت مسیح

علیہ السلام نے رحمتِ الٰہی کے تصور کے لیے بھی باپ کی تشبیہہ اختیار کی۔ قرآن آیا تو جیسے تصورِ توحید کے بارے میں اس نے تشبیہہ وتمثیل کے تمام پردے ہٹا دیے اور انسانی اوصاف وجذبات کی مشابہت سے ایک طرف ہو کر توحید کے ہر گوشے میں مجاز کی جگہ حقیقت کا جلوہ پیش کیا ٹھیک ایسے ہی اس نے توحیدِ عبادت کے لیے عمل کی ٹھوس بنیاد فراہم کی۔ عبادت کے ایجابی پہلو پر تو سب نے زور دیا تھا لیکن عمل میں اسلام سے پہلے سلبی پہلو نمایاں نہ ہوا تھا۔ ایجابی پہلو یہ ہے کہ عبادت و نیاز مندی کے سارے اعمال اللہ کے لیے ہونے چاہئیں۔ اور سلبی یہ ہے کہ اللہ سبحانہٗ کے ساتھ عمل میں کسی کی عبادت نہ ہونی چاہیے۔ ایجابی پہلو میں کسی نہ کسی صورت میں شخصیت پرستی، عظمت پرستی نمودار ہوتی تھی۔ قرآن نے سلبی پہلو پر زور دے کر عبادت کا ایسا کامل نقشہ کھینچ دیا کہ شخصیت پرستی اور عظمت پرستی کے تمام دروازے بند ہو گئے۔ دُنیا میں قدیم سے یہ دستور چلا آرہا تھا کہ حکمرانوں اور پیشواؤں کے آگے سجدے کرتے اور اسے تعظیم واحترام کی خاص علامت سمجھتے۔ قرآن نے توحیدِ عبادت کا جو نقشہ پیش کیا ہے وہ اس قسم کے رسوم کو برداشت نہیں کرتا۔ اس نے سجدے کی ہر قسم کو چاہے وہ سجدۂ عبادت ہو یا سجدۂ خلافت۔ اللہ کے لیے خاص کر دیا ہے اور سب سے اس کی نفی کر دی۔ نفی اور اثبات میں توحیدِ عبادت کا یہ تصور اس قدر کامل اور بے لچک ہے کہ اس کی کوئی نظیر ملنی ناممکن ہے۔

فرشتوں کے حضرت آدم علیہ السلام کو اور برادرانِ یوسف کا حضرت یوسف علیہ السلام کو سجدۂ خلافت کا بے شک قرآن میں تذکرہ ہے لیکن یہ محض ایک گزشتہ واقعے کی ایک حکایت ہے۔ یہ اسلامی احکام کی تشریع نہیں ہے۔ یہاں بھی حضرت نانوتویؒ نے جو بیش قیمت رہنمائی فرمائی ہے اس سے چشم پوشی کرنا بے انصافی ہے۔

جیسے فرشتوں کے حضرت آدم علیہ السلام کو سجدے میں کمالِ معرفت کے لیے شرک ایک آہنی دیوار ہے۔ ایسے ہی برادران و والدینِ یوسف میں کمالِ نبوت شرک کے وسوسے سے مانع ہے۔ کمالِ معرفت اور کمالِ نبوّت ہونے ہوئے ان ہستیوں کے بارے میں شرک کا خیال بھی نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن چونکہ بعد میں نہ فرشتوں جیسی معرفت کا کمال اور حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کے آخری نبی ہونے کی وجہ سے نبوّت کا کمال متصور نہیں ہے اس لیے سجدے کی ہر نوع حرام اور سرمایۂ شرک ہے۔

اسلامی شریعت میں دونوں سجدے اللہ کے سوا کسی کے لیے حرام ہیں۔ سجدۂ عبادت

ہو یا سجدۂ خلافت ۔ لیکن دونوں میں ایک باریک قانونی فرق ہے ۔ سجدۂ عبادت کفر ہے اور سجدۂ خلافت حرام ہے ۔ یا یوں کہہ لیجئے کہ سجدۂ عبادت شرک اعتقادی ہے اور سجدۂ خلافت شرک عملی ہے ۔ اور یا حافظ ابن القیمؒ کی زبان میں اس طرح تعبیر کر دیجئے کہ سجدۂ عبادت شرک اکبر ہے اور سجدۂ خلافت شرک اصغر ہے ۔

حافظ ابن القیمؒ نے مدارج میں اما الشرك الاصغر کے عنوان کے تحت جہاں مشرکانہ فہرست میں غیر خدا کی قسم، جو اللہ اور تو چاہے، اللہ اور تمہاری مہربانی، میرا تو تمہارے اور اللہ کے سوا کوئی نہیں، جیسی تعبیرات کو شمار کیا ہے وہاں یہ بھی لکھا ہے کہ و من انواع الشرك سجود المريد للشيخ ۔ الغرض یہ شرک ہے اور اسلامی قانون میں حرام ہے اور اس کا ارتکاب ایک سنگین جرم ہے ۔

۸۳ ۔ مگر ابلیس ۔ اس کے لفظی معنے یاس زدہ ہیں ۔ قرآن میں مصدر ابلاس مختلف موقعوں پر اسی مفہوم میں آیا ہے ۔ ابلیس فرشتہ نہیں جیسا کہ یہودیوں اور عیسائیوں کے تتبع میں ایک خیال پھیل گیا ہے بلکہ جنات سے تھا جیسا کہ قرآن حکیم میں تصریح ہے كَانَ مِنَ الْجِنِّ ۔ نور کا بنا ہوا یہ فرشتہ نہیں جو نافرمانی پر قادر ہی نہیں ہے بلکہ آگ کا بنا ہوا جن تھا ۔ خود قرآن میں اس کا اقرار ہے خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ ۔ اور جنات کے بارے میں اللہ سبحانہ نے یہ فرمایا کہ جنات کی تخلیق آگ سے ہوئی ہے وَ خَلَقَ الْجَآنَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ ۔ ان صریح نصوص کے مقابلے میں کسی کی بات قابلِ اعتنا نہیں ہے [1]

لفظی ترجمہ تو انتہائی مایوس ہے لیکن اصطلاح میں وہ جن ہے جس نے اللہ کے حکم کی نافرمانی کر کے آدم علیہ السلام اور بنی آدم کے لیے مسخر ہونے سے انکار کر دیا ۔ اور اللہ سے قیامت تک کے لیے مہلت مانگی کہ اسے نسلِ انسانی کو بہکانے اور گمراہی کی طرف ترغیب دینے کا موقعہ دیا جائے ۔ اسی کو الشیطان بھی کہا جاتا ہے ۔ درحقیقت شیطان و ابلیس محض کسی مجرد قوت کا نام نہیں وہ انسان کی طرح ایک صاحب تشخص ہستی ہے [2]

بالفاظ دیگر جب تک وہ انکار کرتا ہے ابلیس ہے اور جب دوسروں کو ورغلاتا ہے تو شیطان ہے ۔ بلحاظِ لغت یہی درست ہے کیونکہ ابلیس وہ ہے جو رحمتِ الٰہی سے

---

[1] تفسیر ماجدی ص ۱۷، [2] تفہیم القرآن ص ۶۵

وَقُلْنَا يَآدَمُ اسْكُنْ أَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا ۖ وَلَا تَقْرَبَا هَٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُونَا مِنَ الظَّالِمِينَ ﴿٣٥﴾

اور ہم نے کہا کہ اے آدم تُو اور تیری بیوی دونوں جنت میں رہو اور جہاں سے چاہو بافراغت کھاؤ (لیکن دیکھو) اس درخت کے قریب نہ جانا (اگر جاؤ گے تو) ان لوگوں میں سے ہو جاؤ گے جو نقصان اُٹھانے والے ہیں۔

مایوس ہے اور شیطان وہ ہے جو دوسروں کو رحمتِ الٰہی سے دُور کرتا ہے۔ جس طرح ملائکہ کو محض قوائے عالم یا قولئے روحانیت بتانا غلط ہے ایسے ہی ابلیس اور اس کی ذریت کو محض انسانی یا قوتِ وہمیہ قرار دینا غلط ہے۔

۸۴۔ وہ منکروں میں سے تھا۔ اس کا ترجمہ کئی طرح کیا گیا ہے۔ ایک یہ کہ وہ کافروں میں سے ہو گیا۔ دوسرے یہ کہ وہ نافرمانوں میں شامل ہو گیا۔ جو لوگ تھا سے ترجمہ کرتے ہیں ان کا مطلب یہ ہے کہ علمِ الٰہی میں پہلے ہی کافر تھا۔ اوروں کو اگرچہ اس کا علم اب ہوا۔ یا یوں کہو کہ اب کافر ہو گیا اس وجہ سے کہ حکمِ الٰہی کا بوجہ تکبّر انکار کیا اور حکمِ الٰہی کو خلافِ مصلحت اور حکمت سمجھا یہ نہیں کہ فقط سجدہ نہیں کیا۔[1]

اور ہو گیا کا یہ مطلب بھی بتایا ہے کہ نافرمانی نے کافروں میں داخل کر دیا۔ یہ معنے نہیں کہ وہ پہلے کافروں میں سے تھا۔ جن مترجمین نے کان کو تھا کے معنے میں لیا ہے انہوں نے فی علم اللہ محذوف مانا ہے۔ ابلیس پر کفر کا اطلاق حکم کے ردّ و انکار کی بنا پر ہوا محض ترکِ عمل کی بنا پر نہیں۔ ترک چاہے کیسا ہی گناہ ہو ایمان سے خارج کر دینے اور کفر تک پہنچا دینے کے لیے اہل السنت کے نزدیک کافی نہیں ہے[2]

نیز اس تعبیر سے کہ وہ منکروں میں سے تھا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غالباً ابلیس سجدہ سے انکار کرنے میں اکیلا نہ تھا بلکہ جنّوں کی ایک جماعت نافرمانی پر آمادہ ہو گئی تھی اور ابلیس

---

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۸ [2] تفسیر ماجدی ص ۱۷

کا نام صرف اس لیے لیا گیا کہ وہ ان کا سردار اور اس بغاوت میں پیش پیش تھا۔[1]

ذمہ داری کی نمائش

اس سے پہلی آیت میں حضرت آدم علیہ السلام کے لیے فرشتوں کی وفاداری کا ذکر تھا۔
اس آیت میں اللہ سبحانہٗ نے حضرت آدم علیہ السلام کی تکلیفی ذمہ داریوں کا عملی مظاہرہ بتایا ہے اور یہ مظاہرہ بھی ایک امتحان کے ذریعے ہوا۔ انسان دُنیا میں اس لیے آیا ہے کہ ایک ذمہ دار اخلاقی وجود کی حیثیت سے ان ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو جو اس کے مالک کی جانب سے اس پر عبد ہونے کی حیثیت میں ڈالی گئی ہے۔ ذمہ داری کے اسی بوجھ کا نام قرآن کی زبان میں امانت ہے۔ امانت کا حاصل یہ ہے کہ انسان اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں یہاں آزاد نہیں ہے بلکہ اس پر اللہ سبحانہٗ کی جانب سے اوامر اور نواہی کی ذمہ داری ڈالی گئی ہے۔ طاعت کی صورت میں جزا اور معصیت کی صورت میں اس کے لیے سزا ہے.... ان ذمہ داریوں کی پابجائی میں عملی زندگی کی تشکیل کا نام عبادت ہے۔ انسان کو اللہ سبحانہٗ نے جو مزاج عطا فرمایا ہے اور جن صلاحیتوں سے مالا مال کیا ہے اس کی تکمیل چونکہ اس کے بغیر ممکن نہ تھی اس لیے سب سے پہلے اسی کے مظاہرے کے لیے جنت کا مقام تجویز ہوا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ
حضرت آدم علیہ السلام کی ذات ایک ایسی حقیقت جامعہ ہے جو جسم و رُوح دونوں کے ساتھ رابطہ رکھتی ہے اور ساتھ ہی عقلی قوتوں کے ساتھ دو مثبت و منفی طاقتوں کا سرچشمہ ہے۔ جو مزاج ان مختلف قوتوں سے مل کر بنا ہے وہ ہی عملی زندگی میں امانت کی ذمہ داریوں کو پورا کر کے فرائضِ خلافت انجام دے سکتا ہے اور زمینی کائنات کے حقائق معلوم کر سکتا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ خلافت کے کاروبار کے وجود میں آنے سے پہلے کوئی ایسی تجربہ گاہ ہو۔ جہاں حضرت آدم علیہ السلام کو اپنی قوتوں کو ظاہر کرنے کا موقعہ ملے تاکہ خلافت سے پہلے آدم علیہ السلام کی صلاحیتیں قوت سے نکل کر فعلیت کا لباس پہن لیں۔ گویا اب تک جو کچھ نظریہ تھا اب اسی نظریہ کے مطابق پہلا عملی نمونہ ہے

[1] تفہیم القرآن ص ۶۶

۸۶ ۔ لفظی معنے ہر اس باغ کے ہیں جس کے درخت زمین کو چھپالیں ۔ اصطلاحِ شریعت میں وہ باغ مراد ہے جو بے شمار نعمتیں لیے ہوئے عالمِ آخرت میں نیکو کاروں کے لیے ہے اور آج منظروں سے پوشیدہ ہے ۔ آیت میں اَنتَ تو مخاطب سے معلوم ہوتا ہے کہ اصلی مخاطب آدم علیہ السلام تھے حضرت حوار علیہا السلام کی حیثیت تابع کی سی ہے ۔[1]

حضرت آدم علیہ السلام کو جس جنّت میں رہنے کے لیے کہا گیا ہے وہ جنّت کون سی ہے ؟ جنّت الماوٰی جو بعد قیامِ قیامت اہلِ ایمان کا مستقر ہے ۔ یا جنّتِ ارضی جو اسی سرزمین میں کسی بلند پُر فضا مقام پر حضرت آدم علیہ السلام کی حکومت کے لیے بنائی گئی تھی ۔ جمہور علمار اسلام کا مسلک یہ ہے کہ یہ جنّت الماوٰی ہی تھی جس کا وعدہ آخرت میں مسلمانوں سے کیا گیا ہے وہ کہتے ہیں کہ آیات و احادیث کا ظاہر یہی چاہتا ہے ۔ اس آیت میں الجنۃ الف لام کے ساتھ لانا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ اُسی مشہور جنّت کا ذکر ہے جس کو جگہ جگہ قرآن میں قیامِ قیامت کے بعد اہلِ ایمان کا وطن بتایا ہے ۔ ورنہ اگر کسی نئے مقام کا تذکرہ ہوتا تو پہلے اس کا تعارف ہوتا پھر جانی پہچانی چیز بنا کر الجنۃ کہا جاتا ۔ قرآن میں آگے اس جنت سے نکلنے کا حکم ہے اور نکلنے کے لیے ہبوط، اترنا، بولا گیا ہے ۔ ہبوط بلندی سے پستی کی طرف ہوتا ہے اس لیے یہ جنّتِ ارضی نہیں ہو سکتی بلکہ جنّتِ ماوٰی ہے ــــ صحیح مسلم میں ایک طویل حدیث ہے جس میں یہ جُملہ موجود ہے ۔

اللہ تعالیٰ لوگوں کو جمع کرے گا ، اہلِ ایمان کھڑے ہوں گے ۔ جنّت ان کے قریب ہوگی وہ حضرت آدم علیہ السلام کے پاس آئیں گے اور کہیں گے اے ہمارے باپ ہمارے لیے جنّت کو کھولیے ۔ اس پر حضرت آدم علیہ السلام فرمائیں گے کیا جنّت سے تم کو تمہارے باپ کی خطا کاری نے ہی نہیں نکالا ہے ؟ اس کے برعکس علما کی ایک جماعت کہتی ہے کہ یہ جنّت دُنیا ہی کے مقامات میں سے کسی مقام پر تھی ۔ جنّۃ الماوٰی نہ تھی ۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ آیاتِ قرآنی بتاتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آدم و حوار کو وہاں کھانے پینے کا مکلّف بنایا ۔ آدم علیہ السلام وہاں خوابِ استراحت میں رہتے تھے ۔ وہاں ابلیس بھی جاتا تھا اور اس نے حضرت آدم علیہ السلام کو بہکایا اور پھر سب وہاں سے نکالے گئے ۔ یہ تمام وہ حالات ہیں جو دُنیا کے ساتھ مخصوص ہیں اور جنت الماوٰی میں ان کا وجود نہیں ہے ۔

---

[1] تفسیر ماجدی ص ۱۷

بہر حال بحث بڑی طویل ہے۔ حافظ ابن القیمؒ نے حادی الارواح میں اور حافظ ابن کثیرؒ نے البدایہ والنہایہ میں اس پر مبسوط بحث فرمائی ہے۔ امام ابو منصور ماتریدیؒ اپنی تاویلات میں رقم طراز ہیں کہ:
ہمارا اعتقاد ہے کہ یہ ان باغوں میں سے کوئی باغ ہے جس میں آدم اور حواء رہتے تھے۔ ہم نہ اس کی تعیین کرتے ہیں اور نہ اس کے مقام کی جستجو کرتے ہیں۔ سلف کا یہی مذہب ہے۔ اہل السنت میں سے جن لوگوں نے اس کی تعیین کی کھوج لگائی ہے ان کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے۔
بلکہ کچھ بزرگوں نے تو امام ابو حنیفہؒ کو بھی ان میں شمار کیا ہے جو اس جنت کے جنتِ ارضی ہونے کے قائل ہیں۔ اور خود تاویلات اہلِ السنت کے مشہور مصنف ابو منصور ماتریدیؒ کا بھی میلان اسی طرف ہے اس لیے راہ صواب یہی ہے کہ اس معاملہ میں توقف کیا جائے اور سکوت کرکے معاملہ کو خدا کے سپرد کر دینا چاہیے۔
آیت میں اسکن فرمایا ہے اس کے معنے ہیں رہو تم۔ یہ نہیں فرمایا کہ داخل ہو جاؤ یا چڑھ جاؤ۔ اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ تخلیق، تعلیم، فرشتوں سے مقابلہ اور آدم علیہ السلام کو فرشتوں کا سجدہ، یہ سارے کوائف اسی الجنۃ میں یا اس کے قریب پیش آئے ہیں۔
۸۷ ۔ با فراغت رَغَدًا کا ترجمہ ہے اس کے معنے وسیع، اچھی طرح ــــ یہ اصل میں مصدر ہے بمعنے بہت نعمت ہونا۔ اور صفت مشبہ ہو کر استعمال ہوتا ہے نیز راغد کی جمع بھی ہے جیسے خدّام خادم کی۔ آیت کلا منہا رغدا حیث شئتما اور کھاتے پھرو اس میں سے جہاں سے چاہو محظوظ ہو کر ــــ میں رغداً بمعنے صفت بھی ہو سکتا ہے اور جمع بھی۔[1]
اس آیت میں دو امر آئے ہیں ایک کا تعلق رہائش سے اور دوسرے کا خوراک سے ہے۔ اور رہائش بھی انفرادی نہیں بیوی کے ساتھ ہے اور خوراک کا بھی کوئی پیمانہ مقرر نہیں بلکہ ان دو رخصتوں کے ساتھ ہے کہ با فراغت کھاؤ اور جہاں سے چاہو کھاؤ۔ اجتماعی رہائش سے لباس کی طرف بھی اشارہ ہے جیسا کہ آپ آٹھویں پارے میں پڑھیں گے۔ گویا رہنے کے لیے مکان، پہننے کے لیے کپڑا، کھانے کے لیے خوراک اور رفاقت کے لیے بیوی زندگی کے بنیادی تقاضے ہیں۔ ان ہی تقاضوں کے جھمیلے میں انسان کو یہ کہا گیا ہے کہ لا تقربا ھذہ الشجرہ۔
۸۸ ۔ اس درخت کے قریب نہ جانا۔ دونوں سے کہا گیا ہے۔ لوگ یہاں معنے یہی کرتے ہیں کہ نزدیک

---

[1] لغات القرآن ج ۳ ص ۹۰

نہ ہو تم یعنی اس کو نہ کھانا۔ جب کسی کام سے روکتے ہیں تو اس کام تک پہنچنے کے وسائل پر بھی پابندی لگانے کے لیے یہ تعبیر اختیار کرتے ہیں۔ اور کچھ اربابِ معانی کا خیال ہے کہ یہ تعبیر ایسے موقعہ پر زور پیدا کرنے کے لیے اختیار کی جاتی ہے جہاں روکے گئے میں پڑ جانے کا اندیشہ قوی ہو۔ گویا واؤ کے ذریعے اس فقرے کو پہلے فقرے کے ساتھ جوڑ کر پہلے ہی اشارہ فرما دیا کہ اگر ایسا واقعہ ہو گیا کہ تم نے اس ممانعت کو اپنے عمل سے توڑ دیا تو اس کے نتیجے میں تمہیں جنت کی رہائش، اس کی پوشاک سے محروم ہونا پڑے گا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زمین یعنی جائے تقرر پر خلیفہ کی حیثیت سے بھیجے جانے سے پہلے ان کو امتحان کی غرض سے جنت میں رکھا گیا تھا تاکہ ان کے رجحانات کی آزمائش ہو جائے۔ اس آزمائش کے لیے ایک درخت کو چن لیا گیا اور حکم دیا گیا کہ اس کے قریب نہ پھٹکنا۔ اور اس کا انجام بھی بتا دیا گیا۔ اس امتحان کے لیے جنت ہی کا مقام سب سے موزوں تھا۔ دراصل اسے امتحان گاہ بنانے کا مقصود یہ حقیقت انسان کے ذہن نشین کرنی تھی کہ تمہارے لیے تمہارے مرتبہ انسانیت کے لحاظ سے جنت ہی لائق و مناسب مقام ہے۔ لیکن شیطانی ترغیبات کے مقابلے میں اگر تم اللہ سبحانہٗ کی فرمانبرداری کے راستہ سے منحرف ہو جاؤ گے تو جس طرح ابتدا میں اس سے محروم ہو گئے ہو اسی طرح آخر میں بھی محروم رہو گے۔[1]

جس درخت کے قریب جانے سے روکا گیا ہے یہ کونسا درخت ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ درخت جنت کے درختوں میں سے کوئی متعین اور حضرت آدم علیہ السلام کے لیے معلوم و معروف درخت تھا لیکن اب اس کی تعیین سے کوئی نتیجہ نہ تھا۔ اس لیے قرآن حکیم جو کبھی بے نتیجہ بات نہیں کہتا اس کی تعیین سے خاموش ہے اور حدیث صحیح میں بھی اس موضوع پر کچھ نہیں آیا ہے۔ اس لیے محققین کا مسلک بھی اس باب میں خاموشی ہے۔[2] مشہور ہے کہ درخت گیہوں کا تھا یا بقول بعض انگور، انجیر وغیرہ واللہ اعلم۔[3]

۸۹ ۔ ان لوگوں میں سے ہو جاؤ گے جو نقصان اٹھانے والے ہیں۔ ظلم کے معنے نقصان، ستم، بے انصافی، زبردستی، گناہ، تقصیر ــــ اصل معنے غیر کی ملک میں تصرف کرنا اور حد سے گزر جانا۔ اسی لیے علماء نے تصریح کی ہے کہ ظلم کا صدور ذاتِ باری سے محال ہے کیونکہ کائنات تمام تر اسی کی

---

[1] تفہیم القرآن ص ۶۶ [2] تفسیر ماجدی ص ۱۷ [3] حاشیہ شیخ الہندؒ

ملکیت ہے۔ لہٰذا وہ اپنی ملک میں جو بھی کرے بجا ہی بجا ہے۔ امام راغبؒ فرماتے ہیں کہ اہلِ لغت اور بہت سے علماء کے نزدیک ظلم کہتے ہیں۔ کسی چیز کو اس کی مخصوص جگہ سے ہٹا کر نقصان کے ساتھ یا زیادتی کے ساتھ یا وقت بدل کر یا جگہ بدل کر بے محل رکھ دینے کو۔ اسی سے عربی کا محاورہ ہے ظلمت السقاء میں نے مشکیزے کے دودھ کو بے وقت استعمال کیا۔ اور یہ استعمال شدہ دودھ ظلیم کہلاتا ہے۔ اسی طرح ظلمت الارض کے معنے ہیں میں نے زمین کو ایسی جگہ سے کھودا جہاں کھودنے کی جگہ نہ تھی۔ وہ جگہ مظلوم کہلاتی ہے اور جو مٹی نکلی ہے اس کو بھی ظلیم کہتے ہیں۔ یہاں ظلم کے معنے نقصان اٹھانا ہیں۔ اللہ کی نافرمانی سے بڑھ کر کونسا ظلم اپنے آپ پر ہوگا۔ اس تصریح سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ جنت کی حیثیت اس وقت تک دار الجزا یا دار الخلد کی نہ تھی جیسا کہ اب ہے بلکہ اس وقت وہاں تکلیفاتِ شرعیہ تھیں، اوامر اور نواہی تھے اور جب جنت کی ماہیت اس وقت یہ تھی تو کوئی اشکال نہیں رہتا[1]

ظالم کا لفظ نہایت معنے خیز ہے۔ ظالم وہ ہے جو کسی کا حق تلف کرے، جو شخص اللہ سبحانہ کی نافرمانی کرتا ہے وہ درحقیقت تین بڑے بنیادی حقوق تلف کرتا ہے۔ اولاً خدا کا حق کیونکہ وہ اس کا مستحق ہے کہ اس کی فرمانبرداری کی جائے۔ ثانیاً ان تمام چیزوں کے حقوق جن کو اس نے اس نافرمانی کے ارتکاب میں استعمال کیا۔ اس کے اعضائے جسمانی، اس کے قوائے نفس، اس کے ہم معاشرت انسان، وہ فرشتے جو اس کے ارادے کی تکمیل کا انتظام کرتے ہیں اور وہ اشیاء جو اس کام میں استعمال ہوتی ہیں ان سب کا اس پر حق یہ تھا کہ وہ صرف ان کے مالک ہی کی مرضی کے مطابق ان پر اپنے اختیارات استعمال کرے۔ مگر جب اس کی مرضی کے خلاف اس نے ان پر اختیارات استعمال کیے تو درحقیقت ان پر ظلم کیا۔ ثالثاً خود اپنا حق کیونکہ اس پر اس کی ذات کا یہ حق ہے کہ وہ اسے تباہی سے بچائے مگر نافرمانی کرکے جب وہ اپنے کو اللہ کی سزا کا مستحق بناتا ہے تو دراصل اپنی ذات پر ظلم کرتا ہے۔ ان ہی وجوہ سے قرآن میں جگہ جگہ گناہ کے لیے ظلم اور گنہگار کے لیے ظالم کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے[2]

آیت میں حضرت آدم علیہ السلام کے ساتھ ان کی اہلیہ کا ذکر ہے یعنی حضرت حوا علیہا السلام۔ ان کی تخلیق پر بحث آپ کو انشاء اللہ سورۂ نساء میں ملے گی۔

---

[1] تفسیر ماجدی ص ۱۷ [2] تفہیم القرآن ج ۱ ص ۶۰

فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ ۪ وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ۝

پھر شیطان کی وسوسہ اندازی نے اس درخت کے ذریعے ان دونوں کے قدموں میں لغزش[90] پیدا کر ڈالی۔ اور اس لغزش کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان دونوں کو اس زندگی سے نکال ڈالا[91] جس میں وہ بس رہے تھے۔ اور ہم نے حکم دیا کہ تم یہاں سے اُتر جاؤ تم ایک دوسرے کے دُشمن ہو[92]۔ اور اب تمہارے لیے زمین میں ٹھہرنا ہے اور وہیں ایک خاص وقت تک گزر بسر کرنا ہے[93]۔

امتحان کی اصل غرض یہ تھی کہ حضرت آدم علیہ السلام شیطان کی ترغیبات کے مقابلے میں کس حد تک حکم کی پیروی کرتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے جنت میں درخت منتخب کیا گیا۔ اس لیے درخت کے نام اور اس کی خاصیت کا کوئی ذکر نہیں فرمایا۔ حضرت شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ انسان کی اصل فطرت تو نیکی ہے لیکن اصل فطرت کی راہ میں جب رکاوٹیں آجاتی ہیں تو انسان نافرمانی کر گزرتا ہے اور یہ رکاوٹیں تین قسم کی ہیں، طبعی، رسمی اور بے خبری۔ طبعی رکاوٹ یہ ہے کہ آدمی کی طبیعت کی افتاد غلط ہو۔ خواہشوں، ولولوں اور چاہتوں کا رُخ غلط ہو جائے، جذبات میں بہہ جائے۔ علمی قوتیں طبعی تقاضوں کے سامنے بے دست و پا ہو جائیں۔ اسی کو نفس کہتے ہیں۔

رسمی رکاوٹ یہ ہے کہ ماحول غلط ہو، گرد و پیش میں گاڑی ایسی چل رہی ہو اور حالات کا دھارا ایسا ہو کہ اس میں آدمی کی فطرت دب کر رہ جائے۔

بے خبری یہ کہ آدمی کو پتہ ہی نہ ہو۔ اور یہ تینوں رکاوٹیں صرف شیطنت کے زیر سایہ پروان چڑھتی ہیں۔ فقط ماحول اور بُری صحبت کا جال شیطان کے جالوں میں سب سے سنگین ہے اور جب یہ دام ہمرنگ زمین بن کر آئے اور زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔

۹۰ ۔ شیطان وہ ہے جو خیر اور رحمتِ الٰہی سے دُور ہو۔ ابلیس کا ذکر اُوپر آچکا ہے۔

اب یہاں اسے اس کے وصفی نام سے یاد کیا جارہا ہے۔ نافرمانی کی پاداش میں وہ جنت سے نکالا جاچکا ہے۔ اب اس کا نام شیطان ہے۔ اس کے پاس انسان کو مجبور کرنے کی کوئی طاقت نہیں ہے البتہ وہ پروپیگنڈے کے فن کا امام ہے۔ ترغیب خوب دے سکتا ہے سیاہ کو سفید کرکے خوب دکھا سکتا ہے اور وسوسہ اندازی کی طاقت غضب کی رکھتا ہے۔ نزدیک اور دُور اپنا عمل سب جگہ سے کرسکتا ہے فاصلہ اس کے لیے کوئی معنے نہیں رکھتا اور مادی رکاوٹیں اس کی راہ میں حاصل نہیں ہوسکتی ہیں۔[1]

اس مقام پر ازلال بولا گیا ہے اس کے معنے ہیں بغاوت، سرکشی یا ارادی نافرمانی کا کوئی مفہوم نہیں۔ اس کے معنے ڈگمگا دینے، پھسلا دینے اور ہٹا دینے کے ہیں۔

زلت کیا ہے؟ یہ ایسی حالت پر بولا جاتا ہے کہ جہاں نہ عمل اور کردار میں تمرد ہو اور نہ ارادی طور پر حکم کی خلاف ورزی ہو اور ساتھ ہی وہ عمل اپنی حقیقت اور ماہیت کے اعتبار سے قبیح نہ ہو۔ ان تمام امور کے پیشِ نظر وہ اپنی ذات میں اباحت اور جواز کا درجہ رکھتا ہو مگر کرنے والے کی ہستی کے شایانِ شان نہ ہو بلکہ اس کا اس طرح کرنا خدائے تعالیٰ کی مرضی کے خلاف ہو۔ لیکن نبی پر چونکہ اللہ تعالیٰ کی مستقل حفاظت و نگرانی ہوتی ہے اس لیے فوراً ہی اسے متنبہ کردیا جاتا ہے کہ یہ عمل تمہاری جلالتِ قدر اور عظمتِ مرتبہ کے شایانِ شان نہیں ہے۔

اس حقیقت کے واضح ہوجانے کے بعد اب اس واقعہ پر نظر ڈالیے تو آپ معلوم کریں گے کہ اس واقعہ کے اظہار کے لیے ایسی تعبیر اختیار کی گئی جس میں حضرت آدم علیہ السلام کی لغزش کو نہیں بلکہ شیطان کے ازلال کو واضح کیا اور بتا دیا کہ حضرت آدم علیہ السلام کی یہ غلطی نہ گناہ تھی اور نہ نافرمانی بلکہ معمولی قسم کی لغزش بنی تھی۔ اس پر تفصیلی بحث انشاء اللہ سورۂ طٰہٰ میں آئے گی۔ یہاں صرف اتنا سمجھ لیجئے کہ حضرت آدم علیہ السلام نے کسی قسم کا کوئی گناہ نہیں کیا اور جس حد تک معاملہ پیش آیا اس میں ان کے قصد وارادے کے خلاف ورزی کا کوئی دخل نہیں ہے۔ بلکہ وہ ایک وسوسہ تھا جو لغزش کی شکل میں ان سے صادر ہوگیا اور وہ بھی بھول چوک کے ساتھ۔ اور وہ اس طرح ہوئی ہے کہ خدا تعالیٰ کی جنت میں دائمی زندگی کا ان کو فریب دیا گیا اور اس کی توثیق و تصدیق کے لیے خدا تعالیٰ کا نام لے کر ان کے سامنے قسم کھائی۔ پھر جس طرح ہر شخص اپنی کسی انتہائی کامیابی اور بے نہایت فوز و فلاح کے تصورات، تمناؤں میں پڑ کر دوسری

---

[1] تفسیر ماجدی ص ۱۷

جانب سے ذہول میں پڑ جایا کرتا ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام کو قربِ ایزدی کی تمناؤں پر شیطان کی قسموں کے سامنے یہ خیال نہ رہا کہ مجھ سے کیا کہا گیا تھا بس اس فریب میں آکر پوری فراموشی کے عالم میں ان سے خلاف ورزی کا ارتکاب ہو گیا۔ قرآن کریم نے اسے ضرور عصیان کہا ہے لیکن اس کی تشریح جو خود اس نے بیان کی ہے اس کے بعد کسی انسان کو ایک لمحہ کے لیے بھی اس پر معصیت کا لفظ بولنے کا حق نہیں رہتا یعنی یہاں معاملہ کی نوعیت ہی اتنی نازک ہو گئی تھی کہ اس کے سامنے کسی فرد سے صبر و تحمل کرنا مشکل تھا۔

۹۱ ۔ کہتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حوا علیہا السلام جنت میں رہنے لگے اور شیطان کو اس کی عزت کی جگہ سے نکال دیا شیطان کو اور حسد بڑھا بالآخر مور اور سانپ سے مل کر بہشت میں گیا اور حضرت حوا علیہا السلام کو طرح طرح سے ایسا پھسلایا اور بہکایا کہ انہوں نے وہ درخت کھالیا اور حضرت آدم علیہ السلام کو بھی کھلایا اور اُن کو یقین دلا دیا تھا کہ اس کے کھانے سے اللہ سبحانہٗ کے ہمیشہ کو مقرب ہو جاؤ گے اور حق تعالیٰ نے جو ممانعت فرمائی ہے اس کی توجیہہ گھڑ دی[1]

یعنی شیطان نے دھوکا اور لغزش کے ذریعے حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حوا علیہا السلام کو ان نعمتوں سے نکال دیا جن میں وہ آرام سے گذر بسر کر رہے تھے۔ یہ نکالنا اگرچہ بحکمِ خداوندی ہوا مگر سبب اس کا شیطان تھا، اس لیے نکالنے کی نسبت اس کی طرف کر دی گئی[2]

اتر جانے کے حکم سے معلوم ہوا کہ یہ جنت زمین کے کسی حصہ پر نہیں آسمان پر تھی۔ قول محقق یہی ہے اور اتر جانے کے حکم کا تقاضا بھی یہی ہے جب تک اور کوئی قرینہ نہ ہو۔ ہبوط کے معنے بلندی سے پستی میں اترنے ہی کے لیے جائیں گے[3]

اگر جنت سے مراد دُنیا کا کوئی باغ ہوتا تو یہ کوئی اتنی اہم بات نہ تھی جس کا تذکرہ قرآن میں آتا۔ پھر جب وہیں ان کی صورت بنی تو یقیناً وہیں ان کی سکونت بھی ہو گی اور اسی وقت جنت کو حضرت آدم علیہ السلام کی وراثت کہنا بھی صحیح ہو سکتا ہے۔ قرآن کریم کی کسی آیت سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ کوئی دُنیا کا باغ تھا۔ حضرت آدم علیہ السلام کی سرگزشت مختلف مقامات پر ذکر کی گئی ہے مگر کسی مقام پر بھی اس کی طرف اشارہ نہیں کیا گیا۔

---

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ [2] معارف القرآن ج ۱ ص ۱۳۵ [3] تفسیر ماجدی ص ۱۸

یہ شبہ نہ کیا جائے کہ دو آدمیوں کے اتر جانے کو جمع کے ساتھ کیوں تعبیر کیا؟ اس لیے کہ حضرت آدم و حوا علیہما السلام کے ساتھ ان کی آئندہ ہونے والی اولاد کو بھی شامل کر لیا گیا۔ ان دونوں کو نیچے اتر جانے کا حکم دینا گویا پوری نوعِ انسان کو نیچے اترنے کا حکم دینا ہے۔

۹۲ ۔ اس کی سزا میں حضرت آدم و حوا علیہما السلام اور جو اولاد پیدا ہونے والی تھی سب کی نسبت حکم ہوا کہ جنت سے زمین پر جا کر رہو۔ باہم ایک دوسرے کے دشمن ہو گے جس کی وجہ سے تکلیفیں پیش آئیں گی۔ جنت دار العصیان اور دار العداوت نہیں ہے۔ ان امور کے مناسب دار دُنیا ہے جو تمہارے امتحان کے لیے بنایا گیا ہے [۱]

بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ تم ایک دوسرے کے دشمن ہو۔ یہ مختصر لفظوں میں کل زمینی زندگی کا نقشہ ہے یعنی یہاں کشمکش، بغض، حسد، نفسانیت، خود غرضی کا دور رہا کریگا۔ [۲]

اس حکم کے مخاطب حضرت آدم و حوا علیہما السلام ہیں۔ اور اگر شیطان کو اس وقت تک آسمانوں سے باہر نہیں کیا گیا تھا تو وہ بھی اس خطاب میں شامل ہے۔ اس صورت میں باہم عداوت ہونے کا مطلب یہ ہوگا کہ شیطان کے ساتھ تمہاری عداوت کا سلسلہ دنیا میں بھی جاری رہے گا اور اگر اس واقعہ کے رونما ہونے سے پہلے ہی شیطان جنت بدر ہو چکا تھا تو پھر اس کے مخاطب حضرت آدم و حوا علیہما السلام ہوں گے۔ ان کو بطورِ عتاب یہ جتلایا گیا ہے کہ ایک سزا تو یہ ہے کہ جنت سے زمین پر اتارا گیا۔ دوسری سزا اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ اولاد میں باہم عداوت ہو گی اور ظاہر ہے کہ اولاد میں باہم عداوت ہونے سے والدین کی زندگی کا مزا کرکرا ہو کر رہ جاتا ہے۔ یہ بھی ایک قسم کی معنوی اور روحانی سزا ہے [۳]

زیادہ قرینِ قیاس یہی ہے کہ مخاطب حضرت آدم و حوا علیہما السلام ہیں۔ کیونکہ قرآن میں دوسرے موقعہ پر اس کے لیے تثنیہ کا صیغہ آیا ہے قلنا اهبطا منها جميعاً۔

اگر پہلی بات ہو یعنی آدم اور شیطان سے یہ کہا گیا ہے کہ انسان کا دشمن شیطان اور شیطان کا دشمن انسان ہے تو شیطان کا دشمنِ انسان ہونا تو ظاہر ہے کہ وہ اسے اللہ سبحانہٗ کی فرمانبرداری کے راستہ سے ہٹانے اور تباہی میں ڈالنے کی کوشش کرتا ہے۔ رہا انسان کا دشمنِ شیطان ہونا تو فی الواقع انسانیت تو اس سے دشمنی کی مقتضی ہے مگر خواہشاتِ نفس کے لیے جو ترغیبات

---

[۱] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۹ [۲] تفسیر ماجدی ص ۱۸ [۳] معارف القرآن م ش ص ۶۴

وہ پیش کرتا ہے ان سے دھوکہ کھا کر آدمی اسے دوست بنا لیتا ہے۔ اس طرح کی دوستی کے معنے یہ نہیں ہیں کہ فی الواقع دشمنی دوستی میں تبدیل ہو گئی بلکہ اس کے معنے یہ ہیں کہ ایک دشمن دوسرے دشمن سے شکست کھا گیا اور اس کے خیال میں پھنس گیا۔[1]

۹۳۔ تمہیں زمین میں رہنا ہے اور ایک خاص وقت تک گزر کرنا ہے یعنی دنیا میں ہمیشہ نہ رہو گے بلکہ ایک وقتِ معین تک رہو گے اور وہاں کی چیزوں سے بہرہ اندوز ہو گے اور پھر ہمارے رُوبرو پیش ہو گے اور وقتِ معین ہر شخص کی حد تک تو اس کی موت کا وقت ہے اور پورے عالم کے لیے قیامت کا۔[2]

آیت کا یہ حصہ خود اس کی دلیل ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو پہلی بار زمین پر بھیجا جا رہا ہے اور اب تک وہ جس جنت میں تھے وہ زمین پر نہیں آسمان پر تھی۔ یہاں سے ان کی زندگی کا نیا دَور شروع ہو رہا ہے۔ نئی زندگی اور نیا ماحول اور اب ان کو یہیں رہنا ہے لیکن یہاں قیام دائمی نہ ہو گا صرف ایک مقررہ وقت تک رہنا ہو گا۔ متاع اور الیٰ حین دونوں سے زمینی زندگی کا عارضی اور بے ثبات ہونا بالکل ظاہر ہو رہا ہے۔

آیت میں زمین میں رہنے کو استقرار سے تعبیر کیا ہے، یہ قرار سے بنا ہے اس کے معنی ٹھہرنا ہیں اور مستقر کے معنی ٹھہرنے کی جگہ کے ہیں یعنی وقتی اور عارضی ٹھہرنے کی جگہ۔ گویا یہ زمین انسانی زندگی کے لیے واقعی رہنے کی جگہ نہیں بلکہ اسے کچھ وقت کے لیے ٹھہرنے کی جگہ بتایا گیا ہے۔ اس کے مقابلے میں آخرت دار القرار ہے یعنی رہنے کا واقعی گھرانہ۔ اس لفظ کے ساتھ متاع اور الیٰ حین کی قید نے یہ بات کھول دی ہے کہ زمین انسانی معیشت کے لیے ہے اور اس کی نعمتوں سے انسان کو بہرہ مند ہونا ہے لیکن یہاں کی زندگی دائمی نہیں ہے۔ اس لیے حضرت آدم علیہ السلام کی زمین میں آمد نہ تو زمین کی بربادی کے لیے ہے اور نہ زمین میں ہمیشہ رہنے کے لیے ہے۔ گویا حضرت آدم علیہ السلام کا ارضِ راحت سے نکل کر ارضِ عمل میں آنا اس لیے نہیں ہے کہ اللہ سبحانہٗ ان کو تباہ کرنا چاہتا ہے اور نہ اس لیے ہوا ہے کہ اللہ سبحانہٗ ان کو زمینی نعمتوں سے محروم رکھنا چاہتا ہے اور نہ مقصد یہ ہے کہ زمین میں ہمیشہ رہنا ہے۔

پھر آمد کا مقصد کیا ہے؟ آنے والی آیات میں اسی کا تذکرہ ہے۔

---

[1] تفہیم القرآن ص ۶۵　[2] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۹

فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ۭ
اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۝

پھر آدم علیہ السلام کو اپنے رب کے الہام سے چند باتیں[۹۴] معلوم ہوگئیں (جن کے ذریعے آدم علیہ السلام نے اللہ سبحانہٗ کی بارگاہ میں معذرت پیش کردی) اللہ سبحانہٗ نے آدم علیہ السلام کی توبہ قبول فرمالی[۹۵]۔ اللہ سبحانہٗ ہی توبہ قبول کرنے والا اور مہربان ہے[۹۶]۔

حضرت آدم علیہ السلام کی توبہ

غلطی، بھول چوک اور گناہ کے بعد اگر ندامت کا احساس اندر سے جاگتا ہے تو یہ آدمیت ہے اور اگر بجائے احساسِ ندامت کے تناؤ، تمرد اور سرکشی رونما ہو تو یہ آدمیت نہیں ابلیسیت ہے۔ انسان کو اللہ سبحانہٗ کا پہلا تعارف اگرچہ صفتِ ربوبیت کے ذریعے ہوا ہے مگر ربوبیت کی اصلی روح رحمت ہے۔ اگر رحمت نہ ہوتی تو تربیت بھی نہ ہوتی بلکہ تمام جہان کی پیدائش ہی اسی رحمت کا نتیجہ ہے۔ رحمت ہی کا یہ جوش تھا کہ بلا مطالبہ، بلا استحقاق توبہ و انابت کے الفاظ اپنی جانب سے تلقین کردیے۔ اور یہاں اس سے بھی زیادہ مہربانی اور رحیمیت کا کمال یہ ہے کہ اس تعلیم کی نسبت بھی اپنی جانب نہیں فرمائی۔ یوں نہیں فرمایا کہ اللہ سبحانہٗ نے حضرت آدم علیہ السلام کو توبہ کے کلمات سکھادیے بلکہ یوں فرمایا ہے کہ آدم علیہ السلام نے سیکھ لیے۔

۹۴۔ جب حضرت آدم علیہ السلام نے حق تعالیٰ کا حکم عتاب آمیز سنا تو بحالتِ ندامت انفعال گریہ وزاری میں مصروف تھے۔ عین اس حالت میں اللہ تعالیٰ نے ان کو چند کلمات القاء اور الہام کے طور پر بتلائے جن سے ان کی توبہ قبول ہوئی۔ وہ کلمات یہ ہیں رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ[لہ]

مطلب یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو جب اپنے قصور کا احساس ہوا اور انہوں نے نافرمانی

لہ حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۹

سے پھر فرمانبرداری کی طرف رجوع کرنا چاہا اور ان کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ اپنے رب سے اپنی خطا معاف کرائیں تو انہیں وہ الفاظ نہ ملتے تھے جن کے ساتھ وہ خطا بخشی کے لیے دُعا کر سکتے۔ اللہ سبحانہٗ نے ان کے حال پر رحم فرما کر وہ الفاظ بتا دیے۔

۹۵۔ توبہ کے اصل معنے رجوع کے اور پلٹنے کے ہیں۔ بندہ کی طرف سے توبہ کے معنے یہ ہیں کہ وہ سرکشی سے باز آگیا۔ طریقِ بندگی کی طرف پلٹ آیا۔ اور خدا کی طرف سے توبہ کے معنے یہ ہیں کہ وہ اپنے شرمسار غلام کی طرف رحمت کے ساتھ متوجہ ہوگیا پھر سے نظرِ عنایت اس کی طرف مائل ہوگئی [1]

تاب علیہ۔ لفظ توبہ کے ساتھ عربی میں اگر عَلیٰ آتا ہے تو اس کے معنے ہیں رحمت کے ساتھ رجوع کیا، توجہ کی اور توبہ کی توفیق دی یا توبہ کے اسباب فراہم کر دیے۔ یہ اللہ سبحانہٗ کی صفت ہے اسی سے تَوَّابَ آتا ہے لیکن اگر اس کے ساتھ اِلیٰ کا حرف آئے تو اس کے معنے ہیں بندہ نے اللہ سبحانہٗ کی طرف توجہ کی اور توبہ کی۔ اور اگر اس کے ساتھ عَلیٰ ہو تو توبہ قبول کرنے کے معنے میں آتا ہے کہ اللہ سبحانہٗ نے حضرت آدم علیہ السلام کی توبہ قبول فرمالی۔ اور اس کی وجہ یہ بتاتی ہے کہ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ کیونکہ اللہ سبحانہٗ ہی توبہ قبول کرنے والا ہے اور رحیم ہے۔ تواب توبہ ہے کہ خطاؤں سے درگزر کرنے والا ہے لیکن صرف خطاؤں ہی سے درگزر نہیں کرتا بلکہ وہ اپنی طرف سے اور بھی مہربانی کرنے والا ہے۔

۹۶۔ آیت میں رحیم اور تواب دونوں مبالغے کے صیغے ہیں۔ ان کے ذریعے ہم دیکھ سکتے ہیں کہ قرآن نے نوعِ انسانی کے سامنے اللہ سبحانہٗ کو کس طرح پیش کیا ہے۔ ان دو صفتوں میں تفکر سے ہم اللہ سبحانہٗ کے اس کے بندوں کے ساتھ تعلقات کی نوعیت معلوم کر سکتے ہیں۔ بندوں سے اللہ تعالیٰ کا تعلق صرف غضب ناک اور سخت گیر مالک کا نہیں ہے بلکہ اس کا اپنے بندوں سے رشتہ محبت اور رحمت کا رشتہ ہے۔ فلاسفہ کو صرف عادل مالک و آقا چاہتا ہے لیکن گنہگاروں کو وہ عادل چاہتا ہے جس کے غصے پر اس کی رحمت غالب ہو۔ یہی وجہ ہے کہ معصوم موجود تھے لیکن ان کی جگہ خالی تھی جو گناہ کر کے ندامت محسوس کریں۔ رحمت چاہتی تھی کہ ان کو بخشے جن پر فردِ جرم لگ چکی ہے۔ یہ رحمت ہی ہے جس نے بندوں کے لیے توبہ و انابت کا دروازہ کھول

---

[1] تفہیم القرآن ص ۶۸

دیا ہے۔ کوئی بدعملی، کوئی گناہ، کوئی جرم، کوئی فساد ہو اور نوعیت میں کتنا ہی سخت اور مقدار میں کتنا ہی عظیم ہو۔ لیکن جونہی توبہ و انابت کا احساس انسان میں پیدا ہوتا ہے رحمتِ الٰہی قبولیت کا دروازہ کھول دیتی ہے اور اشکِ ندامت کا ایک قطرہ بدعملیوں، گناہوں کے ان گنت داغ اس طرح دھو دیتا ہے گویا اس کے دامانِ عمل پر کوئی داغ لگا ہی نہ تھا۔

یہاں حافظ ابن القیمؒ کا ایک بیان بڑا ہی رقت انگیز ہے وہ اسلامی نظام حیات میں اللہ سبحانہٗ کا اپنے بندوں سے تعلق سمجھنے میں بیحد مفید ہے۔ فرماتے ہیں:

اللہ سبحانہٗ اپنے بندوں کو کسی حال میں اپنی رحمت سے مایوس نہیں کرتا اس کا اپنے بندوں سے خطاب ہے اے بندے جب بھی تو میری طرف آئے گا میری طرف سے تیرے لیے رحمت کا دروازہ کھلا ہے۔ نافرمانوں کو اپنی رحمت سے مایوس نہیں کرتا۔ اگر وہ گناہ کر کے توبہ کرتے ہیں تو میں ان کا حبیب ہوں، میں توبہ کرنے والوں سے محبت کرتا ہوں۔ اگر وہ توبہ نہیں کرتے تو پھر میں ان کے لیے طبیب ہوں۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن میں اللہ سبحانہٗ نے جہاں کہیں گنہگاروں کو مخاطب کیا ہے یا ان کا ذکر کیا ہے تو عام طور پر اپنی طرف نسبت کر کے کہا ہے۔ مثلاً

یَاعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓی اَنْفُسِھِمْ

یا ءَاَنْتُمْ اَضْلَلْتُمْ عِبَادِیْ؟

اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے ایک باپ جوشِ محبت سے اپنے بیٹے کو پکارتا ہے تو خصوصیت کے ساتھ اپنے رشتہ پدری پر زور دیتا ہے اے میرے بیٹے! اے میرے فرزند! امام جعفر صادقؒ نے کیا خوب فرمایا ہے۔ جب ہم اپنی اولاد کو اپنی طرف نسبت دے کر مخاطب کرتے ہیں تو وہ بے خوف و خطر ہماری طرف دوڑنے لگتے ہیں کیونکہ سمجھ جاتے ہیں ہم ان پر غضبناک نہیں ہیں۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے بیس سے زیادہ موقعوں پر ہمیں عبادی کہہ کر اپنی طرف نسبت دی ہے اور سخت سے سخت گنہگار انسانوں کو بھی یا عبادی کہہ کر پکارا ہے۔ یہ اس بات کی کھلی نشانی ہے کہ گنہگاروں کو تواب و رحیم کی اتنی تلاش نہیں ہے جتنی تواب و رحیم کو گنہگاروں کی تلاش ہے

قرآن کی یہ آیت اس نظریے کی تردید کرتی ہے کہ گناہ کے نتائج لازمی ہیں اور وہ بہرحال انسان کو بھگتنے ہی پڑیں گے۔ یہ انسان کے اپنے خود ساختہ گمراہ کن نظریات میں سے ایک گمراہ کن نظریہ ہے کیونکہ جو شخص ایک مرتبہ گنہگارانہ زندگی میں مبتلا ہو گیا اس کو یہ نظریہ ہمیشہ کے لیے مایوس کر دیتا ہے

اور اگر اپنی غلطی پر متنبہ ہونے کے بعد وہ سابق کی تلافی اور آئندہ کے لیے اصلاح کرنا چاہے تو یہ اس سے کہتا ہے کہ اب تیرے بچنے کی کوئی اُمید نہیں ہے۔ جو کچھ تو کر چکا ہے اس کے نتائج بہرحال تیری جان کے لیے لاگو ہی رہیں گے۔ قرآن اس کے برعکس یہ بتاتا ہے کہ بھلائی کی جزا اور بُرائی کی سزا دینا اللہ سبحانہٗ کے اختیار میں ہے تمہیں جس بھلائی پر انعام ملتا ہے وہ تمہاری بھلائی کا طبعی نتیجہ نہیں بلکہ اللہ سبحانہٗ کا فضل ہے چاہے عنایت فرمائے چاہے نہ فرمائے۔ اسی طرح جس بُرائی پر تمہیں سزا ملتی ہے وہ بھی بُرائی کا طبعی نتیجہ نہیں ہے کہ لازماً مرتب ہو کر رہے بلکہ اللہ سبحانہٗ پورا اختیار رکھتا ہے کہ چاہے معاف کر دے چاہے سزا دے۔ البتہ اللہ سبحانہٗ کا فضل اور اس کی رحمت اس کی حکمت کے ساتھ ہم رشتہ ہے۔ وہ چونکہ حکیم ہے اس لیے اپنے اختیارات کو اندھا دھند استعمال نہیں کرتا۔ جب کسی کی بھلائی پر انعام دیتا ہے تو یہ دیکھ کر ایسا کرتا ہے کہ بندے نے سچی نیت کے ساتھ اس کی رضا کے لیے بھلائی کی تھی۔ اور جس بھلائی کو رد کر دیتا ہے اسے اس بنا پر رد کرتا ہے کہ اس کی ظاہری شکل بھلے کام کی سی تھی مگر اندر اپنے رب کی رضا جوئی کا خالص جذبہ نہ تھا۔ اسی طرح وہ سزا اس قصور پر دیتا ہے جو باغیانہ جسارت کے ساتھ کیا جائے اور جس کے پیچھے شرمساری کے بجائے مزید ارتکاب جُرم کی خواہش موجود ہو اور اپنی رحمت سے معافی اس قصور پر دیتا ہے جس کے بعد اپنے کیے پر شرمسار اور آئندہ کے لیے اپنی اصلاح پر آمادہ ہو۔ بڑے سے بڑے مجرم، کٹے سے کٹے کافر کے لیے بھی خدا کے ہاں مایوسی و ناامیدی کا کوئی موقع نہیں بشرطیکہ وہ اپنی غلطی کا معترف، اپنی نافرمانی پر نادم اور بغاوت کی روش چھوڑ کر اطاعت کی روش اختیار کرنے کے لیے تیار ہو[1]

اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ توبہ قبول کرنے اور گناہ معاف کرنے کا اختیار سوائے اللہ تعالیٰ کے اور کسی کو نہیں۔ یہود و نصاریٰ اس قاعدہ سے غفلت کی بنا پر سخت فتنہ میں مبتلا ہو گئے کہ پادریوں اور پیروں کے پاس جاتے اور ان کو کچھ ہدیہ دے کر اپنے گناہ معاف کرا لیتے اور سمجھتے تھے کہ انہوں نے معاف کر دیا تو اللہ سبحانہٗ کے نزدیک بھی معاف ہو گیا۔ آج بھی بہت سے ناواقف مسلمان اس طرح کے غلط اور خام عقیدے رکھتے ہیں جو سراسر غلط ہیں۔ کوئی عالم یا مرشد کسی کے گناہ کو معاف نہیں کر سکتا زیادہ سے زیادہ دُعا کر سکتا ہے[2]

---

[1] تفہیم القرآن ج ۱ ص ۶۸ [2] معارف القرآن م ش ص ۱۴۲

قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى
فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۳۸﴾

(پھر جب ایسا ہوا کہ حضرت آدم علیہ السلام کی توبہ قبول ہو گئی تو) ہم نے حکم[۹۷] دیا کہ تم سب یہاں سے اتر جاؤ[۹۸]۔ (اور جس زمینی زندگی سے تم دوچار ہو گے وہاں) ضرور میری جانب سے تمہارے پاس ہدایت[۹۹] آئے گی تو جو شخص اس ہدایت کی پیروی کرے گا اسے[۱۰۰] کوئی اندیشہ نہ ہو گا اور نہ وہ کبھی غمگین ہو گا۔

سعادت و شقاوت کا قانون

یہ آیت پہلی آیات کے ساتھ گہرا ربط رکھتی ہے۔ پہلے حاکمانہ انداز میں زمین میں اُترنے کا حکم دیا تھا اب حکیمانہ طرز پر ارشاد ہو رہا ہے تاکہ زمین میں پہنچ کر منصبِ خلافت پر متمکن ہوں اور مقصدِ تخلیق پورا ہو۔

۹۷۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی توبہ تو قبول فرمائی مگر فی الفور جنت میں جانے کا حکم نہ فرمایا بلکہ دُنیا میں رہنے کا جو حکم ہوا تھا اسی کو برقرار رکھا کیونکہ مقتضائے حکمت و مصلحت یہی تھا۔ ظاہر ہے کہ زمین کے لیے خلیفہ بنائے گئے تھے نہ کہ جنت کے لیے۔ اور اللہ تعالیٰ نے یہ فرما دیا کہ جو ہمارے مطیع و فرمانبردار بن کر رہیں گے ان کو دُنیا میں رہنا مضر نہ ہو گا بلکہ مفید ہو گا۔ ہاں جو نافرمان ہیں ان کے لیے جہنم ہے اور اس تفریق و امتحان کے لیے بھی دُنیا ہی مناسب ہے[۱]

۹۸۔ یہ اتر جانے کا حکم بطورِ سزا اور عتاب نہیں مل رہا ہے اس لیے کہ خطا تو اب معاف ہو چکی ہے بلکہ یہ محض نتیجۂ طبعی کا ظہور ہے۔ شجرِ ممنوعہ کا پھل کھا لینے سے جو اثرات مرتب ہو رہے تھے ان کے لحاظ سے اب جنت میں قیام کی گنجائش نہ تھی[۲]

اس جگہ پھر اس کو مکرر لانے میں حکمت یہ ہے کہ پہلی آیت میں زمین میں اُترنے کا حکم بطورِ سزا آیا تھا اور اس آیت میں زمین میں اُترنے کا حکم خلافتِ الٰہیہ کی تکمیل کے لیے ہے۔ اسی لیے اس کے

---

[۱] حاشیہ شیخ الہند ص ۹ [۲] تفسیر ماجدی

ساتھ ہدایت بھیجنے کا ذکر بھی ہے جس کا تعلق سرتاسر خلافت کے فرائض سے ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اگرچہ زمین پر اُترنے کا حکم ابتدائی بطور سزا و عتاب تھا مگر بعد میں جب خطا معاف ہو گئی تو خلافت کی مصالح اور حکمتوں کے پیشِ نظر زمین پر پہنچنے کے حکم کو اس کی حیثیت تبدیل کر کے برقرار رکھا گیا۔ اب حضرت آدم علیہ السلام کا زمین میں آنا زمین کے حاکم اور خلیفہ کی حیثیت سے ہوا۔ یہ وہی حکمت ہے جس کا صراحتہً پہلے بھی اعلان ہو چکا ہے[1]

چونکہ حضرت آدم علیہ السلام کے روئے زمین پر آنے میں اور بھی ہزاروں حکمتیں اور مصلحتیں جیسے اقامتِ حدودِ الٰہیہ واجراء احکامِ شرعیہ پوشیدہ تھیں ـــــ اس لیے معاف فرمانے کے بعد بھی اس حکمِ ہبوط کو منسوخ نہیں فرمایا البتہ طرز تبدیل کر دیا پہلے اُترنے کا حکم حاکمانہ تھا اور اب حکیمانہ ہے[2]

اس فقرے اهبطوا منها کا اعادہ معنے خیز ہے۔ اُوپر کے فقرے میں یہ بتایا گیا تھا کہ حضرت آدم علیہ السلام نے توبہ کی اور اللہ سبحانہٗ نے توبہ قبول کر لی۔ اس کے معنے یہ ہوئے کہ حضرت آدم علیہ السلام اپنی نافرمانی پر عذاب کے مستحق نہیں رہے گنہگاری کا جو داغ ان کے دامن پر لگ گیا تھا وہ دھو ڈالا گیا نہ یہ داغ ان کے دامن پر رہا نہ ان کی نسل کے دامن پر اور نہ اس کی ضرورت پیش آئی کہ معاذ اللہ خدا کو اپنا اکلوتا بیٹا بھیج کر نوعِ انسانی کا کفارہ ادا کرنے کے لیے سُولی پر چڑھوانا پڑتا۔ برعکس اس کے اللہ سبحانہٗ حضرت آدم علیہ السلام کی توبہ ہی قبول کرنے پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ اس کے بعد انہیں نبوت سے بھی سرفراز فرمایا کہ وہ اپنی نسل کو سیدھا راستہ بتائیں۔ اب جو اُترنے کا حکم پھر دُہرایا گیا تو اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ قبولِ توبہ کا یہ مقتضا نہ تھا کہ آدم علیہ السلام کو جنت ہی میں رہنے دیا جائے اور زمین پر نہ اُتارا جائے۔ زمین ان کے لیے دار العذاب نہیں وہ یہاں سزا کے طور پر نہیں اتارے گئے بلکہ ان کو زمین میں خلافت ہی کے لیے پیدا کیا تھا۔ جنت ان کے لیے اصلی جائے قیام نہ تھی وہاں سے نکلنے کا حکم ان کے لیے سزا کی حیثیت نہ رکھتا تھا۔ اصل تجویز ان کو زمین ہی پر اتارنے کی تھی۔ البتہ اس سے پہلے ان کو اس امتحان کی غرض سے جنت میں رکھا گیا تھا[3]

۹۹ـ میری جانب سے تمہارے پاس ہدایت آئے گی۔ اس ہدایت سے معلوم ہوتا ہے کہ عالم کی ابتدا میں جن باتوں کی اولادِ آدم کو بنیادی طور پر تعلیم دی گئی تھی ان میں ایک نبوت کی بعثت

---

[1] معارف القرآن ج ۱ ص ۱۴۲ [2] بیان القرآن ج ص ۲۵ [3] تفہیم القرآن ج ۱ ص ۶۹

دوسرے رسولوں کے انسان ہونے کا اعلان تھا۔ اسی اعلان کے مطابق دُنیا میں اللہ سبحانہٗ کے سارے پیغمبر آئے جن کی صحیح تعداد کا اللہ سبحانہٗ ہی کو علم ہے مگر قرآن سے جس قدر اجمالاً معلوم ہو سکا ہے یہ ہے کہ سب سے پہلے منصب نبوّت کے لیے دو انسان منتخب ہوئے تھے۔ پھر افراد و اشخاص کی جگہ خاندانوں کا انتخاب کیا گیا۔ اس کے بعد خاندانوں نے انحراف اور کفرانِ نعمت شروع کیا تو بنی اسماعیل کا انتخاب عمل میں آیا اور اس خاندان میں سے آخری پیغمبر روانہ کر کے سلسلۂ نبوّت ختم کر دیا اور بساطِ عالم لپیٹ دینے کا اعلان کر دیا۔ اس تمام سلسلے میں جو حضرت آدم علیہ السلام سے شروع ہو کر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو جاتا ہے۔ کوئی پیغمبر ایسا نہ تھا جو انسان نہ ہو۔ اگر رسُول انسان نہ ہوتا تو نسلِ انسانی پر یہ ایک بدنما داغ ہوتا کہ اشرف المخلوقات کا مصلح و مربّی کسی اور نوع میں پیدا کیا جاتے اس لیے خود رسُول اور نوعِ انسانی کا شرف و کمال یہی تھا کہ رسُول انسانوں میں سے ایک انسان ہو۔ اس آیت میں حضرت آدم علیہ السلام کو نبوّت مرحمت فرما کر انسانی کمال کا نقطۂ آخر ظاہر فرما دیا۔

زمینی زندگی میں انسانی ضروریات اور اس کے احوال و ظروف کے مطابق انسانوں میں علمی طلبگاروں کا عموم عقل و ادراک کے فیضان کا نتیجہ ہے۔ حکیم الامت حضرت شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں:

انسان چونکہ عقل کی نعمت سے مالا مال ہے اس لیے اس میں اس کے احوال و ظروف کے مطابق علمی طلب گاریوں کی جھلک ہے

لیکن ان علمی طلب گاریوں کی راہ میں سب سے زیادہ کٹھن اور سب سے زیادہ نازک راہ عالمِ غیب سے استفادے کی راہ ہے۔ عام انسانوں میں اس کی صلاحیت نہیں ہے اور اس سے استفادے کے بغیر نوعِ انسانی کا وہ کمال ناتمام رہتا ہے جو حکمتِ الٰہی نے اس کے لیے مقرر کیا ہے اس لیے جیسا کہ حکیم الامتؒ نے بتایا ہے کہ حکمتِ الٰہیہ نے یہ فیصلہ فرمایا کہ اپنے غیب پر مطلع کرنے کے لیے انسانوں میں سے سب سے زیادہ پاک نفوس منتخب کرے اور ان پر وحی کا فیضان فرمائے۔

گویا انسانوں میں سے کچھ انسانوں کو اللہ سبحانہٗ نے فیضانِ وحی قبول کرنے کی صلاحیت و استعداد پیدا فرمائی اور اُن کو عہدۂ نبوّت سے سرفراز فرمایا۔ چونکہ وحی سب انسانوں کو ملنے والی نہ تھی اس لیے یہاں اولادِ آدم کو خصوصیت سے مخاطب کر کے فرمایا کہ تمہارے پاس میری جانب سے ہدایت آئے گی ـــــ لفظ اِمَّا اِن اور مَا سے مل کر بنا ہے۔ مَا کلام میں زور پیدا کرنے کے لیے ہے اور اِنْ کے معنے اگر ہیں۔ اگر کہہ کر یہ اشارہ فرما دیا کہ نبوّت کا روانہ کرنا ہمارے ذمّہ واجب نہیں ہے۔ یہ محض اللہ سبحانہٗ کا فضل ہے۔ اسی مہربانی اور فضل کو یقینی بنانے کے لیے لفظ مَا اور نون تاکید لائے ہیں اور اس میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ

نبوّت کسب و اکتساب کا نتیجہ نہیں ہے۔

ف۱۰۰ ۔ جو شخص میری ہدایت کی پیروی کرے گا۔ اس پورے جملہ میں اُس آسمانی ہدایت کی پیروی کرنے والوں کے لیے دو انعام بتائے گئے جو نبوّت کے ذریعے اللہ سبحانہٗ کی جانب سے اولادِ آدم کے نام آئے گی۔ ایک یہ کہ ان پر کوئی اندیشہ نہ ہوگا دوسرے یہ کہ وہ غمگین نہ ہوں گے۔

جو صدمہ اور اندیشہ کسی مصیبت پر اس کے ہونے سے پہلے ہوتا ہے اس کو خوف کہتے ہیں اور اس کے واقع ہو چکنے کے بعد جو غم ہوتا ہے اس کو 'حزن' کہتے ہیں۔ اس آیت میں جو خوف و حزن کی نفی فرمائی اس سے اگر خوف و حزن دنیوی مراد لیا جائے تو معنی یہ ہوں گے کہ جو لوگ ہماری ہدایت پر چلیں گے اس میں اس اندیشے کی گنجائش نہیں کہ شاید یہ ہدایت حقہ نہ ہو۔ شیطان کی طرف سے دھوکہ اور مغالطہ ہو۔ اور نہ وہ اس وجہ سے کہ ان کے باپ سے بالفعل جنت چھوٹ گئی محزون ہوں گے کیونکہ ہدایت والوں کو عنقریب جنت ملنے والی ہے۔ اگر خوف و حزنِ آخرت مراد ہو تو مطلب یہ ہوگا کہ قیامت میں اہلِ ہدایت کو خوف نہ ہوگا نہ حزن مگر حزن کا نہ ہونا تو بے شک مسلّم لیکن خوف کی نفی فرمانے پر ضرور یہ خلجان ہوتا ہے کہ اس روز تو حضرات انبیاء علیہم السلام تک کو ہوگا۔ کوئی بھی خوف سے خالی نہ ہوگا۔ تو بات یہ ہے کہ خوف دو طرح کا ہوتا ہے۔ کبھی تو خوف کا مرجع ڈرنے والے میں پایا جاتا ہے جیسے مجرم شاہی جو بادشاہ سے ڈرتا ہے تو موجب خوف جرم ہے۔ اور کبھی مرجع خوف اُس میں ہوتا ہے جس سے آدمی ڈرتا ہے مثلاً اگر کوئی شخص کسی بادشاہ صاحب جاہ و جلال کے سامنے یا شیر کے رُوبرو ہو تو ڈرنے کی یہ وجہ نہیں ہوتی کہ ڈرنے والے نے بادشاہ یا شیر کا کوئی جُرم کیا ہے بلکہ ڈر کا اصلی باعث قہر و جلالِ بادشاہی اور شیر کی درندگی اور اس کا غضبناک ہوتا ہے۔ آیت سے پہلی قسم کی نفی ہوئی نہ کہ دوسرے قسم کے خوف کی۔ یہ شبہ اس وقت دُرست ہوتا جب تعبیر لاخوف فیھم یا لا یخافون ہوتی۔[1]

حقیقت یہ ہے کہ انسانی زندگی کی سعادت کے لیے اس سے زیادہ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اس کی شقاوت کی ساری سرگزشت ان ہی دو لفظوں پر سمٹی ہوتی ہے۔ خوف اور غم۔ جونہی ان دو باتوں سے اسے رہائی مل گئی اس کی ساری سعادتیں اس کے قبضے میں آگئیں۔ زندگی کے جتنے بھی کانٹے ہو سکتے ہیں سب کو ایک ایک کر کے چنو۔ اور دیکھو خواہ جسم میں چبھتے ہوں خواہ دماغ میں، خواہ

---

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۹

موجودہ زندگی کی عافیت میں خلل ڈالتے ہوں خواہ آخرت کی۔ تم دیکھو گے کہ ان دو باتوں سے باہر نہیں ہیں۔ یا خوف کا کانٹا ہے یا غم کا۔ قرآن کہتا ہے ایمان کی راہ سعادت کی راہ ہے جس کے قدم اس راہ میں جم گئے اس کے لیے دونوں کانٹے بے اثر ہو جائیں گے۔ اس کے لیے نہ تو کسی طرح کا اندیشہ ہوگا نہ کسی طرح کی غمگینی[1]

اسلام میں نبوت کا تصور

قرآن نے نبوت کا تصور تمام مذاہب سے بالکل جُداگانہ پیش کیا ہے۔ قرآن کے بیان کے مطابق نبی نہ اللہ سبحانہٗ کا اوتار ہوتا ہے کہ اس میں اللہ سبحانہٗ حلول کر جائے اور نہ خود اللہ ہوتا ہے کہ صورتِ انسانی میں جلوہ گر ہو جائے۔

رسُول میں الوہیت کی جھلک دیکھنا عیسائیت کی دعوت ہے اور اللہ سبحانہٗ کے متعلق یہ خیال کہ وہ رسُول کی صورت میں برونر کرتا ہے براہمہ کا عقیدہ ہے۔ قرآن کا تصورِ نبوت ان دونوں سے علیحدہ ہے بلکہ قرآن کے نقطۂ نظر سے یہ دونوں تصور بے مصداق، ناممکن اور محال ہیں۔ سوچنے کی بات ہے کہ جب اللہ سبحانہٗ نے عالم حیوانات میں ہر نوع کی الگ الگ خصوصیات اور جُداجُدا صورتیں بنائی ہیں ان میں سے کسی نوع کی یہ مجال نہیں ہے کہ دوسری نوع کی کسی خصوصیت کو اپنا سکے اور ہزار ترقی کے باوجود ایک نوع دوسری نوع کی صورت کا لبادہ پہن سکے۔ جب مخلوقات میں یہ سرحدیں اتنی مضبوط ہیں تو مخلوق کے متعلق یہ خیال کہ کوئی اپنے دائرے سے ترقی کر کے خالق کی سرحد میں داخل ہو جائے یا خالق کے بارے میں یہ گمان کہ وہ مخلوق میں حلول کر جائے احمقانہ خوش فہمی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟ اور اگر تھوڑی دیر کے لیے مسئلہ ارتقاء کو مان بھی لیا جائے پھر بھی مخلوقات کی کسی کڑی کے عالمِ قدس سے ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس لیے نبی کے بارے میں قرآنی تصور بلا کسی ادنیٰ شائبۂ تنقیص یہ ہے کہ وہ ایک عظیم المرتبت اور جلیل القدر انسانی شخصیت ہوتی ہے اور اپنی تمام عظمتوں اور مراتبِ قرب کے باوجود الوہیت کے تصور سے یکسر خالی ہوتی ہے۔

قرآن کی روشنی میں رسُول کی عام انسانوں میں سب سے بڑی برتری یہ ہے کہ وہ اللہ سبحانہٗ کا

[1] ترجمان القرآن ج ۲ ص ۱۸۲

رسُول ہے اور اس کی مرضی کی نمائندگی کرتا ہے اس لیے رسُول کا کمال ہی یہ ہے کہ وہ ایک انسان ہو۔ کیونکہ انسانی اصلاح کے لیے صرف علم ہی کافی نہیں ہے۔ علم کے ساتھ احساس کی بھی ضرورت ہے۔ اسی لیے قرآن نے جابجا رسُولوں کی روانگی کے سلسلے میں رسُولوں کے انسان ہونے پر خاص طور پر زور دیا ہے۔ پیشِ نظر آیت میں اگرچہ تصریح نہیں ہے لیکن دوسری آیت میں اولادِ آدم کو مخاطب کرکے یہ بات بنیادی طور پر بتا دی گئی ہے اِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ رُسُلٌ مِّنْکُمْ ضرور آئیں گے۔ تمہارے پاس رسُول تم میں سے۔ ایک اور موقعہ پر رسُول کے انسان ہونے کو بہت بڑا انعام قرار دیا ہے لَقَدْ مَنَّ اللّٰہُ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ بَعَثَ فِیْہِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِہِمْ ایمان والوں پر اللہ سبحانہٗ کا احسان ہے کہ اس نے ان میں سے ہی رسُول ان میں روانہ کیا۔ الغرض آغازِ آفرینش میں جن باتوں کی اولادِ آدم کو تعلیم دی گئی تھی ان میں سے ایک رسُولوں کی روانگی اور دوسرے رسُولوں کے انسان ہونے کا عقیدہ تھا۔ اسی عقیدے کے مطابق دُنیا کے تمام رسُول آئے ہیں۔

نبوّت کیا ہے ؟

صوفیائے کرام اسے وجود کا نقطۂ اوّل، حقیقۃ الحقائق، برزخیۃ الکبریٰ کہتے ہیں۔ اس کی فلسفیانہ حقیقت کی بہترین تشریح امام غزالیؒ نے معارج القدس میں اور حکیم الامت شاہ ولی اللہؒ نے حجۃ اللہ البالغہ میں کی ہے۔ امام صاحبؒ فرماتے ہیں کہ نبوّت انسانیت کے رُتبہ سے کچھ بالا تر ہے۔ جس طرح انسانیت حیوانیت سے بالاتر ہے وہ عطیہ الٰہی اور موہبت ربانی ہے سعی و محنت اور کسب و تلاش سے نہیں ملتی ہے۔ اور المنقذ میں امام موصوفؒ نے نبوّت کی حقیقت پر جو عقلی بحث کی ہے وہ اس سے زیادہ لطیف ہے۔ ان کی بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ سبحانہٗ نے انسان کو مختلف اطوار میں مختلف نعمتوں سے مالا مال کیا ہے۔ سب سے پہلے انسان کو حواس کی نعمت دی حواس کے ذریعے انسان کو دیکھنے، سننے، سونگھنے، چھونے اور چکھنے کی قوتیں ملی ہیں اور ان کے ذریعے ہی انسان کو خارج کا علم ہوتا ہے۔ حواس کے بعد انسان کو قوّتِ تمیز عطا کی جاتی ہے انسان اس کے ذریعے محسوسات سے باہر کا پتہ لیتا ہے۔ بعد ازیں انسان کو ایک اور نعمت ارزانی کی جاتی ہے اسے "عقل" کہتے ہیں۔ اللہ سبحانہٗ کے اس انعام و فیضان نے انسان کے لیے غیر محدود ترقیات کا دروازہ کھول دیا ہے۔ اس کے ذریعے انسان واجبات، ممکنات اور مستحیلات کا ادراک کرتا ہے اور اسی کی بنیاد پر انسان کو تمام کائناتِ زمینی کا خلاصہ کہا گیا ہے

عقل کے بعد اللہ سبحانہ، کی جانب سے ایک اور نعمت ملتی ہے اس نعمت کا نام ہے نبوّت۔ اس کے ذریعے وہ عالمِ غیب کا ادراک کرتا ہے اس کے سامنے عقل ایسے ہی بے دست و پا ہوتی ہے جیسے عقل کے سامنے حواس بے دست و پا ہوتے ہیں۔ جیسے عقل والے اگر عقلی معلومات کو محسوسات کے متوالوں کے سامنے پیش کریں وہ ان کو مستبعد سمجھ کر انکار کر دیتے ہیں۔ ایسے ہی نبی جب نبوّت کی معلومات عقل والوں کے سامنے پیش کرتا ہے تو عقل والے بھی استبعاد کی وجہ سے اسے نہیں مانتے۔

حضرت مجدد الف ثانیؒ نے بھی اس کے قریب قریب ہی نبوّت کی حقیقت بتائی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ جیسے عقل کا مرتبہ احساس سے بالا ہے ایسے ہی نبوّت کا مقام عقل سے اونچا ہے۔ "ہم چنیں طورِ نبوّت ورائے طورِ عقل است" ہمارے زمانے کے مشہور فلاسفر علامہ اقبالؒ نے نبوّت کو اپنے مخصوص فلسفیانہ انداز میں اس طرح سمجھایا ہے:

ایک اعتبار سے نبوّت کی تعریف یوں بھی کی جا سکتی ہے کہ یہ شعورِ ولایت کی وہ شکل ہے جس میں واردات اتحاد اپنی حدود سے تجاوز کر جاتیں اور ان قوتوں کی پھر سے رہنمائی یا از سرِ نو تشکیل کے وسائل ڈھونڈتی ہیں جو حیاتِ اجتماعیہ کی صورت گری میں گویا انبیاء کی ذات میں زندگی کا نامتناہی مرکز اپنے لامتناہی اعماق میں ڈوب جاتا ہے تو اس لیے کہ پھر ایک تازہ قوت اور زور سے ابھر سکے۔ وہ ماضی کو مٹاتا ہے اور پھر زندگی کی نئی نئی راہیں اس پر منکشف کر دیتا ہے۔

جس چیز کو امام غزالیؒ عقل سے ماوراء، مجدد الف ثانیؒ نورِ نبوّت کہتے ہیں۔ علامہ اقبالؒ اسی کو شعورِ نبوّت کہتے ہیں۔ عنوانات مختلف ہیں لیکن حقیقت ایک ہے۔ اختلافِ تعبیر سے یہ غلط فہمی نہ ہو کہ نبوّت ان بزرگوں کے نزدیک انسان کے ممکن الحصول ارتقائی کمالات میں سے کوئی کمال ہے۔ ان بزرگوں کا ہرگز یہ مقصد نہیں ہے بلکہ وہ بتانا یہ چاہتے ہیں کہ نبوّت ایک منصب ہے لیکن اس منصب کے کچھ کمالات ہیں۔ ان کمالات کی عقلی توجیہہ یہ ہے ورنہ خود اس کمال کا نام نبوّت نہیں ہے۔ امام غزالیؒ نے تصریح کی ہے۔

ایسی راہ کا وجود ممکن ہے جس کے ذریعے ان امور کا ادراک کیا جا سکے جن کا عقلِ انسانی ادراک نہیں کر سکتی۔ نبوّت سے مراد یہی ہے یہ مطلب نہیں کہ نبوّت اس کا نام ہے۔

بہر حال نبوّت ایک منصب ہے اور نبی اگرچہ عام انسانوں کے ساتھ بشریّت اور انسانیت

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝

اور جو لوگ اس ہدایت کے منکر ہوں گے اور ہماری آیات کو جھٹلائیں گے وہ دوزخی ہیں۔ ہمیشہ دوزخ کے عذاب میں رہیں گے۔

میں شریک ہوتے ہیں مگر نبوت میں وہ انسانوں سے بالکل الگ ہوتے ہیں کیونکہ اس میں نبوت کی وجہ سے وحی کے قبول کرنے کی جو صلاحیت ہوتی ہے وہ دوسرے انسانوں میں ہرگز نہیں ہوتی۔

اس آیت میں تصویر کا دوسرا رُخ پیش فرمایا ہے۔ متبعین ہدایت اور مصدقین کا مقام بتانے کے بعد یہ بتایا جا رہا ہے کہ منکرین اور مکذبین کا انجام کیا ہوگا؟ دو لفظوں میں حقیقت حال کی کیسی کامل تصویر کھینچ دی ہے جس سے کوئی گوشہ بھی باہر نہیں رہا۔ ساتھ ہی آیٰتنا میں ضمیر متکلم لاکر اس کے تمام دلائل بھی واضح کر دیے۔ نبوت سے تعلق نہ رکھنے والوں کی دو حالتیں پیش کی ہیں۔

ایک یہ کہ وہ انکار کرتے ہیں۔

دوسرے یہ کہ وہ تکذیب کرتے ہیں

قرآن کے نزدیک دونوں صورتیں ناپسندیدہ ہیں۔ ان میں ہر بات نہ صرف بیانِ حال ہے بلکہ بجائے خود ایک دلیل بھی ہے اور یہی قرآن کی معجزانہ بلاغت ہے۔

۱۰۱ ف۔ آیات جمع آیت کی۔ آیت کے اصل معنے اس نشانی یا علامت کے ہیں جو کسی چیز کی طرف رہنمائی کرے۔ قرآن میں یہ لفظ چار مختلف معنوں میں آیا ہے۔ کہیں اس سے مراد محض علامت یا نشانی ہے، کہیں آثارِ کائنات کو اللہ سبحانہٗ کی آیات کہا گیا ہے کیونکہ مظاہرِ قدرت میں سے ہر چیز اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہی ہے جو اس ظاہری پردے کے پیچھے پوشیدہ ہے، کہیں ان معجزات کو آیات کہا گیا ہے جو انبیاء علیہم السلام لے کر آئے تھے کیونکہ یہ معجزے دراصل اس بات کی علامت ہوتے تھے کہ یہ لوگ فرمانروائے کائنات کے نمائندے ہیں، کہیں کتاب اللہ کے فقروں کو آیت کہا گیا ہے کیونکہ وہ صرف حق و صداقت کی طرف رہنمائی کرتی ہیں بلکہ فی الحقیقت اللہ سبحانہٗ

کی طرف سے جو کتاب بھی آتی ہے اس کے صرف مضامین کی ہی نہیں اس کے الفاظ اور انداز بیان اور طرز عبارت تک میں اس کے جلیل القدر مصنف کی شخصیت کے آثار نمایاں طور پر محسوس ہوتے ہیں۔ ہر جگہ عبارت کے سیاق و سباق سے بآسانی معلوم ہو جاتا ہے کہ کہاں آیت کا لفظ کس معنے میں آیا ہے[1]

آیت کے معنے نشانی اور علامات کے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو علم و احساس کے جو ذرائع عطا کیے ہیں وہ حقیقت میں صرف آیات و علامات کی شناخت ادریا دہے۔ دُنیا میں جس قدر چیزیں ہیں تم ان کو کس طرح جانتے ہو۔ صرف علامات و آیات سے۔ کلیات سے لے کر جزئیات تک جو کچھ ہمیں خارج سے علم حاصل ہوا ہے اس کا ذریعہ محض علامات و آیات ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ یہ گھوڑا ہے۔ لیکن ہم کیونکہ جانتے ہیں اس طرح کہ ان چیزوں کی جو مخصوص نشانیاں ہیں وہ الگ ہمارے ذہن میں محفوظ ہیں۔ انہی کی مدد سے ہم کہتے ہیں کہ یہ فلاں چیز ہے۔

ہمارا تمام ترفنِ استدلال دراصل علامات و آیات ہی پر موقوف ہے۔ اگر چیزوں سے علامات و آیات محو کر دی جائیں تو نہ کسی چیز کو پہچان سکیں اور نہ کسی دعوے پر کوئی دلیل قائم کر سکیں۔

سے ۱۰۲۔ یہ نسلِ انسانی کے حق میں ابتدائے آفرینش سے لے کر قیامت تک کے لیے اللہ سبحانہٗ کا مستقل فرمان ہے اور اسی کو تیسرے رکوع میں اللہ سبحانہٗ کے عہد سے تعبیر کیا گیا ہے۔ انسان کا کام خود راستہ تجویز کرنا نہیں ہے بلکہ بندہ اور خلیفہ ہونے کی دوگونہ حیثیتوں کے لحاظ سے وہ اس پر مامور ہے کہ اس راستے کی پیروی کرے جو اس کا رب اس کے لیے تجویز کرے اور اس راستے کے معلوم ہونے کی دو ہی صورتیں ہیں۔ یا تو کسی شخص کے پاس براہِ راست اللہ سبحانہٗ کی وحی آئے یا پھر وہ اس انسان کا اتباع کرے جس کے پاس وحی آئی ہو۔ ان کے علاوہ کوئی صورت یہ معلوم ہونے کی نہیں کہ اللہ سبحانہٗ کی رضا کس راہ میں ہے ان کے ماسوا ہر صورت غلط ہے بلکہ غلط ہی نہیں سراسر بغاوت بھی ہے جس کی سزا جہنم کے سوا کچھ نہیں ہے[2]

قرآن مجید میں تمام نبیوں میں سے سب سے پہلا تذکرہ حضرت آدم علیہ السلام کا ہے اور حسب ذیل سورتوں میں بیان کیا گیا ہے۔

سورۃ بقرہ، اعراف، اسراء، کہف اور طٰہٰ میں نام اور صفات دونوں کے ساتھ اور سورۃ حجر اور ص میں فقط ذکرِ صفات کے ساتھ۔ اور آلِ عمران، مائدہ، مریم اور یٰس میں صرف شخصی طور پر نام آیا ہے۔

---

[1] تفہیم القرآن ج ۱ ص ۶۹ [2] تفہیم القرآن ص ۶۹

يٰبَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَوْفُوْا بِعَهْدِيْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ ۚ وَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ ۝

اے بنی اسرائیل![ف١٠٣] تم میرے وہ احسان[ف١٠٤] یاد کرو جن سے میں نے تمہیں نوازا ہے۔ اور تم میرا وہ عہد[ف١٠٥] پورا کرو جو تم نے مجھ سے کیا ہوا ہے میں تمہارا وہ عہد پورا کروں گا جو میں نے تم سے کیا ہوا ہے اور دیکھو سب سے ہٹ کر بس میرے[ف١٠٦] ہی سے ڈرو۔

یہ واقعہ قرآن کی مذکورہ بالا سورتوں میں اگرچہ اسلوبِ بیان، طرزِ ادا اور لطیفِ تعبیر کے لحاظ سے مختلف نظر آتا ہے لیکن مقصد اور واقعہ کے اعتبار سے ایک ہی حقیقت ہے جو مختلف تعبیرات میں موعظت و عبرت کے پیشِ نظر حسبِ موقعہ بیان کی گئی ہے۔

قرآن عزیز ان تاریخی واقعات کو اس لیے بیان نہیں کرتا کہ وہ واقعات ہیں بلکہ قرآن کا مقصد یہ ہے کہ ان واقعات سے پیدا شدہ نتائج کو انسانی رُشد و ہدایت کے لیے موعظت بنائے۔ اور انسانی عقل سے اپیل کرے کہ وہ نوامیس و قوانینِ فطرت کے سانچے میں ڈھلے ہوئے ان تاریخی نتائج سے سبق حاصل کریں اور ایمان لائیں کہ یگانہ اللہ سبحانہٗ کی ہستی کے علاوہ عبادت و نیازمندی کی مستحق کوئی نہیں ہے۔ اس کی اطاعت اور اس کی ہدایات کی پیروی میں فلاح و نجات اور ہر قسم کی ترقی کا راز مضمر ہے۔

بنی اسرائیل سے خطاب

قرآن نے سب سے پہلے یہ بتایا تھا کہ قرآن کے کلامِ الٰہی اور اس کے جملہ مضامین کے واقعی ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ اس کے بعد بتایا کہ قرآن کی دعوت کے سامنے قبولیتِ حق کی استعداد کے لحاظ سے تین قسم کے مخاطب ہیں:

۱۔ طالبِ حق اور خدا پرست لوگ جنہوں نے صدائے حق سنتے ہی اسے پہچان لیا اور قبول کر لیا ان میں کچھ عرب کے موحدین، کچھ یہودی اور کچھ عیسائی تھے۔

۲۔ عام مشرکینِ عرب جن کے پاس ایمان و عمل کی کوئی تعلیم نہ تھی۔ محض رسوم و اوہام کے پجاری اور آباؤ اجداد کی تقلید کی مخلوق تھے۔ ان میں اکثر کی طبیعتیں گمراہی اور فساد کی پختگی سے اس درجہ مسخ ہو گئی تھیں کہ کتنی ہی اچھی بات کہی جائے ماننے والے نہ تھے۔

۲- عام اہلِ کتاب یعنی الہامی تعلیمات کے پیرو، ان میں سر برآوردہ گروہ یہودیوں اور عیسائیوں کا تھا۔ یہ دونوں جماعتیں ایمان کی مدعی تھیں لیکن ایمان کی حقیقت گم ہو چکی تھی اور اعتقاد و عمل کی تمام سچائیوں سے محروم ہو گئے تھے۔

قرآن نے متقین کے نام سے پہلے گروہ کا ذکر کیا - الذین کفروا کے عنوان سے دوسرے کا اور من الناس کی سرخی سے تیسرے گروہ کا تعارف کرایا۔

تیسرا گروہ چونکہ مدعی ایمان تھا اس لیے اس کی نفسیات، اعتقادی اور اخلاقی کمزوریوں کی نشاندہی کی اور اس کی حقیقت کی توضیح کے لیے دو مثالیں دی ہیں۔

اس کے بعد پوری انسانیت کو توحیدِ عبادت کی دعوت دی ہے اور اس پر خالقیت و ربوبیت سے استدلال کیا ہے اور توحیدِ عبادت کے ساتھ ہی ساری نسلِ انسانی کو رسالت کا پیغام بھی یہ کہہ کر دے دیا کہ ہمارے پیغمبر جو پیغام پیش کر رہے ہیں اگر تمہارے خیال میں یہ کلامِ الٰہی نہیں ہے تو پھر تم بھی اس جیسی ایک سورت بنا کر لاؤ۔ اس طرح کلمہ کے دونوں حصوں ایک توحید دوسرے رسالت کی دعوت پیش کر دی۔ تیسرا رکوع ختم ہوا تو چوتھے رکوع میں تاریخ نسلِ انسانی بیان ہوئی۔ اس میں بتایا گیا کہ انسان کی اصلی غرض آفرینش دنیا میں اللہ سبحانہٗ کے قانون کی تنفید ہے اور خلافت۔

اب اس پانچویں رکوع میں بنی اسرائیل کو خطاب کیا گیا ہے۔ یہ لوگ اہلِ کتاب تھے۔ نبوت انبیاء کے ماننے والے اور ایمان باللہ والیوم الآخر کے مدعی تھے۔ اور بتایا جا رہا ہے کہ جو قوم اللہ سبحانہٗ کی روانہ کی ہوئی کتاب سے منہ موڑ لیتی ہے خواہ وہ نسب کے اعتبار سے کتنی ہی اونچی ہو اس کا انجام کیا ہوتا ہے۔ اس داستان سے اہلِ ایمان کو یہ سبق دینا مقصود ہے کہ نرا زبانی دعویٰ اور صرف نسلی انتساب کی اللہ سبحانہٗ کے یہاں کوئی قیمت نہیں ہے۔ چنانچہ اس مقصد کی خاطر یہودیوں کی اخلاقی کمزوریاں مذہبی غلط فہمیوں اور اعتقادی و عملی گمراہیوں میں سے ایک ایک کی نشاندہی کر کے اس کے بالمقابل دینِ حق کے مقتضیات بیان کیے گئے ہیں تاکہ اہلِ ایمان اپنا راستہ صاف دیکھ سکیں اور غلط راہوں سے بچ سکیں۔

۱۰۳ - اوّل یاایھا الناس اعبدوا ربکم خطاب عام تھا اور ان نعمتوں کا ذکر فرمایا تھا جو تمام بنی آدم پر عام تھیں۔ مثلاً زمین و آسمان و جملہ اشیاء کا پیدا کرنا۔ پھر حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کر کے ان کو خلیفہ بنانا اور بہشت میں داخل کرنا وغیرہ - اب ان میں خاص بنی اسرائیل کو خطاب کیا گیا اور خاص نعمتیں جو وقتاً فوقتاً پشت در پشت ان پر ہوتی چلی آئیں اور انہوں نے جو کفرانِ نعمت

کیا ان سب باتوں کا مفصل ذکر کیا جاتا ہے۔ کیونکہ بنی اسرائیل تمام فرقوں سے بنی آدم میں ممتاز اور اہلِ علم و کتاب و نبوت اور انبیاء کو پہچاننے والے سمجھے جاتے تھے کیونکہ حضرت یعقوب علیہ السلام سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک چار ہزار نبی ان میں آچکے تھے۔ تمام عرب کی نظریں ان کی طرف تھیں کہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کرتے ہیں یا نہیں۔ اس لیے ان انعامات اور خرابیوں کا بسط کے ساتھ ذکر فرمایا کہ شرما کر ایمان لائیں۔ ورنہ دوسرے لوگ ان کی حرکات سے واقف ہو کر ان کی بات کا اعتبار نہ کریں[1]

بنی اسرائیل مشہور نامور پیغمبر حضرت ابراہیم علیہ السلام (۲۱۶۰ تا ۱۹۸۵ قبل مسیح) سے مشہور و نامور دو نسلیں چلیں۔ ایک بی بی ہاجرہ مصری کے بطن کے فرزند حضرت اسماعیل علیہ السلام سے۔ یہ نسل بنی اسماعیل کہلائی اور آگے چل کر قریش کی ایک شاخ پیدا ہوئی، ان کا وطن عرب رہا۔ دوسری بی بی سارہ عراقی کے بطن کے فرزند حضرت اسحاق علیہ السلام کے فرزند حضرت یعقوب علیہ السلام عرف اسرائیل سے۔ یہ نسل بنی اسرائیل کہلائی۔ اس کا وطن شام رہا۔ قدیم جغرافیہ میں فلسطین کوئی الگ ملک نہ تھا شام ہی کا جزو تھا۔ ایک تیسری نسل قطورا سے چلی اور بنی قطورا کہلائی لیکن اسے تاریخ میں اس درجہ اہمیت حاصل نہیں۔

بنی اسرائیل کا صدیوں تک عروج رہا۔ توحید کی علمبردار دنیا میں یہی قوم رہی، انبیاء ان میں اُٹھتے رہے۔ بڑے بڑے عابد و زاہدان میں پیدا ہوئے۔ حکمران، سلاطین اور فوجی جنرل ان میں بڑے بڑے ہوئے۔ نزولِ قرآن کے وقت ان کا اقتدار مدت ہوئی رخصت ہو چکا تھا۔ اپنے وطن سے نکل کر عراق، مصر وغیرہ اطراف و جوانب میں پھیل گئے تھے اور ان کے کچھ قبیلے اطرافِ حجاز اور حجاز خصوصاً مدینہ طیبہ میں آباد ہو چکے تھے۔ بنی اسرائیل تو ایک قومی اور نسلی اصطلاح ہے۔ مذہبی حیثیت سے یہ لوگ یہود تھے۔ سلسلۂ وحی و نبوت اور عقیدہ جزا و سزا کے قائل تھے۔ علومِ انبیاء اور معارفِ اولیاء کے حامل تھے۔ مالدار تھے، ساہوکار تھے، ساتھ ہی سفلی عملیات، سحر و کہانت نیز تجارت کے بھی بڑے ماہر تھے۔ حجاز کی آبادی میں اس دینی و دنیوی تفوق کی بنا پر اہمیت انہیں اس وقت اچھی خاصی حاصل تھی۔ ملک کی عام آبادی مشرکوں اور بت پرستوں کی تھی۔ وہ لوگ ایک طرف تو یہود کے علم و فضل کے قائل اور ان کی دینی واقفیت سے مرعوب تھے[2]

---

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۹ [2] تفسیر ماجدی ص ۱۹

۱۰۴ - اس نعمت کا اللہ سبحانہٗ نے دوسری جگہ اس طرح ذکر فرمایا ہے۔ اِذْ جَعَلَ فِیْکُمْ اَنْبِیَاۤءَ وَ جَعَلَکُمْ مُّلُوْکًا۔ یعنی اعلیٰ سے اعلیٰ روحانی نعمتوں سے اور اچھی سے اچھی مادی نعمتوں سے مالامال فرمایا۔ اس انعام بے پایاں کا تقاضا یہ ہونا چاہیے تھا کہ اُس نبوّت کو اپنائیں جو اللہ سبحانہٗ نے ان کی ہدایت کے لیے روانہ فرمائی۔ لیکن اس نعمت ہی کو انہوں نے نبوّت سے روگردانی اور نبوّت کی ایذارسانی کے لیے دلیل بنالیا اور اس کی وجہ ان کی یہ غلط فہمی یا بدفہمی ہے کہ وہ اپنی جگہ یہ سمجھ بیٹھے کہ اللہ سبحانہٗ کے انعامات اور اس کی مہربانی کے بس وہی مستحق ہیں۔ اور ان کی نسل سے باہر اللہ سبحانہٗ کوئی نبی نہیں بھیجے گا۔

علامہ قرطبیؒ نے یہاں یہ لطیفہ خوب لکھا ہے کہ اللہ پاک نے بنی اسرائیل سے نعمتوں کے یاد کرنے کا مطالبہ کیا ہے اور اہلِ ایمان یعنی مسلمانوں سے اپنے کو یاد کرنے کا۔ اذکرونی اذکرکم۔ فرق ظاہر ہے کہ بنی اسرائیل کی منظر نعمت پر ہے اور اہلِ ایمان کی نظر نعمت سے گزر کر منعم پر ہے۔

انعامات کی تفصیل یہاں بھی قرآن میں آگے آرہی ہے۔ ہزاروں انبیاء ان میں روانہ کیے گئے تورات وغیرہ کتابیں نازل فرمائیں۔ فرعون سے نجات دے کر ملک شام میں تسلط دیا۔ من وسلویٰ نازل ہوا۔ ایک پتھر سے بارہ چشمے جاری کیے جو نعمتیں اور خوارقِ عادات کسی فرقہ کو نصیب نہیں ہوئیں[1]۔

۱۰۵ - تم میرا عہد پورا کرو یعنی تمہارا وہ عہد جو میرے ساتھ ہے۔ طاعتِ الٰہی اور طاعتِ انبیا کا۔ (کشاف)، تورات میں اس عہد کا ذکر جا بجا ہے اور تمہارے عہد کا مطلب یہ ہے کہ جو عہد اللہ سبحانہٗ نے تم سے تمہارے ایمان و طاعت پر بطورِ انعام کر رکھا ہے۔

تورات میں یہ اقرار کیا تھا کہ تم تورات کے حکم پر قائم رہو گے اور جس پیغمبر کو بھیجوں گا اس پر ایمان لا کر اس کے رفیق رہو گے تو ملک شام تمہارے قبضہ میں رہے گا۔ بنی اسرائیل نے اس کو قبول کر لیا تھا مگر پھر اپنے اقرار پر قائم نہ رہے۔ بدنیتی کی رشوت لے کر مسئلے غلط بتائے، حق کو چھپایا۔ اپنی ریاست جمائی، پیغمبر کی طاعت نہ کی بلکہ بعض پیغمبروں کو قتل کیا۔ تورات میں جہاں حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت تھی اس کو بدل ڈالا[2]۔

اللہ سبحانہٗ نے بنی اسرائیل سے دو عہد لیے تھے ایک عام اور دوسرا خاص۔ عام عہد تو یہی تھا کہ اللہ سبحانہٗ کی عبادت کریں گے، شرک نہ کریں گے، اس کے رسولوں پر ایمان لائیں گے۔ اور عہدِ خاص یہ تھا کہ اللہ سبحانہٗ نے بنی اسرائیل سے کہا تھا کہ میں اُن کے لیے اُن کے بھائیوں میں

---

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۹ [2] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۹

وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ ۠ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِىْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۡ وَّاِيَّاىَ فَاتَّقُوْنِ ۝۴۱

اور ایمان لے آؤ اس کتاب[۱۰۴] پر جو میں نے نازل کی۔ یہ تصدیق[۱۰۵] کرتی ہے اس کتاب کی جو تمہارے پاس ہے۔ اور دیکھو اس کتاب الٰہی کے پہلے منکر[۱۰۶] تم ہی نہ بنو۔ اور تھوڑی قیمت پر میری آیات[۱۱۰] کا سودا نہ کرو۔ میرے سوا کوئی نہیں بس میری ہی نافرمانی[۱۱۱] سے بچو۔

تجھ سا ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا اس کے منہ میں کلام ڈالوں گا اور جو کچھ میں اس سے کہوں گا وہ سب ان سے کہے گا۔ اور ایسا ہوگا کہ جو کوئی میری باتوں کو جنہیں وہ میرا نام لے کر کہے گا نہ سنے گا تو میں اس کا حساب اسی سے لوں گا۔ (استثنا ۱۸۔ ۱۹)

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی زندگی کی آخری وصیت جس پر ان کی تورات اور ان کے صحیفۂ حیات دونوں کا خاتمہ ہو جاتا ہے بنی اسرائیل کو یہ فرمائی۔

۔ یہ وہ برکت ہے جو موسیٰ مردِ خدا نے اپنے مرنے سے پہلے بنی اسرائیل کو بخشی اور اس نے کہا کہ خداوند سینا سے آیا اور سعیر سے ان پر طلوع ہوا اور فاران کے پہاڑ سے وہ جلوہ گر ہوا، دس ہزار مقدسوں کے ساتھ آیا اور اس کے داہنے ہاتھ میں ایک آتشیں شریعت ان کے لیے تھی۔ ہاں وہ اپنے لوگوں سے بڑی محبت کرتا ہے۔ اس کے سارے ساتھی تیرے ہاتھ میں ہیں اور وہ تیرے قدموں کے پاس بیٹھے ہیں اور تیری باتوں کو مانیں گے (استثنا ۳۳۔ ۱، ۲، ۳)[۱]

۱۰۶۔ بس میرے ہی سے ڈرو یعنی دنیوی منافع کے فوت ہونے کا اندیشہ نہ کرو[۲]

اس میں اشارہ شرکِ جلی سے زیادہ شرکِ خفی کی طرف ہے۔ بنی اسرائیل جو ضعفِ ایمان کا شکار تھے اخلاقی بیماری سارے اسرائیلیوں کی قوم میں پھیل چکی تھی اور اللہ سبحانہ کی رضا و عدمِ رضا کی جگہ

[۱] سیرت النبی ج ۳ ص ۸۱۴　[۲] حاشیہ شیخ الہندؒ

انسانوں کو راضی رکھنے کی پروا اور ان کی ناخوشی سے بچنے کی اہمیت اچھے اچھے علماء و مشائخ کے دل میں گھر کر چکی تھی [1]

دعوتِ ایمان

ان آیات میں خاص طور پر یہودیوں کو دعوت دی گئی ہے۔ مدینہ کی زندگی میں انہوں نے اسلامی دعوت کا پوری قوت سے مقابلہ کیا اور درونِ خانہ اس کے ختم کرنے کے درپے تھے۔ ان کو یقین ہو گیا تھا کہ اب اقتدار مکمل طور پر اسلام کے ہاتھوں میں منتقل ہو رہا ہے۔ قرآن کی بنیاد پر نئی زندگی کی تشکیل سے ان کو یہ تلخ احساس ہوا کہ قرآنی دعوت ان کو ادب و ثقافت، معیشت و معاشرت غرض زندگی کے ہر شعبے سے باہر نکال دے گی۔

توقع یہ تھی کہ یہودِ مدینہ اس نئے رسول اور اس نئی دعوت کو سب سے پہلے قبول کریں گے کیونکہ ان کو ایک نبی کی آمد کا انتظار تھا جس کے اوصاف سے وہ باخبر تھے اور ان کی کتابوں میں اس کا تذکرہ موجود تھا۔ لیکن انہوں نے اس توقع پر پانی پھیر دیا اس لیے قرآن نے خاص طور پر ان کو ایمان کی دعوت دی ہے۔

ف ۱۰۷۔ کتاب سے مراد قرآن حکیم ہے۔ قرآن پر ایمان لانے سے مقصود ان تمام صداقتوں اور حکموں کو بجان و دل قبول کرنا ہے جو اس میں مذکور ہیں۔ یہ گویا پوری اسلامی شریعت کو قبول کا مختصر ترین طریقۂ تعبیر ہے۔ اور اس لیے ایمانیات کی بہت سی باتیں جن کی تفصیل ہر موقعہ پر ضروری نہیں۔ اس ایک فقرے کے تحت میں آجاتی ہیں۔ قرآن پر ایمان لانے کے معنیٰ یہ ہیں کہ جو کچھ قرآن میں علمی و عملی عقائد و عبادات و احکام مذکور ہیں۔ ان سب کو بے کم و کاست تسلیم کر لیا جائے۔ اگر کوئی ان کو تسلیم ہی نہیں کرتا تو ان کی تعمیل و پیروی کا اس سے کیونکر مطالبہ کیا جا سکتا۔ اس بنا پر اسے ما انزلت سے تعبیر کیا گیا ہے اور جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے الفاظ میں ماجئت بہ فرمایا ہے یعنی جو کچھ میں لے کر آیا ہوں اس پر ایمان لاؤ۔

ف ۱۰۸۔ یہ تصدیق کرتی ہے۔ یعنی قرآن حکیم تورات کا مصدق ہے۔ تصدیق کے معنے ہیں

[1] تفسیر ماجدی ص ۱۹

کسی کو سچا قرار دینا ۔ یعنی قرآن حکیم ہی ایسی کتاب ہے جو پچھلی تمام صداقتوں کی تصدیق کرنے والا ہے اور اس کے نتیجے میں ان صداقتوں کے علمبرداروں کو سچا قرار دیتا ہے اور ان پر ایمان لانا ضروری بتاتا ہے ۔ قرآن کا یہ وصف اس بات کی دلیل ہے کہ وہ انسانی بناوٹ نہیں ہے بلکہ خدائی کام ہے ۔

مصدق لما معکم کے ایک اور معنے بھی بتائے گئے ہیں یعنی تورات میں بتا دیا گیا تھا کہ اگر آنے والا پیغمبر تورات کی تصدیق کرے تو اس کو سچا مان لینا ۔ اور اگر نہ کرے تو جھوٹا ہے ۔ قرآن کہتا ہے کہ میں تورات کا مصدق ہوں اس لیے مجھے ماننے میں تمہیں کوئی تامل نہ ہونا چاہیے ۔ یہ بات یاد رہے کہ احکامِ قرآنی ۔ درباره اعتقادات ، اخبارِ انبیاء ، واحوالِ آخرت و اوامر و نواہی تورات وغیرہ کتبِ سابقہ کے موافق ہیں ۔ ہاں بعض اوامر و نواہی میں نسخ بھی کیا گیا ہے مگر وہ تصدیق کے مخالف نہیں ۔ تصدیق کے مخالف تکذیب ہے اور تکذیب کسی کتابِ الٰہی کی بالکل کفر ہے ۔ منسوخ تو بعض آیاتِ قرآنی بھی ہیں لیکن اسے تکذیب نہیں کہتے [1]

مصدقاً لما معکم کا مطلب یہ بھی ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کی پیش گوئیاں ان کی کتاب میں تھیں ۔ آپ کی تشریف آوری سے اس کی تصدیق ہوئی اور قرآن ان کی تصدیق کر رہا ہے اگر قرآن نہ آتا تو ان کے غلط ہونے کا اندیشہ تھا ۔ لیکن عام مفسرین پہلی بات کو ترجیح دیتے ہیں کہ قرآن تورات کی تصدیق کرتا ہے مگر عام طور پر اگر تورات سے مراد بائیبل کے پرانے عہد نامے کی پانچ کتابیں لیتے ہیں اس وجہ سے یہ الجھن پیش آتی ہے کہ کیا فی الواقع یہ کتابیں کلامِ الٰہی ہیں اور کیا قرآن واقعی ان کا مصدق ہے ؟ لیکن اصل بات یہ ہے کہ تورات سے مراد وہ احکام ہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت سے لے کر ان کی وفات تک چالیس برس کے دوران ان پر نازل ہوئے ۔ ان میں سے دس احکام تو وہ تھے جو اللہ تعالیٰ نے پتھر کی تختیوں پر کندہ کرکے ان کو دیے تھے ۔ باقی ماندہ احکام کو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے لکھوا کر اس کی بارہ نقلیں بنی اسرائیل کے بارہ قبیلوں کو دیں اور ایک نقل بنی لاوی کے حوالے کر دی تھی ۔ اسی کتاب کا نام تورات تھا ۔ اس کی تاریخی حیثیت پر انشاء اللہ مستقل بحث آئے گی ۔ قرآن اسی کو تورات کہتا ہے اور اس کی وہ تصدیق کرتا ہے ۔

۱۰۹ ۔ اور اس کتابِ الٰہی کے پہلے منکر تم نہ بنو ۔ یعنی قرآن کی دیدہ و دانستہ تکذیب کرنے والوں میں پہل مت کرو کہ قیامت تک منکرین کا وبال تمہاری گردن پر ہو ۔ مشرکین مکہ کا انکار

---

[1] حاشیہ شیخ الہند ص ۹

دیدہ و دانستہ نہیں بلکہ بے خبری اور نادانی کا نتیجہ ہے اس لیے انکار میں تمہارا اوّل نمبر نہ ہونا چاہیے۔ یہ کفر پہلے کفر سے بھی سخت ہے[1]

مطلب یہ ہے کہ تمہاری دیکھا دیکھی جو لوگ انکار کر بیں گے ان سب میں اوّل تم ہو گے تو قیامت کے دن سب کے انکار کا وبال تمہارے نامۂ اعمال میں ہوتا رہے گا[2]

ان کو پہلا منکر اس لحاظ سے کہا گیا ہے کہ مشرکین عرب یہود کے تسلیم و اقرار کے بعد جس طرح اس باب میں ان کی تقلید کرتے اسی طرح یہود کے انکار و مخالفت کے بعد اسے بھی سند میں پیش کرتے اور خود بھی ان کی راہ چلتے۔ یہود بہرحال اہلِ کتاب تھے۔ آسمانی کتاب کی قدر انہیں کو ہونا چاہیے تھی اور بطورِ مقتدائے عرب انہی کی ذمہ داری بڑھی ہوئی تھی[3]

۱۰ ۔ تھوڑی قیمت پر میری آیات کا سودا نہ کرو۔ یعنی نبوّت پر ایمان لانا اور قرآن کو ماننا بہت ہی بڑی نعمت ہے۔ اس عظیم نعمت کے مقابلے میں دُنیا کی حقیر منفعتوں کو نہ لو۔ دُنیا کی تمام نعمتیں، تمام دولتیں، تمام ریاستیں اور ساری منفعتیں اس کے مقابلے میں ہیچ ہیں ــــ تھوڑی قیمت سے مراد وہ دنیوی فائدے ہیں جن کی خاطر یہ لوگ اللہ سبحانہٗ کے احکام اور اس کی ہدایات کو رد کر رہے تھے۔ حق فروشی کے معاوضے میں خواہ انسان دُنیا بھر کی دولت لے لے بہرحال وہ تھوڑی ہی قیمت ہے[4]

اللہ سبحانہٗ کے احکام چھوڑ کر ان کو بدل کر اور چھپا کر لوگوں سے حقیر و ذلیل دُنیا نہ وصول کرو جیسا کہ یہود کی عادت تھی[5]

یا یہ کہ دُنیا کی مادی مصلحت کی بنا پر آخری کی ابدی دولت کو نہ چھوڑو یعنی آخرت کی زندگی بہت ہی عظیم ہے اور اس کے مقابلے میں دُنیا بہت ہی حقیر ہے تم اعلیٰ کا ادنیٰ سے تبادلہ نہ کرو۔ گویا استعارے کی زبان میں ان کو سمجھایا گیا ہے کہ دنی اغراض کی خاطر اور کمترین منافع کی وجہ سے ان پیش گوئیوں کا غلط مطلب نہ بتاؤ جو جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں تمہاری کتاب میں موجود ہیں۔

اللہ سبحانہٗ کی آیات کے بدلے ثمناً قلیل لینے کا مطلب صرف یہی نہیں ہے کہ یہودی علماء

---

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۹ [2] بیان القرآن ص ۲۶ [3] تفسیر ماجدی ص ۱۹ [4] تفہیم القرآن
[5] بیان القرآن ص ۲۶

وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿٤٢﴾

اور حق میں باطل کی آمیزش نہ کرو اور حق کو نہ چھپاؤ حالانکہ تم جانتے ہو کہ یہ میری بات ہے۔[۱۱۲]

لوگوں کی مرضی اور ان کی اغراض کی خاطر اللہ تعالیٰ کی آیات کا مطلب غلط بتلا کر لوگوں سے پیسے لیتے تھے۔ بلکہ اس تعبیر سے یہ بتانا مقصود ہے کہ انہوں نے پورے دین کو یک قلم دکانداری اور پیشہ بنا لیا تھا اور ان کی دینی زندگی ہر معنے میں دکانداری کی زندگی ہو گئی تھی۔ علماء ہونے کے معنے ہی یہ ہو گئے تھے کہ دین اور خدا کے نام سے پیشہ کی روٹی کھانے والے، علم دین کا پڑھنا پڑھانا، مسائل دین کی تعلیم، فتویٰ نویسی، ہدایت و وعظ، قرأت و ذکر کوئی کام ایسا نہ تھا جو بغیر معاوضہ کے انجام دیتے۔ اس کی تفصیل انشاء اللہ سورہ توبہ میں آئے گی ——— قرآن نے یہاں ان کی اس گمراہی کی طرف اس لیے اشارہ کیا ہے تاکہ واضح ہو جائے کہ یہودیوں کا ایمان سے محروم ہو جانا دراصل ان کے علماء کی اس گمراہی اور دُنیا پرستی کا نتیجہ تھا۔ حکیم الامت شاہ ولی اللہؒ نے "الفوز الکبیر" میں بڑے درد اور دلسوزی کے ساتھ یہ بات لکھی ہے کہ اگر علمائے یہود کی حالت دیکھنی چاہتے ہو تو آج کل کے علماء کو دیکھ لو۔

[۱۱۱] اور میری نافرمانی سے بچو۔ پہلی آیت کا خاتمہ رہبت پر اور اس کا خاتمہ تقویٰ پر کیا ہے۔ رہبت مطلق ڈر کو کہتے ہیں اور اتقاء محتاط ہونے کو۔ پہلی آیت میں ایفائے عہد کا ذکر تھا اس لیے لفظ رہبت یہ بتانے کے لیے لائے کہ لوگوں کی رائے عامہ کے اندیشہ سے بالا اور مالی منفعتوں کے خطرے میں پڑنے کے خیال سے بے خوف ہو کر صرف اللہ سبحانہٗ سے ڈر کر ایفائے عہد کرو اور یہاں لفظ اتقاء لا کر بتایا ہے کہ بالا دست زیردست کا اور زبردست بالادست کے غضب سے بے فکر ہو کر دل سے اللہ سبحانہٗ کی نافرمانی سے بچنے کا عہد کرو۔ لوگوں کے قلوب و جوارح پر اللہ سبحانہٗ کا قبضہ ہے۔ دلوں کی تسخیر کرنا اسی کا کام ہے اس لیے ہر قدم پر اللہ سبحانہٗ کی نافرمانی سے بچنا چاہیے اور اس کتاب الٰہی پر ایمان لانا چاہیے۔
علامہ آلوسیؒ نے یہاں یہ نکتہ خوب بیان فرمایا کہ پہلی آیت میں بنی اسرائیل کے عوام سے

خطاب تھا اس لیے رہبیت آیا ہے اور یہاں ان کے علماء سے خطاب ہے اس لیے اتقاء استعمال ہوا ہے۔

حق میں باطل کی آمیزش

ادھوری بات کہنا کہ مطلب کچھ کا کچھ ہو جائے، جھوٹ کو لفظی اور ظاہری سچائی کا رنگ دے دینا بالکل گھڑے ہوئے جھوٹ سے کہیں بڑھ کر دھوکے اور مغالطے کا سبب بن جاتا ہے۔ اسی سے ملتی جلتی چیز کا نام آج کی اصطلاح میں پروپیگنڈا ہے۔ موجودہ مغربی سیاست کاروں کے یہودی اس فن میں امام رہ چکے ہیں۔

خود غرض لوگ احکام شرعیہ کو دو طرح تبدیل کرتے ہیں۔ ایک یہ کہ اصل بات ہی کو ظاہر نہیں کرتے اسے کتمان کہتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ ظاہر تو کرتے ہیں مگر اس میں خلط ملط کر دیتے ہیں۔ اسے لبس کہتے ہیں۔ اللہ سبحانہٗ نے دونوں سے منع کر دیا ہے [1]

لبس کے اصلی معنے چھپانے کے ہیں لیکن اگر یہ باب سَمِعَ سے ہے تو اس کے معنے پہننا ہیں۔ اور اگر ضَرَبَ سے ہو تو اس کے معنے ملاوٹ کے ہیں۔ اسی سے تلبیس ہے جس کے معنے دھوکہ دینے کے ہیں۔

احکامِ الٰہی کو بدل دینے کی دو ہی صورتیں ہیں۔ ایک ان میں اندرونی تخلیط و تلبیس ہے دوسرے ان کا اخفاء کتمان۔ یہودیوں نے اپنے دینی نوشتوں میں دونوں طرح کے عمل جاری کر رکھے تھے۔ توراۃ کے تلف ہو جانے سے اوّل تو یوں ہی کتنے ہی احکام سرے سے غائب ہو گئے۔ پھر جو باقی رہ گئے تھے ان کو حاملانِ توراۃ نے اپنے اپنے اغراض و مصالح کے ماتحت خدا معلوم کہاں سے کہاں پہنچا دیا تھا [2]

۱۱۲ ۔ اس آیت میں دو باتوں سے روکا ہے۔ ایک یہ کہ حق میں باطل کی ملاوٹ نہ کرو۔ دوسرے یہ کہ جان بوجھ کر حق کو نہ چھپاؤ۔

علماء یہود عوام کو گمراہ کرنے کے لیے یہ دونوں حربے استعمال کرتے تھے۔ جن لوگوں کو توراۃ میں بیان شدہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق پیش گوئیوں کا کچھ علم ہوتا

---

[1] بیان القرآن ص ۲۷ [2] تفسیر ماجدی ص ۱۹

ان کے دلوں میں شبہات پیدا کر کے ان کو یقین دلا دیتے کہ یہ صفات و علامات حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم پر منطبق نہیں ہیں۔ ایسے لوگ اپنی جگہ سے ہل جاتے یہ تو لبس الحق بالباطل ہے اور اس سے ان کو منع کیا گیا ہے۔ اور جو لوگ بالکل بے خبر ہوتے ان سے وہ اصل بات ہی کو پوشیدہ رکھتے تاکہ وہ اندھیرے میں رہیں اور راستہ پر آنے کی کوئی صورت نہ ہو سکے یہ کتمانِ حق ہے اور وانتم تعلمون کا مطلب یہ ہے کہ تم خوب جانتے ہو کہ تم لبس و کتمان کے ذریعے لوگوں کو گمراہ کر رہے ہو اور یہ بھی تمہیں معلوم ہے کہ اللہ سبحانہ کے بندوں کو گمراہ کرنا کتنا بڑا جرم ہے[1]

شاہ عبدالقادرؒ نے آیت کا یہی مطلب اس طرح بیان فرمایا ہے کہ مت ملاؤ سچی بات کو جو تورات میں صفت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی لکھی ہے اس جھوٹ کے ساتھ جو تم نے خود بنایا ہے اور تم جانتے ہو کہ جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ سبحانہ کے برحق رسول ہیں[2]

دراصل جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو مدینے میں اسلام کی دعوت دینی شروع کی تو یہ قدرتی بات تھی کہ اَن پڑھ عرب اہلِ کتاب سے پوچھتے کہ آپ بھی نبی کے پیروکار ہیں اور کتاب کو مانتے ہیں آپ ہمیں بتائیں کہ یہ صاحب جو مدعیٔ نبوّت ہیں ان کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ یہودی علماء اس سوال کا جواب لوگوں کو کبھی صحیح نہ بتاتے۔ ان کے لیے یہ کہنا تو بے حد مشکل تھا کہ توحید کا جو درس محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دے رہے ہیں غلط ہے یا انبیاء، ملائکہ اور آخرت کے بارے میں آپ کے نظریات صحیح نہیں ہیں۔ کیونکہ یہ سب وہ خود مانتے تھے۔ انہوں نے طریقہ یہ اختیار کیا کہ ہر پوچھنے والے کے دل میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف کوئی نہ کوئی شبہ ڈال دیتے۔ کوئی ایسا شوشہ چھوڑ دیتے جس سے لوگ شکوک کے شکار ہو جائیں اور طرح طرح کے الجھن میں ڈالنے والے سوالات چھیڑ دیتے تاکہ لوگ ان میں خود ہی الجھیں اور دوسروں کو بھی الجھانے کی کوشش کریں۔ ان کا یہی رویّہ تھا جس کی بنا پر ان سے فرمایا جا رہا ہے کہ حق پر باطل کے پردے نہ ڈالو اپنے جھوٹے پروپیگنڈے اور شریرانہ شبہات سے حق کو دبانے اور چھپانے کی کوشش نہ کرو اور حق و باطل کو خلط ملط کر کے دنیا کو دھوکہ نہ دو[3]

بہرحال یہ آیت یہودی علماء کے اندازِ غوایت اور اغواء پر ایک سخت تنقید ہے اور دین کی زندگی میں عقائد کی حدود کے اندر خود ساختہ اوہام اور اعمال کی حدود میں گھڑی ہوئی رسوم کو داخل کرنے، ان پر دین کا لیبل لگانے کے خلاف ایک بہت بڑا چیلنج ہے۔ اگر آج ہم اپنے ایمان و عمل کا احتساب کریں

---

[1] جواہر القرآن ص ۴۴ [2] موضح القرآن [3] تفہیم القرآن ج ۱ ص ۷۳

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ﴿٤٣﴾

اور نماز قائم کرو (اس سے تمہارے اندر رُوحِ عبادت تازہ ہوگی) اور زکوٰۃ کی ادائیگی کرو (اس سے تمہاری رُوح میں پاکیزگی آئے گی) اور اللہ کی بارگاہ میں جھکنے والوں کے ساتھ تم بھی سرِ نیاز خم کردو۔

تو ہمیں معلوم ہوجائے کہ لبس الحق بالباطل اور کتمان کی حقیقت معلوم کرنے کے لیے اور کسی طرف دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ اس دور کے یہودی علماء کا چہرہ ہے۔ ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے منبر پر فرمایا تھا تمہارے متعلق مجھے سب سے زیادہ خطرہ اس شخص کا ہے جو منافق علیم ہو۔ لوگوں نے دریافت کیا کہ منافق ہوکر پھر علیم بھی کیسے؟ فرمایا کہ اس کی باتیں بڑی پُر حکمت ہوں گی مگر اس کا عمل حق کے خلاف ہوگا۔

اسلام کی دعوت

دعوتِ ایمان کے بعد ان آیات میں اسلام یعنی ایمان کی بنیاد پر اٹھے ہوئے عمل کی یہودیوں کو دعوت دی ہے اور تمام اسلامی احکام میں سے خاص طور پر نماز اور زکوٰۃ کا مطالبہ کیا ہے۔ اس سے یہ بات قطعی طور پر واضح ہوگئی کہ جس بات کے بعد ایک جماعت مسلمانوں کی جماعت تسلیم کی جاسکتی ہے وہ یہ ہے کہ ایمان کے بعد عمل میں دو باتیں ضرور آجائیں۔ نماز کی جماعت کا قیام اور زکوٰۃ کی ادائیگی۔ اگر یہ دو باتیں ایک جماعت میں مفقود ہوں تو اس کا شمار مسلمانوں میں نہ ہوگا۔

یہ سوال کہ تمام اعمال میں سے نماز و زکوٰۃ کا خصوصیت سے ذکر کیوں کیا گیا ہے؟ اس لیے کہ نماز سے ان میں حبِّ جاہ کم ہوگی اور زکوٰۃ سے حبِّ مال دور ہوگی۔ ان میں یہی دو بیماریاں ساری نافرمانیوں اور سرکشیوں کا باعث ہیں [1]

[1] بیان القرآن ص ۲۷

۱۱۳ ۔ نماز کے لیے عربی لفظ صلاۃ ہے۔ صلاۃ کے معنے عربی اور عبرانی زبانوں میں دعا کے آتے ہیں، اس لیے نماز کی لفظی حقیقت اللہ سبحانہ، سے درخواست اور التجا ہے اور اس کی معنوی حقیقت بھی ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ، فرماتے ہیں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار فرمایا کہ اَلدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَةِ دعا، عبادت کا مغز ہے۔ اور نعمان بن بشیرؓ کہتے ہیں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اَلدُّعَاءُ هُوَ الْعِبَادَةُ فرماکر یہ آیت پڑھی کہ اُدْعُوْنِیْ اَسْتَجِبْ لَكُمْ اِنَّ الَّذِیْنَ یَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِیْ سَیَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دَاخِرِیْنَ ۔

لفظ اقامت کے معنے سیدھا کرنا اور ثابت کرنا ہیں اور چونکہ استقامت اور اقامت ہونے کی صورت میں گر جانے کا خطرہ کم ہوتا ہے اس لیے اقامت کے معنے ہمیشہ کرنے کے ہیں۔

۱۱۴ ۔ لفظ زکوٰۃ کے لغوی معنے دو آتے ہیں پاک ہونا اور بڑھنا۔ اسلامی عبادات کا دوسرا رکن زکوٰۃ ہے جو آپس میں انسانوں کے درمیان ہمدردی اور باہم ایک دوسرے کی امداد اور معاونت کا نام ہے۔ زکوٰۃ کا دوسرا نام صدقہ ہے جس کا اطلاق تعمیم کے ساتھ ہر مالی اور جسمانی امداد اور نیکی پر ہوتا ہے لیکن اسلام کی قانونی زبان میں زکوٰۃ صرف اس مالی امداد کو کہتے ہیں جو ہر اس مسلمان پر واجب ہے جو دولت کی ایک مقدار کا مالک ہے۔

نماز ہو یا زکوٰۃ تمام آسمانی صحیفوں میں فرض بتائی گئی ہے۔ قرآن کا دعویٰ ہے اور اس کی تائید مختلف آسمانی صحیفوں سے ہوتی ہے کہ جس طرح نماز مذہب کا جزو لاینفک بنی اسی طرح زکوٰۃ بھی تمام مذاہب کا ہمیشہ ضروری جزو رہی ہے۔ بنی اسرائیل سے اللہ تعالیٰ کا جو عہد تھا اس میں نماز اور زکوٰۃ دونوں تھیں۔

لَئِنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَاٰتَیْتُمُ الزَّكٰوةَ ۔

۱۱۵ ۔ جھک جاؤ جھک جانے والوں کے ساتھ۔ یعنی باجماعت نماز پڑھا کرو۔ پہلے کسی دین میں باجماعت نماز نہ تھی اور یہود کی نماز میں رکوع نہ تھا۔ آیت کا خلاصہ یہ ہوا کہ صرف امور مذکورہ بالا نجات کے لیے تم کو کافی نہیں بلکہ تمام اصول میں نبی آخرالزمان کی پیروی کرو۔ نماز بھی ان کے طور پر پڑھو جس میں جماعت بھی ہو اور رکوع بھی ہے[1]

یہاں یہ سوال بے حد اہمیت رکھتا ہے کہ نماز کے حکم کے باوجود علیحدہ رکوع کا کیوں حکم دیا ہے

---

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۲۰

شیخ الہندؒ کا جواب آپ پڑھ چکے ہیں۔ دوسرے علماء کی رائے بھی سنیئے ۔
خضوع وخشوع کو عمل باطنی تواضع میں اہلِ تواضع کی معیت کو بہت بڑا دخل ہے اس لیے مع الراکعین کا اضافہ نہایت برمحل ہے[1]

یہاں نماز کا ایک جز بول کر کل نماز مراد لی گئی ہے جیسے قرآن میں ایک جگہ قرآن الفجر فرماکر پوری نمازِ فجر مراد ہے اور بعض احادیث میں سجدہ کا لفظ بول کر پوری رکعت مراد لی گئی ہے اس لیے مرادِ آیت کی یہ ہوگئی کہ نماز پڑھو نماز پڑھنے والوں کے ساتھ۔ اور رکوع کی تخصیص کی وجہ یہ ہے کہ یہودیوں کی نماز میں سجدہ وغیرہ تو تھا مگر رکوع نہیں تھا۔ رکوع اسلامی نماز کی خصوصیت ہے اس لیے راکعین کے لفظ سے اُمتِ محمدیہ کے نمازی مراد ہوں گے اور معنی یہ ہوں گے کہ تم بھی اُمتِ محمدیہ کے نمازیوں کے ساتھ نماز ادا کرو[2]

اصل بات یہ ہے کہ چونکہ نماز یہودیوں میں بھی تھی اور صرف یہودیوں میں نہیں بلکہ عیسائیوں میں بھی تھی۔ چنانچہ حدیث میں یہودیوں اور عیسائیوں کی نماز کے تذکرے ہیں مثلاً حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نماز پڑھو تو تہبند باندھ لو یا چادر اوڑھ لو یہودیوں کی طرح ننگے نماز نہ پڑھو (کنز العمال ص ۲)، تم یہودیوں کی طرح صرف اوپر سے نماز میں چادر نہ ڈال لو بلکہ اس کو باندھ لیا کرو (۴۳ ص) نماز میں یہودیوں کی طرح مت جھومو (ص ۱۱۲) تم یہودیوں کے برخلاف نماز میں موزے پہنے رہو (۱۱۲) میری اُمت میں اس وقت تک دین کا کچھ نہ کچھ اثر رہے گا جب تک لوگ یہودیوں کی تقلید میں مغرب کی نماز میں ستاروں کے نکلنے کا اور عیسائیوں کی تقلید میں صبح کی نماز میں ستاروں کے ڈوبنے کا انتظار نہ کریں گے۔ (ص ۸۴)

ان حوالوں سے ثابت ہوتا ہے کہ یہودی نماز ادا کرتے تھے۔ لیکن یہودیوں کی نماز میں رکوع نہ تھا اور نظامِ جماعت اُن کی بدعملی سے درہم برہم ہو چکا تھا۔ اس آیت میں چونکہ قرآن ایمان کی دعوت کے بعد عملی اسلام کی طرف یہودیوں کو دعوت دے رہا ہے اس لیے خاص طور پر یہ کہا گیا ہے کہ اس نماز کی ادائیگی کرو جو رکوع والی ہے اور باجماعت ادا کی جاتی ہے۔ اور مطلب یہ ہے کہ اسلام کے علم وعمل کو اپناؤ۔ اسلام سے پہلے دُنیا میں کوئی ایسا مذہب نہ تھا جس میں نماز کو اہمیت نہ دی گئی ہو لیکن وہ مذہب چونکہ خاص خاص قوموں اور وقتوں تک محدود تھے اس لیے

---

[1] بیان القرآن ص ۲۷　[2] معارف القرآن ج ۱ ص ۱۵۶ ۔

ان کے اندر سے عملاً اس کی اہمیت جاتی رہی چنانچہ اسلام سے پہلے دنیا کے کسی مذہب میں آج تک نماز کو واضح، معین اور تاکیدی حیثیت حاصل نہیں یعنی کسی مذہب کے پیروں کے عمل سے بھی اس کی صورت نمایاں نہیں ہوتی ورنہ جیسے پہلے بتایا جا چکا ہے کہ قرآن کی رُو سے انبیاء علیہم السلام نے اپنی اُمتوں کو نماز کا حکم دیا ہے۔ لیکن موجودہ حیثیت یہ ہے کہ اسلام کے سوا نماز کہیں نمایاں، واضح اور مؤکد صورت میں باقی نہیں رہی ہے اور اس کا سبب یہ ہے کہ چونکہ جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خاتم الانبیاء اور قرآن خاتم الکتب ہو کر آیا ہے اس لیے اس فریضہ کو دین کامل میں ایسی واضح، مؤکد اور نمایاں صورت دی گئی ہے کہ وہ قیامت تک دنیا میں قائم اور باقی رہے۔ یہ اسلام کا وہ فریضہ ہے جس سے کوئی مسلمان متنفس جب تک اس میں کچھ بھی ہوش و حواس باقی ہے کسی حالت میں سبکدوش نہیں ہو سکتا۔ قرآن میں سو مرتبہ سے زیادہ اس کی تعریف، اس کی بجاآوری کا حکم اور اس کی تاکید آتی ہے۔ اس کے ادا کرنے میں سُستی نفاق کی علامت اور اس کا چھوڑ دینا کفر کی نشانی بتائی گئی ہے۔ یہ فرض ہے جو اسلام کے ساتھ پیدا ہوا اور اس کی تکمیل اس شبستانِ قدس میں ہوئی جس کو معراج کہتے ہیں۔

یہاں یہودیوں کو دعوت اسلام و ایمان کی آیات پڑھتے ہوئے یہ خلش بے معنے ہے کہ رسالت کی دعوت کیوں نہیں دی گئی۔ مَآ اَنْزَلْتُ جو کچھ میں نے اتارا۔ یہ ایمان کی دعوت میں ایمان باللہ، ایمان بالرسول، ایمان بالیوم الآخر، ایمان بالکتب، ایمان بالملائکہ سب ہی آگئے ہیں۔ بلکہ اس میں سب سے واضح طور پر رسالت کی دعوت ہے کیونکہ مَآ نزلت یعنی قرآن دعوائے رسالت کی دلیل ہے دلیل کو منوانے کا مقصد ہی یہ ہے کہ اس کے مدلول کو تسلیم کرو۔ اس کا مدلول حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا اللہ کا رسول ہونا ہے۔ کون ہے جو علت کو مان کر معلول کا، دلیل کو مان کر مدلول کا، کارسازی کو دیکھ کر کارساز کا، حکمت کو دیکھ کر حکیم کا اور عمل کو دیکھ کر عامل کا انکار کرے۔

قرآن اگر نبوت کا معجزہ اور اس کی دلیل ہے تو اس کو منوانے کا مطالبہ کرنا نبوت ہی کو منوانا ہے کیونکہ انسان کی فطرت یہ کبھی باور نہیں کر سکتی کہ دلیل موجود ہو اور مدلول نہ ہو۔ اس کا وجدان پکارتا ہے کہ ایسا ہونا ممکن نہیں ہے۔

یہ بات انسان کے وجدان اذعان کے خلاف ہے کہ قرآن کا مطالعہ کرنے کے بعد اس کو کلام رب العالمین نہ مانے اور جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا یقین اس کے اندر جاگ نہ اُٹھے۔

أَتَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ أَنْفُسَكُمْ وَأَنْتُمْ تَتْلُونَ الْكِتٰبَ ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿٤٤﴾

کیا تم لوگوں کو ایسی حالت میں نیکی کا حکم دیتے ہو کہ تمہیں خود اپنا پتہ نہیں ہے کہ تمہاری عملی زندگی کیسی ہے۔ حالانکہ تم کتابِ الٰہی کی تلاوت کرتے رہتے ہو۔ کیا تم گفتار و کردار کے اس تضاد پر غور نہیں کرتے ہو۔ اتنی موٹی سی بات بھی تمہاری عقل میں نہیں آتی ہے؟

بہرحال یہودیوں کو حکم ہو رہا ہے کہ وہ اپنی فتنہ انگیزیاں چھوڑ کر ایمان و اسلام کو اپنا ئیں اور اعمالِ اسلامی میں نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں۔ اگر وہ ایسا کرلیں تو مسلمان جماعت کے فرد ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مدینہ کی زندگی میں جو اعمال اہلِ کتاب اور اہلِ ایمان کے درمیان حدِ فاصل تھے وہ یہی اعمال تھے۔ ایمان کے علاوہ ان دونوں کی دعوت اس لیے ہے کہ دو نظام ہائے زندگی میں امتیاز ان کے الگ الگ شعائر کے ذریعے ہی ہو سکتا ہے۔ اسلامی شعائر میں انفرادی اور اجتماعی زندگی میں جیسے نماز سب سے زیادہ امتیازی عمل ہے۔ ایسے ہی سیاسی زندگی میں زکوٰۃ سب سے زیادہ اہم رکن ہے۔ لہٰذا اگر عبادات میں وہ ہماری نماز قائم کر لیتے ہیں اور سیاسی لحاظ سے ہماری اتنی برتری تسلیم کر لیتے ہیں کہ زکوٰۃ دینے کو تیار ہو جاتے ہیں تو یہ اس بات کی کھلی شہادت ہو گی کہ اب وہ دل سے نبوتِ محمدیہ کو مان چکے ہیں۔

فنِ دینداری

ان کے اخلاق کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ علم کی حد تک وہ کتاب اللہ کا مطالعہ کرتے تھے اور دوسروں کو اس کی دعوت دینے میں بہت باک اور دلیر تھے لیکن خود فراموشی کا شکار تھے یعنی علم رکھتے ہوئے خود علم کے تقاضوں کو عملی زندگی میں نہ اپناتے تھے۔ دین سے دینداری کا نہیں بلکہ فنِ دینداری

اور پیشہ ٔ دینداری کام لیتے ۔ پہلی آیت میں پیشہ ٔ دینداری سے روکا گیا ہے اور اس آیت میں فنِ دینداری پر زجر و توبیخ فرمائی ہے ۔ دونوں کے درمیان دینداری کی تلقین ہے ۔ حضرت شیخ الہندؒ کا یہ تشریحی نوٹ پڑھیے کہ یہ آیت یہود کے بارے میں نازل ہوئی ہے ۔ یہ لوگ اپنے ان رشتہ داروں کو جو اسلام لا چکے تھے کہتے تھے کہ تم دینِ اسلام پر قائم رہو، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نبی برحق ہیں لیکن خود دعوتِ اسلام قبول کرنے کے لیے تیار نہ ہوتے ۔

۱۱۶ ؎۔ نیکی بِرّ کا ترجمہ ہے ۔ بِرّ ہر قسم کی نیکیوں کے لیے ایک جامع لفظ ہے ۔ بڑی نیکی کو کہتے ہیں کیونکہ بَر خشکی کے وسیع رقبہ کو کہتے ہیں ۔

بعض علمائے یہود یہ کمال کرتے تھے کہ اپنے لوگوں سے کہتے کہ یہ دینِ اسلام اچھا ہے اور خود مسلمان نہ ہوتے اور نیز علمائے یہود بلکہ ظاہر بینوں کو اس موقعہ پر یہ شبہ ہوتا ہے کہ جب ہم احکام شریعت کی تعلیم میں کوتاہی نہیں کرتے ہیں تو اس کی چنداں ضرورت نہیں ہے کہ ہم خود بھی احکام شرعیہ پر عمل کریں ۔ جب ہماری ہدایت کے مطابق بہت سے لوگ اعمالِ شرعیہ بجا لاتے ہیں تو بحکم قاعدہ اَلدَّالُّ عَلَی الْخَیْرِ کَفَاعِلِہٖ وہ ہمارے ہی اعمال ہیں ۔ تو اس آیت میں دونوں کا ابطال ہو گیا ۔

یہود اپنے صاحبِ علم وکتاب ہونے کی وجہ سے اہلِ عرب کی نظر میں محترم تھے ۔ مدینہ کے شہری اکثر ان سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی دعوت کے موضوع پر مشورے کرتے کہ اس مدعیٔ نبوت کے دعوے میں کہاں تک صداقت ہے ؟ علمائے یہود ایسے مواقع پر لوگوں کو یہی کہتے کہ واقعی اللہ کے پیغمبر ہیں ۔ ہماری پیش گوئیوں کے مطابق ان میں یہ علامات پائی جاتی ہیں لیکن اپنے عمل کے وقت ہوائے نفس حائل ہو جاتی اور یہ خیال آتا کہ اسلام لانے کے بعد ماتحتی اور پابندی کی زندگی گزارنی ہوگی ۔ سیادت کے یہ مالی اور جاہی مزے نہ رہیں گے [1]

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ مدینہ کے علمائے یہود اپنے اپنے رشتہ داروں کو جو مسلمان تھے نصیحت کرتے تھے کہ تم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرتے رہو ۔ اس آیت میں ان کی اس بدکرداری پر ملامت کی گئی ہے کہ دوسروں کو پیروی کی تلقین کرتے ہو اور اپنی خبر نہیں لیتے کہ کفر پر ڈٹے ہوئے ہو [2] (قرطبی)

---

[1] تفسیر ماجدی ص ۲۰ [2] معارف القرآن م ش ص ۱۵۷

اَلْبِرُّ نیکی کو کہتے ہیں۔ لیکن لغت میں اس کا اطلاق عام ہے اور ہر قسم کی نیکی کو شامل ہے۔
یہاں بِرّ سے مراد حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو ماننا ہے۔

۱۱۷ ۔ خود کا پتہ نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ علم رکھتے ہوئے خود اس کے تقاضوں پر عمل نہ کرنا۔ یہ جانتے ہوئے کہ نماز فرض ہے نماز نہ پڑھنا، جھوٹ حرام ہے اور جھوٹ سے نہ بچنا۔ اس آیت میں دھمکی اسی بات پہ ہے کہ علم اور دوسروں کو تعلیم کے باوجود خود عمل نہیں کرتے ہیں۔
علمائے تابعین نے اسی سلسلے میں ان کے کردار کا جو چہرہ پیش کیا ہے یہ ہے:

حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ علمائے بنی اسرائیل لوگوں کو نیکی، تقویٰ اور طاعت کی تلقین کرتے لیکن خود نیکی، تقویٰ اور طاعت سے گریزاں رہتے۔

حضرت ابن جریج رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ یہ لوگوں کو نماز روزے کو کہتے مگر یہ خود نماز روزے کے پاس نہ جاتے۔

حضرت زید رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ یہودی علماء سے جب کوئی شخص ایسا معاملہ دریافت کرتا جس میں کسی کا حق وابستہ نہ ہو اور نہ اس کے ساتھ کوئی رشوت ہو تو وہ اسے حق اور سچی بات بتلاتے۔

ان بزرگوں کی یہ تشریحات بتا رہی ہیں کہ ان یہودی علماء میں پیشہ ورانہ دینداری نے ایک سے زیادہ اخلاقی بیماریاں پیدا کر دی تھیں۔ یہ علمی زندگی میں سوسائٹی میں اتنا اونچا مقام رکھتے تھے کہ کتاب اللہ کے عالم تھے اور ان کے علم پر لوگوں کو اس قدر اعتماد تھا کہ عام شہری زندگی کی دینی ہدایت میں قیادت ان کے ہاتھ میں تھی۔ لیکن یہ خود بے عملی کا شکار تھے۔ اپنی ذات کی حد تک ان کا علم بے سود، کتاب الٰہی ان کے حق میں ایک آرٹ اور علم دین ان کی زندگی کا کاروبار ہو کر رہ گیا تھا۔ قرآن ان کو اسی پہ ملامت کر رہا ہے۔

۱۱۸ ۔ کتاب اللہ سے اتنا گہرا تعلق کہ صرف اس کے عالم ہی نہ تھے بلکہ اس کا پڑھنا پڑھانا ان کی زندگی کا خاص مشغلہ تھا۔ مدینہ شہر میں اس کی تعلیم و تعلم کے لیے بیت المدارس کے نام سے دینی درس گاہ قائم تھی۔ اس کے باوجود خود کامل علم رکھتے ہوئے ثمرہ علم یعنی عمل سے محروم تھے۔ ان کی حیثیت اس راہ گیر سے مختلف نہیں ہے جو صحیح راستہ کو چھوڑ کر غلط راہ پر چل پڑے اور راستہ میں ملنے والے ہر شخص کو نصیحت کرتا جائے کہ یہ راستہ غلط ہے اس پر نہ چلنا۔

آپ یہاں شاید ذہنوں میں یہ خلش محسوس کریں کہ آیت کی روشنی میں بے عمل یا بدعمل شخص کو

دوسروں کو نصیحت کرنے، وعظ کرنے، نیکی کا راستہ بتانے کی افادیت نہیں ہے ـــــ یہ غلط بالکل بیجا ہے کیونکہ آیت قرآنی کا یہ مقصود نہیں ہے۔ قرآن کا مطالبہ یہاں صرف یہ ہے کہ واعظ، ناصح، معلم، مبلغ کو اپنے کہے پر عمل کرنا چاہیے اور اپنی زندگی کو اپنے علم کے تقاضوں کے مطابق بنانا چاہیے دین کو دینداری کا فن اور دینداری کا پیشہ نہ بنائے۔ یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ بے عمل یا بدعمل کسی کو نصیحت کرنے، نیکی کی تلقین کرنے کا مجاز نہیں ہے۔ حضرت شیخ الہندؒ فرماتے ہیں:

آیت سے مقصود یہ ہے کہ واعظ کو اپنے وعظ پر عمل کرنا چاہیے یہ غرض نہیں ہے کہ فاسق کسی کو نصیحت نہ کرے۔

مولانا اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں:

اس سے یہ نہیں نکلتا کہ بے عمل کو واعظ بننا جائز نہیں ہے بلکہ یہ نکلتا ہے کہ واعظ کو بے عمل بننا جائز نہیں ہے۔ دونوں باتوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

مفتی محمد شفیع صاحب فرماتے ہیں:

یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ بے عمل کے لیے دوسروں کو وعظ و تلقین کرنی ناجائز ہے اور جو شخص کسی گناہ میں مبتلا ہو وہ دوسروں کو اس گناہ سے باز رہنے کی تلقین نہ کرے۔ خلاصہ یہ ہے کہ آیت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بے عمل کو وعظ کہنا جائز نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ واعظ کو بے عمل نہ ہونا چاہیے اور دونوں میں فرق واضح ہے۔

لیکن یہاں یہ سوال بھی ہوتا ہے کہ بے عمل نہ ہونے پر زور دینا اگر آیت قرآنی کا مقصود ہے تو پھر اس میں واعظ کی تخصیص کیوں ہے۔ بے عملی تو واعظ اور غیر واعظ دونوں کے لیے ناجائز ہے۔ واقعی ناجائز تو دونوں کے لیے ہے مگر واعظ کی تخصیص کی وجہ یہ ہے کہ واعظ کا جرم غیر واعظ کے مقابلے میں زیادہ سنگین ہے۔ کیونکہ واعظ جرم کو جرم سمجھتے ہوئے جان بوجھ کر کرتا ہے اس کے پاس ناواقفیت کا عذر نہیں ہوتا برخلاف غیر واعظ اور ان پڑھ کے کہ اس کو چاہے نہ جاننے کی پاداش میں باز پرس ہو لیکن ارتکاب گناہ کی حد تک اس کے پاس ناواقفیت کا عذر ہے۔

قرآن میں عام شہریوں کی گنہگارانہ زندگی کو بدعملی کہا ہے۔ لَبِئْسَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ۔ لیکن علمائے کرام اور مشائخ طریقت کی گنہگارانہ زندگی کو بدعملی نہیں بلکہ بدکاری کہا ہے لَبِئْسَ مَا كَانُوا يَصْنَعُونَ۔ عمومی کردار عمل ہے اور علماء کا کردار نہیں بلکہ صنعت ہے، فن کاری ہے، آرٹ ہے ـــــ بہرحال مقصد یہ بتانا ہے کہ معلم اور واعظ کے علم و عمل اور قال و حال میں

وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ۭ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ ۝

ربع

الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّھُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَاَنَّھُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ۝

اور صبر و نماز کی قوتوں سے اپنی اصلاح میں مدد لو۔[119] اور بلا شبہ نماز[120] ایک ایسا عمل ہے جو آرام پسند طبیعت کے لیے بہت ہی بھاری ہے۔ لیکن جن کے دل اللہ کے لیے عاجزی سے شرمسار ہیں اور جن کو یقین[121] ہے کہ ان کو اللہ سے ملنا ہے اور اس کے حضور میں پیش ہونا ہے تو ان پر نماز کا عمل بھاری نہیں ہے۔

ہم آہنگی ہونی چاہیے۔

اس موضوع پر جب احادیث میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سامنے آتے ہیں تو اوروں کا پتہ نہیں مگر میں تو ایمان کی ساری کمزوریوں کے اعتراف کے ساتھ صرف اپنی کہتا ہوں کہ میں کہہ نہیں سکتا۔ دل و دماغ پر کیا گزرتی ہے۔ حافظ ابن کثیرؒ نے تفسیر میں بڑی دلسوزی کے ساتھ ارشادات لکھے ہیں۔ آئیے آپ بھی سن لیجیے اور عبرت حاصل کیجیے۔

حضرت جندب بن عبد اللہؓ کہتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ وہ عالم جو لوگوں کے لیے معلمِ خیر ہوتا ہے اور خود با عمل نہیں ہوتا اس چراغ کی طرح ہے جو لوگوں کے لیے روشنی کا سامان کرتا ہے لیکن خود جلتا رہتا ہے۔

حضرت انس بن مالکؓ کہتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ شبِ معراج میں میرا گزر ایسے لوگوں پر ہوا جن کے ہونٹ آگ کی قینچیوں سے کاٹے جا رہے تھے۔ میں نے دریافت کیا کہ یہ کون لوگ ہیں؟ جواب دیا کہ دنیا میں آپ کی امت کے واعظ، خطیب اور لیکچرار ہیں جو لوگوں کو نیکیوں کی تلقین کرتے تھے اور خود عمل نہیں کرتے تھے حالانکہ کتابِ الٰہی پڑھتے تھے۔

بہرحال یہ آیت ان علماء کی مذمت کر رہی ہے جن کا عمل ان کے علم سے ہم آہنگ نہ ہو۔ یہ صرف یہودی علماء کے کردار کی کہانی نہیں ہے بلکہ ان تمام لوگوں کے لیے اس میں بہت بڑی

عبرتیں ہیں جو ایمان کے مدعی ہو کر علمِ نبوت کے سرمایہ کے محافظ ہیں لیکن ان کی زندگی کا کوئی گوشہ علمِ نبوت سے ہمنوا نہیں ہے۔ وہ مطمئن ہیں کہ ہم قرآن کی تبلیغ کر رہے ہیں، سنت کی تعلیم میں مشغول ہیں، ہماری تعلیم و تبلیغ ہی ہمارے لیے سامانِ نجات کافی ہے۔ ہمیں خود احکام پر عمل پیرا ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔

دو نفسیاتی بیماریوں کا علاج

یہودی علماء کی زندگی پر اب تک جو تنقیدی تبصرہ قرآن نے کیا ہے اور جن جن اخلاقی کمزوریوں کی نشاندہی کی ہے یعنی حق سے روگردانی اور انکار میں سبقت، دینی زندگی میں کاروباری اور پیشہ ورانہ ذہنیت، کلامِ الٰہی میں تحریف، دعوتِ حق کے خلاف پروپیگنڈا، گفتار و کردار میں تضاد اور علم رکھتے ہوئے بے عملی کا مظاہرہ۔ ان سب اخلاقی کمزوریوں کا باعث صرف ان میں دو بدترین عادتوں کا ظہور تھا۔ ایک مال سے محبت اور دوسرے جاہ سے پیار۔ اور یہ دو محبتیں اگر یکجا ہوں تو حاصل جمع حسد ہوتا ہے۔

قرآن بڑی خیر خواہی، ہمدردی اور دلسوزی سے ان آیات میں ان کو ان بیماریوں کو دور کرنے کی تدبیر اور ان کا علاج بتا رہا ہے پہلے حبِ مال کا اور دوسرے نمبر پر حبِ جاہ کا علاج تجویز کیا ہے۔

۱۱۹ھ۔ مدد لینا استعانت کا ترجمہ ہے۔ اور اسلامی قانون میں اسباب کو اسباب سمجھ کر مدد لینا جائز ہے۔ اگر اسباب کو علت سمجھے تو پھر ناجائز ہے۔ علت دنیا میں ہونے والے تمام کاموں کی اللہ کی ذات ہے۔ آفتاب کی روشنی سے یہ سمجھ کر فائدہ اٹھانا کہ روشنی کا سبب ہے اور اس میں روشنی کا خالق اللہ سبحانہٗ ہے جائز ہے اور یہ سمجھنا کہ آفتاب خالقِ نور ہے ناجائز ہے۔ اسباب بھی دو قسم کے ہیں مادی اور عادی۔ دوسرے شرعی اور روحانی۔ مادی جیسے دوا اور ڈاکٹر بیماری دور کرنے کا سبب ہیں۔ شرعی جیسے صبر اور نماز، دعا۔ ان کو شرعی کہنے کی وجہ یہ ہے کہ ان کا سبب ہونا عادت سے نہیں بلکہ شریعت سے معلوم ہوا ہے۔ حضرت شیخ الہندؒ نے سورۃ فاتحہ کی تفسیر میں اسی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ

اگر کسی مقبول بندے کو محض واسطہ رحمتِ الٰہی اور غیر مستقل سمجھ کر استعانت ظاہری کرے تو یہ جائز ہے۔

اس میں مقبولیت ہونا واسطہ، غیر مستقل اور ظاہری کی شرطوں سے اپنے مخاطبوں کے کوزہ ذہن

میں یہ بات اتارنا چاہتے ہیں کہ اسباب شرعیہ کے تحت ایسی امداد میں کوئی مضائقہ نہیں ہے جیسے کسی سے دُعا کی درخواست کرنا کہ آپ میرے لیے اللہ سبحانہٗ سے دُعا فرمائیے کہ اللہ پاک میرا یہ کام کردے کیونکہ یہ استعانت درحقیقت حق تعالیٰ ہی سے استعانت ہے۔

آیت میں ایمان کی ثابت قدمی اور شعائرِ کفر کو چھوڑ دینے کے لیے ایک محسوس علاج یہ بتایا جارہا ہے کہ مدد لو صبر اور نماز سے۔

علمائے اہلِ کتاب حق کے نمایاں ہونے کے باوجود بھی آپ پر ایمان نہ لاتے تھے۔ اس کی بڑی وجہ حبِ جاہ اور حبِ مال تھی۔ اللہ تعالیٰ نے دونوں کا علاج بتایا ہے۔ صبر سے مال کی طلب اور محبت جائے گی اور نماز سے عاجزی اور انکساری پیدا ہو کر حبِ جاہ کم ہوگی [1]

مطلب یہ ہے کہ اگر تمہیں نیکی کے راستہ پر چلنے میں دشواری محسوس ہوتی ہے تو اس کا علاج صبر اور نماز ہے۔ ان دو چیزوں سے تمہیں وہ طاقت ملے گی جس سے یہ راہ آسان ہو جائے گی [2]

یہودی علماء جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام کو قبول نہ کرتے تھے اس کے دو سبب تھے۔ ایک یہ کہ ان کے دلوں میں گداز اور تاثر نہ تھا۔ اور دوسرے یہ کہ پیغامِ حق قبول کرنے کے بعد اُن کو جو جانی اور مالی دشواریاں پیش آتیں یہ عیش و عشرت اور ناز و نعمت کے خوگر ہونے کی وجہ سے ان کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ اسی لیے قرآن نے ان کی بیماری کے لیے صبر اور نماز کا نسخہ تجویز کیا ہے۔ نماز سے ان کے دل میں اثرِ طبیعت میں گداز پیدا ہوگا۔ صبر کی عادت سے قبولِ حق کی راہ کی مشکلیں دُور ہوں گی۔

صبر کی حقیقت پر ہمارے عوام کی غلط فہمی نے پردے ڈال رکھے ہیں۔ ان کے خیال میں بے کسی اور بے بسی کا نام صبر ہے لیکن کیا واقعی یہی ہے؟ صبر کے لغوی معنے روکنے اور سہارنے کے ہیں۔ اور اس سے مراد ارادے کی وہ مضبوطی، عزم کی وہ پختگی اور نفس کی خواہشوں کا وہ انضباط ہے جس سے ایک شخص نفسانی ترغیبات اور بیرونی مشکلات کے مقابلے میں قلب و ضمیر کی مضبوطی، اخلاقی جرأت اور ثباتِ قدم کا مظاہرہ کرتا ہے۔ قرآن میں صبر کا لفظ اسی معنے میں استعمال ہوا ہے۔

حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مدینہ کے لوگوں کے سامنے توحید کی دعوت اور اسلام کی سوغات پیش کی تو عرب کا ایک ایک ذرہ آپؐ کی مخالفت میں سرگرم جولاں ہوگیا۔ ہر طرف سے عداوت اور دُشمنی کے مظاہرے ہونے لگے اور گوشہ گوشہ سے قدم قدم پر رکاوٹیں نمودار ہوگئیں۔ ایسے حالات

---

[1] حاشیہ شیخ الہند، ص ۱۰ [2] تفہیم القرآن ص ۷۳۔

میں دعوت کو قبول کرنا جان کو جوکھوں میں ڈالنے کے مترادف تھا۔ قرآن نے اس ارشاد کے ذریعے بتایا کہ ان حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے اس اخلاقی صفت کو اپنے اندر پرورش کرو۔ اس کی پوری تفصیل انشاء اللہ دوسرے پارے میں ملے گی۔

۱۲۰ نماز کا حکم پہلی آیت میں مل چکا ہے۔ یہاں نماز کے آسان ہونے کا طریقہ بتایا جارہا ہے۔ پہلے یہ بات فرمائی ہے کہ نماز بہت بھاری ہے اور بھاری ہونے کا مطلب یہ ہے کہ انسان میدان خیال میں آزاد ہے اور انسان کے جوارح اسی آزاد خیالی کے نتیجے میں آزاد رہنے کے خوگر ہیں۔ نماز وقت کی، نہ سوچنے، نہ ہنسنے، نہ کھانے، نہ پہننے، نہ چلنے، پاک صاف رہنے، اذکار مخصوصہ پڑھنے کی پابندی عائد کرتی ہے۔ اس لیے انسان کی آزادئ خیال اور آزادئ عمل ختم ہوکر رہ جاتی ہے۔ بس یہی نماز کا بھاری ہونا ہے۔

اس آیت میں نماز کے ثقل، دشواری اور بھاری پن کو دور کرنے کا یہ علاج بتایا گیا ہے کہ صفت خشوع اپنے اندر پیدا کرنی چاہیے اس کے ذریعے نماز کی دشواری ختم ہو جائے گی۔

یعنی نماز حضور دل سے بہت بھاری ہے مگر ان پر آسان ہے جو عاجزی کرتے ہیں اور ڈرتے ہیں۔ جن کا خیال اور دھیان یہ ہے کہ ہم کو خدا کے روبرو پیش ہونا اور اس کی طرف پھر جانا ہے یعنی نماز میں خدا کا قرب اور گویا اس سے ملاقات ہے یا قیامت میں حساب کے لیے اس کے روبرو جانا ہے[1]

خشوع لغت کی زبان میں پست ہونے، نیچا ہونے کو کہتے ہیں۔ ریت کا ایسا ٹیلا جو دوسرے ٹیلوں کے مقابلے میں پست ہو عربی میں خشعہ کہلاتا ہے۔ آواز کی پستی پر بھی خشوع بولا جاتا ہے۔ نگاہوں کے نیچا ہونے کو بھی خشوع کہتے ہیں۔ ہری بھری کھیتی کے مقابلے میں زمین کے اس حصے کو بھی خشوع کہا جاتا ہے جس میں روئیدگی نہ ہو۔ چہروں کی پستی اور تذلل کو بھی خشوع کہا گیا ہے اور بالآخر دلوں کے جھک جانے اور پست ہو جانے پر بھی خشوع بولا گیا ہے۔

یہاں الخاشعین میں دل کا خشوع مراد ہے اور دل کی اسی کیفیت کی اعضاء و جوارح پر نمائش ہوتی ہے۔ جنید بغدادیؒ فرماتے ہیں کہ خشوع دراصل اللہ سبحانہ کے حضور میں دلوں کی عاجزی کو کہتے ہیں۔ دل میں اگر خشوع ہوتا ہے تو آدمی ذہن و دماغ کے پورے شعور کے ساتھ حق کے سامنے سرنگوں ہو جاتا ہے۔ اس کی نماز اسی احساس سے دب جاتی ہے بلکہ اس کی پوری زندگی میں نبوت کے

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۱۰

لائے ہوئے علم وعمل کے لیے یہی کیفیت رونما ہو جاتی ہے۔ ہر موقعہ اور ہر حال میں وہ نبوت کے علم وعمل کے سامنے اپنے آپ کو پست، نیچا اور دبا ہوا رکھتا ہے۔ منفعتوں اور مصلحتوں کے مقابلے میں اصول و صداقت کو اور دنیا کے مقابلے میں آخرت کو ترجیح دیتا ہے۔ وہ نبوت کے لائے ہوئے نظامِ حیات کے لیے بے اصول، ناقابلِ اعتبار، ابن الوقت اور مصلحت کیش نہیں بلکہ با اصول، بلند اخلاق اور مضبوط سیرت کا مالک بن کر رہتا ہے۔

اس آیت میں پوری زندگی کو خشوعی بنانے کا مطالبہ ہے۔ یہ آیت پکار کر کہہ رہی ہے کہ الخاشعین یعنی جن کی زندگی خشوعی ہے ان پر نماز بھاری اور گراں نہیں ہوتی اور یا ان کو نماز میں گرانی نہیں ہوتی ہے۔ بلا شبہ جس کی زندگی اسلام کیلئے خشوعی نہ ہو اس پر نماز جیسا عمل اور اس کی ادائیگی گراں ہوتی ہے۔ لیکن جو لوگ خشوعی زندگی رکھتے ہیں اور جن کی رگ رگ میں اسلام سے وفاداری، اسلام سے محبت پیوست ہوتی ہے ان کے لیے نماز دشوار، گراں اور بھاری نہیں ہے۔

خشوعی زندگی کن کی ہوتی ہے؟ اسی اٹھے ہوئے سوال کا جواب دوسری آیت میں دیا ہے۔

۱۲۱
ف ۔جن کو یقین ہے۔ یہ ترجمہ ہے الذین یظنون کا۔ ظن لغت میں شک اور یقین دونوں معنی میں آیا ہے اور کلامِ عرب میں ظن بمعنی یقین کے استعمال کی نظیریں بہت سی ہیں۔ یہاں اکثر مفسرین نے یقین ہی کے معنے میں لیا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ خشوعی زندگی ان کی ہوتی ہے جن کو یقین کی دولت نصیب ہوتی ہے اور یقین بھی ایسا کہ ایک طرف ان کو یہ فکر دامن گیر ہو کہ ان کو اللہ سبحانہ کے حضور میں حساب کے لیے پیش ہونا ہے۔ اور دوسری طرف یہ شوق غالب ہو کہ ان کو اپنے محبوب سے ملنا ہے۔ شوق اور خوف کے ملے جلے جذبات پر مبنی یقین کی یہی عظمت اور مطلوب کی یہی لگن زندگی کو خشوعی بنا دیتی ہے۔ ان کو یہ دھیان لگا رہتا ہے کہ زندگی میں کی ہوئی عبادتیں رائیگاں جانے والی نہیں ہیں اپنے شفیق و کریم آقا کے حضور میں بہر حال حاضر ہونا ہے اُس وقت زندگی کی ساری محنتیں وصول ہو جائیں گی۔ اس یقین سے شوقِ نماز پیدا ہو جانا یقینی ہے۔ نماز میں اس طرح خشوع آئے گا تو نماز ہی پوری زندگی کو خشوعی بنا دے گی۔ نماز میں بندہ اپنے مولی کے حضور میں کھڑا ہوتا ہے۔ اللہ سبحانہ سے زیادہ پُر ہیبت اور پُر جلال ذات کون ہو سکتی ہے۔ ضروری ہے کہ نمازی کے قلب و دماغ اور اعضاء و جوارح پر خشوع کی کیفیت ظاہر ہو، عجز و نیاز ہو، تواضع و انکسار ہو، آنکھ، زبان، کان، دل، دماغ اور تمام اعضاء و جوارح پورے طور پر نماز میں لگے ہوئے ہوں۔ محبوب سے ملنے کا شوق اور

اس کی ناراضگی کا خوف جب سر پر سوار ہوتا ہے تو محبوب کی طلب میں کوئی مزاحمت مزاحمت نہیں رہتی اور شوق انسان کو راہ کی تمام دشواریوں سے بے نیاز کر دیتا ہے۔ شوق و خوف کی یہی سرشاریاں دورِ نبوت کے مسلمانوں کی نمازوں میں کھلم کھلا نظر آتی ہیں اور تاریخ نے ہمارے لیے محفوظ رکھی ہوئی ہیں۔

جب بھی نمازوں کا رشتہ شوق ملاقات انھم ملاقوا ربھم اور خوف حضوری انھم الیہ راجعون سے ٹوٹ جائے گا تو نمازیں بے جان ہو کر رہ جائیں گی۔ حضرت حذیفہؓ نے اس اندیشہ کا اظہار ان لفظوں میں فرمایا ہے۔

مسلمانو! تم اپنے دین سے سب سے پہلے چیز جو ضائع کرو گے وہ نمازوں کا خشوع ہے اور آخری چیز جو تمہارے ہاتھ سے نکل جائے گی وہ نماز ہے۔ اس کے بعد اسلام کی تمام کڑیوں کا رشتہ تمہاری زندگی سے ایک ایک ہو کر ٹوٹ جائے گا۔

آیت میں ان دو فقروں کا مختصر لفظوں میں مطلب یہ ہے کہ

جو شخص خدا کا فرمانبردار نہ ہو اور آخرت کا عقیدہ نہ رکھتا ہو اس کے لیے تو نماز کی پابندی ایک ایسی مصیبت ہے جسے وہ کبھی گوارا ہی نہیں کر سکتا مگر جو برضا و رغبت خدا کے آگے سرِ اطاعت خم کر چکا ہو اور جسے یہ خیال ہو کہ مر کر اللہ سبحانہٗ کے سامنے جانا ہی ہے اس کے لیے نماز ادا کرنا ہی نہیں چھوڑنا بھی مشکل ہے[1]

اس کا حاصل بھی یہی ہے کہ زندگی میں خشوع پیدا کرنے کا ذریعہ نماز ہے اور نماز میں خشوع آخرت کے فکر اور اللہ سبحانہٗ کی محبت کے ولولے پیدا کرتا ہے۔

شاید آپ کے ذہن میں یہ سوال اُبھر آئے کہ اب تک جو کچھ بتایا گیا ہے اس سے یہ معلوم ہوا ہے کہ نماز خشوع رکھنے والوں کے لیے گراں نہیں ہوتی ہے اور خشوع ان میں ہوتا ہے جن کو اللہ سبحانہٗ سے ملنے کا شوق اور اس کی بارگاہ میں پیش ہونے کا خوف ہو۔ لیکن سوال یہ ہے کہ خود خشوع کیا ہے؟ یہ دل کا خشوع، اعمال میں خشوع آخر کیا چیز ہے؟

دراصل ہر جاندار کے لیے جیسے جسم کے ساتھ رُوح کا ہونا ضروری ہے ایسے اعمال کے لیے بھی جسم کے ساتھ رُوح کا ہونا ناگزیر ہے۔ اعمال کے مظاہر تو اعمال کے ڈھانچے اور ان کے جسم ہیں اور اعمال کی رُوح کا نام خشوع ہے۔ جیسے اگر کوئی جسم رُوح نہیں رکھتا ہے تو اس کی کوئی قیمت

---

[1] تفہیم القرآن ص ۷۴

نہیں ہے۔ ٹھیک ٹھیک اسی طرح اگر کوئی عمل مظہر اور ڈھانچہ رکھتا ہے مگر اس میں رُوح خشوع نہیں ہے تو اس کی بازارِ قیامت میں کوئی قیمت نہیں ہے۔ حیوان اور انسان کے افعال میں بھی جوہری فرق ہے کہ حیوانات کے تمام افعال طبعی ہوتے ہیں۔ قانون اور ضابطے سے ان کو کوئی سروکار نہیں ہوتا اس لیے ان کے افعال میں رُوح ہوتے یا نہ ہونے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ انسان چونکہ ایک ذمہ دار اخلاقی وجود ہے اس لیے اس کے اعمال کی وہ نوعیت نہیں ہے۔ اس کا ہر فعل قانون کی پابندیوں سے جکڑا ہوا ہے۔ اس لیے اس کے اعمال میں ڈھانچے کے ساتھ رُوح کا ہونا ضروری ہے۔ نماز ایک قانونی مطالبہ اور اس کا ایک قانونی پیمانہ ہے۔ اس کا بھی ایک مظہر اور ڈھانچہ ہے اور اس کے ساتھ اس کی رُوح بھی ہے۔ رُوح کا ڈھانچے کے ساتھ گہرا لگاؤ ہے۔

اسلامی قانون کے شارحین میں سے جن بزرگوں کی مرکزی توجہ نماز کی رُوح تک محدود رہی اور خشوع میں ان کو نماز کی رُوح ہونے کے علاوہ کوئی دوسرا پہلو نظر نہ آیا۔ انہوں نے یہ فیصلہ فرمایا کہ بغیر خشوع کے نماز نہیں ہوتی اور نہ ہونے کا مطلب یہ بتایا ہے کہ آخرت میں اس نماز پر کوئی اجر و ثواب نہ ملے گا۔ چنانچہ حنابلہ میں سے ابو عبداللہ بن حامدؒ اور شوافع میں سے امام غزالیؒ نے ایسی نماز کو بے ثواب بتایا ہے ان کا موقف یہ ہے کہ

خشوع نماز کی رُوح ہے ایسے جسم کی کیا قیمت ہو سکتی ہے جس میں رُوح نہ ہو۔

نماز کے واجبات، فرائض، ارکانِ نماز کے جسم و ڈھانچہ کے ترکیبی اعضا ہیں۔ اس جسم میں سے اگر صرف واجب ہی رہ جاتے تو سب کا فیصلہ یہی ہے کہ سجدہ سہو کیا جاتے ورنہ نماز لوٹائی جائے اور جسم میں سے اگر رُوح ہی پرواز کر جائے تو پھر نماز کیسے ہو سکتی ہے۔ لیکن یہ ان بزرگوں کا انتہا پسندانہ نظریہ ہے۔ اور اسلام کی اس جامع پالیسی کے سرتاسر خلاف ہے جو اسلام نے رُوح و جسم کے بارے میں مقرر کی ہوئی ہے۔

ہمیں اس معاملہ پر دقتِ نظر اور گہرے فکر کے ساتھ اسلام کی جامع پالیسی کی روشنی میں غور کرنا چاہیے اور تجزیہ کرنا چاہیے کہ اسلامی قانون میں عمل کے لیے جو نقشہ ترتیب دیا ہے اس کے کیا کیا پہلو ہیں۔

اسلام کے بتائے ہوئے نقشہ میں اعمال کی دو تصویریں ہیں۔ ایک تصویر وہ ہے جسے ہم جسم، ڈھانچہ اور مظہر کہتے ہیں۔ دوسری تصویر وہ ہے جسے ہم باطن رُوح اور مقصد کہتے ہیں۔

اسلام کا قانون یہ ہے کہ وہ اس دنیا میں اعمال کی صحت کا معاملہ اور ان کی درستگی اور

پذیرائی کا فیصلہ مصادر سے نہیں بلکہ مظاہر سے، رُوح سے نہیں جسم سے، باطن سے نہیں بلکہ ظاہر سے کرتا ہے۔ پوری اسلامی زندگی کے لیے ایمان کی حیثیت رُوح کی ہے۔ کسی کے مسلمان ہونے کا فیصلہ دنیوی زندگی اور قانون کی نپی تلی زبان میں باطن کی گہرائیوں سے نہیں بلکہ ظاہر سے، مصادر سے نہیں بلکہ مظاہر سے کیا جاتا ہے۔ قرآن کہتا ہے:۔

لَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰىٓ اِلَيْكُمُ السَّلَامَ لَسْتَ مُؤْمِنًا

اور ارشادِ نبوّت ہے:

اُمِرْتُ اَنْ اُقَاتِلَ النَّاسَ حَتّٰى يَقُوْلُوْا لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ

آپ پوچھ سکتے ہیں کہ اسلام کسی کے مسلمان ہونے کا فیصلہ اس کے مظاہر سے کیوں کرتا ہے؟

اس کا جواب حافظ ابن تیمیہؒ نے یہ دیا ہے۔

اسلام کے ثبوت کا دار و مدار کسی ایسی چیز پر ہونا چاہیے جس کا علم سب کو یکساں طور پر ہو سکے اس کلمہ کا زبانی اقرار ہی مسلمان ہونے کا معیار قرار دیا گیا۔ اور اسی ایک کلمہ کو جنگ کے آغاز اور خاتمہ کا معیار بنا دیا۔

معاملہ کی یہی صورت نماز میں ہے۔ نماز بھی اسلامی زندگی کی طرح جسم و رُوح، ظاہر و باطن کے مجموعہ کا نام ہے۔ اسلام کا قانون دان طبقہ قانون کی نپی تلی زبان میں نماز کی صحت کا فیصلہ نماز کے مصادر سے نہیں بلکہ نماز کے مظاہر کو دیکھ کر کرتا ہے۔ نماز کے فرائض، نماز کی شرطیں، ارکان واجبات کی اگر ایک شخص تکمیل کر رہا ہے تو بلا ریب اس کی نماز دُرست ہے۔ اگر قانون کی نظر میں ایک منافق کی نماز صحیح ہے تو وہ مسلمان جو دل کی گہرائیوں میں سب کچھ مانتا ہے لیکن طبیعت کی غلط اُفتاد یا نادانی کی وجہ سے، غفلتوں، وسوسوں اور بے پروائیوں کا شکار ہو کر خشوع کی پوری کیفیت اور حضورِ قلب سے محروم رہے یقیناً اس کا مستحق ہے کہ اس کی نماز بدرجۂ اولیٰ صحیح ہو۔

اس موقعہ پر حافظ ابن القیمؒ نے یہ بات خوب فرمائی ہے کہ

دل کے وسوسوں اور غفلتوں میں مبتلا مسلمانوں کی نماز یقیناً منافق کی نماز سے زیادہ صحیح ہے۔

ہمیں چاہیے کہ معاملہ کے اس پہلو پر بھی غور کریں۔

بلاشبہ خشوع دل کی خاص کیفیت کا نام ہے لیکن قرآنی اطلاقات اور نبوّت کے ارشادات میں خشوع کی محسوس صورت کی اعضاء و جوارح میں بھی نشاندہی کی گئی ہے۔ قرآن میں آواز کی پستی، نگاہوں کے نیچے ہونے اور چہروں کے تذلّل پر خشوع کا اطلاق آپ سن چکے ہیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

نے قرآن کے ان ہی اشارات سے یہ بات معلوم کر لی کہ نماز کے خشوع کے درجات میں دل کے خشوع کی حالت تو بے شک اللہ سبحانہٗ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ لیکن خشوع کا ایک درجہ وہ ہے جو آنکھوں سے نظر آتا ہے یہ اعضاء کا خشوع ہے۔

ایک بار حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم جماعت سے نماز ادا فرما رہے تھے کہ کچھ لوگوں سے نماز میں ایسی حرکات سرزد ہوئیں جو خشوع کے منافی تھیں۔ آپ نے فرمایا

بخدا مجھ سے تمہارا خشوع پوشیدہ نہیں ہے۔

اسی درجہ خشوع کی خاطر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں آتے وقت بھگدڑ مچانے سے منع فرمایا ہے۔ اور اسی کی خاطر مساجد میں آواز بلند کرنے اور شور و ہنگامہ سے روکا ہے اور اسی کی وجہ سے نماز میں تسویۂ صفوف کا حکم دیا۔ اور اسی بنا پر نماز میں اِدھر اُدھر دیکھنے کی ممانعت آئی ہے۔

امام مجاہدؒ، ابراہیم نخعیؒ اور امام زہریؒ نے قرآن کی آیت فِیْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ کے معنے سکونِ اطراف بتائے ہیں۔ اسی خشوع کی کیفیت کو برقرار رکھنے کی خاطر نماز میں انگلیاں چٹخانا پسند نہیں کیا گیا۔ ارشاد ہے کہ انگلیاں نہ چٹخاؤ ——— اس کی وجہ صاحب بدائع نے یہ لکھی ہے کہ یہ حرکت خشوع کے خلاف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نماز میں خشوع کی کیفیت تمام اعضاء و جوارح پر طاری ہونی چاہیے۔ ذہن حاضر ہو، نظریں نیچی ہوں، اعضاء پُرسکون ہوں۔ غرضیکہ سارے بدن سے ذلت، پستی، مسکنت، عاجزی اور خاکساری کے آثار نمایاں ہوں یہ خشوع کا وہ درجہ ہے جس کا ہر نمازی سے مطالبہ ہے اور اسی کے ذریعے ہم کسی کے دل کے خشوع کا فیصلہ کر سکتے ہیں۔ جیسے ہم کلمہ کے زبانی اقرار سے ایمان اور دل کی تصدیق کا فیصلہ کرتے ہیں ایسے ہی آواز کی آہستگی، نگاہوں کی پستی اور اعضاء کے سکون سے ہم یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ دل میں خشوع کی کیفیت موجود ہے۔ گویا شریعت نے ان مظاہر کو کسی کے خشوع جاننے کا پیمانہ مقرر کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فقہا نے ان مظاہر کو لوازم خشوع میں شمار کیا ہے۔ علامہ شامیؒ لکھتے ہیں:

خشوع کے لوازم میں سے عجز کا اظہار، نگاہ کی پستی، آواز میں آہستگی اور اعضاء کا سکون ہے۔ بلکہ بعض علماء نے خشوع کے مظاہر پر خشوع کے اطلاقات دیکھ کر خشوع کو اعضاء و جوارح ہی کا عمل کہا ہے۔

خشوع کا دوسرا درجہ یہ ہے کہ دل اللہ سبحانہٗ کی جناب میں عجز، جمعیت اور سکون کی سوغات لے کر پیش ہو۔ اور اللہ سبحانہٗ کی محبت اور عظمت کا چراغ قلب میں روشن ہو۔

یہ درجہ اونچے لوگوں کے لیے ہے۔ یہ مقام محض طاعت، محض تذلل، محض فرمانبرداری اور محض نگاہوں کے نیچے کرنے پوری آواز پست کرنے کا نہیں ہے۔ یہ وجدان سے گزر کر عرفان کا درجہ ہے جو یہاں تک پہنچتا ہے اس کے مقام کی بلندیوں کو بحث و نظر اور علمی کاوشوں سے ناپا نہیں جا سکتا۔ یہ خود کرنے اور پانے کا معاملہ ہے بتلانے اور سمجھانے کا معاملہ نہیں ہے۔

قانونی نقطۂ نظر سے اس درجہ کا عوامی زندگی کی نماز میں صرف اسی قدر حصہ ہے جس کی طرف فقہا میں سے علامہ شامیؒ نے اشارہ کیا ہے۔

دل کا سب سے یکسو ہو کر نماز میں لگ جانا اس طرح کہ جو کچھ کہہ رہا ہے اور کہہ رہا ہے اسے اس کا علم ہو۔ یہ فرقِ مراتب اور درجات کا تفاوت رکھ کر اسلام نے مختلف استعدادوں اور صلاحیتوں کے لیے درجہ بدرجہ سیرابی کا سامان کر دیا ہے۔ عوام کے لیے خشوع کا پہلا مرتبہ کافی ہے خواص کے لیے دوسرا مرتبہ ضروری ہے جیسے حیوان اور انسان کے افعال میں فرق ہے اور جیسے مومن و کافر کے اعمال میں تفاوت ہے، ٹھیک اسی طرح استعداد، صلاحیت، طلب اور محنت کے لحاظ سے عام مومنین اور خاص مومنین کے درمیان فرق ہے۔ نماز سب کی ایک ہے۔ لیکن نیت سب کی الگ الگ ہے۔ ہر طالب کے حصے میں اس کی استعداد اور محنت کے مطابق خشوع اور اس کی سرشاری کی کیفیت آتی ہے۔

اس آیت کا مقصد مخاطبوں کو یہ بتانا نہیں ہے کہ نماز میں خشوع ہو گا تو زندگی خشوعی ہو جائے گی بلکہ لوگوں کو یہ سمجھانا ہے کہ اسلام کے لیے زندگی خشوعی ہو گی تو نماز آسان ہو جائے گی۔ اس میں زور زندگی کے خشوعی بنانے پر ہے۔ اسی بنا پر خاشعین کی تشریح یہ کی ہے کہ جن کو اللہ سبحانہٗ کی بارگاہ میں حضوری کا خوف ہو اور اللہ سبحانہٗ سے ملنے کا شوق ہو۔

خشوعی زندگی کا یہ مطالبہ اس لیے کیا گیا ہے کہ اسلام سیاسی حیثیت سے اس کے ذریعے مخلصین اور منافقین کے درمیان امتیاز پیدا کرنا چاہتا ہے۔ قانون ان دونوں میں کوئی امتیاز نہیں کر سکتا تھا۔ نماز کو خاص طور پر پیش کیا اس کے ذریعے ان دونوں گروہوں میں حدِ فاصل قائم ہو سکتی ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم نے اسی فریضہ میں سستی کو منافقین کی خاص نشانی بتایا ہے اور اسی بنا پر یہاں فرمایا:

وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ

يَٰبَنِىٓ إِسْرَٰٓءِيلَ ٱذْكُرُوا۟ نِعْمَتِىَ ٱلَّتِىٓ أَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَأَنِّى فَضَّلْتُكُمْ عَلَى ٱلْعَٰلَمِينَ ﴿۴۷﴾

اے بنی اسرائیل! میری نعمتیں یاد کرو جن سے میں نے[۱۲۲] تمہیں نوازا تھا۔ اور اس بات کو کہ میں نے دُنیا کی ساری قوموں پر تمہیں فضیلت[۱۲۳] دی تھی۔

انعام کی تفصیل

اب تک جو کچھ اجمالاً کہا گیا ہے یہاں سے اس کی تفصیل ہے۔ یہاں کے ساتھ بنی اسرائیل کی فضیلت بھی بیان کی گئی ہے۔ لیکن یہ یاد رہے کہ بنی اسرائیل کا تعارف یہاں مذہب یہود کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک مخصوص قوم اور نسل کی حیثیت سے پیش ہو رہا ہے۔ بنی اسرائیل کسی مذہب یا فرقہ کا نام نہیں۔ اس لیے یہاں یہودی مذہب کی فضیلت نہیں اسرائیلی نسل کی ہو رہی ہے۔

۱۲۲ چونکہ تقویٰ اور کمالِ ایمان کا حاصل کرنا صبر و حضور استغراقِ عبادات کے ذریعے سے دُشوار تھا اس لیے اس کا آسان طریقہ تعلیم فرماتے ہیں اور وہ تشکر ہے۔ اس بنا پر حق تعالیٰ اپنے احسانات اور انعامات جو اُن پر وقتاً فوقتاً ہوتے تھے ان کو یاد کراتے ہیں اور ان کی بدکرداریاں بھی ظاہر فرماتے ہیں۔ انسان بلکہ حیوان تک میں یہ صفت موجود ہے کہ اپنے منعم کی محبت اور اس کی اطاعت دل نشیں ہو جاتی ہے اور چند رکوع میں اس کی شرح و بسط کے ساتھ بیان فرمایا گیا ہے[۱]

۱۲۳ یہ اس دور کی طرف اشارہ ہے جب کہ تمام دُنیا کی قوموں میں ایک بنی اسرائیل کی قوم ہی ایسی تھی جس کے پاس اللہ کا دیا ہوا علم تھا اور جسے اقوام کا امام و رہنما بنایا گیا تھا تاکہ وہ بندگیٔ رب کے راستے پر سب قوموں کو بلائے اور چلائے[۲]

---

۱ حاشیہ شیخ الہندؒ ص۱۰ ۲ تفہیم القرآن ج ۱ ص ۷۴

اس آیت میں اگرچہ خطاب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے یہودیوں کو ہے مگر عموماً ایسا ہوتا ہے کہ باپ دادا پر جو احسان و اکرام کیا جاتے اس سے اس کی اولاد بھی فائدہ حاصل کرتی ہے اس لیے ان کو ہی اس آیت میں مخاطب بنا لیا ہے[1]

معیارِ فضیلت

سوال یہ ہے کہ اس نسل کی فضیلت کا اعلان سارے عالم پر کس معنے میں ارشاد ہوا ہے اور وہ کون سی ایسی نعمت تھی جو بحیثیت نسل بنی اسرائیل کے ساتھ بلا شرکت غیرے مدتوں مخصوص رہی۔ اگر دولت، حکومت، تجارت یا کثرتِ آبادی اس کی بنیاد ہے تو اوّل تو یہ انعام خود اس درجہ کے نہیں ہیں کہ ان کا ذکر اس اہتمام سے کیا جاتے اور اسی کو معیارِ فضیلت قرار دیا جاتے: ثانیاً یہ نعمتیں اور بہت سی قوموں کو اپنے اپنے وقت میں نصیب ہو چکی ہیں۔ کلدانیہ، مصر، ہندوستان، ان سب ملکوں کا تمدن اپنے زمانے میں اسرائیلیوں سے پہلے عروج پر رہ چکا ہے۔ اور تاریخ کا بیان ہے کہ ان قوموں کا دنیوی جلال اسرائیلیوں سے کچھ زیادہ ہی رہا ہے۔ پھر آخر اسرائیلیوں کی وہ مخصوص فضیلت کیا تھی؟ تاریخ کی زبان سے جواب ایک ہی سنا ہے کہ وہ دولت صرف اللہ کی توحید کی نعمت تھی۔ دنیا کی تاریخ کے جس دور میں ساری قومیں اور ساری نسلیں کم و بیش شرک میں مبتلا تھیں۔ یا اس کی طرف سے ہٹی چلی جا رہی تھیں۔ یہ نسلِ اسرائیل ہی ایک ایسی قوم تھی جو من حیث القوم توحید کی علمبردار تھی۔ عقیدۂ توحید اور عقیدۂ رسالت میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ رسالت کی قائل صرف وہی قوم ہوگی جس کا عقیدۂ توحید واضح و پختہ ہوگا۔ اور انبیاء و رسل جہاں تک کسی نسل کا تعلق ہے نسلِ اسرائیل ہی میں مسلسل پیدا ہوتے رہے۔ ہاں متفرق طور پر کسی دوسری نسل میں بھی کبھی کبھی پیدا ہو گئے ہوں تو وہ اس کے منافی نہیں۔ یہاں ذکر افراد کا نہیں بلکہ نسل و قوم کا ہو رہا ہے۔ دنیا کی ساری قوموں میں جس وقت ادتار دل کا ظہور ہو رہا تھا اور دنیا کی قومیں عنصر پرستی، مظاہر پرستی، دیوتا پرستی، بت پرستی غرض شرک ہی کی کسی نہ کسی شکل میں گرفتار تھیں۔ بنی اسرائیل اس وقت دنیا میں توحید کے علمبردار تھے[2]

دوسرے مفسرین کا بھی اس معاملہ میں اسی طرف میلان ہے۔ مصر کے مشہور مفسرِ قرآن

---

[1] معارف القرآن م ش ص ۱۹۶　[2] تفسیر ماجدی ص ۳۰

رشید رضا کہتے ہیں:۔

قوموں پر فضیلت کی بنیاد اگر انبیاء کی کثرت ہے تو یہ بنی اسرائیل کی وہ خصوصیت ہے کہ دُنیا کی کوئی قوم اس معاملہ میں بنی اسرائیل کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔ لیکن یہ فضیلت اس معاملہ میں فیصلہ کن نہیں ہے کہ نسلِ اسرائیل کا ہر ہر فرد اس کی وجہ سے فضیلت سے ہمدوش ہو گیا ہے۔ اور اگر تفضیل کی بنیاد قربِ الٰہی ہے تو پھر یہ فضیلت صرف بنی اسرائیل کے انبیاء اور ان لوگوں کی ہوگی جو ان کے زمانے اور ان کے بعد ان کے نقشِ قدم پر چلے ہیں۔

اہلِ عالم پر فضیلت کا یہ مطلب ہے کہ جس وقت سے بنی اسرائیل کا وجود ہوا تھا اس وقت سے لے کر اس خطاب کے نزول تک تمام فرقوں سے افضل رہے ہیں۔ کوئی ان کا ہم پلہ نہ تھا جب انہوں نے نبی آخر الزمان اور قرآن کا مقابلہ کیا تو وہ فضیلت ختم ہو کر مغضوبیت میں تبدیل ہو گئی اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے متبعین کو خیر اُمت کا لقب ملا۔[1]

تفضیل کو یہاں پیش کرنے کا مقصد یہ بتانا ہے کہ ان کو سمجھ لینا چاہیے کہ جس ذاتِ کبریا نے ان کو ماضی میں فضیلت دی تھی وہ ذاتِ قدوس اب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی اُمت کو فضیلت دے رہی ہے۔

اور یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ ان کو حاملِ علومِ نبوّت کی حیثیت سے نبوّت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا استقبال کرنا چاہیے۔ ماضی میں استقبال ہی ان کی فضیلت کی بنیاد رہی ہے۔

دُنیا کی قوموں کے مقابلے میں تمہیں قرآن کی آیات اور نبوّت کی پیش کش پر زیادہ غور و فکر سے کام لینا چاہیے اور ایمان میں سبقت کرنی چاہیے کیونکہ بزرگی اور فضیلت کا تقاضا یہی ہے کہ فضائل کی طرف قدم اٹھیں اور نیکیوں میں پیش پیش ہوں۔

---

[1] حاشیہ شیخ الہند صلا

وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِىْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْئًا وَّلَا يُقْبَلُ

مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۴۸﴾

اور دیکھو اللہ کے حضور میں پیش ہونے والے دن سے ڈرو جب کہ کوئی کوشش انسان کو اللہ کی گرفت سے نہ بچا سکے گی۔ نہ تو کوئی شخص دوسرے شخص کے کام آئے گا اور نہ کسی کی کوئی شفاعت قبول ہوگی اور نہ کسی سے کوئی بدلہ قبول کیا جائے گا اور نہ کہیں سے کوئی امداد دستیاب ہو گی [۱۲۳]۔

آخرت کی بازپرس

یہودیوں کی جماعتی سرگرانی زیادہ تر نسلی غرور کا نتیجہ تھی۔ وہ کہتے تھے کہ ہم حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل سے ہیں اور تورات میں ہے کہ خدا نے ان کی نسل کو برکت دی۔ قرآن اس آیت میں بتانا چاہتا ہے کہ یوم الجزا میں یہ غرور کام نہ آئے گا۔ آیت کے ایک ایک فقرے میں کسی نہ کسی اسرائیلی عقیدے کا رد ہے۔ یہودی مصریوں اور یونانیوں کی طرح آخرت کی زندگی کو دنیا پر قیاس کرتے تھے اور اس غلط فہمی کا شکار تھے کہ آخرت میں مجرم کو کچھ دے دلا کر یا کسی کی سفارش کرا کے چھڑایا جا سکتا ہے ——— قرآن نے ان آیات میں ان کی اسی غلط فہمی کا ازالہ کیا ہے۔

۱۲۳ے جب کوئی کسی بلا میں گرفتار ہوتا ہے تو اس کے ساتھی اکثر یہی کیا کرتے ہیں کہ اوّل تو اس کے ادائے حق لازم میں کوشش کرتے ہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا تو سعی و سفارش کرتے ہیں۔ یہ بھی نہ ہو سکے تو پھر تاوان، جرمانہ اور فدیہ دے کر چھڑاتے ہیں۔ اگر یہ بھی نہیں ہو سکتا تو بالآخر اپنے مددگاروں کو جمع کر کے اس کی نجات کی فکر کرتے ہیں۔ حق تعالیٰ نے اسی ترتیب کے موافق ارشاد فرمایا کہ کوئی شخص گو کیسا ہی مقرب خداوندی ہو مگر کسی نافرمان عدو اللہ کا فرکو منجملہ چاروں صورتوں کے کسی صورت سے نفع نہیں پہنچا سکتا۔ بنی اسرائیل کہتے تھے کہ ہم کیسے ہی گناہ

کریں ہم پر عذاب نہ ہوگا۔ ہمارے باپ دادا جو پیغمبر ہیں ہمیں بخشوالیں گے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ خیال تمہارا غلط ہے۔ اس سے اس شفاعت کا انکار نہیں نکلتا جس کے اہل السنت قائل ہیں اور جو دیگر آیات میں مذکور ہے[1]

اس دن سے مراد یوم قیامت ہے۔ قیامت کی یاد بڑے حکیمانہ موقع پر دلائی گئی ہے۔ حشر و نشر، جزا و سزا کا عقیدہ جو انسان کے دل میں مسئولیت اور ذمہ داری کی روح ہے۔ اسرائیلیوں کے دلوں ہی سے نہیں بلکہ ان کی مقدس کتابوں اور نوشتوں تک سے بھی مٹ چکا تھا۔ روزِ قیامت کے بیان جو اوصاف بیان کیے گئے ہیں سب میں کسی نہ کسی اسرائیلی عقیدے کا رد ہے۔ کوئی شخص کسی شخص کے کام نہ آئے گا۔ اس میں اس اسرائیلی عقیدے کی تردید ہے جو آج تک جیوش انسائیکلوپیڈیا میں ان الفاظ میں لکھا ہوا ہے۔ بہت سے لوگ اپنے اَسلاف کے اور بہت سے اپنے اَخلاف کے اعمالِ حسنہ کی بنا پر بخش دیے جائیں گے۔ (ج ۶ ص ۶۱) اور کوئی سفارش قبول نہ کی جائے گی۔ اس میں بھی اس اسرائیلی عقیدے کی تردید ہے کہ عمل اور عقیدے کیسے ہی ہوں پھر بھی اپنے بزرگ سفارش کر کے بخشوا ہی لیں گے۔ شفاعت اور ایک تخفیفِ مستقل کا بھی مبالغہ آمیز تخیل ہے جس نے عیسائیوں میں آکر انتہائی شکل اختیار کر لی اور کفارے ہی کی طرح شفاعت پر بھی مسیحیت کی بنیاد ہے۔ اور کسی سے کوئی معاوضہ نہ لیا جائے گا۔ اس میں بھی اصلی ضرب یہودی اور مسیحی عقیدۂ کفارہ پر ہے۔ مسیحیوں کے یہاں عقیدۂ کفارہ کی اہمیت تو ظاہر ہی ہے لیکن خود یہودی بھی ایک بڑی تعداد میں اسی عقیدۂ کفارہ سے متاثر ہو کر اس کے قائل ہو گئے تھے[2]

آیت میں جس یوم کا ذکر ہے اس سے قیامت کا دن مراد ہے۔ مطالبہ ادا کرنے کا مطلب یہ ہے کہ مثلاً کسی کے ذمہ نماز، روزے کا مطالبہ ہے اور دوسرا کہہ دے کہ میری نماز لے کر اس کا حساب بے باق کر دیا جائے اور معاوضہ یہ کہ کچھ مال وغیرہ دے کر بچا لا دے۔ دونوں باتیں نہ ہوں گی اور سفارش میں بغیر ایمان کی قید اس لیے ہے کہ دوسری آیتوں سے معلوم ہوا ہے[3]

---

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ ص۱۰ [2] تفسیر ماجدی ص۲۱ [3] معارف القرآن م ش ص۱۶۶

نجاتِ متوارث کا عقیدہ

بنی اسرائیل کی گمراہی کی ایک بہت بڑی وجہ یہ تھی کہ آخرت کے متعلق ان کے عقیدے میں خرابی آگئی تھی۔ اور اس قسم کے خیالاتِ خام میں مبتلا ہوگئے تھے کہ ہم جلیل القدر انبیاء کی اولاد ہیں۔ بڑے بڑے اولیاء، صلحاء اور زہاد سے نسبت رکھتے ہیں۔ ہماری بخشش تو ان ہی بزرگوں کے صدقے میں ہو جائے گی۔ ان کا دامن گرفتہ ہو کر بھلا کوئی سزا کیسے پا سکتا ہے۔ ان ہی جھوٹے بھروسوں نے ان کو دین سے دُور اور گناہوں کے چکر میں مبتلا کر دیا تھا۔ اس لیے انعام یاد دلانے کے ساتھ فوراً ان کی غلط فہمیوں کو دُور کیا گیا ہے[1]

آئیے پوری آیت پر ایک جامع نظر ڈال لیجئے۔

آیت میں چار باتیں بتائی گئی ہیں۔

اوّل روزِ قیامت میں فیصلے کا مدار ایمان و عمل ہو گا۔ کوئی شخص کسی شخص کے کام نہ آئے گا۔ دُنیا میں اگر کوئی شخص مبتلا ہوتا ہے یا کسی جُرم کی پاداش میں مجرم کی حیثیت سے قانون کے سامنے آتا ہے تو اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اگر مجرم کا باپ دادا یا اوپر کا کوئی اور دور نزدیک کا رشتہ دار یا دُنیا کے لحاظ سے بڑا با اثر بارسُوخ آدمی، کہ لوگ اس کے دنیوی کارناموں سے متاثر ہوں تو ایسے شخص سے تعلق رکھنے والے کو اس انتساب اور تعلق کی بنا پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص کسی شخص کے کام نہ آئے گا اور کسی کو کسی کی وجہ سے نہ چھوڑا جائے گا۔ اور کسی کو کسی کی پاداش میں سزا نہ دی جائے گی۔

دوم یہ کہ اس روز کسی کے بارے میں کوئی شفاعت قبول نہ کی جائے گی۔ یعنی کسی با اثر اور صاحبِ اقتدار کی سفارش سے مجرم کی سزا اس دن معاف نہ ہو گی۔ یہودی آخرت کے معاملات کو دُنیا پر قیاس کرتے تھے اور سمجھتے تھے کہ جیسے بادشاہ دیگر اُمراء کا کہنا مان لیتا ہے کیونکہ وہ ارکینِ سلطنت ہیں اور ان کے ناراض ہونے سے حکومت کا نظم و نسق تباہ ہونے کا اندیشہ ہے۔ اسی طرح اللہ سبحانہٗ بھی یہ خیال کر کے کہ ان کو ناراض نہ کرنا چاہیے انبیاء اور اولیاء کی شفاعت مان لے گا۔ اس قسم کی شفاعت کو شفاعتِ وجاہت کہتے ہیں۔ یعنی انبیاء اور اولیاء کی جاہ

---

[1] تفہیم القرآن ص ۸۲

کی وجہ سے ان کی بات مانی جائے۔

شفاعت کی دوسری صورت وہ یہ سمجھے ہوتے تھے جیسے دنیا میں بادشاہ کسی کی محبت کی وجہ سے اُسے ناراض کرنا نہیں چاہتا۔ اللہ سبحانہٗ بھی انبیاء اور اولیا کو ناراض کرنا گوارا نہیں کرے گا اور ہماری اس طرح بخشش ہو جائے گی۔ قرآن نے شفاعت کی ان دونوں قسموں کی اس آیت میں نفی کی ہے اور بتایا ہے کہ اللہ کے دربار میں نہ وجاہت کی شفاعت قبول کی جائے گی اور نہ محبت کی۔

شفاعت کا اسلامی تصوّر

اسلام نے شفاعت کا جو تصوّر پیش کیا ہے وہ ان دونوں سے جُدا گانہ ہے اور اس کا آیت میں کوئی تذکرہ نہیں ہے۔ اس کے تفصیلی مباحث تو آپ کو سولھویں پارے میں ملیں گے۔ مگر یہاں اتنا سمجھ لیجئے کہ قرآن یہ تسلیم کرتا ہے کہ خدا کے نیک بندے اپنے دوسرے گنہگار بھائیوں کے حق میں بشرطیکہ وہ گنہگار ہوں، کافر و مشرک نہ ہوں، شفاعت کریں گے۔ قرآن نے اس کی دو اہم اور بنیادی شرطیں بتائی ہیں۔

ایک یہ کہ شفاعت وہ کرے گا جسے اللہ شفاعت کا حکم دے گا۔

دوم یہ کہ شفاعت ان کے حق میں ہو سکے گی جن کے حق میں اللہ شفاعت کی اجازت دیں گے بلکہ خود انبیاء بھی شفاعت ان ہی کی کریں گے جن کی شفاعت خدا خود چاہے گا۔

وَلَا يَشْفَعُونَ إِلَّا لِمَنِ ارْتَضَىٰ

دربارِ خداوندی میں اسی قسم کی شفاعت ہوگی۔ قرآن حکیم میں جس نبی یا ولی کی شفاعت کا ذکر ہے وہ یہی شفاعت ہے۔

جب صورتِ حال یہ ہے کہ وہی شفاعت کریں گے جن کو اللہ تعالیٰ اس کی اجازت دیں گے اور وہ ان کی ہی شفاعت کریں گے جن کی شفاعت کرانا خود اللہ کو منظور ہوگا تو حقیقت میں خود اللہ سبحانہٗ اپنے دربار میں آپ شفیع ہوگا۔ یا صوفیا کی زبان میں یوں کہو کہ جلالِ الٰہی کی بارگاہ میں اللہ کی صفت کریمی و رحیمی خود شفیع بن کر کھڑی ہو جائے گی۔

سوم یہ کہ کسی سے کوئی بدلہ قبول نہ کیا جائے گا۔ بعض اوقات کچھ دے دلا کر مجرم کو بری کرا لیا جاتا ہے۔ قرآن نے اس نظریہ کی بھی تردید کر دی ہے کہ وہاں کسی مجرم کو

رشوت یا نذرانہ لے کر نہ چھوڑا جائے گا۔ اس کی بارگاہ میں کوئی رشوت نہ چلے گی خواہ اس کی مقدار کچھ ہو۔

فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْ أَحَدِهِمْ مِلْءُ الْأَرْضِ ذَهَبًا

روئے زمین بھر کر بھی سونا فدیہ میں دے گا تو قبول نہ کیا جائے گا۔

لَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ میں اسی کا ذکر ہے۔

چہارم یہ کہ طاقت کے بل بوتے پر کوئی آکر چھڑا لے گا۔ آخری فقرے میں اس کی بھی نفی فرمادی کہ وہاں کہیں سے کسی قسم کی مدد پہنچنے کا کوئی امکان بھی نہیں ہے۔

وَإِذْ نَجَّيْنَٰكُم مِّنْ ءَالِ فِرْعَوْنَ يَسُومُونَكُمْ سُوٓءَ ٱلْعَذَابِ يُذَبِّحُونَ أَبْنَآءَكُمْ
وَيَسْتَحْيُونَ نِسَآءَكُمْ ۚ وَفِى ذَٰلِكُم بَلَآءٌ مِّن رَّبِّكُمْ عَظِيمٌ

اور اپنی تاریخ کا وہ واقعہ بھی یاد کرو جب ہم نے تمہیں فرعونیوں[۱۲۴] سے بچا لیا تھا جو تمہیں نہایت سخت عذاب[۱۲۵] میں ڈالے ہوتے تھے۔ تمہارے لڑکوں کو بے دریغ ذبح[۱۲۶] کرتے تھے اور تمہاری عورتوں کو زندہ رہنے دیتے تھے اور اس میں تمہارے پروردگار کی جانب سے بہت ہی بڑی آزمائش تھی[۱۲۷]۔

غلامی سے نجات

یہاں سے جن واقعات کی طرف اشارات کیے گئے ہیں وہ سب بنی اسرائیل کی تاریخ کے مشہور واقعات ہیں اس لیے تفصیل بیان کرنے کے بجائے ایک ایک واقعہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

بنی اسرائیل کی تاریخ میں دو قسم کے واقعات ہیں۔ ایک وہ جن کا تعلق ان ایام و وقائع سے ہے جو اُن کے اور فرعون کے درمیان گزرے۔ دوسرے وہ جو اُن کے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے درمیان گزرے۔ یہاں دونوں ملے جلے پیش کیے گئے ہیں۔ پہلی قسم کے واقعات میں یہ بتانا مقصود ہے کہ تم پر اللہ کے یہ یہ احسانات ہیں۔ اور دوسری قسم کے واقعات میں یہ جتانا ہے کہ تمہارے یہ کرتوت ہیں جو تم ان احسانات کے جواب میں کرتے رہے۔ اور مدینہ کی ابتدائی زندگی میں مسلمانوں کو یہ داستان اس لیے سنائی جارہی ہے کہ ان پر یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ دعوت حق کی مخالفت ہمیشہ طاقتور جماعتوں نے کی ہے اور ہمیشہ ناکام رہی ہیں اور اس کا بھی پتہ لگ جائے کہ ایک نئی ہدایت یافتہ جماعت کو راہِ عمل میں کیسی کیسی لغزشیں پیش آسکتی ہیں تاکہ پیروانِ دعوت ان سے اپنی نگہداشت کر سکیں۔

۱۲۴؎ آلِ فرعون کا ترجمہ ہم نے اس لفظ سے کیا ہے۔ اس میں خاندانِ فراعنہ اور مصر کا

حکمران طبقہ دونوں شامل ہیں[1]

آل لغت میں اہل کا مترادف ہے۔ اس سے مراد اہل و عیال، اتباع، ہم مذہب، ہم خیال اور ہم نسب ہوتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ اہل کا استعمال عام ہے اور آل صرف خصوصیت اور اہمیت رکھنے والوں کے لیے آتا ہے[2]

فرعون۔ یہ کسی متعین بادشاہ کا ذاتی نام نہیں ہے۔ یہ قدیم شاہان مصر کا لقب ہے۔ تین ہزار سال قبل مسیح سے شروع ہو کر عہد سکندر تک فراعنہ کے اکتیس خاندان مصر پر حکمران رہے ہیں۔ سب سے آخری خاندان فارس کی شہنشاہی کا تھا جو ۳۳۲ قبل مسیح سکندر کے ہاتھوں مغلوب ہوا۔ ان میں سے حضرت یوسف علیہ السلام کا فرعون عمالقہ کے خاندان سے تھا جو دراصل عرب خاندانوں کی ایک شاخ ہے۔ مشہور مورخ ابن قتیبہ لکھتا ہے:

اہل عرب ہی میں سے عمالیق ہیں۔ یہ متعدد قوموں کے مجموعہ تھے جو ممالک میں منتشر ہو کر پھیلے۔ منجملہ ان کے مصر کے فراعنہ ہیں۔

ابن خلدون کا بیان ہے:

ان قوموں میں بہت سے بادشاہ ہوئے ان کی عرب میں حکومتیں تھیں جن کے کچھ قبائل کا سلسلہ حکومت مصر اور شام تک وسیع ہو گیا تھا۔

زمانہ موسیٰ علیہ السلام کا فرعون

یہ سوال کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا فرعون کون ہے؟ بے حد اہمیت رکھتا ہے—— عام مورخین عرب اور مفسرین قرآن اس کو بھی عمالقہ ہی کے خاندان کا فرد بتاتے ہیں۔ لیکن انگریز مورخین کا خیال ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ہم عصر کوئی ایک بادشاہ نہیں ہوا۔ یکے بعد دیگرے دو بادشاہ ہوئے ہیں۔ اگر یہ صحیح ہے تو اسے قرآن کا اعجاز کہیے کہ وہ بجائے شخصی نام کے عمومی لفظ لایا ہے جس کے بعد شخصیتوں کے ایک یا دو ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن یہ بھی ان کی رائے ہے۔ اب جدید مصری اثری تحقیقات اور حجری کتبات کے پیش نظر اس سلسلے میں جو انکشاف ہوا ہے یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام

---

[1] تفہیم القرآن ص۷۵　　[2] تفسیر ماجدی ص۲۱

کے زمانے کا فرعون رعمسیس ثانی کا بیٹا منفتاح ہے۔ اس تحقیقی روایت کے بارے میں احمد یوسف احمد آفندی نے ایک مستقل مقالہ سپردِ قلم کیا ہے۔ یہ مصری دارالآثار کے مصوّر ہیں اور اثری تحقیقات کے بہت بڑے عالم ہیں۔ ان کے اس مقالہ کا خلاصہ علامہ عبدالوہاب نجار نے قصص الانبیاء میں نقل کیا ہے جس کا حاصل یہ ہے۔ جس فرعون نے بنی اسرائیل کو مصائب میں مبتلا کیا وہ یہی رعمسیس ثانی ہے۔ یہ مصر کے حکمرانوں کا انیسواں خاندان تھا حضرت موسیٰ علیہ السلام اس کے زمانے میں پیدا ہوئے اور اسی کی آغوش میں پرورش پائی۔ تاریخ اثریات سے پتہ چلتا ہے کہ اسیویہ قبائل جو مصر کے قریب آباد تھے۔ ان کے اور فراعنہ کے اس خاندان کے درمیان پیہم نو سال تک سخت پیکار رہی۔ بدیں وجہ یہ قرین قیاس ہے کہ رعمسیس دوم نے اس اندیشہ سے کہ کہیں اسرائیلی قیادت پر آمادہ نہ ہو جائیں۔ اسرائیلیوں کو ان مصائب میں مبتلا کرنا ضروری سمجھا جن کا ذکر توریت اور قرآن میں ہے۔ رعمسیس دوم اس زمانے میں بہت بوڑھا ہو چکا تھا اس لیے اپنی زندگی ہی میں اپنے بڑے بیٹے منفتاح کو شریکِ حکومت کر لیا تھا۔ رعمسیس کی اولاد میں سے یہ تیرھواں لڑکا تھا۔ لہٰذا منفتاح ہی وہ فرعون ہے جس کو حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام نے دعوتِ اسلام دی اور بنی اسرائیل کی رہائی کا مطالبہ کیا۔[1]

غالباً من آلِ فرعون کی تعبیر میں بھی قرآن کا اعجازی اشارہ یہی ہے۔ قرآن اس آیت میں اسی سے بنی اسرائیل کو بچا لینے کے انعام کو یاد کرا رہا ہے۔ مورخین کا خیال ہے کہ سارے اسرائیل مصر سے دفعۃً نہیں نکلے تھے۔

۱۲۵ بلکہ رفتہ رفتہ اور مختلف ٹولیوں میں نکلے تھے۔ اور ان کا سب سے آخری اور بڑا دستہ وہ تھا جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قیادت میں روانہ ہوا۔ اگر تاریخ نے کبھی مورخین کے اس خیال کی تصدیق کر دی تو قرآن کے لفظ نَجَّيْنَاکُمْ کے باب تفعیل سے لانے کی اعجازی شان کا ظہور ہو گا۔ سیّد انور شاہؒ نے صحیح لکھا ہے کہ قرآن حکیم کا اعجاز صرف مقاصد و حقائق میں نہیں بلکہ مفردات میں بھی ہے۔ مفردات میں وہ لفظ اختیار کرنا ہے جس سے اوفی بالحقیقۃ اور اوفی بالمقام کوئی پیش نہیں کر سکتا۔[2]

---

[1] قصص القرآن ج ۱ ص ۲۲۱ [2] مشکلات القرآن ص ۶۷

فرعون کے مظالم

۱۲۶ ؎ نہایت سخت عذاب میں ڈالے ہوئے تھے۔ یہ یَسُوْمُوْنَکُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ کا ترجمہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ظالم و جابر حکمرانوں کی طرح تمہیں رعایا بنائے ہوئے تم پر سے اوپر طرح طرح کی سختیاں کر رہے تھے۔ دراصل مصر کے لوگ اپنے آپ کو متمدن اور ترقی یافتہ سمجھتے تھے اور سب کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ خصوصاً اسرائیلی ان کی نگاہوں میں بڑے ہی ذلیل تھے۔ انہیں چرواہا کہہ کر پکارتے تھے اور اس قابل نہ سمجھتے کہ اپنی مجلسوں میں جگہ دیں۔ یہ بات بھی ان میں عام تھی کہ کوئی مصری اسرائیلی کے ساتھ ایک دسترخوان پر کھانا نہ کھائے۔ اور مصر کے دیہاتی بھی انہیں اس درجہ بُرا سمجھتے کہ اپنی آبادیوں میں ان کا بسنا گوارا نہ کرتے تھے ؎۱

(پیدائش ۴۶-۳۴، ۴۳-۳۲)

توریت میں ہے مصریوں نے خدمت کروانے میں بنی اسرائیل پر سختی کی اور انہوں نے سخت محنت سے گارے اور اینٹ کا کام کیا اور سب خدمت کھیت کی کرواکے ان کی زندگی تلخ کی۔ ان کی ساری خدمتیں جو وہ ان سے کراتے تھے مشقت کی تھیں۔ (خروج ۱۳-۱۴)

قرآن حکیم اور توراۃ کے بیان کا یہ فرق قابلِ غور ہے کہ توراۃ نے حاکمانہ سخت گیریوں کو سارے مصریوں کا کام بتایا ہے جبکہ قرآن اسے محتاط اور صادقانہ لہجے میں صرف فرعونیوں کا کردار بتا رہا ہے۔ دونوں چیزیں بالکل الگ الگ ہیں ؎۲

فرعون نے خواب دیکھا تھا۔ نجومیوں نے اس کی تعبیر دی کہ بنی اسرائیل میں ایک شخص پیدا ہوگا جو تیری سلطنت کو غارت کر دے گا۔ فرعون نے حکم دیا کہ بنی اسرائیل میں جو بیٹا پیدا ہو اُسے مار ڈالو اور جو بیٹی پیدا ہو اُسے خدمت کے لیے رہنے دو۔ خدا تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پیدا کیا اور زندہ رکھا ؎۳

توراۃ میں یہ اور اضافہ ہے کہ فرعون نے دایہ مقرر کر دی تھی کہ قلمرو مصر میں جس اسرائیلی کے یہاں لڑکا پیدا ہو اُسے قتل کر دیا جائے مگر ان عورتوں کے دل میں ایسی ہمدردی پیدا ہوئی کہ انہوں نے اس عمل کے لیے کوئی اقدام نہیں کیا اور جب فرعون نے بازپرس کی تو یہ معذرت

؎۱ ترجمان القرآن صفحہ ۲۵۰ ؎۲ تفسیر ماجدی صفحہ ۲۱ ؎۳ حاشیہ شیخ الہندؒ صفحہ ۱۰

پیش کردی کہ اسرائیلی عورتیں شہری عورتوں کی طرح نازک اندام نہیں ہیں۔ وہ خود ہی بچہ جن لیتی ہیں، اور ہمیں مطلق خبر نہیں ہوتی ہے۔ اس پر فرعون نے ایک جماعت کو اس لیے مقرر کیا کہ وہ تفتیش و تلاش کے بعد اسرائیلی لڑکوں کو قتل کریں اور لڑکیوں کو چھوڑ دیں[1]

۲۱۵ اس میں تمہارے پروردگار کی جانب سے بڑی آزمائش ہے۔ آزمائش بلا کا ترجمہ ہے۔ بلا ایک سے زیادہ معنی میں بولا جاتا ہے۔ اگر ذالکم کا اشارہ ذبح کی طرف ہو تو اس کے معنی مصیبت کے ہیں۔ اور اگر اشارہ نجات کی طرف ہے تو یہ نعمت کے معنی میں ہے اور اگر اشارہ دونوں کی طرف ہو تو آزمائش کے معنی لیے جائیں گے[2]

یعنی آزمائش اس بات کی کہ اس بھٹی سے تم خالص سونا بن کر نکلتے ہو یا نری کھوٹ بن کر رہ جاتے ہو۔ اور آزمائش اس امر کی کہ اتنی بڑی مصیبت سے اس معجزانہ طریق پر نجات پانے کے بعد بھی تم اللہ کے شکر گزار بندے ہوتے ہو یا نہیں[3]

اس سارے واقعہ کو قرآن نے مضارع کے صیغوں کے ذریعے بیان کر کے اس طرح منظر کشی کی ہے گویا بنی اسرائیل فرعونی حکمرانوں کی سختیوں کا تختہ مشق بن رہے ہیں۔ ان کے بچے بے دریغ قتل ہو رہے ہیں۔ ان کی لڑکیاں زندہ ہیں اور فرعونوں کی خدمت انجام دے رہی ہیں۔ منظر کشی کے ذریعے اپنے مخاطبوں کو تاثر دینا معجزانہ انداز بیان ہے۔ اور قرآن کے ساتھ مخصوص ہے۔

---

[1] خروج ب ۱ آیات ۱۵-۲۳

[2] حاشیہ شیخ الہند ص ۱۰ [3] تفہیم القرآن ص ۷۵

وَإِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَأَنْجَيْنَاكُمْ وَأَغْرَقْنَا آلَ فِرْعَوْنَ وَأَنْتُمْ تَنْظُرُونَ ﴿٥٠﴾

اور اس واقعہ کو یاد کرو جب[۱۲۸] ہم نے تمہاری خاطر سمندر[۱۲۹] کو پھاڑ کر راستہ بنایا تھا۔ پھر اس طرح تمہیں بچا لیا تھا۔ اور فرعونیوں کو تمہاری دیکھتی آنکھوں دریا بُرد کر دیا تھا[۱]

عظیم الشان معجزہ

اس آیت میں دوسرے انعام کا ذکر کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرعون اور اس کی قہرمانیت کے مظالم سے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کو ایک عظیم الشان معجزے کے ذریعے نجات دی۔ فرعون اور فرعونیوں کے مظالم سے تنگ آکر بالآخر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قیادت میں بنی اسرائیل نے مصر کی سکونت ترک کرکے اپنے آبائی وطن شام و فلسطین کو جانا طے کر لیا۔ سفر مصری حکومت سے چھپ چھپا کر رات کے وقت شروع کیا۔ شب کی تاریکی میں بنی اسرائیل راستہ بھول گئے۔ بجائے اس کے کہ شمال کی طرف کچھ اور آگے بڑھ کر اپنے دائیں پر مشرق کی طرف مڑتے پہلے ہی ادھر گھوم پڑے۔ اُدھر فرعون کو خبر ہو گئی وہ اپنے لشکر کی خود کمان کرتا ہوا تیزی سے تعاقب میں پہنچ گیا۔ اب اسرائیلیوں کے سامنے سمندر تھا۔ اور پشت پر فرعونی لشکر۔ قرآن نے اس آیت میں اسی تاریخی واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ سورۃ بقرہ سے پہلے نازل ہونے والی سورتوں میں اس کی تفصیلات آ چکی ہیں۔

[۱۲۸] یعنی اے بنی اسرائیل اس انعام عظیم کو یاد کرو جب تمہارے باپ دادا فرعون کے ڈر سے بھاگے اور آگے دریا پیچھے فرعون کا لشکر تھا۔ اور ہم نے تم کو بچا لیا۔ فرعون اور اس کے لشکر کو غرق کر دیا۔ یہ قصہ آئندہ مفصل آئے گا[۱]

[۱۲۹] بحر سے مراد یہاں دریائے نیل نہیں بلکہ بحرِ قلزم یا بحرِ احمر ہے۔ دریائے نیل تو

---

[۱] حاشیہ شیخ الہندؒ صفحہ ۱

بنی اسرائیل کے مسکن سے مغرب کی طرف واقع تھا۔ اور اسرائیلیوں کا راستہ شام کے لیے مشرق کی طرف تھا۔ مصر سے شام کی راہ کے قریب بحرِ قلزم ہے۔ اسی کے تنگ شمالی سرے کی جانب یہاں اشارہ ہے۔ اسرائیلیوں نے اسی کو عبور کر کے جزیرہ نمائے سینا میں قدم رکھا تھا۔

مقامِ عبور کیا تھا؟

اس بات کا فیصلہ قطعاً ناممکن ہے مقامِ عبور کیا تھا جس سے بنی اسرائیل گزرے اور دریا کو عبور کر گئے۔ کیونکہ اس سلسلے میں تاریخ کا پرانا ذخیرہ تورات ہے۔ البتہ قرآن اور تورات کی مشترک تصریحات سے یہ قطعی متعین کیا جا سکتا ہے کہ بنی اسرائیل نے بحرِ قلزم کو کسی کنارے یا دہانے سے عبور کیا یا درمیانی کسی حصہ سے۔ اس کے لیے ایک مرتبہ نقشہ میں اس حصہ پر نظر ڈال لیجئے جہاں بحرِ قلزم یا بحرِ احمر واقع ہے۔ دراصل یہ بحرِ عرب کی ایک شاخ ہے جس کے مشرق میں سرزمینِ عرب واقع ہے اور مغرب میں مصر۔ شمال میں اس کی دو شاخیں ہو گئی ہیں۔ ایک شاخ خلیج عقبہ جزیرہ نمائے سینا کے مشرق میں اور دوسری شاخ خلیج سویز اس کے مغرب میں واقع ہے۔ یہ دوسری شاخ پہلی شاخ سے بڑی ہے اور شمال میں دور تک چلی گئی ہے۔ اس شاخ کے شمالی دہانے کے سامنے ایک سمندر واقع ہے جس کا نام بحرِ روم ہے۔ اور بحرِ احمر کے اس شمالی دہانے کے درمیان تھوڑا سا خشکی کا حصہ ہے۔ یہی وہ راستہ ہے جہاں سے مصر والوں کو فلسطین جانے کے لیے بحرِ احمر کو عبور نہیں کرنا پڑتا تھا اور اس زمانے میں یہ راستہ قریب ترین تھا۔ اسرائیلیوں نے یہ راستہ بحکمِ الٰہی اختیار نہیں کیا تھا۔ اب اسی خشک راستہ کو کھود کر بحرِ احمر کو بحرِ ابیض سے ملا دیا گیا ہے اور اب اس ٹکڑے کا نام سویز ہے[1]

اسرائیلیوں کے سمندر عبور کرنے کی زمانے کی تاریخ یقین کے ساتھ تو نہیں بتائی جا سکتی لیکن جدید تحقیقات کے مطابق پندرہویں صدی قبل مسیح کا وسط قرار دیا جا سکتا ہے بلکہ بعض نے جرأت کر کے ۱۴۴۷ قبل مسیح متعین کر دیا ہے۔

لشکرِ فرعون کی غرقابی

۱۳۰ ؎ تمہاری دیکھتی آنکھوں یعنی یہ سب کچھ تم دیکھ رہے ہو۔ یہاں بھی منظر کشی کی خاطر

[1] قصص القرآن ج ۱ ص ۴۳۶

مضارع کا صیغہ استعمال ہوا ہے۔ گویا سمندر آنکھوں کے سامنے پھٹ رہا ہے۔ سمندر کا پانی سمٹ کر دونوں طرف پہاڑ کی طرح دیوار بن کر کھڑا ہے۔ درمیان میں خشک راستہ ہے اور تم اس راستہ میں چل کر سمندر عبور کر کے سمندر کے کنارے کھڑے ہو۔ فرعون کی فوجیں فرعون کی قیادت میں سمندر میں داخل ہوتی ہیں لیکن ابھی درمیان ہی میں تھے کہ پانی کی کھڑی ہوئی دیواریں آناً فاناً آپس میں مل گئیں اور سمندر کا پانی پہلے کی طرح رواں ہو گیا اور تمہاری آنکھوں کے سامنے دیکھتے دیکھتے فرعون مع اپنے لاؤ لشکر کے غرق ہو گیا۔

آیت کا مقصود اس انعامِ الٰہی کی یاد دہانی ہے۔ یہ ایک انعام نہیں ہے۔ اس میں ایک سے زیادہ انعامات ہیں۔ سمندر کا پھٹنا، سمندر میں خشک راستہ نمودار ہونا، تمہارا بچ نکلنا، فرعونیوں کا غرق ہو جانا اور یہ سب کچھ تمہارے سامنے ہونا اللہ کے تم پر انعامات ہیں۔

اس موضوع پر دوسرے تفصیلی مباحث کے لیے آپ کو سورۃ الشعراء تک انتظار کی زحمت برداشت کرنی پڑے گی۔ بشرطِ حیات انشاءاللہ وہاں اس اعجازِ موسوی کے سارے پہلوؤں کو کھول کر بتایا جائے گا۔

بہرحال یہ ایسا عظیم معجزہ ہے جس نے وقت کی تمام مادی استبدادیت کو ایک لمحہ میں شکست دے کر مظلوم قوم کو ظالم کے پنجے سے رستگاری دلائی۔

وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰٓى اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۵۱﴾ ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۵۲﴾ وَاِذْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۵۳﴾

اور وہ واقعہ بھی یاد کرو جب ہم نے موسیٰ[۱۳۱] سے چالیس[۱۳۲] راتوں کا وعدہ کیا تھا۔ تم نے ان کی غیر موجودگی میں بچھڑے کی پرستش کو اپنا لیا تھا اور تم جادۂ حق سے ہٹ گئے تھے۔ لیکن اس کے باوجود ہم نے پھر بھی تم کو معاف کر دیا تھا تاکہ تم اللہ کے شکر گزار بن کر اس کے احسان کی قدر کرو اور جب موسیٰ نے چالیس راتوں کا وعدہ پورا کر لیا تو ہم نے موسیٰ کو کتاب یعنی تورات دی[۱۳۳] اور حق و باطل میں امتیاز[۱۳۴] کرنے والی قوت عطا فرمائی تاکہ تم کو طاعت و فرمانبرداری کی راہ معلوم ہو جائے۔

نظامِ شریعت

جب موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کو مصری حکومت کے پنجۂ غضب سے نکال لائے تو اب مشیتِ ایزدی یہ ہوئی کہ اس قوم کو پورا نظامِ شریعت اور دستورِ زندگی عطا ہو۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جزیرہ نمائے سینا کے ایک پہاڑ کی چوٹی کوہِ طور پر نوشتۂ غیبی لینے کی خاطر ایک چلہ کے لیے بلائے گئے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا نسب نامہ

[۱۳۱] حضرت موسیٰ علیہ السلام کا نسب چند واسطوں سے حضرت یعقوب علیہ السلام سے جا ملتا ہے۔ سلسلۂ نسب یہ ہے۔ موسیٰ بن عمران بن قامت بن لاوی بن یعقوب علیہ السلام۔ تورات میں ہے کہ آپ کی عمر ایک سو بیس برس کی تھی۔ (استثنا ۳۴: ۷-۱) آپ کا زمانہ مورخین اور اثریین کے تخمینہ کے مطابق پندرہویں اور سولہویں صدی قبل مسیح کا ہے۔ سالِ ولادت

غالباً ۱۵۲۰ قبل مسیح اور سالِ وفات ۱۴۰۰ قبل مسیح ہے۔

۱۳۲ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اللہ سبحانہٗ کا وعدہ تھا کہ جب بنی اسرائیل مصری حکومت کی غلامی سے آزاد ہو جائیں گے تو تم کو شریعت دی جائے گی۔ اب وہ وقت آگیا کہ اللہ کا وعدہ پورا ہو اس لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام وحیٔ الٰہی کے اشارے سے طور پر پہنچے اور وہاں عبادتِ الٰہی کے لیے اعتکاف کیا۔ اس اعتکاف کی مدت ایک ماہ تھی مگر بعد میں چالیس کر دی گئی۔ چالیس سے چالیس رات دن مراد ہیں۔ اسلامی روایتوں میں آتا ہے کہ یہ زمانہ ذیقعد کے پورے مہینے اور ذی الحجہ کے دس روز کا تھا۔

احکامِ عشرہ یا تورات

۱۳۳ یہ قصہ کہ ہم نے موسیٰ علیہ السلام سے تورات عطا کرنے کا وعدہ کیا۔ اور ان کے کوہِ طور پر تشریف لے جانے کے بعد بنی اسرائیل نے بچھڑے کی پرستش شروع کر دی۔ مفصل سورۂ اعراف اور سورۂ طٰہٰ میں آرہا ہے۔ اس کے تفصیلی مباحث کا وہاں مطالعہ کیا جائے۔ اس جگہ یہ بات ضرور سمجھ لیجئے کہ اس واقعہ میں کوہِ طور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام پر جن احکام کا نزول ہوا وہ تورات ہے۔ لیکن مسیحی علماء کی موجودہ جماعت کہتی ہے کہ اس سے مراد وہ دس احکام ہیں جو مذہبِ موسوی میں شریعت یا احکامِ عہد کے نام سے موسوم ہیں۔ یعنی خدا کے سوا کسی کو نہ پوجو۔ زنا نہ کرو۔ چوری نہ کرو وغیرہ۔ اور تو اور حضرت مولانا ابوالکلام آزادؒ نے بھی ترجمان القرآن میں کتاب کا مصداق احکامِ عہد ہی کو قرار دیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:۔

یہاں شریعت سے مقصود وہ دس احکام ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے وحیٔ الٰہی سے پتھر کی دو تختیوں پر کندہ کیے تھے اور جنہیں تورات میں عہد کے احکام سے تعبیر کیا گیا ہے۔ (خروج ۳۴ - ۲۹) لیکن یہ رائے قرآن عزیز اور تورات دونوں کی شہادت کے خلاف ہے۔ کیونکہ قرآن نے اس آیت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے چلّہ کا ذکر کرتے ہوئے جب نزولِ احکام کا ذکر کیا ہے تو اسے کتاب اور فرقان کہا ہے۔ اور یہ دونوں صفات قرآن میں تورات کی آئی ہیں۔

اگرچہ تورات موجودہ بائبل کے سفرِ خروج استثنا اور کتاب یسوع میں حضرت موسیٰ

علیہ السلام کے چلہ کے بعد احکامِ عہد یا شریعت کا لفظ پایا جاتا ہے۔ لیکن مولانا رحمت اللہ کیرانوی نور اللہ مرقدہٗ نے اپنی شہرہ آفاق تصنیف اظہار الحق میں فارسی، عربی اور اُردو تراجم قدیم کے حوالہ سے ثابت کیا ہے کہ تورات کے ان نسخوں میں ان ہر دو الفاظ کی جگہ تورات لکھا ہوا پایا جاتا ہے ——— مولانا رحمت اللہ کیرانوی قدس اللہ سرہٗ العزیز فرماتے ہیں:

کتاب استثناء باب ۲۷، آیت ۸ میں ہے

اور ان پتھروں پر شریعت کی باتیں صاف صاف لکھنا۔

اس میں شریعت کا لفظ آیا ہے لیکن یہی آٹھویں آیت فارسی ترجمہ نسخہ مطبوعہ ۱۸۳۵ء میں اس طرح ہے،

برآں سنگہا تمامی کلمات ایں تورات بحسنِ وضاحت تحریر نما

اور ۱۸۴۵ء کے فارسی ترجمہ کے الفاظ یہ ہیں،

وبرآں سنگہا تمامی کلمات ایں تورات را بخط روشن بنولیس

اور کتاب یوشع میں ہے کہ

اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حکم کے مطابق ایک مذبح بنایا اور اس پر تورات لکھی۔ اسی باب کے ۳۲ ویں آیت کا فارسی ترجمہ مطبوعہ ۱۸۳۹ء اس طرح ہے کہ

دراںجا تورات را برآں سنگہا نقل نمود کہ آنرا پیش روئے بنی اسرائیل بہ تحریر آورد۔

اور فارسی ترجمہ مطبوعہ ۱۸۴۵ء میں یہ الفاظ ہیں،

دراںجا براں سنگہا نسخہ تورات موسیٰ را کہ درحضور بنی اسرائیل نوشتہ بود نوشت[1]

ان حوالوں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جو تختیاں کوہ طور پر دی گئی تھیں وہ تورات کی تختیاں تھیں۔ احکامِ عہد کی تختیاں نہ تھیں اور انگریزی نسخوں میں "لا" عربی اور اُردو نسخوں میں شریعت کو بھی صحیح مان لیا جائے تو یہ لفظ بھی اپنے معنے کی وسعت میں تورات پر صادق آتا ہے۔ اور تورات، شریعت اور قانون سب کا مصداق ایک ہی چیز ہے۔ قدیم عیسائی دُنیا میں یہی معنے سمجھے جاتے رہے ہیں۔ اور احکامِ عہد اسی کا ایک جز ہیں اور اس کو مستقل قرار دینا بعد کی پیداوار ہے۔

---

[1] اظہار الحق ج ۱ ص ۳۴۲

۱۳۴ ؎ فرقان ان احکامِ شرعیہ کو فرمایا جن سے جائز ناجائز معلوم ہو یا فرقان حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزوں کو فرمایا جن سے جھوٹے سچے اور مومن و کافر کی تمیز ہوتی ہے یا خود تورات ہی کو بطورِ عطفِ تفسیری فرمایا کہ اس سے حق اور ناحق کا فیصلہ ہوتا ہے۔ ؎۱

فرقان کیا ہے؟

فرقان اپنے لفظی معنے میں ہر وہ چیز ہے جس سے حق و باطل کے درمیان فرق کیا جا سکے۔ قرآن کا بھی نام ہے اس مناسبت سے کہ قرآن حق و باطل، حرام و حلال کے درمیان فارق ہے اور اسی تعلق سے اس کا اطلاق تورات پر بھی ہوا ہے کہ یہ بھی فارق ہے بلحاظِ عقائد حق و باطل کے درمیان بلحاظِ گفتار صدق و کذب کے درمیان اور بلحاظِ اعمال نیک اور بد کے درمیان۔ اس مقام پر فرقان کی متعدد تفسیریں کی گئی ہیں:-

۱۔ الکتاب اور الفرقان میں عطفِ تفسیری ہے اور دونوں سے تورات ہی مراد ہے۔

۲۔ اس سے مراد تورات اپنے قوانین کے لحاظ سے ہے۔

۳۔ اس سے مراد وہ معجزات ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عطا ہوئے۔

۴۔ اس سے مراد وہ فتح و غلبہ ہے جو بنی اسرائیل کو فرعونی حکومت کے مقابلہ میں ہوا۔

یہودیوں کا عقیدہ ہے کہ لکھی ہوئی کتاب کے علاوہ زبانی بھی بہت سے اسرار و مسائل کی تعلیم حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ہوئی تھی اور ان کے بعد سینہ بہ سینہ نسلاً بعد نسلٍ ان کی قوم میں منتقل ہوتی رہی ہے لہذا یہود کے نقطہ نظر سے فرقان سے مراد اس علم سفینہ کے علاوہ یہ علم سینہ ہے۔ ؎۲

فرقان وہ چیز جس کے ذریعے حق اور باطل کا فرق نمایاں ہو۔ اردو میں اس کے مفہوم میں لفظ کسوٹی ہے۔ یہاں فرقان سے مراد دین کا وہ علم و فہم ہے جس سے آدمی حق اور باطل میں تمیز کرتا ہے۔ ؎۳

نزولِ کتاب کا مقصد

۱۳۵ ؎۔ آخر میں فرمایا تاکہ تمہیں طاعت کی راہ معلوم ہو جائے۔ اس سے معلوم ہوا کہ دُنیا میں اللہ سبحانہٗ

؎۱ حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۱۱ ؎۲ تفسیر ماجدی ص ۲۲ ؎۳ تفہیم القرآن ص ۷۶

کی جانب سے کتابوں کے نزول کا مقصد یہ اور صرف یہ ہے کہ لوگ اس کی روشنی میں اللہ کی طاعت کر سکیں۔ اور اپنی زندگیوں کو من چاہی نہیں رب چاہی بنائیں۔ قرآن نے اپنے بارے میں یہی اعلان آغاز میں کیا ہے کہ ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ ۔

اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ جہاں تک انسان کی عملی زندگی کا تعلق ہے عقل کی رہنمائی نہ تو ہر حال میں کافی ہے نہ ہر حال میں موثر، نفسِ انسانی طرح طرح کی خواہشوں اور جذبوں سے کچھ اس طرح مقہور واقع ہوا ہے کہ جب کبھی عقل اور جذبات میں کش مکش ہوتی ہے تو اکثر حالتوں میں فتح جذبات کی ہوتی ہے۔ بسا اوقات عقل ہمیں یقین دلاتی ہے کہ فلاں کام نقصان دہ ہے لیکن جذبات ہمیں ترغیب دیتے ہیں اور ہم اس کے ارتکاب سے اپنے آپ کو روک نہیں سکتے۔ عقل کی بڑی سے بڑی دلیل بھی ہمیں ایسا نہیں بنا سکتی کہ غصہ کی حالت میں بے قابو نہ ہو جائیں اور بھوک کی حالت میں محض غذا کی طرف ہاتھ نہ بڑھائیں ۔

اس لیے ضروری ہوا کہ انسان کی عملی زندگی کی رہنمائی کا کام خود اللہ ہی کا ہو۔ اللہ کی رہنمائی کو قرآن کی زبان میں الھدی کہا گیا ہے۔ یہ الھدی یعنی انسان کی عملی زندگی کے لیے حقیقی روشنی وحی کی روشنی ہے۔ انسانی زندگی میں اجالا اسی کے ذریعے ہو سکتا ہے۔ اس لیے ہدایت کی وہ تمام صورتیں جو نبوت کی لائی ہوئی ہدایت سے الگ ہو کر بنائی جائیں حرف غلط ہیں۔ نبوت کی لائی ہوئی ہدایت میں علم و عمل کی دونوں نعمتیں ہمدوش ہوتی ہیں۔ ان سے انحراف شقاوت اور ضلالت کا سبب ہے ۔

آیت کا مطلب یہ ہے کہ تمہیں کتاب دی ہے اور کتاب بھی ایسی جو تمہیں علمبردارِ حق ہونے کی حیثیت سے دنیا کے تمام باطل عقائد، باطل اقوال، باطل اعمال اور باطل اخلاق میں ممتاز کر سکے۔ اور اس لیے دی ہے کہ اس کے ذریعے تمہیں منزلِ مقصود تک پہنچنے کا راستہ مل جائے یا تم اس پر چل کر منزلِ مقصود تک پہنچ جاؤ۔ اور راستہ میں نہ بھٹکو اور شقاوت و ضلالت کا شکار نہ ہو۔

یہ بات سید رشید رضا مرحوم یہاں خوب لکھ گئے کہ ہدایت یابی کا استعدادی کمال یہ ہے کہ بنی اسرائیل کو یہ معلوم ہو جائے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کی جانب سے جو علم و عمل لے کر آئے ہیں بس وہ نورِ ہدایت ہے جو ان کو اصل مقام تک پہنچانے کا ضامن ہے ۔

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ فَتُوْبُوْٓا اِلٰى بَارِىِٕكُمْ فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِىِٕكُمْ ؕ فَتَابَ عَلَيْكُمْ ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۝

اور پھر واقعہ بھی یاد کرو جب ہم نے چالیس راتوں والا وعدہ پورا کیا اور موسیٰ علیہ السلام کتابِ الٰہی لے کر واپس آتے اور تمہیں گوسالہ پرستی میں مبتلا دیکھا اور یہ صورتِ حال دیکھ کر اس وقت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم [۱۳۶] یعنی تم سے کہا کہ اے میری قوم افسوس تمہاری احسان فراموشی پر۔ تم نے بچھڑے کو معبود [۱۳۷] بنا کر خود ہی اپنی جانوں پر ظلم کیا۔ لہٰذا تم اپنے مولیٰ کے حضور توبہ کرو [۱۳۸] اور اس گوسالہ پرستی کے جرم کی پاداش میں اپنے آپ کو قتل کر دو [۱۳۹] اسی میں تمہارے خالق کے نزدیک تمہارے لیے خیر [۱۴۰] کا سامان ہے۔ چنانچہ اس وقت تم نے توبہ کی۔ اس لیے اللہ نے تمہاری توبہ قبول کر لی اور اللہ ہی معاف [۱۴۱] کرنے والا اور مہربانی والا ہے۔

گوسالہ پرستی

اس آیت میں قرآن نے اپنی معجزانہ بلاغت سے منظر کشی کا جو انداز اختیار کیا ہے وہ بڑا ہی دلآویز ہے۔ پہلے ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ میں گناہ کی طرف اشارہ کیا اور اس کے بعد معافی اور قبولِ توبہ کی نعمت کا تذکرہ کیا۔ کتابِ الٰہی اور آسمانی دستورِ حیات کے انعام کا ذکر کر کے ان کی زندگی کے نقشہ سے ایک سیاہ دھبے کو نہیں بلکہ دو کو پیش کر دیا۔ ایک گوسالہ پرستی دوسرے رویت الٰہی۔

[۱۳۶] یہاں قوم سے مراد خاص وہ لوگ ہیں جنہوں نے بچھڑے کو سجدہ کیا[1]

یہ واقعہ مفصّل سورۂ اعراف اور طٰہٰ میں آ رہا ہے۔ انشاء اللہ اس کے تفصیلی مباحث وہاں آئیں گے۔

گوسالہ پرستی کا مبداء

[۱۳۷] یہ سوال کہ بنی اسرائیل میں گوسالہ پرستی کہاں سے آئی۔ اس کے علماء نے مختلف جوابات

---

[1] حاشیہ شیخ الہند ص ۱۱

دیے ہیں۔

ایک رائے یہ ہے کہ یہ مصریوں کی گاؤ پرستی کا اثر تھا۔ دوسرا خیال یہ ہے کہ مشرک کنعانیوں اور فلسطینیوں کا اثر تھا۔ بہرحال یہ شرک جہاں سے بھی آیا قرآن نے اسے شرک ہی قرار دیا ہے[1]

دراصل بنی اسرائیل مصری بت پرستی سے اس درجہ مالوف ہو گئے تھے کہ رہ رہ کر انہیں اس کا شوق ابھرتا تھا۔ جونہی حضرت موسیٰ علیہ السلام چالیس دن کے لیے الگ ہوئے انہوں نے گائے کے بچھڑے کی طلائی مورتی بنا کر اس کی پوجا شروع کر دی۔ تورات میں ہے کہ مورتی حضرت ہارون علیہ السلام نے بنائی تھی۔ (خروج ۳۱ - ۳۲) لیکن قرآن نے دوسرے مقام پر واضح کر دیا ہے کہ یہ سامری نامی ایک شخص کی کارستانی تھی اور حضرت ہارون علیہ السلام کا دامن اس دھبے سے پاک ہے[2]

گائے اور بیل کی پرستش کا مرض بنی اسرائیل کی ہمسایہ اقوام میں ہر طرف پھیلا ہوا تھا۔ مصر اور کنعان میں اس کا عام رواج تھا۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے بعد بنی اسرائیل جب انحطاط میں مبتلا ہو گئے اور رفتہ رفتہ قبطیوں کے غلام بن گئے تو انہوں نے منجملہ اور امراض ایک یہ مرض بھی اپنے حکمرانوں سے لے لیا تھا[3]

گوسالہ پرستی کے واقعات کے تفصیلی مباحث تو آپ آئندہ سورۂ اعراف اور طٰہٰ میں پڑھیں گے۔ یہاں حضرت شاہ عبدالقادر دہلویؒ کی زبانی اس کا خلاصہ سن لیجئے۔

جس وقت بنی اسرائیل بہتے دریا میں داخل ہوئے پیچھے سے فرعون بھی اپنی فوج کے ساتھ آگیا۔ حضرت جبریل علیہ السلام بیچ میں ہو گئے کہ ان کو ان تک نہ پہنچنے دیں۔ سامری نے پہچانا کہ یہ جبریل ہیں۔ ان کے پاؤں کے نیچے سے مٹھی بھر مٹی اٹھائی۔ اب سونے کے بچھڑے میں ڈال دی۔ سونا تھا کافروں کا مال لیا ہوا۔ قریب سے اس میں مٹی پڑی برکت کی۔ حق و باطل مل کر ایک کرشمہ پیدا ہوا کہ رونق جاندار کی اور آواز اس میں پڑ گئی۔ ایسی چیزوں سے بچنا چاہیے اسی سے بت پرستی بڑھتی ہے۔

فی الواقع گوسالہ پرستی افسوسناک ہی نہیں بلکہ حیرت زا بھی ہے۔ اس سے بنی اسرائیل کی ذہنیت اور اخلاقی پستی بے نقاب ہو کر سامنے آجاتی ہے۔ اُدھر جبل طور پر تو حضرت موسیٰ علیہ السلام مناجات الٰہی اور راز و نیاز میں مشغول ہیں۔ اور بنی اسرائیل کے لیے آئینِ الٰہی تورات حاصل کر رہے

[1] تفسیر ماجدی [2] ترجمان القرآن [3] تفہیم القرآن ص ۷۶

ہیں۔ اور نیچے۔ بنی اسرائیل اپنے مشرکانہ جذبات کی تسکین کا گوسالہ پرستی کے ذریعے سامان کر رہے ہیں۔

نبی کی اُمت میں بگاڑ

اوروں کا پتہ نہیں مگر میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ نبی کی اُمت میں اسی طرح نبوت کی لائی ہوئی ہدایت سے انحراف پیدا ہو جاتا ہے۔ بنی اسرائیل صرف حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اُمت نہیں بلکہ پہلے سے نبیوں کے ماننے والے نبیوں سے نسلی تعلق رکھنے والے ہیں۔ برکتوں کو دیکھ کر فریفتہ ہو جانا اور سمجھ بوجھ کو خیر باد کہہ دینا اُمتوں کی عام کمزوری ہے۔ اس بدعملی کا باعث اللہ کی عبادت کا انکار نہیں بلکہ عقیدت اور عظمت کا وہ بوجھ ہے جو عام ذہنوں میں برکت کے نام پر پیدا ہو جاتا ہے۔ قربان جائیے قرآن کے بلیغانہ اندازِ بیان کے یا نبوت کے اسلوبِ دعوت کے کہ شرک جیسے سنگین گناہ میں مبتلا دیکھ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا، اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ تم نے بچھڑے کو اپنا کر اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے۔ یعنی اپنا نقصان کیا ہے۔ یہ نہیں فرمایا اشرکتم باللّٰہ یا عبدتم العجل من دون اللہ یعنی تم نے اللہ کے ساتھ شرک کیا، تم نے بچھڑے کی عبادت کی۔ بلکہ آیت میں اتخاذ کے مفعول ثانی کو بھی حذف کر دیا۔ حالانکہ ایسے مواقع پر اتخاذ کے دو مفعول آتے ہیں۔ قرآن میں اتخاذ مشرکین کے لیے اسی طرح بولا گیا ہے۔ یعنی دو مفعولوں کے ساتھ۔ جیسے اِتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ۔

اس سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ چونکہ اُمت میں مشرکانہ عمل برکتوں کی فریب کی وجہ سے پیدا ہوا تھا۔ اللہ کی عبادت سے انکار اس کا باعث نہ تھا اس لیے اندازِ خطاب یہ اختیار کیا گیا اور اگر یہی مشرکانہ عمل مشرکینِ مکہ کی طرح عبادت کے نتیجے میں ہوتا تو اندازِ خطاب ظلمتم نہ ہوتا بلکہ اشرکتم ہوتا۔

۱۳۸ ۔ اپنے مولیٰ کے حضور توبہ کرو یعنی چونکہ بچھڑے سے عابدانہ تعلق پیدا کر کے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے اور اس طرح تم توحید عبادت جیسی بیش بہا دولت کو چھوڑ کر مخلوق پرستی کی گندگی میں ملوث ہو گئے ہو۔ اس لیے اپنے خالق کی بارگاہ میں حاضر ہو کر اپنے اس جرمِ عظیم کی معافی مانگو۔ لیکن چونکہ توبہ کا حاصل اس کے سوا کچھ نہیں کہ دل میں ندامت محسوس ہو اور اپنے کیے پر پچھتا کر اللہ کی ہیبت و جلال سے سرشار ہو کر آئندہ گناہ نہ کرنے کا پختہ ارادہ کرے۔ اس لیے اس عزم کے بعد یہ کرو کہ

۱۳۹ ۔ اپنے آپ کو قتل کرو یعنی جنہوں نے بچھڑے کو سجدہ نہیں کیا تھا وہ سجدہ کرنے والوں کو

قتل کریں۔ اور بعض کی رائے ہے کہ بنی اسرائیل کے تین گروہ تھے۔ ایک وہ جنہوں نے گوسالہ پرستی نہ کی اور دوسروں کو بھی روکا۔ دوسرے وہ جنہوں نے گوسالہ پرستی کی۔ تیسرے وہ جنہوں نے خود تو گوسالہ پرستی نہ کی لیکن دوسروں کو نہ روکا۔ فریق دوم کو یہ حکم ہوا کہ مقتول ہو جاؤ۔ تیسرے فریق کو یہ حکم ہوا کہ ان کو قتل کرو تاکہ ان کی خاموشی اختیار کرنے کی توبہ ہو جائے۔ اور فریق اوّل کو اس میں شریک نہیں کیا گیا کیونکہ اسے توبہ کی ضرورت ہی نہ تھی[1]

شرک شریعتِ موسوی اور آئینِ اسرائیلی میں علاوہ معصیت کے فوجداری جُرم تھا۔ جُرم بھی مستوجبِ قتل۔ تورات کی قانونی عبارتوں میں مشرک اور مشرکہ کے لیے یہ تصریح ہے۔ اس مرد یا عورت پر یہاں تک پتھراؤ کرو کہ وہ مر جائیں۔ گواہوں کے ہاتھ اس پر پہلے اٹھیں تاکہ اس کو قتل کریں اور ان کے بعد باقی سب لوگوں کے ساتھ تم ایسا ہی اپنے بیچ سے شرارت کو نیست و نابود کیجیو۔ (استثناء ۱۷۔ ۵،۷)

شرک کے مجرمین سامنے پکڑ کر لائے گئے اور اپنے ہی بھائی بندوں کے ہاتھوں موت کے گھاٹ اُترے۔ تورات میں ہے۔ تم میں ہر مرد اپنی کمر پر تلوار باندھے اور ہر ایک دروازے سے دوسرے دروازے تک تمام لشکر گاہ میں گزرتا پھرے اور ہر مرد تم میں سے اپنے بھائی کو ہر ایک آدمی اپنے قریب کو قتل کرے۔ اور بنی لاوی نے موسیٰ کے کہنے کے مطابق کیا۔ چنانچہ اس دن لوگوں میں سے تقریباً تین ہزار آدمی مارنے پڑے۔ (خروج ۳۲۔ ۲۷۔ ۲۸)

سب کو معافی کا پروانہ

[۱۴۰] اس میں تمہارے لیے خیر کا سامان ہے۔ یعنی ایسا کرنا تمہارے لیے بہتر ہے۔ اس سے تمہارے دامن کی آلودگی کے دھبے مٹ جائیں گے اور آخرت کی ابدی زندگی میں تمہاری سرخروئی ہو گی۔ اور یا مطلب یہ ہے کہ توبہ کا یہ عملی مظاہرہ گناہ اور گناہ پر اصرار سے تمہارے لیے بدرجہا بہتر ہے۔ پہلی صورت میں یہ فقرہ پہلے حکمِ توبہ اور قتل کی علت بنا رہا ہے۔ اور دوسری صورت میں اس فقرے کے ذریعے توبہ کی ترغیب دی جا رہی ہے۔ اس سے اگلا فقرہ اللہ نے تمہاری توبہ قبول کر لی۔ یعنی فَتَابَ عَلَيْكُمْ اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تقریر کا حصّہ ہے تو مطلب یہ ہے

---

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۱۱

کہ اگر تم نے حکم کی تعمیل کر کے توبہ کا یہ عملی مظاہرہ کر دیا تو سمجھ لو کہ اللہ نے تمہاری توبہ قبول کر لی ہے۔ اور اگر یہ فقرہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تقریر کا حصہ نہیں اور اللہ سبحانہٗ کی جانب سے بنی اسرائیل کو خطاب ہے تو پھر مطلب یہ ہے کہ تمہیں جو کچھ حکم دیا گیا تھا تم نے چونکہ تعمیل کر لی ہے اس لیے اللہ سبحانہٗ نے تمہاری توبہ کو شرفِ قبول عطا فرما دیا۔ اور اس اندازِ بیان سے یہ بتانا مقصود ہے کہ تمہاری توبہ من حیث القوم قبول کر لی گئی۔ سزا صرف ان افراد کو ملی جو شرک کے مجرم تھے اور معافی کا پروانہ سب کو عطا ہو گیا۔

[۴۱] اس آخری فقرے کے ذریعے یہ بات سمجھا دی کہ ان کی توبہ کی قبولیت دراصل اس لیے ہوئی ہے کہ اللہ کی شان ہی گنہگار بندوں کی توبہ قبول کرنا ہے اور صرف قبول کرنا ہی نہیں بلکہ بندوں کو توفیق عطا فرمانا اسی کا کام ہے کیونکہ بندوں سے خدا کا رشتہ رحمت کا رشتہ ہے اور سچی عبودیت اسی کی ہے جس کے لیے معبود صرف معبود نہ ہو بلکہ محبوب و رحیم بھی ہو۔

اس فقرے میں اللہ کی رحمت کی وسعت اور اس کی مغفرت کی فراوانی کا جو دلکش منظر پیش کیا ہے اس کی حد و انتہا نہیں ہے۔ کتنے ہی گناہ ہوں، کتنے ہی سخت گناہ، کتنی ہی مدت کے گناہ ہوں لیکن ہر اس شخص کے لیے جو اس کے دروازۂ رحمت پر دستک دے رحمت و قبولیت کے سوا کوئی صدا نہیں ہو سکتی۔ دُنیا کی بہت سی گمراہ قوموں کا عقیدہ ہے کہ اللہ کو معاف کرنے کا کوئی اختیار نہیں ہے۔ کیونکہ وہ خود قانونِ مکافاتِ عمل کا پابند ہے۔ عیسائیت اسی بنیادی گمراہی کا شکار ہے۔ چونکہ خدا از خود کسی کو معاف نہیں کر سکتا اور معاف کرنا چاہتا ہے اس لیے اس نے اپنے بیٹے کو سب کی طرف سے بطورِ کفارہ سزا دے کر دوسروں کو معاف کر دیا۔ قرآن نے توبہ، قبولیتِ توبہ اور اس کے بعد صفتِ رحیمی پیش فرما کر اس گمراہی کی تردید کر دی۔

وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ وَ اَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ۝ ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝

اور وہ واقعہ بھی[۱۴۲] یاد کرو جب تم نے (حضرت موسیٰ علیہ السلام سے) کہا تھا کہ اے موسیٰ ہم تمہاری بات ہرگز نہ مانیں گے جب تک کھلم کھلا اللہ کو نہ دیکھ لیں گے۔ اس وقت تمہارے دیکھتے دیکھتے تمہیں اچانک بجلی کے کڑاکے نے آ پکڑا تھا۔ پھر ہم[۱۴۳] نے اس ہلاکت کے بعد تم کو دوبارہ اُٹھا کر کھڑا کیا تاکہ تم اللہ کے شکر گزار بندے بن جاؤ۔

دیدارِ الٰہی کا مطالبہ

جب بنی اسرائیل کا گوسالہ پرستی کا سنگین جرم معاف ہو گیا تو اب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان سے فرمایا کہ میرے پاس جو یہ تختیاں ہیں۔ یہ کتاب ہے جو اللہ نے تمہاری ہدایت دینی اور دنیوی زندگی کی فلاح کے لیے مجھ کو عطا فرمائی ہے۔ یہ تورات ہے اب تمہارا فرض ہے کہ اس کو اپنی زندگی میں اپناؤ اور اس دستورِ حیات کے ذریعے زندگی کے سارے گوشوں میں تبدیلی پیدا کرو۔ بنی اسرائیل بہر حال بنی اسرائیل تھے کہنے لگے کہ موسیٰ ہم کیسے مانیں کہ یہ اللہ کی کتاب ہے۔ صرف تیرے کہنے سے ہم نہیں مانیں گے۔ ہم تو اس وقت مانیں گے کہ اللہ کو بے حجاب اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں، وہ ہم سے یہ کہے کہ یہ تورات میری کتاب ہے۔

[۱۴۲] یعنی اس وقت کو بھی یاد کرو کہ باوجود اس قدر احسانات کے جب تم نے کہا تھا کہ اے موسیٰ ہم ہرگز تمہارا یقین نہ کریں گے کہ یہ اللہ کا کلام ہے۔ جب تک آنکھوں سے صریحاً خدا کو نہ دیکھ لیں۔ اس پر بجلی نے تم کو ہلاک کیا۔ اس کے بعد موسیٰ علیہ السلام کی دُعا سے ہم نے تم کو زندہ کیا اور یہاں وقت کا ذکر ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ستر آدمیوں کو منتخب کیا اور کوہِ طور پر کلامِ الٰہی سننے کی غرض سے لے گئے تھے۔ پھر جب انہوں نے کلامِ الٰہی کو سُنا تو انہی ستر آدمیوں نے کہا کہ اے موسیٰ پردے میں سننے کا ہمیں اعتبار نہیں، آنکھوں سے خدا کو دکھاؤ۔ اس پر ان ستر آدمیوں کو بجلی نے ہلاک کر دیا تھا[۱]

[۱] حاشیہ شیخ الہند ص ۱۱

بے ادبی و گستاخی

یہ اشارہ جس واقعے کی طرف ہے اس کی تفصیل یہ ہے کہ چالیس شبانہ روز کی قرارداد پر جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کوہ طور پر تشریف لے گئے تھے تو آپ کو حکم ہوا تھا کہ بنی اسرائیل کے ستر نمائندے بھی اپنے ساتھ لے کر آئیں۔ پھر جب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کتاب اور فرقان عطا کی تو آپ نے ان نمایندوں کے سامنے اسے پیش کیا۔ اس موقع پر قرآن کہتا ہے کہ ان میں سے بعض شریر کہنے لگے کہ ہم محض تمہارے بیان پر یہ کیسے مان لیں کہ خدا تم سے ہمکلام ہوا ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ کا غضب نازل ہوا اور انہیں سزا دی گئی۔ لیکن بائبل کہتی ہے:

انہوں نے اسرائیل کے خدا کو دیکھا۔ اس کے پاؤں کے نیچے نیلم کے پتھر کا چبوترہ سا تھا اور آسمان کی مانند شفاف تھا۔ اور اس نے بنی اسرائیل کے شرفاء پر اپنا ہاتھ نہ بڑھایا۔ سو انہوں نے خدا کو دیکھا اور کھایا پیا۔ (خروج باب ۲۴ آیت ۱۰-۱۱)[1]

اس عبارت سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ مولانا مودودی اپنے مخاطبوں کے ذہن میں یہ اتارنا چاہتے ہیں کہ یہ ستر آدمی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ پورے چلہ میں کوہ طور پر رہے اور بلا کسی پس منظر کے پہلے ہی اللہ پاک نے ستر آدمی منتخب کر کے ساتھ لانے کا حکم دیا تھا۔ اگرچہ مفسرین میں سے کچھ کی رائے بھی یہ ہے۔ لیکن مولانا شبیر احمد عثمانیؒ فرماتے ہیں۔ راجح یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ میقات اس میقات کے علاوہ ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تورات عطا کرنے کے لیے مقرر ہوئی تھی۔ نیز سورۃ اعراف میں بیان کی ترتیب سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ گوسالہ پرستی اور سزایابی کے بعد پیش آیا۔ لیکن سورۃ نساء کی آیت

فَقَالُوْٓا اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ بِظُلْمِهِمْ ثُمَّ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ ط

زیادہ صفائی سے بتلاتی ہے کہ گوسالہ پرستی اس واقعہ کے بعد ہوئی ہے۔ لیکن حضرت مولانا اشرف علیؒ فرماتے ہیں کہ یہاں پر جو ثُمَّ کا ترجمہ واقعات کی ترتیب کے لیے نہیں ہے بلکہ استبعاد کے لیے ہے۔ اور مولانا مودودی بھی فرماتے ہیں کہ یہاں یعنی سورۃ نساء میں واقعہ کی تفصیل بیان کرنا مقصو

[1] تفہیم القرآن ص ۷۷

نہیں ہے بلکہ یہودیوں کے جرائم کی ایک مختصر فہرست پیش کرنی مقصود ہے۔
بہرحال رائیں دونوں ہیں کہ وہ طور پر ایک ہی میقات ہے یا دو میقاتیں ہیں۔ تورات میں کسی دوسری میقات کا ذکر نہیں ہے اور عام مفسرین کی بھی یہی رائے ہے لیکن سورۂ اعراف میں ترتیبِ مضامین اس خیال کے منافی ہے۔

حیات بعد الموت

۱۴۳ لفظ موت سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ اس بجلی سے مر گئے تھے۔ سورۂ اعراف میں صاعقہ کی جگہ رجفہ آیا ہے اور دونوں میں کوئی منافات نہیں ہے۔ بجلی بھی کڑکی اور زلزلہ بھی آیا۔ اس حادثہ کے ذریعے ان لوگوں کی موت واقع ہوئی۔ آیت میں موت اور بعث دونوں لفظ موجود ہیں اور اسی کی تائید کرتے ہیں اور اکثر مفسرین نے یہی بیان کیا ہے بلکہ یہاں تک لکھ گئے کہ بعد موت کی قید ہی اس لیے لگائی گئی ہے کہ اٹھائے جانے کو کوئی نیند یا غشی کے بعد نہ سمجھے۔ لیکن روح المعانی میں یہ بھی ہے کہ کچھ کی رائے ہیں یہ موت نہیں بلکہ بے ہوشی کی قسم کیلئے موت مجازی ہے۔

قرآن نے حیات بعد الممات کا قانون عام تو یہی بتایا ہے کہ اس دنیوی موت کے بعد پھر عالمِ آخرت ہی کے لیے دوبارہ زندگی ملے گی۔ لیکن قانونِ خاص یہ ہے کہ کبھی کبھی حکمت و مصلحت کی خاطر اللہ تعالیٰ اس دنیا ہی میں مردے کو زندگی دے دیتا ہے۔ اور انبیاء علیہم السلام کی معجزانہ زندگی میں خود قرآنی شہادت کے مطابق اس حقیقت کا متعدد بار ظہور ہو چکا ہے۔
قرآنِ عزیز نے اس آیت میں بھی بنی اسرائیل کے نمائندوں کی موت و ہلاکت کے اور اس کے بعد ان کے جی اٹھنے کا ذکر کیا ہے اور لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ کہہ کر اس واقعہ کی اصلی حقیقت کو اور زیادہ واضح کر دیا ہے کہ بے شبہ صورت یہ پیش آئی کہ ان کی نامعقول اور گستاخانہ اصرار پر صاعقہ کے عذاب نے ان کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی عاجزانہ دعا پر خدا کی وسعتِ رحمت نے ترس کھایا اور ان سوختہ جان انسانوں کو دوبارہ زندگی دی تاکہ یہ شکر گزار رہیں اور آئندہ اس قسم کی بے جا ضد سے کام نہ لیں اور خدا کے سچے فرمانبردار بن جائیں۔
تورات میں ہے کہ

وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَأَنزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوَىٰ ۖ كُلُوا مِن طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ ۖ وَمَا ظَلَمُونَا وَلَٰكِن كَانُوا أَنفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ﴿٥٧﴾

اور پھر ایسا ہوا کہ ہم نے دھوپ کی شدت سے بچانے کے لیے تمہارے اوپر ابر کا سایہ کیا۔ اور بھوک کی شدت سے بچانے کے لیے ہم نے من و سلویٰ کی غذا تمہارے لیے فراہم کر دی اور تم سے کہہ دیا تھا کہ جو صاف ستھری چیزیں ہم نے تم کو عطا کی ہیں انہیں کھاؤ۔ لیکن اس کے باوجود بھی وہ اپنی بدعملیوں سے باز نہیں آئے۔ انہوں نے ہمارا کچھ نقصان نہیں کیا بلکہ وہ خود اپنا ہی نقصان کرتے تھے۔

اور یوں ہوا کہ تیسرے روز صبح کو بادل گرجے اور بجلیاں چمکیں اور پہاڑ پر کالی گھٹا امڈی اور قرنائی کی آواز بہت بلند ہوئی۔ چنانچہ سب لوگ ڈیروں میں کانپ گئے۔

(خروج ۱۹-۱۶)

توراۃ میں ہے کہ

سرداروں کی ایک جماعت نے حضرت موسیٰ کی بزرگی و پیشوائی سے انکار کیا تھا۔ اس پر حکم الٰہی سے ایک وقت مقرر کیا گیا اور سرکش گروہ جمع ہوا۔ اس وقت زلزلہ آیا، زمین پھٹی اور سب اس میں مدفون ہو گئے۔ (۱۶-۳۱ گنتی)

ابر کا سایہ اور من و سلویٰ

اسرائیلی زندگی کے دو تلخ اور ناگوار واقعات بیان فرمانے کے بعد ان آیات میں پھر دو نعمتوں کا تذکرہ کیا ہے۔ بتانا یہ ہے کہ تمہارا ہمارے ساتھ تعلق یہ تھا اور ہمارا تمہارے ساتھ معاملہ یہ ہے۔ ان آیات میں اپنے انعامات کو کھول کر بیان کیا ہے لیکن ان کی سرکشی کو کھول کر نہیں بلکہ اشارے میں پیش کیا ہے۔ انعام کی صراحت اور تفصیل میں ان کو مخاطب کیا ہے لیکن سرکشی کے اشارے میں صیغۂ غائب استعمال کیا ہے۔ تذکرہ میں قرآن کا یہ اندازِ بیان بھی اپنے اندر ایک اعجازی شان رکھتا ہے۔ بلاغت

میں یہ ایجاز کی وہ قسم ہے جو قرآن سے باہر آپ کو کہیں نہیں مل سکتی۔

۱۴۴ھ جزیرہ نما سینا میں جہاں دھوپ سے بچنے کے لیے کوئی جائے پناہ تمہیں میسر نہ تھی ہم نے ابر سے تمہارے بچاؤ کا انتظام کیا۔ اس موقع پر یہ خیال رہے کہ بنی اسرائیل لاکھوں کی تعداد میں مصر سے نکل آئے تھے اور سینا کے علاقے میں مکانات کا تو کیا ذکر، سر چھپانے کے لیے ان کے پاس خیمے تک نہ تھے۔ اس زمانے میں اگر اللہ کی طرف سے ایک مدت تک آسمان ابر آلود نہ رکھا جاتا تو یہ قوم دھوپ سے ہلاک ہو جاتی[1]

جزیرہ نما سینا جیسے ریگستانی ملک اور چٹیل میدان میں سایہ میسر آجانا واقعی سایۂ رحمت سے کم نہیں۔ تورات میں ستونِ ابر اور ستونِ زمرد دونوں کا ذکر بطورِ معجزہ کے ہے۔ سیاقِ قرآنی سے معجزہ کا پہلو منظر نہیں آتا۔ ذکر عام نعمتوں کا ہو رہا ہے جو بنی اسرائیل پر ان کی تاریخ کے اہم دور میں نازل ہوتی رہی ہیں اور قرآن نے عام مستقل اور بظاہر طبیعی اسباب سے پیدا شدہ نعمتوں کو کہیں بھی معجزانہ اور خارقانہ عادتوں سے کم اہمیت نہیں دی ہے۔ تورات میں ہے۔ اور خداوند دن کو بدلی کی صورت میں آیا تاکہ انہیں راہ بتاتے اور رات کو آگ کے ستون میں ہو کے آیا تاکہ انہیں روشنی بخشے۔ ان کے آگے چلا جاتا۔ تاکہ دن رات چلے جائیں اور بدلی کا ستون دن کو اور آگ کا ستون رات کو ان کے آگے سے ہرگز نہ اٹھاتا۔ (خروج ۱۳-۲۱-۲۲) روایاتِ یہود میں حسب بیان جیوش انسائیکلوپیڈیا ج ۴ ص ۱۲۳ یہ تصریح موجود ہے کہ بنی اسرائیل جب کثرتِ معاصی میں مبتلا ہو جاتے تو یہ ابر ان پر سایہ کرنا چھوڑ دیتا[2]

خلاصہ یہ ہے کہ بنی اسرائیل نے بحرِ قلزم کو پار کر کے جس سرزمین پر قدم رکھا یہ افریقہ نہیں بلکہ عرب کی سرزمین تھی جو بحرِ احمر کے مشرق میں واقع ہے۔ یہ لق ودق بے آب و گیاہ میدان سے شروع ہوتی ہے جو تورات کی زبان میں بیابانِ شور، سین، وادیٔ سینا، کے نام سے مشہور ہے۔ اسی میں وادیٔ تیہ واقع ہے اور طور تک اس کا دامن وسیع ہے۔ یہاں شدید گرمی پڑتی ہے دُور دُور تک پانی اور سبزے کا پتہ نہیں ہے۔ بنی اسرائیل اس لق ودق میدان میں پہنچے تو گھبرا اُٹھے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فریاد کرنے لگے کہ گرمی کی شدت اور سایہ دار درخت نہ ہونے کی وجہ سے ہم بہت پریشان ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کو تسلی دی اور اللہ کی بارگاہ میں دُعا کی کہ اے اللہ

---

[1] تفہیم القرآن ص ۸۷　[2] تفسیر ماجدی ص ۲۳

اس سخت تکلیف سے نجات عطا فرما۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دُعا قبول ہوئی اور آسمان پر بادلوں کے پرے کے پرے بنی اسرائیل پر سایہ فگن ہو گئے۔

۱۴۵۔ بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے یہ بھی درخواست کی کہ زندگی کے لیے صرف سایہ ہی کافی نہیں ہے زندہ رہنے کے لیے کھانے کی بھی ضرورت ہے۔ اس بےآب وگیاہ زمین میں تو کہیں کوئی ذریعہ نظر نہیں آتا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ سے دُعا کی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس کا بھی انتظام کیے دیتے ہیں۔ رات گزری، صبح کو اٹھے تو بنی اسرائیل نے دیکھا کہ زمین پر ہر جگہ سفید اولے کی طرح کے دانے شبنم کی صورت میں آسمان سے کوئی چیز برس کر گری ہوئی ہے۔ کھایا تو نہایت میٹھی حلوے کی مانند تھی۔ یہ من تھا۔ دن میں تیز ہوا چلی اور تھوڑی دیر میں بٹیروں کے غول کے غول زمین پر پڑنے لگے۔ بنی اسرائیل نے بآسانی ان کو ہاتھوں سے پکڑ لیا اور بھون کر کھانے لگے یہ سلویٰ تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی معرفت بنی اسرائیل کو تنبیہہ کر دی تھی کہ ضرورت کے مطابق من وسلویٰ کو کام میں لائیں دوسرے دن کے لیے ذخیرہ نہ کریں [1]

منّ ایک چیز تھی شیریں دھنیئے کے سے دانے ترنجبین کے مشابہ۔ رات کو اوس برسنے کی طرح لشکر کے گرد ڈھیر لگ جاتے۔ صبح کو ہر ایک اپنی ضرورت کے مطابق اٹھا لیتا۔ اور سلویٰ ایک پرندہ ہے جس کو بٹیر کہتے ہیں، شام کو لشکر کے گرد ہزاروں جمع ہو جاتے [2]

من وسلویٰ دونوں قدرتی غذائیں تھیں جو بنی اسرائیل کو ہاجرت کے زمانے میں ملتی رہیں۔ دونوں کی خدا کے فضل سے اتنی بہتات تھی کہ ایک پوری کی پوری قوم صرف ان ہی غذاؤں پر زندگی بسر کرتی رہی اور اسے فاقہ کشی کی مصیبت نہ اٹھانی پڑی۔ حالانکہ آج کسی نہایت متمدن ملک میں بھی اگر چند لاکھ مہاجر یکایک آ پڑیں تو ان کی خوراک کا انتظام مشکل ہو جاتا ہے [3]

بہرحال یہ غذائیں بنی اسرائیل کو مہاجرت کے زمانے میں بلا مشقت وتعب مل جاتی تھیں۔ تورات کی تصریحات اس بارے میں یہ ہیں:

صبح کو لشکر کے پاس اوس پڑی۔ اور جب اوس پڑ چکی تو کیا دیکھتے ہیں کہ بیابان میں ایک چھوٹی چھوٹی گول چیز ایسی سفید جیسے برف کا چھوٹا ٹکڑا زمین پر پڑی ہے اور بنی اسرائیل نے دیکھ کر آپس میں کہا کہ من ہے کیونکہ انہوں نے نہ جانا وہ کیا ہے، تب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے

---

[1] ابن کثیر ج ۱ ص ۹۵ [2] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۱۱ [3] تفہیم القرآن ص ۸۷

اُن کو بتایا کہ یہ روٹی ہے جو خداوند نے تمہیں کھانے کو دی ہے۔ (خروج ۱۶، ۱۴، ۱۵)

اسرائیل کے گھرانے نے اس کا نام من رکھا۔ وہ دھنیے کے بیج کی طرح سفید تھی اور اس کا مزہ شہد میں ملی ہوئی پھلودی کا تھا۔ خروج ۱۶-۳۱)

اور من سوکھے دھنیے کی مانند تھا اور اس کا رنگ موتی کے دانے کی طرح تھا۔ لوگ اِدھر اُدھر سے اُسے جمع کرتے اور چکی میں پیستے تھے یا اوکھلی میں کوٹتے تھے اور تنوروں پر پکاتے تھے اور پھلکیاں بناتے۔ اس کا مزہ تازہ تیل کا سا تھا اور رات کو جب اوس پڑتی تو من پڑتا تھا (گنتی ۱۱-۸-۱۱) سلویٰ ایک قسم کا بٹیر ہے۔ بٹیر جزیرہ نما سینا کا خاص جانور ہے۔ بڑی کثرت سے پایا جاتا ہے۔ گرمی میں شمال کی طرف چلا جاتا ہے جاڑے میں جنوب کی طرف واپس آجاتا ہے۔ اڑتا اونچا نہیں بہت نیچا رہتا ہے۔ تھک بہت جلدی جاتا ہے اور اس کا شکار بڑی آسانی سے ہو جاتا ہے (جیوش انسائیکلو پیڈیا ج ۱ ص ۲۸۵)

واضح رہے کہ سارے رکوع میں اور اس کے بعد بھی بنی اسرائیل پر انعامات کا تذکرہ ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ یہ سارے واقعات اپنے عام طبیعی اسباب سے ہٹ کر بصورت معجزات ہی پیش آئے ہیں اصل مقصود بیان اللہ سبحانہ کے انعامات کی یاددہانی ہے چاہے وہ حسبِ عادت ہوتے ہوں یا بطور خرقِ عادت۔ مفسرین نے عموماً ابر کی سایہ افگنی اور من و سلویٰ کے نزول کو معجزات میں شمار کیا ہے۔ لیکن اگر کسی کی تحقیق میں یہ دونوں باتیں عام واقعات میں داخل ہوں تو اس کا اثر قرآن کی تذکیر پر نہیں پڑتا ان کی انعامی حیثیت بہرحال قائم رہتی ہے اور یہی قرآن کا مقصود ہے [1]

۱۴۷ ؎ انہیں کھاؤ۔ یہ ہماری دَین ہے، ہمارا عطیہ ہے۔ کھانے پر خصوصی طور پر زور دینے سے بزرگوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ان چیزوں کا ذخیرہ نہ کرو۔ گویا حکم یہ ملا تھا کہ روز کے روز خرچ کرتے رہو اور بلا ضرورت ان غذاؤں کا ذخیرہ نہ کرو۔ معلوم ہوتا ہے کہ ذخیرہ اندوزی کی عادت یہودیوں کی آج کی نہیں بہت پرانی ہے۔ آج دنیا میں معاشی پریشانیوں کا واحد سبب یہودی سٹاکسٹوں کی یہی ذخیرہ اندوزی بنی ہوتی ہے۔ یہ اگر اشیاء و اجناس میں ہو تو احتکار ہے اور دولت و مال میں ہو تو اکتناز ہے۔ اور یہودی احتکار و اکتناز ہی کا آج ردِ عمل سوشلزم کی صورت میں پیدا ہوا ہے یعنی وہ نظام صرف دولت کے اکتناز اور اجناس کے احتکار ہی کو نہیں بلکہ دولت اور اشیاء کی

---

[1] تفسیر ماجدی ص ۲۳

انفرادی ملکیت کو بھی ختم کر دینا چاہتا ہے۔ بہرحال اس فقرہ میں یہ بتانا مقصود ہے کہ
اس لطیف و لذیذ غذا کو کھاؤ اور اسی پر اکتفا کرو۔ آگے کے لیے ذخیرہ جمع کر کے نہ رکھو اور
نہ دوسری غذا سے مبادلہ کی خواہش کرو[1]۔

بنی اسرائیل نے اس حکم کی تعمیل نہیں کی اور باوجود اس کے کہ اللہ کی رحمت کا کرشمہ روزانہ اپنی
آنکھوں سے دیکھتے تھے پھر بھی اللہ پر بھروسہ نہیں کیا اور ذخیرہ اندوزی میں لگ گئے[2]
۱۴۷ھ۔ اس صورت حال کا لازماً یہ نتیجہ نکلا کہ وہ اللہ کے حکم سے باغی ہو گئے اور ہدایتِ الٰہی
کی تعمیل نہیں کی۔ ابن کثیرؒ نے لکھا ہے فخالفوا وکفروا۔ علامہ آلوسیؒ لکھتے ہیں کہ اس اگلے
فقرے وَمَا ظَلَمُوْنَا کا معطوف علیہ محذوف ہے۔ پوری بات اس طرح ہے کہ بنی اسرائیل نے
اس انعامِ الٰہی کی قدر نہیں کی۔ انہوں نے ہماری نافرمانی کی اور اس طرح انہوں نے ہمارا کوئی
نقصان نہیں کیا۔ قرطبیؒ نے بھی یہی بات لکھی ہے کہ انہوں نے اللہ کی نافرمانی کی اور اللہ کی نعمت
اور احسان کا شکر سے جواب نہیں دیا اور انہوں نے یہ کردار اختیار کر کے ہمارا کوئی نقصان نہیں
کیا بلکہ نعمتوں کا معصیتوں سے مقابلہ کر کے اپنا ہی کچھ کھویا۔ ابن جریرؒ نے بھی یہی تشریح کی ہے۔
کہ مطلب یہ ہے کہ اللہ نے اُن کو کھانے کو کہا تھا۔ انہوں نے اللہ کے حکم سے سرتابی کی اور نافرمانی
کی اور اس طرح انہوں نے ہمارا کچھ نقصان نہیں کیا۔

الغرض شارحینِ قرآن نے اس فقرے وَمَا ظَلَمُوْنَا کو محذوف پر معطوف کر کے اس کو بنی اسرائیل
کی آپ بیتی کا حصہ سمجھا ہے اور بتایا ہے کہ واقعہ کے ان ہی افراد کا یہ کردار بھی ہے اور اس فقرے
کا تعلق اُن ہی کے کردار سے ہے۔ پتہ نہیں کہ بعض معاصرین نے عام مفسرین کی اس تشریح
کو چھوڑ کر ترجمہ میں یہ اضافہ

مگر تمہارے اَسلاف نے جو کچھ کیا۔

کیا بتانے کے لیے ضروری سمجھا ہے۔ اگر یہ بتانا چاہتے ہیں کہ یہ اصحاب موسیٰ علیہ السلام کے
اَسلاف کے کردار کا ذکر ہے تو یہ قرآن کی مراد نہیں ہے۔ اور اگر یہ بتانا چاہتے ہیں کہ زمانۂ نبوت
کے یہودیوں کے اَسلاف نے ایسا کیا ہے تو مراد کی حد تک تو یہ دُرست ہے لیکن جس معنویت کی
خاطر قرآن نے یہ بلیغانہ فقرہ بولا ہے اس کی روح پامال ہو جاتی ہے۔

---

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۱۱ [2] معارف القرآن ص ۱۳۸

یہاں یہودیوں کی طرف آیت کے اس ٹکڑے وَلٰكِنْ كَانُوْۤا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ (لیکن وہ خود اپنا نقصان کرتے تھے) میں نقصان کی جو نسبت کی گئی ہے اس نقصان میں خدا معلوم ثقات مفسرین کو ان کے گوشت کے سڑ جانے کا نقصان اتنا عظیم کیوں محسوس ہوا ہے کہ وہ اس کا تذکرہ کیے بغیر آیت کی تشریح نہیں کرتے۔ نقصان کے لیے مولانا محمد ادریس کی یہ تشریح بڑی برمحل ہے کہ ایسا رزق کھویا کہ جس میں نہ دُنیا کی مشقت تھی اور نہ آخرت کا حساب ہے۔ محمود آلوسیؒ لکھتے ہیں کہ ان کی بدکرداری اور نافرمانی کا نقصان خود اُن ہی کو تھا۔ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں کہ نافرمانی کر کے انہوں نے اپنا ہی نقصان کیا ہے۔ قرطبیؒ لکھتے ہیں کہ اللہ کی نعمت کا معصیت سے مقابلہ کر کے خود ہی نقصان اٹھایا ہے۔ قاضی ثناء اللہ فرماتے ہیں کہ میرے عذاب کو نافرمانی کے ذریعے دعوت دے کر اور آسمانی رزق کو بند کر کے وہ اپنا ہی نقصان کرتے تھے۔

اس آیت میں دراصل ایک طرف اگر یہ بتایا ہے کہ

دین کے سارے مطالبات اور اللہ سبحانہ کے سارے اوامر و نواہی کا رشتہ بندوں کی منفعتوں اور مضرتوں سے وابستہ ہے۔ اللہ اگر کسی کام کے کرنے کو کہتا ہے تو اس میں خود بندوں کا فائدہ ہے اللہ کا کوئی فائدہ نہیں۔ اور اگر وہ کسی کام سے روکتا ہے تو اس میں بندوں کا اپنا نقصان ہے۔ اللہ کا کوئی نقصان نہیں ہے۔

صحیح مسلم کی ایک حدیث قدسی میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اے میرے بندو! اگر تم میں سے سب انسان اگلے، پچھلے اور انسان و جن سب مل کر نیک ترین اور متقی ہو جائیں تو یاد رکھو کہ اس سے میرے ملک میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔ اے میرے بندو! اگر سب اگلے پچھلے انسان اور جن بدترین اور فاجر سے فاجر ترین جائیں تو میرے ملک میں کوئی کمی نہیں آتی۔

اگر اللہ کا دین، اللہ کی وحی، اللہ کا رسول نیک عمل کی ترغیب دیتا ہے اور بد عملی سے روکتا ہے تو یہ صرف اس لیے کہ انسان اپنے نقصان اور اپنی ہلاکت سے بچے۔ یہ بات نہیں ہے کہ اس میں خدا کا کوئی فائدہ یا نقصان ہے۔ گویا قرآن نے اس بلیغ فقرے مَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْۤا کے ذریعے اپنے مخاطبوں، یگانوں اور بیگانوں کے ذہن میں یہ بات اتاری ہے کہ گنہگار اگر گناہ کرتا ہے تو جان لے اس کی مضرت اسی کے لیے ہے۔ عابد اگر عبادت کرتا ہے تو سمجھ لے کہ اس کا نفع اسی کی ذات تک محدود ہے۔ اس کی بے نیازی کا عالم یہ ہے کہ تمام مجرمین کو بخش دے تو پروا نہیں۔ فیاضی کی یہ انتہا کہ اگر ایک ایک کو مُنہ مانگی مراد دے دے تو اس

خزانۂ غیب میں کوئی نقصان نہیں۔ سبحان اللہ مَا ظَلَمُوْنَا کا مدلول کس قدر بلند ہے۔

دوسری طرف وَلٰکِنْ کَانُوْٓا اَنْفُسَھُمْ یَظْلِمُوْنَ کے ذریعے یہ اشارہ کر دیا کہ اللہ سبحانہٗ کی گوناگون نعمتوں کا اور بار بار کی درگزر کا بنی اسرائیل کی مادہ پرست فطرت پر کوئی اثر نہ تھا۔ نعمتوں کی فراوانی کے باوجود یہ نافرمانیاں کرتے تھے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ فرعون کی غلامی اور اس کے جابرانہ نظام نے ان کی فطرت کو مسخ کر دیا تھا۔ کیونکہ جب بھی کوئی نظامِ جبر کسی سوسائٹی پر عرصہ دراز تک مسلط رہتا ہے تو وہ لوگوں کی فطرتِ سلیمہ کو مسخ کر ڈالتا ہے۔ اس سوسائٹی کی ساری خوبیاں اور اس کے افراد کے سارے فضائل ایک ایک کر کے رخصت ہو جاتے ہیں۔ غلامی انسان کی فطری خوبیاں اور طبعی صلاحیتیں برباد کر دیتی ہے اور غلامی ان کے مزاجوں میں اس قدر راسخ ہو جاتی ہے کہ جب ان پر ظلم و ستم ہوتا ہے تو وہ سیدھے ہو جاتے ہیں اور جوں ہی آزادی ملتی ہے وہ ہر قید سے آزاد ہو جاتے اور سرکشی پر اتر آتے ہیں۔ یہی حال بنی اسرائیل کا تھا کہ طویل غلامی نے ان کی فطرت کو بگاڑ کر رکھ دیا تھا [1]

اس موقعہ پر حافظ ابن کثیرؒ نے یہ بات بالکل بر موقعہ فرمائی ہے کہ

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ فضیلت میں حضرات صحابہ دوسرے انبیاء کے حواریوں اور ساتھیوں کے مقابلے میں گوئے سبقت لے گئے ہیں۔ کیونکہ صحابہ کرامؓ نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں دھوپ کی شدت اور گرمی کی تمازت میں دین کی سربلندی کے لیے غزوات اور سرایا میں سفر کیے لیکن اس قسم کے خوارق و معجزات کا مطالبہ نہیں کیا۔ نہ غیبی خوراک مانگی اور نہ دھوپ سے بچاؤ کی درخواست کی۔ اگر کبھی کچھ مانگ پیش بھی کی تو صرف یہ کہ یا رسول اللہ کھانا تھوڑا ہے برکت کی دعا فرما دیجئے۔ اگر پیاس کی شدت نے ستایا تو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود دعا فرما دی۔ بدلی اٹھی، برسی اور چل دی۔ اتباع کا یہ کامل ترین، موثر ترین اور محبوب ترین نمونہ صحابہ کے سوا کہیں دیکھنے میں نہیں آتا [2]

---

[1] فی ظلال القرآن [2] ابن کثیرؒ ج ا ص ۹۷

وَإِذْ قُلْنَا ادْخُلُوا هَٰذِهِ الْقَرْيَةَ فَكُلُوا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا وَادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَقُولُوا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطَايَاكُمْ ۚ وَسَنَزِيدُ الْمُحْسِنِينَ ﴿٥٨﴾ فَبَدَّلَ الَّذِينَ ظَلَمُوا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِي قِيلَ لَهُمْ فَأَنزَلْنَا عَلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا رِجْزًا مِّنَ السَّمَاءِ بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ ﴿٥٩﴾

اور اس واقعہ کو بھی یاد کرو جب ہم نے تم سے کہا تھا کہ اس بستی [۱۴۸] میں داخل ہو جاؤ۔ پھر کھاؤ پیو اور آرام کی زندگی بسر کرو۔ اور ہم نے تم سے کہہ دیا تھا کہ جب شہر کے دروازے [۱۴۹] میں قدم رکھو تو بستی کے دروازے [۱۵۰] میں سجدہ ریز ہوتے ہوئے اور زبانوں [۱۵۱] سے حِطّہ کہتے ہوئے داخل ہونا۔ اگر تم نے ایسا کیا تو ہم تمہاری خطاؤں کو معاف [۱۵۲] کر دیں گے۔ اور حسن کار لوگوں کو مزید فضل و انعام سے نوازیں گے۔ لیکن پھر ایسا ہوا کہ تم میں سے ظلم کار لوگوں نے اسے ایسی بات [۱۵۳] سے بدل ڈالا جو اُن سے کہی نہ گئی تھی۔ اس کے نتیجے میں ہم نے ظلم کار لوگوں پر آسمان سے اُن کی نافرمانیوں اور بدکاریوں کی پاداش میں عذاب [۱۵۴] نازل کیا۔

فتح کا نشہ

یہاں اللہ تعالیٰ ان کی یہ تاریخی نافرمانی اس لیے بیان فرما رہے ہیں کہ ان کی زندگی کی تصویر کے دونوں رُخ سامنے آ جائیں۔ محکومیت اور حاکمیت کے یا غلامی اور آقائی کے۔ زمانۂ غلامی میں اگر قبولِ حق کے لیے تیار نہ ہوتے تھے تو قبول کے بعد زمانۂ آقائی میں اقتدار کے نشہ میں سرکشی اور معصیت پر اصرار کرتے ہیں۔ قوموں پر اللہ کی جانب سے دونوں قسم کے ابتلا آتے ہیں غلامی کا اور آقائی کا۔ غلامی میں اگر مصائب سے دوچار ہوتے ہیں تو اقتدار کی بے راہ روی معاصی سے ہمدوش کر دیتی ہے۔

چونکہ تاریخی لحاظ سے یہ واقعہ خروج کے بعد پیش آیا تھا۔ اس لیے اس کا ذکر یہاں مناسب ہوا۔ اور انداز یہ بتا رہا ہے کہ قرآن تمام تاریخ بنی اسرائیل کو ایک وحدت بنا کر پیش کر رہا ہے جو اپنے آغاز سے آخر تک یکساں اور علیٰ تلتی ہے۔ اس لیے بیانات میں تسلسلِ زمانی اور ترتیبِ تاریخی

ہرگز ضروری نہیں ہے۔ قرآن کا مقصود تو نتائج و عبر یعنی اخلاقی، روحانی، سیاسی اور اجتماعی سبق نہ کر واقعات کی روداد۔

۱۴۸ اس بستی میں داخل ہو جاؤ۔ اصل عربی میں لفظ قریہ آیا ہے اور وہ بھی الف لام کے ساتھ جو خصوصیت کے معنے بتاتا ہے لوگوں کے مقام اجتماع کو کہتے ہیں۔ کیڑیوں کے مسکن کو بھی عربی اجتماع کے پیش نظر قریہ کہتے ہیں۔ لفظ کے اصل معنے لغت میں جمع ہیں۔ اہل عرب جب پانی حوض میں اکٹھا کرتے تھے اس وقت بولتے ہیں قریت الماء فی الحوض۔ یہاں گاؤں نہیں شہر ہے کیونکہ رغداً چین و آرام کی زندگی گاؤں میں نہیں شہر ہی میں میسر آسکتی ہے جہاں شہری زندگی کی ساری ضروریات فراہم ہوتی ہیں۔

یہ شہر کونسا تھا؟ یہ سوال بیحد اہمیت کا حامل ہے۔ اصل تو یہی ہے کہ ان کی تعیین میں ہمیں راہِ سکوت اختیار کرنی چاہیے جن میں خود قرآن خاموش ہے۔ خدا معلوم بنی اسرائیل کی تاریخ میں کتنے شہر ہیں جن میں داخل ہوتے وقت ان کو عاجزی اور نیاز مندی کے مظاہرہ کا حکم ہوا ہے مگر انسانی طبیعت ہمیشہ نامعلوم کی طلب میں کوشاں رہتی ہے۔ اس لیے مختلف علماء نے یہاں بھی شہر کی تعیین میں دادِ تحقیق دی ہے۔ تحقیق کی حد تک آپ بھی لطف اندوز ہو جائیے۔

جب بنی اسرائیل کو ایک شہر میں داخل ہونے کا حکم ہوا اس شہر کا نام اریحا تھا۔ اس میں قوم عمالقہ جو قوم عاد سے تھی اور بعض نے بیت المقدس کہا ہے[1]

حافظ ابنِ کثیرؒ فرماتے ہیں کہ اس آیت میں قریہ سے بیت المقدس مراد ہے[2]

غالباً یہ وہ شہر ہے جسے تورات میں یریحو کہا گیا ہے۔ اور جو یردن پار سرزمینِ کنعان کی پہلی آبادی تھی جس کے حصول کی بنی اسرائیل کو بشارت دی گئی تھی[3]

یہ ابھی تک تحقیق نہیں ہو سکا ہے کہ اس بستی سے مراد کون سی بستی ہے۔ جس سلسلۂ واقعات میں ذکر ہو رہا ہے وہ اس زمانے سے تعلق رکھتا ہے جب کہ بنی اسرائیل ابھی جزیرہ نمائے سینا میں تھے۔ لہٰذا اغلب یہ ہے کہ یہ اسی جزیرہ کا کوئی شہر ہوگا۔ مگر یہ بھی ممکن ہے کہ اس سے مراد شطیم ہو جو یریحو کے بالمقابل دریائے اُردن کے مشرقی کنارے پر تھا۔ بائیبل کا بیان ہے کہ اس شہر کو بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی کے آخر زمانے میں فتح کیا اور وہاں بڑی

---

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۱۱ [2] معارف القرآن م ۱ ص ۱۳۹ [3] ترجمان القرآن ج ۲ ص ۳۹

بدکاریاں کیں جس کے نتیجے میں خدا نے ان پر دبا روانہ کی اور چوبیس ہزار آدمی ہلاک ہو گئے۔[1]
(گنتی باب ۲۵ آیت ۱-۸)
ممکن ہے کہ فلسطین کا شہر اریحا ہو جو موجودہ نقشوں میں یریحو کے نام سے ملے گا۔ یہ بحرِ مردہ کے شمالی ساحل سے پانچ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ اسے اسرائیلیوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد حضرت یوشع علیہ السلام کے زمانے میں فتح کیا تھا۔ قدیم ائمہ تفسیر کا رُخ بیت المقدس کے بعد پھر اسی شہر کی جانب ہے۔ اس کے علاوہ بھی متعدد شہروں اور مقامات کے نام لیے گئے ہیں۔ بعض شہروں کے اب نام بھی بدل گئے۔ مثلاً ایلہ کہ اب اسے عقبہ کہتے ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ شہر شطیم مراد ہو۔ یہ علاقہ موآب میں واقع ہے جو بحرِ مردہ کے مشرق میں واقع ہے۔ شہر دریائے یردن کے مشرقی کنارے پر ہے۔ بحرِ مردہ کے شمال و مشرق میں۔ بنی اسرائیل کی دشت پیمائی کے زمانے میں یہ شہر گویا ان کا سرحدی ناکہ تھا۔ عربی میں اسے وادیٔ انار بھی کہتے ہیں۔ بعض مفسرین نے جو دروں کا نام لیا ہے اس سے بھی مراد یہی ہے۔[2]

۱۴۹ سجدہ ریز ہوتے ہوئے۔ مطلب یہ ہے کہ اس شہر کے دروازے میں سجدۂ شکر کرتے ہوئے جاؤ۔ اور یہ شکر بدنی ہو۔ اور بعض کہتے ہیں کہ براہِ تواضع کمر کو جھکاتے ہوتے جاؤ۔[3]
یعنی حکم یہ تھا کہ ظالم و جابر فاتحوں کی طرح اکڑتے ہوئے نہ گھسنا بلکہ خدا ترسوں کی طرح منکسرانہ حالت میں داخل ہونا جیسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ کے موقعہ پر مکہ میں داخل ہوئے۔[4]
اصل میں حکم یہ ہوا کہ شہر کے دروازے میں سجدۂ شکر کرتے ہوئے داخل ہونا۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں فاتحانہ حیثیت سے داخل ہوئے تو غسل فرمایا اور آٹھ رکعت نماز پڑھی۔ کچھ علماء نے اسے صلوٰۃ الفتح کا نام دیا ہے۔ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ جب ایوانِ کسریٰ میں فاتحانہ داخل ہوتے تو محل میں پہنچ کر آٹھ رکعت نماز پڑھی۔[5]

۱۵۰ زبانوں سے حِطّۃ کہتے ہوتے۔ یعنی زبان سے استغفار اور اپنے گناہوں کا اقرار کرتے ہوئے داخل ہونا۔ قرآن میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو فتح کے وقت یہی حکم آیا تھا۔

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ۙ وَرَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ۙ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا ۠

---

[1] تفہیم القرآن ص ۸۷ [2] تفسیر ماجدی ص ۲۴ [3] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۱۱ [4] تفہیم القرآن ص ۸۷ [5] معارف القرآن ص ۱۴۰

جب اللہ کی مدد اور فتح آجائے اور آپ لوگوں کو فوج در فوج اللہ کے دین میں داخل ہوتے دیکھیں تو اپنے پروردگار کی تسبیح و تحمید کیجئے اور اس سے استغفار کیجئے یقیناً وہ بہت توبہ قبول کرنے والا ہے۔

فتح کی سرشاریوں میں یہ ہدایت نہیں دی جارہی ہے کہ جشن دھوم دھام سے منانا، جلوس نکالنا، نقارے بجانا، چراغاں کرنا اور زندہ باد کے نعرے لگانا۔ بلکہ حکم یہ ہورہا ہے کہ اللہ کی طرف متوجہ ہونا اور استغفار کرنا۔ یہاں حِطّہ کے دو مطلب ہوسکتے ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ سے اپنی خطاؤں کی معافی مانگتے ہوئے جانا۔ دوسرے یہ کہ لوٹ مار اور قتلِ عام کے بجائے بستی کے باشندوں میں درگزر اور عام معافی کا اعلان کرتے جانا[1]

پہلے بدنی شکر ادا کرنے کو کہا اب ان سے کہا جارہا ہے کہ زبان سے اپنے گناہوں کی معافی مانگتے ہوئے جاؤ۔ یہ شکر زبانی ہوا۔ جو یہ دونوں باتیں کرے گا اس کی خطائیں ہم معاف کردیں گے اور نیک بندوں کے لیے ثواب بڑھائیں گے[2]

یہ فرق ہے اللہ والوں کے لشکر اور دنیادار بادشاہوں کے لشکروں کے داخلہ میں۔ دنیادار فاتح کے ہاں قومی بینڈ اور ترانے بجتے ہیں، وقتی نعرے لگتے ہیں۔ یعنی قدم قدم پر قومی، شخصی اور وطنی بڑائی کا اظہار کرتے ہیں۔ اس کے برعکس جب نبوّت کے علوم کے علمبردار فاتح کی حیثیت سے کسی ملک میں داخل ہوتے ہیں اور ان کو جب سیاسی کامیابی سے ہمدوش ہونے کا موقعہ ملتا ہے ان کا دل خشوع سے لبریز اور زبان پر تسبیح ہوتی ہے۔ قُوْلُوْا حِطَّةٌ سے یہ مراد نہیں ہے کہ بعینہٖ لفظ حِطّہ کا تلفظ ادا کرتے جاؤ۔ یہ لفظ تو عربی ہے اور عبرانیوں کی زبان عربی نہیں۔ عبری یا عبرانی تھی۔ مراد یہ ہے کہ ان کو زبان سے بھی کلماتِ توبہ و استغفار ادا کرتے رہنے کا حکم ملا تھا۔

۱۵۱ تو ہم تمہیں معاف کردیں گے۔ یعنی اگر تم نے شہر میں داخل ہوتے وقت ہماری ہدایات پر عمل کیا تو ہم تمہاری غلطیوں کے نتائج سے تمہاری نگرانی کریں گے اور گناہوں کے اثرات سے تمہاری حفاظت کریں گے۔ اور اس پر اکتفا نہیں بلکہ آگے فرمایا ہے کہ حُسنِ کار لوگوں کو مزید نوازیں گے۔ یہاں تعمیلِ احکام میں بھی درجہ بندی ہے۔ پہلا درجہ عام عمل کا ہے کہ اللہ کی

---

[1] تفہیم القرآن ص ۷۹　[2] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۱۱

بات مان لی اور اس کے مطابق زندگی میں عمل کیا۔ یہ درجہ جس نے حاصل کرلیا اس کے لیے مغفرت کا پروانہ ہے۔ دوسرا درجہ اس سے آگے ہے اور اس کا نام احسان ہے۔ احسان کے معنے نیکی کرنے کے نہیں بلکہ نیکوکاری کرنے کے ہیں۔ ایک نیک ہے دوسرا نیکوکار ہے۔ دونوں میں بہت فرق ہے۔ جب بندۂ وادیٔ محبت طے کرتا ہوا اپنے مولیٰ کی رضا و تسلیم میں فنا ہو جاتا ہے اور اللہ کے حکموں کا اس طرح فرمانبردار ہو جاتا ہے جیسے ایک شائستہ گھوڑا اپنے سوار کے اشارات کا۔ تو یہ حسن کار ہے۔ گویا المحسنین اسرائیلی مسلمانوں کا وہ طبقہ تھا جو زندگی کے تمام مختلف شعبوں میں حسن پسند نہیں بلکہ حسن کار واقع ہوا تھا۔ یہاں کام کرنے کے دو رُتبے ہیں۔ ایک یہ کہ سر کا بوجھ اتارنے کے لیے قانون کا گھر پورا کر دیا جائے۔ اس میں نہ مشقت ہوتی ہے نہ وقت لگتا ہے لیکن اگر یہ ارادہ کرلیا جاتے کہ جو کام بھی کیا جاتے پورے حسن و سلیقہ سے کیا جائے تو اس کے لیے سب کچھ کرنا پڑتا ہے پھر ان حسن کاروں کو اگر زُہد و فضل کی محبوبیت کا مقام حاصل ہو تو اپنی محنت و مشقت کی بنیاد پر یقیناً وہ اس کے مستحق ہیں۔

۱۵۲ ظلم کار لوگوں نے اسے بدل ڈالا۔ ان سے کہا گیا تھا کہ عجز و نیاز کے ساتھ شہر میں داخل ہونا، زبان پر استغفار ہو۔ قرآن کا منطوق تو یہی ہے کہ اُن کو استغفار کرنے کا حکم ملا تھا لیکن غَيْرَ الَّذِي قِيلَ لَهُمْ کے مفہوم سے معلوم ہوتا ہے کہ استغفار کے لیے اُن کو خالص دُعائی پیمانے کی تلقین ہوئی تھی۔ یہ پیمانہ کیا تھا؟ قرآن نے بتایا ہے کہ یہ پیمانہ حِطَّةٌ کا تھا۔ یہ کلمہ استغفار ہے اس کے معنے ہیں، خدایا گناہوں سے پاک کر دے۔ عربی کا شاعر کہتا ہے:

فاز بالحطة التی جعل اللہ   بها ذنب عبده مغفورا

وہ اس توبہ پر فائز ہوا جس کے ذریعے اللہ نے اپنے بندے کے گناہ کو بخش دیا

یہ کہنا کہ یہ عربی لفظ ہے اور اسرائیلیوں کی زبان عربی نہیں عبرانی ہے زیادہ وزن نہیں رکھتا جبکہ سامی زبانوں کی علماء السنہ ہم آہنگی ثابت کر چکے ہیں۔ آخر لفظ دین کے بارے میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ عبرانی اور آرامی زبانوں میں اس کے مشتقات ملتے ہیں۔ لہٰذا اگر عبرانی میں بھی یہی دُعائی پیمانہ ہو تو اس میں کیا استبعاد ہے۔ صاحبِ ترجمان القرآن کا میلان اسی طرف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو دُعائی پیمانہ زبان سے کہنے کے لیے ان کو بتایا گیا تھا انہوں نے اسے چھوڑ کر کچھ اور کہنا شروع کر دیا۔ اسے چھوڑ کر انہوں نے کیا کہا؟ اس میں آراء مختلف ہیں لیکن امام بخاریؒ نے جو مرفوع حدیث حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے حوالہ سے پیش کی ہے اس میں خود حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس تبدیل شدہ پیمانے کی نشاندہی کی ہے کہ انہوں نے حِطَّةٌ کی جگہ حَبَّةٌ فِي شَعِيرَةٍ کہا تھا

یعنی غلط جو ہیں — یہ بات انہوں نے ازراہِ تمسخر کہی۔ اور یہ ان لوگوں سے قطعاً بعید نہیں ہے جن کی طبیعتوں میں اللہ کی نافرمانی رچی بسی ہو۔ جو اپنے نبی سے استہزاء کرتے ہوں۔ اور جن کی قومی سیرت میں نبیوں پر قتل اور تہمتوں کے دھبے ہوں۔ اب آیئے یہ بھی معلوم کر لیجئے کہ اس کا نتیجہ کیا ہوا؟ قرآن نے بتایا ہے کہ

۱۵۳ ان ظالموں پر آسمان سے عذاب نازل کر دیا۔ ظالموں کے اضافہ سے اشارہ فرمادیا کہ یہ نافرمانی سب نے نہیں کی تھی۔ اور یہ بھی بتایا کہ یہ عذاب صرف ظالموں پر نازل ہوا تھا اَلَّذِیْنَ ظَلَمُوْا سے صرف یہی بتانا مقصود نہیں ہے کہ یہ عذاب سب پر نہیں آیا تھا بلکہ یہ جتانا مقصود ہے کہ اس عذاب کا سبب عالمِ طبیعت میں صرف طبعی مؤثرات نہیں تھے بلکہ عالمِ غیب میں ان کا ظلم کار ہونا اس کا سبب بنا تھا۔ کیونکہ قاعدے کے مطابق جب کسی حکم کو کردار کے حوالہ سے پیش کیا جاتا ہے تو کردار حکم کی علت ہوتا ہے۔ قرآن میں اس کی بے شمار مثالیں ہیں مثلاً اَلسَّارِقُ وَالسَّارِقَۃُ فَاقْطَعُوْٓا اَیْدِیَہُمَا میں ہاتھ کاٹنے کی علت چوری کا کردار ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان کو یہ سزا ان کے ظلم کی پاداش میں ملی تھی۔ معاً یہ سوال یہاں ذہن میں ابھرتا ہے کہ ایسے نازک موقعہ پر ان کو یہ کیا سوجھی۔ تمسخر کا بھی کوئی موقعہ ہوتا ہے اور نافرمانی کا بھی کوئی محل ہوتا ہے۔ اسی اٹھتے ہوتے سوال کا جواب بِمَا کَانُوْا یَفْسُقُوْنَ میں دیا گیا ہے۔ یعنی ان میں اس موقعہ پر یہ ظلم کاری فسق و فجور کی عادت بنانے کی وجہ سے نمایاں ہوتی تھی۔

آیت کی تشریحات ختم ہو چکی ہیں لیکن ابھی دو باتیں بحث طلب ہیں۔

اوّل یہ کہ رجز، عذاب کی نوعیت کیا تھی۔ ہمارے ہاں روایتیں طاعون کی نقل ہوتی ہیں۔ تاریخ بنی اسرائیل میں آتا ہے کہ طاعون اس قوم پر بار بار آیا ہے۔ اور بائبل میں اس کا ذکر متعدد مقامات پر ہے۔ اس کے علاوہ بھی بنی اسرائیل طرح طرح کی بلاؤں کا نشانہ بنتے رہے ہیں اس لیے ایسی بات کی تعیین کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہو سکتی جسے قرآن نے خود ہی پوشیدہ رکھا ہے۔

دوسری بحث اس آیت میں یہ بھی ہے کہ اس آیت میں ذکر کے پیمانہ کو بدلنے کو ظلم اور فاسقوں کا شیوہ بتایا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ذکر کے جو پیمانے نبوت کی راہ سے آئیں ان میں تبدیلی جائز نہیں ہے۔

دراصل نبوت کی جانب سے جو ہدایات آتی ہیں ان کی دو صورتیں ہوتی ہیں

۱۔ جن ہدایات میں جسمانی مقصود ہوں الفاظ کو درجہ مقصودیت حاصل نہ ہو ان میں اگر ایسی تبدیلی

کر دی جائے جس سے معنے پر کوئی اثر نہ پڑے تو یہ جائز ہے لیکن اس میں شرط یہ ہے کہ بیان کرنے والا حافظ اور عارف ہو۔ اگر بیان کرنے والا حافظ اور عارف نہ ہو تو اس کے لیے الفاظ بدلنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ حافظ ابن الصلاحؒ نے مقدمہ میں، حافظ نوویؒ نے تقریب میں تصریح فرمائی ہے کہ ایسے شخص کے لیے تبدیلی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اس حد تک مسئلہ سب کے یہاں اتفاقی ہے لیکن علماء کا اس موضوع پر اختلاف ہے کہ اگر کوئی شخص حافظ اور عارف ہو تو اس کے لیے تبدیلی کرنے کی گنجائش ہے یا نہیں۔ ابوبکر الخطیبؒ نے الکفایہ فی علوم الروایہ میں اکثر سلف کی طرف نسبت کر کے لکھا ہے کہ وہ اسے ناجائز کہتے ہیں۔ حافظ سیوطیؒ نے اسی کو سلف میں قاسم بن محمدؒ، امام ابن سیرینؒ اور رجاء بن حیوہؒ کا مسلک قرار دیا ہے۔ امام ذہبیؒ نے صحابہ میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو اسی نظریے کا علمبردار بتایا ہے۔ اگرچہ امام رازیؒ نے محصول میں، امام غزالیؒ نے المستصفیٰ میں، علامہ قرافیؒ نے شرح تنقیح الفصول میں، حافظ سیوطیؒ نے تدریب الراوی میں اور علامہ الجزائری نے توجیہ النظر میں یہ بتایا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ تبدیلی کے قائل ہیں۔ لیکن مشہور محدث ملا علی قاریؒ نے شرح مسند امام اعظمؒ میں امام اعظمؒ کے بارے میں حافظ ابوجعفر طحاویؒ کی ایک روایت کی وجہ سے دعویٰ کیا ہے کہ امام اعظمؒ کسی درجہ میں بھی تبدیلی کے جواز کے قائل نہیں ہیں۔ بہرحال امام اعظمؒ، امام مالکؒ اور خطیب بغدادیؒ کے الفاظ میں سلف کی اکثریت کا مذہب یہی ہے۔ لیکن بعد میں آنے والے محدثین احادیث کی روایت میں اس کی پابندی نہ کر سکے انہوں نے پہلے کتابت کے سہارے حفظ کی گرفت کو ڈھیلا کیا۔ بعد ازیں راوی سے معرفت کی قید کو یہ کہہ کر ہٹا دیا کہ عارف ہو یا نہ ہو حدیث بیان کر سکتا ہے۔ اور معلوم ہے کہ الفاظ کی نگرانی اگر حفظ کے ذریعے ہوتی ہے تو معانی کی حفاظت کا واحد ذریعہ معرفت ہے ۔ لیکن محدثین کو اس میں شدت محسوس ہوئی تا آنکہ سیوطیؒ نے برملا اس کی سنگینی کی یہ کہہ کر شکایت کی کہ یہ مذہب بڑا ہی سخت ہے اور عمل اس پر نہیں ہے۔[1]

۲۔ وہ ہدایات جن کے معنے ہی میں نہیں بلکہ الفاظ میں بھی تعبد ہے اور الفاظ بھی معنے کی طرح مقصود ہیں جیسے قرآن حکیم، اذکار نماز۔ ان کو ان ہی لفظوں میں ادا کرنا ضروری ہے۔ دوسرے الفاظ میں تبدیل کرنا قطعاً جائز نہیں ہے۔ قرآن کا ترجمہ اگر آپ پڑھیں گے تو یہ تلاوت قرآن نہیں ہے۔ شوافع میں سے حافظ سیوطیؒ نے لکھا ہے کہ الاذکار توقیفیۃ اذکار کے الفاظ سرکاری ہیں۔ اضاف

---

[1] اس پر مبسوط بحث کے لیے ہماری کتاب دیکھیے امام اعظم اور علم الحدیث از ص ۵۶۰ تا ۵۷۶

وَإِذِ اسْتَسْقَىٰ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ فَقُلْنَا اضْرِب بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ۖ فَانفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ۖ قَدْ عَلِمَ كُلُّ أُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ۖ كُلُوا وَاشْرَبُوا مِن رِّزْقِ اللَّهِ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ ﴿٦٠﴾

اور وہ واقعہ بھی یاد کرو جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کے لیے پانی مانگا[154] ۔ اور ہم نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ اپنی لاٹھی چٹان پر مارو[155] موسیٰ علیہ السلام نے ہمارے حکم کی تعمیل میں اپنی لاٹھی چٹان پر ماری تو بارہ[156] چشمے اس چٹان سے پھوٹ نکلے اور سب لوگوں کو اپنا اپنا پانی لینے کی جگہ کا علم ہو گیا۔ (اسی وقت تم سے ہم نے کہا تھا کہ) کھاؤ پیو[157] اللہ کی دین سے فائدہ اٹھاؤ اور اس ملک میں جھگڑا و فساد نہ کرو[158]

میں سے ابوبکر الجصاص ؒ نے قرآن کی اسی آیت سے اس کی ممانعت پر استدلال کیا ہے۔ احناف کے مشہور فقیہ علامہ ابن عابدین الشامی ؒ نے رد المحتار میں نماز کے بعد ۳۳ بار تسبیح، ۳۳ بار تحمید اور ۳۴ بار تکبیر پر عدد کی زیادتی کے بارے میں بحث کو اس فیصلہ پر ختم کر دیا ہے کہ اگر کسی شک کی بنا پر زیادہ بار پڑھا پھر تو معذور ہے اور اگر ثواب کی خاطر زیادہ کیا تو معذور نہیں ہے کیونکہ شارع کی قائم کردہ حد سے آگے بڑھنا ہے۔ ملا علی قاری ؒ نے علامہ جزری ؒ کے حوالہ سے نقل کیا ہے۔ نماز کے بعد ذکر مسنون اللّٰھم انت السلام میں والیک یرجع السلام کے اضافہ کی کوئی اصل نہیں ہے۔ امام عینی ؒ نے حضرت براء بن عازب ؓ کی اس روایت پر جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو سونے کے وقت دعا سکھائی تھی اور حضرت براء ؓ کی غلطی پر جب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی اصلاح فرمائی۔ یہ نوٹ لکھا ہے کہ ثواب کی مقدار اور الفاظ کی تعیین کی حد تک اسلام میں اذکار توقیفی ہیں۔ ان تصریحات سے آپ حطہ کی تبدیلی کی سنگینی کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

بارہ چشمے

وادیٔ سینا میں شدید گرمی پڑتی ہے۔ دُور دور تک پانی کا نام و نشان نہیں ہے۔ بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے مطالبہ کیا کہ پانی کہاں سے پئیں ہم تو پیاس سے تڑپ تڑپ کر مر جائیں گے۔

سایہ کے لیے ابر، کھانے کے لیے من وسلویٰ کی فراہمی کے ساتھ پینے کے لیے پانی کا بھی انتظام کر دو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بارگاہِ الٰہی میں ہاتھ اٹھا دیے۔ وحیِ الٰہی نے ان کو حکم دیا کہ اپنا عصا پتھر پہ مارو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تعمیلِ حکم کی تو فوراً بارہ چشمے اُبل پڑے۔

آیت کی تشریح سے پہلے ذرا اس پس منظر پہ ایک نگاہ ڈال لیجئے جو اس واقعہ کے سلسلے میں تورات میں بیان کیا گیا ہے اور اس پس منظر کے آئینے میں بنی اسرائیل کے کردار کا چہرہ بھی ملاحظہ فرمائیے۔

تب سارے بنی اسرائیل کی جماعت نے اپنے سفروں میں خداوند کے فرمان کے مطابق سین کے بیابان سے کوچ کیا اور رفیدیم میں ڈیرا کیا۔ وہاں لوگوں کے پینے کو پانی نہ تھا سو لوگ موسیٰ سے جھگڑنے لگے اور کہا کہ ہم کو پانی دیں کہ پیویں۔ موسیٰ نے خداوند سے فریاد کر کے کہا ان لوگوں سے کیا کہوں وہ سب تو مجھے سنگسار کرنے کو تیار ہیں۔ (خروج باب ۱۷ آیت ۱-۴)

اور قدیم ترین یہودی مورخ جوزیفس کی تاریخ آثار یہود میں ہے۔ وہ مقام رفیدیم میں پہنچے جہاں پیاس کی شدت سے بیتاب ہو رہے تھے۔ یہاں کی سرزمین میں پانی کا ایک قطرہ نہ پایا۔ اس پر یہ لوگ غصہ میں بھر کر پھر موسیٰ پر ٹوٹ پڑے ..... لیکن وہ خدا کے آگے دُعا میں زاری کے ساتھ مشغول ہو گیا۔ (باب ۳ فصل ۲)

تورات میں ہی ایک دوسری جگہ مقام کا نام رفیدیم کے قادس درج ہے۔ (گنتی ۲۰-۱-۲)

اس بنا پر علمائے اہلِ کتاب میں باہم سخت اختلاف ہو گیا ہے کہ اس واقعہ کا مقام وقوع کیا ہے؟ وہ مقام کوئی ہو قرآن نے خود مقام کا نام نہیں لیا خود واقعہ کا ہونا اہلِ کتاب کو مسلم ہے اور واقعہ کے ہونے میں کوئی اختلاف نہیں ہے[1]

۱۵۴ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کے لیے پانی طلب کیا۔ عربی میں استسقاء کا لفظ آیا ہے اس کے معنے پانی مانگنا ہے۔ پانی مانگنے کا مطلب یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ سبحانہ سے پانی کے لیے دُعا فرمائی۔ اس سے معلوم ہوا کہ استسقاء کی اصل دُعا ہے۔ غالباً امام ابوحنیفہؒ جو اسلامی قانون کے اپنے دور میں بہت بڑے نکتہ داں ہوئے ہیں انہوں نے اسی سے اندازہ کیا ہے کہ اصل میں استسقاء دُعا ہے اور شریعتِ اسلامیہ میں نماز کی صورت میں دُعائی پیمانہ اسی کا مسنون عمل ہے۔ حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی کبھی بارش کی طلب گاری کے لیے نماز ادا کی ہے اور کبھی ایسا بھی کیا ہے کہ خطبہ کی حالت میں صرف دُعا فرمادی اور نماز ادا نہیں کی۔ چنانچہ صحیحین میں حضرت

---

[1] تفسیر ماجدی ص ۲۴

انس بن مالکؓ کا بیان ہے کہ خطبہ جمعہ ہی میں آپ نے دُعا فرمائی اور اللہ سبحانہ نے بارش نازل فرمادی۔[1]

یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ توبہ و استغفار اور اللہ کی جناب میں دُعا، بارش برسانے اور ابر لانے کے لیے ایک آلہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ حضرت ہود علیہ السلام نے بھی اُمت کو اسی کو بارش لانے کے لیے استعمال کرنے کا حکم دیا تھا۔

یٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْا اِلَیْهِ یُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَیْكُمْ مِّدْرَارًا:

حضرت نوح علیہ السلام نے بھی اپنی قوم کو یہی مشورہ دیا ہے۔ محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلّم چونکہ آخری پیغمبر ہیں اس لیے آپ نے اس کا کمالی نمونہ پیش فرمادیا اور زمانۂ نبوت میں اس عملی تجربہ کا لوگوں نے مشاہدہ بھی کیا۔

آج تو شاید اس عملی تجربہ کو کوئی ماننے کے لیے تیار نہ ہو لیکن اللہ کے رسُول کا بیان ہے جسے امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے۔

ایک شخص کسی میدان میں جا رہا تھا کہ اس نے بادل کے ٹکڑے میں سے آواز سُنی فلاں شخص کے باغ کو سیراب کرو۔ آواز کے بعد دیکھا کہ بادل کا وہ ٹکڑا ایک کنارے کی طرف ہٹ گیا اور برس گیا۔ اس کا پانی ایک سنگلاخ زمین میں جمع کیا پھر چند نالیوں میں سے ایک نالی میں سارا پانی سمٹ کر آ گیا۔ اور ایک طرف بہنے لگا۔ آواز سننے والے کا بیان ہے کہ میں اس پانی کی روانی کے پیچھے پیچھے چلا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک آدمی ایک باغ میں کھڑا پانی لگا رہا ہے۔ میں نے اس سے دریافت کیا کہ اسے اللہ کے بندے بتا تیرا نام کیا ہے؟ اس نے بتایا کہ فلاں نام ہے۔ یہ وہی نام تھا جسے میں نے ابر سے سُنا تھا۔ تب باغبان نے میرے سے پوچھا کہ تم نے میرا نام کیوں دریافت کیا ہے۔ میں نے کہا کہ جس بادل کا یہ پانی ہے میں نے اس سے آواز سُنی تھی کہ فلاں کا باغ سیراب کرو۔ یہ تمہارا ہی نام ہے۔ اب بتاؤ کہ تمہارا کردار کیا ہے۔ اس نے کہا۔ اچھا تم نے پوچھا ہے تو بتا دیتا ہوں۔ سنو میں اس باغ کی پیداوار کے تین حصّے کرتا ہوں۔ ایک حصّہ صدقہ کرتا ہوں ایک حصّہ اپنے اہل و عیال کے لیے رکھ لیتا ہوں اور ایک حصّہ پھر اسی باغ میں لگا دیتا ہوں۔

گویا آب پاشی کی بے شمار تدبیروں میں سے قرآن کی رُو سے ایک اہم تدبیر توبہ، استغفار، دُعا اور صدقہ ہے۔ جس کی تصدیق انبیاء کے تجربہ سے ہو چکی ہے۔

---

[1] معارف القرآن م س ص ۱۶۸

یاد رہے کہ اس تجربہ کے موثر ہونے کے لیے گناہوں سے بیزاری، فقر و مسکنت اور عبودیت کا اظہار ضروری ہے۔ گناہوں پر اصرار اور اللہ کی نافرمانیوں پر قائم رہتے ہوئے تاثیرِ دُعا کے انتظار کا کسی کو حق نہیں ہے۔

۱۵۵۔ ہم نے کہا کہ اپنی لاٹھی چٹان پر مارو۔ دُعا قبول ہونے پر پانی حاصل کرنے کی یہ تدبیر بتائی کہ چٹان پر لاٹھی مارو، پانی اُبلنے لگے گا۔ یہ چٹان کون سی تھی۔ بیضاویؒ اور رازیؒ نے لکھا ہے کہ یہ خاص چٹان تھی۔ توراۃ میں ہے کہ یہ چٹان جبل حورب میں تھی۔ (خروج ۱۷-۶) حورب سے وہ سلسلہ کوہ مراد ہے جو وادی لجاس میں واقع ہے۔ وہ چٹان اب تک جزیرہ نمائے سینا میں موجود ہے۔ سیاح اسے جاکر دیکھتے ہیں اور چشموں کے شگاف اب بھی اس میں پائے جاتے ہیں[1]

۱۵۶۔ اس چٹان سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے۔ بنی اسرائیل کے بارہ قبیلے تھے اس لیے چشمے بھی بارہ نکلے۔ کسی قبیلہ میں آدمی زیادہ کسی میں کم۔ ہر قبیلہ کے موافق ایک چشمہ تھا[2]۔ بعض نادان مسیحیوں نے اس تعداد پر بھی اعتراض کردیا ہے کہ یہ تو بائیبل میں موجود نہیں ہے۔ اللہ نے جواب بھی مسیحیوں کی زبان سے دلایا۔ جارج سیل انگریزی میں قدیم مترجم قرآن ہے۔ اس آیت کے حاشیہ پر لکھتا ہے۔ ایک مسیحی جو وہاں سے ہو آیا ہے بتصریح بیان کرتا ہے کہ چٹان میں بارہ مقامات سے پانی نکلتا تھا۔ اور ایک دوسرے مسیحی سیاح کا مشاہدہ بیان کرتا ہے '۔ چٹان میں اس وقت چوبیس سوراخ ہیں جو بآسانی شمار کیے جا سکتے ہیں۔ بارہ ایک طرف اور بارہ دوسری طرف۔ سب سے پہلے قرآن نے حتمی طور پر بنی اسرائیل کے بارہ قبائل کے لیے بارہ چشموں کی تعداد بیان کی ہے۔ یہ اشارہ ان ہی شگافوں کی طرف ہے[3]

۱۵۷۔ کھاؤ پیو۔ اس زور نے معاش گریز رجحانات کی تردید کردی ہے اور بتادیا کہ عالم کا نظام نانے بکفہ رہی کا نظام ہے۔ یعنی اللہ نے اس نظام کو اسی لیے قائم کیا ہے تاکہ اپنی معاشی سہولتوں کے لیے بالواسطہ یا بلاواسطہ آدمی اس سے استفادہ کرے اور نفع اُٹھائے۔ اس لیے نہیں ہے کہ اس سے گریز اختیار کرے۔ رزق اللہ میں رزق کی نسبت کرکے بتادیا کہ جو کچھ مل رہا ہے وہ سب اللہ کے فضل وکرم سے ہے۔ تمہارے زورِ بازو کا ہرگز نتیجہ نہیں ہے۔

۱۵۸۔ ملک میں جھگڑا و فساد نہ کرو۔ جب قوم کی قوم قانونِ الٰہی کو چھوڑ کر اپنے اپنے نفس

---

[1] تفہیم القرآن ص ۶۹　[2] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۱۲　[3] تفسیر ماجدی ص ۲۹

کے مطابق کوئی روش اختیار کر لیتی ہے تو اس کا نتیجہ دُنیا میں لازمی طور پر فتنہ و فساد، حرب و ضرب اور کثرت جرائم کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور انفرادی و اجتماعی امن اٹھ جاتا ہے۔ فضل و انعام سے نواز کر بنی اسرائیل سے کہا جا رہا ہے کہ جو فارغ البالی کی اللہ کی جانب سے نعمت ملی ہے۔ اس کو غنیمت سمجھو اور اس کی قدر کرو۔ اللہ کے قانون کی نافرمانی کر کے ملک کے امن و نظم کو خراب نہ کرو۔ امن اور نظم اسی وقت قائم رہ سکتا ہے جب اللہ کے بھیجے ہوئے قانون پر عملدرآمد رہے۔ اللہ کے دستور کے علاوہ کسی جاہلی دستور پر قائم رہنا، اس کے طور طریقوں کی دعوت دینا فساد فی الارض کے مترادف ہے۔ اس سے انحراف بلکہ سرمو تجاوز دُنیا کو بدنظمی، تباہی، ابتری، کشت و خون، بداخلاقی، قطع ارحام، نسل کشی، طبقاتی جنگ کو دعوت دینا ہے۔

بہرحال آیت میں بتایا گیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دُعا سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ضرب کے ذریعے اللہ سبحانہٗ نے بنی اسرائیل کے لیے چٹان سے بارہ چشمے نکال کر پانی کا انتظام فرمایا۔

یہ واقعہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ایک حیثیت سے نہیں بلکہ متعدد حیثیتوں سے معجزہ ہے۔ پانی کا پتھر سے نکلنا، پتھر سے بارہ چشموں کا نکلنا، لاٹھی کی ضرب سے نکلنا، بقدرِ ضرورت نکلنا ــــ ضرورت پوری ہو جانے پر بند ہو جانا، الغرض یہ واقعہ قدرتِ الٰہی کا ایک خاص کرشمہ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عظیم معجزہ تھا ــــ اور جو کوتاہ نظران معجزات کا انکار کرتے ہیں ــــ

نیستند آدم خلافِ آدم اند

دیکھو مقناطیس تو لوہے کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے اس پتھر نے پانی کھینچ لیا تو انکار کیوں ہے۔[1]

قاضی بیضاویؒ فرماتے ہیں کہ ایسے خوارق کا انکار کرنا بڑی غلطی ہے۔ جب بعض پتھروں میں خلاف قیاس اللہ تعالیٰ نے یہ تاثیر رکھی ہے کہ لوہے کو جذب کرتا ہے تو اگر اس پتھر میں یہ تاثیر پیدا کر دی ہو کہ اجزائے زمین سے پانی جذب کرلے تو کیا بعید ہے۔ ہمارے زمانے کے عقلاء کو اس سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔ یہ نظیر بھی سطحی نظر والوں کے لیے ہے ورنہ خود اگر اس پتھر کے اجزاء ہی میں پانی پیدا ہو جائے پھر بھی کونسا محال ہے۔ جو لوگ ایسی باتوں کو محال کہتے ہیں تو واللہ وہ محال کی حقیقت ہی نہیں سمجھتے۔[2]

علامہ زملکانی سے حافظ ابن کثیرؒ نے البدایہ میں نقل کیا ہے کہ عصائے موسیٰ کے ذریعے پتھر سے

---

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۱۲ [2] بیان القرآن ص ۴۵

پانی کا نکلنا بلاشبہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اعجاز ہے اور یقیناً بہت بڑا اعجاز ہے لیکن اسی اعجاز کی ایک جھلک ہمیں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے معجزات میں جب نظر آتی ہے تو دونوں میں یعنی اعجاز موسوی اور اعجاز محمدیؐ میں زمین و آسمان کا فرق نظر آتا ہے۔ صحیح بخاری میں ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ بیان فرماتے ہیں کہ ہم معجزات کو برکت سمجھتے ہیں اور تم ان کو خوف کی چیز سمجھتے ہو۔ ہم ایک سفر میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے ساتھ تھے۔ پانی کی کمی ہو گئی۔ آپؐ نے فرمایا کہ دیکھو کسی کے پاس کچھ پانی ہو تو لے آؤ۔ لوگ ایک برتن لے آئے جس میں ذرا سا پانی تھا۔ آپؐ نے برتن میں اپنا دست مبارک ڈالا اور فرمایا چلو اور وضو کا پانی اور خدا کی برکت لو۔ بخدا میں نے بچشم خود دیکھا کہ پانی آپؐ کی انگلیوں سے چشمہ کی طرح اُبل رہا تھا۔ اور آپ کے زمانۂ مبارک میں ایسا بھی ہوتا تھا کہ ہم کھانا کھاتے تھے اور کھانے کی تسبیح اپنے کانوں سے سنتے تھے۔

یہ بھی ایک معجزہ ہے اور وہ بھی ایک معجزہ تھا۔ لیکن ذرا غور فرمائیے کہ پانی پتھر سے نکلا اور لاٹھی کی ضرب کے ذریعے نکلا۔ پانی طبعاً زمین اور پتھر ہی سے نکلتا ہے اور پہاڑوں میں چشمے چٹانوں ہی سے نکلے ہوتے ہیں۔ اور پانی کسی ذریعہ ہی سے باہر آتا ہے چاہے یہ پھاوڑے اور کدال کی ضرب ہو اور چاہے کسی اور چیز کی۔ یہاں اعجاز صرف یہ ہے کہ جس راہ سے پانی آتا ہے اور جس ذریعے سے آتا ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے عصا کے ذریعے پانی نکال دیا۔ لیکن اعجازِ محمدیؐ کا معاملہ اس سے بالا ہے۔ انگلیوں کی راہ سے پانی آنا اللہ کی عادت اور عالمِ تکوین کا قانون نہیں ہے۔ صرف لگن میں ہاتھ رکھتے ہی انگلیوں سے پانی کی آبشاریں اُبل آنا بہت بڑا اعجاز ہے۔ یوں سمجھئے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا پتھر سے پانی نکالنا اگر اعجاز ہے تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کا انگلیوں سے پانی نکالنا کمالِ اعجاز ہے۔ اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ آپ کو اللہ سبحانہٗ نے دوسرے انبیاء کے مقابلے میں ہر پہلو میں شان کمال عطا فرمائی ہے۔ مولانا محمد قاسمؒ نے کیا خوب فرمایا ہے:۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی برکت سے اگر پتھر میں سے پانی نکلتا تھا تو یہاں دست مبارک میں سے نکلتا تھا اور ظاہر ہے کہ پتھروں سے پانی نکلنا اتنا عجب نہیں جتنا گوشت و پوست میں سے پانی کا نکلنا عجب ہے۔ اس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزہ میں پتھر میں سے پانی کے نکلنے سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ جسم مبارک موسویؑ کا یہ کمال تھا۔ اور یہاں یہ ثابت ہوتا ہے کہ دست مبارک محمدیؐ منبع فیوض الانہار ہے۔ بلکہ جب یہ دیکھا جائے کہ کسی پیالہ میں تھوڑا سا پانی لے کر اُس پر آپؐ نے ہاتھ پھیلا دیا جس سے اس قدر پانی نکلا کہ تمام لشکر سیراب ہو گیا اور لشکر کے جانور سیراب ہو گئے۔

وَإِذْ قُلْتُمْ يَا مُوسَىٰ لَن نَّصْبِرَ عَلَىٰ طَعَامٍ وَاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُخْرِجْ لَنَا
مِمَّا تُنبِتُ الْأَرْضُ مِن بَقْلِهَا وَقِثَّائِهَا وَفُومِهَا وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا ۖ قَالَ
أَتَسْتَبْدِلُونَ الَّذِي هُوَ أَدْنَىٰ بِالَّذِي هُوَ خَيْرٌ ۚ اهْبِطُوا مِصْرًا فَإِنَّ لَكُم مَّا سَأَلْتُمْ ۗ
وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَاءُوا بِغَضَبٍ مِّنَ اللَّهِ ۗ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ كَانُوا
يَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَيَقْتُلُونَ النَّبِيِّينَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۗ ذَٰلِكَ بِمَا عَصَوا وَّكَانُوا يَعْتَدُونَ ۝

اور اپنی تاریخ حیات کے اس واقعہ کو بھی یاد کرو جب تم نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا تھا کہ ہم ایک ہی کھانے پر[۱۵۹] صبر ہرگز نہ کریں گے یہ ہم سے نہیں ہو سکتا۔ لہذا آپ اپنے پروردگار سے ہمارے لیے دعا فرمائیے کہ ہمارے لیے وہ تمام چیزیں پیدا کی جائیں جو زمین کی پیداوار[۱۶۰] ہیں۔ ساگ، ترکاری، گیہوں، لہسن، دال، پیاز۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا کیا تم ایک بہتر چیز کے بدلے ادنیٰ درجے کی چیز لینا چاہتے ہو[۱۶۱] اچھا اگر تم یہی چاہتے ہو تو کسی شہر[۱۶۲] میں آبادی بن جاؤ۔ جو کچھ تم مانگ رہے ہو وہاں تمہارے لیے موجود ہوگا۔ اور اس قسم کی گستاخیوں کی پاداش میں بالآخر ان پر ذلت[۱۶۳] و خواری کی مار پڑ گئی اور اللہ کے غضب میں آ گئے۔ یہ اس بات کا نتیجہ تھا کہ وہ اللہ کی آیات[۱۶۴] کا انکار کرتے تھے اور ناحق اللہ کے پیغمبروں کو قتل کرتے تھے[۱۶۵]۔ اور گمراہی کی اس منزل پر وہ اس لیے پہنچے کہ وہ اطاعت کی جگہ سرکشی اور قانون کی بغاوت کے عادت مجرم تھے[۱۶۶]۔

تو یہ بات بحکم فہم سلیم سمجھ میں آتی ہے کہ جیسے آئینہ وقت تقابل آفتاب فقط قابل و مفعول ہوتا ہے اور نورفشانی فقط آفتاب ہی کا کام ہے اور یہ کمالِ نور اُسی کی طرف سے آیا ہے آئینہ کی طرف سے نہیں یا کائنات الجو اور حوادث مابین ارض و سما میں فاعلیت آسمان کی طرف ہے۔ زمین فقط قابل ہے دوسروں کا کمال لے کر ظاہر کرتی ہے۔ ایسے ہی اس وقت جس وقت آپ نے دستِ مبارک اُس پانی پر رکھا اور یہ معجزہ تکثیرِ آب نمایاں ہوا تو یوں سمجھو کہ پانی محض قابل تھا فاعلیت اور ایجاد آپ کی طرف سے تھا یعنی فاعلیت فاعلِ حقیقی اور ایجاد موجدِ حقیقی کے سامنے آپ کا دستِ مبارک ایک واسطہ فیض اور آلہ ایجاد تھا گو اُس خدا کو بے ان وسائط کے بھی بنانا آتا ہے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ اس طور سے پانی کا پیدا ہونا صاف اس

بات پر دلالت کرتا ہے کہ جو کچھ ہوا وہ آپ کے دستِ مبارک کی تاثیر سے ہوا اور ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزہ میں یہ خوبی نہیں نکلتی بلکہ فقط ایک قدرتِ خدا ثابت ہوتی ہے۔

امر واقعہ یہ ہے کہ انبیائے عالم میں صرف حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ذاتِ گرامی ہے جن کے لیے ایک دفعہ چٹان کی رگیں پانی کی سوتیں بنی ہیں۔ لیکن رسولِ عرب کے لیے صرف گوشت و پوست کی انگلیاں نہیں بلکہ مشکیزہ کا چمڑا، خشک چشموں کے دہانے، سوکھے ہوئے کنوؤں کی سوتیں، دہانِ مبارک کی کلیاں متعدد بار پانی کا چشمہ ثابت ہوتی ہیں۔ گویا ؎

نہ دانم آں گل رعنا چہ رنگ و بو دارد
کہ مرغ ہر چمنے گفتگوئے او دارد

فکری پستی اور طبیعت کا فساد

وادیِ سینا کی گرم و خشک فضاؤں اور پتھریلی زمین میں اللہ نے بنی اسرائیل کے لیے سلنے کا، پینے کے لیے پانی کا اور کھانے کے لیے غذا کا انتظام فرمایا اور ایک عظیم مقصد کی خاطر نبوت کی رہنمائی میں ان کی تربیت کا اہتمام کیا مگر اُن کی فاسد طبیعت، فکری پستی اور فطرت کی دنائت قدم قدم پر ان کے راستہ میں حائل رہی۔ اپنی فکری پستی اور طبیعت کے فساد کی وجہ سے اُن کو مقصد کی عظمت کا کوئی احساس نہ تھا۔ وہ تکلیفیں برداشت کرنے سے گھبراتے اور شہری زندگی کی راحتوں کو رہ رہ کر یاد کرتے تھے۔ حد یہ کہ وہ اس عظیم مقصد کی خاطر کھانا چھوڑنا اور بھوکا مرنا تو درکنار کھانے پینے کی اشیاء میں کسی تبدیلی کو بھی گوارا نہ کرتے تھے۔ وہ کسی طرح تیار نہ تھے کہ عزت و اقتدار اور آزادی کے لیے اپنی زندگی کو کسی نئے سانچے میں ڈھالیں۔ ان آیات میں ان کی اسی نیرنگئ طبع اور فکری پستی کا تذکرہ ہے۔

۱۵۹ یہ واقعہ اسی وادیٔ سینا کا ہے۔ بنی اسرائیل آسمانی طعام کھاتے کھاتے اُکتا گئے تو کہنے لگے کہ ہم سے ایک طرح کے کھانے پر صبر نہیں ہوتا ہم کو تو زمین کا اناج، سبزی، ساگ، ترکاری چاہیے[1]

قرآن حکیم یہاں واقعات میں ان کی تاریخی ترتیب اور تسلسل کا ہرگز پابند نہیں ہے۔ بنی اسرائیل عرصۂ دراز تک ایک ہی غذا کھاتے کھاتے اکتا گئے تھے اور اب اپنے پیغمبر سے فرمائش کر رہے

---

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۱۲

تھے کہ اس بیابان سے نکال کر کسی دوسری جگہ لے چلئے جہاں طرح طرح کے شہری کھانے موجود ہوں[1]

سے ۱۶۰۔ اپنے پروردگار سے دعا کیجئے کہ وہ ہمارے لیے زمین کی پیداوار مہیا کرے۔ دراصل مصریوں کی مرغوب غذا اکثر زراعت پیشہ قوموں کی طرح زمینی پیداوار تھی۔ مصر میں آج کی طرح اس وقت بھی بڑی مانگ سبزی، پیاز، ہلدی وغیرہ کی تھی اور یہی چیزیں اسرائیلیوں کی بھی اصل غذا بن چکی تھیں۔ اسرائیلیوں کی اصل غذا سبزی تھی خصوصاً غلہ کی اقسام (جیوش انسائیکلوپیڈیا ص ۲۰۴) قدیم اسرائیلی سبزیوں، ترکاریوں اور پھلوں پر گزر بسر کرتے تھے۔ (ج ۵ ص ۵۹۶)

توراۃ میں یہ بات ذرا مختلف انداز میں پیش کی گئی ہے۔

بنی اسرائیل روتے ہوئے بولے کون ہے جو ہمیں گوشت کھانے کو دے گا۔ ہم کو وہ مچھلی یاد آتی ہے جو ہم مفت مصر میں کھاتے تھے اور وہ کھیرے اور وہ خربوزے اور وہ گندنا اور وہ پیاز اور وہ لہسن۔ پر اب تو ہماری جان خشک ہو چلی ہے۔ یہاں تو ہماری آنکھوں کے سامنے کچھ بھی نہیں ہے مگر یہ من (گنتی ۱۱-۴-۶)[2]

سے ۱۶۱۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کیا ایک بہتر چیز کے بدلے ادنیٰ چیز لینا چاہتے ہو مطلب یہ ہے کہ جس بڑے مقصد کے لیے یہ صحرانوردی تم سے کرائی جا رہی ہے اس کے مقابلے میں کیا تم کو کام و دہن کی لذت اتنی مرغوب ہے کہ اس مقصد کو چھوڑنے کے لیے تیار ہو اور ان چیزوں سے محرومی کچھ مدت کے لیے بھی برداشت نہیں کر سکتے ہو[3] جب محکومی و غلامی سے اخلاق پست ہو جاتا ہے۔ اور بلند مقاصد کے لیے جوش و عزم باقی نہیں رہتا تو صورت حال یہی ہو جاتی ہے جس کا نقشہ ان آیات میں پیش کیا گیا ہے۔ بنی اسرائیل فراعنہ مصر کی غلامی سے آزاد ہو گئے تھے اور قومی عظمت کا مستقبل ان کے سامنے تھا لیکن وہ حقیر راحتوں کے لیے ترستے تھے جو مصر کی غلامانہ زندگی میں ان کو میسر تھیں۔ اور وہ چھوٹی چھوٹی تکلیفیں شاق گزرتی تھیں جو آزادی اور عظمت کی راہ میں پیش آتی ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام ان کو بتا رہے ہیں کہ افسوس تمہاری غفلت اور بے حسی پر۔ کیا تم چاہتے ہو کہ ادنیٰ سی بات کے لیے یعنی غذا کی لذت کے لیے اس مقصد عظیم سے دست بردار ہو جاؤ جس میں بڑی ہی خیر اور برکت ہے یعنی قومی آزادی اور سعادت سے۔ اچھا اگر تمہاری بدبختی کا حال یہی ہے تو

سے ۱۶۲۔ کسی شہری آبادی میں جا رہو، وہاں یہ تمام چیزیں مل جائیں گی۔ کیونکہ بڑے شہروں میں

---

[1] تفسیر ماجدی ص ۲۵ [2] تفسیر ماجدی ص ۲۵ [3] تفہیم القرآن ص ۸۰

سبزیاں اور پھل علاوہ موسم کے بے فصل اور بے بہارے مل جایا کرتے تھے۔ شہر کے لیے مصر کا لفظ بولا گیا ہے یہاں مراد جزیرہ نما سینا یا اس کے مضافات کا کوئی شہر ہے۔ یہ اس وقت ہے جبکہ لفظ مصر نکرہ ہو اور تنوین کے ساتھ ہو اور اگر یہ علم اور نام ہے اور بغیر تنوین کے ہو جیسا کہ زمخشری کی تصریح کے مطابق حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت میں ہے اور امام اعمشؒ کی قرأت ہے تو مطلب یہ ہے کہ اس کے لیے دُعا کی ضرورت نہیں ہے تم دوبارہ مصر ہی چلے جاؤ جہاں سے آتے ہو۔ اپنی اسی ذلت آمیز غلامی کو دوبارہ اختیار کر لو وہاں تمہیں کافی مقدار میں ساگ، ترکاریاں مل جائیں گی اور اس بلند نصب العین کو چھوڑ دو جس کے لیے تمہارا انتخاب ہوا ہے۔ اگر یہ دوسرا مطلب ہو تو یہ بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی جانب سے ایک قسم کی سرزنش ہے۔ حافظ ابن جریرؒ نے ابو العالیہؒ اور ربیعؒ کی طرف منسوب کر کے یہی مطلب بتایا ہے۔ اگرچہ ابن جریرؒ کی رائے میں نہ یہ معنی درست ہیں اور نہ یہ قرأت۔ مصر کے بعض جدید مؤلفین کی جانب سے اس کی ترجیح بے وزن ہے۔ میری مراد سید قطب مرحوم سے ہے۔

ف۱۶۳ - اور ان پر ذلت و خواری کی مار پڑ گئی۔ ذلت یہ کہ ہمیشہ مسلمان اور عیسائیوں کے محکوم رہتے ہیں۔ کسی کے پاس مال ہوا تو کیا۔ حکومت سے محروم ہو گئے جو موجب عزت تھی۔ اور محتاجی یہ کہ اوّل تو یہود میں مال کی قلت ہے اور جن کے پاس ہو بھی تو حکام وغیرہ کے خوف سے اپنے آپ کو مفلس اور حاجت مند ہی ظاہر کرتے تھے۔ شدتِ حرص اور بخل کے باعث محتاجوں سے بدتر نظر آتے ہیں[1]

اس موضوع کے تفصیلی مباحث تو چوتھے پارہ میں آئیں گے لیکن یہاں یہ نکتہ ضرور پیشِ نظر رہے کہ پہلے پارہ میں یہود کا ذکر نہیں ہے ذکر بنی اسرائیل کا ہو رہا ہے۔ یعنی ایک معین نسل و قوم کا نہ کہ کسی مسلک کے ماننے والوں کا۔ اس لیے جو ذلت و نکبت چودہ سو سال گزرنے پر اس کی مصداق ایک مخصوص نسل و قوم ہے۔ خود ARTI-SAMITISM کا لفظ بتا رہا ہے کہ یہود سے جو مستقل عداوت جرمنی کو خصوصاً اٹلی، ہنگری، رومانیہ وغیرہ یورپ اور امریکہ کی اکثر ولایتوں کو عموماً ہے اس کی بنا نسلی یا قومی ہے نہ کہ دینی و اعتقادی ـــ تنگدستی اور مفلسی کی بات پہ شاید آپ کو حیرت ہو اور سوچیں کہ سرمایہ داری تو یہود کی ضرب المثل ہے لیکن یہ محض فریب اور ایک عمومی مغالطہ ہے۔ دولت و ثروت جتنی بھی ہے وہ یہودیوں کے صرف چند مشاہیر و اکابر تک ہے ورنہ عوام یہود کا

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۱۲

شمار تو دنیا کی مفلس ترین قوموں میں ہے۔ یہ خود محققین یہود کا فیصلہ ہے۔ جیوش انسائیکلوپیڈیا میں ہے۔ اگرچہ یہود کا قول ضرب المثل ہے لیکن اہلِ تحقیق کا اتفاق ہے کہ یہود یورپ کے جس ملک میں آباد ہیں وہاں کی آبادی میں انہیں کے مفلسوں کا تناسب بڑھا ہوا ہے (ج ۱ ص ۱۵۱) عوام یہود دوسری قوموں سے کہیں زیادہ غریب ہیں یہ اور بات ہے کہ ان کے چند افراد بہت زیادہ دولتمند ہیں (ج ۱ ص ۶)

ف ۱۶۴ یہ اس بات کا نتیجہ تھا کہ وہ اللہ کی آیات کا انکار کرتے تھے۔ یعنی اللہ کا غضب اور ذلّت و مسکنت ان پر اس لیے پڑی ہے کہ وہ زندگی میں ان سنگین جرائم کے مرتکب تھے۔ اوّل اللہ کی آیات کا کفر، دوسرے انبیاء کا قتل۔

اس موقعہ پر سید قطب مرحوم کی یہ بات بالکل برمحل ہے کہ ان پر ذلّت و خواری کا ہمیشہ کے لیے مسلط ہونا تاریخی لحاظ سے اُس مرحلہ پر نہیں ہوا۔ یہ لوگ ذلیل و خوار اس وقت ہوئے جب وہ عادی مجرموں کے زمرہ میں آ گئے تھے۔ قرآن کی اس آیت میں اسی کی طرف کانوا یکفرون سے اشارہ کیا گیا ہے۔ ان بُرائیوں کا ارتکاب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کافی بعد ہوا لیکن چونکہ انہوں نے ساگ، ترکاری کا مطالبہ کیا تھا اس لیے ان کے اس مطالبہ کے پیشِ نظر یہیں بتا دیا۔ دوسرے بزرگوں نے بھی یہی سمجھا ہے۔

یہاں کانوا یکفرون استعمال ہوا ہے۔ اس میں ان کی خاص مستقل قومی خصلت کا ذکر کیا ہے کہ انکار کرتے ہی رہتے تھے، انکار کو شعار ہی بنا لیا تھا[1]

آیات سے کفر کی مختلف صورتیں مراد ہیں۔ مثلاً ایک یہ کہ خدا کی بھیجی ہوئی تعلیمات میں سے جو بات اپنے خیالات اور خواہشات کے خلاف پائی اس کو ماننے سے صاف انکار کر دیا۔ دوسرے یہ کہ ایک بات کو یہ جانتے ہوئے کہ اللہ نے فرمائی ہے پوری ڈھٹائی اور سرکشی کے ساتھ اس کی خلاف ورزی کی اور حکمِ الٰہی کی کچھ پروا نہ کی۔ تیسرے یہ کہ ارشادِ الٰہی کے مفہوم کو اچھی طرح جاننے اور سمجھنے کے باوجود اپنی خواہش کے مطابق اسے بدل ڈالا[2]

ف ۱۶۵ ۔ ناحق اللہ کے پیغمبروں کو قتل کرتے تھے۔ یعنی دوسری یہودگیاں، شرارتیں تو تھیں، حد یہ ہے کہ قتل تک سے بھی نہ چوکے۔ اور یہ بھی اگر کانوا یکفرون ہی پر عطف ہے جیسا کہ عبارت کا تقاضا ہے تو مطلب یہ ہے کہ قتل نبی کا ایک واقعہ نہیں بلکہ اُن کی پوری زندگی نبیوں کے قتل

---

[1] تفسیر ماجدی ص ۲۶　[2] تفہیم القرآن ص ۸۰

جیسے سنگین جرم سے آلودہ تھی اور قومی حیثیت سے وہ اس کے مجرم عادی تھے۔
یسعیا نبی کا قتل، یرمیاہ نبی کا قتل، ذکریا نبی کا قتل، یحییٰ نبی کا قتل اور حضرت کے لیے اقدام قتل، یہ اسرائیل کی تاریخ جرائم کے چند جلی عنوانات ہیں۔ یہ قوم اس قابل رہ گئی تھی کہ اس کے ساتھ کچھ بھی رعایت نہ رکھی جائے۔

آیت میں قتلِ انبیاء کا جرم بیان کرتے ہوئے بغیر حق (یعنی ناحق) کی قید لگائی ہے۔ نبی کا قتل تو ہمیشہ ہی ناحق ہوتا ہے۔ نبی کے قتل کے جائز ہونے کی کوئی صورت ہی نہیں۔ قرآن کا مقصود اس اضافہ سے یہ بتانا ہے کہ خود اُن قاتلوں کے معیار سے بھی یہ قتل ناحق اور ناجائز ہے۔ یعنی خلافِ عدل تو تھا ہی بلکہ قانون، وقت اور ضابطہ بھی اس کی اجازت نہ دیتا تھا۔

۱۶۶ ۔ قانون کی بغاوت اور سرکشی کے مجرم عادی تھے۔ ایک گناہ دوسرے گناہ کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ آیت میں بتایا ہے کہ کفر اور قتلِ انبیاء جیسے جرائم ان میں اس لیے پیدا ہو گئے تھے کہ وہ عصیان اور عُدوان یعنی خلوت و جلوت میں خدا کی نافرمانی میں بے باک ہو چکے تھے۔ ایک گناہ دوسرے گناہ کا سبب بن جاتا ہے۔ عصیان و عُدوان نے اُن کو کفر اور قتلِ انبیاء تک پہنچا دیا۔ قاضی بیضاویؒ نے لکھا ہے کہ جس طرح چھوٹی طاعت بڑی طاعت کی طرف لے جاتی ہے۔ چھوٹی معصیت بھی بڑی معصیت تک پہنچا دیتی ہے۔

عصیان کا اطلاق قرآن میں بالعموم حقوق اللہ پر ہوا ہے جبکہ عُدوان زیادہ تر حقوق العباد کے لیے بولا جاتا ہے۔ اعتداء، تعدی اور عدوان ایک ہی مادہ سے بنے ہیں اور سب کے معنے حد سے گزرنا ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان میں دونوں قسم کے گناہوں کی فراوانی ہو چکی تھی۔ اللہ سے نیاز مندانہ تعلق ٹوٹ چکا تھا اور اللہ کے بندوں سے معاملات خبط ہو چکے تھے۔

یہ فقرہ دراصل یہ بتانے کے لیے ہے کہ جس طرح صحت بدن کی ایک نشانی یہ ہے کہ زبان کا ذائقہ دُرست ہو اور اس میں میٹھی چیز میٹھی چیز اور کڑوی چیز کڑوی معلوم ہو۔ ایسے ہی صحت ایمان کی علامت یہ ہے کہ ایمان کا ذائقہ دُرست ہو۔ اس میں طاعت و عصیان کا صحیح صحیح امتیاز باقی ہو۔ اگر یہ امتیاز باقی نہ رہے تو سمجھ لو بیماری آلیٹی ہے۔ یہاں حال اس شخص کا ہے جو گناہوں کا خوگر ہو جاتا ہے۔ اب اس میں طاعت و عصیان کا احساس ختم ہو جاتا ہے۔ اور یہ احساس کی پامالی سنگین گناہوں کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ اسی بنا پر حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ:
مومن اپنے گناہوں سے اس طرح ڈرتا ہے جیسے وہ پہاڑ کے نیچے بیٹھا ہوا اور ڈر رہا ہو کہ وہ

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالنَّصَارَىٰ وَالصَّابِئِينَ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِندَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿۶۲﴾

بلاشبہ مسلمان[166] ہوں یا یہودی[168]، اور عیسائی[169] ہوں یا صابئی[170]۔ سب کی نجات وسعادت کا مدار دعویٰ اور نسبت سے ہٹ کر یہ ہے کہ جو بھی اللہ[171] اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہوتے عمل صالح کرے گا۔ ان کے لیے ان کے پروردگار کے پاس ان کے ایمان وعمل کا اجر ہے اور ان کو نہ کوئی ڈر ہوگا اور نہ وہ غمگین[172] ہوں گے۔

اب گرا اور فاجر آدمی ان کو اس طرح حقیر سمجھتا ہے جیسے مکھی اس کی ناک کے پاس سے گزری ہے اور اس نے اپنے ہاتھ کی حرکت سے اڑا دی۔ (بخاری)

آیت کا حاصل یہ ہے کہ

اس ذلت ومسکنت وغضبِ الٰہی کا باعث ان کا کفر اور انبیاء علیہم السلام کا قتل کرنا تھا اور اس کفر وقتل کا باعث احکام کی نافرمانی اور حدودِ شرع سے خروج تھا[1]

مدارِ نجات وسعادت

آیت کا آغاز اِنَّ سے کیا ہے اور بغیر کسی رابطہ کے بات کہی گئی ہے۔ بلاغت کی زبان سے اس قسم کا اندازِ بیان ماحول میں یا مخاطبوں کے ذہنوں میں کسی اٹھتے ہوتے سوال کا جواب دینے کے لیے اختیار کیا جاتا ہے اور اِنَّ بات کی پیشانی پر اُس وقت لگایا جاتا ہے جب مخاطب میں بات کے لیے انکار کی خلش ہو۔ بنی اسرائیل ان ساری شقاوتوں کے باوجود اس بات کے مدعی تھے کہ نجات صرف یہودیت میں ہے اور بنی اسرائیل خواہ کچھ کریں ان کو بہرحال جنت میں جانا ہے۔ قرآن ان

---

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۱۳

کے ذہنوں میں اس اُٹھتے ہوئے سوال کا جواب اس آیت میں دے رہا ہے اور بتا رہا ہے کہ مدارِ نجات دعویٰ اور نسبت نہیں بلکہ مدارِ نجات صرف ایمان اور عملِ صالح ہے خواہ کسی نسل سے تعلق رکھتا ہو۔ ایک مسلمان اگر ایمان و عمل کی نعمت نہیں رکھتا ہے تو وہ بھی اسی طرح نجات سے ہمدوش نہ ہوگا۔ جیسے ایک یہودی، ایک عیسائی اور ایک صابی۔

یعنی کسی خاص فرقہ پر موقوف نہیں یقین لانا شرط ہے اور عمل نیک ہو جس کو یہ نصیب ہوگا ثواب پایا۔ یہ اس واسطے فرمایا کہ بنی اسرائیل اس پر مغرور تھے کہ ہم پیغمبروں کی اولاد ہیں، ہم ہر طرح اللہ کے نزدیک بہتر ہیں [1]

۱۶۷ - جو مسلمان ہیں الذین آمنوا قرآن میں جہاں بھی مطلق صورت میں آیا ہے اس سے مراد مسلمان ہی ہیں۔ یہاں بھی مسلمان ہی مراد ہیں۔ قرآن نے مواقع خطاب میں یہی لفظ بولا ہے گویا مومنین اور الذین آمنوا مسلمانوں کا نام ہے اور حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کے متبعین کے لیے خاص ہے۔

یہاں مسلمانوں کا ذکر کیوں کیا گیا ہے؟ ــــ اس لیے تاکہ دُنیا کو یہ پتہ لگ جاتے کہ نجات کا یہ قانون عام یگانوں اور بیگانوں سب کے لیے ہے۔ صرف دعویٰ اور نسبت کا غرّہ ایمان و عمل کے بغیر مسلمان کے لیے بھی کافی نہیں ہے۔ نیز الذین آمنوا کے ذکر سے بات میں ایک وزن پیدا ہوگیا ہے۔

اس کی مثال ایسی ہے کہ کوئی حاکم یا بادشاہ یوں کہے کہ ہمارا قانون عام یہ ہے خواہ کوئی موافق ہو یا مخالف۔ جو بھی طاعت کرے گا وہ موردِ عنایت ہوگا۔ ظاہر ہے کہ موافق تو طاعت کر ہی رہا ہے سنانا اصل میں مخالفین کو ہے۔ لیکن اس میں نکتہ یہ بتانا ہے کہ موافقین پر ہماری عنایت کی وجہ کوئی ذاتی خصوصیت نہیں بلکہ ان کی طاعت ہی ہماری عنایات کی علت ہے۔ اگر مخالف بھی اس کو اختیار کرے تو وہ بھی ان کے برابر ہو سکتا ہے [2]

۱۶۸ - جو یہودی ہیں۔ عربی میں لفظ الذین ھادو ہے۔ ھاد اور ھود دونوں کے معنے یہودی ہونے کے ہیں۔ ہود مصدر سے بنا ہے جس کے معنے پشیمان ہونا، حق کی طرف لوٹ آنا ہے۔ یہ لوگ چونکہ بچھڑے کی پوجا سے توبہ کرکے حق کی طرف لوٹے تھے اس لیے یہود کہلاتے۔ اور ھادوا کے معنے ہوتے دینِ یہود کے پیروکار۔

۱۶۹ - نصاریٰ۔ جمع نصرانی کی۔ فلسطین میں ایک قصبہ ناصرہ ہے۔ یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام

---

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۱۳ [2] بیان القرآن ص ۳۶

کاآبائی وطن ہے اور آپ کو یسوع ناصری اسی نسبت سے کہاجاتا ہے۔ نصرانی کا انتساب اسی قصبہ کی طرف ہے۔ یا نصرانی کی وجہ تسمیہ شاید یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں نے انصار اللہ کہا تھا۔ تو جو لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مذہب کے مدعی ہیں وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف منسوب ہو گئے۔ (قاموس)

یہاں بعض معاصر مفسرین ایک سنگین غلط فہمی کا شکار ہو گئے ہیں کہ قرآن یہاں مسیحوں کا نہیں بلکہ نصاریٰ کا ذکر کر رہا ہے۔ مسیحی وہ ہیں جو اناجیل اربعہ پر یقین رکھتے ہیں۔ حضرت مسیح کو خدا کا نبی نہیں بلکہ خدا کا بیٹا مانتے ہیں۔ آخرت میں نجات دینے والا خدا کو نہیں بلکہ مسیح کو مانتے ہیں۔ اور خدائی کو تین اقنوموں میں تقسیم کر کے ایک ناقابلِ فہم فلسفہ بیان کرتے ہیں۔ اس کھلے ہوتے شرک کا ذکر ہرگز اس مقام پر مقصود نہیں ہے۔ اس لیے نام نصاریٰ بولا گیا ہے۔ نصرانی حضرت مسیح کے سچے پیرو نبی کو نبی مانتے والے ابتدائی زمانہ میں کہلاتے تھے۔ یہ توحید کے قائل تھے اور بجائے اناجیل اربعہ کے صرف انجیل متی کو مانتے تھے۔

ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ یہ تفصیل خود معاصر کے ذہن و فکر کی اختراع ہے۔ ورنہ قرآن وسنت میں ایسی کوئی تفصیل موجود نہیں۔ قرآن اپنے زمانہ نزول میں نصاریٰ کو مخاطب کر رہا ہے۔ قرآن نے نصاریٰ کے عقیدوں کی جن مقامات پر تردید کی ہے وہاں ابنیت کو نصاریٰ کا کارنامہ بنا کر تردید کی ہے۔

قَالَتِ النَّصَارَى الْمَسِيحُ ابْنُ اللَّهِ

سورۃ مائدہ میں ـــــ مِنَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّا نَصَارَىٰ کہہ کر ان کے اس عقیدے کو کفر قرار دیا ہے۔ سورۃ توبہ میں ان کے مشرکانہ عقائد کا تذکرہ کیا ہے۔ اس لیے نصرانی اور مسیح کی یہ تفریق قرآن کی بیان کردہ تحقیق کے سرتاسر خلاف ہے۔ خبر نہیں اس تفصیل سے موصوف کا مقصد کیا ہے؟

۱۷۱۔ صابی۔ فرقہ صابی۔ دینِ حنیف اور ملتِ ابراہیمؑ کا متبع۔ یعنی حنفاء کے مقابل فرقہ کا نام ہے۔ صابی کی جمع صابئون اور صابئین آتی ہے۔ اس لفظ کے عربی ہونے میں اختلاف ہے۔ امام ابوالقاسم سہیلیؒ نے روض الانف میں اس کو عجمی بتایا ہے۔ اگر یہ عربی ہو تو یہ صباء سے ہے جس کے معنے صابی ہونے اور ایک دین سے دوسرے دین میں ہونے کے ہیں۔ علامہ شوکانیؒ فتح القدیر میں رقم طراز ہیں۔ صابئین صابی کی جمع ہے اور بعض نے صاب کی جمع کہا ہے۔ اور قاریوں نے اس میں اختلاف کیا ہے۔ چنانچہ بجز امام نافع قاریؒ کے سب نے اس کو ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

جس نے اسے ہمزہ سے کہا ہے اس نے صبات النجوم سے قرار دیا ہے جو ستاروں کے طلوع ہونے کے لیے بولا جاتا ہے۔ اور جس نے بغیر ہمزہ کے پڑھا ہے وہ اسے صبیٰ سے بناتے ہیں جس کے معنے مائل ہونا ہیں۔ لغت میں صابی وہ شخص ہے جو ایک دین سے نکل کر دوسرے دین کی طرف مائل ہو۔ اس لیے جب کوئی شخص اسلام لاتا تھا تو عرب کہتے تھے کہ قد صبأ وہ بے دین ہوگیا۔ فرقہ صابیہ کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ وہ یہود اور نصاریٰ کے دین سے ہٹ کر ستاروں کے پرستار ہو گئے۔ (فتح القدیر ج ۱ ص ۸۹)

اور مولانا سید سلیمان ندوی فرماتے ہیں کہ:

لفظ صابئی کی لغوی تشریح بھی کسی قدر تفصیل طلب ہے۔ کہتے ہیں کہ صبا عبری لفظ صبع کا آرامی تلفظ ہے۔ صبع عربی لفظ صبغ کے ہم معنی ہے جس سے عربی میں دوسرا لفظ اصطباغ بنا ہے اس کے اصلی معنے دھونے اور نہانے کے ہیں اور اصطلاحاً بپتسمہ کے معنے میں بولا جاتا ہے۔ چونکہ یہ فرقہ مذہباً دن میں کئی مرتبہ غسل کرتا تھا اس لیے ان کا آرامی نام صابئی پڑا اور اسی سے عربی میں آیا۔

یہاں تک تو اس لفظ کی تشریح لغوی کا تعلق تھا۔ باقی رہی تاریخی تشریح کہ صابئین کون تھے۔ اور اُن کے عقائد کیا ہیں؟ اس کے متعلق سید صاحب رقمطراز ہیں کہ:

حافظ ابن تیمیہ نے صابئین کی تحقیق پر الرد علی المنطقیین میں جو کچھ لکھا ہے وہ محققانہ ہے۔ ہم اس کا لفظ بہ لفظ ترجمہ کر دیتے ہیں۔

ان صابئین کا خاص مرکز حرّان تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام یہیں پیدا ہوتے تھے یا عراق سے یہاں آئے تھے۔ دونوں قول ہیں۔ یہاں علت اولیٰ، عقل اول اور نفس کلیہ کے ہیکل تھے۔ نیز زحل، مریخ، مشتری، شمس، زہرہ، عطارد اور قمر کے ہیکل تھے۔ عیسائیت سے پہلے ان کا یہی مذہب تھا۔ عیسائیت کے بعد ان میں عیسائیت پھیلی۔ یہاں تک کہ اسلام آیا اور یہ صابئین فلاسفہ حکومتِ اسلامی میں آخر وقت تک موجود رہے۔ ان ہی میں سے وہ صابئین تھے جو بغداد وغیرہ میں طبیب ومنشی تھے۔ ان میں سے اسلام نہ لائے۔ چوتھی صدی ہجری میں جب فارابی حرّان گیا تو ان ہی سے فلسفہ سیکھا۔ اہلِ دمشق کا مذہب بھی عیسائیت سے پہلے یہی تھا۔ ان کی نماز کا قبلہ قطب شمالی تھا۔ اسی لیے دمشق میں بہت سی پرانی مسجدیں ہیں جن کا ایک قبلہ قطب شمالی بھی ہے۔ دمشق کی جامع مسجد کے پاس ایک بہت بڑا معبد ہے۔

حافظ ابن تیمیہ نے اس کے بعد صابئین کی دو قسمیں کی ہیں۔ ایک موحدین، یہ وہ ہیں جنہوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ملت کی پیروی کی۔ دوسری جماعت وہ تھی جو مشرک تھی۔ قرآنِ حکیم نے

حیثیتوں سے ذکر کیا ہے۔ ایک میں اوّل کا ذکر ہے اور دوسرے میں دوم کا۔[1]

اس موضوع پر ابوبکر الجصاصؒ نے بھی تفصیلی بحث کی ہے لیکن ہم اسے پارہ چھ کے لیے اٹھا رکھتے ہیں۔ یہاں دائرۃ المعارف الاسلامیہ کا اقتباس پیش کرتے ہیں۔ دائرۃ المعارف کے مؤلفین کی اس موضوع پر تحقیق نہ صرف یہ کہ حافظ ابن تیمیہؒ کی تحقیق سے ہم آہنگ ہے بلکہ کچھ اضافہ بھی ہے۔

صابیہ دو فرقوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

پہلا فرقہ مندیا۔ انگریزی میں MANDIAN کہتے ہیں۔ یہ فرقہ یہودیت اور نصرانیت کا ایک معجون ہیں۔ اگرچہ نصرانی نہیں لیکن بپتسمہ کو مانتے ہیں اور عراق میں حضرت یحییٰ علیہ السلام کے پیروکار ہیں۔

دوسرا فرقہ صابیہ حران ہے۔ یہ فرقہ ستارہ پرست ہے۔ اس کو ایک عرصہ دراز تک اسلام کے سائے میں وقت گزارنے کا موقع ملا ہے۔ ان میں سے بہت ارباب فن اور اہلِ علم ہوئے ہیں۔ یہ بات صاف ہے کہ قرآن میں یہود و نصاریٰ اور صابین کا جس مقام پر ذکر ہے وہاں فرقہ مندیا مراد ہے۔ اور اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ صابیہ عربی لفظ صبا سے بنا ہے جس کے معنے نہانے کے ہیں۔ عربی میں اگر عین گر گیا اور صبارہ گیا ہے تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ قطعاً معمدانیین ہی ہیں۔ صابیہ مشرکہ نے یہ نام محض یہود و نصاریٰ کے ساتھ اسلام کی فراخ حوصلگی کو دیکھ کر اپنے لیے استعمال کیا ہے ورنہ اصل میں صابی معمدانیین ہی ہیں۔

عرب مصنفین نے جن صابیہ کے حالات بیان کیے ہیں وہ صابیہ حران ہیں۔[2]

تاریخ ایران پر ایک مستند مستشرق کی کتاب کا اُردو ترجمہ حال ہی میں نکلا ہے (انجمن ترقی اُردو دہلی)، اس کے صفحہ ۴۷ پر فاضل مترجم ڈاکٹر شیخ محمد اقبال اورینٹل کالج لاہور مینڈین (MANDIAN) پر حاشیہ دیتے ہیں کہ:

مینڈین بزبان آرامی اولوالعلم۔ اس فرقہ کے لوگ اب بھی موجود ہیں اور صابین کہلاتے ہیں۔ وہ لوگ اگرچہ عیسائی نہیں تاہم جان دی بپسٹ کو مانتے ہیں۔ عراق میں عوام الناس ان کو حضرت یحییٰ علیہ السلام کی اُمت کہتے ہیں۔ (ایران بہ عہد ساسانیاں)

۱۷ا۔ جو بھی اللہ اور یوم آخر پر ایمان رکھتے ہوئے عمل صالح کرے اس کو ایمان و عمل کا اجر ضرور ملے گا۔ مطلب یہ ہے کہ نجات کا ضابطہ سب کے لیے ایک ہے۔ دعویٰ اور نسبت پر کسی کی نجات

---

[1] منات القرآن　[2] دائرۃ المعارف الاسلامیہ ج ۱ ص ۸۶

نہ ہوگی۔ نجات سب کی ایمان اور عملِ صالح سے ہوگی۔ یہ یہودیوں کے اس دعوے کا جواب ہوا کہ ہم تو نیکوں کی اولاد ہیں یا ہم تو اللہ کے لاڈلے ہیں۔ یا ہم تو صرف چالیس دن دوزخ میں جائیں گے۔ ان کو بتا دیا کہ اعتقاد صحیح اور عمل صحیح بس یہی دو نجات کی شرطیں ہیں گویا انسان کو یہ بشارت پہلی بار کھلے لفظوں میں پہنچی ہے کہ اصل شے عقیدہ اور عمل ہے اور ان دو کی تصحیح کے بعد قوم، نسل، نسب اور نسبت سب ہیچ ہیں۔

آیت میں ایمان باللہ کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ خدا کو ایک مان لیا جائے اور بس۔ بلکہ اس کا صاف اور واضح مطلب یہ ہے کہ اللہ کو الٰہ تسلیم کیا جائے اور اللہ کے سوا کسی کو الٰہ نہ مانا جائے۔ ایمان کی یہی دعوت دُنیا میں آنے والے پیغمبروں کا سب سے پہلا دعوتی کلمہ اور سب سے پہلا مطالبہ ہے۔ اور اللہ کو الٰہ بنانے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی کی مرضی کی اطاعت اور اس کی بندگی و عبادت کو اپنے وجود کا آخری مقصد اور اپنی پیدائش کا نصب العین یقین کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ اگر ایمان یہی ہے جس پر نسلِ انسانی کی نجات اور کامیابی موقوف ہے تو پھر اللہ کو الٰہ بنانے کے لیے اللہ کی مرضی کا صحیح علم جب تک حاصل نہ ہو ایمان باللہ کا وجود کیسے ہوگا۔ اور خدا کی مرضی کا علم حاصل ہونے کا واحد ذریعہ اللہ کی وحی ہے اور جن پر خدا کی وحی آتی ہے اُن کو ہی قرآن کی زبان میں نبی اور رسُول کہتے ہیں۔

جو لوگ ایمان باللہ کا مطلب خدا کو ایک ماننا سمجھتے ہیں پتہ نہیں ان کی مراد کیا ہے؟ کیا وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہر وہ شخص جو خدا کو ایک مان لے بس موحّد ہے۔ اگر ایمان باللہ کا مطلب یہ ہے کہ عالم کو پیدا کرنے اور اس کے نظم و ترتیب کو قائم رکھنے والے کو ایک مانا جائے اور یہی ایمان مطلوب ہے تو پھر قرآن کی ان آیتوں کا کیا مطلب ہے جن میں بار بار مسلسل اور مختلف طریقوں سے یہ اعلان کیا گیا ہے کہ اس کے ماننے والے مشرکینِ مکہ بھی ہیں۔

اس آیت کا ہرگز یہ مقصد نہیں کہ صرف خدا کو مان کر عملِ صالح کرنے والا نجات یافتہ ہے۔ نہ سیاق و سباق اس کی اجازت دیتا ہے اور نہ نبوّت کی دعوت اس کی ہمنوائی کرتی ہے۔

سلسلۂ عبارت کو پیشِ نظر رکھنے سے یہ بات خود بخود واضح ہو جاتی ہے کہ یہاں ایمان کی تفصیلات بیان کرنا مقصود نہیں ہے۔ یہاں تو یہودیوں کے اس زعمِ باطل کی تردید مقصود ہے کہ وہ صرف یہودی گروہ کو نجات کا اجارہ دار سمجھتے تھے۔ وہ اس خیالِ خام میں مبتلا تھے کہ ان کے گروہ سے اللہ کا کوئی ایسا رشتہ ہے جو دوسرے انسانوں سے نہیں ہے۔ لہٰذا جو ان کے گروہ سے تعلق رکھتا

ہے وہ خواہ اعمال و عقائد کے لحاظ سے کیسا ہی ہو بہر حال نجات اس کے لیے مقدر ہے۔ اور باقی تمام انسان جو ان کے گروہ سے باہر ہیں وہ صرف جہنّم کا ایندھن ہیں۔ اس غلط فہمی کو دُور کرنے کے لیے فرمایا جارہا ہے کہ اللہ کے یہاں اصل چیز تمہاری گروہ بندی نہیں بلکہ وہاں جو کچھ اعتبار ہے وہ ایمان اور عملِ صالح کا ہے۔ جو انسان بھی یہ چیز لے کر آئے گا وہ اپنے رب سے اجر پائے گا[۵]

اور ایمان بھی وہ لے کر آئے گا جس کا مطالبہ بنی اسرائیل سے آغاز ہی میں آمِنُوا بِمَا أَنزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُونُوا أَوَّلَ كَافِرٍ بِهِ میں کیا ہے۔ اپنا مفروضہ ایمان نہیں۔ مطلب صاف ہے کہ جو قوم مسلمان کہلاتی ہے یا یہود و نصاریٰ یا صابی یا کچھ اور۔ تمثیلاً چند مذاہب کا ذکر کیا گیا ہے۔ کوئی شخص ان ناموں کی بدولت یا نسل، رنگ، پیشہ، وطن وغیرہ احوال و خصائص کے لحاظ سے حقیقی فلاح و کامیابی حاصل نہیں کر سکتا۔ کامیاب، مامون، مصئون ہونے کا صرف ایک اور صرف ایک معیار ہے۔ ایمان اور عملِ صالح۔ جس طبقہ کو اپنے مقربِ الٰہی یا کامیاب ہونے کا دعویٰ ہو وہ اسی کسوٹی پر اپنے کو کس کر دیکھ لے۔ اگر اس پر کھرا اُترے تو بے خوف و خطر مفلح و کامیاب ہے ورنہ ہر وقت اپنے کو خدا کے قہر و غضب کے نیچے سمجھے۔ پچھلی آیات میں خاص یہودیوں کو دعوتِ ایمان کے بعد ان پر انعامات کا ذکر اور ان کی قومی سیرت کے دھبوں کا تذکرہ تھا۔ اس آیت میں تمام اقوام و ملل کے سامنے بلا رو رعایت ایسا عجیب و غریب معقول اور منصفانہ ضابطہ پیش کیا گیا ہے جس کے بعد کسی سلیم الفطرت انسان کو اسلام کی صداقت اور ہمہ گیری میں شُبہ نہیں رہ سکتا۔ ایک شخص جب تک خدا پر ایمان نہ لاتے اور روزِ جزا کو نہ مانے اور نیکی اختیار نہ کرے کیا عقلِ سلیم قبول کر سکتی ہے کہ وہ نعیم دائم رضائے حق اور سرورِ ابدی سے ہمکنار ہو سکتا ہے۔ ایمان باللہ کے تحت میں اللہ کو الٰہ ماننا اور الٰہ ماننے کے ساتھ اس کے لوازم کو قبول کرنا داخل ہے۔ جو شخص کسی ایک پیغمبر کی تکذیب کرتا ہے اور اس کو قبول نہیں کرتا وہ فی الحقیقت اللہ کو نہیں مانتا ہے۔ اس کے ایمان باللہ کا دعویٰ جھوٹا ہے۔

قرآن نے اسی سورت میں ایمان کی راہ یہ بتلائی ہے۔

وَالَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِمَا أُنزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنزِلَ مِن قَبْلِكَ وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ۔

اور اسی ایمان کے بارے میں یہ اعلان کیا ہے کہ

أُولَٰئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِّن رَّبِّهِمْ

---

[۵] تفہیم القرآن ج ۱ ص ۸۰

اور اسی ایمان ہیں دُنیا و آخرت کی فلاح وسعادت کو مقصور کیا ہے۔ یعنی اس سے باہر فلاح وسعادت کا کہیں تصور بھی نہیں ہو سکتا۔ اور اسی لیے تفریق بین الرسل کو ایک بہت بڑی گمراہی قرار دیا ہے۔

قرآن نے تفریق بین الرسل کو انکار کی راہ قرار دیا ہے اور ایمان کی راہ یہ بتلائی ہے کہ بلا تفریق سب کی تصدیق کی جائے۔ وہ کہتا ہے کہ یہاں راہیں صرف دو ہیں تیسری نہیں ہو سکتی۔ ایمان کی راہ یہ ہے کہ سب کو مانو، انکار کی راہ یہ ہے کہ سب کا یا کسی ایک کا انکار کر دو۔ یہاں کسی ایک کا انکار بھی وہی حکم رکھتا ہے جو سب کے انکار کا ہے[1]

۱۷۲ ۔ نہ ان کو ڈر ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ حافظ ابن تیمیہؒ نے اس آیت میں دونوں جملوں کے تعفن سے بڑا ہی لطیف استنباط فرمایا ہے۔ آیت میں پہلا جملہ لَاخَوْفٌ عَلَيْهِمْ ہے جس کے معنے ہیں ان کو کوئی ڈر نہیں ہے۔ یہ نہیں فرمایا کہ لَا يَخَافُونَ وہ نہیں ڈریں گے۔ اور دوسرا فقرہ وَلَاهُمْ يَحْزَنُونَ وہ غمگین نہ ہوں گے۔ یہ نہیں فرمایا لَاحُزْنَ لَهُمْ ان کو کوئی غم نہیں ہے۔ پہلے جملہ میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ روزِ قیامت اُن کو اللہ کا ڈر ہوگا۔ حساب کا اندیشہ ہوگا۔ اس لیے حال کی نفی فرمائی ہے مستقبل کی نفی نہیں فرمائی ہے۔ اور دوسرے جملہ میں غم کے مستقبل میں نہ ہونے کی خبر دی ہے۔ اس میں اشارہ ہے کہ ان کو کسی حال میں غم سے دوچار نہیں ہونا پڑے گا، نہ قبر میں نہ میدانِ حشر میں۔

یاد رہے کہ قرآن میں یہ پیرایۂ بیان بارہ مقام پر آیا ہے۔ سب سے پہلے اسی سورت میں فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ ..... الخ وہاں اس سے پہلے انبیاء کی آمد کا تذکرہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو پیامِ ہدایت اللہ کی جانب سے رسولوں کے ذریعے آتے گا جو شخص اس کی پیروی کرے گا اُسے نہ ڈر ہے اور نہ رنج ہوگا۔ دوسرا یہ موقعہ ہے مَنْ آمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا ...... الخ تیسرے آیت ۱۱۲ البقرہ میں بَلٰى مَنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهُ أَجْرُهُ عِنْدَ رَبِّهِ وَلَاخَوْفٌ .... الخ یعنی اسلام اور احسان دونوں جمع ہوں تو اس کو نہ کوئی ڈر ہے اور نہ غم ہوگا۔ ۴۔ آیت ۲۶۲۔ اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ أَمْوَالَهُمْ فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ مَا أَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَا أَذًى لَّهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَاخَوْفٌ .... الخ یعنی راہِ خدا میں کسی کو کچھ دیتے ہیں اور دے کر احسان نہیں جتاتے اور اپنے برتاؤ سے تکلیف نہیں دیتے ان کو نہ ڈر ہے اور نہ غم ہوگا۔ ۵۔ آیت ۲۷۷ البقرہ۔ اِنَّ

[1] ترجمان القرآن ص ۸۷

اَلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ لَھُمۡ اَجۡرُھُمۡ عِنۡدَ رَبِّھِمۡ وَلَا خَوۡفٌ عَلَیۡھِمۡ ..... الخ یعنی جو لوگ ایمان لاتے اور عملِ صالح کے ساتھ اقامتِ صلوٰۃ اور زکوٰۃ کی ادائیگی کرتے ہیں ان کو نہ ڈر ہے اور نہ غم ہوگا۔ ۶- اور اسی رکوع کی آیت ۲۷۴ اَلَّذِیۡنَ یُنۡفِقُوۡنَ بِالَّیۡلِ وَالنَّھَارِ سِرًّا وَّعَلَانِیَۃً فَلَھُمۡ اَجۡرُھُمۡ عِنۡدَ رَبِّھِمۡ وَلَا خَوۡفٌ ... الخ یعنی جو لوگ خلوت و جلوت میں خرچ کرتے رہتے ہیں اُن کو نہ ڈر ہے اور نہ غم ہوگا۔ ۷- آیت ۱۷۰ آلِ عمران میں شہداء کے بارے میں ہے اَنۡ لَّا خَوۡفٌ ... الخ۔ ۸- آیت ۶۹ مائدہ میں ہے مَنۡ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَھُمۡ اَجۡرُھُمۡ ... الخ۔ ۹- آیت ۴۸ سورۂ انعام میں انبیاء کی بعثت کا ذکر کرکے فرمایا مَا نُرۡسِلُ الۡمُرۡسَلِیۡنَ اِلَّا مُبَشِّرِیۡنَ وَمُنۡذِرِیۡنَ فَمَنۡ اٰمَنَ وَاَصۡلَحَ فَلَا خَوۡفٌ عَلَیۡھِمۡ ... الخ یعنی جو اللہ کے رسولوں پر ایمان لائے گا اور عمل صالح کرے گا اس کو نہ ڈر ہے اور نہ غم ہوگا۔ ۱۰- آیت ۳۵ سورۂ اعراف میں انبیاء کی روانگی کے موضوع پر آیا ہے یٰبَنِیۡۤ اٰدَمَ اِمَّا یَاۡتِیَنَّکُمۡ رُسُلٌ مِّنۡکُمۡ یَقُصُّوۡنَ عَلَیۡکُمۡ اٰیٰتِیۡ فَمَنِ اتَّقٰی وَاَصۡلَحَ فَلَا خَوۡفٌ ... الخ یعنی جو شخص رسول کی نافرمانی سے بچ کر رہے اور اپنی اصلاح کرے گا تو اُسے نہ ڈر ہے ... الخ۔ ۱۱- اولیاء اللہ کے بارے میں ہے لَا خَوۡفٌ عَلَیۡھِمۡ وَلَا ھُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ۔ ۱۲- آیت ۱۳ سورہ احقاف میں ہے اِنَّ الَّذِیۡنَ قَالُوۡا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسۡتَقَامُوۡا فَلَا خَوۡفٌ یعنی جن لوگوں نے اللہ کے رب ہونے کا اعلان کیا اور اس پر قائم رہے اُن کو نہ ڈر ہے اور نہ غم ہوگا۔

اس آیت کا مطلب مقرر کرنے کے لیے ان سب آیات کو پیشِ نظر رکھیے۔ ان آیات کی روشنی میں مطلب اس کے سوا کیا ہے کہ جو شخص نبوّت کی وساطت سے نبی کو مان کر اللہ کی وحی کی روشنی میں زندگی ایسی بنالے کہ اس میں ایمان کے ساتھ طاعت کی سرشاریاں ہوں اور طاعت میں حسن ہو، سر سے ٹالنے والی بات نہ ہو، سراپا اخلاص ہو۔ اللہ کے راستہ میں خلوت و جلوت میں خرچ کرتا ہو۔ خرچ کرکے احسان نہ جتاتا ہو۔ نماز قائم کرتا ہو، زکوٰۃ کی ادائیگی کرتا ہو۔ نبوّت کی نافرمانی سے بچ کر رہے اور توحید کے اقرار و عمل پر آخر وقت تک قائم رہے، نجات اس کی ہوگی۔

ان بارہ آیتوں میں سے ڈر نہ ہونے کی بشارت تین آیتوں میں نبوّت ملنے والوں کو دی گئی ہے — اسی لیے حافظ ابنِ تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ :

ایمان باللہ اور ایمان بالرسل دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ جو لوگ رسول کی تصدیق نہیں کرتے وہ یقیناً مشرک ہوتے ہیں اور جو مشرک ہوتے ہیں وہ بلاشبہ رسولوں کی تکذیب کرتے ہیں۔ اس

وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّورَ خُذُوا مَا آتَيْنَاكُمْ بِقُوَّةٍ وَاذْكُرُوا مَا فِيهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ۝ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِنْ بَعْدِ ذَٰلِكَ ۖ فَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ لَكُنْتُمْ مِنَ الْخَاسِرِينَ ۝

اور اپنی تاریخ حیات کا وہ واقعہ بھی یاد کرو جب ہم نے تم سے عہد و پیمان لیا تھا۔ حالت یہ تھی کہ کوہِ طور تم پر ہم نے بلند کر رکھا تھا اور تم نیچے کھڑے تھے کہ ہم نے جو کتاب تمہیں دی ہے اُسے پوری مضبوطی اور قوت سے اپناؤ اور جو کچھ ان ہدایات میں ہے اس کو یاد رکھو تاکہ تم میں باغیانہ میلانات ختم ہوں اور متقیانہ سیرت آئے۔ لیکن اس کے باوجود تم اس پر قائم نہ رہ سکے اور اپنے عہد سے پھر گئے۔ پس اگر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت تمہاری دستگیری نہ کرتی تو تم تو تباہی کا نشانہ بن چکے ہوتے۔

لیے جو شخص شرک کی کسی نوع میں مبتلا ہو گا وہ ان کا دشمن اور ان کے پیغام کا مخالف ہو گا۔
(الصارم المسلول)

اور الرد علی البکری میں ایمان باللہ اور ایمان بالرسول کا خلاصہ ان لفظوں میں بیان کیا ہے:
دین اسلام کے دو اصول ہیں۔ اوّل یہ کہ ہم ایک اللہ کی عبادت کریں۔ دوسرے یہ کہ ہم اس طریقے سے عبادت کریں جو نبوت کے بتائے ہوئے طریقے ہوں۔ یہی لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی حقیقت ہے جو شخص ان میں سے کسی ایک کو چھوڑ دے گا اس کا نہ دین معتبر ہے اور نہ کوئی عمل۔
(الرد علی البکری ص ۵۳)

اللہ سے عہد شکنی

پچھلی آیات میں بنی اسرائیل کی مسلسل نافرمانیوں کی داستان سنانے کے بعد نہایت حکیمانہ بلیغ انداز میں یہ بتایا تھا کہ ساری برائیوں کے باوجود رحمت و مغفرت کی راہیں سب کے لیے کھلی ہوئی ہیں۔

ضرورت صرف ایمانِ صحیح اور عملِ صحیح کی ہے۔ اس خوشخبری کے بعد اس آیت میں ایک ایسے واقعہ کا ذکر کیا گیا ہے جس میں ان کی بدکرداری نے عقوبت و عذاب کو دعوت دے دی تھی لیکن اللہ کی رحمت عذاب کی راہ میں آڑے آگئی۔ یہ واقعہ قرآن میں مختلف مقامات پر بیان کیا گیا ہے۔ تورات میں اس واقعہ کی کچھ مجمل سی کیفیت درج ہے۔ وہ پہاڑ کے نیچے آ کھڑے ہوئے اور کوہِ سینا پر زیر و بالا دھواں تھا۔ کیونکہ خداوند شعلہ میں ہو کر اس پر اترا اور تنور کا سا دھواں اس پر اٹھا اور پہاڑ اسرائیل کے سروں پر ہل گیا۔ اور تالمود جو تورات کی مشہور و مستند شرح یہود کے ہاں موجود ہے۔ اس میں اس اجمال کی تفصیل میں اقوال ذیل درج ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے اوپر کوہِ سینا کو الٹ دیا جس طرح کوئی بڑا ظرف الٹ دیا جاتا ہے۔ اور کہا کہ اگر تم تورات کو قبول کرتے ہو جب تو خیر ورنہ سب یہیں دفن کر دیے جاؤ گے (جیوش انسائیکلو پیڈیا ج ۴ ص ۳۲۱) خدا نے پہاڑ کو ان پر الٹ کر اوندھا کر دیا اور ان سے کہا کہ اگر تورات کو قبول کرتے ہو جب تو خیر ورنہ یہیں تمہارا مدفن بن کر رہیگا۔ (ایضاً)[1]

۱۷۳ ۔ طور۔ عربی زبان میں طور کے معنے پہاڑ کے ہیں لیکن بعض اہلِ لغت نے تصریح کی ہے کہ مطلق پہاڑ کو طور نہیں کہتے جب تک وہ درختوں سے ہرا بھرا نہ ہو۔ عرب کے مشہور جغرافیہ نویس اور ادیب علامہ یاقوت حموی رومی، وفات ۶۲۶ھ اپنی کتاب معجم البلدان میں لکھتے ہیں۔ طور عربی زبان میں پہاڑ کو کہتے ہیں اور بعض اہلِ لغت نے بیان کیا ہے کہ جب تک پہاڑ میں درخت نہ ہو طور نہیں کہتے۔ امام بخاریؒ نے امام مجاہدؒ سے نقل کیا ہے کہ سریانی زبان میں طور پہاڑ کو کہتے ہیں۔ اور ضحاکؒ کہتے ہیں کہ نبطی زبان میں طور کے معنے پہاڑ کے ہیں۔ ان تصریحات سے پتہ چلتا ہے کہ عربی، سریانی اور نبطی زبانوں میں طور کا استعمال یکساں ہے۔ قرآن میں طور کا استعمال ایک مخصوص پہاڑ کے لیے ہوا ہے۔ چنانچہ الطور میں میں الف لام اس کی دلیل ہے۔ جدید جغرافیہ نویس کہتے ہیں کہ طور کا اطلاق جزیرہ نما سینا کے متعدد پہاڑوں پر ہوا ہے لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کے سلسلے میں جبلِ طور سے مراد جبلِ سینا ہے۔ لیکن خود سینا کی کوئی ایک چوٹی نہیں ہے متعدد چوٹیاں ہیں انہی میں سے کسی کا نام طور ہے۔[2]

۱۷۴ ۔ ہم نے کوہِ طور تم پر بلند کر دیا تھا۔ کہتے ہیں کہ تورات نازل ہوئی تو بنی اسرائیل شرارت

---

[1] تفسیر ماجدی ص ۱۸۱   [2] لغات القرآن ج ۴ ص ۲۲

سے کہنے لگے کہ تورات کے حکم تو مشکل اور بھاری ہیں ہم سے نہیں ہو سکتے تب اللہ تعالیٰ نے ایک پہاڑ کو حکم کیا جو ان سب کے سروں پر اترنے لگے اور سامنے آگ پیدا ہوئی سرتابی کی گنجائش بالکل نہ تھی مجبوراً تورات کے احکام کو قبول کر لیا [1]

اس واقعہ کو قرآن میں مختلف مقامات پر جس انداز سے بیان کیا گیا ہے اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ اس وقت بنی اسرائیل میں یہ ایک مشہور واقعہ تھا لیکن اب اس کی تفصیلی کیفیت معلوم کرنا مشکل ہے۔ بس مجملاً یوں سمجھنا چاہیے کہ پہاڑ کے دامن میں میثاق لیتے وقت ایسی خوفناک صورتِ حال پیدا کر دی گئی تھی کہ ان کو ایسا معلوم ہوتا تھا گویا پہاڑ ان پر آ پڑے گا [2]

ایک شبہ کا ازالہ

باقی رہا یہ شبہ کہ پہاڑ سروں پر معلق کر کے تسلیم کرانا یہ تو صاف اکراہ واجبار ہے جو قرآن کی آیت لا اکراہ ... الخ اور نیز قاعدہ تکلیف کے خلاف ہے۔ کیونکہ بنائے تکلیف تو اختیار ہے اور اکراہ و اختیار میں تضاد ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اکراہ دربارہ قبول ہرگز نہیں ہے۔ دین تو بنی اسرائیل پہلے سے قبول کیے ہوئے تھے اور بار بار حضرت موسیٰ علیہ السلام سے تقاضہ کرتے تھے کہ کوئی کتاب متضمن احکام ہم کو لا کر دو اس پر عمل کریں اور اس پر معاہدہ کر چکے تھے۔ جب تورات ان کو دی گئی تو عہد شکنی پر کمربستہ ہوئے تو اب پہاڑ کا معلق کرنا نقضِ عہد سے روکنے کے لیے تھا نہ کہ قبولِ دین کے لیے [3]

مطلب یہ ہے کہ ایمان لانے پر اکراہ نہیں بلکہ اوّل اپنی خوشی سے ایمان و اسلام قبول کر لینے اور اس کے خلاف بغاوت کرنے کی وجہ سے ہے۔ باغیوں کی سزا تمام حکومتوں میں بھی عام مخالف اور دشمن قوموں سے الگ ہوتی ہے۔ ان کے لیے ہر حکومت میں دو ہی راستے ہوتے ہیں۔ یا اطاعت قبول کر لیں یا قتل کیے جائیں۔ اسی وجہ سے اسلام میں مرتد کی سزا قتل ہے۔ کفر کی سزا قتل نہیں ہے۔

اس کا بہترین جواب مفتی محمد عبدہ نے دیا ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ دراصل یہ جبر و اکراہ کا معاملہ نہیں تھا بلکہ آیت اللہ کا یہ آخری مظاہرہ تھا جو ان کی رُشد و ہدایت کی تقویت و تائید میں

---

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۱۳ [2] تفہیم القرآن ص ۸۳ - [3] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۱۳

کیا گیا اور اس لیے یہ واقعہ میثاق کے بعد پیش آیا جیسا کہ سیاقِ کلام سے ظاہر ہے۔

۱۷۵ - جو کچھ ہم نے تم کو دیا ہے اسے مضبوطی سے اپناؤ۔ جو کچھ دیا سے مراد تورات ہے۔ احکام تورات کیلئے اس اخذ و تمسک کی تاکید اور اس کے ترک پر وعید خود تورات میں بھی جا بجا مذکور ہے۔ مثلاً:

جو کوئی اس شریعت کی سب باتوں پر قائم نہ رہے کہ ان پر عمل کرے اس پر لعنت سب جماعت کہے آمین (استثنا ۲۷-۲۶) اگر تو کوشش کر کے خداوند اپنے خدا کی آواز سُنے تاکہ ان سب پر جو آج کے دن میں تجھ سے فرماتا ہوں دھیان رکھ کر عمل کرے تو خداوند تیرا خدا زمین کی قوموں کی نسبت تجھے سرفراز کرے گا۔ (استثنا ۲۸-۱) یہ پورا مقولہ اسی وقت کا ہے جب کتاب نازل ہوئی تھی۔ کتاب ہدایت کے نزول اور رفع طور کے ساتھ ساتھ ہدایت اس کی بھی ہوئی تھی کہ اس کتاب کی حفاظت کرنا اور اس کے احکام پر مداومت کرنا۔[۱]

۱۷۶ - اور یاد رکھو ان ہدایات کو جو اس میں ہیں۔ یعنی اس کے مضامین کو یاد رکھو تاکہ ان پر عمل کر سکو — احکامِ الٰہی کا یاد رکھنا اصلاً اسی غرض سے ہوتا ہے کہ ان پر عمل کیا جا سکے۔ اس حکم کے تحت حفظ و قرأت بھی داخل ہیں لیکن اصلی مقصد عمل ہے۔ امام راغبؒ لکھتے ہیں کہ ذکر بول کر کبھی تو نفس کی وہ حالت مراد ہوتی ہے جس کے ذریعے انسان جو کچھ معرفت حاصل کرتا ہے اس کا یاد رکھنا ممکن ہو اور یہ حفظ ہی کی طرح ہے اور کبھی ذکر کسی چیز کے دل میں استحضار پر بولا جاتا ہے۔ اس لیے ذکر کی دو قسمیں ہیں۔ قلبی اور لسانی۔ یہاں یاد رکھنے سے مقصود ان پر عمل کرنا ہے۔ حفظ بھی اسی استحضار کا ذریعہ ہے۔ اگر معاملہ ذکر سے ہٹ کر صرف حفظ ہی تک رہ جائے تو اس کی امام غزالیؒ نے بہترین مثال دی ہے۔ آقا نے نوکروں کی تحویل میں باغ دیا ہے اور باغ کی اصلاح، تعمیر، آبادکاری کا کام اُن کے سپرد کیا ہے اور باغ کی اصلاح و تعمیر سے متعلق ہدایات کتابی صورت میں نوکروں کو دی ہیں اور ان کو اس کتاب میں بتایا ہے کہ باغ کی اصلاح و تعمیر کیسے کی جائے گی۔ حسنِ کارکردگی کی صورت میں ان سے انعامات کا وعدہ کیا ہے۔ غلط کاری، بدکاری اور ناکاری کی صورت میں گرفت اور سزا کی دھمکی دی ہے۔ نوکروں نے آقا کی دی ہوئی کتاب کو زبانی یاد کر لیا ہے۔ اس کو بار بار پڑھتے ہیں۔ مختلف نغموں اور لہجوں میں مزے لے لے کر

---

[۱] تفسیر ماجدی ج ۱ ص ۲۷

پڑھتے ہیں مگر کتاب میں لکھی ہوئی ہدایات کے مطابق باغ کی تعمیر واصلاح کا کوئی کام نہیں کرتے بلکہ باغ میں ادھم مچاتے ہیں۔ بوٹوں کو پیروں سے روندرہے ہیں، درختوں کی افزائش ختم ہو چکی ہے۔ سبزی و شادابی ختم ہو چکی ہے۔ لیکن باغ کے نوکر صرف آقا کی دی ہوئی کتاب کو پڑھ پڑھ کر مزے لے رہے ہیں اور سُن کر سر دُھن رہے ہیں — جو حیثیت ان نوکروں کی آقا کی نظر میں ہوگی۔ ٹھیک ٹھیک وہی حیثیت اس اُمت کی اللہ کی بارگاہ میں ہوگی جو کتاب الٰہی کو پڑھتی ہے، یاد کرتی ہے، سُن کر مزے لیتی ہے لیکن اس پر عمل نہیں کرتی ہے۔

۱۷۷ ۔ تاکہ تم میں متقیانہ سیرت پیدا ہو جائے۔ اس سے معلوم ہوا کہ متقی بننے کا واحد راستہ نبوت کے لائے ہوئے علم و عمل سے علمی اور عملی طور پر رشتہ جوڑنا ہے۔ قرطبیؒ نے لکھا ہے کہ اگر تم کتاب الٰہی کے اوامر کی نگرانی کروگے اور اسے طاقِ نسیان نہیں بناؤ گے اور اسے ضائع نہیں کروگے تو متقی بن جاؤ گے۔ کیونکہ کتاب کی رہنمائی میں عملی زندگی پر مواظبت سے انسان میں اللہ سے لگاؤ پیدا ہو جاتا ہے اور یہ لگاؤ نفسانیت کو دبا کر روحانیت سے دوچار کرتا ہے۔

۱۷۸ ۔ لیکن اس کے باوجود تم اس کے عہد سے پھر گئے۔ یعنی عہد و پیمان کرکے پھر پھر گئے۔ اگر اللہ کا فضل نہ ہوتا تو بالکل تباہ ہو جاتے۔ یعنی اسی وقت ہلاک کر دیے جاتے یا یہ کہ توبہ و استغفار بھی کرتے اور نبی آخر الزمان کی متابعت بھی کرتے تو بھی تمہاری تقصیرات معاف نہ کی جاتیں[1]

ان کو بتایا جا رہا ہے کہ تم نے اس وقت وقتی خوف و دہشت سے یا علیٰ رؤس الاشہاد خدا کے عظیم الشان نشان کا مشاہدہ کرکے تورات کی طرف متوجہ ہوئے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سامنے اس کے احکام کی تعمیل کا اقرار کیا۔ مگر افسوس کہ تمہارا یہ عہد و پیمان ہنگامی ثابت ہوا اور تم زیادہ عرصہ تک اس پر کاربند نہ رہ سکے اور حسبِ عادت اس کی پھر خلاف ورزی شروع کر دی لیکن اللہ نے تمہارے جرائم سے چشم پوشی کی اور اللہ کے فضل و رحمت نے تمہیں تباہی سے بچا لیا۔

---

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۱۳

وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِئِيْنَ ﴿٦٥﴾
فَجَعَلْنٰهَا نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿٦٦﴾

اور تم خوب واقف ہو اپنوں ہی میں سے ان لوگوں کے کردار[179] سے جنہوں نے سبت[180] کے دن کے بارے میں قانون شکنی[181] کی تھی۔ (یعنی اللہ کے حکم سے بچنے کے لیے تدبیریں سوچیں) اس کے نتیجہ میں ہم نے اُن سے کہا کہ ذلیل[182] و خوار بندر ہو جاؤ۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور ہم نے اس واقعہ کو اس زمانے کے لوگوں اور بعد میں آنے والی نسلوں کے لیے تازیانۂ عبرت[183] اور متقیوں کے لیے سامانِ نصیحت بنا دیا۔

قانونِ الٰہی کے خلاف حیلہ سازی

اس سے پہلی آیت میں عہد و پیمان کے تذکرے میں یہ بتایا کہ تمہارے اندر اس قدر گراوٹ آچکی ہے کہ تم عہد و میثاق کے باوجود اس سے پھر گئے اور بجائے اللہ کی کتاب پر عمل کرنے کے تم نے عملی زندگی میں عہد و پیمان سے بے پرواہ ہو کر اس کی دھجیاں اڑا دیں۔ اس آیت میں اس کی واقعاتی مثال پیش فرمائی ہے اور بتایا کہ قانونِ الٰہی کے خلاف تمہاری غداری، عہد شکنی اور حیلہ سازی اس حد تک پہنچ گئی تھی کہ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ یہ واقعہ تمہارے علم میں ہے کہ

179ء ان لوگوں کے کردار سے تم خوب واقف ہو۔ عربی زبان میں لام اور قد کا استعمال قسم کے موقعہ پر ہوتا ہے اور اس سے مقصود بات میں زور پیدا کرنا ہوتا ہے گویا قرآن بنی اسرائیل کو ان کی تاریخ کا کوئی ایسا واقعہ یاد دلا رہا ہے جو ان کا خوب اچھی طرح سے جانا بوجھا ہے۔ اور ان سے کہہ رہا ہے کہ اے بنی اسرائیل جس واقعہ کا آگے ذکر آ رہا ہے وہ تمہاری تاریخ کا ایک مسلّم اور جانا پہچانا واقعہ ہے اور تم اس سے خوب واقف ہو۔

180ء۔ سبت کے دن۔ سبت کے لفظی معنے ہیں ہفتہ کا ساتواں دن یعنی سنیچر، ہفتہ، شنبہ، یہودیوں کی شریعت کی اصطلاح میں یہ ایک مقدس دن ہے۔ یہ دن صرف یادِ خدا اور عبادت کے لیے

مخصوص ہے اور اس روز تجارت، زراعت، شکار وغیرہ ہر قسم کے دنیوی کام ممنوع تھے اور ممانعت بھی اتنی سخت کہ جو کوئی اس کی خلاف ورزی کرے اس کی سزا قتل تھی۔ چنانچہ تورات میں ہے کہ سبت کو مانو اس لیے کہ وہ تمہارے لیے مقدس ہے جو کوئی اس کو پاک نہ جانے وہ ضرور مار ڈالا جائے گا۔ پس جو کوئی سبت کو کام کرے وہ ضرور مار ڈالا جائے گا۔ اس سے معلوم ہوا کہ

بنی اسرائیل کے لیے یہ قانون مقرر کیا گیا تھا کہ وہ ہفتہ کے دن کو آرام اور عبادت کے لیے مخصوص رکھیں۔ اس روز کسی قسم کا دنیوی کام حتیٰ کہ کھانا پکانا بھی نہ خود کریں اور نہ اپنے خادموں سے کام لیں۔ لیکن جب بنی اسرائیل پر اخلاقی و دینی انحطاط کا دور آیا۔ تو وہ علی الاعلان سبت کی بے حرمتی کرنے لگے حتیٰ کہ ان کے شہروں میں کھلے بندوں سبت کے روز تجارت ہونے لگی۔[1]

۱۸۱ے۔ سبت کے اسی دن میں قانون کی خلاف ورزی کو اعتداء کہا ہے یعنی ان کو حکم تھا کہ شنبہ کا دن خالص عبادت کے لیے مقرر ہے۔ اس روز مچھلی کا شکار نہ کرو۔ وہ لوگ حیلہ سے ہفتہ کے روز شکار کرنے لگے۔[2]

شکار کی داستان یہ ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانے میں یہود کی ایک بڑی آبادی مقام ایلہ میں تھی۔ یہ ذکر انہی کا ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام کا زمانہ حکومت ۱۰۱۳ء ق م سے ۹۷۳ء ق م ہے۔ مقام ایلہ اگر وہی ہے جس کا ذکر تورات میں ایلات کے نام سے آتا ہے (استثناء ۲ : ۸) تو یہ فلسطین کے جنوب میں عرب کی عین شمالی سرحد پر بحرِ قلزم کی مشرقی خلیج میں لب ساحل واقع ہے۔ موجودہ جغرافیہ نویس اس کو عقبہ کے نام سے پکارتے ہیں۔ اور عقبہ خلیج عقبہ کی مشہور بندرگاہ ہے۔ ایلہ کے یہودی اپنی شریعت کے قانون کے پے در پے اور پیہم خلاف ورزی کرتے۔ مچھلی کا شکار ایک خاص حیلہ سے اور اسے ظاہری صورت جواز دے کر سبت کے دن کیا کرتے۔[3]

۱۸۲ے۔ ہم نے ان سے کہا کہ بندر ذلیل و خوار ہو جاؤ۔ یعنی جب وہ لگاتار نافرمانی کرتے رہے تو پھر ہم نے ان کو اس مسلسل نافرمانی کی پاداش میں سزا دی۔ کیا سزا ملی؟ یہ کہ بندر ہو جاؤ ذلیل۔ جمہور مفسرین اس کا یہ مطلب بتاتے ہیں کہ اللہ نے ان کو مسخ کر کے ان کی صورت بندر کی سی کر دی، فہم و شعور انسانی موجود تھا۔ ایک دوسرے کو دیکھتا اور روتا مگر بات نہ کر سکتا تھا۔ تین دن کے بعد سب مر گئے۔[4] اس کے ساتھ یہ بھی تفسیر کی گئی ہے کہ مسخ صرف معنوی ہوا صوری نہیں۔ یعنی ان کے عادات و اخلاق

---

[1] تفہیم القرآن ج ۱ ص ۸۰ [2] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۱۳ [3] تفسیر ماجدی ص ۲۸ [4] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۱۳

بندروں کے سے کر دیے گئے تھے اور بندر کا اطلاق ان پر مجازاً ہوا ہے ورنہ حقیقتہً وہ بندروں کے قالب اور جسم میں تبدیل نہیں کیے گئے تھے۔ چنانچہ امام راغبؒ نے بعض علماء کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ان کے اَخلاق و عادات بندروں ایسے ہو گئے تھے۔ بندروں کی صورت نہیں بنی تھی۔ پروفیسر عبدالرؤف نے معجم القرآن میں اسی تاویل کو پسند کیا ہے۔ قرطبیؒ نے امام مجاہدؒ کے حوالہ سے لکھا ہے۔ ان کی صورتیں مسخ نہیں ہوئی تھیں بلکہ دلوں کو بندروں کے دلوں کی طرح بنا دیا گیا تھا۔ لیکن حافظ ابنِ کثیرؒ نے اس رائے پر سیاقِ قرآن کے خلاف ہونے کی وجہ سے ندرت اور غرابت کا فتویٰ لگایا ہے۔

بہرحال ان کے بندر بنائے جانے کی کیفیت میں اختلاف ہے۔ بعض یہ سمجھتے ہیں کہ اُن کی جسمانی ہیئت بگاڑ کر بندروں کی سی کر دی گئی تھی۔ اور بعض اس کے یہ معنے لیتے ہیں کہ ان میں بندروں کی سی صفات پیدا کر دی گئی تھیں۔ لیکن قرآن کے الفاظ اور اندازِ بیان سے ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ مسخ اخلاقی نہیں بلکہ جسمانی تھا میرے نزدیک قرینِ قیاس یہ ہے کہ ان کے دماغ بعینہٖ اسی حال پر رہنے دیے گئے ہوں گے جس میں وہ پہلے تھے اور جسم مسخ ہو کر بندروں کے سے ہو گئے ہوں گے۔[1]

اس تفسیر پر کہ ان کو حقیقت میں بندر بنا دیا گیا تھا عقلاً کوئی استحالہ نہیں ہے۔ جو لوگ اللہ کے قانونِ تشریعی کو توڑنے میں اتنی جری اور بے باک ہوں ان کے حق میں خالقِ کائنات اپنے قانونِ تکوین کو کسی حد تک اگر بدل دے اور بجائے ارتقاء کے اگر کہیں ترقی معکوس ہو جائے تو یہ ناممکن کیا میرے خیال میں مستبعد بھی نہیں ہے۔

۱۸۳۔ ہم نے اس واقعہ کو موجودین اور بعد میں آنے والوں کے لیے تازیانۂ عبرت بنا دیا۔ سزا کچھ بھی ہو قرآن کا مقصود سزا کی تفصیل بیان کرنا نہیں ہے بلکہ اس کی عبرت انگیزی اور موعظت آموزی کے پہلو کو واضح کرنا ہے۔ اس واقعہ اور اس عقوبت کو ہم نے باعثِ خوف و عبرت بنا دیا۔ اگلے اور پچھلے لوگوں کے واسطے یعنی جنہوں نے اس عذاب کا مشاہدہ کیا اور جو آئندہ پیدا ہوں گے یا جو بستیاں شہر کے آگے اور پیچھے آباد ہیں سب کے لیے عبرت ہے[2] ـــــ گویا سزا ایسی تھی کہ مدتوں تک اس کا چرچا رہے اور لوگ اس کا تذکرہ سن کر ڈرتے رہیں۔ یہ تو نافرمانوں اور گنہگاروں کی حد تک اس سزا کا فائدہ ہے باقی رہے نیکوکار تو ان کے لیے اس واقعہ میں سامانِ نصیحت ہے کہ اسے سن کر ان میں راہِ تقویٰ کی ترغیب اور زیادہ ہو گی۔ یہاں صاحبِ رُوح المعانی نے یہ نکتہ بڑا عجیب لکھا ہے اور مولانا اشرف علی تھانوی

---

[1] تفہیم القرآن ص ۸۴۔ [2] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۱۳

قدس اللہ سرہ العزیز نے اسے مسائل السلوک میں ممتاز جگہ دی ہے کہ ارباب معرفت کو یہ بات سمجھنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے عبادات کو خاص خاص ہیئت کے ساتھ خاص اوقات میں متعین کیا ہے تاکہ طبعی ظلمتیں دُور ہوں۔ لہٰذا جو شخص ان ہیئتوں کی رعایت نہیں کرتا اس کا نُور استعداد ضائع ہو جاتا ہے اور وہ سبت والوں کی طرح ممسوخ ہو جاتا ہے۔ یعنی جس جانور کے اوصاف اس میں راسخ ہیں انہی کی طبیعت ان میں پیدا کر دی جاتی ہے۔ اگرچہ اس اُمت کے لیے مسخ صوری نہیں ہے۔ انسان کو چاہیے کہ ادویہ شرعیہ کے مطابق اپنی انسانیت کو محفوظ رکھنے کی کوشش میں لگا رہے۔

اس واقعہ میں یہودیوں کے جس اعتداء کا ذکر کیا ہے اور جس پر عذاب آیا ہے۔ روایات سے معلوم ہوا ہے کہ وہ یہودیوں کی صاف طور پر قانون کی خلاف ورزی نہ تھی بلکہ قانون کی زد سے بچنے کے لیے ایسے شرعی حیلے گھڑ لیتے تھے جن سے قانونِ الٰہی کا ابطال لازم آتا تھا۔ یعنی محض نمائشی طور پر تو ان کی تعمیل کرتے لیکن جو حقیقی مقصد تھا وہ پورا نہ کرتے۔ حافظ ابنِ کثیرؒ نے حضرت ابوہریرہؓ کے حوالہ سے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بیان لکھا ہے کہ وہ کام نہ کرنا جو یہودی کرتے تھے کہ اللہ کے محرمات کو معمولی حیلوں سے حلال سمجھنے لگو اور لکھا ہے کہ ھذا اسناد جید

یاد رکھنا چاہیے کہ حیلے بھی دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ آپ ایسے ذرائع تلاش کریں جن سے حکمِ الٰہی کی پابجائی ہو۔ حرام سے بچاؤ، ظالم سے حق حاصل کیا جائے اور مظلوم کی دادرسی ہو۔ حرام سے بچاؤ کی مثال یوں خیال فرمایئے کہ ایک سیر عمدہ کھجور کے بدلے میں دو سیر خراب کھجور خریدنا منع ہے کیونکہ یہ جنس کا جنس سے تبادلہ ہے اور اس میں کمی بیشی سُود ہے۔ ایسے موقعہ پر حرام سے بچنے کے لیے اگر کوئی یہ تدبیر کرتا ہے کہ دو سیر خراب کھجور کو بازار میں فروخت کرتا ہے اور اس کی قیمت سے پھر ایک سیر اچھی کھجور خرید تا ہے۔ اگرچہ یہ بھی حیلہ ہے لیکن چونکہ اس کا مقصد حرام کرنا نہیں بلکہ حرام سے بچنا ہے اس لیے حرام سے بچنے کی تدبیریں اس کی زد میں نہیں آتی ہیں۔

حیلہ کی دوسری قسم یہ ہے کہ ایسے ذرائع تلاش کیے جائیں جن سے فرائض و واجبات سے چھٹکارا، محرمات کی حلت، مظلوم کو ظالم، ظالم کو مظلوم، حق کو باطل، باطل کو حق قرار دے سکے۔

حافظ ابن القیمؒ فرماتے ہیں کہ حیلوں کی یہی وہ قسم ہے جس کی بُرائی پر سلف کا اجماع ہے۔ تفصیلی بحث تو انشاء اللہ سورۂ اعراف میں آئے گی مگر اتنی بات ذہن نشین کر لیجئے کہ یہودیوں میں اخلاقی، معاشرتی، معاملاتی ساری بیماریوں کی قرآن نے نشاندہی کی ہے۔ مثلاً سُود لینا، لوگوں کے اَموال ناجائز کھانا، لیکن آپ یہ سُن کر حیران ہوں گے کہ ان جرائم میں سے کسی جُرم پر مسخ جیسی سنگین

باقی

وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِۦٓ إِنَّ ٱللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَن تَذْبَحُوا۟ بَقَرَةً ۖ قَالُوٓا۟ أَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا ۖ
قَالَ أَعُوذُ بِٱللَّهِ أَنْ أَكُونَ مِنَ ٱلْجَٰهِلِينَ ﴿٦٧﴾ قَالُوا۟ ٱدْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّن لَّنَا مَا هِىَ ۚ قَالَ
إِنَّهُۥ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَلَا بِكْرٌ عَوَانٌۢ بَيْنَ ذَٰلِكَ ۖ فَٱفْعَلُوا۟ مَا تُؤْمَرُونَ ﴿٦٨﴾
قَالُوا۟ ٱدْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّن لَّنَا مَا لَوْنُهَا ۚ قَالَ إِنَّهُۥ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَآءُ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا
تَسُرُّ ٱلنَّٰظِرِينَ ﴿٦٩﴾ قَالُوا۟ ٱدْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّن لَّنَا مَا هِىَ إِنَّ ٱلْبَقَرَ تَشَٰبَهَ عَلَيْنَا وَإِنَّآ
إِن شَآءَ ٱللَّهُ لَمُهْتَدُونَ ﴿٧٠﴾ قَالَ إِنَّهُۥ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُولٌ تُثِيرُ ٱلْأَرْضَ وَ
لَا تَسْقِى ٱلْحَرْثَ مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيهَا ۚ قَالُوا۟ ٱلْـَٰٔنَ جِئْتَ بِٱلْحَقِّ ۚ فَذَبَحُوهَا وَمَا
كَادُوا۟ يَفْعَلُونَ ﴿٧١﴾

اور اپنی زندگی کا وہ واقعہ بھی یاد کرو جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے یہ بات کہی تھی کہ اللہ کا تمہیں یہ حکم ہے کہ تم ایک گائے ذبح کرو۔ بجائے راست باز انسانوں کی طرح عمل کرنے کے کہنے لگے آپ ہم سے مذاق کرتے ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ اللہ کی پناہ کہ میں جاہلوں میں سے بنوں۔ میں تو حکمِ الٰہی پہنچا رہا ہوں۔ بولے اگر ایسا ہی ہے تو پھر اپنے پروردگار سے درخواست کرو کہ وہ کھول کر بتائے کہ کس طرح کی گائے ذبح کی جائے۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا اللہ کا ارشاد ہے کہ ایسی گائے ہونی چاہیے جو نہ بالکل بوڑھی ہو اور نہ بالکل بچھیا۔ درمیانی عمر کی ادھیڑ ہو۔ تمہیں جو کچھ حکم مل رہا ہے اس کی پابجائی کرو۔ لیکن وہ بولے کہ موسیٰ اپنے رب سے ہماری خاطر درخواست کر کہ وہ یہ بتائے کہ اس کا رنگ کیا ہو۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا حکمِ الٰہی یہ ہے کہ اس کا رنگ ایسا خوب گہرا زرد ہو کہ دیکھنے والوں کو بھائے۔ پھر بولے کہ ان ساری باتوں کے باوجود اپنے رب سے صاف صاف پوچھ کر بتاؤ کہ گائے کیسی ہو ہمارے لیے گائے کی پہچان مشکل ہے انشاء اللہ ہم ضرور پتہ لگالیں گے۔ موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا اللہ فرماتا ہے کہ ایسی گائے ہونی چاہیے جو نہ تو کبھی ہل میں جوتی گئی ہو نہ کہیں آب پاشی کے کام میں لائی گئی ہو۔ پوری طرح صحیح وسالم اور بے داغ ہو۔ اس پر وہ پکار اٹھے ہاں اب تم نے پتے کی بات کہی ہے۔ چنانچہ اس کے بعد انہوں

نے گائے ذبح کی، اگرچہ وہ ایسا کرنے کو تیار نہ تھے۔

سزا نہیں ملی ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قانونِ الٰہی کے اوامر سے بچنے کے ذرائع تلاش کرنا قرآن کی نظر میں کتنا سنگین جرم ہے۔
واقعہ کے بالکل آخر میں وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ فرما کر اس طرف اشارہ کر دیا کہ اجتماعی زندگی کے اس دورِ انحطاط اور برائیوں کے اس سیلاب میں اسی معاشرے میں ایک طبقہ ایسا بھی موجود تھا جو اس کام سے ان کو باز رکھنے کی کوشش کرتا تھا۔ یہ طبقہ اس کوشش میں لگا ہوا تھا کہ شاید ہماری محنت سے اجتماعی تقویٰ میں بہار آجائے۔ سورۂ اعراف میں ہے لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ یہ واقعہ بتاتا ہے کہ قرآن کی نظر میں اپنے دوسرے بھائیوں کو گرنے سے بچانا اور گرتوں کو سنبھالنا اور سہارا دینا کتنا اہم ہے اور اس کے اخلاقی فرائض کا یہ کیسا ضروری حصہ ہے کہ اگر اس کو ادا نہ کیا جائے تو وہ بھی ایسا ہی گنہگار رہے جیسا وہ اس فعل کا مرتکب ہوا۔ البتہ بھائی کا فرض اسے سمجھا دینے اور بتا دینے کے بعد ختم ہو جاتا ہے۔ زبردستی منوانا اس کا فرض نہیں ہے۔ اور اس کا کیا بلکہ خود رسُول کا بھی یہ فرض نہیں ہے۔ اگر یہ فرض ادا ہو گیا تو اس کے سر سے ذمّہ داری کا بوجھ اتر گیا۔ تفصیل سورۂ اعراف میں آئے گی۔

کثرتِ سوال اور تعمق

دل جب اخلاص سے خالی ہوں تو احکامِ الٰہی کی سیدھی سادھی اطاعت کرنے کی جگہ رَد و کد کرنا، طرح طرح کے سوالات کرنا، بلا ضرورت باریک بینیاں اور دقیقہ سنجیاں کرنا اور قانونِ الٰہی کی سادگی اور آسانی کو سختی اور پیچیدگی سے تبدیل کر دینا، انسان کی بہت بڑی کمزوری ہے۔
نبوت کے علم و عمل سے اُمتوں کا رشتہ تین وجہ سے ٹوٹتا ہے۔ ایک بے خبری، دوسرے طبیعت کی غلط اُفتاد اور تیسرے گرد و پیش اور ماحول کا اثر۔ طبیعت کی غلط اُفتاد سے انسان میں طاعت کی سرشاریاں ختم ہو کر نافرمانی کے جذبات جنم لیتے ہیں۔ طاعت سے گریز کے لیے نفسِ انسانی قسم قسم کی راہیں تلاش کرتا ہے۔ ان ہی راہوں میں ایک کثرتِ سوال اور تعمق فی الدین ہے۔ حکیم الامت شاہ ولی اللہؒ نے اسے نبوت کے علم و عمل سے اُمتوں کا رشتہ ٹوٹنے کا سبب بتایا ہے۔ یہی بیماری یہودیوں میں عصیان و عدوان کی وجہ سے پیدا ہوئی اور اسی کے نتیجے میں اُن کی اجتماعی زندگی متقیانہ سیرت

سے محروم ہو گئی۔ تفصیلی بحث تو آپ نے اس موضوع پہ اسی پارہ کی آیت نمبر ۱۰۸ میں پڑھی۔ یہاں تو صرف یہ بتانا ہے کہ ایک بار ایک خالص فوجداری کیس بنی اسرائیل میں پیش آگیا۔ یعنی ایک قتل ہو گیا۔ مگر قاتل کا پتہ نہ چلا آخر شبہ نے تہمت کی شکل اختیار کر لی اور باہمی اختلاف سے نزاع وجدال کی خوفناک صورت رونما ہو گئی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بارگاہ میں جب یہ فوجداری مقدمہ آیا تو آپ نے نبی ہونے کی حیثیت سے اللہ کی بارگاہ میں درخواست پیش کی کہ میری مدد فرما۔ وحی نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی رہنمائی فرمائی کہ ان سے کہو ایک گائے ذبح کریں اور اس کے بعد گائے کے حصّے کو مقتول کے حصّے سے مس کریں۔ اگر وہ ایسا کریں گے تو ہم مقتول کو زندہ کر دیں گے اور معاملہ واضح ہو کر سامنے آجائے گا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب بنی اسرائیل سے کہا تو انہوں نے اپنی طبیعت کی غلط افتاد کی وجہ سے سوالات شروع کر دیے۔

صحیح مسلم میں حدیث ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر بنی اسرائیل حضرت موسیٰ علیہ السلام کے فرماتے ہی گائے ذبح کر دیتے تو اُن سے لیے گائے کے معاملہ میں کسی قسم کی مطلق قید نہ ہوتی۔ وہ کوئی سی گائے بھی ذبح کر دیتے تعمیلِ حکم ہو جاتی مگر انہوں نے بیہودہ سوالات کر کے اپنے اوپر پابندیاں لگائی ہیں۔

۱۸۴ اور اپنی زندگی کا وہ واقعہ بھی یاد کرو۔ یہ زمانہ وہ ہے کہ صدیوں تک مصر میں اور مصر والوں میں رہتے رہتے بہت سی مشرکانہ رسمیں بنی اسرائیل میں گھر کر چکی تھیں۔ اور مصریوں کی صحبت سے گائے کی تقدیس ان کے دلوں میں رچ چکی تھی۔ گائے کی تقدیس کا خیال مصریوں میں تھا۔ مصری اپنے دیوتا حورس کا چہرہ گائے کی شکل کا بناتے تھے اور خیال کرتے تھے کہ کرۂ ارض ایک گائے کی پشت پر قائم ہے۔ ہندوستان کی طرح گائے کی تقدیس مشرکانہ مذہب کا ایک جزو تھا۔

۱۸۵ ۔ تورات میں بھی ایسے حادثہ میں جب کہ قاتل کا پتہ نہ ہو یہ حکم اب بھی موجود ہے کہ — اگر اس ملک میں جسے خداوند خدا تجھ کو قبضہ کرنے کو دیتا ہے کسی مقتول کی لاش میدان میں پڑی ہوئی ہے اور یہ معلوم نہ ہو کہ اس کا قاتل کون ہے تو تیرے بزرگ اور قاضی نکل کر اس مقتول کے گرداگرد کے شہروں کے فاصلے کو ناپیں اور جو شہر اس مقتول کے سب سے نزدیک ہو اس شہر کے بزرگ ایک بچھیا لیں جس سے کبھی کوئی کام نہ لیا گیا ہو اور نہ جوئے میں جوتی گئی ہو۔ اور اس شہر کے بزرگ بہتے پانی کی وادی میں جس میں نہ ہل چلا ہو اور نہ اس میں کچھ بویا گیا ہو لے جائیں اور وہاں اس وادی میں اس بچھیا کی گردن توڑ دیں۔ تب بنی لاوی جو کاہن ہیں نزدیک آئیں کیونکہ خداوند تیرے خدا نے اُن کو چن لیا ہے کہ

خداوند کی خدمت کریں اور اس کے نام سے برکت دیا کریں اور ان ہی کے کہنے کے مطابق ہر جھگڑے اور مار پیٹ کے مقدمہ کا فیصلہ ہوا کرے۔ پھر اس شہر کے سب بزرگ جو اُس مقتول کے سب سے نزدیک رہنے والے ہوں۔ اس بچھیا کے اوپر جس کی گردن اس وادی میں توڑی گئی اپنے اپنے ہاتھ دھوئیں اور یوں کہیں کہ ہمارے ہاتھ سے یہ خون نہیں ہوا اور نہ یہ ہماری آنکھوں کا دیکھا ہوا ہے۔ تو اے خداوند اپنی قوم اسرائیل کو جسے تو نے چھڑایا ہے معاف کر اور بے گناہ کے خون کو اپنی قوم اسرائیل کے ذمہ نہ لگا۔ تب وہ خون اُن کو معاف کر دیا جائے گا۔ (استثناء ۲۱۔ ۱ از ۱ تا ۹)

قرآن میں جو واقعہ بیان ہو رہا ہے وہ اسرائیلی زندگی کا اس موضوع پر پہلا واقعہ ہے۔ اگر یہ قانون پہلے سے موجود ہوتا تو سوالات کی گنجائش ہی نہ ہوتی۔ اوّل وہلہ میں اگر وہ گائے کے ذبح کا حکم پا کر ذبح کر دیتے تو یہ قیدیں اور شرطیں جو ان کی کج بحثی سے اور سوالات کی کثرت سے نمودار ہوتی ہیں نہ ہوتیں اور قانون اپنی اصلی اور سادہ شکل میں ہوتا۔

ہمارے مفسرین نے مقتول کے نام کی بھی نشاندہی کی ہے کہ بنی اسرائیل میں ایک عامیل نامی مارا گیا تھا۔ اور اس کا قاتل معلوم نہ تھا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ اللہ حکم دیتا ہے کہ گائے ذبح کر دو [1]

۱۸۶ س۵۔ کیا آپ ہم سے مذاق کرتے ہیں ؟ گائے کا تقدس اُن کے دلوں میں اس قدر پیوست ہو چکا تھا کہ ان کو گائے کے ذبح کا حکم سُن کر یقین ہی نہ آیا کہ فی الواقع ایسے مقدس جانور کے ذبح کر ڈالنے کا حکم ملا ہوگا۔ اپنی گستاخانہ ذہنیت کی وجہ سے نبوّت کی ذاتِ گرامی کو اپنے نفس کے چور خانے کا نشانہ بنا بیٹھے اور بولے کہ کیا آپ ہم سے مذاق کرتے ہیں ؟ یعنی کیا آپ گائے ذبح کرنے کا حکم دل لگی، ہنسی اور تفننِ طبع کی راہ سے دے رہے ہیں یا اس میں کوئی حقیقت ہے ؟ اس کے جواب میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ اَعُوْذُ بِاللّٰہِ اَنْ اَکُوْنَ مِنَ الْجَاھِلِیْنَ۔ نعوذ باللہ کہ میں ایسی جہالت آمیز انسانوں کا وطیرہ اختیار کروں کہ حکمِ خداوندی کی تبلیغ و اشاعت میں ہنسی اور تفننِ طبع سے کام لوں۔ اور میں دل لگی اللہ کے پیغام کے پہنچانے میں کروں۔ اس کی تو وہی شخص جرأت کر سکتا ہے جو خود اللہ سے بے خبر اور نادان ہو۔ یا وہ کر سکتا ہے جو اُمورِ دینی میں استہزاء کے نتائج و عواقب سے بے خبر ہو۔ میں تو اللہ کا پیغمبر ہوں۔ میرے بارے میں تمہارا یہ گمان خود تمہارے مقامِ نبوّت سے بے خبر

---

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۱۳

وَإِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادَّارَءْتُمْ فِيهَا ۖ وَاللَّهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنتُمْ تَكْتُمُونَ ﴿٧٢﴾ فَقُلْنَا اضْرِبُوهُ بِبَعْضِهَا ۚ كَذَٰلِكَ يُحْيِي اللَّهُ الْمَوْتَىٰ وَيُرِيكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ﴿٧٣﴾

اور پھر غور کرو اس پر کہ جب تم نے ایک شخص کی جان لی تھی اور اس کے بارے میں تمہارے درمیان باہم اختلاف رونما ہو گیا تھا اور معاملہ کو تم باہم ایک دوسرے کے سر تھوپ رہے تھے۔ حالانکہ جو کچھ تم چھپا رہے تھے اللہ اسی کو منظرِ عام پر لانے والا تھا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ ہم نے حکم دیا کہ مقتول کی لاش کو گائے کے ایک حصے سے ضرب لگاؤ دیکھو اسی طرح اللہ سبحانہ مُردوں کو زندگی بخشتا ہے اور تمہیں اپنی قدرت کی نشانیاں دکھاتا ہے تاکہ تم سمجھ بوجھ سے کام لو۔

ہونے کی علامت ہے۔ قرطبیؒ نے آیت سے استنباط کیا ہے۔ دین، اُمورِ دین کے ساتھ استہزاء جہالت اور گناہِ عظیم ہے۔ اور اس کا مرتکب مستحقِ وعید ہے اور لکھا ہے کہ آج اگر کوئی شخص حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کے بارے میں یہ رویہ اختیار کرے تو کفر ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے انہوں نے کہا کہ کھول کر بتائیے کہ گائے کیسی ہونی چاہیے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ کی جانب سے اُن کو بتایا کہ گائے ایسی ہونی چاہیے جو بڑی عمر کی بوڑھی اور بہت چھوٹی عمر کی بچھیا نہ ہو بلکہ ان دونوں کے درمیان ادھیڑ عمر کی ہو اور آخر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ کہہ کر پھر تنبیہہ فرمائی فَافْعَلُوا مَا تُؤْمَرُونَ۔ تمہیں کو حکم کی بجا آوری کرنی چاہیے۔ اور سرکشی سے بچنا چاہیے۔ زیادہ سوالات نہ کرنے چاہئیں۔

لیکن چونکہ ان لوگوں کو اپنی ہمسایہ قوموں سے گائے کی عظمت و تقدیس اور گاؤ پرستی کے مرض کی چھوت لگ گئی تھی۔ اس لیے اُن پر گائے کے ذبح کرنے کا معاملہ شاق گزر رہا تھا۔ مگر چونکہ ان کے ایمان کا امتحان ہی اس طرح ہو سکتا تھا کہ اگر وہ واقعی خدا کے سوا کسی کو معبود نہیں سمجھتے تو یہ عقیدہ اختیار کرنے سے پہلے جس کو وہ معبود سمجھتے رہے اسے اپنے ہاتھ سے ذبح کریں۔ یہ امتحان بہت کڑا امتحان تھا۔ دلوں میں پوری طرح ایمان اُترا ہوا نہ تھا۔ اس لیے انہوں نے ٹالنے کی کوشش کی اور تفصیلات پوچھنے لگے۔ مگر جتنی تفصیلات وہ پوچھتے گئے اتنے ہی گھرتے

چلے گئے یہاں تک کہ آخر کار اسی خاص قسم کی سنہری گائے پر جسے اس زمانے میں پرستش کے لیے رکھا جاتا تھا گویا انگلی رکھ کر بتا دیا گیا کہ اسے ذبح کرو[1]

قاتل پکڑا گیا

واقعہ کا اصلی حصّہ یہی ہے کہ اللہ سبحانہٗ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ ان سے کہو کہ گائے ذبح کر کے گائے کے ایک حصّہ کو مقتول کے جسم پر ضرب لگائیں۔ اگر وہ ایسا کریں گے تو مقتول زندہ ہو کر خود قاتل کو بتائے گا۔

اس موقعہ پر ذہنوں میں یہ خلش ضرور پیدا ہوتی ہے کہ ذبح بقرہ اور مقتول کی زندگی میں کیا مناسبت ہے۔ قاتل کا پتہ لگانے کے لیے یہ غیر معمولی صورتِ حال کیوں اختیار کی گئی؟

اللہ سبحانہٗ کی حکیمانہ بلندیوں تک پہنچنا تو انسان کے بس میں نہیں ہے لیکن جن لوگوں نے بنی اسرائیل کی تاریخِ حیات کا مطالعہ کیا ہے وہ یہ بات بخوبی جانتے ہیں کہ گائے کی عظمت اور تقدیس ان کے دلوں میں جس قدر رچ چکی تھی کہ قدم قدم پر ان کی راہ میں آڑ بن رہی تھی۔ آپ پڑھ چکے ہیں کہ گوسالہ پرستی کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان سے تورات کی تعمیل کے لیے کہا تو انہوں نے اس وقت بھی حیلہ جوئیوں سے کام لیا۔ اگر رفع طور کا نشان ان پر ظاہر نہ ہوتا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تکذیب میں پس و پیش نہ کرتے۔ ابھی تک قانونِ الٰہی کی پذیرائی کے باوجود قانون پر عمل کے لیے ان کی بے باک طبیعتیں آمادہ نہیں ہیں۔ اور اُن کے دلوں سے گائے کی تقدیس کا عقیدہ دُور نہیں ہوا تھا۔ بلکہ ان کی حالت سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ گائے کی تقدیس کی گرفت نے ان کو پکڑ رکھا تھا۔ اس موقعہ پر ان کی اصلاح کے پیشِ نظر اللہ کی حکمت نے فیصلہ یہی فرمایا کہ بنی اسرائیل کی اس گمراہی کا کسی ایسے طریق سے علاج کیا جائے جس کا مشاہدہ خود ان کی آنکھیں کر لیں۔

چنانچہ گائے ذبح کرا کے اُن کو دکھا دیا کہ جس کی تقدیس تمہارے دل میں اس قدر پیوست ہو چکی ہے اس کی حقیقت یہ ہے کہ تم نے خود اپنے ہاتھوں سے اس کو فنا کے گھاٹ اتار دیا اور وہ تمہارا بال بھی بیکا نہ کر سکی۔ اور یہ بھی جتا دیا کہ یہ خیال نہ کرنا کہ گائے کے پارۂ گوشت سے مُردہ میں

[1] تفہیم القرآن ج ۱ ص ۸۵

زندگی آنا گائے کا کمال ہے۔ اگر یہ گائے کا کمال ہوتا تو جس کے پارۂ گوشت سے مُردہ زندہ ہوا ہے وہ خود کیوں زندہ نہیں ہوا۔ بلکہ یہ اللہ کا کام ہے کہ وہ کس سے کیا کام لیتا ہے۔ امرِ واقعہ یہ ہے کہ موت وحیات کا معاملہ اللہ کے قبضے میں ہے۔

قرآن عزیز نے غالباً اسی حکمت کے پیش نظر ذبح بقرہ کے واقعہ کو دو حصّوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصّہ میں بنی اسرائیل کی گوسالہ پرستی کی تائید میں بقرہ کا یہ واقعہ بیان فرمایا کہ جب ایک مقصد کے تحت بنی اسرائیل سے گائے ذبح کرنے کو کہا گیا تو گوسالہ کی عظمت ان کی طاعت میں حائل ہو گئی اور انہوں نے قسم قسم کے سوالات کیے لیکن بالآخر ان کو مجبور ہو کر تعمیلِ حکم کرنی پڑی۔ اس مرحلہ پر سامعین کے ذہن میں یہ سوال اُبھرا اور شوق پیدا ہوا کہ وہ یہ معلوم کریں کہ گائے ذبح کرنے کا واقعہ اور کس طرح پیش آیا ہے۔ چنانچہ قرآن نے دوسرے حصّہ کے اسی سوال کا جواب ایک واقعہ کی صورت میں ان آیات میں دیا ہے۔

۱۸۷ اس آیت سے قصّہ کا رُخ قدرتِ خالق، حقیقتِ بعثت اور موت وحیات کی ماہیت و کیفیت کی طرف ہو جاتا ہے۔ اور اندازِ بیان غائب سے خطاب کی جانب منتقل ہو جاتا ہے اور اصل واقعہ کے نمایاں پہلو کو واضح کیا جاتا ہے کہ تمہارے بزرگوں میں سے عامیل نامی شخص کو قتل کر دیا تھا۔ تم میں سے ہر ایک دوسرے پر الزام دھرنے لگا اور تم جس چیز کو چھپاتے تھے، یعنی صفتِ ایمانی یا قاتل کے حال کو۔ اللہ تعالیٰ اس کو ظاہر کرنا چاہتا ہے[۱]

اصل میں قاتل کا پتہ نہیں لگ رہا تھا۔ کوئی کہتا تھا کہ فلاں قاتل ہے اور کوئی کہتا تھا کہ فلاں۔ ایک دوسرے پر الزام لگا رہے تھے۔[۲]

۱۸۸۔ ہم نے حکم دیا کہ مارو اس مقتول پر گائے کا ایک ٹکڑا۔ یعنی جب گائے کا ٹکڑا اس مقتول کے جسم پر مارو گے تو مقتول زندہ ہو جائے گا اور اپنے قاتل کا نام بتائے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا[۳]

اس مقام پر یہ بات تو بالکل صریح ہے کہ مقتول کے اندر دوبارہ اتنی دیر کے لیے جان ڈالی گئی کہ وہ قاتل کا پتہ بتا دے۔ لیکن اس غرض کے لیے جو تدبیر بتائی گئی یعنی لاش کو اس کے ایک حصّہ سے ضرب لگاؤ اس کے الفاظ میں کچھ ابہام معلوم ہوتا ہے تاہم اس کا قریب ترین مفہوم وہی ہے جو قدیم مفسرین نے بیان کیا ہے یعنی یہ کہ اوپر جس گائے کے ذبح کرنے کا حکم دیا تھا اسی کے گوشت سے مقتول کی لاش پر

---

[۱] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۱۴　[۲] تفسیر ماجدی ص ۲۹　[۳] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۱۴

ضرب لگانے کا حکم ہوا۔ اس طرح یک کرشمہ دو کار ہوئے۔ ایک یہ کہ اللہ کی قدرت کا ان کو ایک نشان دکھایا گیا۔ دوسرے یہ کہ گائے کی عظمت و تقدیس اور اس کی معبودیت پر بھی ایک ضرب کاری لگی کہ اس نام نہاد معبود کے پاس اگر کچھ بھی طاقت ہوتی تو اسے ذبح کرنے سے ایک آفت بپا ہو جاتی نہ کہ اس کا ذبح ہونا اُلٹا مفید ثابت ہو[1]

یہ حقیقت ہے کہ گائے کے ٹکڑے کے ذریعے مقتول کو زندہ کر کے قاتل کا پتہ بتانا اللہ تعالیٰ کی شانِ قدرت کا ایک عجیب و غریب نشان ہے جو یہود کی سخت جبلت اور متمردانہ خصلت کے مقابلے میں حق کی تائید کے لیے حکمتِ الٰہی کے پیشِ نظر ظہور میں آیا۔ اور جو نشان ہونے کے علاوہ اپنے اندر متعدد مصالح رکھتا تھا۔ خود قرآن کا سیاق و سباق اسی کی تائید کرتا ہے۔ چنانچہ اسی جگہ فرمایا ہے كَذَٰلِكَ يُحْيِي اللَّهُ الْمَوْتَىٰ ۔ اسی طرح اللہ مُردوں کو زندہ کرے گا اور اسی کے سیاق میں ارشاد ہے وَيُرِيكُمْ آيَاتِهِ تاکہ دکھا دے تم کو اپنی نشانیاں۔ گویا ذبح بقرہ کا قصہ نقل کرنے سے پہلے بار بار بنی اسرائیل کو آیاتِ الٰہیہ دکھانے کا ذکر اور پھر واقعہ کے ساتھ ہی آخرت میں احیاء موتی پر اس سے استشہاد اس بات کی واضح دلیل ہے کہ کسی تاویل اور دراز کار باتوں کی پناہ لیے بغیر ان آیات کی صاف اور واضح تفسیر وہی ہے جو سطور بالا میں پیش کی گئی۔

یہ کہنا قطعاً بے وزن ہے کہ اس واقعہ کا تورات میں جب کوئی ذکر نہیں ہے تو قرآن نے یہ واقعہ کہاں سے پیش کیا ہے اور معلوم ہے کہ اسرائیل کی تاریخ حیات کے لیے سب سے مستند ذریعہ تورات ہے۔

یہاں مفتی محمد عبدہٗ کا جواب بہت خوب ہے کہ قرآن یہ واقعہ اسی علمی مرکز کی جانب سے پیش کر رہا ہے جس نے اسرائیل کے بارے میں یہ انکشاف کیا ہے کہ نَسُوا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوا بِهِ اسرائیل اللہ کی جانب سے آئی ہوئی باتوں میں سے ایک حصے کو بھول چکے ہیں اور یہ کہ أُوتُوا نَصِيبًا مِّنَ الْكِتَابِ جنہیں کتاب اللہ کے علم ہی سے ایک حصہ دیا گیا ہے۔ بلاشبہ تورات میں یہ حکم موجود ہے اور قرآن نے اس کے فراموش شدہ حصہ کا انکشاف کیا ہے۔ اس ایک واقعہ پر اور اس ایک حکم پر کیا منحصر ہے۔ بہت سے واقعات اور احکام میں قرآن نے اُن کی تحریفات اور تلبیسات کی نشاندہی کی ہے۔

اس سلسلے میں گائے حاصل کرنے سے متعلق تفسیری کتابوں میں جو عجیب و غریب قصے بیان کیے گئے ہیں ان سب کا سرچشمہ اسرائیلی افسانے ہیں۔ یعنی یہ وہ قصے ہیں جو یہود کے ذرائع سے مشہور ہو گئے اور تفسیروں

---

[1] تفہیم القرآن ج ۱ ص ۸۶

میں درج کر دیے گئے۔ لیکن محققین نے ان کو قرآن کی تشریح میں کبھی قبول نہیں کیا۔ حافظ عماد الدین ابن کثیر رح جو نقد روایت میں مثالی بلکہ استدلالی شخصیت ہیں فرماتے ہیں کہ

یہ سلسلۂ بیانات جو عبیدہ، ابو العالیہ اور سدی وغیرہ سے مروی ہے ان میں باہم اختلاف ہے اور صاف بات یہ ہے کہ یہ اسرائیلی ذرائع کی تخلیق ہیں۔ اگرچہ ان کو نقل کرنا درجہ جواز میں آسکتا ہے مگر ہم ان کی تصدیق و تکذیب کے مکلف نہیں ہیں۔ اسی بنا پر ان روایات کا قطعاً کوئی اعتبار اس وقت تک نہیں جب تک قرآن و سنت سے ان کی تائید نہ ہو جائے۔

اور خاص اس واقعہ کے متعلق لکھتے ہیں:

گائے کا وہ حصہ جو مقتول کے جسم سے مارا گیا تھا کونسا تھا؟ کوئی بھی حصہ ہو واقعہ میں جس قدر مذکور ہے معجزہ ہونے کے لیے وہی کافی ہے۔ اگر اس حصہ کا تعین بھی ہماری معلومات کے لیے ضروری ہوتا تو اللہ سبحانہ اسے ضرور واضح فرما دیتے مگر اللہ نے اسے مبہم ہی رکھا ہے۔ اگرچہ اصل حقیقت کے لحاظ سے وہ بہرحال متعین ہے۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی اس کے تعین کے متعلق کوئی صحیح روایت ثابت نہیں ہے لہذا ہمارے لیے بھی یہی مناسب ہے کہ ہم بھی اسے اسی طرح مبہم رہنے دیں جس طرح اللہ نے مبہم رکھا ہے۔ (البدایہ والنہایہ ج ۱ ص ۱۱۲)

ایک شبہ کا ازالہ

اس تفسیر کے بعد اس سوال کا جواب بھی مل گیا کہ قرآن نے خصوصیت کے ساتھ واقعہ کے اس حصے کو پورے واقعہ سے علیحدہ کر کے کیوں بیان کیا۔ یہ واقعہ کے بیان کرنے کا مؤثر دل نشین فنی پہلو ہے جس سے یہ واقعہ اپنے سیاق و سباق سے خوب ہم آہنگ ہے۔

یہ تفسیر سامنے رکھ کر معاملہ کے سارے پہلوؤں پر نظر ڈالو، ہر بات اس طرح واضح ہو جاتی ہے گویا تمام قفلوں کے لیے صرف اسی ایک چابی کی ضرورت تھی اضربوہ ببعضھا کا مطلب بھی ٹھیک ٹھیک اپنی جگہ بیٹھ گیا۔ کسی دور از کار توجیہہ کی ضرورت باقی نہیں رہی کیونکہ اس طرح ہی حقیقت حال بتانے کی گائے کے عقیدت کیشوں کو ضرورت تھی۔ گائے سے عابدانہ تعلقات رکھنے والوں کی عقیدت پاش پاش ہو گئی۔ واللہ مخرج ما کنتم تکتمون کا عملی مظاہرہ سامنے آگیا اور وہ تمام بے معنی توجیہیں غیر ضروری ہو گئیں جن کی وجہ سے بعض جدید ارباب تفسیر یہ ترجمہ کرنے پر مجبور ہو گئے۔

ہم نے حکم دیا کہ اس شخص پر جو فی الحقیقت قاتل تھا مقتول کے بعض اجزائے جسم سے ضرب لگاؤ۔

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً ۚ وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ ۚ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَآءُ ۚ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ۗ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ

پھر تمہارے دل اس کے بعد سنگین ہو گئے[۱۹۰] سنگین بھی کیسے؟ ایسے جیسے[۱۹۰] پتھر ہوتے ہیں بلکہ سنگینی میں پتھروں سے بھی زیادہ۔ کیونکہ پتھروں[۱۹۱] میں تو کچھ پتھر ایسے بھی ہیں جن میں سے نہریں بہہ کر آتی ہیں اور ان پتھروں میں کچھ پتھر ایسے بھی ہیں جو پھٹ جاتے ہیں تو ان میں سے پانی نکل آتا ہے اور انہیں میں وہ چٹانیں بھی ہیں جو خدا کے خوف سے گر جاتی ہیں اور یاد رکھو کہ اللہ تمہارے کاموں سے بے خبر نہیں۔

اگر تم ایک لاش پر کھڑے ہو اور قاتل کا پتہ نہ ہو، صورتِ حال اتنی سنگین ہو گئی ہو کہ ایک دوسرے پر الزام لگایا جا رہا ہو تو ایسی حالت میں مسئلہ کا حل کیا ہو گا جبکہ معاملہ بھی اس کی بارگاہ میں ہو جو موت و حیات کا مالک ہے۔ اگر مردہ خود بول پڑے تو معاملہ پل جھپکنے میں ختم ہو جائے گا۔

چونکہ معاملہ کا تعلق مالک موت و حیات سے تھا اس لیے مُردے کو زندہ کر کے اس نے اپنی احیائی شان کا مظاہرہ کر دیا اس لیے اب كذالك يحي الله الموتىٰ کی تفسیر میں کسی تکلف کی احتیاج باقی نہ رہی۔ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بات نہیں بلکہ اللہ کی بات ہے۔ ایسے ہی اللہ مُردے زندہ کرے گا یعنی جیسے یہ مُردہ زندہ کیا ہے ایسے ہی روزِ قیامت سب کو زندہ کرے گا اور تم بھی ان میں ہو گے۔ اور اس تشریح سے اس سوال کا جواب بھی خود بخود سمجھ میں آ گیا کہ آخر میں ویریکم آیاتہ کیوں فرمایا۔ کیونکہ یہ اللہ کی قدرت کی نشانی تھی کہ دیکھنے والوں نے مُردہ زندہ ہوتے دیکھا اور قاتل کا نام اس کی زبان سے کانوں نے سُنا اور لعلکم تعقلون کے ذریعے متنبہ کر دیا کہ معلوم کے ذریعے وہ کچھ جان سکتے ہو جو ابھی تک تمہارے لیے مجہول ہے یعنی سمجھ لو کہ جو ذات ایک جان کے زندہ کرنے کی قدرت رکھتی ہے وہ سب کے زندہ کرنے پر بھی قادر ہے۔ اگر یہ قانون اور مسئلہ سمجھنے کی بات ہوتی تو تعبیرِ عقل سے نہیں تذکر، تفکر، تدبر اور تفقہ سے ہوتی۔

دراصل یہ سارا معاملہ ہی دوسرا ہے جب تک یہ حقائق پیشِ نظر نہ ہوں اصلیت کا سراغ نہیں

مل سکتا۔ سب سے پہلے یہ حقیقت سمجھنی چاہیے کہ جو واقعہ ان آیات میں بیان کیا گیا ہے وہ کس دور کا ہے یہ بات اس وقت کی ہے جب تورات کا نزول نہیں ہوا۔ پھر یہ بات سامنے لانی چاہیے کہ یہ واقعہ گائے پرست قوم کا ہے اور جنہیں پیش آیا تھا وہ یہودی تھے اور فرعون کی غلامی سے نئے نئے آزاد ہوئے تھے اور دلوں میں گائے کی عبادت کی چسک تھی۔ صرف اتنی سی بات پر غور کرنے سے سارا معاملہ حل ہو جاتا ہے۔

قلبی قساوت

یہاں تک اسرائیلی تاریخ حیات کا چہرہ بیان فرمایا اور بتایا ہے کہ مال و دولت کا حصول، حق اور باطل میں التباس، کتمانِ حق، دین کا کاروبار، شخصی مسئولیت سے بے پروائی، غلامی سے آزادی کے بعد سرکشی، گوسالہ پرستی، گستاخی اور بے ادبی، ظلم کاری اور معصیت پر اصرار، فطرت کا فساد اور اخلاقی بگاڑ، قتلِ انبیاء، اللہ کی آیات کا کفر، عہد و پیمان کے بعد اس سے روگردانی اور انحراف، غداری، عہد شکنی، حیلہ سازی، تعمق اور کثرتِ سوال اور نبوت کی شان میں گستاخیاں ان کے مزاجوں میں راسخ ہو گئی تھیں۔ یہاں پہنچ کر قاری اور سامع کے ذہن میں معاً یہ سوال ابھرتا ہے کہ اس کے بعد پھر کیا ہوا۔ یا یہ کہ اس طرزِ عمل اور زندگی کو اس انداز پر ڈھالنے کا نتیجہ پھر کیا ہوا۔ اسی سوال کا جواب ان آیات میں دیا ہے کہ پھر تمہارے دل سنگین ہو گئے یعنی دلوں میں سنگینی آنے کا باعث یہ اعمال بنے ہیں۔ یہاں ثُمَّ نہ استبعاد کے لیے ہے اور نہ استعجاب کے لیے بلکہ صرف ماقبل سے مابعد کو متاخر بتانے کے لیے آیا ہے اور ذالک کا اشارہ اس پوری عملی زندگی کی طرف ہے جس کا چہرہ دور سے بیان ہوتا آ رہا ہے۔ قرآن میں دوسرے مقام پر قساوت کو ان کی ایسی زندگی کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ سورۂ مائدہ کی آیت نمبر بارہ دیکھئے:

فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيثَاقَهُمْ لَعَنَّاهُمْ وَجَعَلْنَا قُلُوبَهُمْ قَاسِيَةً

اُن کی عہد شکنی کی وجہ سے ہم نے ان پر لعنت کی اور اُن کے دلوں کو سنگین کر دیا۔

یعنی عہد شکنی اور غداری کی وجہ سے ہم نے ان کو اپنی رحمت سے دور کر دیا اور اُن کے دل کو سنگین کر دیا۔ اس تعبیر سے یہ ظاہر فرما دیا کہ ان کے ملعون اور سنگدل ہونے کا سبب عہد شکنی اور بے وفائی ہے جو خود اُن کا کردار ہے۔

قربان جائیے اس بلیغانہ انداز بیان کے، منظر کشی میں قرآن اپنی مثال نہیں رکھتا ۔

۱۸۹ ؎ - تمہارے دل سنگین ہو گئے - یہ قساوت سے بنا ہے ۔ قساوت عربی میں ہر چیز کی سختی اور شدت کو کہتے ہیں ۔ سخت پتھر کو حجر قاس اور ایسی زمین کہ جس میں پیداوار کی صلاحیت نہ ہو ارض قاسیہ کہتے ہیں ۔ قساوت یہ ہے کہ حق قبول کرنے اور نصیحت سے اثر پذیری کی اس میں کوئی صلاحیت نہ ہو ۔ مطلب یہ ہے کہ قبولِ حق کے باب میں تمہارے دلوں میں سختی آگئی ہے ۔ قساوت کے بالکل رقت، لین اور اخبات آتا ہے ۔ احادیث میں اہلِ یمن کے دلوں کی رقت کا ذکر اسی معنے میں ہے ۔ صحیح مسلم میں ہے ۔

فرمایا ۔ یمن کے لوگ آئے ہیں، یہ لوگ بڑے رقیق القلب ہوتے ہیں ۔ ایمان و دین کی حکمت تو یمن ہی کا حصہ ہے ۔

حافظ ابن القیمؒ فرماتے ہیں کہ اللہ سبحانہ نے تین قسم کے دل قرآن میں ایک مقام پر بتلائے ہیں ۔ قلب مریض، قلب قاسی اور قلب مخبت ۔ دل کی بیماری یہ ہے کہ اس میں حق کا جماؤ نہیں ہوتا ۔ اور دل کی قساوت یہ ہے کہ اس میں حق کے لیے پذیرائی نہیں ہوتی ۔ اور قلب کا اخبات یہ ہے کہ حق کے سامنے عجز و نیاز کا اظہار کر کے اسے قبول کرلیں اور اس پر جم جائیں ۔ ہدایات کو فراموش کر جانا، ہدایات کے معانی اور مطالب کو بگاڑ دینا قساوت کی خاص علامات ہیں ۔

۱۹۰ ؎ - ایسے سنگین جیسے پتھر ہوتے ہیں بلکہ سنگینی میں پتھروں سے بھی زیادہ ۔ اس میں قلوب کی قساوت اور اس کے مختلف مدارج کو ایک بلیغ تشبیہہ دے کر سمجھایا ہے کہ قلب کی قساوت یہ ہے کہ اس میں اثر پذیری اور تاثر کی کوئی صلاحیت نہ رہے دین کی فہم کے لیے اس میں کوئی حرکت نہیں ہے اور اللہ کے خوف سے وہ یکسر خالی ہو چکے ہیں ۔ یہ بے حس قلوب جن سے ہدایت کے چشمے تو کیا ابلیں گے ہدایت کا کوئی قطرہ بھی ان میں نہیں ہے ۔ قلوب قاسیہ ہیں جو سختی میں پتھروں سے بھی بڑھ کر ہیں کیونکہ پتھروں میں کچھ نہ کچھ آثارِ تاثر کچھ نہ کچھ حرکت تو نظر آتی ہے ان میں وہ بھی نہیں ہے ۔ آیت میں حرف اَوْ کے دو معنے کے گئے ہیں ۔ رازیؒ کہتے ہیں کہ بل کے معنے میں ہے اور مطلب یہ ہے کہ پتھر جیسے سخت ہیں بلکہ پتھر سے بھی زیادہ سخت ہیں ۔ لیکن قرطبیؒ اور آلوسیؒ نے اسے تنویع کے لیے بتایا ہے اور معنے یہ ہیں کہ اُن کے دل دو قسم کے ہیں کچھ تو پتھر جیسے سخت اور کچھ پتھروں سے بھی زیادہ سخت ۔ اور یہی زیادہ اچھا ہے ۔

۱۹۱ ؎ - پتھروں میں کچھ پتھر ایسے بھی ہیں جن سے نہریں بہہ کر آتی ہیں ۔ یعنی سنگینی کی وجہ سے

زمین کی طرح ان میں پیداوار تو نہیں ہوتی۔ لیکن ان سے چشمے نکلتے ہیں اور چشموں سے نہریں جاری ہوتی ہیں اور نہروں سے پوری زمین سیراب ہوتی ہے اور زمین کی سیرابی سے انسانی معیشت کے لیے رحمتوں کے دروازے کھلتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ سنگینی کے باوجود پتھروں میں یہ تاثر موجود ہے۔ لیکن ان میں کسی درجے میں اثر پذیری کی صلاحیت نہیں ہے اور اس سے نیچے درجے میں کچھ پتھر ایسے بھی ہیں جن سے دریا تو نہیں مگر کچھ پانی ضرور نکلتا ہے۔ اور کچھ پتھر ایسے بھی ہیں جو اللہ کی ہیبت سے نیچے گر جاتے ہیں۔ پتھروں میں اپنی طبیعت کے خلاف یہ انفعالات موجود ہیں۔ لیکن ان میں گناہوں، بدکرداریوں اور بدعنوانیوں کی وجہ سے انسانی طبیعت رکھتے ہوئے اثر پذیری کا کچھ بھی مادہ نہیں ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ پتھروں میں بھی کسی درجہ میں تاثر پایا جاتا ہے مگر ان میں کسی درجہ میں حق کے قبول کرنے کا کوئی اثر نہیں ہے۔ شیخ الہندؒ فرماتے ہیں:۔

بعض پتھروں سے بڑا نفع ہوتا ہے کہ انہار اور پانی بکثرت ان سے جاری ہوتے ہیں اور بعض پتھروں سے پانی کم نکلتا ہے اور پہلی قسم کے مقابلے میں نفع کم ہوتا ہے اور بعض پتھروں سے گو کسی کو نفع نہ پہنچے مگر خود ان میں ایک اثر اور تاثر ہوتا ہے۔ لیکن ان کے دل ان تینوں قسموں کے پتھروں سے سخت تر ہیں نہ ان سے کسی کو نفع اور نہ ان میں کوئی مضمونِ خیر موجود ہے[1]

اس کا مطلب یہ ہے کہ اس مقام پر تین قسم کے پتھروں کے ذکر میں خاص بلیغانہ انداز میں یہ بتایا ہے کہ بعض پتھروں میں تاثر اتنا قوی ہوتا ہے جس سے نہریں جاری ہو جاتی ہیں جن سے مخلوقِ خدا فائدہ اٹھاتی ہے اور ان یہودیوں کے دل ایسے بھی نہیں ہیں کہ مخلوقِ خدا کی تکلیف میں پگھل جائیں۔ اور بعض پتھروں میں گو اس درجہ کا اثر نہیں مگر پھر بھی ایک اثر تو ہے کہ خوفِ خدا سے گر جاتے ہیں مگر ان کے دلوں میں اتنا بھی جذبہ انفعالی نہیں ہے[2]

افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ یہ جانتے ہوئے کہ مشبہ بہ پتھر ہیں اور یہودیوں کی قساوتِ قلبی کو پتھروں سے تشبیہہ دی گئی ہے۔ بعض اہلِ قلم نے پتھروں کی ان اقسام پر یہ نوٹ سپردِ قلم فرمادیا کہ

بعض پتھروں سے دریا پھوٹ نکلتے ہیں اور ان سے عالم سیراب ہوتا ہے۔ اس قسم کے پتھروں کی مثال انسانی آبادی میں انبیاء و رسل ہیں۔ ان کے چشمۂ فیض سے ایک عالم اپنی روحانی پیاس

---

[1] حاشیہ شیخ الہند ص

[2] معارف القرآن م ش ص ۱۹۱

بھاتا اور سیراب ہوتا رہتا ہے۔

ایسے پتھر بھی ہیں جن سے پانی نکلتا ہے اور ان سے بھی کسی درجہ میں اللہ کی مخلوق سیراب ہوتی ہے اس نوعیت کے پتھروں کی مثالیں اولیاء اُمت اور اَبرار و متقین ہیں۔

اور کچھ پتھر اللہ کی ہیبت سے گر جاتے ہیں اس طرح کے پتھروں کی مثال مومنین و صالحین ہیں (تفسیر ماجدی ص ۳۰) خبر نہیں کہ موصوف اس کے ذریعے قرآن کے قاریوں کو کیا سمجھانا چاہتے ہیں؟ اگر وہ جانتے ہیں کہ پتھروں سے یہودیوں کو تشبیہ دی جا رہی ہے تو کیا وہ یہ سمجھانا چاہتے ہیں کہ اس مشبہ بہ کا عکس ان میں جن کو تشبیہ دی گئی ہے یہ ہے کہ یہودیوں میں کچھ انبیاء و رُسل کے مقام کی، کچھ اولیاء و ابرار کی حیثیت کی اور کچھ عام مومنین جیسی شخصیتیں موجود ہیں۔ اگر یہ کچھ سمجھانا ہو تو یہ مراد قرآنی نہیں ہے۔ قرآن کی مراد تو یہ جتانا ہے کہ یہودیوں کی قلبی و اخلاقی حالت انتہائی تنزل کی وجہ سے ایسی حالت رونما ہو گئی ہے کہ عبرت پذیری اور تنبیہ کی استعداد یک قلم معدوم ہو گئی ہے اور وہ اپنی اس تباہ شدہ حالت پر قانع ہیں۔ ذرا خیال فرمائیے کہ جب تشبیہ بُرائی میں ایسے آخری درجہ کی دی جا رہی ہو اور تشبیہ بھی پتھروں سے سنگینی میں دی جا رہی ہو وہاں انبیاء و رُسل و ابرار و متقین کے ذکر کا کونسا محل ہے؟ یہ موصوف کی خالص اپنی ذہنی اختراع ہے۔ ورنہ جو لوگ قرآن کی بلاغت کا ذوق رکھتے ہیں اور جن کو اللہ نے فہم قرآن کی نعمت سے مالا مال کیا ہے ان میں سے کسی نے یہ بات نہیں کہی ہے۔ اور یہ بات کسی کی زبان پر آ کیسے جائے جبکہ ان آیات میں جو بات کہی جا رہی ہے وہ صرف یہ ہے کہ بنی اسرائیل کے قلوب کی سختی اور قبولِ حق میں بے اثری کا عالم یہ ہے کہ اگر محاورہ اور بول چال کی زبان میں یوں کہہ دیا جائے کہ ان کے پہلو میں دل نہیں بلکہ پتھر کے ٹکڑے ہیں۔ پھر بھی اُن کی شدت و صلابت کی صحیح تصویر سامنے نہیں آ سکتی۔ اس لیے کہ پتھر اگرچہ سخت ہے مگر ناکارہ نہیں ہے۔ کیا تم نے پہاڑوں کو نہیں دیکھا یہ پہاڑ ہی تو ہیں کہ ان ہی کے سخت پتھروں سے دریا اور نہریں نکل کر بہہ رہی ہیں۔ اور کہیں ان ہی سے شیریں اور خنک پانی کی سوت جاری ہے۔ اور اگر زلزلہ آ جائے یا اللہ کی مشیت کا کوئی اور فیصلہ ہو جائے تو پہاڑوں کی یہی دیو پیکر چٹانیں ٹوٹ کر سرنگوں ہو جاتی ہیں اور اللہ تعالیٰ کے خوف و خشیت کا زبانِ حال سے اقرار کرتی ہیں، مگر بنی اسرائیل پر نہ اللہ کی آیات کا اثر ہوتا ہے اور نہ نبوت کی شیریں اور دل پسند نصیحتوں کا۔ اور نہ نافرمانی کے وقت خدا کا خوف ان پر طاری ہوتا ہے۔

اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ یُّؤْمِنُوْا لَكُمْ وَقَدْ كَانَ فَرِیْقٌ مِّنْهُمْ یَسْمَعُوْنَ كَلٰمَ اللّٰهِ
ثُمَّ یُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ وَهُمْ یَعْلَمُوْنَ ﴿۷۵﴾

اے مسلمانو! کیا تمہیں ان سے توقع ہے کہ یہ تمہاری[192] بات مان لیں گے حالانکہ ان میں سے ایک گروہ[193] کا یہ شیوہ رہا ہے کہ اللہ کا کلام سنتا، اس کا پورا مطلب سمجھتا لیکن پھر بھی جان بوجھ کر اس میں تحریف کر دیتا۔

جان بوجھ کر حق سے انحراف

پہلی آیت میں بنی اسرائیل کے دلوں کا نقشہ بیان کیا گیا تھا کہ ان کے دل پتھروں سے بھی زیادہ سخت ہیں ان میں کوئی نرمی نہیں، کوئی احساس نہیں، زندگی کی کوئی رمق نہیں۔ ان کی طبیعتیں کھوکھلی، جامد اور بے حس ہیں۔ اب ان سادہ دل مسلمانوں کو سمجھایا جا رہا ہے جو دوسروں تک حق پہنچانے کے لیے بے چین ہیں، اس کے لیے اپنے کاروبار کو نقصان پہنچا چکے ہیں، اپنی عمر بھر کا اندوختہ لٹا چکے ہیں، اپنی چھوٹی موٹی تجارتوں پر پانی پھیر چکے ہیں، اپنی کھیتی باڑی اور باغات کو ویران کر کے، وطن سے بے وطن ہو کر دُنیا والوں سے سفہاء کی پھبتی سن چکے ہیں کہ جن لوگوں کی داستان یہ ہے ان سے تم کچھ زیادہ لمبی چوڑی توقعات نہ رکھو۔ ورنہ جب ان کے پتھر دلوں سے تمہاری دعوتِ حق ٹکرا کر واپس آئے گی تو دل شکستہ ہو جاؤ گے۔ یہ لوگ تو صدیوں سے عصیان و عُدوان کے خوگر ہیں۔ ایمان کی طبیعت ان کی طبیعتوں سے مختلف ہے اور ایمان کی پیداوار کے لیے جو صالح زمین درکار ہے یہ وہ زمین نہیں ہے۔ یہ بات نہیں کہ حق میں قوتِ فاعلی نہیں ہے۔ بلکہ اصل بات یہ ہے کہ مفعول میں قوتِ قابلی نہیں ہے۔ اللہ کی جن آیات کو سن کر تم پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے، رونگٹا کھڑا ہو جاتا ہے، دلوں میں عجز و نیاز آ جاتا ہے۔ ان ہی آیات سے یہ کھیلتے اور تمسخر کرتے ہیں۔ اہلِ حق کو یہ بیوقوف کہتے ہیں اور زندگی میں خدا ناشناسی بلکہ خدا کی کھلم کھلا بغاوت کو اصلاح سمجھتے ہیں۔ ان سے یہ توقع رکھنا بے کار ہے کہ حق کی آواز پر لبیک کہیں گے۔

۱۹۲ ۔ اے مسلمانو! کیا تمہیں ان سے یہ توقع ہے کہ وہ تمہاری بات مان لیں۔ یہاں عربی لفظ یو منوالکم ہے یہاں ایمان کے ساتھ لام آیا ہے۔ عموماً اس کے ساتھ حرف با آتا ہے۔ دونوں میں باریک سا فرق ہے اگر با کے ساتھ لفظ ایمان استعمال ہو تو اس کے معنے اذعان اور یقین کے آتے ہیں اور اگر لام کے ساتھ ہو تو اس کے معنے اعتراف و تسلیم اور انقیاد کے آتے ہیں۔ چونکہ علماء نے ایمان کی تعریف میں عموماً تصدیق ہی کا لفظ ذکر کیا ہے اس لیے عام طور پر غلط فہمی یہ پیدا ہو گئی ہے کہ ایمان گویا تصدیق کے ہم معنی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قرآن میں ہر جگہ ایمان کو تصدیق کے معنے میں سمجھ لیا گیا۔ حالانکہ دونوں میں بہت بڑا فرق ہے۔ اگر یہ ملحوظ نہ ہو تو آیاتِ قرآنی کی مراد متعین کرنا دشوار ہو جائے گا۔

ایمان کے معنے

حافظ ابن تیمیہؒ نے یہ بات کھول کر بتائی ہے۔ ان کی تحقیق کا خلاصہ یہ ہے کہ ایمان کا لفظ امن سے بنا ہے۔ اس لیے امانت و اعتماد کے معنے اس میں ہونے ضروری ہیں چاہے یہ با کے ساتھ استعمال ہو یا لام کے ساتھ۔ ایمان صرف ان خبروں میں مستعمل ہو گا جو اپنی چشم دید نہ ہوں بلکہ عدم موجودگی کی ہوں۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے واپس آکر حضرت یعقوب علیہ السلام کی خدمت میں جب حضرت یوسف علیہ السلام کے قتل کا غلط افسانہ پیش کیا تو ومانت بموٴمن لنا کہا۔ کیونکہ یہ واقعہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی غیر حاضری میں ہوا اور حضرت یعقوب علیہ السلام کو ان پر اعتماد و اطمینان نہ تھا۔ اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کی حضرت لوط علیہ السلام نے تصدیق کی۔ حضرت لوط علیہ السلام کی تصدیق کو بھی قرآن نے آمن له لوط سے تعبیر کیا ہے کیونکہ انہوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اعتماد پر ان کے ایمان کی تصدیق کی تھی۔

اس تحقیق کی روشنی میں آیت کے معنے یہ ہوں گے۔ تمہارے اعتماد پر یہ لوگ تمہاری باتوں کی تصدیق کیونکر کریں گے اور تمہاری بات کیسے مان لیں گے؟

یہ خطاب ہے ان مسلمانوں سے جو قریب کے زمانے میں نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے تھے۔ ان لوگوں کے کان میں پہلے سے نبوت، کتاب، ملائکہ، آخرت، شریعت وغیرہ کی جو باتیں پڑی ہوتی تھیں، وہ سب انہوں نے ہمسایہ یہودیوں ہی سے سُنی تھیں۔ اور یہ بھی انہوں نے یہودیوں ہی سے سنا تھا کہ دُنیا میں ایک پیغمبر اور آنے والے ہیں اور یہ کہ جو لوگ ان کا ساتھ دیں گے وہ ساری دُنیا پر چھا جائیں گے۔ یہی معلومات تھیں جن کی بنا پر اہلِ مدینہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

کی نبوت کی چرچا سن کر آپ کی طرف خود متوجہ ہوئے اور جوق در جوق ایمان لائے۔ اب وہ متوقع تھے کہ جو لوگ پہلے ہی انبیاء اور کتبِ آسمانی کے پیرو ہیں اور جن کی دی ہوئی خبروں کی بدولت ہی ہم کو نعمتِ ایمان میسر ہوئی وہ ضرور ہمارا ساتھ دیں گے بلکہ اس راہ میں پیش پیش ہوں گے۔ چنانچہ یہی توقعات لے کر یہ پُرجوش مسلمان اپنے یہودی دوستوں اور ہمسایوں کے پاس جاتے تھے اور ان کو اسلام کی دعوت دیتے تھے۔ پھر وہ اس دعوت کا جواب انکار سے دیتے تھے تو مخالفین اس سے یہ استدلال کرتے تھے کہ معاملہ کچھ مشتبہ ہی معلوم ہوتا ہے ورنہ اگر واقعی یہ نبی ہوتے تو آخر کیسے ممکن ہے کہ اہلِ کتاب کے علماء اور مشائخ اور مقدس بزرگ جانتے بوجھتے ایمان لانے سے منہ موڑتے اور خواہ مخواہ اپنی عاقبت خراب کر لیتے[1]

۱۹۳ ۔ حالانکہ ان میں سے ایک گروہ کا یہ شیوہ رہا ہے۔ گروہ سے مراد وہ لوگ ہیں جو کوہ طور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کلامِ الٰہی سننے گئے تھے۔ انہوں نے وہاں سے آکر یہ تحریف کی کہ ہم نے یہ بھی ساری بات ختم ہونے پر سنا کہ کر سکو تو احکام پر عمل کر لینا ورنہ ان کے ترک کا بھی اختیار ہے۔ اور بعض نے فرمایا کہ کلامِ الٰہی سے کلامِ الٰہی مراد تورات ہے اور اس کی تحریف سے یہ مراد ہے کہ اس میں لفظی اور معنوی تبدیلی کر لیتے تھے۔ کبھی آپ کی نعت کو بدلا، کبھی آیت رجم کو اڑا دیا[2]

اصل عربی میں وَ قَدْ کَانَ فَرِیْقٌ مِّنْهُمْ ہے۔ اس میں کَانَ کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں اور لغت و نحو دونوں اس کی اجازت دیتے ہیں۔ ایک یہ کہ ایک ایسا فریق تھا اسرائیلیوں میں۔ گویا ذکرِ ماضی کا اور موجود یہودیوں کے اسلاف کا ہو رہا ہے۔ دوسرے یہ کہ ایسا فریق ہے یعنی ذکر حال کا اور ہم عصر یہودیوں کا ہو رہا ہے۔ ائمہ تفسیر سے دو قسم کے اقوال منقول ہیں لیکن سیاق دوسرے معنے کے زیادہ موافق ہے کیونکہ حجت معاصرین پر قائم ہو رہی ہے اور ملزم ان ہی کو قرار دینا زیادہ مناسب ہے[3]

ایک گروہ سے مراد ان کے علماء اور حاملینِ شریعت ہیں۔ کلام اللہ سے مراد تورات، زبور اور وہ دوسری کتابیں ہیں جو ان لوگوں کو انبیاء کے ذریعے پہنچی ہیں۔ تحریف کا مطلب یہ ہے کہ بات کو اصل معنے و مفہوم سے پھیر کر اپنی خواہش کے مطابق کچھ دوسرے معنے پہنا دینا جو قائل کے منشا کے خلاف ہوں۔ نیز الفاظ میں تغیر و تبدل کو بھی تحریف کہتے ہیں۔ علمائے بنی اسرائیل نے دونوں طرح

۱؎ تفہیم القرآن ج ۱ ص ۸۴ ۲؎ حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۱۵ ۳؎ تفسیر ماجدی ص ۳۱

کی تحریفیں کلام اللہ میں کی ہیں [1]

یہودی علماء کی یہ بہت بڑی شقاوت تھی کہ کتاب اللہ کی اطاعت کرنے کی جگہ کتاب اللہ کو اپنی خواہشوں اور رایوں کے مطابق کام میں لانا چاہتے ہیں وہ اس کی آیتوں میں تحریف کرتے تھے۔ اور تحریف بھی فکر اور سوچ کی غلطی سے نہیں بلکہ مانتے ہوئے کہ یہ غلط ہے اور سمجھتے ہوئے کہ ایسا کرنا سنگین گناہ ہے یعنی یا تو کسی آیت کا مطلب اس طرح ٹھہراتے کہ بات کچھ سے کچھ ہو جاتی یا کتاب اللہ کی آیتیں سناتے ہوئے اپنی طرف سے گھٹا بڑھا دیتے کہ اصلی مطلب ظاہر نہ ہو اور جو بات بتانی چاہتے ہیں کسی نہ کسی طرح بن جائے۔

حکیم الاُمت حضرت شاہ ولی اللہؒ نے حجۃ اللہ البالغہ میں دین میں تحریف کے موضوع پر جو مقالہ سپردِ قلم فرمایا ہے اس میں تحریف کی حقیقت، تحریف کے اسباب اور تحریف کی صورتوں کا احاطہ فرمایا ہے۔ یہاں اس کی تفصیل کا موقعہ نہیں ہے۔ انشاء اللہ سورۃ توبہ میں یہ بحث آئے گی۔

نیز تورات اور انجیل میں تحریف کا موضوع قرآن کے خاص مباحث میں سے ہے۔ قرآن نے جس تحریف کا دعویٰ کیا ہے اس کی حقیقت کیا ہے اور تاریخی طور پر اس کی حیثیت کیا ہے؟ اس کے لیے بھی آپ کو سورۃ مائدہ کے انتظار کی زحمت گوارا کرنی ہوگی۔

یہاں صرف یہ بات سمجھنے کی ہے کہ قرآن نے ان پر صرف تحریف ہی کا الزام نہیں لگایا بلکہ اس کے ساتھ یہاں یہ بھی فرمایا ہے کہ وہ یہ کام دیدہ و دانستہ کرتے تھے اور اس کے لیے تعبیر یہ اختیار فرمائی ہے مِنْۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ یعنی کلام اللہ میں مطالب کو بگاڑنے کا یہ کام دو باتوں کے باوجود کرتے تھے۔

اوّل یہ کہ وہ کلام اللہ کو پورے طریقے پر سمجھ لیتے، اس کے مطالب کو عقل کی گرفت میں لیتے اور حقیقت کا پورے طور پر ادراک کر لینے کے بعد کرتے تھے۔ یہ بات نہ تھی کہ یہ کام وہ کسی غلط فہمی، کج فہمی اور کسی سوچ بچار کی غلطی سے کرتے تھے بلکہ بالارادہ پورے فکر و شعور کے ساتھ یہ کام انجام دیتے تھے۔

دوم یہ کہ وہ جانتے ہوئے کرتے تھے کہ جو کچھ کر رہے ہیں یہ غلط ہے ہمیں یہ کام نہ کرنا چاہیے اور یہ کام کرتے وقت ان کو یہ علم ہوتا تھا کہ حقیقت یہ ہے اور ہم اسے اس طرح بگاڑ رہے ہیں یعنی ان کا یہ کام کسی بھول، خطا اور ذہول کا نتیجہ نہ تھا۔

---

[1] تفہیم القرآن ج ۱ ص ۸۷۔

یہ دو قیدیں لگا کر قرآن نے اُن کے عمل کی بُرائی اور گندگی کو صرف نمایاں نہیں کیا بلکہ اُن کے عصیان و فسوق پر مُہر لگا دی ہے ۔

اس آیت میں تحریف سے کیا مُراد ہے ؟ ابنِ جریرؒ فرماتے ہیں کہ یہاں مطالب اور معانی کی تحریف مراد ہے ۔ اگر لفظی تحریف کو بتانا یہاں مقصود ہوتا تو آیت میں یَسْمَعُوْنَ کَلَامَ اللّٰہِ نہ ہوتا اور مِنۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوْہُ کی قید نہ ہوتی ۔ آلوسیؒ نے بھی ابنِ جریرؒ کی ہمنوائی کرتے ہوئے آیت کا مطلب یہی بتایا ہے کہ وہ تورات کی آیات سنتے ہیں لیکن ان میں اپنے اغراض کے مطابق تاویلات فاسدہ کرتے ہیں ۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے بھی اسی کی تائید نقل کی گئی ہے ۔

اس تشریح سے ان علماء کی تائید ہوتی ہے جنہوں نے یہاں فریق سے زمانہ نبوت کے یہودی علماء اور حاملینِ شریعت مراد لیے ہیں اور پوری آیت کا مطلب یہ ہے کہ تم ان لوگوں سے ایمان کی توقع لگائے ہوئے ہو جن کے علماء اور حاملینِ شریعت کلامِ الٰہی اور تورات کو سُن کر اس کی آیات کو مطالب کا غلط جامہ پہنا دیتے ہیں ۔ اور یہ غلط جامہ پہناتے ہوئے وہ جانتے ہیں کہ یہ غلط ہے لیکن ان کی طبیعت کی کجی ، خواہشات کی پیروی اور اپنے مفادات کی تکمیل ان کو اس تحریف پر آمادہ کرتی ہے ۔ ایسی صورت میں ان سے یہ کیسے توقع رکھی جا سکتی ہے کہ وہ اس دعوتِ ایمان کو قبول کرلیں جو تم پیش کر رہے ہو ۔

اور اگر آیت میں فریق سے مراد گزشتہ زمانہ میں یہودیوں کا وہ گروہ ہو جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کوہِ طور پر تھا تو آیت میں تحریف سے مطالب کی تحریف نہیں بلکہ الفاظ کی تحریف مراد ہوگی اور آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ یہ تو وہ لوگ ہیں جن کے اَسلاف اصل کلام سُن کر اس کو بدل دیتے تھے ان کو سرکشی و انکار اور تحریف وراثت میں ملی ہے ۔ ان سے ایمان کی توقع بیکار ہے ۔ ان کا قرآن کی دعوت کو قبول نہ کرنا اس لیے نہیں کہ قرآن کی دعوت مشتبہ ہے بلکہ اس لیے ہے کہ یہ لوگ تو صدیوں کے بگڑے ہوئے ہیں ۔ اللہ کی آیات کو بدل ڈالنا ، حق سے انحراف اور اس کا انکار ان کا آبائی پیشہ ہے ۔ اگر وہ اب اس دین کو نہیں مانتے تو اس پر حیرت نہ ہونی چاہیے جس کے دلائل ٹھیٹھ عقلی اور جس کا اعجاز علمی ہے ۔ قرآن علومِ ہدایت ، دقائق بلاغت کا شاہکار ہے ۔ اس کی جن آیات کو سُن کر تم پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے ان ہی سے کھیلتے اور تمسخر کرتے ان کی نسلیں بیت گئی ہیں ۔

وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚ وَاِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ قَالُوْٓا اَتُحَدِّثُوْنَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ لِيُحَآجُّوْكُمْ بِهٖ عِنْدَ رَبِّكُمْ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۷۶﴾ اَوَلَا يَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ﴿۷۷﴾

نصف

اور دیکھو ان کا حال تو یہ ہے کہ جب اہلِ ایمان سے ملتے ہیں تو اپنے تئیں مومن[۱۹۴] ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور باہم تنہائی میں مسلمانوں سے الگ ہو کر ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں[۱۹۵] تم ان مسلمانوں کو وہ باتیں کیوں بتاتے ہو جن کا علم اللہ نے تمہارے لیے کھولا ہے۔ کیا اس لیے بتاتے ہو کہ وہ تمہارے خلاف[۱۹۶] تمہارے پروردگار کی عدالت میں حجت میں پیش کر سکیں۔ کیا اتنی سی موٹی بات بھی تمہاری عقل میں نہیں آتی۔ افسوس ہے ان کے دعویٰ ایمان پر۔ کیا ان کو اتنا بھی پتہ نہیں[۱۹۷] ہے کہ ان کا معاملہ کسی انسان سے نہیں بلکہ اس اللہ سے ہے اور اللہ کے علم سے کوئی بات بھی چھپی نہیں ہے۔ نہ وہ جو چھپا کر کرتے ہیں اور نہ وہ جو ظاہر کرتے ہیں۔

عقیدے کا فساد

یہ آیت بھی پہلی آیت کا تتمہ ہے اور یہ بتایا جا رہا ہے کہ کیا تم ان سے ایمان کی توقع رکھتے ہو جن کی اخلاقی گراوٹ اس درجہ میں پہنچی ہوئی ہے کہ ابن الوقتی کو شیوہ بنا رکھا ہے اور پوری زندگی دوغلی بنی ہوئی ہے۔ ان کے دوغلے پن اور ابن الوقتی کا حال یہ ہے کہ اہلِ ایمان سے ملتے ہیں تو ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں مگر جب اپنی مجلسوں میں پہنچتے ہیں اور ان سے پوچھا جاتا ہے تو ان کا رنگ کچھ اور ہوتا ہے۔ ابن الوقتی کا عالم یہ ہے کہ اہلِ ایمان سے مل کر یہ بھی کہتے ہیں کہ تورات میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بشارت آتی ہے اور اپنی خلوتوں میں باہم ان باتوں کے بتانے پر منع کرتے ہیں۔

۱۹۴ہ۔ یہود میں جو لوگ منافق تھے وہ بطورِ خوشامد اپنی کتاب میں سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں مسلمانوں سے بیان کرتے۔ دوسرے لوگ ان میں سے ان کو اس بات پر ملامت کرتے

کہ اپنی باتیں ان کو کیوں بتاتے ہو۔ کیا تم نہیں جانتے کہ مسلمان تمہارے پروردگار کے آگے تمہاری خبر دی ہوئی باتوں سے تم پر الزام قائم کریں گے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سچے جان کر بھی ایمان نہ لاتے اور تم کو لاجواب ہونا پڑے گا۔

یہ آیت دراصل دعوتِ اسلامی کے ایک نتیے مرحلے کی نشاندہی کر رہی ہے۔ اصلاح و دعوت کے بارے میں کمزوری یہ ہے کہ عام لوگ نئی دعوت اور پرانی ڈگر کے معاملے میں ایک قسم کی حیرت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ وہ یہ نہیں دیکھتے کہ حق کیا ہے اور کدھر ہے بلکہ یہ سوچتے ہیں کہ ہمارا فائدہ کس چیز میں ہے، اگر دعوت کو قبول کرتے ہیں تو پارٹی سے علیحدگی کا اندیشہ ستاتا ہے۔ اور اگر پرانی ڈگر پر قائم رہتے ہیں تو ہدایتِ حق سے محرومی کا دھبہ لگتا ہے۔ ایسے لوگ اپنی موقع پرستی، ابن الوقتی کا مظاہرہ کرنے کے لیے سب سے تعلقات استوار کر لیتے ہیں تاکہ حالات کے ہر موڑ سے استفادہ کر سکیں۔ اس قسم کا مدینہ کے یہودیوں میں بھی ایک طبقہ تھا۔ ان آیات میں قرآن نے ان کا چہرہ پیش کیا ہے۔

سے ۱۹۵ - اور جب باہم تنہائی میں ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں۔ اس فقرے میں کہنے والے اور ہیں اور پہلے فقرے میں کہنے والے اور ہیں۔ دونوں جگہ قالوا آیا ہے۔ جو ایمان کا دعویٰ کرنے والے ہیں ان کو دوسرے لوگ کہتے تھے اور تنہائی میں کہتے ہیں یعنی یہ دیکھ کر کہتے کہ آس پاس کوئی مسلمان تو نہیں ہے۔

کیا کہتے تھے؟ یہ بات کہ اتحدثونھم بما فتح اللہ علیکم ان مسلمانوں کو تم وہ باتیں کیوں بتلاتے ہو جن کا علم اللہ نے تمہارے لیے کھولا ہے۔ یعنی وہ اسرار و تعلیمات جو تمہاری مقدس کتابوں اور آسمانی صحیفوں میں محفوظ ہیں۔ مثلاً آخری نبی کی بشارتیں جو تمہاری مقدس کتابوں اور آسمانی صحیفوں میں محفوظ ہیں۔ مثلاً آخری نبی کی بشارتیں اور علامتیں۔ یہود جب باہم ملتے تو ایک دوسرے کو قائل کرتے کہ تم اپنے ہاں کی پیشین گوئیاں اور خاص تعلیمات مسلمانوں کو کیوں بتاتے ہو[1]

اللہ نے جن کا علم تمہارے لیے کھولا ہے، جو کچھ کھولا ہے سے مراد شریعت اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت کا وہ انعام ہے جو بنی اسرائیل پر ہوا ہے۔ اس میں حاملِ شریعت کو قیدی سے تشبیہہ دی ہے اور اس کے بتانے کو اس تعلق کی بنا پر کھولنے سے۔ یا جو کچھ کھولا سے مراد یہ ہے کہ اللہ نے تم سے آنے والے نبی کے ماننے اور اس کی نصرت کرنے کا جو عہد لیا ہوا ہے اس کا

---

[1] تفسیر ماجدی ص ۱۳۱

تم مسلمانوں سے نہ کرو۔ گویا وہ آپس میں ایک دوسرے کو کہتے کہ تورات اور دیگر کتب آسمانی میں جو پیش گوئیاں اس نبی کے متعلق ہیں یا جو آیات اور تعلیمات ہماری مقدس کتابوں میں ایسی ملتی ہیں جن سے ہماری موجودہ روش پر گرفت ہو سکتی ہے انہیں مسلمانوں کے سامنے بیان نہ کرو۔

۱۹۶ ۔ تمہارے خلاف تمہارے پروردگار کے حضور میں حجت پیش کریں۔ یعنی تمہارے رب کے سامنے تمہارے خلاف حجت کے طور پر پیش کریں گے۔ یہ تھا اللہ کے متعلق ان ظالموں کے فساد عقیدہ کا حال۔ گویا وہ اپنے نزدیک یہ سمجھتے تھے کہ اگر دُنیا میں وہ اپنی تحریفات اور اپنی حق پوشی کو چھپا لے گئے تو آخرت میں ان پر کوئی مقدمہ نہ چل سکے گا[1]

لیحاجوکم بہ عند ربکم کا ایک مفہوم تو یہی ہے کہ یہ لوگ قیامت میں اللہ کے حضور میں تمہیں قائل کرلیں گے لیکن زیادہ جی لگتے ہوئے معنے یہ ہیں کہ اسی دُنیا میں تم پر حجت قوی قائم کردیں گے اور عند ربکم یہاں عند اللہ کی طرح حجت قوی کے معنے میں ہے۔ اس لیے کہ آخرت میں حجت قائم کرنے کے لیے کسی ایسے ظاہری سہارے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہاں تو کشف حقائق از خود ہو کر رہے گا اس لیے احتجاج بکتاب اللہ کے لیے یہاں عند اللہ کی تعبیر آئی ہے۔ زمخشری، بیضاوی، آلوسی، نسفی کے اشارات بھی ایسے ہی ہیں۔

۱۹۷ ۔ کیا ان کو اتنا بھی پتہ نہیں ہے۔ یعنی اللہ کو توان کے سارے معاملات ظاہر ہوں یا مخفی بالکل معلوم ہیں ان کی کتاب کی ساری دلیلیں مسلمانوں کو بتا سکتا ہے اور جا بجا بتا بھی دیا۔ آیت رجم کو انہوں نے چھپایا مگر اللہ نے ظاہر فرما کر ان کو رُسوا کر دیا۔ یہ اُن کے علماء کا حال ہے۔ یہ عقل مندی اور کتاب دانی کے مدعی تھے[2]

اللہ جب چاہے اپنے رسُولؐ اور اہل ایمان کو مطلع کر سکتا ہے موٹی سی بات ہے کہ اللہ کے لیے ایسے اُمور کی اطلاع اپنے پیغمبر کو دے دینا مشکل ہی کیا تھا لیکن بے مغز اس امکان کی طرف اپنا ذہن ہی نہ لاتے تھے کہ شاید اس مدعی نبوّت کا تعلق خدا تعالیٰ کے ساتھ واقعی کچھ ہو۔ ٹھیک اسی طرح جیسے آجکل مغربی قومیں اس امکان ہی کو قبول کرنے کو تیار نہیں ہیں کہ کہیں واقعی قرآن خدا ہی کی کتاب نہ ہو[3]

---

[1] تفہیم القرآن ص ۸۸ [2] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۱۵ [3] تفسیر ماجدی ص ۳۱

وَمِنْهُمْ أُمِّيُّونَ لَا يَعْلَمُونَ الْكِتٰبَ إِلَّآ أَمَانِيَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّونَ ﴿۷۸﴾

اور ان میں سے وہ لوگ بھی ہیں جو بالکل ان پڑھ ہیں۔ اور کتاب اللہ سے اُن کا تعلق خوش اعتقادی کے ولولوں اور آرزوؤں کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اور عقائد کی جگہ صرف وہم و گمان ان کا سرمایۂ نجات ہے۔

عوامی زندگی میں دین کا سرمایہ

اُمتوں میں انحطاط و زوال کا نقطۂ آغاز نبوت کے لائے ہوئے علم و عمل سے رشتہ ٹوٹنا ہے۔ جب یہ رشتہ ٹوٹتا ہے تو زندگی کے ہر گوشہ میں انحطاط آجاتا ہے۔ دین کی قدریں مٹ جاتی ہیں، دینداری کی ہیبت دلوں میں نہیں رہتی۔ اور عوامی زندگی نبوت کے لائے ہوئے علوم ہدایت سے قطعاً بے بہرہ ہو کر ایک طبقہ کی رعیت بن کر رہ جاتی ہے اور یہ طبقہ عوامی استحصال کو اپنی زندگی کا منتہائے نظر بنا لیتا ہے۔

اس آیت میں عوامی زندگی کا جو چہرہ پیش کیا جارہا ہے اس میں تنقید اُن کی خوش فہمی پر ہے، مفروضات کی پیروی پر ہے، خواہشات کے مطابق من گھڑت افسانوں پر ہے۔ بغیر سند اور دلیل، جھوٹے ولولوں اور بلند بانگ نعروں پر ہے۔

بتایا جارہا ہے کہ یہ اَن پڑھوں کا وہ گروہ ہے جنہیں کتاب الٰہی سے ولولوں سے زیادہ کوئی تعلق نہیں اور جن کا اعتقادی سرمایہ صرف اوہام اور عملی سرمایہ صرف چند من گھڑت رسوم ہیں۔

ف ۱۹۸۔ ان میں سے وہ لوگ بھی جو بالکل ان پڑھ ہیں۔ اصل لفظ اُمِّيُّونَ ہے۔ یہ اُمّی کی جمع ہے جو نہ لکھ سکے اور نہ پڑھ سکے۔ زجاج نے تشریح کی ہے کہ اُمّی وہ ہے جو اُمتِ عرب کی صفت پر ہو۔ ان پڑھ ہونا عرب کی خاص صفت تھی جس میں وہ دوسری قوموں سے ممتاز تھے۔ صحیحین میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا انا امة اُمیة لا نکتب ولا نحسب ہم اُمّی جماعت ہیں نہ لکھنا جانیں نہ حساب کرنا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہ حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے اُمتِ اسلامیہ کی خصوصیت بیان ہو رہی ہے یعنی رسول اللہ ہو نے

کی حیثیت میں آپؐ یہ نہیں فرما رہے ہیں کہ ان پڑھ ہونا مسلمانوں کی خصوصیت ہے بلکہ عربی کی حیثیت سے یہ فرما رہے ہیں کہ ہم یعنی عرب کی اَن پڑھ ہونا صفت ہے۔ کیونکہ رسُول ہونے کی حیثیت میں آپ کی تشریف آوری کا تو مقصد ہی قرآن نے یہ بتایا ہے کہ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ۔ پیغمبر تعلیم دیتا ہے تم کو کتاب و حکمت کی۔ ظاہر ہے کہ اس کے بعد اُمّی ہونے کا سوال ہی بے محل ہے۔ بخیر یہاں یہ تو جملہ معترضہ درمیان میں ویسے ہی آ گیا۔ اگر قفسِ عنصری میں انفاسِ حیات کا سلسلہ قائم رہا تو انشاءاللہ اس کے تفصیلی مباحث آپ کو سورۃ یونس میں ملیں گے۔ بہرحال اگر اُمّی کے معنے اَن پڑھ کے ہیں تو اُمّی کو ہمارے محاورات میں عامی کی طرح سمجھنا چاہیے کیونکہ عامی وہ ہے جو عوام الناس کی صفت پر ہے۔

قرآن میں حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اُمّی کہا گیا ہے۔ آپؐ کے اُمّی ہونے سے ایک طرف قرآن اپنے اعجاز کو ثابت کر رہا ہے اور دوسری طرف آپؐ کے اس معجزہ کی جانب توجہ دلائی جا رہی ہے کہ باوجود اُمّی ہونے کے کمالِ علوم سے سرفراز ہیں۔ پس اس لحاظ سے لفظ اُمّی آپؐ کے حق میں صفت مدح ہے اور غیر کے لیے مذموم۔

۱۹۹ ف۔ یعنی ان کو تو کچھ بھی خبر نہیں مگر چند آرزوئیں۔ اصل عربی لفظ امانی ہے جھوٹی آرزوئیں۔ خیالات کے اندازے، اُمیدیں ٹھہرائی ہوئیں، امنیۃ کی جمع ہے جس کے معنے کسی ٹھہرائی ہوئی تمنّا اور اندازہ کی ہوئی چیز کے ہیں۔ بعض مفسّرین نے امانی کے معنے جھوٹی باتوں کے اور بعض نے بے سمجھے بوجھے پڑھ لینے کے بتائے ہیں۔ چونکہ جھوٹی بات میں ایک بے حقیقت چیز کا ٹھہرانا ہوتا ہے اور بے سمجھے پڑھنا اندازے پر چلنا ہے۔ اس لیے یہ دونوں معنی امنیۃ سے مراد ہو سکتے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ یہ تو ان کو بالکل پتہ نہیں تورات میں کیا لکھا ہے مگر چند آرزوئیں جو اپنے عالموں سے جھوٹی باتیں سُن رکھی ہیں مثلاً بہشت میں یہودیوں کے سوا کوئی نہ جائے گا اور ہمارے باپ دادا ہمیں بخشوا لیں گے۔ اور یہ ان کے خیالات بے اصل ہیں جن کی ان کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے۔[1] یہ اُن کے عوام کا حال ہے۔ علمِ کتاب سے کورے ہیں کچھ نہیں جانتے کہ اللہ نے اپنی کتاب میں دین کے کیا اُصول بتائے ہیں، اخلاق اور شرع کے کیا قواعد ہیں اور انسان کی فلاح و خسران کا مدار کن چیزوں پر ہے۔ اس علم کے بغیر وہ اپنے مفروضات اور خواہشات کے مطابق گھڑی ہوئی

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۱۵۔

باتوں کو دین سمجھے بیٹھے ہیں اور جھوٹی توقعات پر جی رہے ہیں۔[1]

گویا ان کی عامی زندگی میں ایمان و عمل نام کی کوئی چیز باقی نہ تھی۔ عقائد کی حدود میں وہ سُنے سنائے قصوں اور توہمات پر ایمان رکھتے تھے اور یہ سمجھے ہوتے تھے کہ بنی اسرائیل کا گھرانہ اللہ کا خاص کنبہ اور خاندان ہے اور ان کے خاندان کے پیغمبر اور نبی چونکہ خدا کے پیارے اور محبوب ہیں اس لیے ان کی اولاد اور نسل بھی دُنیا و آخرت میں یہی درجہ رکھتی ہے۔ اگر ان پر کوئی مصیبت بھی پڑے گی پھر بھی ان کے خاندان کے بزرگ جو خدا کے بزرگ اور برگزیدہ ہیں وہ ہر طرح ان کو اس سے بچا لیں گے ان کا دعویٰ تھا نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰہِ وَاَحِبَّآؤُہٗ۔

عوامی زندگی کا نبوت کی راہ سے آتے ہوتے علم سے رشتہ ٹوٹنے کا نتیجہ یہ نکلا۔

اوّلاً۔ خدا کی کتاب جو اس غرض سے آئی تھی کہ لوگ اسے پڑھیں اور اس پر عمل کریں یک قلم عام زندگی میں بے کار ہو گئی۔

ثانیاً۔ ہدایت کا مرکز اللہ کی کتاب نہ رہی بلکہ توہمات ہو گئے۔

ثالثاً۔ انسان کی عقلی ترقی کی تمام راہیں بند ہو گئیں۔

رابعاً۔ توہم پرستی، جہل و کوری کا دروازہ کھل گیا کیونکہ جب نجات کا مدار ایمان پر عقائد کی جگہ توہمات اور اعمال کی جگہ رسُوم پر آ ٹھہرا، تو ظاہر ہے کہ عقل و بینش کی جگہ جہل و کوری پھیلے گی۔

یہ سرگزشت تو یہودی دُنیا کی ہے جسے قرآن نے مخاطب کیا تھا لیکن خود مسلمانوں کا کیا حال ہوا جنہیں اس دعوت کی تبلیغ سپرد کی گئی تھی۔ افسوس ہے کہ وہ خود بھی اس گمراہی سے نہ بچ سکے اور ان کی عوامی زندگی کا رشتہ نبوت کے لاتے ہوتے علم و عمل سے ٹوٹ چکا۔ نتیجہ نکلا کہ وہ تمام خرابیاں ظہور میں آ گئیں جن کا دروازہ قرآن نے بند کرنا چاہا تھا۔ اور سب سے بڑا فساد یہ پیدا ہوا کہ ان کی علمی و عملی ترقی یک قلم رک گئی اب معاملہ یہاں تک پہنچ چکا ہے کہ ایک طرف عقائد کی جگہ چند من گھڑت افسانوں اور اعمال کی جگہ چند رسُوم نے لے لی ہے۔ اور دوسری طرف تمام اقتصادی، سیاسی اور اخلاقی زندگی میں اسلامی قوانین پر عملدرآمد ختم ہو کر رہ گیا ہے، اور پوری اجتماعی زندگی اس اُمیت کے نتیجہ میں اختلال کا شکار ہو کر رہ گئی۔ یہ انبوہِ عظیم جسے مسلمان قوم کہا جاتا ہے اس کا حال یہ ہے کہ اس کے ۹۹۹ فی ہزار نہ کتاب و سنت کا علم رکھتے ہیں، نہ حق و باطل کی تمیز سے

---

[1] تفہیم القرآن ج ۱ ص ۸۸

فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ ﴿۷۹﴾

پس ہلاکت اور تباہی ہے ان لوگوں کے لیے جن کا شیوہ یہ ہے کہ اپنے ہاتھوں سے کتاب لکھتے ہیں پھر لوگوں سے کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے یعنی اس میں جو کچھ لکھا ہے وہ اللہ کے احکام ہیں اور یہ اس لیے کرتے ہیں تاکہ اس کے معاوضہ میں دُنیا کا حقیر فائدہ حاصل کر لیں پس ان کے ہاتھوں کی لکھائی ان کی تباہی کا اور ان کی کمائی بھی ان کی بربادی کا سامان ہے۔

آشنا ہیں۔ نہ ان کا اخلاقی نقطہ نظر اور ذہنی رویہ اسلام سے ہم آہنگ ہے۔ باپ سے بیٹے اور بیٹے سے پوتے کو بس مسلمان کا نام وراثت میں ملتا آ رہا ہے اس لیے یہ مسلمان ہیں۔

انشاء اللہ ہم اس موضوع پر دوسرے پارے میں جہاں قرآن نبوت کے مقاصد سے بحث کرے گا تفصیلی بحث کریں گے اور بتائیں گے کہ نبوت کے علم و عمل سے اُمت کے تعلقات کیسے بحال ہو سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں نبوت کا پیغام کیا ہے۔ خلافتِ راشدہ نے کیا کام کیا ہے اور ائمہ نے کیا تجاویز پیش کی ہیں۔

یہودی علماء اور دین کا کاروبار

پہلے بتایا تھا کہ عوام کی دین کی زندگی چند توہمات اور رسوم کا نام ہو کر رہ گئی ہے اب بتانا چاہتے ہیں کہ یہ صورتِ حال اس لیے رونما ہوئی ہے کہ ان کے علماء نے دین کی زندگی کا کاروبار شروع کر دیا تھا اور اس کاروبار میں وہ اپنے عوام کو دین سے بے بہرہ رکھ کر ان کا استحصال کر رہے تھے۔ ان کا استحصال کیا تھا؟ ان آیات میں علماء کے اسی کردار کی نقاب کشائی کی ہے اور بتایا ہے کہ انہوں نے دین کی ساری باتوں کو یک قلم دکانداری اور پیشہ بنا لیا تھا۔ اور ان کی پوری زندگی ہر معنے میں دکانداری

زندگی ہوگئی تھی۔ علمِ دین کا پڑھنا، پڑھانا، مسائلِ دین کی تعلیم، فتویٰ نویسی، ہدایت و وعظ، قرأت و ذکر کوئی کام ایسا نہ تھا جو بغیر دنیوی معاوضہ کے کیا جاتا ہو۔

۳ھ ۔ پس ہلاکت ہو ان لوگوں کے لیے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ان عوام جاہلوں کے موافق باتیں اپنی طرف سے بنا کر لکھ دیتے تھے اور خدا کی طرف ان باتوں کو منسوب کر دیتے۔ مثلاً تورات میں لکھا تھا کہ پیغمبر آخرالزمان خوبصورت، پیچواں بال، سیاہ آنکھیں، میانہ قد، گندمی رنگ کے ہوں گے۔ انہوں نے بدل کر یوں لکھ دیا کہ لامبا قد، نیلی آنکھیں، سیدھے بال ہوں گے تاکہ عوام آپ کی تصدیق نہ کریں اور ہمارے کاروبار میں فرق نہ آجائے[1]

یہ اُن کے علماء کے متعلق ارشاد ہے ان لوگوں نے صرف اتنا ہی نہیں کیا کہ کلامِ الٰہی کے معانی کو اپنی خواہشات کے مطابق بدلا ہو بلکہ یہ بھی کیا کہ بائیبل میں اپنی تفسیروں کو اپنی قومی تاریخ کو، اپنے اوہام اور قیاسات کو، اپنے خیالی فلسفوں کو اور اپنے اجتہاد سے وضع کیے ہوئے فقہی قوانین کو کلامِ الٰہی کے ساتھ خلط ملط کر دیا اور یہ ساری چیزیں لوگوں کے سامنے اس حیثیت سے پیش کیں کہ گویا یہ سب اللہ ہی کی طرف سے آئی ہوئی ہیں۔ ہر تاریخی افسانہ، ہر مفسر کی تاویل، ہر متکلم کا الہیاتی عقیدہ اور ہر قضیہ کا قانونی اجتہاد جس نے مجموعہ کتبِ مقدسہ میں جگہ پالی۔ اللہ کی بات بن کر رہ گیا۔ اس پر ایمان لانا فرض ہوگیا اور اس سے پھر جانے کے معنے دین سے پھر جانے کے ہوگئے[2]

۱۰۲ھ ۔ اس میں جو کچھ لکھا ہے وہ اللہ کی طرف سے ہے۔ یعنی لکھتے خود ہیں اور نام اللہ سبحانہٗ کے لگاتے ہیں۔ امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ اس میں دو حقیقتوں کی طرف اشارہ ہے۔ ایک یہود کی انتہائی شقاوتِ قلب کی جانب کہ کلامِ ربانی میں بھی تحریف سے نہ چوکے۔ دوسرے اس بات کی طرف کہ اس تحریف سے ان کا مقصود کوئی خدمتِ دین نہ تھا تمام تر تحصیل مال و جاہ ہی تھا۔ علامہ قرطبیؒ یہاں بڑے پتے کی بات فرماگئے کہ اللہ کے دین میں ہر قسم کی تبدیلی، تغیر، زیادتی ایک سنگین جرم ہے اور اس آیت کی وعید میں داخل ہے۔

یہاں سوچنے اور سمجھنے کی بات یہ ہے کہ اس آیت میں جس چیز کو بطورِ سنگین جرم پیش کیا جارہا ہے یہ ہے کہ لکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ خدا کی جانب سے ہے۔ اس کی چند صورتیں ہو سکتی ہیں۔

۱۔ خود ہی باتیں گھڑتے ہوں اور ان گھڑی ہوئی باتوں کو اپنے عوام میں گرمیٔ مجلس کی خاطر

---

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۱۵　[2] تفہیم القرآن ص ۸۹

اللہ کے نام پر پیش کرتے ہیں جیسے عام دنیادار اور پیشہ ور واعظوں کا قاعدہ ہے ۔

۲۔ اپنے خیالات کو کتاب اللہ کے ساتھ ملا کر خلط ملط کر کے لکھتے ہوں اور اس طرح لوگوں کی ناوانی سے ناجائز فائدہ اٹھا کر اپنے خیالات کو بھی کتاب اللہ کے درجے میں بتاتے ہوں ۔

۳۔ کتاب اللہ کی بیان شدہ باتوں کو تبدیل کر کے ان کو کتاب اللہ کی بات بتاتے ہیں ۔

آیت میں سارے احتمالات ہیں اور سب از روئے قرآن حرام ہیں ۔

پہلی بات کو بھی قرآن نے سنگین جرم قرار دیا ہے اور اسے قول علی اللہ بغیر علم کہتے ہیں ۔ اس کا ذکر آگے آرہا ہے ۔

دوسری بات سے بھی منع کیا ہے ۔ یہودیوں نے بائبل میں اپنی تفسیروں کو ، اپنی تشریحات کو اور اپنی قومی تاریخ کو اس طرح خلط ملط کر دیا کہ لوگ اسے بھی کتاب اللہ ہی سمجھنے لگے بلکہ انہوں نے خود اس کو لوگوں کے سامنے کتاب اللہ ہی کی حیثیت سے پیش کیا ۔

تیسری بات بھی شریعت میں منع ہے ۔ ان تینوں راہوں سے اللہ کے دین میں فساد اور کتاب اللہ میں تحریف کو آنے کا موقعہ ملتا ہے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ قرآن سے پہلے کوئی کتاب دانستہ اور نادانستہ لفظی تحریفات اور تصرفات سے محفوظ نہیں رہی ۔ لاکھوں پیغمبروں میں سے کسی کا صحیفہ چند کے سوا دنیا میں باقی نہیں ۔ اور جو باقی ہے وہ فنا ہو ہو کر نئے نئے قالب بدلتا رہا ہے ۔ تورات کی حقیقت کو ترجموں کی کثرت بیونت نے بالکل مشتبہ کر دیا ۔

غالباً تاریخ مذاہب کے اسی تجربہ کے پیش نظر قرآن کی حفاظت کی خاطر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کی تلاوت کو تعبد قرار دیا ہے اور تعبد کے طور پر قرآن کے علاوہ کسی دوسری چیز سے قرآن جیسا معاملہ کرنے سے منع فرمایا ۔ قرآن کی شان تعبد کا اظہار اس حدیث میں ہے جو صحیح مسلم میں ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھ سے نہ لکھو اور جس نے مجھ سے قرآن کے علاوہ کچھ لکھا وہ اسے مٹا دے مجھ سے حدیث بیان کیا کرو ۔ اس میں کوئی حرج نہیں ہے اور جس شخص نے میرے بارے میں ارادتاً جھوٹ بولا اسے چاہیے کہ اپنا ٹھکانہ بس دوزخ بنا لے ۔

اگرچہ امام بخاریؒ اور دیگر محدثین کے نزدیک یہ روایت معلول ہے یعنی ان کی تحقیق میں یہ الفاظ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نہیں بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی حضرت ابو سعید خدریؓ کے ہیں جن کو غلطی سے راوی نے حضورؐ کا نام لے کر پیش کر دیا ہے لیکن اگر بالفرض یہ ارشاد نبوّت بھی ہو تو اس کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں کہ قرآن کے الفاظ میں تعبد ہے ۔ قرآن سے الگ ہو کر

کوئی عبارت نہیں جس کے الفاظ میں تعبّد ہو۔ اور تعبدی طور پر جس کی تلاوت کی جاتی ہو۔ خود انداز بیان بتا رہا ہے کہ مقصدِ نبوت یہی ہے۔ ارشاد کے الفاظ یہ ہیں لا تکتبوا عنی غیر القرآن۔ لفظ غیر عربی اسالیب میں اپنا موصوف چاہتا ہے اس لیے اصل عبارت یوں ہے لا تکتبوا عنی قرآناً غیر القرآن۔ یعنی تلاوت کی کوئی چیز میرے سے قرآن کے علاوہ نہ لکھو۔ اس کی تائید خود حضرت ابو سعید خدریؓ کے ان بیانات سے بھی ہوتی ہے جو حافظ ابن عبد البرؒ نے جامع بیان العلم میں درج کیے ہیں۔

ابو نضرہؒ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت ابو سعید خدریؓ سے دریافت کیا کہ آپ سے سنی ہوئی چیزیں قلم بند کرنے کی اجازت ہے؟ فرمایا کیا تم ان کو مصاحف بنانا چاہتے ہو؟

ابو نضرہؒ ہی نے حضرت ابو سعید خدریؓ کے حوالہ سے اس سوال کے جواب میں ہمیں لکھنے کی اجازت دیجئے۔ یہ بھی نقل کیا ہے۔ نہیں نہیں کیا تم اسے قرآن بنانا چاہتے ہو؟۔

اس دور میں اگر قرآن کے ساتھ کچھ اور لکھنے کی اجازت دے دی جاتی تو کتاب اللہ اسی اختلاط کا نشانہ بن جاتی جس سے تورات کے دامن پر تحریف کا دھبہ لگا ہے ـــــ معالم السنن میں علامہ خطابیؒ نے بتایا ہے کہ قرآن کے مقابلے میں حدیث کو نہ لکھنے کی ممانعت کا پس منظر یہی اختلاط ہے فرماتے ہیں کہ ایک ہی صحیفہ قرآن کے ساتھ کچھ لکھنے سے اس لیے منع فرمایا ہے تاکہ التباس نہ ہو اور قاری اشتباہ کا شکار نہ ہو۔ رامہرمزیؒ نے المحدث الفاصل میں یہی بات لکھی ہے۔ بہرحال کہنا یہ چاہتا ہوں کہ یہ نبوت کی جانب سے قرآن کی حفاظت کا عملی اہتمام صرف اس لیے ہوا کہ قرآن بھی کہیں مخلوط ہو کر نہ رہ جائے۔

ورنہ جہاں تک حدیث کے بیان کرنے کی اجازت کا تعلق ہے وہ اس میں صاف اور صریح موجود ہے۔ امیر یمانیؒ نے یہ بات خوب فرمائی ہے کہ

آغاز میں ممانعت اختلاط کے اندیشہ کے پیشِ نظر تھی۔ کیونکہ ابھی لوگوں کے سینوں میں قرآن محفوظ نہ ہوا تھا اور حفاظِ قرآن خال خال تھے۔ جب قرآن سے عوامی زندگی میں لستگی پیدا ہو گئی اور قرآن کے اسالیب، کمالِ بلاغت اور حسنِ نظم سے تعلق پیدا ہو کر ایسا امتیازی ملکہ پیدا ہو گیا اور غیر قرآن کا ذوقِ تمیز پیدا ہو گیا اور التباس کا اندیشہ جاتا رہا تو ممانعت ختم ہو گئی [1]

الغرض قرآن کو غیر قرآن سے خلط ملط سے بچانے کے لیے نبوت کا یہ اقدام تھا اور اس کی

---

[1] توضیح الافکار ص ۲۶۵

حیثیت انتظام کی خاطر سدِ ذرائع سے زیادہ کچھ نہ تھی۔

اسلام بڑے فخر سے گردن اونچی کر کے کہہ سکتا ہے کہ اس نیلگوں چھت کے نیچے دُنیا میں آسمانی کتابوں میں قرآن کے سوا کوئی کتاب محفوظ نہیں ہے۔

۲۰۲ھ۔ ان کے ہاتھوں کی لکھائی ان کی تباہی کا سامان ہے۔ قرآنی اور اسلامی معیارِ صداقت پر تحریف و تصحیف اور اللہ کے نام پر گھڑی ہوئی ہر بات موجبِ لعنت ہے اور حد سے بڑھی ہوئی جسارت ہے اسی لیے یہ بات مسلمانوں کی سمجھ میں نہیں آتی کہ کوئی شخص کسی کلام کو کلامِ الٰہی مان کر اس میں دخل و تصرف کیسے کر سکتا ہے۔ لیکن دوسری قومیں اس معیار ہی سے ناآشنا ہیں بلکہ بعض اہلِ کتاب کے ہاں تو بھلائی کے لیے بُرائی درست اور خدا کی سچائی کی خاطر ہر جھوٹ جائز ہے۔ آج مسیحیت کے نام سے جو تثلیثی شرک پھیلا ہوا ہے اس مذہب کے بانی پولوس اسرائیلی ہیں۔ آپ کا یہ مقولہ آج تک انجیل میں لکھا ہوا ہے کہ اگر میرے جھوٹ کے سبب سے خدا کی سچائی اس کے جلال کے واسطے زیادہ ظاہر ہوئی تو پھر کیوں گنہگار کی طرح مجھ پر حکم دیا جاتا ہے اور ہم کیوں نہ بُرائی کریں تاکہ بھلائی پیدا ہو[1]

۲۰۳ھ۔ ان کی کمائی ہی اُن کی بربادی کا سامان ہے۔ یعنی جو مالی فوائد اپنی غرض مندانہ اور بقول خود دروغ، مصلحت آمیز خرافات، دینی افسانوں، اپنی خود ساختہ عقیدوں کی ترویج سے حاصل کرتے ہیں وہ یہاں مراد ہیں۔ اسی میں رشوت، سُود، ناجائز طریقے سے حاصل کیا ہوا سرمایہ سب داخل ہیں۔ پوری آیت پر ذرا غور فرمایئے بتایا یہ گیا ہے کہ

اپنی خود ساختہ اور من گھڑت باتوں کو خود اپنے آپ لکھتے ہیں اور اسے اللہ کی بات اور دین بتاتے ہیں۔ چاہے یہ عقائد ہوں چاہے اعمال اور چاہے یہ اذکار و وظائف ہوں، قومی رسوم ہوں، ان سب کو وہ لوگوں کے سامنے بلاشبہ اللہ کا دین بنا کر پیش کرتے ہیں اور اس سے ان کی غرض اللہ کی رضا، دین کی برتری، آخرت میں سرخروئی نہیں بلکہ یہ اور صرف یہ ہوتی ہے کہ مادی منافع اور مالی فوائد حاصل کیے جائیں۔ قرآن نے اسی کاروبار کے لیے یشتروا بہ ثمنا قلیلا کی تعبیر اختیار کی ہے۔ اس کاروبار کی صورتیں کس قدر وہاں مروج تھیں اس کی تفصیل کا یہ موقعہ نہیں ان شاء اللہ سورۂ مائدہ میں آرہی ہے۔ دراصل یہ کاروبار اور استمرار بول کر قرآن یہود کے تاریخی واقعہ کی طرف مسلمانوں کو متوجہ کر رہا ہے۔ ان کی تاریخ پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نام نہاد مذہبی پیشواؤں

---

[1] تفسیر ماجدی

وَقَالُوا لَن تَمَسَّنَا النَّارُ إِلَّا أَيَّامًا مَّعْدُودَةً ۚ قُلْ أَتَّخَذْتُمْ عِندَ اللَّهِ عَهْدًا فَلَن يُخْلِفَ اللَّهُ عَهْدَهُ ۖ أَمْ تَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿٨٠﴾

اور وہ کہتے ہیں کہ ہمیں دوزخ کی آگ ہرگز نہ لگے گی، لیکن صرف چند روز گنے چنے ۔ یعنی اگر ہمیں کوئی سزا ملی بھی تو صرف چند روز ملے گی ۔ اے پیغمبر ان لوگوں سے کہہ دو کہ تمہاری یہ بات دو حال سے خالی نہیں ہے یا تو تم نے اللہ سے کوئی عہد لیا ہوا ہے کہ وہ اس کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا اور یا پھر تم اللہ کے نام پر ایسی بات کہہ رہے ہو جس کے متعلق تمہیں علم نہیں ہے ۔

نے مختلف ترکیبوں سے عوام کو اپنے قبضہ میں کر رکھا ہے کہ ان کی گرفت سے وہ کسی طرح باہر نہیں ہو سکتے تھے اللہ کی رحمت کا عام بیوپار یہودی معاشرے میں عام طور سے رائج تھا۔ آٹھ آٹھ آنے سیر یہودی علماء اللہ کی رحمت کو بیچتے تھے ۔ من مانے طور پر جس کسی سے جب چاہتے اور جس قدر چاہتے لوگوں سے وصول کرتے اس میں ایک ان کا کردار تھا اور دوسرا ان کے کردار کا ہنگامی نتیجہ ۔ قرآن نے یہاں دو بار ویل بولا ہے پہلی تباہی ان کے کردار پر ہے اسے ان کے ہاتھوں کی کھائی کہا ہے دوسری تباہی اس کردار کے نتیجے پر ہے اور اسے ان کا اختیاری عمل قرار دیا ہے اور اس کے لیے کسب اور کمائی کا عنوان اختیار فرمایا ہے ۔

نجات یافتہ ہونے کا نعرہ

اُمتوں کا تعلق جب نبوت کے لائے ہوئے علم و عمل سے زندگی کے مختلف گوشوں میں رشتہ ٹوٹ جاتا ہے تو اُمتوں میں اپنی نجات کے لیے طرح طرح کے ولولے اور خوش فہمیاں پیدا ہو جاتی ہیں ۔ آیت میں جو بات یہودیوں کی طرف منسوب کر کے کہی گئی ہے اور اسے بذریعہ عطف پہلی بات کے ساتھ جوڑا گیا ہے اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ عوامی زندگی کا رشتہ جب اللہ کی ہدایت سے ٹوٹ گیا اور عام

زندگی دین سے نا آشنا ہو گئی تو اس کے نتیجہ میں ایک استحصالی طبقہ علماء کے نام سے پیدا ہو گیا تو دوسری طرف عوامی زندگی آخرت سے بے فکر ہو کر آخرت کی نجات کے لیے خوش کن ولولوں، اُمیدوں، آرزوؤں اور نعروں کی مخلوق بن کر رہ گئی۔

۲۰۴ھ - یہ یہودیوں کی عام غلط فہمی کا بیان ہے جس میں ان کے عامی اور عالم سب مبتلا تھے وہ سمجھتے تھے کہ ہم خواہ کچھ کریں بہرحال چونکہ ہم یہودی ہیں لہٰذا جہنم کی آگ ہم پر حرام ہے اور بالفرض اگر ہم کو سزا دی بھی گئی تو بس چند روز کے لیے وہاں بھیجے جائیں گے اور پھر سیدھے جنت کی طرف پلٹا دیے جائیں گے[1]۔

۲۰۵ھ - چند روز گنے چنے۔ بعض نے کہا سات دن اور بعض نے چالیس روز جتنے روز بچھڑے کی پوجا کی اور بعض نے کہا چالیس سال جتنی مدت تیہ میں گزاری اور بعض نے کہا جتنی مدت دنیا میں زندہ رہا[2]۔
سات روز کی وجہ خود یہودیوں کی بتائی ہوئی یہ ہے کہ دُنیا کی ساری عمر سات ہزار سال ہے لہٰذا جس اسرائیلی کو کوئی شفاعت دستیاب نہ ہو سکے گی وہ ہزار کے پیچھے ایک روز دوزخ میں رہے گا۔ اور چالیس روز کی مدت پادری راڈول نے اپنے انگریزی ترجمہ قرآن کے حاشیہ میں اکابر یہود کے حوالہ سے لکھا ہے کہ جن دنوں میں قوم اسرائیل گوسالہ پرستی میں مبتلا رہی تھی بلکہ بعض یہودی ماخذوں سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا اسرائیل اپنے کو آتش دوزخ سے بالکل ہی باہر اور محفوظ سمجھ رہے تھے۔ چنانچہ جیوش انسائیکلوپیڈیا میں یہ عقیدہ یوں نقل کیا ہے۔ آتش دوزخ گنہگاران یہود کو چھوئے گی بھی نہیں کیونکہ وہ جہنم کے دروازے پر پہنچتے ہی اپنے گناہوں کا اقرار کر لیں گے اور خدا کے پاس واپس آجائیں گے۔ (ج ۵ ص ۵۸۳) اور تالمود میں ہے کہ قیامت کے دن ابراہیم دوزخ کے دروازے پر تشریف فرما ہوں گے اور کسی مختون اسرائیلی کو دوزخ میں نہ گرنے دیں گے۔ (ص ۴۰۴)[3]۔

۲۰۶ھ یہودیوں کا یہ نعرہ کہ ان کی اُمت نجات یافتہ ہے اس لیے ممکن نہیں کہ کوئی یہودی ہمیشہ کے لیے دوزخ میں ڈالا جائے۔ اس فقرے کے ذریعے قرآن ان کے اس زعم باطل کی تردید کر رہا ہے اور کہتا ہے کہ جنت و دوزخ کی تقسیم قوموں کی تقسیم کی بنا پر نہیں ہے کہ کسی خاص قوم کے لیے جنت ہو اور باقی کے لیے دوزخ۔ ان سے بطور حجت الزامی دریافت کرتا ہے کہ تمہارا یہ عقیدہ دو حال سے خالی نہیں ہے۔ ایک یہ کہ تمہارے پاس اس کے لیے تمہارے مقدس نوشتوں میں کوئی سند ہو اور اللہ نے تم سے کبھی یہ

---

[1] تفہیم القرآن ص ۹۰ [2] حاشیہ شیخ الہند ص [3] تفسیر ماجدی ص ۲۲۔

معاملہ کرلیا ہو کہ وہ تمہیں دوزخ میں ہرگز نہ ڈالے گا اور اس معاملہ کی وجہ سے اللہ سبحانہ، اس کے ایفا کا پابند ہے اور اس کی خلاف ورزی نہ کرے گا۔ استفہام انکاری ہے۔ یعنی کیا تمہیں خدا نے نجات کا غیر مشروط پٹہ لکھ کر دے دیا ہے کہ جہاں ایک شخص یہودی ہوا آتشِ دوزخ اس پر حرام ہو گئی۔ اگر نہیں دیا ہے اور یقیناً نہیں ہے تو پھر بتاؤ کہ تمہارا ایسا اعتقاد رکھنا اللہ پر افتراء نہیں تو اور کیا ہے؟ اس دوسری بات کو قول علی اللہ بغیر علم سے تعبیر کیا ہے۔ کیا یہ اللہ پر بہتان نہیں ہے اور اللہ پر بہتان طرازی سے زیادہ سنگین جُرم کیا ہو سکتا ہے۔ یہ اُصول محرمات میں قرآن کے نزدیک وہ عظیم جُرم ہے اللہ نے بلا تمیز سب انبیاء کی زبانی جس کی سنگینی کا اعلان کیا ہے۔ دُنیا میں ادیانِ باطلہ کی بھی جُرم اصل واساس ہے۔ اسی کی پستان سے دودھ پی پی کر اللہ کے دین میں تحریف کو پلنے کا موقعہ ملا ہے اور اسی راہ سے سنّت کے مقابلے میں بدعت اور توحید کے مقابلے میں شرک اللہ کے دین میں پہنچا ہے۔

اُمتوں میں عقائد کا بگاڑ، اعمال کا فساد اور اخلاق کا انحطاط جب بھی رونما ہوا ہے اسی راہ سے ہوا ہے آپ جس بُرائی کی طرف اشارہ کریں گے اسی کا شجرہ نسب بالواسطہ یا بلاواسطہ اَنْ تَقُوْلُوْا عَلَی اللّٰہِ مَالَا تَعْلَمُوْنَ سے وابستہ ہوگا۔ نبوّت کے لائے ہوئے علم وعمل اور قرآن وسنّت سے اُمتوں کا تعلق ٹوٹنے کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ علم وعمل عام شاہراہ سے ہٹ کر ان افراد کی ملک بن جاتا ہے جن کی عام شہریوں کی نظر میں کوئی قدر وقیمت نہیں ہوتی۔ شہریوں میں پست ترین، کمترین طبقہ پیشہ ورانہ طور پر اس کا اجارہ دار بن جاتا ہے۔

اللہ اکبر حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کی اعجاز آفرین زبان نے اُمت کو یہی بات کیسے شاندار انداز میں سمجھائی ہے۔ ابن ابی خیثمہؒ نے حضرت انس رضؓ کے حوالہ سے یہ ارشادِ نبوّت روایت کیا ہے اور حافظ عسقلانیؒ نے اسے بلاچون وچرا فتح الباری میں جگہ دی ہے۔

یا رسُولؐ اللہ! یہ ارشاد فرمایئے کہ شہری زندگی میں نیکی کا پرچار اور بُرائی پر روک ٹوک کب ختم ہو گی؟ فرمایا جب تم میں وہ ساری بُرائیاں رونما ہو جائیں گی جن سے بنی اسرائیل دوچار ہو چکے ہیں اور جب تمہارے نیکوکار لوگوں میں مداہنت اور غنڈوں میں بدکاری کھلم کھلا ہو گی۔ حکومت واقتدار کم مایہ لوگوں کے ہاتھ میں ہو گا اور علمِ دین رذیل لوگوں میں محدود ہو جاتے گا۔

اس کا مطلب اس کے سوا کیا ہے کہ اس وقت عام شہریوں کی دینی زندگی اَنْ تَقُوْلُوْا عَلَی اللّٰہِ مَالَا تَعْلَمُوْنَ کی گرفت میں آجاتے گی۔

غور فرمایئے کہ یہودیوں کے اس نعرے کا یا قرآن کے لفظوں میں اس غرّے کا بنیادی سبب اس کے

بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓــَٔتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝

جیسا تم نے سمجھا ہے ایسا ہرگز نہیں ہے[207] بلکہ نجات کا قانون یہ ہے کہ جس نے بھی گناہوں[208] کی کمائی کی اور اس کے گناہوں نے اس کو گھیرے[209] میں لے لیا تو وہ دوزخی ہے ہمیشہ اسی میں رہے گا۔ اور جو لوگ ایمان[210] لائے اور انہوں نے کام بھی اچھے کیے تو وہ جنتی ہیں جنت ہی میں رہیں گے۔

سوا کیا ہے کہ وہ شفاعت کے بارے میں غلط جراثیم کا شکار ہو گئے تھے۔ حافظ ابن تیمیہؒ نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں شفاعت کے موضوع پر حسب ذیل الفاظ میں تنبیہہ فرمائی ہے۔

اہل باطل کی گمراہی کی اصل حقیقت یہی تھی کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سفارش کا معاملہ بھی مخلوقات کی سفارش پر قیاس کر رکھا تھا جیسے دنیا میں ایک انسان اپنی سفارش کے لیے ایسے شخص کا انتخاب کر لیتا ہے جس کے متعلق وہ یہ سمجھتا ہے کہ اس کی سفارش کا اثر پڑے گا یا تو اس لیے کہ اس سے اس کا کوئی تعلق ہے یا وہ اس سے ڈرتا ہے۔ جس نے اللہ کی بارگاہ میں اس نوع کی سفارش سمجھی اس نے خطرناک غلطی کی۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی بارگاہِ عالی میں سفارش کا معاملہ بندوں کی مرضی پر نہیں بلکہ اللہ کی مرضی پر موقوف ہے۔ شفاعت میں بندوں کی مرضی آتے ہی ایمان ٹیپ ٹاپ اور آرزوؤں کا نام ہو کر رہ جاتا ہے۔ امام حسن بصریؒ فرماتے ہیں۔

ایمان ٹیپ ٹاپ ظاہر داری اور خوش آئند تمناؤں کا نام نہیں ہے بلکہ ایمان اسے کہتے ہیں کہ اللہ کی محبت دل میں سرایت کر جائے اور اعمال اس کی تصدیق بھی کریں۔ (کتاب الایمان ص ۱۱۷)

نجات کا قانونِ کلی

اس آیت میں صاف صاف لفظوں میں قانونِ نجات کا اعلان کیا ہے۔ نجات نسلوں، نسبتوں اور

خوش آئند نعروں اور دعووں سے نہیں ہوگی بلکہ اس کا قانون سب کے لیے عام ہے۔ جس طرح سنکھیا کھانے سے ہر کھانے والا ہلاک ہو جاتا ہے چاہے یہودی ہو یا غیر یہودی، اور دودھ پینے سے صحت و توانائی ملتی ہے خواہ پینے والا کسی نسل سے تعلق رکھتا ہو، اسی طرح عالم معنویات میں بھی ہر عمل کا خاصہ ہے اور وہ اس لیے نہیں بدلا جا سکتا کہ عمل کرنے والے کی نسل یا قوم کیا ہے۔

۲۰۷ ف ۔ ایسا ہرگز نہیں۔ یعنی یہ بات غلط ہے کہ یہودی دوزخ میں نہ جائیں گے کیونکہ خلود فی النار اور خلود فی الجنۃ کا جو قاعدہ کلیہ اس آیت میں بیان فرمایا ہے اسی کے مطابق سب سے معاملہ ہوگا۔ یہودی اس قاعدے سے مستثنیٰ نہیں ہو سکتے [1]

۲۰۸ ف ۔ جس نے گناہوں کی کمائی کی۔ آیت میں گناہ کو کمائی قرار دیا ہے۔ یہ تعبیر ایک معروف نفسیاتی حالت کی طرف اشارہ کرتی ہے کیونکہ جو شخص گناہ کا ارتکاب کرتا ہے وہ اس سے لطف اندوز اور لذت یاب ہوتا ہے اور اسے اپنی کمائی تصور کرتا ہے۔ اگر یہ گناہ اس کے مذاق پر گراں ہوتا تو وہ یقیناً اس کا مرتکب نہ ہوتا۔ اور اگر اسے وہ خسارہ اور نقصان سمجھتا تو اس پر خوش دلی سے آمادہ نہ ہوتا۔ بلکہ وہ اس گناہ سے نفرت کرتا۔

نیز گناہ کے لیے لفظ کسب لا کر اس طرف اشارہ کر دیا کہ نیکی انسان میں اصل ہے گناہ انسان کی اپنی کمائی اور محنت ہے۔ اس کے لیے بننے اور تکلف کرنے کی ضرورت ہے۔

۲۰۹ ف ۔ اور اس کے گناہوں نے اسے گھیر لیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ گناہ اس پر ایسا غلبہ کر لیں کہ کوئی جانب ایسی نہ ہو کہ گناہ کا غلبہ نہ ہو۔ حتیٰ کہ دل میں ایمان و تصدیق باقی ہوگی تو بھی احاطہ مذکور محقق نہ ہوگا۔ تو اب کافر ہی یہ صورت صادق آ سکتی ہے [2]

گھیر لینے سے مراد یہ ہے کہ پوری زندگی میں نیکی کا کہیں نام و نشان ہو اور اس طرح بدی کو اختیار کرے اور گناہوں میں پڑ جائے کہ خود ایمان کے لیے گنجائش ہی باقی نہ رہے۔ ایسا صرف وہ ہی لوگ کر سکتے ہیں جو سرے سے باطل پرست ہوں۔

گھیر لینے کی تعبیر میں معنوی حالت کو مجسّم بنا کر پیش کیا ہے اور یہ قرآن حکیم کا خاصہ ہے اور اس کا مخصوص اندازِ بیان ہے۔ اس اندازِ بیان کی خوبی یہ ہے کہ معنوی کیفیت ایک مجسّم صورت بن کر احساسات پر اثر انداز ہوتی ہے۔ غرض اس تعبیر کے ذریعے گنہگار کو گناہوں میں گھرا ہوا بتایا

---

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۱۶ [2] ایضاً

گیا ہے جیسے وہ گناہوں کی جیل میں زندگی گزار رہا ہے۔ اس کے افکار و نظریات، اس کے اعمال و اخلاق اور اس کے احوال و آداب سب پر گناہ چھائے ہوئے ہیں اور اس کا ہر سانس گناہ بن کر خارج ہو رہا ہے ایسے شخص کے لیے فیصلہ کن انداز میں کہا گیا ہے کہ یہ صرف دوزخی نہیں بلکہ اس کو دوزخ میں خلود حاصل ہو گا۔

۸۲ ۔ اور جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اچھے اچھے کام کیے یعنی جو شخص اپنے ارادہ و اختیار سے ایمان اور عملِ صالح کو اپناتے گا اس کی منزل جنت ہے۔

اس آیت میں بھی ایمان و عملِ صالح کو مدارِ نجات بتایا گیا ہے۔ ایمان اگرچہ تصدیقِ قلبی کا نام اور بہ دل کا عمل ہے لیکن جب دل کی یہی تصدیق رسوخ و پختگی اختیار کر لیتی ہے تو یہی ایمان جو اب تک ایک معنی تھا اب ایک شکل و صورت اختیار کر لیتا ہے۔

اربابِ حقائق کے نزدیک معانی کی جسمانیت ایک ثابت شدہ حقیقت ہے اور جدید تحقیقات کے مطابق حرارت کو تولا جا سکتا ہے اور تولا جا رہا ہے بلکہ اس کے لیے مقیاس الحرارت بھی بازار میں ملتا ہے ایسے ہی آواز کو مدت تک ایک بے جسم معنی تصور کیا گیا مگر حال کی تحقیقات نے ثابت کر دیا ہے کہ عالم کی پیدائش سے لے کر آج تک جس قدر آوازیں اس فضا میں بلند ہوئیں سب محفوظ ہیں اور ان سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ ریڈیو کی محیر العقول ایجاد کی بنیاد یہی انکشاف ہے۔ آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ تحقیقاتِ جدیدہ کی ساری تگ و دو کے باوجود ابھی وہاں تک رسائی نہیں ہوئی جہاں ہمارے اربابِ حقائق کی نظریں سینکڑوں سال پہلے پہنچ چکی تھیں۔ شیخ محی الدین بن عربیؒ فتوحاتِ مکیہ میں آوازوں کے لیے صرف جسم کو ثابت نہیں کرتے بلکہ ان اشتباہ اور اشکال کے بھی مدعی ہیں یعنی آوازوں کا صرف جسم نہیں بلکہ جسم کے ساتھ ان کی شکل و صورت بھی ہے اور ظاہر ہے کہ جب شکل و صورت ہے تو صورت کے ساتھ رنگ بھی ضرور ہو گا۔

ایسے ہی ایمان بھی ابتداءً اگرچہ تصدیقِ قلبی کا نام ہے مگر یہ تصدیق اعمالِ صالحہ کی آبیاری سے نشوونما پا کر ایک نور کی شکل اختیار کر لیتی ہے اور یہی نور فی الواقع ایمان ہے۔ یہ نور جس قدر پختہ ہوتا جاتا ہے اتنے ہی خواہشاتِ نفس کے حجابات اٹھتے جاتے ہیں اور جیسے جیسے یہ حجابات اٹھتے جاتے ہیں اسی قدر یہ نور پھیلتا جاتا ہے۔ اس قدر پھیل جاتا ہے کہ انسان کی پوری زندگی کو اپنی آغوش میں لے لیتا ہے اور مومن گویا خود ایمان مجسم ہو جاتا ہے۔

اسی نور کی رہنمائی کے مطابق زندگی میں اوامرِ الٰہیہ کے لیے امتثال اور محرمات کے لیے اجتناب کا

جذبۂ عمل پیدا ہو جاتا ہے۔ اخلاقِ رذیلہ زائل ہو جاتے ہیں اور اخلاقِ فاضلہ کے زیور سے آراستگی ہو جاتی ہے۔ یہی ایمان دعوتِ انبیاء کا مقصد ہے اور اسی پر نجات اور فلاحِ ابدی کا مدار ہے۔ یہی وہ نقطہ ہے جس سے انسانی عمل کا ہر خط نکلتا ہے اور اس کے دائرہ حیات کا ہر خط اسی پر جا کر ختم ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے ایمان کا ذکر ہمیشہ عملِ صالح سے پہلے کیا ہے اور ان کو اس طرح پیش کیا ہے جیسے ایک موصوف کے لیے دو صفتیں ہوں۔ اس طرح نہیں جیسے دو صفتوں کے لیے الگ الگ موصوف ہوں۔ یہاں یہ نہیں فرمایا کہ والذین آمنوا اور والذین عملوا الصلحٰت بلکہ فرمایا والذین آمنوا و عملوا الصالحات۔ اس کا مطلب یہ اور صرف یہ ہے کہ مدارِ نجات ایمان و عمل صالح ہے۔ قرآن نے ان لوگوں کے اعمال کی مثال جو ایمان سے محروم ہیں اس راکھ سے دی ہے جسے ہوا اُڑا کر لے جائے۔

غرض ایمان تمام اعمال کی اساس ہے جس کے بغیر وہ بے بنیاد رہے۔ وہ ہماری سیرابی کا اصلی سرچشمہ ہے جس کے فقدان سے ہمارے کاموں کی حقیقت سراب سے زیادہ نہیں ہے۔ اللہ کا اقرار اور اس کی رضا کا حصول ہمارے اعمال کی غرض و غایت ہے۔ یہ نہ ہو تو ہمارے تمام کام بے نظام ہو کر رہ جائیں۔ وہ ہمارے دل کا نور ہے وہ نہ ہو تو پوری زندگی تیرہ و تاریک نظر آئے۔

ایمان و عمل کو ایک ہی موصوف کی صفت بنا کر قرآن نے علم و عمل، تصور اور عقلیت و عملیت میں لزوم ثابت کیا ہے مگر اصل زور انسان کی عملیت پر دیا ہے اور عقائد کے اتنے ہی حصہ کا یقین و اقرار ضروری قرار دیا جو دل کی اصلاح کرے اور اعمالِ اخلاق کی بنیاد قرار پا سکے۔ عقائد کے فلسفیانہ الجھاؤ اور تصورات و نظریات کی تشریح کر کے عملیت کو برباد نہیں کیا۔

آپ آیت کی معجزانہ بلاغت پر غور کریں کہ لفظ اُولٰٓئِكَ دونوں جگہ لائے ہیں۔ لیکن ایک دقیق سا فرق بھی ہے۔ گنہگاروں کی سزا کا ذکر کیا تو فاولٰٓئک اصحاب النار اور جب ایمان و عمل صالح والوں کی جزا کا ذکر کیا تو اولٰئک اصحاب الجنۃ فرمایا۔ پہلے فقرہ پر حرف فا لاتے اور دوسرے فقرے کو اس سے محروم کر دیا۔ اس میں بلیغانہ معنویت ہے۔

نزولِ قرآن کے وقت عام اعتقاد یہ تھا کہ جزا و سزا محض خدا کی خوشنودی اور اس کے قہر و غضب کا نتیجہ ہے۔ اعمال کے نتائج کو اس میں دخل نہیں ہے۔ الوہیت اور شاہیت کا تشابہ تمام دینی تصورات کی طرح اس معاملے میں بھی فکری گمراہی کا سبب بنا۔ لوگ دیکھتے تھے کہ ایک مطلق العنان بادشاہ کبھی خوش ہو کر انعام و اکرام دینے لگتا ہے کبھی بگڑ کر سزائیں دینے لگتا ہے۔ اس لیے سمجھتے تھے کہ خدا کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔

قرآن نے اس فکری گمراہی کی اصلاح کی اور بتایا کہ جیسے اس مادی دُنیا میں قانون یہ ہے کہ ہر حالت کوئی نہ کوئی اثر رکھتی ہے اور ہر چیز کا کوئی نہ کوئی خاصہ ہے۔ یہ کبھی نہیں ہوسکتا کہ یہاں کوئی چیز نتائج کی گرفت سے آزاد ہو۔ جیسے اللہ سبحانہٗ نے اجسام میں خواص رکھے ہیں اسی طرح اعمال کا رشتہ بھی نتائج سے وابستہ ہے اور جس طرح جسمِ انسانی کے قدرتی اثرات ہیں اسی طرح روحِ انسانی کے قدرتی انفعالات ہیں۔ جسمانی مؤثرات کا ظہور جسم پر ہوتا ہے۔ معنوی مؤثرات سے رُوح متاثر ہوتی ہے۔ اعمال کے لیے بھی اللہ کی مقرر کردہ نتائج ہیں جنہیں وہ جزا و سزا سے تعبیر کرتا ہے۔ ایمان وعمل کا نتیجہ اچھائی ہے اور یہ ثواب ہے اگناہوں کا نتیجہ بُرائی ہے اور یہ عذاب ہے۔ ثواب و عذاب کے ان اثرات کی نوعیت کیا ہو گی۔ قرآن کہتا ہے جنت اور دوزخ ہوگی۔ جنت کی نعمتیں ان کے لیے ہیں جن کے اعمال جنت والوں کے ہوں گے دوزخ کی عقوبتیں ان کے لیے ہیں جن کے اعمال دوزخیوں کے ہوں گے۔ حافظ ابن القیمؒ نے اس موقعہ پر بڑی اچھی بات لکھی ہے۔

اللہ سبحانہٗ نے دُنیا اور آخرت میں کامیابی اور ناکامی کا مدار قرآن میں اعمال کو اس طرح قرار دیا ہے جیسے جزا کے لیے شرط معلول کے لیے علت اور مسبب کے لیے سبب ہوتا ہے اور اعمال کا یہ قانون مکافاتِ قرآن میں ایک ہزار سے زیادہ مقامات پر ہے۔ غرض دُنیا و آخرت کی مصالح و مفاسد، سعادت اور شقاوت، فلاح و خسران قرآن میں معنوی مؤثرات کے رُوحانی انفعالات ہیں۔ —— اس سے آگے فرماتے ہیں کہ

جو شخص قرآن کے پیش کردہ اس قانون پر تفقہ حاصل کرے گا اور اس میں پوری بصیرت پیدا کرے گا تو اسے بہت زیادہ فائدہ ہوگا اور نادانی کا شکار ہو کر عجز و بیچارگی، کوتاہی اور تہی دامنی کے لیے تقدیر کا سہارا نہ لے گا۔ صحیح معنے میں کامل ترین فقیہ وہ ہے جو تقدیر کا تقدیر سے مقابلہ کرتا ہے جس طرح اس حیات میں بھوک، پیاس، سردی سب اللہ ہی کی تقدیر ہیں لیکن ان کو دُور کرنے کا طریق بھی اللہ کی تقدیر ہے۔ ایسے ہی معنویاتِ آخرت کی سزا و جزا کا معاملہ بھی ایمان اور عملِ صالح کی بناتی ہوتی تقدیرِ الٰہی ہے۔ دونوں جہانوں کا مالک اللہ ہے اور دونوں جگہ اس کی حکمت ایک ہے۔ آیت میں دونوں جگہ اسی ترتیب کو بتانے کے لیے ایسے جملے لے کر آتے جو معنے شرطی کو متضمن ہیں۔ علمائے نحو وبلاغت کا فیصلہ ہے کہ الذین اور اس قسم کے دوسرے موصولات پر مشتمل جملے معنے شرطی کے حامل ہوتے ہیں۔ شرط و جزا کی صورت میں لاکر یہ بتایا ہے کہ گناہ اور احاطہ خطیئات دوزخ میں جانے کی اور ایمان وعملِ صالح جنت میں جانے کی ناگزیر شرط ہے۔ اور پہلے فقرے میں

فا اس لیے لگائی ہے کہ پہلا موقعہ ذعید کا تھا اور وعید میں نہ ہونے کا امکان ہے اس لیے وہاں فا کا اضافہ کر دیا۔ دوسری آیت میں وعدہ تھا جس میں خلف کا کوئی امکان نہیں اس لیے فا ہٹا دی۔

یہ بات بھی سمجھ لیجئے کہ بدکاروں کے لیے دوزخ اور ایمان و عمل صالح کے لیے جنت کا ذکر آیا ہے اور دونوں آیتوں میں دونوں کے لیے ھم فیھا خالدون کی تعبیر آئی ہے۔ خلود کے معنے اگرچہ مدت طویل کے ہیں لیکن دوزخیوں اور جنتیوں کے لیے قرآن میں جہاں آیا ہے اس سے مراد دوام اور ہمیشگی ہے اس کی تابید و تاکید میں قرآن میں کئی جگہ ابداً بھی آیا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے جیسا کہ امام غزالیؒ نے لکھا ہے کہ انسان اگرچہ ازلی نہیں مگر ابدی ضرور ہے۔ اس لیے اس کو ایک ابدی مستقر کی ضرورت ہے۔ دُنیا اس کا ابدی مستقر نہیں صرف عارضی مستقر ہے۔ اس کا دائمی مستقر جنت یا دوزخ ہیں۔ قادرِ مطلق نے اس کی تقسیم ایمان و کفر پر رکھی ہے۔ گناہ کی آلودگیوں کے باوجود مومن کا ابدی مستقر جنت اور اچھے اچھے کاموں کے باوجود کافر کا ابدی مستقر جہنم ہی رہے گا۔ اب رہی یہ بات کہ یہاں ایمان و کفر کی جزا خلود کیوں رکھی گئی ہے تو میرے علم میں اس کا سب سے بہتر جواب وہ ہے جو ابن قتیبہؒ نے دیا ہے۔ اسی کا خلاصہ حافظ بدرالدین عینیؒ نے شرح بخاری میں اور عبدالوہاب الشعرانیؒ نے الیواقیت میں ذکر کیا ہے۔ آپ بھی سن لیجئے، فرماتے ہیں :۔

جنت میں خلود اور ابدی زندگی کی بنیاد عمل پر نہیں بلکہ نیت پر رکھی گئی ہے۔ اگر اس کی بنیاد عمل پر ہوتی تو آخرت کی زندگی بھی اتنی ہونی چاہیے تھی جتنی کہ اس کے عمل کی تھی یا بہت سے بہت اس سے دوگنی۔ لیکن چونکہ اس کی بنیاد نیت پر رکھی گئی ہے اور نیت یہ ہوتی ہے کہ اگر وہ ہمیشہ زندہ رہے گا تو خدا کی اطاعت کرے گا۔ اس نیت میں موت اگر حائل ہو جاتی ہے اس کا اپنا کوئی قصور نہیں ہوتا اس لیے اس کو اپنی نیت کے مطابق دوام و خلود کا بدلہ مل جاتا ہے۔ یہی حال دوزخ میں کافر کے خلود کا ہے۔ (عمدۃ القاری)

جنت کی حد تک تو یہ بات بالکل دُرست ہے لیکن یہ بات کہ بُرائی اور بُرائی کی جزا دوزخ میں بھی ابدیت ہے۔ اس میں علماء کے خیالات مختلف ہیں۔ اگرچہ اہل السنت کی اکثریت دوزخ کی ابدیت ہی کو مانتی ہے۔ اس کی تفصیل کا یہ محل نہیں۔ انشاءاللہ یہ بحث سورۂ ہود میں آئے گی۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ ۣ وَبِالْوَالِدَيْنِ
اِحْسَانًا وَّذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَّاَقِيْمُوا
الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ۭ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْكُمْ وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۸۳﴾

اور وہ وقت یاد کرو جب ہم نے بنی اسرائیل سے ایمان و عمل کا یہ عہد لیا تھا کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا[211]، والدین سے سلوک میں حسن کاری کرنا[212]، عزیز و اقارب سے نیکی سے پیش آنا، یتیموں اور مسکینوں کا خیال رکھنا اور تمام انسانوں سے خواہ کوئی ہو اچھی بات کہنا[213]، نماز قائم کرنا[214] اور زکوٰۃ کی ادائیگی کرنا۔ ایمان و عمل کی ان بنیادی سچائیوں پر تم سے عہد لیا تھا لیکن تم اس سے پھر گئے[215] اور اس پر تم میں سے ایک تھوڑی تعداد کے علاوہ کوئی قائم نہ رہا، اور حقیقت یہ ہے کہ تم عمل سے وقتی طور پر نہیں ہٹے تھے بلکہ تمہارے اندر اس سے بے رخی اور روگردانی ہمیشہ کے لیے رونما ہو گئی ہے۔

احکام پر عمل سے انحراف

گذشتہ آیات میں اسرائیلی تاریخ ملی کے انعامات اور انعامات پر ان کی ناشکری اور اس کے نتائج کو بیان کیا تھا۔ ان آیات میں بتایا جا رہا ہے کہ اللہ کی جانب سے آئے ہوئے احکام عملیہ عبادات اور معاملات میں ان کی زندگیوں کا رُخ کیا تھا۔ اور اسی مناسبت سے ان کی کج فہمی، قساوت قلوب کے اشارات بھی دوبارہ آئے ہیں اور اس مقام پر تفصیل نہیں اشارات ہی ضروری ہیں۔ یہ گویا عملی احکام میں ان کی گناہوں سے بھرپور زندگی ان کے انحراف اور ان کی بدعہدی کی تاریخ ہے۔

یاد رہے کہ عہد کا تعلق جب اللہ تعالیٰ سے ہوتا ہے تو محاورہ تورات میں حکم کے معنے میں آتا ہے۔ بعض شارحین قرآن نے بھی یہاں عہد بمعنی حکم بتایا ہے اور معنے یہ کیے اَمَرْنَا بِذَالِکَ ہم نے اس کا حکم دیا۔

ف[211]۔ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا، ہمیشہ سے دینِ انبیاء میں توحید کے دو پہلو نمایاں اور

نمایاں رہے ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ کی عبادت کرو اور دوسرے یہ کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔ توحید کا پورا نقشہ صرف زبان سے کلمہ توحید پڑھ لینے سے عیاں نہیں ہوتا جب تک وہ انسانی زندگی کے ہر گوشے میں نمایاں نہ ہو جائے۔ مثبت اور منفی پہلو جدا جدا ہو کر ممتاز نظر نہ آنے لگیں۔ توحید کے دعویٰ کے ساتھ جہاں پہنچ کر مداہنت کی ادنیٰ سے ادنیٰ گنجائش بھی ختم ہو جاتی ہے وہ توحید کا یہی منفی پہلو ہے اور اسی پہلو کے نمایاں ہونے سے اسلام و کفر میں کھلا امتیاز ہوتا ہے۔ شرک کی عام فضاؤں میں جب خدا کے برگزیدہ نبی آئے تو ان کا مقصد صرف اعبدوا اللّٰہ سے پورا نہیں ہوا جب تک اس کے ساتھ لا تعبدون الا اللّٰہ کا علم بلند نہیں کیا یعنی جب تک توحید کے مثبت پہلو کے ساتھ منفی پہلو کو نمایاں نہیں کیا جتنا توحید کا مثبت پہلو اہم ہے اتنا ہی اس کا منفی پہلو اہم ہے۔ ایک مسیحی صرف اللہ کی عبادت کا اعلان کر کے مسلمان نہیں ہو سکتا جب تک اس کا بھی صاف اور صریح اقرار نہ کرے کہ حضرت مسیح الٰہ، ابن اللہ نہیں بلکہ اللہ کے بندے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ توحید کے دونوں پہلوؤں کا مظاہرہ شرطِ ایمان ہے۔

قرآن کا اعلان ہے کہ محبوب کے متلاشی کہاں مارے مارے پھرتے ہیں ان کے لیے اس کی ملاقات کا صرف ایک راستہ ہے کہ اللہ کی عبادت کریں اور اس کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کریں۔ اللہ تعالیٰ کی توحید اس وقت تک خالص نہیں ہو سکتی جب تک اعبدوا اللّٰہ کے ساتھ لا تعبدون الا اللّٰہ کا اعلان صاف صاف نہیں کر دیا جاتا۔ آج مسلمان بھی اگر اپنے ایمانوں کا جائزہ لیں تو اس میں توحید کا جس قدر مثبت پہلو صاف نظر آتے گا اتنا واضح اس کا دوسرا منفی پہلو نظر نہ آئے گا۔

یاد رکھیے جب تک کہ اس کا یہ پہلو بھی اتنا ہی واضح نہ ہو جائے اس وقت تک آپ کی توحید کا نقشہ مکمل نہ ہو گا۔ مشکل اعبدوا اللّٰہ نہیں اس میں تو اکثر قومیں آپ کی ہم آہنگ ہیں۔ جو مرحلہ مشکل ہے وہ تمام شرکاء اور باریک سے باریک شریکوں سے بیزاری کا اعلان کر کے لا تعبدون الا اللّٰہ کو عملی زندگی میں جگہ دینا ہے۔ اسی لیے کلمہ طیبہ لا الٰہ الا اللّٰہ میں مثبت پہلو کی بنیاد منفی پہلو پر قائم کی گئی ہے۔

غالباً اب آپ خوب سمجھ گئے ہوں گے کہ قرآن جس توحید کی طرف دعوت دیتا ہے اور جس کی بلا تمیز تمام انبیاء نے دعوت دی ہے اور جس پر عمل پیرا ہونے کا اللہ نے بنی اسرائیل سے عہد لیا ہے وہ اللہ کی عبادت کے ساتھ کسی اور کی عبادت نہ کرنا ہے۔ حکیم الامت شاہ ولی اللہؒ نے حجۃ اللہ البالغہ میں وحدتِ ادیان کے موضوع پر منجملہ دوسری باتوں کے یہ بھی لکھا ہے،

انبیاء کی اس پر پوری اجتماعی طاقت صرف ہوتی ہے کہ عبادت اور استعانت میں اللہ کی توحید کا اعلان کیا جاتے۔ یہ گویا دینِ انبیاء کی اصل اوّل ہے۔ اعمال، اخلاق، آداب اور احوال کے لیے اوّلین اساس ہے۔

۲۱۲ ـ والدین سے سلوک میں حسن کاری کرنا۔ یہ دوسرا اخلاقی فریضہ ہے جس کی ادائیگی پر بنی اسرائیل کو متوجہ کیا گیا۔ والدین کے حقوق کی پاسداری اور ان کے احترام و بزرگی کو برقرار رکھنا ۔انسان کے لیے عقلاً اور واقعتہً ضروری ہے کہ اپنے والدین کا اچھی طرح خدمت گزار ہو۔ ان سے تواضع اور نرمی سے پیش آئے۔ ان کو جہاں تک ہو سکے آرام پہنچائے۔ ان کے ہر حکم کی تعمیل کرے بشرطیکہ کوئی حکم الٰہی سے نہ ٹکرائے اور ان کی تمام ضروریات پوری کرے، اذیتوں سے بچائے اور ہر طرح مطمئن اور خوش رکھنے کی کوشش کرے چاہے وہ عقیدے کے اعتبار سے کچھ ہوں۔

اس حکم کی اہمیت کا اندازہ لگانے کے لیے اس فقرے کا بلیغانہ انداز جان لینا کافی ہے۔

اوّل اس فقرے بالوالدین احسانا میں فعل کو چھوڑ کر صرف مصدر لائے ہیں۔ اصل عبارت یوں تھی و تحسنون بالوالدین احسانا۔ فعل کو اس لیے ہٹایا ہے کہ فعل میں زمانہ پایا جاتا ہے اور قرآن والدین کے بر و احسان کو کسی زمانے میں مقید کرنا نہیں چاہتا چاہے ان کی جوانی کا زمانہ ہو اور چاہے بڑھاپے کا اور چاہے ان کی جانب سے مطالبہ ہو یا نہ ہو۔ بہرحال اولاد کا کام ہے والدین سے احسان کرنا۔

ثانیاً برتاؤ اور سلوک کے لیے لفظ احسان لائے ہیں۔ عربی میں احسان ان جگہوں پر نہیں بولا جاتا جہاں ہم اردو میں بولتے ہیں۔ عربی میں احسان کے معنے حسن کاری کرنے کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ مطلق خدمت، مطلق احترام اور ان کے حقوق کی مطلق پاسداری نہ ہونی چاہیے بلکہ اس فرض کی ادائیگی میں تمہیں حسن کار بننا چاہیے۔

اس میں ان لوگوں کے لیے بڑی عبرت ہے جن کی سمجھ میں اب تک یہ نہیں آیا ہے کہ انسانیت کی تکمیل اور اس میں حسن و جمال پیدا کرنے والا اللہ ان سے کیا چاہتا ہے۔ اگر صحیح مسلم کی یہ مشہور روایت صحیح ہے کہ

اللہ نے حسن کاری ہر چیز میں واجب فرمائی ہے۔ اس لیے جب تم ذبح کرو تو ذبح میں بھی حسن کار بنو اور جب تم قتل کرو تو قتل میں بھی حسن کاری کرو۔

اور صحیح نہ ہونے کی وجہ کیا ہے جبکہ صحیح مسلم میں ہے۔ تو اس کا مطلب اس کے سوا کیا ہے کہ قرآن حسن و جمال کے قالب میں ڈھلے بغیر کسی مسلمان سے کوئی فعل صادر ہوتا دیکھنا نہیں چاہتا۔

ثالثاً احسان کا صلہ با آیا ہے حالانکہ احسان خود متعدی ہے۔ علمائے بلاغت نے تصریح کی ہے کہ متعدی کا صلہ اگر لایا جائے تو اس میں گہری معنویت ہوتی ہے۔ دیکھئے عربی میں لفظ اَخَذَ پکڑ لے، لینے کے معنے میں خود متعدی آتا ہے۔ اگر آپ یہ کہنا چاہیں کہ رشید نے میرا ہاتھ پکڑا تو آپ یوں کہیں گے اَخَذَ رَشِیدٌ یَدِیْ۔ لیکن اگر آپ یہ بتانا چاہیں کہ میرے ساتھ اور بھی موجود تھے ان سب میں سے رشید نے میرا ہاتھ پکڑا تو آپ با استعمال کریں گے اور یوں کہیں گے کہ اَخَذَ رَشِیدٌ بِیَدِیْ۔ بتانا یہ ہے کہ صرف والدین کے حقوق کی پاسداری نہیں، بلکہ دوسرے افراد کے حقوق کی پاسداری کرتے ہوئے والدین کے حقوق کی نگرانی کرنا ہے۔ عام قرابت داروں کے ساتھ بھی تمہارا رویہ بہتر ہونا چاہیے۔ یتیموں کی ہمدردی، ان کے حقوق کا دھیان رکھنا، ان کی بے دریغ اعانت وحاجت روائی کرنا انسان کا اخلاقی فرض ہے اور پھر ان مسکینوں اور غریبوں کی دلجوئی اور دامے درمے ان کی اعانت بھی انسانوں کے واجبات میں سے ہے۔ یعنی معاشرے کے ایسے تمام افراد جو اپنی ضروریات پوری کرنے کے سہارے اور معاشی بے فکری اور فارغ البالی سے محروم ہو چکے ہوں اس کی ذمہ داری اہل ثروت پر ہے کہ ایسے حاجت مندوں کی اعانت اور ان سے فیاضانہ سلوک کرنا ضروری ہے۔ بنی اسرائیل سے چوتھا عہد اسی کا لیا گیا تھا۔

۲۱۳
۵۔ اور تمام انسانوں سے اچھی بات کہنا۔ اس فقرے میں حسن خلق کے اس جامع پہلو پر زور دیا گیا ہے جس کے بغیر زندگی اخلاقی خوبیوں سے آراستہ نہیں ہو سکتی اسی لیے انسانی برتاؤ کے باب میں اسے دوسرے نمبر پر پیش کیا ہے کہ انسان کے کردار واخلاق کی تکمیل اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک وہ خوش کلامی اور بات چیت کا انداز غایت درجہ نرم اور شگفتہ اختیار نہ کرے۔

وقولوا للناس حسنا کے الفاظ بھی کہہ رہے ہیں کہ حسن کلام کا طریقہ یہ اختیار کرو کہ بات چیت میں خوش بیانی اور شیریں کلامی کے ساتھ آواز میں بھی نرمی اور آہستگی اختیار کرو۔ قرطبیؒ نے اس موقعہ پر کیا اچھی بات لکھی ہے۔ انسان کو سب کے لیے نرم خو اور شیریں زبان ہونا چاہیے چاہے نیک ہو یا بد، سُنی ہو یا بدعتی۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام سے کہا تھا کہ فرعون کے پاس جاؤ تو زبان میں شیرینی اور نرمی رکھ کر بات نہ کرنا۔ آج نہ تو کوئی متکلم موسیٰ وہارون سے برتر ہے اور نہ آپ کا کوئی مخاطب فرعون سے بدتر ہے۔

حضرت طلحہ بن عمرؓ کہتے ہیں کہ میں نے امام عطاءؒ سے کہا کہ آپ کی شخصیت بڑی عظیم ہے کہ آپ کے پاس غلط خیال لوگوں کا ہجوم رہتا ہے۔ میرے مزاج میں ذرا تیزی ہے۔ میں تو ڈانٹ ڈپٹ

سے پیش آتا ہوں۔ حضرت عطاءؒ نے ان کو بتایا کہ ایسا نہ کیا کرو۔ اللہ سبحانہ کا ارشاد ہے قولوا للناس حسنا
اس میں تو یہود نصاریٰ بھی داخل ہیں، مسلمان اس میں کیوں داخل نہ ہوں لہ

ایک بار مدینہ طیبہ کی حرم نبوی میں نماز عصر سے فراغت کے بعد میں ایک مولوی صاحب کے پاس بیٹھا تھا۔ مولوی صاحب کے مزاج میں ان مسلمانوں کے بارے میں بڑی تیزی تھی جن کے دامنوں پر دین کی زندگی میں نت نئی ایجادوں کے دھبے ہیں۔ ان کو مسلمان سننا بھی گوارا نہ کرتے تھے۔ میں نے ادبًا عرض کیا کہ ایک مسئلہ بتائیے بولے وہ کیا۔ میں نے عرض کیا کہ یہودیوں اور عیسائیوں پر قرآن نے شرک و کفر کا الزام بھی کہیں لگایا ہے یا نہیں۔ فرمایا کیوں نہیں قرآن میں موجود ہے اور سورۂ مائدہ اور سورۂ توبہ کی آیات تلاوت کر دیں۔ میں نے عرض کیا کہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ شرک اور کفر کے ان سنگین الزامات کے باوجود قرآن ہی میں ان کا کھانا اور ان کی عورتوں سے شادی کرنا جائز بتایا گیا ہے اور ان کو مشرکین سے الگ کر کے یہ رعایت صرف اس لیے دی ہے کہ یہودی اور عیسائی نبوت کو ماننے والے ہیں۔ یہودی حضرت موسیٰ علیہ السلام اور عیسائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو۔ اور یہ سب جانتے ہیں کہ نبوت کی برادری میں سب سے اعلیٰ اور سب سے افضل جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ قرآن اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ماننے والوں کو یہ رعایت دیتا ہے تو ہم جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ماننے والوں کو اتنی رعایت بھی دینے کو تیار نہیں ہیں کہ ان کے ذبیحہ کو جائز قرار دیں اور ازدواجی تعلقات کو صحیح سمجھیں۔ نہ تو ہم قرآن کے ماننے والوں میں صحابہ سے بلند ہیں اور نہ یہ مسلمان جن کے دامنوں پر قسم قسم کے دھبے ہیں۔ یہودیوں اور عیسائیوں سے بدتر ہیں۔

بہرحال آیت قرآنی کا مخاطبت میں تمام انسانوں کے لیے شیریں کلام ہونے کا مطالبہ ہے۔

۲۱۴ ۔ نماز قائم کرنا، زکوٰۃ ادا کرنا، اجمالی طور پر لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰہَ میں حکم عبادت یہ بتانے کے لیے آیا ہے کہ ہر شخص پر اپنی اپنی جگہ عبادت کی ذمہ داری کا بوجھ ہے۔ لیکن یہاں یہ بتانے کے لیے کہ خاص عبادتیں ایسی بھی ہیں جو انسان بغیر وحی کی رہنمائی کے انجام نہیں دے سکتا۔ دو عبادتوں نماز اور زکوٰۃ کو مثالاً پیش کیا ہے۔ اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ بنی اسرائیل کو نماز اور زکوٰۃ کے احکام انہیں مخصوص ہیئتوں اور انہیں متعین قیود کے ساتھ ملے تھے۔ اقامت سے نماز میں قیام، رکوع اور سجدہ کا پتہ چلتا ہے۔ زمانۂ نبوت میں جو یہودی نماز کے پابند تھے وہ بھی ان ارکان کو ادا کرتے تھے۔ کھڑے

لہ قرطبی ج ۱ ص ۲،

ہو کر تورات اور زبور کی آیات تلاوت کرتے تھے اور سجدہ بھی کرتے تھے۔ قرآن کی شہادت یہ ہے کہ

مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَآئِمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُوْنَ

روایات میں ہے کہ رکوع میں یہودیوں کی طرح دونوں ہاتھ نہ جوڑے ہوں[1] ـــــ اس سے معلوم ہوا کہ عرب کے یہودی نمازیں یہ مختلف ارکان ادا کرتے تھے۔ اسلام کی نماز بھی ان ہی قدیم ارکان اور فطری شکل وصورت کے ساتھ فرض ہوئی ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے عہد سے چلی آرہی تھی۔ چنانچہ دائرۃ المعارف الاسلامیہ کے مصنفین نے بھی اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے۔

اسلامی نماز اپنی ترکیب میں بہت حد تک یہودیوں اور عیسائیوں کی نماز کے مشابہ ہے۔

(دائرۃ المعارف الاسلامیہ ج ۱۴ ص ۲۷۸)

حکیم الامت شاہ ولی اللہؒ نے بھی وحدتِ ادیان کے موضوع پر اس کی ہمنوائی کی ہے[2]

زکوٰۃ بھی ان عبادات میں سے ہے جو تمام آسمانی مذاہب کے صحیفوں میں فرض بتائی گئی ہے لیکن ان کے پیروں نے محبتِ مال کی وجہ سے اس کو ایسا فراموش کردیا کہ بظاہر ان کے مذہبی احکام میں اس کا نام بھی منظر نہیں آتا۔ قرآن پاک کا دعویٰ ہے اور اس کی تائید مختلف آسمانی صحیفوں سے ہوتی ہے کہ جس طرح نماز مذہب کا جزو لاینفک تھی اسی طرح زکوٰۃ بھی تمام مذاہب کا ہمیشہ جزو رہی ہے۔

نماز و زکوٰۃ کے موضوع پر نبوّت محمدیہ کا تکمیلی کارنامہ کیا ہے؟ اس کی تفصیل کا یہ محل نہیں ہے اس کے لیے پارہ نمبر ۲ ہے۔

۲۱۵ ـ پھر تم اس سے پھر گئے۔ یعنی اس معاہدہ کے ساتھ معاملہ یہ تھا کہ تم نے اس پر عمل سے گریز پائی اختیار کی، اللہ کے ساتھ اپنی عبادتوں میں انبیاء اولیاء کو شریک کرلیا۔ والدین کے گستاخ اور نافرمان ہوگئے۔ اقارب سے قطع رحمی اختیار کرلی۔ یتیموں کے اموال مختلف بہانوں سے کھاتے مساکین اور غریبوں کی ہمدردی سے تمہارے دل خالی ہوگئے۔ لوگوں سے برتاؤ میں تمہاری زبانیں تلخ ہوگئیں۔ تم ریاست کے غرور میں انسانوں کو حقیر سمجھنے لگے۔ نماز کو تمہارے معاشرے کے افراد چھوڑ بیٹھے اور زکوٰۃ کا نام ونشان تمہاری زندگی میں باقی نہ رہا۔ اس کی جگہ طاعت میں تم نے اللہ سے رشتہ توڑ کر اس کی مخلوق سے جوڑ لیا اور اب تمہاری دینی زندگی دین کی پہنائی سے سمٹ کر چند خود ساختہ رسموں اور من گھڑت مجالس کی ہو کر رہ گئی۔ ہاں تم میں سے چند افراد اس سیلاب سے

---

[1] فتح الباری ج ۲ ص ۲۲۷ [2] حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ ص ۸۷

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَآءَكُمْ وَلَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ مِّنْ
دِيَارِكُمْ ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ثُمَّ اَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ
وَتُخْرِجُوْنَ فَرِيْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ تَظٰهَرُوْنَ عَلَيْهِمْ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ
وَاِنْ يَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى تُفٰدُوْهُمْ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ

اور وہ معاملہ یاد کرو جب ہم نے تم سے یہ عہد[۲۱۶] لیا تھا کہ باہم ایک دوسرے کا خون نہ بہانا اور نہ باہم ایک دوسرے[۲۱۷] کو گھر سے بے گھر کرنا۔ اور تم نے اس کا اقرار کیا[۲۱۸] تھا۔ اب بھی تو تم اس کو مانتے ہو لیکن تم ہی اس اقرار[۲۱۹] اور ماننے کے باوجود باہم ایک دوسرے کو بے دریغ قتل کرتے ہو اور اپنی برادری کے ایک طبقہ کے خلاف ظلم و معصیت[۲۲۰] پر مبنی یونین قائم کرکے اسے جلاوطن کرتے ہو۔ لیکن پھر جب ایسا[۲۲۱] ہوتا ہے کہ وہی جلاوطن کیے ہوئے آدمی قیدی ہوکر تمہارے سامنے آتے ہیں تو تم فدیہ دے کر ان کو چھڑا لیتے ہو اور کہتے ہو کہ شریعت کی رُو سے ایسا کرنا ضروری ہے حالانکہ شریعت میں ان کو گھروں سے نکالنا بھی تم پر حرام تھا۔

ضرور بچے رہے لیکن یہ ماش کی دال میں سفیدی کے برابر تھے۔ اجتماعی زندگی کے فیصلے اجماع کی افرادی قوت سے ہوتے ہیں اور تمہارا دین کی زندگی سے یہ ہٹنا بھی واپسی کے ارادے سے اور کسی وقتی اور ہنگامی حالات کے تحت نہ تھا بلکہ اس لیے تھا کہ تم میں دین ہی سے اعراض، روگردانی اور بے رُخی کی عادت پیوست ہو گئی تھی۔

دینداری کی نمائش

بنی اسرائیل میں اتباع دین کی رُوح یک قلم معدوم ہو گئی اور دینداری کی نمائش اس لیے ہونے لگی تاکہ نفسانی خواہشوں اور مقصد برآری کے لیے اسے آلہ کار بنایا جائے۔ اس صورتِ حال کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ شریعت کے بنیادی اور اصولی احکام پر کوئی توجہ نہ رہی لیکن چھوٹی چھوٹی باتوں پر جو دینداری

اور ریاکاری کا ذریعہ ہو سکتی ہیں اور جن کے کرنے میں کچھ چھوڑنا اور کھونا نہیں پڑتا علم و عمل کی قوتیں لگ گئیں۔ ساری توجہ اور عملی جدوجہد ان کے حصول پر مرکوز ہو گئی اور اسی میں خدا کی رضا اور خوشنودی تلاش کی جانے لگی۔ علمائے یہود اسی گمراہی میں مبتلا تھے۔ قرآن نے ان آیات میں ان کی اسی گمراہی کا نقشہ عجیب انداز میں پیش کیا ہے اور اس کی دلکشی میں اس بات نے اور اضافہ کر دیا کہ پہلی آیت میں مامورات میں ان کی بے رُخی کو بے نقاب کیا تھا اور اس آیت میں ان کی کام چوریوں کا تذکرہ ہے۔

ف۲۱۶۔ اس جگہ بھی عہد لیا بمعنے حکم دیا ہے۔ خونریزی کی ممانعت تورات مروجہ میں بھی متعدد مقامات پر آئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم نے تمہیں حکم دیا تھا کہ آپس میں ایک دوسرے کا خون نہ بہانا۔ خونریزی تمام آسمانی مذاہب میں منع رہی ہے اور ظلم و سفاکی سے تمام نبیوں نے روکا ہے بلکہ قرآن نے انکشاف کیا ہے کہ بنی اسرائیل کو اللہ سبحانہ، نے قتلِ نفس سے باز رہنے کی سخت تاکید کی تھی اور اپنے فرمان میں یہ الفاظ لکھ دیے تھے کہ جس نے کسی انسان کو غیر قانونی طور پر یعنی بغیر خون کے بدلے یا ملک میں فساد پھیلانے کے جُرم کے بغیر قتل کیا اس نے گویا تمام انسانوں کو قتل کیا۔

ف۲۱۷۔ قرآن کے نزدیک یہ بھی قتل ہی کے ہم پلّہ سنگین جُرم ہے کہ بلا وجہ اور بلا قصور کسی کو گھر سے نکال دیا جائے۔ پہلا جُرم اگر صرف فوجداری تھا تو یہ جُرم فوجداری اور دیوانی دونوں قسم کا ہے۔ فوجداری اس لیے کہ اس میں دوسرے پر اس کی مرضی کے خلاف جبر ہو رہا ہے، اور دیوانی اس لیے کہ کسی کو ملکیت سے محروم کر کے غاصبانہ قبضہ کیا جا رہا ہے اسی لیے قرآن نے اس کو مظلومی کی نشانی قرار دیا ہے۔ اخرجوا من دیارھم بغیر حق۔

ان دونوں فقروں کے ذریعے قرآن نے علم الاجتماع کے اس قانون کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ جماعت میں فرد کی ہستی کوئی نہیں اصل ہستی جماعت کی ہے اور جماعت کا فرد ہونے کی وجہ سے ایک کا دوسرے کو نکالنا خود اپنے کو نکالنا ہے اور ایک کا دوسرے کو مارنا خود اپنے کو مارنا ہے۔ گویا پوری اُمّت اجتماعی زندگی میں ایک جان ہے۔ جماعت کے ہر فرد میں یہ احساس شدید ہونا چاہیئے کہ ایک کی جان سب کی جان ہے اور ایک کا مال سب کا مال ہے۔ ایک شخص کے بدن میں جو رُوح گھوم رہی ہے اور اس کی رگوں میں جو خون دوڑ رہا ہے اس میں اور جماعت کے دوسرے افراد کے خون اور جان میں کوئی فرق نہیں ہے۔ افراد کا یہی تصور ان میں عدل و انصاف کو پرورش کرتا ہے اور اسی کے احساس سے دب کر ہر شخص دوسرے کی جان، مال اور آبرو کا محافظ بن کر رہتا ہے اسی کو قانونی تکافل کہتے ہیں۔ اللہ اکبر جس قانون کے ذریعے اللہ کی وحی نے جماعت کی

فرد کی جان مال کا محافظ قرار دیا اسی کا سہارا لے کر آج مساوات کے علمبرداروں سے ہر شخص کی جان اور ہر شخص کا مال معرضِ خطر میں ہے۔ غصب، چوری، ڈکیتی، لوٹ مار کوئی عیب نہیں ہے۔ انا للہ فالی اللہ المشتکی۔

۲۱۸ ۔ تم نے اقرار کیا تھا اور تم مانتے ہو۔ یعنی ان احکام کا تم نے اقرار کیا تھا۔ یہاں حافظ ابن تیمیہؒ ایک مفید تحقیق فرما گئے ہیں وہ بھی گوش گزار فرما لیجئے کہ اقرار کے دو معنے ہیں۔ ایک زبان سے تصدیق کرنا، دوسرے التزام طاعت اور عہد عمل و فرمانبرداری۔ اس آیت میں دوسرے معنے مراد ہیں کیونکہ معنے تو دانتم تشھدون سے مفہوماً سمجھ میں آرہے ہیں جس کے لیے ہم نے ترجمہ میں تم مانتے ہو کی تعبیر اختیار کی ہے۔ یہاں اس حکم کی تصدیق مطلوب نہیں ہے بلکہ اس کا اظہار کیا جارہا ہے کہ تم نے اس میثاق کی طاعت کرنے اور اپنانے کا عہد کیا تھا۔ التزام طاعت کا یہی مفہوم ہے۔ مفسرین نے دو مطلب بتائے ہیں۔ ایک یہ کہ تمہارے اسلاف نے میثاق کو طاعت کو قبول کیا تھا اور وہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ہم اس کی وحی کررہے تھے وہاں موجود تھے۔ دوسرے یہ کہ اے مخاطبو تم نے اس میثاق کا اقرار کیا ہوا ہے اور تمہارا اعتقاد بھی یہی ہے تم اسے مانتے ہو اس کے منکر نہیں ہو۔ دونوں باتیں صحیح ہیں اور دونوں صورتوں میں ان کے خلاف حجت قائم کی جارہی ہے۔

۲۱۹ ۔ تم ہی باہم ایک دوسرے کو قتل کرتے ہو۔ میثاق کا ذکر کرنے اور بتانے کے بعد کہ تم اسے مانتے ہو اس آیت میں اس میثاق کی خلاف ورزی کی داستان بیان کرتے ہیں یعنی اے مخاطبو یہ جاننے اور ماننے کے باوجود تم باہم قتل و خونریزی میں کتنے بے باک اور دلیر ہو۔ تمہارا حال یہ ہے۔

مدینہ میں یہود کے دو قبیلے بنو قریظہ اور بنو نضیر تھے۔ دونوں کی لڑائی تھی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو نیچا کرنے اور شکست دینے کے لیے مشرکین کے دو قبیلوں سے اتحاد کر رکھا تھا۔ بنو قریظہ اوس کے اتحادی تھے اور بنو نضیر نے خزرج سے دفاعی پیکٹ کر رکھا تھا۔ جب جنگ کا بازار گرم ہوتا تو بنو قریظہ اوس کی حمایت میں خزرج سے نبرد آزما ہوتے اور بنو نضیر خزرج کی دوستی کی خاطر اوس سے لڑتے۔ نتیجہ میں بنو قریظہ اپنے بھائی، ہم مسلک اور ہم نبی اُمت بنو نضیر کے افراد کے خون سے ہاتھ رنگین کرتے اور یہی بنو نضیر بنو قریظہ کے ساتھ کرتے جب ایک دوسرے پر غلبہ ہوتا تو کمزوروں کو جلا وطن کرتے تھے[1]

واضح الفاظ میں اسے یوں کہہ دیجئے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد سے پہلے مدینے کے

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۱۶

اطراف میں یہودی قبائل نے اپنے ہمسایہ عرب قبیلوں اوس اور خزرج سے حلیفانہ تعلقات قائم کر رکھے تھے۔ جب ایک عرب قبیلہ دوسرے قبیلے سے برسرِ جنگ ہوتا تو دونوں کے حلیف یہودی قبیلے بھی اپنے اپنے حلیف کا ساتھ دیتے اور ایک دوسرے کے مقابلے میں نبرد آزما ہو جاتے تھے[1]

ان کا یہ کردار کھلے طور پر قرآن میں بیان شدہ اس معاہدے کے خلاف تھا اور وہ بالارادہ جان بوجھ کر اللہ کے حکم کی بغاوت کر رہے تھے۔ یہاں زمانۂ نبوت کے معاصر یہودیوں کی یہی خصوصیات بے نقاب کی جا رہی ہیں۔

۲۲۰۔ ظلم و معصیت پر مبنی یونین یعنی تَظٰهَرُونَ عَلَيْهِمْ بِالْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ۔ یہ فقرہ بڑھا کر قرآن نے بتا دیا کہ اس جنگ، امداد اور اتحاد کے پس منظر میں کوئی جذبہ صادقہ، حسنِ نیت اور اخلاص نہ تھا بلکہ اس جنگ، اتحاد اور تظاہر و تعاون کی تمام تر بنیاد خالصتاً اخلاقی کمزوری تھی جس میں دُنیادار اہلِ سیاست ہمیشہ مبتلا رہتے ہیں یعنی ظلم و معصیت۔ اس کا قریب ترین مفہوم یہی ہے کہ مطلق جنگ مذموم نہ تھی بلکہ اس خبیث بنیاد نے اسے خبیث بنا دیا۔ اگر یہی یہودی باہم متحد ہو کر عدل و طاعت کو قائم کرنے اور ظلم معصیت کو مٹانے کے لیے کھڑے ہوتے تو قرآن کو کوئی اعتراض نہ ہوتا۔ لیکن پھر ان کا بھائی چارہ مشرکین سے نہ ہوتا بلکہ باہم اعتصام بحبل اللہ کی بنیاد پر تنظیم قائم کرتے۔ اس سے مدلولاً یہ بھی معلوم ہوا کہ قرآن کی نگاہ میں علی الاطلاق اتحاد اور امداد کی کوئی قیمت نہیں ہے جب تک اس کی اساس عدل و تقویٰ پر نہ ہو۔ ہمارے فقہا نے قرآن کی روشنی میں یہ ضابطہ لکھا ہے کہ الامور بمقاصدھا۔

۲۲۱۔ پھر وہی جلاوطن قیدی بن کر آتے تو تم فدیہ دے کر چھڑا لیتے ہو۔ یعنی اگر قید ہو کر آتے ہیں تو سب رل مل کر مال جمع کر کے اس کا بدلہ دے کر قید سے اس کو چھڑا لیتے ہو[2]

مطلب یہ ہے کہ جب ایک یہودی قبیلے کے اسیرانِ جنگ دوسرے یہودی قبیلے کے ہاتھ آتے تھے تو غالب قبیلہ فدیہ لے کر انہیں چھوڑتا اور مغلوب قبیلہ فدیہ دے کر ان کو چھڑاتا تھا۔ اس فدیہ کے لین دین کو جائز ٹھہرانے کے لیے کتاب اللہ سے استدلال کرتے تھے۔ گویا وہ کتاب اللہ کی اس اجازت کو تو سر آنکھوں پر رکھتے تھے کہ اسیرانِ جنگ کو فدیہ لے کر چھوڑا جائے مگر اس حکم کو ٹھکراتے تھے کہ باہم جنگ نہ کی جائے[3]

---

[1] تفہیم القرآن ص ۹۱۔ [2] حاشیہ شیخ الہند ص ۱۶ [3] تفہیم القرآن ج ۱ ص ۹۳

گویا اس موضوع پر ان کو تین حکم دیے گئے تھے کہ اپنی قوم میں

۱- باہم قتل و خونریزی نہ کرنا
۲- کسی کو جلا وطن نہ کرنا
۳- کسی کو اگر قید و بند میں مبتلا دیکھیں تو فدیہ دے کر رہا کرانا۔

بنی اسرائیل نے اپنے سیاسی مفادات اور مصالح کی خاطر پہلے دو حکموں کو پس پشت ڈال دیا اور تیسرے حکم پر عمل کرنے کا اہتمام کیا[1]

ان دونوں آیات سے سرسری طور پر نہ گذر جایئے ان پر ایک نظر ڈال کر دیکھئے کہ ان میں کیا کہا گیا ہے یہ اور صرف یہ

۱- اللہ کے سوا کسی دوسری ہستی سے عابدانہ تعلقات قائم نہ کرنا۔
۲- والدین کے ساتھ صرف سلوک ہی نہیں کرنا بلکہ اس میں حسن کاری کرنا۔
۳- اہلِ قرابت کے قرابت کی بنا پر حقوق ادا کرنا۔
۴- یتیموں کی پوری طرح پاسداری کرنا۔
۵- مسکینوں، غریبوں اور اہلِ حاجت کی ہر حال میں خبر گیری کرتے رہنا۔
۶- انسانی زندگی میں انسانوں سے برتاؤ میں نرم گفتاری اور شیرینی زبان اختیار کرنا۔
۷- اللہ سے تعلقات استوار کرنے کے لیے نماز قائم کرنا۔
۸- اللہ سے تعلقاتِ بندگی کی خاطر مال قربان کر کے زکوٰۃ کی ادائیگی کرنا۔
۹- باہم قتل و خونریزی اور جنگ و جدال سے بچ کر رہنا اور ایک دوسرے کی جان کی حفاظت کرنا۔
۱۰- باہم ایک دوسرے کی ملکیت پر ناجائز قبضہ نہ کرنا اور ایک دوسرے کو گھر سے بے گھر کر کے اس کے اموال کو نہ چھیننا۔
۱۱- آپس میں اگر کوئی قید ہو جائے تو قیدی کو فدیہ دے کر رہا کرانا۔

یہ تمام احکام جن کا بنی اسرائیل کی تاریخ ملی میں میثاق لیا گیا ہے اور جن احکام میثاق کو بنی اسرائیل نباہ نہ سکے صرف بنی اسرائیل ہی کے لیے نہ تھے ان میں سے ہر ایک حکم اس اُمت کے لیے بھی واجب العمل ہے۔ علماء نے تصریح کی ہے کہ ان منہیات میں ساری باتیں ہمارے لیے بھی ویسے ہی حرام ہیں جیسے

---

[1] معارف القرآن م ش ص ۱۹۲

أَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ فَمَا جَزَاءُ مَنْ يَفْعَلُ
ذَٰلِكَ مِنْكُمْ إِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يُرَدُّونَ
إِلَىٰ أَشَدِّ الْعَذَابِ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ۝ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا
الْحَيَاةَ الدُّنْيَا بِالْآخِرَةِ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْصَرُونَ ۝86

کیا یہ طرز عمل تم نے اس لیے اختیار کیا ہے کہ تم کتاب الٰہی کا کچھ حصہ مانتے ہو اور کچھ حصے کا انکار کرتے ہوئے[222] تم یاد رکھو تم میں سے جن لوگوں نے یہ کردار ادا کیا ہے ان کو اس کی پاداش[223] میں دُنیا کی ذلت و رُسوائی ہی مل سکتی ہے اور قیامت[224] کے دن ان کو سخت سے سخت عذاب ہوگا اور اللہ تمہارے کردار[225] سے بے خبر نہیں ہے۔ یہی لوگ ہیں[226] جنہوں نے آخرت کی زندگی کے بدلے دنیوی زندگی مول لی ہے لہٰذا ان کے عذاب میں کوئی کمی نہ کی جائے گی اور نہ ان کی کوئی مدد کی جائے گی۔

بنی اسرائیل پر حرام تھیں۔ قرطبیؒ فرماتے ہیں ھذا کلہ محرم علینا۔ یہ سب ہم پر بھی حرام ہیں اور مامورات میں بھی سب باتیں ہمارے لیے ویسے ہی واجب العمل ہیں۔ مامورات کے سلسلے میں قرآن کو بنی اسرائیل سے شکایت ہے کہ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ إِلَّا قَلِيلًا مِنْكُمْ۔ آئیے قرآن کے پیش کیے ہوئے اس آئینے میں ہم بھی اپنا چہرہ دیکھیں اور محرمات کے بارے میں قرآن کو بنی اسرائیل سے شکایت ہے کہ اپنی مطلب برآری کی حد تک حرام سے نہیں بچتے ہو۔ آئیے ہم بھی اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھیں کہیں ہم بھی اسی راہ پر تو نہیں چل رہے ہیں۔

ایمان و کفر میں مصالحت کے نتائج

ایک نہایت اہم اور گہری اور انقلاب انگیز تبدیلی جو بنی اسرائیل کی ذہنیت و نفسیات میں واقع ہو گئی تھی وہ یہ ہے کہ آخرت پر ان کا ایمان فی الواقع ختم ہو چکا تھا اور اس کے نتیجے میں ان میں اصول صداقت

کے مقابلے میں منافع ومصالح، آجل کے مقابلے میں عاجل کو ترجیح دینے کی بیماری پیدا ہو گئی تھی اس سے بنی اسرائیل ایک بے اُصول، نا قابلِ اعتبار، ابن الوقت اور مصلحت پرست قوم کی سطح پر آ گئے تھے۔ ان کے سامنے کوئی اخلاقی معیار نہیں بلکہ صرف منافع ومصالح اور اغراض ومقاصد رہ گئے تھے۔ قرآن ان آیات میں ان کو بتا رہا ہے کہ منافع اور اغراض کی خاطر کفر وایمان کی ضدین کا اجتماع دُنیا میں ذلت اور آخرت میں سنگین عذاب کی دعوت ہے۔ اب بھی وقت ہے سنبھل جاؤ۔

۲۲۲
ف۔ تم کتابِ الٰہی کا ایک حصہ مانتے ہو اور ایک حصے کا انکار کرتے ہو۔ یعنی کیا تمہارے اس طرزِ عمل کا نتیجہ یہ نہیں ہے کہ کتاب اللہ کے کچھ حصہ پر ایمان ہے اور کچھ حصہ کا انکار کرتے ہو کیا ایمان وکفر کا یہ اجتماع ممکن ہے اور کیا اس سے بڑی کوئی حماقت ہو سکتی ہے کہ ایمان ہی میں تجزیہ کر رہے ہو۔ حالانکہ تم جانتے ہو کہ کتاب اللہ کے ایک حصہ کا انکار ساری کتاب کے انکار کے مترادف ہے۔

آیت میں بے عملی اور گناہ کو کفر بتایا ہے یہ اس بات کی دلیل ہے کہ جو شخص گناہ کرتا ہے اور اس کے لیے کرنے سے پہلے اپنے اندر خلش نہیں رکھتا اور گناہ کرنے کے بعد کسی قسم کی ندامت محسوس نہیں کرتا بلکہ بے باکانہ انداز میں آگے ہی بڑھتا جاتا ہے۔ قرآن کی نظر میں اس کا یہ اقدام التزامِ طاعت کے منافی ہے۔

مدینہ کی ابتدائی زندگی میں اسلامی دعوت سے برسرِ پیکار یہودی علماء تھے یہودی علماء ہی ہیں جن کے بارے میں جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے کہ

اگر مجھ پر یہود کے دس بڑے علماء ایمان لے آتے تو تمام یہود ایمان لے آتے۔

یہ حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث مسند احمد، ابوداؤد میں موجود ہے۔ امام بخاریؒ نے بھی بحوالہ حضرت ابوہریرہؓ اسے روایت کیا ہے۔ حافظ ابنِ حجر عسقلانیؒ نے فتح الباری میں مدینہ کے مشاہیر علمائے یہود کے یہ نام لکھے ہیں۔ عبداللہ بن سلام، ابویاسر بن اخطب، حی بن اخطب، کعب بن الاشرف، رافع بن ابی الحقیق، عبداللہ بن حنیف، فنحاص، رفاعہ بن زید، زبیر بن بالمیا، کعب بن اسد، شمویل بن زرر، ان میں صرف عبداللہ بن سلام کا مسلمان ہونا ثابت ہے۔ حافظ ابوالقاسم سہیلیؒ نے عبداللہ بن صوریا کا اسلام لانا بھی لکھا ہے مگر حافظ عسقلانیؒ کو اس میں تامل ہے۔ ارشادِ نبوت کا مطلب یہ ہے کہ اگر یہ دس علماءِ یہود اسلام لے آتے تو مدینہ کی یہودی دُنیا جو ان کو ارباب سمجھے بیٹھی تھی سب حلقہ بگوشِ اسلام ہو جاتی مگر چونکہ اس قوم کے حق میں من حیث القوم اسلام مقدر نہ تھا اس لیے

ان کے علماء کو بہت کم اسلام لانے کی توفیق ملی —— قرآن کا مخاطب علماء کا یہی گروہ ہے۔

یہاں کچھ علماء کو یہ وسوسہ ہوا ہے کہ آیت میں احکام پر عمل نہ کرنے کو کفر سے تعبیر کیا ہے حالانکہ آدمی جب تک حرام کو حرام سمجھے کافر نہیں ہوتا۔ انہوں نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ —— جو گناہ بہت شدید ہوتا ہے اس پر محاوراتِ شرعیہ میں اس کی شدت کے پیشِ نظر کفر کا اطلاق کر دیا جاتا ہے۔

یہ جواب اس شخص کے بارے میں تو درست ہے جس نے انفرادی طور پر گناہ کیا ہو اور اسے اپنے گنہگار ہونے کا احساس ہو یعنی فرد کی حد تک تو مسئلہ یہی ہے کہ گناہ سے گنہگار کافر نہیں ہوتا لیکن یہ بات جماعت کی حد تک درست نہیں ہے۔ جماعت کو ایماندار اس وقت تسلیم کیا جا سکتا ہے جب وہ زبان سے اقرار کرے اور من حیث الجماعت اس اقرار پر عمل پیرا ہو۔ اگر ان دونوں باتوں میں سے ایک بھی مفقود ہو جائے گی تو اس کا شمار اہلِ ایمان میں نہ ہوگا۔ اس اعتبار سے ایک فرد کی حالت میں اور ایک جماعت کی حالت میں جو فرق ہے اسے منظرِ انداز نہ کرنا چاہیے۔ فقہانے بھی ترکِ صلوٰۃ میں اسے ملحوظ رکھا ہے۔ اگر ایک فرد قیامِ صلوٰۃ میں کوتاہی کرتا ہے تو گنہگار ہے لیکن اگر ایک جماعت بحیثیتِ جماعت ترک کر دیتی ہے تو ایمان کی متاع کھو بیٹھتی ہے، اور اس سے قتال واجب ہے۔

ان آیات میں خالص اجتماعی قانون کے تحت پوری جماعت مخاطب ہے اور اس پر قومی اغراض کے سنگین الزام قائم کرنے کے بعد اثم و عدوان کا مجرم گردانا ہے۔ بلاشبہ جن دلوں میں ایمان کی رتی ہو وہاں یہ صورتِ حال نہیں ہوتی یہ ان کا من حیث الجماعت کردار تھا اور من حیث الجماعت قانون کی کھلم کھلا بغاوت تھی۔ یہ کفر سے بھی زیادہ سنگین جرم تھا۔ جرم کی سنگینی کا اندازہ سزا کی سنگینی سے ہو سکتا ہے۔ ارشاد ہے۔

۲۲۳ ۔ تم میں سے جن لوگوں نے یہ کردار ادا کیا ہے، جن کو اس کی پاداش میں دُنیا کی ذلت و رُسوائی ہی مل سکتی ہے۔ دو قسم کے عذابوں سے دوچار ہوں ایک عاجل اور دوسرا آجل۔ عذابِ عاجل دُنیا میں ذلت و رسوائی کی صورت میں ہوگا۔ عقل بھی گواہ ہے اور واقعات بھی بتا چکے اور بتا رہے ہیں کہ دُنیا میں جو اُمت بھی فسق و بدکاری میں مبتلا ہوتی ہے اور اللہ کے مقرر کردہ قوانین سے کھیلتی ہے وہ اسی دُنیا میں ذلت و رُسوائی کا نشانہ بن جاتی ہے۔ اس پیشین گوئی کا بنی اسرائیل کے حق میں پوری دُنیا نے چند ہی روز میں تماشا دیکھ لیا۔

حجاز میں یہود کے تین زبردست قبیلے رہتے تھے۔ بنی نضیر، بنی قریظہ، بنی قینقاع، تینوں دولت، وجاہت، قوت اور علم و ہنر میں ممتاز تھے۔ تینوں ہی چند سالوں میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات میں تہس نہس ہو کر رہ گئے [1]

ان کا کردار کیا تھا؟ یہی کہ کچھ احکام کو مانتے اور کچھ کا انکار کرتے۔ ایمان کا تجزیہ تو ممکن نہیں ہے تو اب محض احکام کا انکار کرنے والا ہی کافر مطلق ہو گا۔ صرف بعض احکام پر ایمان لانے سے ایمان نصیب نہیں ہوتا۔ آیت نے صاف صاف یہ اعلان کر دیا کہ اگر کوئی شخص بعض احکام شرعیہ کی تو متابعت کرے اور جو حکم کہ اس آیت کی طبیعت یا عادت اور یا غرض کے خلاف ہو اس کے قبول کرنے میں کوتاہی کرے بعض احکام کی متابعت سے اسے کچھ فائدہ نہ ہو گا [2]

۲۲۴ ۔ قیامت کے دن ان کو سخت سے سخت عذاب ہو گا۔ جب اُمت کے تمام معاملات میں دُنیا کی زندگی میں فسادِ اخلاق کی وجہ سے بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے اور اس گہوارۂ عمل میں نیکیوں اور خوبیوں کی جگہ برائیاں ہی برائیاں پھیل جاتی ہیں تو آخرت کی زندگی میں اللہ نے جو نعمتیں ارواحِ عالیہ اور پاک ہستیوں کے لیے مقرر کی ہیں ان سے محرومی ہو جاتی ہے اور اس کی جگہ وہ عذاب اور آلام سے دوچار ہو جاتا ہے۔

قیامت آخرت کی زندگی کی دوسری منزل کا نام ہے اور یہی حقیقی منزل ہے۔ اس کا سب سے پہلا نام قرآن میں یوم الدین ہے یعنی بدلے کا دن جس سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ عمومی جزا اور ربانی عدالت کا دن ہو گا۔ یہاں اس کا نام یوم القیامۃ رکھا گیا ہے۔ قیامت کے دن چونکہ سب یکبارگی اُٹھ کھڑے ہوں گے۔ دوبارہ صور پھونکا جائے گا تو سب زندہ ہو کر قبروں سے اُٹھ کھڑے ہوں گے۔ اس لیے یہ یوم القیامۃ ہے۔ قیامت کے قرآن میں نام، قیامت کے اوصاف اور قیامت کے امکان و وقوع پر طویل مباحث ہیں۔ اس کی تفصیل کا یہ محل نہیں ہے مگر یہاں اتنی بات ضرور سمجھ لیجئے کہ دُنیا کے تمام دینوں میں اس زندگی کے بعد دوسری زندگی کا عقیدہ رہا ہے۔ قرآن میں بھی ایمان کا ایک بنیادی عقیدہ یہی مسئلہ ہے۔

صرف قرآن ہی نے یہودیوں کے لیے آخرت کی زندگی میں ہونے والے عذاب کی خبر نہیں دی ہے بلکہ حضرت مسیح کی زبانی بھی ان کیلئے جہنم کی وعید انجیل میں موجود ہے " تم اپنی نسبت گواہی

---

[1] تفسیر ماجدی ص ۳۴　[2] حاشیہ شیخ الہند ص ۱۱

دیتے ہو کہ ہم نبیوں کے قاتلوں کے فرزند ہیں، غرض اپنے باپ دادوں کا پیمانہ بھر دو۔ اے سانپو! اے افعی کے بچو! تم جہنم کی سزا سے کیونکر بچو گے"۔ (متی ۲۳-۲۴)

۲۲۵ ۔ اللہ تمہارے کردار سے بے خبر نہیں ہے اس کے علم محیط سے تمہاری زندگی کی کوئی حرکت باہر نہیں ہے لہٰذا وہ ضرور تمہیں تمہارے کرتوتوں کی سزا دے گا اور اس معاملہ میں تمہارا کوئی دعویٰ یا غرہ نسب کا نسبت کا آڑ نہ بن سکے گا۔ اس میں یہودیوں کی ان سازشوں اور ریشہ دوانیوں کی طرف بھی اشارہ ہے جو یہودی اسلام کے خلاف کر رہے ہیں ۔

۲۲۶ ۔ یہی لوگ ہیں جنہوں نے آخرت کی زندگی کے بدلے دنیوی زندگی خریدی ہے۔ یعنی مفادِ دنیوی کو آخرت کے مقابلے میں قبول کیا اس لیے کہ جن لوگوں سے عہد لیا تھا اس کو دُنیا کے خیال سے نبھایا اور اللہ کے احکام کی کوئی پرواہ نہیں کی تو پھر ایسوں کی اللہ کے ہاں کون سفارش یا حمایت کر سکتا ہے۔

اس موقعہ پر آخرت کے بدلے دُنیا خریدنے سے یہودیوں کے اس طریقہ کار کی جانب اشارہ ہے کہ وہ دو گروہوں میں بٹ کر مشرکین سے معاہدے کر لیتے جبکہ یہ معاہدے ان کے دین و ایمان کے خلاف ہوتے تھے اور دو متحارب قبیلوں سے معاہدے کرنے سے ان کا منشا یہ ہوتا تھا کہ جو بھی قبیلہ کامیاب ہو وہ بہرحال فائدے میں رہیں گے۔ اور کسی بھی قبیلے کی شکست سے یہودی مفادات پر کوئی زد نہ پڑے۔ یہ رویہ وہ ہی لوگ اختیار کر سکتے ہیں جن کا اللہ پر اعتماد نہ ہو بلکہ ان کا سارا اعتماد اپنی ہوشیاریوں پر ہو۔ گویا سیاسی مفادات، قومی منافع اور ملکی مصلحتوں کی خاطر انہوں نے اللہ کے احکام کو جو پس پشت ڈالا ہے اور اس حقیر دُنیا کے مفادات کی خاطر آخرت کے عظیم منافع کو برباد کیا ہے۔ یہ قرآن کی زبان میں آخرت کے بدلے دُنیا خریدنا ہے۔ اور یہ بُرائی اُمتوں کی زندگی میں اُس وقت رونما ہوتی ہے جب وہ ایک با اصُول، بلند اخلاق، پختہ سیرت جماعت کے بلند مقام سے گر کر ابن الوقتی اور مصلحت پرستی کو اپنی زندگی کا نصب العین بنا لیتی ہے۔ اس مقام پر یہودیوں کی اس کہانی میں ہمارے لیے بہت بڑی عبرت ہے۔ ہمارے اندر ایک نہایت اہم اور گہری اور انقلاب انگیز تبدیلی جو مسلمانوں کی ذہنیت و نفسیات میں اس پچاس سال کے اندر اندر واقع ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ آخرت پر ایمان عملاً کمزور ہوتا جا رہا ہے اور اس کے نتیجہ کے طور پر اُصول و صداقت کے مقابلے میں منافع و مصالح کو ترجیح دینے کا مرض پیدا ہو گیا ہے۔ یہ تبدیلی اس وقت شروع ہوئی جب تقریباً تمام اسلامی ممالک میں مسلمانوں کو مغربی تہذیب، مغربی فلسفۂ اخلاق اور

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَقَفَّيْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ ﴿۸۷﴾

اور ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو تمہاری ہدایت کی خاطر کتاب[۲۲۷] دی۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد پے در پے رسُول روانہ کر کے ہدایت کا سلسلہ جاری رکھا۔ اور بالآخر حضرت عیسٰی بن مریم علیہما السلام کو روشن نشانیاں[۲۲۸] دیں اور روح القدس[۲۲۹] کی تائید سے اسے نوازا۔ لیکن ان میں سے ہر دعوت کی تم نے مخالفت کی۔ تو کیا پس تمہارا کردار یہی ہے کہ جب بھی کوئی رسُول ایسی دعوت[۲۳۰] لے کر آئے جو تمہاری نفسانی خواہشوں کے خلاف ہو تو تم اس کے مقابلے میں تن گئے۔ کسی کو جھٹلایا[۲۳۱] اور کسی کو قتل کر دیا۔

مغربی معیاروں کے قبول کرنے کی دعوت دی گئی۔ مغربی اخلاق، فلسفہ، علوم اور سیاست کا ہر طالبعلم جانتا ہے کہ یورپ کا سارا نظامِ زندگی تمام تر مادہ پرستی اور مصلحت جوئی پر مبنی ہے۔ مسلمانوں میں اس دعوت کے علمبرداروں نے ترقی پر اتنا زور دیا کہ آخرت اور امورِ آخرت کی اہمیت نگاہوں میں گر گئی۔ اور اس کا نتیجہ وہ کچھ نکل آیا جس کی قرآن اس آیت میں نشاندہی کر رہا ہے۔

داعیانِ حق کی مخالفت

قدیم ترین زمانے سے دُنیا میں دو متقابل دعوتیں پائی جاتی ہیں۔ ایک پیروئ نفس اور انسان کی مکمل آزادی اور غیر ذمہ داری کی دعوت۔ دوسرے انسان کی عبدیت، اس کی خدا کے سامنے ذمہ داری و جوابدہی کی دعوت۔ پہلی دعوت کا نام جاہلیت ہے دوسری دعوت اسلام ہے۔ یہودی علماء پہلی دعوت کے علمبردار تھے اور انبیاء دوسری دعوت کے۔ یہودی پیروئ نفس اور خواہشوں کے اس قدر دلدادہ تھے کہ انبیاء کی دعوت کا مذاق اُڑاتے، ان کی تعلیمات پر حملے کرتے اور ان کی دعوت کو اس حد تک اپناتے جہاں تک ان کی سیاسی، قومی، ملکی، تمدنی خواہشیں

اور غرضیں پوری ہوتی نظر آتیں۔ اور جو نہی انبیاء کی دعوت کا ان کے قومی مفادات، ان کی سیاسی اغراض، ان کے ملکی مصالح اور ان کی اقتصادی اور معاشی منفعتوں سے تصادم ہوتا تو انبیاء کے سامنے ایک حریف کی حیثیت سے کھڑے ہو جاتے اور ان کو ناکام بنانے کے سارے حربے استعمال کرتے۔ جہاں تکذیب سے کام چلتا تکذیب کرتے اور تکذیب سے دعوتِ انبیاء ختم نہ ہوتی تو ان کے قتل کے درپے ہو جاتے۔

۲۲۷ف۔ ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب دی یعنی اولاً تمہاری رہنمائی کے لیے ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو تورات دے کر روانہ کیا یعنی ایک مستقل دستورِ زندگی سے بنی اسرائیل کو ہم نے نوازا تھا۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد تمہاری ہدایت کے لیے رسُولوں کا سلسلہ جاری کیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مابین ہر دور میں انبیاء آتے رہے۔ بنی اسرائیل میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد بھی انبیاء کا متواتر آنا تاریخ کا ایک مشہور اور مسلّم واقعہ ہے۔ متعدد انبیاء کے صحیفے عہدنامہ قدیم میں موجود ہیں۔ سلسلۂ انبیاء کی خبر دے کر قرآن یہ جتانا چاہتا ہے کہ زمانۂ نبوت سے دُوری کے نتیجے میں دینی قدریں بدل جاتیں اور شریعت طاقِ نسیان ہو جاتی ہے لیکن اے بنی اسرائیل تم یہ عذر بھی پیش نہیں کر سکتے کیونکہ تمہارے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد انذار و تبشیر کے لیے نبیوں کی ایک بڑی تعداد آتی رہی ہے۔ اسی کے ہم معنی قرآن میں یہ بلیغ فقرہ آیا ہے ثُمَّ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا تَتْرَا پھر ہم نے رسُولوں کا تانتا باندھ دیا۔ اور یہ سب انبیاء تورات ہی کی دعوت لے کر آئے تھے اس لیے تم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہمیں یاد نہیں رہا ہے۔

۲۲۸ف۔ اور بالآخر عیسیٰ علیہ السلام کو ہم نے روشن نشانیاں دیں۔ اس میں روشن نشانیوں سے مراد دلائل، خوارق اور معجزات ہیں۔ ترجمہ میں لفظ روشن بیّنات کا ترجمہ ہے۔ اس کا موصوف محذوف ہے الآیات البینات روشن دلائل۔ قرآن میں آیت کی صفت بَیِّنَۃ اس کثرت سے آئی ہے کہ محض صفت بول کر ہی اس کا موصوف مراد ہو جاتا ہے۔ قرآن نے انبیاء کے معجزات کو عموماً آیت یعنی نشانی کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ جن نبیوں کا قرآن میں تذکرہ ہے۔ ان میں سے کم و بیش حسبِ ذیل انبیاء کے آیات و دلائل بیان ہوئے ہیں۔ حضرت نوحؑ، حضرت لوطؑ، حضرت صالحؑ، حضرت ہودؑ، حضرت شعیبؑ، حضرت زکریاؑ، حضرت یونسؑ، حضرت عیسیٰ علیہم السلام اور حضرت محمد رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ ایسے انبیا بھی ہیں جن کی آیات کے ذکر سے قرآن خاموش ہے مثلاً حضرت اسحاق، حضرت اسماعیل، حضرت ذوالکفل، حضرت الیسع علیہم السلام وغیرہم لیکن

اس خاموشی سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ ان کو کوئی آیت نہیں دی گئی۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

'ہر نبی کو کچھ ایسی نشانیاں دی گئیں جن کو دیکھ کر لوگ اس پر ایمان لاتے۔

البتہ انبیاء کرام کے حالات پر منظر ڈالنے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ غیر معمولی آیات و دلائل ان ہی انبیاء کو مرحمت ہوئے جن کو سخت و شدید معاندین اور منکرین کا سامنا کرنا پڑا اور ضرورت بھی ان ہی کو تھی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ذات گرامی ان انبیاء میں سے ہے جن کو وقت کی شدید ترین قوتوں سے مقابلہ کرنا پڑا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام انبیائے بنی اسرائیل کے خاتم ہیں۔ آپ کے بعد صرف نبوتِ محمدی ہوئی ہے۔ مشہور یہی ہے کہ آپ کا ملک شام کے علاقہ ارضِ گلیل میں ایک قصبہ ناصرہ نامی ہے وہاں آبائی وطن تھا۔ لوگوں کا یہ خیال غلط ہے کہ قرآن میں مسیحیوں کے لیے نصاریٰ کا لفظ ناصرہ سے ماخوذ ہے۔ دراصل اس کا ماخذ نصرت ہے اور اس کی بنا وہ قول ہے جو حضرت مسیح علیہ السلام کے سوال مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰہِ خدا کی راہ میں کون لوگ میرے مددگار ہیں کے جواب میں حواریوں نے کہا تھا کہ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰہِ ۔ اس کی تفصیل سورۂ مائدہ کے نوٹ میں آرہی ہے۔

۲۲۹ ۔ اور ہم نے رُوح القدس کی تائید سے اسے نوازا۔ روح القدس، روح پاک، جان پاک، پاک فرشتہ، موصوف کی اضافت صفت کی طرف ہے جیسے حاتم الجود اور رجل صدق، امام بغویؒ اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ روح القدس کے بارے میں علماء مختلف ہیں لیکن حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے ابن ابی حاتمؒ نے اور محمد بن کعب قرظیؒ سے طبریؒ نے روایت کیا ہے کہ روح القدس سے مراد جبریلؑ ہیں۔ ابو عبیدہؓ اور بہت سے علماء کا اس پر یقین ہے۔ امام بخاریؒ نے بھی سورۂ نحل کی تفسیر میں اسی کو اختیار کیا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنی تخلیق میں نہ صرف انسانوں سے ممتاز بلکہ تمام نبیوں سے الگ ہیں۔ سب مذکر و مؤنث دو صنفوں سے پیدا ہوئے ہیں مگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام ایک ایسے انسان ہیں جن کی تخلیق صرف ایک صنفِ انسانی سے وجود میں آئی ہے۔ پھر اس میں تمثّلِ جبرئیلی، نفخۂ ملکی اور تکلم فی المہد کے واقعات اور بھی عجیب تر ہیں۔ ان کے معجزات میں بھی نرالی شان ہے کہ قدم قدم پر باذن اللہ کی قید لگانی پڑتی ہے۔ ملکیت کا اتنا غلبہ ہے رہنے سہنے اور شادی بیاہ کا کوئی نظم و نسق ہی نہیں ملتا۔ ان سب ضروریات سے منزہ ہو کر واقعی وہ ایک فرشتہ ہیں۔ اگر اس وجہ سے آپ کو ملائکہ سے مناسبت

زیادہ رہی ہو اور اسی مناسبت سے ملائکہ سے استفادہ بھی زیادہ ہوتا رہتا ہو تو اس میں حیرت کی کیا بات ہے عالم بشری میں فرشتہ سے اسی غیر معمولی استفادے کو قرآن نے تائید روح القدس سے تعبیر کیا ہے۔ پاک کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اس کی تعلیم سے انسانوں میں تقدس آتا ہے یا اس لیے کہ اس کی تعلیم ہی سرتاسر مقدس ہے اور اس میں یہ بھی اشارہ ہے کہ آپ کی اعانت اللہ سبحانہٗ نے ایک فرشتہ کے ذریعے کرائی تھی۔

۲۳۰ ؎ - جب بھی کوئی رسُول ایسی دعوت لے کر آتا جو تمہاری نفسانی خواہشوں کے خلاف ہوتی تم اس کے مقابلے میں ڈٹ جاتے۔

انسانی طبیعت کی یہ کمزوری شروع سے رہی ہے کہ وحیٔ الٰہی کے مقابلے میں بالاتر وہ اپنے ہوائے نفس کو رکھنا چاہتا ہے اور وحی کے ذریعے آتے ہوتے جو احکام اسے اپنی خواہشوں یا اپنی ناقص عقل یا اپنی محدود معلومات کے خلاف نظر آتے ہیں ان سے انکار کر دیتا ہے اور ان کے مقابلے میں علمِ بغاوت بلند کر دیتا ہے۔ ہمیشہ سے یہ مسئلہ بے حد اہم رہا ہے کہ انسان کے تعلقات کی بنیاد کیا ہونی چاہیے اور انسانی تمدن کن بنیادوں پر تعمیر ہونا چاہیے۔ اس ضروری اور فیصلہ کن سوال کا جواب انبیاء نے یہ دیا ہے کہ انسانی اُمورِ معاملات اور تمدنی مسائل میں نبوت کی رہنمائی پر پورا اعتماد کیا جائے۔ نبوت کے مقابلے میں بنی اسرائیل کا جواب یہاں قرآن نے یہ بتایا ہے کہ صرف ہمارے ماحول اس کی ذہنی خصوصیات اور جماعتی جذبات و میلانات کی بنیاد پر ہماری رہنمائی ہونی چاہیے۔

جس قوم کے افراد میں مذہب کا یہ تصور ہو اس کے متعلق یہ سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا کہ وہ کسی ایسے نظام کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دے جو محمد رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے ہیں۔ جو لوگ شب و روز اپنے ذاتی اغراض، خاندانی مفاد کی فکر میں ہوں ان کو اس سے کیا بحث کہ کون آیا ہے اور زندگی کی تعمیر نو کس طرز پر ہونے والی ہے۔ جس جماعت کے افراد اپنی خاندانی بزرگی اور بزرگوں کی وجاہت سے نجات حاصل کر سکتے ہوں اسے میدانِ عمل میں آکر زندگی کی نئی قوتوں سے نبرد آزما ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ جہاں چند نعروں اور تجویزوں سے جنت حاصل ہو سکتی ہو وہاں نبوت کا استقبال کرنے کا جذبہ کیونکر پیدا ہو۔ آج جس چیز کا نام نیشنلزم، سوشلزم ہے اگر غور سے دیکھا جائے تو اس کی تہ میں صرف یہی استکبار اور اتباعِ نبوت سے عار کی رُوح کار فرما نظر آئے گی۔ ——— اسی کا نتیجہ ہے کہ

۲۳۱ ؎ - نبیوں میں سے کسی کو تم نے جھٹلایا اور کسی کو قتل کیا۔ اپنی رائے، خواہش، جذبات اور

وَقَالُوا قُلُوبُنَا غُلْفٌ ۚ بَل لَّعَنَهُمُ اللَّهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيلًا مَّا يُؤْمِنُونَ ﴿٨٨﴾

اور یہ لوگ آپ سے کہتے ہیں کہ ہمارے دل غلافوں میں لپٹے ہوئے ہیں (نہیں) بلکہ اللہ نے ان کو ان کے کفر کی وجہ سے اپنی رحمت سے دور کر دیا ہے اسی کا نتیجہ ہے کہ وہ بہت کم حق کو مانتے اور قبول کرتے ہیں۔

میلانات کو اصل اور معیار بنانے کا نتیجہ یہ نکلا کہ انہوں نے انبیاء کے لیے بڑی سے بڑی سزا تجویز کی۔ تکذیب کی اور ان کے خون سے ہاتھوں کو رنگین کیا۔ مولانا اشرف علی تھانویؒ نے یہاں یہ خوب نکتہ نکالا ہے کہ استکبار ہی اکثر گناہوں کی جڑ ہے۔ قرآن نے یہاں تکذیب اور قتل انبیاء جیسے جرائم کو اسی کا نتیجہ قرار دیا ہے۔

بنی اسرائیل کی تاریخ ملی کی داستان بیان کرنے سے مقصود مسلمانوں کو متنبہ کرنا ہے کہ اگر وہ اللہ کے بتائے ہوئے منہاج زندگی اور دستور حیات سے روگردان ہو گئے اور اس کے قانون کو چھوڑ کر اپنے میلانات اور مفادات کے پیچھے پڑ گئے تو ان کا بھی وہی حشر ہو گا جو بنی اسرائیل کا ہوا۔ اور وہ بھی خلافت و امامت کے منصب سے اسی طرح ہٹا دیے جائیں گے جس طرح یہودی ہٹا دیے گئے اور اس طرح ذلت و رسوائی، بدبختی و بے نصیبی ان پر بھی مسلط کر دی جائیگی! اللہ اکبر! دنیا نے اس کا تماشہ دیکھ لیا اور مسلمان دنیا کی امامت سے محروم ہو گئے۔

حق پر ثبات اور باطل پر جمود میں فرق

اُمتوں میں جب راستی اور حق پرستی کی جگہ نفسانی خواہشوں کی پرستش ہونے لگتی ہے اور اصول کی جگہ اغراض پر لوگوں کی جماعتی قوت بنتی ہے تو داعیان حق کی مخالفت ان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا محبوب ترین مشغلہ بن جاتا ہے۔ حق کی پیاس اور طلب سے ان کے دل خالی ہو جاتے ہیں، اپنی ذہنی کاوشوں، قیاس آرائیوں، عقلی اور علمی امانیتوں پر اس قدر مغرور ہوتے ہیں کہ داعی حق کی بات سننا بھی گوارا نہیں کرتے۔ مدینہ کے علماء یہود ایسے ہی جمود میں

مبتلا تھے اور اعتقاد کی پختگی سمجھ کر فخر کرتے تھے۔

۲۳۲
ـــہ ۔ ہمارے دل غلافوں میں ہیں۔ یعنی یہ لوگ اپنے باطل پر جماؤ اور بے حسی کی حالت پر فخر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمارے دل غلافوں میں ہیں یعنی اب کسی نئی بات کا اثر ہم پر ہو نہیں سکتا۔ یا تو اس لیے کہ علمی طور پر تشنہ کام نہیں ہیں۔ یا اس لیے کہ تمہاری بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی ہے۔ حالانکہ یہ اعتقاد کی پختگی اور حق کا ثبات نہیں بلکہ حق کے خلاف عصبیت ہے۔ یہود اپنی تعریف میں کہتے تھے کہ ہمارے دل غلافوں میں محفوظ ہیں، بجز اپنے دین کے کسی کی بات کا ہم پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ ہم کسی کی چاپلوسی، سحر بیانی یا کرشمے اور دھوکے کی وجہ سے ہرگز آپ کی متابعت نہیں کر سکتے۔ حق تعالیٰ نے فرمایا کہ بالکل جھوٹے ہیں۔ بلکہ ان کے کفر کی وجہ سے اللہ نے ان کو ملعون اور اپنی رحمت سے دُور کر دیا ہے اس لیے کسی طرح دینِ حق کو نہیں مانتے اور بہت کم ایمان سے مشرف ہوتے ہیں [1]

مطلب یہ ہے کہ ہم اپنے عقیدہ و خیال میں اس قدر پختہ ہیں کہ آپ خواہ کچھ کہیں آپ کی بات کا ہم پر کوئی اثر نہ ہوگا۔ یہ وہی بات ہے جو ان ہٹ دھرم لوگوں کی زبانوں پر آتی ہے جن کے دل و دماغ میں جاہلانہ تعصب کا خلط ہوتا ہے وہ اسے عقیدے کی پختگی کا نام دے کر ایک خوبی سمجھتے ہیں حالانکہ اس سے بڑھ کر آدمی کے لیے کوئی عیب نہیں ہے کہ وہ اپنے موروثی عقائد پر جم جانے کا فیصلہ کرے چاہے ان کا غلط ہونا کیسے ہی طاقتور دلائل سے ثابت ہو جائے [2]

حافظ ابن القیمؒ نے قلوبنا غلف کی معنویت سے جو نقاب کشائی کی ہے وہ قابلِ شنید ہے۔ اس فقرے کے ایک معنے یہ ہیں کہ ہمارے دل تو علم و حکمت یعنی نقلی اور عقلی علوم و فنون کے گہوارے ہیں۔ پتہ نہیں آپ کی دعوت کیا ہے؟ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گنجینۂ علوم ہونے کی وجہ سے آپ کی دعوت ہماری جماعتی، قومی ضرورت کی چیز نہیں ہے۔ اس صورت میں غلف غلاف کی جمع ہے۔ اکثر مفسرین کی رائے میں معنے یہ ہیں کہ تمہاری دعوت ہماری سمجھ میں نہیں آتی ہے۔ اس صورت میں غلف کو اغلف کی جمع کہا جائے گا۔ ابوعبید کہتے ہیں غلاف میں محفوظ چیز کو اغلف کہتے ہیں جیسے میان میں محفوظ تلوار کے لیے سیفٌ اغلفُ بولا جاتا ہے۔ ابنِ عباسؓ، قتادہؒ، اور مجاہدؒ نے دلوں کے غلافوں میں ہونے کا مطلب یہی بتایا ہے کہ آپ کی دعوت ہماری سمجھ میں نہیں آتی ہے اور یہی مطلب درست

---

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۱۷ [2] تفہیم القرآن ج ۱ ص ۹۲

ہے کیونکہ علوم وحکمت کے خزانہ ہونے کے لیے عربی میں یہ پیمانہ نہیں ہوتا ہے اور قرآن میں بھی اس کی کوئی نظیر نہیں اور کوئی شخص اپنے علمی مقام کو اس انداز میں کبھی ظاہر نہیں کرتا۔

بہرحال معنے دونوں ہیں اور دونوں اکابر نے اختیار کیے ہیں۔ اور خود حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے یہی دونوں معنے منقول ہیں۔ مجاہدؒ اور قتادہؒ کا بیان ہے کہ ابن عباسؓ غُلُفٌ لام کے پیش کے ساتھ پڑھتے اور معنے یہ بتاتے کہ ہمارے دل تو علوم کا خزانہ ہیں ہمیں آپ کے علم کی ضرورت نہیں ہے۔ زمخشری نے بھی یہی معنے لکھے ہیں اور بتایا ہے کہ وہ لوگ اس کا دعویٰ کرتے تھے کہ ہم تو علم کے کوٹھے ہیں ہمیں کسی علم کی ضرورت نہیں ہے۔

۲۴۳ ۔ بلکہ اللہ نے ان کو ان کے کفر کی وجہ سے اپنی رحمت سے دُور کردیا۔ پہلے فقرے کا جو مطلب بھی لیا جائے اسی کے اعتبار سے لفظ بل اپنے معنے میں ہے۔ اگر پہلے فقرے کا مطلب یہ ہے کہ ہم تو خزانۂ علوم ہیں ہمیں آپ کی دعوت کی ضرورت نہیں ہے۔

قرآن نے اس فخریہ نعرے اور دعوے کا جواب یہ دیا ہے کہ جس علم کے خزانہ ہونے کا تمہیں دعویٰ ہے یہ کوئی عزہ کی چیز نہیں ہے بلکہ یہ تو تمہارے صداقت سے دُور ہو جانے کی نشانی ہے۔ اور صداقت سے یہ دُوری تمہارے کفر اختیار کرنے کی وجہ سے ہوئی۔

مطلب یہ ہے کہ صورت حال وہ نہیں ہے جو تم کہہ رہے ہو بلکہ اصل معاملہ یہ ہے کہ تمہارے دلوں پر اللہ کی جانب سے تمہاری کافرانہ زندگی کی وجہ سے مُہر لگ چکی ہے۔

اور اگر پہلے فقرے کا مطلب یہ ہے کہ تمہاری دعوت ہماری سمجھ میں نہیں آتی تو پھر اس فقرے کا مقصد یہ ہے کہ یہ بات نہیں کہ دعوت کی بات تمہاری سمجھ میں نہیں آتی بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں تمہارے انبیاء سابقین سے کفر اور کتاب الٰہی کی مسلسل بغاوت اور تحریف کی وجہ سے اپنی رحمت سے دُور کر دیا ہے۔ یہ ہے واقعی سبب اس کا کہ تم خاتم الانبیاءؐ کی دعوت کو قبول کرنے سے محروم ہو گئے۔

۲۴۴ ۔ بہت کم ایمان لاتے ہیں۔ قلیل ایمان کی صفت ہے۔ جو ایمان نجات کے لیے ضروری ہے اس میں عقائد کے ساتھ معاملات، اخلاق اور اجتماعی و انفرادی زندگی کے متعدد اجزاء ہیں۔ بنی اسرائیل دینی زندگی کے سارے اجزاء میں سے صرف چند اجزاء پر نام و نمود کے لیے کار فرما تھے۔ یا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی کتاب کو اجمالاً مانتے تھے کہ یہ اللہ کی کتاب ہے لیکن زندگی کے مختلف موڑوں اور گوشوں میں کتاب اللہ کے برتنے، اپنانے اور قبول کرنے کی حد تک ایمان نہیں رکھتے تھے۔

وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ ۙ وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ ۫ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿۸۹﴾

اور جبکہ ان کی ہدایت کے لیے اللہ کی طرف سے ایک ایسی کتاب نازل ہوئی جو تصدیق[235] کرنے والی ہے اس کتاب کی جو پہلے سے ان کے پاس موجود ہے۔ باوجودیکہ وہ تورات کی پیشین گوئیوں کی بنا پر اس نبوت[236] کے منتظر تھے اور کافروں کے مقابلے میں اس کا نام لے کر فتح و نصرت[237] کی دعائیں مانگا کرتے تھے، مگر جب وہی ان کی جانی بوجھی[238] نبوت آ گئی تو صاف انکار کر دیا۔ اللہ کی لعنت ان لوگوں پر جو کفر[239] کی راہ اختیار کرتے ہیں۔

آخری نبی کا انتظار اور اس کا انکار

یہ آیت پہلی آیت سے مربوط ہے۔ بتایا یہ جا رہا ہے کہ یہ مدعیانِ علم ایمان کی نعمت سے ان حالات میں محروم ہو رہے ہیں جب کہ ان کے پاس اللہ کی جانب سے خالص علمی کتاب آ ئی ہے اور کتاب بھی وہ آئی جو ان کے علمی صداقتوں کو مانتی ہے۔ اب یہ کہتے ہیں کہ ہمارے قلوب گنجینۂ علوم ہیں ہمیں کسی نئے علم کی ضرورت نہیں لیکن یہی بے چینی سے نبی آخر الزمان کا انتظار کر رہے تھے جس کی آمد کی پیشین گوئیاں ان کے انبیا سنے کی تھیں۔ دعائیں مانگا کرتے تھے کہ جلدی سے وہ آئے تو دینِ حق کا بول بالا ہو اور پھر ہماری ترقیوں کا وقت آئے۔ خود مدینہ والے اس بات کے گواہ تھے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے پہلے یہودی آنے والے نبی کے منتظر تھے۔ ابنِ اسحاق، ابن سعد، مسند احمد، تاریخ بخاری، مستدرک حاکم، دلائلِ بیہقی، معجم طبرانی اور دلائلِ ابونعیم میں متعدد روایتیں ایسی ہیں جن سے مجموعی طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور سے پہلے مدینہ کے یہودیوں میں ایک آنے والے پیغمبر کے جلد ظاہر ہونے کے چرچے رہا کرتے۔ اور ان ہی سے سن سن کر اوس و خزرج کے کانوں میں پیغمبر کی آمد کی خبر پڑی ہوئی تھی۔ اور اکثروں کے لیے

یہ خبر ہدایت کا باعث بنی چنانچہ ابن سعد کے علاوہ دیگر کتب مذکورہ میں ایک نوجوان انصاری کا واقعہ بسند صحیح مذکور ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں چھوٹا تھا تو مدینہ میں ایک یہودی واعظ آیا۔ دوران وعظ اس نے ایک پیغمبر کے ظہور کی بشارت دی۔ لوگوں نے دریافت کیا کہ وہ کب تک ظاہر ہوگا۔ اس نے اُن انصاری کی طرف جو اس مجمع میں سب سے چھوٹے تھے اشارہ کرکے کہا کہ اگر یہ لڑکا جیتا رہا تو وہ اس کا زمانہ پائے گا۔ ابن اسحاق نے سیرت میں لکھا ہے کہ حضرت صفیہؓ فرماتی ہیں کہ جب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ تشریف لائے تو میرے باپ اور چچا دونوں آپؐ سے ملنے گئے۔ یاد رہے کہ حضرت صفیہؓ کے والد اور چچا دونوں بہت بڑے یہودی علماء میں سے تھے۔ دونوں نے بڑی دیر تک آپؐ سے گفتگو کی جب گھر واپس آئے تو میں نے اپنے کانوں سے ان کی باتیں سنی ہیں وہ کہہ رہے تھے کہ "کیا واقعی یہ وہی نبی ہے جس کی خبریں ہماری کتابوں میں ہیں"۔ میرے چچا نے والد سے دریافت کیا ہاں خدا کی قسم۔ یہ والد صاحب کا جواب تھا۔ چچا بولے کیا تم کو اس کا یقین ہے؟ ہاں والد نے کہا۔ چچا نے دریافت کیا کہ پھر کیا ارادہ ہے؟ والد نے کہا کہ جب تک جان میں جان ہے مخالفت کروں گا۔ بیہقی میں حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ ایک یہودی کا لڑکا حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں رہا کرتا تھا۔ اتفاق سے وہ بیمار پڑ گیا۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اس کی عیادت کو تشریف لے گئے اور آپؐ نے اس کے باپ سے پوچھا کہ کیا میرا ذکر تم تورات میں پاتے ہو؟ اس نے کہا کہ نہیں۔ لڑکے نے فوراً جواب دیا ہاں یا رسولؐ اللہ ہم نے آپ کا ذکر تورات میں پڑھا ہے۔

قرآن نے اس آیت میں ان کے ان دو عقیدوں کو دہرا کر ان کے اسلام قبول نہ کرنے پر اُن کی ملامت کی ہے۔

۲۳۵ ؎۔ اوّل تو اللہ کی جانب سے تمہاری ہدایت کے لیے کتاب آنا ہی اس کی مقتضی ہے کہ تم اسے بلا چون وچرا مانو۔ اور پھر جب کہ یہ کتاب تمہارے مقدس نوشتوں اور تمہارے علمی سرمایہ کے خلاف کوئی بات نہیں کہتی بلکہ توحید، اُصولِ دین اور مقاصد میں سر تا سر مصدق اور مؤید ہے تو پھر نہ ماننے کی کیا وجہ ہے اور اس مخالفانہ تگ و دو کا منشاء کیا ہے؟۔

۲۳۶ ؎۔ بنی اسرائیل کے پاس جو کتاب آئی ہے وہ قرآن ہے اور جو کتاب ان کے پاس پہلے سے تھی وہ تورات ہے۔ قرآن کے نازل ہونے سے پہلے جب یہودیوں کا کفار سے مقابلہ ہوتا اور مقابلے میں مغلوب ہوجاتے تو اللہ سے دعا کرتے کہ ہم کو نبی آخر الزمان اور جو کتاب ان پر نازل

ہو گی ان کے طفیل کافروں پر غلبہ عطا فرما۔ جب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے اور سب نشانیاں بھی دیکھ چکے تو منکر ہو گئے اور ملعون ہوئے[1]

مطلب یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد سے پہلے یہودی بڑی بے چینی کے ساتھ "اس نبیؐ" کے منتظر تھے جس کی بعثت کی انبیاء نے بشارت دی تھی۔ دعائیں مانگا کرتے تھے کہ جلدی سے وہ آئے تو کفار پر غلبہ ملے اور ہمارے عروج کا دور شروع ہو۔ خود اہلِ مدینہ اس بات کے شاہد تھے کہ بعثتِ محمدیؐ سے پہلے بھی ان کے ہمسایہ یہودی آنے والے نبی کی امید پر جیا کرتے تھے اور ان کا آئے دن کا تکیہ کلام تھا کہ اچھا اب تو جس کا جی چاہے ہم پر ظلم کر لے۔ جب وہ نبی آئے گا تو ہم سب ان ظالموں کو دیکھ لیں گے۔ اہلِ مدینہ یہ باتیں سنے ہوئے تھے اس لیے جب ان کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات معلوم ہوئے تو انہوں نے آپس میں کہا کہ دیکھنا کہیں یہ یہودی تم سے بازی نہ لے جائیں۔ چلو پہلے ہم ہی اس نبی پر ایمان لے آئیں مگر ان کے لیے یہ عجیب ماجرا تھا کہ وہی یہودی جو آنے والے نبی کی انتظار میں گھڑیاں گن رہے تھے اس کے آنے پر سب سے بڑھ کر اس کے مخالف ہو گئے[2]

۲۴۷ ـہ ـ فتح ونصرت کی دعائیں مانگا کرتے۔ عربی لفظ یستفتحون علی الذین کفروا ہے استفتاح کے معنے فیصلہ طلب کرنا، فتح مانگنا اور مدد چاہنا کے ہیں۔ قرآن میں اس مصدر سے تین مواقع پر مختلف الفاظ آتے ہیں۔ سورۃ انفال میں ہے ان تستفتحوا فقد جاءکم الفتح اگر تم فتح چاہتے ہو تو فتح تمہارے پاس آ گئی۔ سورۃ ابراہیم میں ہے واستفتحوا وخاب کل جبار عنید اور انبیاء نے اللہ سے دعا مانگی اور فیصلہ چاہا۔ آیاتِ قرآنی میں اس لفظ کا استعمال بتاتا ہے کہ اس کے معنی فیصلہ طلب کرنے اور دعا مانگنے کے ہیں۔ ابنِ جریرؒ جو لغت اور زبانِ عربی کے بھی امام ہیں انہوں نے بھی لسے استنصار مدد چاہنے کے معنی میں لیا ہے۔ اصلی معنے کے ہوتے ہوئے بلا وجہ مجازی معنے لینا اور اسے یفتحون کا مرادف بنانا تقاضائے تحقیق نہیں ہے۔ ائمہ تفسیر کی اکثریت نے معنے یہی بتائے کہ یہودی اس پیغمبر کا واسطہ دے کر کافروں پر غلبہ اور برتری کی اللہ کی جناب میں دعائیں مانگتے تھے۔ قرطبی نے ان ہی معنے کی تائید ایک حدیث سے کی ہے۔ حدیث میں ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یستفتح بصعالیک المهاجرین غریب مہاجروں کی دعاؤں کے ذریعے اللہ سے مدد چاہتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ خیبر کے یہودیوں کا قبیلہ غطفان سے

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۱۷ [2] تفہیم القرآن

مقابلہ ہوا۔ مقابلہ میں یہود شکست کھا گئے تو یہود نے اس دُعا کا سہارا لیا۔

اللھم انا نسألك بحق النبی الذی وعدتنا ان تخرجہ لنا فی آخرالزمان ان تنصرنا علیھم۔

(قرطبی ج ۲ ص ۲۷)

حافظ بدرالدین عینیؒ کعب احبارؓ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کے وسیلے سے دُعا مانگنا بنی اسرائیل میں رائج تھا۔ حافظ ابوالقاسم سہیلیؒ لکھتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم نبوّت سے پہلے بھی قریش مکہ میں مبارک سمجھے جاتے تھے اور اسی لیے ایک مرتبہ قحط کے موقعہ پر عبدالمطلب نے قریش کے ساتھ جبل ابی قبیس پر چڑھ کر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلّم کے توسل سے بارش کی دُعا مانگی تھی اور وہ قبول ہو گئی تھی۔ خواجہ ابوطالب نے اسی قصّہ کی طرف اپنے مشہور قصیدے میں اشارہ کیا ہے جس کے کچھ اشعار صحیح بخاری میں بھی منقول ہیں۔ شرح مواہب میں ہے کہ ایک بار مدینہ میں قحط پڑا تو لوگ حضرت عائشہؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے فرمایا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلّم کے مزار اقدس کی چھت کو اتنا کھول دو کہ آسمان نظر آنے لگے۔ گویا یہ بھی ایک قسم کا توسل تھا۔ لوگوں نے ایسا ہی کیا، بارش ہوئی اور اتنی زور سے آئی کہ ہر جگہ سبزہ اُگ آیا اور جانوروں کے جسم چربی کی وجہ سے پھٹ گئے وہ سال عام الفتق کے نام سے تاریخ میں مشہور ہے۔

یہاں یہ سوال بے حد اہمیت رکھتا ہے کہ اس انداز پر دُعا کہ یا اللہ رسُولؐ کے طفیل میرا یہ کام کر دے۔ کا اسلام میں قانونی مقام کیا ہے؟ اگرچہ قرآن کی اس آیت کے منطوق، مدلول سے اس معاملہ کا کوئی تعلق بظاہر نہیں ہے لیکن اتنا اشارہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ یہودیوں کا یہ دُعا کا عمل قرآن کی نظر میں قابلِ گرفت نہیں ہے۔ گرفت اور تنقید اس پر ہے کہ اس کے باوجود پھر نبوت سے آنے کے بعد رشتہ نہیں جوڑتے۔ اگر دُعا کا یہ پیمانہ قرآن کی نظر میں غلط ہوتا تو قرآن کی نگاہِ تنقید سے نہ بچتا۔

جہاں تک اس دُعائی پیمانے کے بارے میں اسلام کے قانونی موقف کا تعلق ہے تو یہ ایک دراز دامن مبحث ہے یہ اس کا محل نہیں ہے۔ ہاں چند ارشادات بطورِ سوغات پیشِ خدمت ہیں۔

توسل چار طرح کا ہے۔ ایمانِ نبی کا توسل، اتباعِ نبی کا توسل، دُعاءِ نبی کا توسل اور ذاتِ رسُولؐ کا توسل۔

ایمان کے توسل کے بغیر تو کوئی شخص مسلمان نہیں ہو سکتا۔ ایمانِ نبوّت کا وسیلہ تو مدارِ نجات ہے۔ قرآنی آیات میں جہاں صرف توحید کو مدارِ نجات بتایا گیا ہے ان سے یہ شبہ نہ ہونا چاہیے کہ

صرف توحید موجبِ نجات ہو سکتی ہے۔ قرآن حکیم میں تصنیف کی جگہ خطابت کا انداز بیان ہے اس لیے اس کا مفہوم سمجھنے کے لیے ایک خطیب کے اندازِ بیان کا تصور رکھنا چاہیے۔ جب وہ کسی خاص ماحول میں گفتگو کرتا ہے تو بہت سی باتیں اس کے ماحول میں اور بہت سی متکلم اور مخاطب کے دماغوں میں موجود ہوتی ہیں اور کچھ اس کے طرزِ کلام سے سمجھ میں آتی ہیں۔ اگر ان سب باتوں کو پیشِ نظر رکھا جائے تو قرآن کے سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی۔ اللہ کا رسول خود خدا کی جانب سے بات کرتا ہے۔ جب وہ بولتا ہے تو اللہ سبحانہ' کا ترجمان بن کر بولتا ہے اس لیے وہ اپنے بیان میں دوران باتوں پر دیتا ہے جو غائب اور غیر محسوس ہیں۔ جب وہ آمنوا باللّٰہ کہتا ہے تو یہ جانتا ہے کہ یہ حکم میری آواز پر جو مانے گا اس کو پہلے مجھے ماننا لازم ہوگا۔ مخاطبوں کو اگر ضد ہوتی ہے تو دراصل اس کی شخصیت سے ہوتی ہے وہ بہت جانی بوجھی اور مانی ہوئی باتوں کا صرف اس لیے انکار کرتے ہیں کہ اس کے مُنہ سے نکل رہی ہے اسی لیے ایمان بالرسول خود ایک رُکن اور اصل بن جاتا ہے۔ پتے کی بات یہ ہے کہ جس طرح ایمان میں اللہ اور رسول کے درمیان فرق کی گنجائش نہیں ہے یعنی ایک کا مُنکر دوسرے کا مُنکر سمجھا جاتا ہے۔ ایسے ہی رسولوں میں بھی باہم یہی نسبت ہے۔ یوں سمجھیے کہ گفتار، کردار اور نظریات کی صداقت ایمان کی صداقت پر موقوف ہے اور ایمان کی صداقت اللہ اور اس کے رسول کے ماننے سے مربوط ہے۔ اس لیے نبوت پر ایمان کا توسل نجات کے لیے ایک مرکزی نقطہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس موضوع پر اُمت میں کبھی دو رائیں نہیں ہوئی ہیں۔

دوسرا اطاعت اور اتباعِ نبی کا توسل۔ یہ توسل بھی اسلام میں شرطِ فلاح، شرطِ محبت اور شرطِ کامیابی ہے۔ زبان سے اگر اقرار کرے مگر طرزِ عمل کھلے منکروں جیسا رکھے تو اگرچہ زبان سے اقرار کر رہا ہے لیکن نافرمانی میں زبان سے انکار کرنے والے کے برابر ہے تو ایک نظر میں یہ بھی گویا مُنکر ہے لہٰذا اسے بھی منکرین کے ساتھ دوزخ میں ایک وقت تک رہنا ہوگا۔ رسول کے پیغام کو ماننا ایمان ہے اور اس کی طاعت کرنا اسی ایمان کی علامت ہے۔ اس توسل کی فرضیت میں بھی کسی کو کوئی کلام نہیں ہے۔

تیسرا دُعا کا توسل ہے۔ حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم سے دُعا کرانا ایک امرِ استحبابی اور پسندیدہ معاملہ ہے۔ معاشرہ صحابہ میں صحابہ کا اس پر عمل تھا قرآن میں اس کی تصریح ہے۔ اور آپ کے وصالِ مبارک کے بعد آپ سے دُعا کی درخواست کے بارے میں دو مختلف رائیں ہیں۔ جو لوگ آپ کی　　　موت کو آپ کی نیند پر قیاس کر کے آپ کی موت کو

عام انسانوں کی موت نہیں سمجھتے ہیں اور برزخ حیات کے قائل ہیں وہ جائز کہتے ہیں اور جن کو حیات سے اختلاف ہے وہ ناجائز بتاتے ہیں۔ یہ موضوع تفصیل طلب ہے انشاء اللہ سیر حاصل تبصرہ سورۃ احزاب میں آئے گا۔

چوتھا ذاتِ نبی کا توسل ہے۔ اس میں علماء کا اختلاف ہے۔ جمہور اہل السنت اسے جائز کہتے ہیں اور حافظ ابن تیمیہؒ اسے ناجائز بتاتے ہیں۔ لیکن یاد رہے کہ یہ اختلاف فرضیت، سنیت اور استحباب میں نہیں بلکہ جواز میں ہے یعنی اس طرح دعا مانگنے کو نہ کوئی فرض کہتا ہے نہ کوئی سنت اور نہ کوئی مستحب کہتا ہے بلکہ جو کہتے ہیں وہ صرف جائز کہتے ہیں۔

۲۴۸ سے - جب وہی ان کی جانی بوجھی نبوت آ گئی۔ اصل لفظ ماعرفوا جانی پہچانی چیز ہے اس سے مراد نبوت بھی ہو سکتی ہے قرآن بھی ہو سکتا ہے اور خود ذاتِ رسالت بھی۔ حاصل سب کا ایک ہے۔ مقصد یہ ہے کہ یہود اس آخری نبیؐ اور اس کی نبوت کی علامتوں سے اپنے دینی نوشتوں اور اپنے علمی سرمایہ کے ذریعے خوب واقف ہو چکے تھے۔ نبوت کا ظہور بالکل اچانک اور ان کے علم و واقفیت کے بغیر نہیں ہوا۔ ان کو پہلے ہی سے خبر تھی کہ نبی آنے والا ہے۔ انجیل یوحنا میں ہے۔ جب یہودیوں نے یروشلم سے کاہن یہ پوچھنے کو اس کے پاس روانہ کیے کہ تو کون ہے؟ تو اس نے اقرار کیا اور انکار نہ کیا بلکہ اقرار کیا کہ میں تو مسیح نہیں ہوں۔ انہوں نے اس سے پوچھا کہ پھر کون ہے کیا تو ایلیاہ ہے؟ اس نے کہا میں نہیں ہوں کیا تو وہ نبی ہے اس نے جواب دیا کہ نہیں۔ پھر انہوں نے اس سے کہا کہ پھر ہے تو کون؟ (یوحنا ۱۹ - ۲۲) اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہود صدیوں سے ایک جانے بوجھے ہوئے نبی "وہ نبی" کے منتظر تھے[1]

یہاں یہ خلش بالکل بے محل ہے کہ حق کی معرفت کے باوجود ان کو کافر کیوں کہا گیا۔ صرف علم و معرفت نہ تو شرعی نظر میں کوئی اہمیت رکھتا ہے اور نہ یہ مدارِ نجات ہے۔ ایمان صرف معرفت کا نام نہیں ہے۔ یہ فرقہ جہمیہ کے سرغنہ جہم بن صفوان کی رائے ہے کہ ایمان صرف معرفت قلبیہ کا نام ہے۔ حافظ ابن تیمیہؒ کتاب الایمان میں فرماتے ہیں کہ اس مسئلہ میں امام اعظمؒ نے اس کی تردید فرمائی ہے۔ امام صاحبؒ کا اس موضوع پر جہم سے مناظرہ دیکھنا ہو تو ہماری کتاب امام اعظمؒ اور علم الحدیث پڑھیے۔ ایمان کے لیے قلب کی تصدیق، زبان کا اقرار ضروری ہے۔ مطلب یہ ہے کہ

---

[1] تفسیر ماجدی ص ۳۵

بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهِ أَنْفُسَهُمْ أَنْ يَكْفُرُوا بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ بَغْيًا أَنْ يُنَزِّلَ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ عَلَىٰ مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ ۖ فَبَاءُوا بِغَضَبٍ عَلَىٰ غَضَبٍ ۚ وَلِلْكَافِرِينَ عَذَابٌ مُهِينٌ ﴿٩٠﴾

بد ترین ہے وہ قیمت[۲۴۰] جس کے عوض انہوں نے اپنے آپ کا سودا کیا ہے یعنی یہ کہ اللہ کی نازل کردہ کتاب سے صرف اس[۲۴۱] ضد سے کفر اختیار کیا کہ وہ جس پر چاہتا ہے اپنا فضل نازل فرماتا ہے۔ اس بنا پر وہ اللہ کے غضب[۲۴۲] بالائے غضب کی آماجگاہ ہو گئے اور حق سے سرکشی اختیار کرنے والوں کو ہمیشہ ذلت آمیز[۲۴۳] عذاب ہوتا ہے۔

نجات کے لیے جاننے کے ساتھ ماننا بھی ضروری ہے حق کی معرفت ابلیس کو بھی حاصل تھی۔

۲۳۹ ۔ اللہ کی لعنت ان پر جو کفر کی راہ اختیار کرتے ہیں۔ یعنی چونکہ انہوں نے جانی بوجھی حقیقت کا انکار کیا ہے اس لیے اللہ نے اپنی رحمت سے دُور کر دیا ہے۔ گویا نبوت کا کفر و انکار ان کی طبیعت بن چکا ہے اس لیے وہ لعنت کے مستحق ہو گئے۔ اس موقعہ پر صرف یہ حقیقت بتلانے کے لیے لایا گیا ہے کہ رحمت سے دُوری کا باعث قوم، نسل، زبان، ملک اور پیشہ نہیں ہے بلکہ نبوت کے ساتھ ان کا کافرانہ طرزِ عمل ہے۔ یہ قرآن کا بلیغانہ انداز ہے کہ فقروں کی ساخت ہی میں وہ اجتماع کے بنیادی اور اہم مسائل کی طرف اشارات کر دیتا ہے۔ خوب یاد رکھیے یہاں کفر کا مجرم ان کو انکارِ توحید، انکارِ آخرت کی وجہ سے نہیں بلکہ انکارِ نبوت کی وجہ سے بتایا گیا ہے۔

نسلی اور جماعتی حسد اور کینہ

ان آیات میں نبوت سے کفر کی وجہ یہ بتائی ہے کہ ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حسد اور کینہ اور یہ کد تھی کہ آنے والا پیغمبر بنی اسمٰعیل میں سے کیوں آیا ہے وہ خیال یہ کر رہے تھے کہ آنے والا پیغمبر ان ہی میں سے ہو گا۔ لیکن اللہ نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو رسالت کے لیے منتخب فرما لیا۔

اس پر یہودیوں کے سینے نفرت و عداوت کے سنڈاس بن گئے۔ تعصب کی وجہ سے انہوں نے پوری انسانیت سے رشتہ توڑ لیا تھا اور وہ انسانیت کی بربادی اور تباہی کے لیے جال بچھاتے رہتے۔ وہ تفرقوں کے بیج بوتے رہتے تھے۔ کینے اور حسد کو پروان چڑھاتے رہتے۔ یہ ساری برائی اس ضد اور کینے کی بنا پر تھی جو ان کو نسلی غرور کی وجہ سے پوری انسانیت سے تھی۔

۲۴۰ - بدترین ہے وہ قیمت جس کے عوض انہوں نے اپنے آپ کا سودا کیا۔ یہ عوض اور قیمت قرآن کا کفر ہے اور کفر بھی محض ضد اور حسد کے سبب[1]

مطلب یہ ہے کہ جس قیمت کو لے کر وہ اپنی جگہ مگن ہیں اور اپنے اس کارنامہ پر نازاں ہیں وہ دنیا میں متاعِ دنیا کی حیثیت سے چاہے کتنی ان کی نظر میں عظیم ہو لیکن آخرت میں نتیجے اور عقوبت کے لحاظ سے بدترین ہے۔

۲۴۱ - صرف اس ضد سے۔ اصل میں لفظ بغی استعمال ہوا ہے۔ سرکشی، زیادتی، ضد مقصود ہے۔ جہاں میانہ روی چاہیے وہاں میانہ روی سے بڑھنے کی خواہش کو بغی کہتے ہیں۔ خواہ میانہ روی سے تجاوز عمل میں آیا ہو یا نہ آیا ہو۔ بغی کا استعمال کمیت اور کیفیت یعنی مقدار اور وصف دونوں کے متعلق ہوتا ہے۔ اصل لغت میں بغیر حق کے کسی چیز کی طلب کو کہتے ہیں اسی بنا پر زانیہ کو بغی کہتے ہیں۔ یا پھر کسی چیز کے بگاڑ اور حد سے تجاوز کو کہتے ہیں۔ اسی بنا پر زخم کے خراب ہونے پر بغی بولا جاتا ہے یہاں بغی کے معنے علماء نے حسد کے کیے ہیں اور مطلب یہ بتایا ہے کہ ان کے قرآن اور نبوت کے انکار کا باعث یہ حسد ہے کہ نبوت بنی اسرائیل سے ہٹ کر بنی اسمٰعیل میں کیوں آئی ہے۔ ہمارے خاندان میں سے نبی کیوں نہیں آیا یعنی اس حسد اور جلن کی وجہ سے وہ نہیں مانتے اور انکار کر رہے ہیں کہ اللہ اپنا فضل اور اپنی رحمت یعنی وحی اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے کیوں نازل کرتا ہے ہم پر ہی اس فضل و رحمت کا نزول کیوں نہیں ہوا۔ اس طرزِ فکر میں بھی نسلی اور خاندانی عصبیت کی روح کام کر رہی ہے۔ قرآن نے یہودیوں کے اس کردارِ حسد کو دوسرے مواقع پر حسد ہی کے نام سے پیش کیا ہے۔

اَمْ یَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰی مَآ اٰتٰھُمُ اللّٰہُ مِنْ فَضْلِہٖ

کیا یہ لوگ خدا کے دیے ہوئے فضل پر حسد کرتے ہیں۔

---

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۱۸۔

لیکن اس صورت میں حسد کو چھوڑ کر لفظ بغی کے استعمال میں کوئی بلیغ معنویت معلوم نہیں ہوتی۔ اگر پیرایہ بیان حسداً ان ینزل اللّٰہ من فضلہم ہوتا تو یہی معنے ہوتے — حسد کو مجازاً بغی اس لیے کہتے ہیں کہ وہ محسود پر زیادتی کرتا ہے۔ بغی اگر اپنے ہی معنے زیادتی، سرکشی اور عناد کے معنے میں ہو تو بات میں زیادہ حسن نمایاں ہوتا ہے مطلب یہ ہے کہ اللہ کی کتاب کا انکار اور نبوت کا کفر اس سرکشی کی وجہ سے کر رہے ہیں کہ اللہ کا یہ فضل محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کیوں ہوا ہے۔ اور اس سے بڑی سرکشی کیا ہو سکتی ہے کہ اللہ پر فضل و رحمت کی بخشش کے لیے پابندی لگا کر اور اس کی بے پایاں رحمت کی آزادی کو مقید کر کے یہ مطالبہ کیا جائے کہ اللہ کی وحی بنی اسمٰعیل میں نہیں بنی اسرائیل میں ہونی چاہیے۔ حسد اس کا باعث تو ہو سکتا ہے مگر یہ خود حسد نہیں بلکہ کھلم کھلا سرکشی اور بغاوت ہے۔

قرآن نے اس حقیقت کو بار بار صاف کیا ہے کہ یہود کا یہ کفر و انکار کسی اجتہادی غلطی کی بنا پر فکر و نظر کے کسی دھوکے یا مغالطہ کی بنا پر نہیں تھا بلکہ اس غصہ اور عناد کا نتیجہ تھا کہ نبوت خاندانِ اسرائیل سے نکل کر بنی اسمٰعیل کے ایک فرزند کو کیوں ملی؟ نسلیت اور قومیت کی ملعون عصبیت جو آج تک دنیا پر مسلط ہے اور یہودی دسیسہ کاری نے پوری دنیا کو اس کا بیمار بنا دیا ہے۔ امام رازیؒ فرماتے ہیں کہ یہود نبوت کو اپنا موروثی حق سمجھتے تھے۔ ایک عربی کو نبوت کا علمبردار دیکھ کر بغاوت و سرکشی پر اتر آئے۔ اللہ اکبر کیا حد ہے اس ضد اور سرکشی کی کہ قومیت کے چکر میں پڑ کر نبوت ہی کا انکار کر دیا ہے۔ یاد رہے قومیت چاہے نسل کے نام پر ہو یا وطن کے اور زبان کے نام پر ہو یا رنگ کے قرآن کی نظر میں سب کا حکم ایک ہے۔

ف۲۴۲۔ وہ اللہ کے غضب بالائے غضب کی آماجگاہ ہو گئے۔ ایک غضب یہ کہ قرآن بلکہ اس کے ساتھ اپنی کتاب کے بھی منکر ہو گئے۔ دوسرا غضب یہ کہ محض سرکشی اور ضد کی وجہ سے نبوت محمدیہ سے منحرف ہو گئے۔[1]

غَضَبٌ عَلٰی غَضَبٍ کی تفسیر میں کئی تشریحات آئی ہیں، ان میں سے ایک تشریح یہ ہے کہ یہود کی پہلی مغضوبیت کی بنیاد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کا انکار ہے اور دوسری مغضوبیت کی بنیاد نبوت محمدیہ کا انکار ہے اور یہ کہا گیا ہے کہ مقصدِ تکرار سے صرف غضب کی تاکید اور اس

---

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۱۸

وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا نُؤْمِنُ بِمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَيَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ ؕ قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ اَنْۢبِيَآءَ اللّٰهِ مِنْ قَبْلُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۹۱﴾

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کی نازل کردہ کتاب کو مانو[۲۴۴] اور قبول کرو تو کہتے ہیں ہم تو وہی کتاب مانیں گے جو ہم پر یعنی[۲۴۵] بنی اسرائیل پر اُتری ہے اور اس کے سوا[۲۴۶] جو کچھ ہے اس کا وہ انکار کرتے ہیں۔ حالانکہ وہ خدا کا سچا[۲۴۷] کلام ہے اور وہ اس تعلیم کی تصدیق و تائید[۲۴۸] کرتا ہے جو ان کے پاس موجود ہے۔ اگر واقعی تم اپنی کتاب[۲۴۹] پر ایمان رکھتے ہو تو پھر ماضی میں خدا کے نبیوں کو کیوں قتل کرتے رہے ہو؟

میں زور پیدا کرتا ہے۔ موقعہ محل کے لحاظ سے اگر یہ کہا جائے کہ چونکہ بنی اسرائیل حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے قبل تورات میں پیشین گوئیاں پڑھ کر اس نبوت کے توسل سے دُعائیں مانگتے تھے اور اب اس جانی پہچانی نبوت کا انکار کر بیٹھے اس لیے وہ اس کفر کی وجہ سے اللہ کے ایک غضب کے مستحق ہو گئے —— اور پھر اللہ سبحانہٗ پر یہ اعتراض کر کے بنی اسمٰعیل میں سے نبی کیوں بنایا سرکشی اور بغاوت کا مظاہرہ کیا۔ دوسرا غضب اس وجہ سے ہوا تو بیجا نہیں ہے بلکہ سیاقِ قرآنی اور حرف فاء کا استعمال یہی چاہتا ہے۔

۲۴۳ھ۔ کافروں کو ذلت آمیز عذاب ہو گا۔ کافروں کا لفظ لا کر بتا دیا کہ یہ عذاب قوم اور نسل کی وجہ سے نہیں بلکہ کفر کی وجہ سے ہے اور اللہ کا قانون یہی ہے کہ انکارِ حق کرنے والوں کو انکار کی پاداش سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔

لفظ مھین یعنی توہین آمیز کے اضافہ سے ایک طرف یہ اشارہ فرمادیا کہ ہر عذاب تذلیل کے لیے نہیں ہوتا کبھی گناہوں سے تطہیر کے لیے بھی ہوتا ہے عذاب گنہگار مسلمانوں کو معاصی پر گناہوں سے تطہیر کے لیے ہو گا نہ بغرضِ تذلیل[۱]

---

[۱] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۱۸

اور دوسری طرف بتادیا کہ یہ عذاب چونکہ یہود کی قومی منافرت و نسلی عصبیت کی وجہ سے ہوگا اس لیے کہ یہ عذاب اُن کے غرور کو توڑنے والا، اُن کی توہین کرنے والا اور اُن کو ذلیل کرنے والا ہوگا۔[1]

ایمان کی دعوت

یہود کو یہ کہہ کر یہ کتاب سب کے لیے آئی ہے اور ہمیشہ کے لیے آئی ہے۔ دعوتِ ایمان دی ہے اور یہودیوں کے اس اعتذار کا کہ ہمارے پاس ہماری کتاب موجود ہے ہمیں کسی نئی تعلیم کی ضرورت نہیں ہے۔ قرآن نے واضح الفاظ میں جواب دیا ہے کہ جس کتاب کو تم اپنی کتاب کہتے ہو اس پر تمہارا عمل کب ہے؟ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی کتاب سب کے لیے ہے اور اس کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ یہ ان تمام صداقتوں کی تصدیق و تائید کرتی ہے جو مختلف قوموں، مختلف زمانوں اور مختلف ملکوں میں اللہ کے پیغمبروں کے ذریعے آتی رہی ہیں۔ اس تصدیق کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم تک جتنے پیغمبر اللہ کی طرف سے آئے وہ سب ایک تھے۔ اسلام اسی دین کا نام ہے جو حضرت آدم علیہ السلام سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم تک باری باری انبیاء کے ذریعے آتا رہا اور انسانوں کو اس کی تعلیم ملتی رہی۔

نبوتِ محمدیہ کا یہ دعویٰ نہیں ہے کہ وہ ہی ہدایت ہے اور اس کے سوا نبیوں کی دعوت، ضلالت اور گمراہی ہے بلکہ دعویٰ یہ ہے کہ وہی کامل ہدایت ہے اور باقی مذاہب سابقہ موجودہ حالت میں ناقص ہیں۔ یعنی وہ ہدایت جو اپنے اپنے وقتوں میں سب نبی لے کر آتے رہے ہیں چونکہ ان کے پیرو اپنی تاویلات، تحریفات، تصرفات اور اختلافات سے اُسے برباد کر چکے تھے اس لیے جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کو کامل ترین صورت میں لے کر آخری نبی کی حیثیت سے تشریف لائے ہیں۔ اب یہ ہدایت ہمیشہ کامل رہے گی کیونکہ تحریف و اختلاف اور تصرف سے محفوظ رہے گی یہی وجہ ہے کہ قرآن نے اپنے بارے میں یہاں قصر کے ساتھ

---

[1] تفسیر ماجدی ص ۳۶

یہ اعلان کیا ہے کہ ھوالحق بس یہی حق ہے یا حق اسی میں منحصر ہے۔ اس کا مطلب اس کے سوا کیا ہے کہ اس سے باہر جو کچھ بھی ہے وہ سراپا حق نہیں بلکہ اس میں باطل کی ملاوٹ ہے۔ اسی بات کو وہ نبوت کی حد تک ھوالھدیٰ کہتا ہے یعنی نبوتِ محمدیہ کی رہنمائی ہی اللہ کی رہنمائی ہے۔ اس کے سوا جو کچھ ہے وہ ضلالت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہودیوں اور عیسائیوں کو جہاں نبوتِ محمدیہ کی دعوت دی گئی ہے ہدایت کی بشارت بھی سنائی گئی ہے۔ عیسائی ہوں یا یہودی۔ ان کو دعوت اسی ہدایت کے پانے کے لیے ہے جس کا نام اسلام ہے اور جس کو لے کر جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا میں تشریف لاتے ہیں اور اب انسانیت کی فلاح اسی کے ماننے پر منحصر ہے۔

۲۴۴ - اللہ کی نازل کردہ کتاب پر ایمان لاؤ۔ یہودیوں سے کہا جا رہا ہے کہ جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر ایمان لاؤ مگر اندازِ دعوت کس قدر بلیغ ہے۔ فرمایا جا رہا ہے کہ اللہ کی نازل کردہ کتاب پر ایمان لاؤ۔ یہ نہیں فرمایا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل شدہ کتاب پر ایمان لاؤ۔ پہلی تعبیر دعویٰ مع دلیل ہے کیونکہ اللہ کو وہ مانتے ہیں اور سلسلۂ وحی کے بھی قائل ہیں اس لیے فرمایا کہ اس کتاب پر ایمان لاؤ کیونکہ یہ اللہ کی نازل کردہ ہے۔ خواہ کسی پر نازل ہو۔ نازل کرنا بھی اللہ کا کام ہے اور جس پر نازل کیا جائے اس کا انتخاب بھی اللہ ہی کا کام ہے۔ بندہ ہونے کی حیثیت میں تمہارا کام تو بس ایمان لانا ہے۔ اگر یہ قرآن آپ پر نازل نہ ہوتا کسی اور پر نازل ہوتا پھر بھی تمہیں ایمان لانا ہی پڑتا کیونکہ مقصود بالذات تو اللہ کی وحی ہے اور انبیاء اسی وحی کے داعی اور مبلغ ہوتے ہیں۔ لہٰذا تمہاری جانب سے یہ قید کہ فلاں شخص پر فلاں خاندان کے فرد پر وحی آئے تو مانیں گے اللہ کے خلاف فیصلہ، اللہ پر اپنی مرضی چلانے اور اللہ کی رحمت کو اپنی ہوائے نفس اور میلانِ طبیعت کا محکوم بنانے کے مترادف ہے۔

۲۴۵ - ہم تو وہ کتاب مانیں گے جو ہم پر اتاری گئی۔ ایمان کی دعوت میں ما انزل اللہ مطلق پیش فرمایا اور ان کے جواب میں یہ اضافہ فرمایا کہ کتاب وہ مانیں گے جو ہم پر اتاری گئی۔ حجتِ دعوت کو طاقتور بنانے کے لیے کیا ہے اور یہ بتانے کے لیے کہ جواب کی پوری عمارت کمزور بنیاد پر کھڑی کی گئی ہے۔ ایمان کی دعوت دینے والا اللہ کی بات کہہ رہا ہے اور یہ اس کے جواب میں اپنی بات کہہ رہے ہیں اور اس سے اشارتاً یہ بھی معلوم ہو رہا ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت یہودیوں میں دلائل سے ثابت اور شواہد سے روشن ہو چکی تھی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ یہ نہ کہتے۔ ان کو آپ کی نبوت میں کوئی شبہ نہ تھا ان کو تو صرف اپنی قومی عصبیت کی بیماری تھی اور یہی بیماری روپ بدل بدل کر آ رہی تھی۔

کہنا یہ چاہتے ہیں کہ ہم کوئی سلسلۂ وحی اور مسئلہ نبوت کے منکر تھوڑے ہی ہیں ہم بھی مومن ہیں اور اپنی نسلِ اسرائیل کے انبیاء کو مانتے ہیں۔

۲۴۶ - اور اس کے سوا جو کچھ ہے اس کا انکار کرتے۔ اصل الفاظ عربی قرآن کے یہ ہیں۔ وَیَکْفُرُوْنَ بِمَاوَرَاءَہٗ - عربی میں لفظ وراء اضداد میں سے ہے۔ قاضی بیضاویؒ لکھتے ہیں کہ وراء اصل میں مصدر ہے جسے بطورِ ظرف استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کی اضافت فاعل کی طرف بھی ہوتی ہے اور مفعول کی طرف بھی۔ پہلی صورت میں مطلب ہوتا ہے چھپانے والی چیز یعنی ایسی چیز جس کی آڑ میں کوئی پوشیدہ ہوجائے۔ ظاہر ہے کہ اس وقت وہ چیز آگے اور چھپنے والا شخص پیچھے ہوگا۔ اس لیے وراء کے معنے پیچھے کے ہوں گے۔ دوسری صورت میں اس کے برعکس ہے۔ آدمی اس چیز کے آگے ہوگا اور وہ چیز پیچھے اس لیے وراء کے معنے اس وقت آگے کے ہیں۔ لیکن قاضی بیضاویؒ نے اس کی توجیہہ نہیں کی کہ وراء کے معنے علاوہ اور سوا کیوں آتے ہیں۔ اس فقرے کا ترجمہ اس طرح کیا جائے کہ وہ انکار کرتے ہیں اس چیز کا جو اس کے پہلے ہے یا اس چیز کا جو اس کے بعد ہے یا اس کا جو اس کے علاوہ ہے۔ پیچھے اور پہلے کے معنے تو یہاں یقیناً نہیں البتہ بعد اور سوا کے معنے بنتے ہیں۔ یعنی تورات کے سوا یا تورات کے بعد جو قرآن اور انجیل میں ہے اس کا انکار کرتے ہیں۔ یہودی تورات کے ساتھ جن صحیفوں کو مانتے ہیں ان کی تعداد ۲۳ ہے۔

تورات دراصل پانچ کتابوں کے مجموعہ کا نام ہے۔ ۱۔ سفرِ تکوین، ۲۔ سفرِ خروج، ۳۔ سفرِ احبار، ۴۔ سفرِ عدد، ۵۔ سفرِ استثناء۔ یاد رہے کہ لفظ سفر بکسرِ سین ہے اور فا ساکن ہے۔ عربی میں صحیفہ اور کتاب کو کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ دوسرے انبیاء کے صحیفے یہ ہیں۔ کتاب یوشع بن نون۔ کتاب القضاۃ۔ کتاب راعوت۔ سفرِ سموئیل اوّل۔ سفرِ سموئیل ثانی۔ سفرِ ملوک الاوّل۔ سفرِ ملوک الثانی۔ السفر الاوّل من اخبار الایام۔ السفر الثانی من اخبار الایام۔ السفر الاوّل لعزراء۔ السفر الثانی لعزراء۔ کتاب ایوب۔ زبور۔ اَمثالِ سلیمان۔ کتاب الجامعہ۔ کتاب نشید الانشاد۔ کتاب اشعیا۔ کتاب ارمیاء۔ مراثی ارمیاء۔ کتابِ حزقیل۔ کتابِ دانیال۔ کتابِ ہوشع۔ کتابِ یوایل۔ کتابِ عاموس۔ کتابِ عبدیاہ۔ کتابِ یونان۔ کتاب میخا۔ کتابِ ناحوم۔ کتابِ حبقوق۔ حلفونیا۔ کتاب حجی۔ کتابِ زکریا۔ کتاب ملاخیا۔ ان صحیفوں کی تعداد ۲۳ ہے۔ تورات کی پانچ کتابوں کو کتیم اور انبیاء کے ان صحیفوں کو نبیم کہتے ہیں۔

ان دونوں کی جو تفسیر و توضیح ائمہ یہود نے انبیاء کی زبانی یادداشت کی بنا پر کی ہے اس کا نام ترگوم یا ترجوم ہے۔

یہاں یہ بحث نہیں ہے کہ ان کتابوں کی تاریخی حیثیت کیا ہے اس کامحل سورۂ مائدہ ہے۔ یہاں صرف یہ بتانا ہے کہ ما انزل علینا میں یہودیوں کا یہ سارا ذخیرہ داخل ہے۔

یہ فقرہ ویکفرون بما وراءہ اور انکار کرتے ہیں اپنے اوپر نازل شدہ چیز کے علاوہ کا۔ نہ یہودیوں کا مقولہ ہے اور نہ یہود کے قول کا تتمہ جیسا کہ بعض معاصر مفسّرین کی رائے ہے بلکہ درحقیقت یہاں سے حق سبحانہ، تعالیٰ شانہ، یہودیوں کو جواب دے رہے ہیں ــــ دراصل ان کو دو جواب دیے ہیں ایک تحقیقی اور دوسرا الزامی۔ اور دونوں جوابوں کے درمیان قرآن کی حقانیت اور ہدایت کا اعلان کیا ہے۔

اس فقرے میں تحقیقی جواب یہ دیا گیا ہے کہ نؤمن بما انزل علینا میں جو انہوں نے ایمان کا دعویٰ کیا ہے یہ صرف زبانی جمع خرچ ہے ورنہ امرِ واقعہ یہ ہے کہ تورات پر ایمان رکھتے ہوئے بھی وہ تورات کے منکر ہیں۔ کیونکہ تورات میں صراحتہً نبوّتِ محمدیہ کی بشارات موجود ہیں۔ ان بشارات کے ہوتے ہوئے اور آپ کی نبوّت کو پہچانتے ہوئے تورات کے علاوہ کا انکار کرنا اور تورات پر ایمان کا دعویٰ کرنا ایمان کا کھوکھلا نعرہ ہے۔ جن دلائل سے تورات کا حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اللہ کی جانب سے نازل ہونا ثابت ہے اس سے کہیں زیادہ طاقتور دلائل سے جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کا نازل ہونا ثابت ہے تو تورات کے علاوہ کے لیے کا فرانہ طرزِ عمل اختیار کرکے تورات پر ایمان کا دعویٰ مضحکہ خیز ہے۔

۲۴۷ ـ وہ خدا کا سچا کلام ہے۔ وھوالحق۔ اس میں قرآن کی حقانیت کا اعلان ہے اور جملہ کی اس ساخت کے ذریعے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ تمہاری جانب سے کفر کا ظہور اب ہوا ہے، لیکن قرآن کی حقانیت تو تمہارے کافرانہ طرزِ عمل کے وجود میں آنے سے پہلے ہی ثابت ہے۔ معنے میں یہ لطافت جملہ حالیہ آنے کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔ دلائل الاعجاز میں عبدالقاہر نے اس کی تصریح کی ہے اور اس کے ساتھ دوسری معنوی لطافت یہ رکھی گئی ہے کہ جملہ ایسا لاتے ہیں کہ جس کے دونوں حصّے معرفہ ہیں۔ عربی میں اس قسم کی ترکیب قصر کا فائدہ دیتی ہے۔ قصر کا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ کہا جا رہا ہے بس یہی ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ قرآن میں حق ہی حق ہے حق کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اور عربی میں لفظ حق کا خاصہ ثبوت اور قیام ہے یعنی جو بات ثابت ہوا ٹل ہو، اٹل ہوا سے حق کہیں گے۔ اور یہ لفظ دو طرح استعمال ہوتا ہے۔ مصدر اور صفت مشبہ۔ اگر یہاں مصدر رہے تو مطلب یہ ہے کہ قرآن سراپا حق ہے اور اس کی حقیقت میں زمانہ کی کوئی قید نہیں ہے اور اگر صفت مشبہ ہے تو مطلب یہ ہے کہ اس کی حقیقت میں دوام اور ثبوت ہے۔ دنیا میں ایسی

کوئی کتاب نہیں جو اس کی ہمسر و ہم پلہ ہو۔

ف ۲۴۸ ۔ اور وہ اس تعلیم کی تصدیق وتائید کرتا ہے جو ان کے پاس موجود ہے۔ اس کے ذریعے یہ بتایا گیا ہے کہ قرآن کا تعلق اس علمی سرمایہ کے ساتھ جسے تم ما انزل علینا۔ کہہ رہے ہو منافات کا نہیں بلکہ اس کا رشتہ ان سے اتحاد و تصدیق کا ہے۔ یہ کہہ کر قرآن نے جتایا ہے کہ تمہارا قرآن سے کفر کرنا اس بنا پر تورات سے کفر کے مترادف ہے۔

یہاں بھی زمخشری نے بتایا ہے کہ جملہ اسمیہ کے بعد جو حال لایا جاتا ہے وہ سابقہ جملہ کے مضمون میں زور اور تاکید کے لیے لایا جاتا ہے۔ پہلا جملہ ھو الحق کا مضمون قرآن کی حقانیت ہے۔ اس جملہ میں یہ کہہ کر کہ قرآن تمہارے علمی سرمایہ کی تصدیق کرتا ہے قرآن کی حقانیت میں اور زیادہ قوت پیدا کر دی ہے اور قرآن کے یہ دو وصف کہ وہ حق ہے اور مصدق ہے ان دونوں نے الگ الگ بھی اور مل کر اپنے سے پہلے جملہ کے مضمون یعنی یہودیوں کے کفر کو سنگین بنا دیا ہے۔

ف ۲۴۹ ۔ یہ قرآن نے یہودیوں کو اس بات کا کہ ہم تو وہ کتاب مانتے ہیں جو ہم پر اتاری گئی ہے دوسرا جواب دیا ہے۔ پہلا جواب تحقیقی تھا یہ جواب الزامی ہے۔ فرمایا کہ اچھا اگر واقعی تم اپنی کتاب پر ایمان رکھتے ہو تو بتاؤ کہ تم پر نازل شدہ کتاب میں کہاں یہ تم کو کہا گیا ہے کہ انبیاء کو قتل کیا کرو۔ تمہارا نبیوں کو قتل کرنا ہی اس بات کی کھلی شہادت ہے کہ تم کتاب پر ایمان کے دعوے میں جھوٹے ہو۔

اس جواب کو الزامی ہونے کی وجہ سے پہلے جواب سے الگ کر دیا اور فرمایا کہ قُل اے پیغمبر ان سے کہو کہ اگر تم تورات پر ایمان رکھتے ہو تو پھر تم نے انبیاء کو کیوں قتل کیا کیونکہ تورات میں یہ حکم ہے کہ جو نبی تورات کو سچا کہنے والا ہو اس کی نصرت کرنا اور اس پر ضرور ایمان لانا۔ اور قتل بھی ان انبیاء کو کیا جو پہلے گزر چکے ہیں جو تورات پر عمل کرتے تھے اور اس کی ترویج کے لیے مبعوث ہوئے تھے ان کے مصدق ہونے میں تو بیوقوف بھی تامل نہیں کر سکتا۔ یہ بات لفظ قبل سے ٹپک رہی ہے[1]

گویا قرآن نے یہود کو یہ جواب دیا ہے کہ خود یہی دعویٰ تمہارا کب صحیح ہے کہ تم اپنی قوم کے انبیاء پر ایمان رکھتے ہو جیسا کہ ما انزل علینا کے مدلول سے معلوم ہو رہا ہے۔ ایمان تو الگ رہا تم نے

[1] حاشیہ شیخ الہند ص ۱۸

وَلَقَدْ جَآءَكُمْ مُّوسٰى بِالْبَيِّنٰتِ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْ بَعْدِهٖ وَ
اَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۹۲﴾

اور پھر دیکھو یہ واقعہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام سچائی کی روشن دلیلوں[250] کے ساتھ تمہارے پاس آئے پھر بھی تم نے موسیٰ[251] علیہ السلام کے آنے کے بعد بچھڑے کو اختیار کر لیا اور تم تو ہو[252] ہی ظلم پیشہ لوگ۔

خود اس زور شور سے ان کی تکذیب کی اور ان کی مخالفت و عداوت پر اس حد تک اُتر آئے کہ ان کو قتل کر ڈالا اور تمہاری قومی تاریخ کے صفحات تو اس سے رنگین ہیں [1]

حق گریز ایمان

اس آیت میں یہودیوں کے اس موقف کا کہ ہم تو اس پر ایمان رکھتے ہیں جو ہم پر اترا گیا ہے یہ تیسرا جواب ہے۔ پہلے بھی یہ واقعہ آچکا ہے وہاں انعامات پر ناشکری جتانے کے لیے یہ واقعہ آیا تھا اور یہاں اس شبہ کا جواب دینے کے لیے یہ واقعہ ذکر کیا گیا ہے کہ ہم تو بس اسی قومی اور علمی سرمایہ کو مانتے ہیں جو ہم پر نازل کیا گیا ہے۔ پہلی آیت میں الٹا تا کہا گیا ہے کہ تمہارے ایمان کے کھوکھلے پن کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ تم اپنے علمی سرمایہ کے لانے والوں کو قتل کرتے رہو۔ یہ تو اس علمی سرمایہ لانے والوں کے ساتھ معاملہ تھا خود تمہارا اپنے پیغمبر کی تعلیمات کے ساتھ کیا برتاؤ تھا اس کا اندازہ اس کردار سے ہوتا ہے جو یہاں پیش کیا جا رہا ہے۔

۲۵۰۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام روشن دلیلوں کے ساتھ تمہارے پاس آئے۔ یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام جن کی شریعت پر تم قائم ہو اور جن کی شریعت کی وجہ سے دوسری سچی شریعتوں کا انکار کر رہے ہو خود انہوں نے تمہیں کھلے کھلے معجزے دکھائے مگر جب چند دن کے لیے کوہ طور پر گئے

[1] تفسیر ماجدی ص ۳۶

تو اتنے ہی میں تم نے بچھڑے کو معبود بنا لیا تھا حالانکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے درجہ نبوت پر فائز زندہ موجود تھے تو اس وقت تمہارا حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت پر ایمان کہاں جا تا رہا تھا یعنی اب تو ما انزل علینا کا بے جان نعرہ لگا رہے ہو اور دعویٰ کر رہے ہو اُس وقت تمہارے اس دعوے کو کیوں گھن لگ گیا تھا، اور اب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے بغض وعناد، شریعت موسوی کی پیروی اور ما انزل علینا پر ایمان کا کس مُنہ سے دعویٰ کرتے ہو؟ [1]

حضرت موسیٰ علیہ السلام کھلی نشانیاں کیا لے کر آئے تھے؟ عام مفسرین کی رائے یہی ہے کہ ان نشانیوں سے مراد عصا، ید بیضا اور دریا کا پھاڑنا وغیرہ ہے۔ آلوسیؒ، قرطبیؒ، ابن جریرؒ اور ابن کثیرؒ کی بھی رائے ہے۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ ان واضح نشانیوں سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا رسُول ہونا تمہیں معلوم ہو چکا تھا اس کے باوجود تم نے جادۂ توحید چھوڑ کر گوسالہ پرستی شروع کر دی تھی۔ کیا یہ کام تم نے اس لیے کیا تھا کہ یہ ما انزل علینا پر ایمان کا مطالبہ تھا ظاہر ہے کہ یہ معجزات حضرت موسیٰ علیہ السلام کے فرعون کے مقابلے میں تھے اور یہاں جآءکم بالبینٰت سے یہ اشارہ نکلتا ہے کہ یہ معجزات موسوی خود بنی اسرائیل کے لیے ہی تھے اس لیے اگر معجزات سے وہ آیات مراد ہوں جو وادی تیہ میں خالص بنی اسرائیل کے لیے ظاہر ہوئے مثلاً بادلوں کا سایہ کرنا، من وسلویٰ کا اترنا اور پانی کی فراہمی جن کا ذکر پہلے آ چکا ہے تو بات میں زیادہ وزن پیدا ہو جاتا ہے۔

نیز لفظ بینٰت صفت ہے اس کا موصوف آیات ہے دونوں کو ملا کر روشن دلائل معنے ہیں لیکن آیات کے معنے صرف ان دلائل کے ہی نہیں جو دعویٰ نبوت کے مؤید ہوں آیات بمعنی احکام بھی آتا ہے اور یہ قرآن کا عام استعمال ہے۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ اللہ نے تم سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وساطت سے دیے گئے احکام عشرہ میں اللہ کی عبادت کرنے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بنانے کا عہد لیا تھا لیکن تم نے اس کے باوجود پھر بھی یہ مشرکانہ طرز عمل اختیار کیا تھا۔ اب تم خود بتاؤ کہ تمہارے ایمان کی قیمت کیا ہے؟ اور یہ کہنا تمہارا کہاں تک درست ہے کہ ہم تو صرف اسی بات پر ایمان لائیں گے جو ہم پر اُتری ہے۔ کیا البینٰت کی صورت میں جو احکام لاتے تھے وہ تم پر نہیں اترے تھے؟

---

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۱۸

ف ۲۵۱ - موسیٰ علیہ السلام کے آنے کے بعد - یہ مِنْ بَعْدِہٖ کا ترجمہ ہے - عام مفسرین نے اس کے
معنے یہی بتائے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کوہِ طور پر جانے کے بعد یعنی ان کی غیر حاضری کے
زمانہ میں - لیکن آلوسیؒ نے روح المعانی میں بتایا ہے کہ اس آیت سے مراد یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ
السلام کے آنے کے بعد یہ کام تم نے کیا ہے - یعنی باوجودیکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام تمہارے پاس
اللہ کا یہ حکم لے کر آچکے تھے کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا - پھر تمہارا کردار یہ تھا - اس صورت
میں ثُمَّ (پھر) صرف وقت کے تاخر کو بتانے کے لیے نہیں بلکہ یہ ظاہر کرنے کے لیے ہے کہ تم
کیسی پستی میں اتر گئے اور یہ جتانے کے لیے کہ یہ کام تم نے اس وقت کیا جب تمہارے پاس اس
کرتوت کے نہ کرنے کے پورے دلائل اور شواہد موجود تھے - آلوسی بغدادیؒ نے اسی معنویت کو
ظاہر کرنے کی خاطر لکھا ہے کہ یہاں ثُمَّ استبعاد کے لیے ہے -

ف ۲۵۲ - اور تم تو ہو ہی ظلم پیشہ لوگ - شرک سے بڑا ظلم اور کون سا ہوگا؟ جملہ کی موجودہ ساخت
یہ بتانے کے لیے ہے کہ جو کچھ اس وقت کیا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبوت کو مان کر گوسالہ پرستی
کی، یہ بھی ظلم تھا اور جو کچھ اب کر رہے ہو کہ تورات میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری
کی بشارتیں پڑھنے اور پڑھنے کے بعد آپ کو پہچان لینے کے باوجود آپ کی نبوت کا اور قرآن کے
کتابِ الٰہی ہونے کا انکار کر رہے ہو یہ بھی ظلم ہے - گویا اس قسم کا طرزِ عمل تمہاری تاریخِ ملّی میں تمہارا آخری
نشان ہے -

اس تیسرے جواب کا حاصل یہ ہے کہ نبوت کو نہ ماننے کے لیے تمہارا یہ عذر کہ ہم تو صرف وہی بات مانیں
گے جو ہم پر اتری ہے عذر لنگ ہے - کیونکہ تم اپنے قومی اور نسلی پیغمبر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ
یہی سلوک کر چکے ہو - ان کو نبی مان کر ان کے احکام کو پائے استحقار سے ٹھکرا چکے ہو - اس لیے تمہارے
اس کہنے کی اس کردار کی موجودگی میں اس کے سوا کوئی عقلی توجیہہ نہیں ہے کہ وہ بھی ظلم تھا اور
یہ بھی ظلم ہے - اُس ظلم کی پاداش میں تمہارے اسلاف سزا بھگت چکے ہیں اور اس ظلم کی پاداش
میں تمہیں بھی سزا بھگتنے کے لیے تیار ہو جانا چاہیے کیونکہ اللہ کا قانون یہ ہے کہ ظلم کے حصہ میں
فلاح و کامیابی نہیں ہے یعنی ظلم کرنے والوں پر کامیابی و سعادت کی راہ نہیں کھلتی ہے پہلے
بھی تم سے کہا گیا تھا کہ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ فَتُوْبُوْٓا اِلٰى بَارِئِكُمْ اور آج بھی تم اَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ کا
مصداق ہو اور تم سے کہا جا رہا ہے اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ اللہ کی نازل کردہ کتاب پر ایمان لاؤ - توبہ
اور انابت کا دروازہ کھلا ہوا ہے - توبہ و انابت کا احساس اپنے اندر اجاگر کرو اور اللہ کی نازل کردہ

وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّورَ خُذُوا مَا آتَيْنَاكُم بِقُوَّةٍ وَاسْمَعُوا ۖ قَالُوا سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا وَأُشْرِبُوا فِي قُلُوبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ ۚ قُلْ بِئْسَمَا يَأْمُرُكُم بِهِ إِيمَانُكُمْ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ﴿۹۳﴾

اور دیکھو جب ہم نے تم پر کوہِ طور کو بلند کر کے عہد لیا تھا کہ جو کتاب ہم نے تم کو دی ہے اس پر مضبوطی سے جم جاؤ اور اس کے حکموں پر دھیان دو[۲۵۳]۔ تمہارے اسلاف نے اس کے بعد کیا کیا یہی نا کہ زبانِ قال سے کہا کہ ہم نے مان لیا[۲۵۴]۔ اور زبانِ حال سے کہا کہ ہم نے نہیں مانا۔ اور ان کے کفر کی وجہ سے ان کے دلوں میں بس بچھڑا ہی بچھڑا رچ بس گیا تھا[۲۵۵]۔ اے پیغمبر ان سے کہہ دو کہ تم جس ایمان[۲۵۶] کا دعویٰ کرتے ہو اگر یہی وہ ایمان ہے تو تف ہے اس ایمان پر کیسی بدترین راہ پر تمہیں لے جا رہا ہے۔

کتاب پر ایمان لے آؤ۔ رحمتِ الٰہی قبولیت کا دروازہ کھول دے گی اور تمہارے اشکِ ندامت کا ایک قطرہ بدعملیوں، گناہوں کے بے شمار داغ اور دھبے اس طرح دھو دے گا گویا تمہارے دامنِ عمل پر کوئی دھبہ لگا ہی نہ تھا۔

مسندِ احمد میں حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ حضرت عمرو بن العاصؓ کہتے ہیں کہ جب اللہ نے میرے دل میں اسلام کی حقانیت ڈال دی تو میں آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا کہ آپؐ مجھے حلقہ بگوشِ اسلام کر لیں۔ آپؐ نے اپنا ہاتھ بیعت کے لیے میری طرف کیا۔ میں نے عرض کیا میں اس وقت تک آپ سے بیعت نہ کروں گا جب تک میرے پچھلے گناہ معاف نہ ہو جائیں۔ آپؐ نے فرمایا اے عمرو کیا تمہیں پتہ نہیں ہے کہ اسلام پچھلے تمام گناہوں کا قصہ پاک کر دیتا ہے۔ قرآن نے بھی عفو و کرم کے اس قانون کو ان الفاظ میں پیش کیا ہے إِن يَنتَهُوا يُغْفَرْ لَهُم مَّا قَدْ سَلَفَ۔ اگر وہ باز آ جائیں تو پچھلے گناہ سارے معاف ہو جائیں گے۔

جو نبوت سب کے لیے آئی تھی اور ہمیشہ کے لیے تھی یعنی رسالتِ محمدیہ اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ تمام مذاہب کی سب سے زیادہ مشترک خواہش کو پورا کرنے کی ضمانت دے۔ اس لیے

نبوتِ محمدیہ کا اعلان ہے کہ ہر ملک و ملت، ہر نسل و رنگ کا جو گنہگار بھی اس کی آغوش میں آجاتے گا وہ اس کے گناہوں کی مغفرت اور نجاتِ ابدی کے لیے ضامن ہو گی۔

بدترین ایمان

یہ یہودیوں کے اس موقف کا کہ ہم تو صرف وہ کتاب مانیں گے جو ہم پر اُتری ہے چوتھا جواب ہے اور اس جواب میں ان کے اس دعوے کا پورا پوسٹ مارٹم کر کے بتایا ہے کہ اس ایمان پر نازاں ہو جس کے ساتھ تاریخ کی ساری بُرائیاں چپکی ہوئی ہیں۔ قرآن نے اس آیت میں بتایا ہے کہ تمہارا تو خود اپنی کتاب کے بارے میں یہ رویہ رہا ہے کہ تم اسے صرف زبان کی حد تک مانتے تھے اور زندگی کے احوال و ظروف میں اس کی کھلم کھلا نافرمانی اور بغاوت کرتے تھے۔ اس طرح ایمان و کفر کی دو متضاد حقیقتیں تم اپنے دامن میں جمع کر کے زبانِ قال سے ایمان کا دعویٰ کرتے اور زبانِ حال سے اس کا انکار کرتے تھے۔ اسی کافرانہ طرزِ عمل کے نتیجہ میں تمہارے دلوں میں گوسالہ پرستی نے گھر کر لیا تھا اور بچھڑے کی محبت تمہاری پوری زندگی کے ریشہ ریشہ میں سرایت کر چکی تھی جن کا رویہ ما انزل علینا کے بارے میں یہ ہو ان کو نبوتِ محمدیہ کے مقابلے میں یہ کہنا کب سجتا ہے کہ ہم صرف وہ کتاب مانیں گے جو ہم پر اتاری گئی ہے۔

۹۳۔ تورات کی حد تک ان کے ایمان کا حال یہ ہے کہ احکامِ تورات دیتے وقت ان سے کہا گیا تھا کہ اس کو پوری قوت اور ہمت سے مضبوط پکڑو۔ چونکہ پہاڑ سر پر معلق تھا، جان کے اندیشہ سے تو زبان سے کہہ لیا سَمِعْنَا یعنی تورات کے احکام ہم نے سُن لیے اور دل سے مابعد میں کہا عَصَیْنَا یعنی ہم نے قبول نہیں کیا۔ اور وجہ اس کی یہ تھی کہ صورت پرستی ان کے دل میں راسخ ہو چکی تھی ان کے کفر کے باعث۔ وہ زنگ ان کے دل سے زائل نہیں ہوا بلکہ رفتہ رفتہ بڑھتا گیا [1]

آیت میں اسمعوا آیا ہے۔ یہ سمع سے بنا ہے اس کے معنے صرف سننے کے نہیں بلکہ ماننے، قبول کرنے اور عمل کرنے کے بھی ہیں۔ اسی لیے نماز میں سمع اللہ لمن حمدہ ہے اس

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۱۸

کے معنے ہیں جس شخص نے اللہ کی حمد نماز میں بحالتِ قیام کی ہے امام سر اٹھا کر مقتدیوں کو یہ خوش خبری سناتا ہے کہ اللہ نے اس کی حمد قبول فرمالی ہے۔ حافظ ابن القیمؒ نے بدائع الفوائد میں یہی معنے بتلاتے ہیں۔ شاید یہ علمی لطیفہ آپ یہاں سن کر خوش ہوں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز باجماعت میں امام اور مقتدی دونوں کے لیے ذکر کا پیمانہ الگ الگ مقرر فرمایا ہے۔ صحیح مسلم میں حدیث ہے۔

اذا قال الامام سمع اللہ لمن حمدہ فقولوا ربنا لک الحمد

جب امام سمع اللہ لمن حمدہ کہے تو تم ربنا لک الحمد کہو۔

یعنی امام کو سمع اللہ لمن حمدہ کہنا چاہیے اور مقتدی کو ربنا لک الحمد۔ امام جس حمد کے اللہ کے یہاں مقبول ہونے کی بشارت دیتا ہے وہ وہی ہے جو امام نماز میں بحالتِ قیام سورۂ فاتحہ کی شکل میں اللہ کی جناب میں پیش کرتا ہے۔ لطیفہ کی بات یہ ہے کہ اگر نماز میں سورۂ فاتحہ پڑھنے کا مطالبہ مقتدیوں سے بھی ہوتا تو پھر سمع اللہ لمن حمدہ کہنے کا صرف امام کو حکم نہ ہوتا بلکہ مقتدیوں سے کہا جاتا کہ جب تم رکوع سے سر اٹھاؤ تو سمع اللہ لمن حمدہ کہو لیکن ایسا کیونکر ہوتا۔ مقتدی یہ کہہ کر مژدہ کسے سناتا؟ مقتدی امام سے یہ جانفزا مژدہ سنتے ہیں تو ربنا لک الحمد کہتے ہیں۔ بہر حال یہاں اسمعوا کے معنے قرطبی نے ماننے اور قبول کرنے کے بتائے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اس کتابِ الٰہی پر عمل کرنا، اطاعت کرنا اور زندگی میں عمل کی پذیرائی دینا۔

۲۵۴۔ زبانِ قال سے کہا کہ ہم نے مان لیا اور زبانِ حال سے کہا کہ ہم نے نہیں مانا۔ ایمان و کفر کا یہ اجتماع یہودیوں کی پوری تاریخ میں موجود ہے لیکن قرآن ان کی قومی تاریخ کے منبع کی نشاندہی کر رہا ہے۔ آیت سے یہ لازم نہیں آتا کہ عصینا (ہم نے نہیں مانا) ان لوگوں نے زبان سے کہا ہو بلکہ بتانے والوں نے بتایا ہے کہ آیت میں قالوا (انہوں نے کہا) بھی مجازی معنے میں زبانِ حال سے کہنے کے معنے میں ہے۔ قول کا لفظ عربی زبان میں وسیع معنے رکھتا ہے۔ زبان سے بولنا اس کے لیے ضروری نہیں ہے۔ امام راغبؒ نے مفردات میں خود قرآن سے اس کے ایک سے زیادہ معانی کی نشاندہی کی ہے لیکن ان سرکشوں اور گستاخوں نے یہ لفظ زبان سے ہی بول دیا ہو تو حیرت کی کوئی بات نہیں ہے[1]

قرطبیؒ نے لکھا ہے کہ اس کے ذریعے قرآن یہودیوں کے اس دعوٰی کو کہ ہم صرف وہ مانیں گے جو ہم پر اتاری گئی ہو۔ تار تار کر رہا ہے اور بتا رہا ہے کہ ان کی تاریخ گواہ ہے کہ انہوں نے کبھی بھی ما انزل علینا

[1] تفسیر ماجدی ص ۲۰۴

کو قبول نہیں کیا۔

ف ۲۵۵ - ان کے دلوں میں بس بچھڑا رچ گیا ہے۔ اصل عربی اُشْرِبُوا فِی قُلُوبِہِمُ الْعِجْلَ ہے مطلب یہ ہے کہ بچھڑے کی محبت ان کی رگ رگ میں رچی گھلی ہوئی اور دل کی گہرائیوں میں بسی ہوئی ہے جیسے پانی رگ رگ میں پہنچ کر جزوِ بدن بن جاتا ہے ایسے ہی بچھڑے کی محبت ان کے دلوں میں رچ کر ان کے جسمِ قومیت کے لیے جزوِ بدن بن گئی ہے اور اس کے بعد بکفرھم کا اضافہ یہ بتانے کے لیے کہ گوسالہ پرستی سے یہ شدید تعلق نتیجہ ہے۔ مصر میں فراعنہ کے تحت کا فرانہ زندگی بسر کرنے کا۔ یہ قرآن کی ایک انوکھی اور بڑی ہی دلکش تعبیر ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ ان کے دلوں کو بچھڑے کی محبت پلادی گئی۔ اس تعبیر کے ذریعے ان پر ایک شدید طنز کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ ان کو بچھڑے سے ایسا شدید لگاؤ ہے کہ گویا اُن کے دلوں کو اس کی محبت پلا کر سیراب کر دیا گیا ہو۔ یہ تعبیر ایک بلیغ اعجاز اور اندازِ بیان کی ایک دلکش مثال ہے[1]

ف ۲۵۶ - کہدو کہ جس ایمان کا تم دعویٰ کرتے ہو اگر وہ ہی ایمان ہے تو تف ہے اس ایمان پر کیسی بدترین راہ پر تم کو چلا رہا ہے۔ آیت کا یہی حصہ سارے جواب کی جان ہے۔ یعنی اگر تمہارے اس دعویٰ میں کہ نؤمن بما انزل علینا ہم تو اس کتاب پر ایمان لائیں گے جو ہم پر اتری ہے۔ یہی ایمان مراد ہے تو ایسے ایمان کی قیمت کیا ہے جو تم کو قتلِ انبیاء۔ اور گوسالہ پرستی جیسے سنگین جرائم کا ارتکاب کرنے کی ہدایت کرتا ہے۔ ایمان وعمل میں تو ہم آہنگی اور ربط ضروری ہے۔ باطن وظاہر بالکل جداگانہ عالم نہیں کہ ایک دوسرے سے متاثر نہ ہوں۔ اگر اعتقاد باطن اعمال ظاہر چاہتا ہے تو اعمالِ ظاہر اعتقادِ باطن کے ممد ومعاون ہوتے ہیں۔ دیکھو اگر ایک شخص یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ یتیم پر رحم انسانی فرض ہے تو اس کے اس عقیدہ کا یہ ناگزیر تقاضا ہے کہ وہ یتیم کے لیے مجسم ہمدردی و دلسوزی بن جائے۔ پھر اس کے اعضاء جوارح اس دلسوزی کے لیے حرکت کرنے لگتے ہیں تو وہ محسوس کرتا ہے کہ اس کے دل میں ایک روحانیت داخل ہو رہی ہے اور جتنا جتنا اس کا یہ مہربانی وکرم گستری کا عمل ترقی کرتا جاتا ہے اسی قدر اس کے دل میں شفقت و رحمت کی نورانیت رونما ہوتی جاتی ہے۔ الغرض تمام صفاتِ قلبیہ کا یہی حال ہے کہ وہ انسان کو جنبشِ عمل کے لیے بے چین کر دیتی ہیں۔ اور جب انسان مصروفِ عمل ہو جاتا ہے تو اس کے آثار لوٹ کر پھر ان صفات کو اور روشن کرتے ہیں۔ ایمان

---

[1] فی ظلال القرآن ص ۹۶؍۱

بھی دل کا ایک عمل ہے۔ اس کا تقاضہ یہ ہے کہ انسانی زندگی توحید خالص اور تصدیقِ رسالت کی اپنے عمل سے گواہی دے۔ صرف زبانی دعویٰ اور بلند بانگ نعرہ اس گواہی کے لیے کافی نہیں ہے۔ امام حسن بصریؒ نے کیا اچھی بات فرمائی ہے۔

ایمان صرف ارادوں، ولولوں اور ظاہری ٹیپ ٹاپ کا نام نہیں ہے بلکہ ایمان یہ ہے کہ بات دل میں سرایت کر جائے اور اعمال اس کی گواہی دیں۔

اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ عمل انسان کی قلبی کیفیت کا آئینہ ہوتا ہے۔ اگر وہ نیک عمل کرتا ہے تو یہ اس کے ایمان کی دلیل ہوگی ورنہ بدعملی خود اس کی بے ایمانی کی شاہد بن جائے گی۔

عبدالملک بن مروان نے سعید بن جبیرؓ سے دریافت کیا کہ ایمان باللہ کیا ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ ایمان تصدیق کو کہتے ہیں مگر تصدیق کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کے حرف حرف پر عمل ہو اور جتنی کوتاہی رہ جائے وہ گناہ نظر آئے اس پر استغفار کرے اور آئندہ اصرار نہ ہو۔ ایسا نہ ہو۔ ایمان کا امتحان عمل میں ہوتا ہے اور یہی وہ کسوٹی ہے جس پر کھرے اور کھوٹے کی تمیز ہو جاتی ہے۔ امام زہریؒ فرماتے ہیں کہ اسلام اقرار کا نام ہے اور ایمان عمل کا۔ یہ دونوں آپس میں رفیق ہیں۔ ہر شخص کا قول و عمل تولا جائے گا۔ اگر اس کا عمل وزنی ہو تو ہر قول مقبول ہوگا اور اگر بات وزنی ہو تو عمل کو شرفِ قبول نہ ملے گا۔ ایسا ایمان جو انسان کو برائیوں پر ابھارتا ہو، ناخدا شناسی اور خدا کی کھلم کھلا بغاوت کو تعلیم دیتا ہو، انبیاء کا گستاخ اور بے ادب ہو، ان کی تکذیب کرتا ہو حتیٰ کہ اپنے مفادات سے تصادم کے وقت انبیاء کے قتل پر بھی ابھارتا ہو، ہرگز ایمان نہیں ہے۔ اگر یہ ایمان ہے تو پھر کائنات میں بے ایمانی کا کوئی وجود نہیں ہے۔ قرآن نے اسی صورتِ حال کا جس دلکش انداز میں نقشہ پیش کیا ہے وہ قرآن ہی کا حصہ ہے

قُلْ بِئْسَمَا يَأْمُرُكُمْ بِهٖٓ اِيْمَانُكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ

یہ وہ انفرادی عصیان نہیں ہے جو ایمان کے مقابلے میں فسوق کہلاتا ہے۔ یہ وہ اجتماعی عصیان ہے جس کی بادِ صرصر شمعِ تصدیق کو گل کر دیتی ہے۔ یہودی اجتماعی طور پر خیال کرتے تھے کہ ہماری نسبتیں، ہمارے انبیاء سے نسلی رشتے، ہماری رسمیں اور ہمارا یہودی ہونا بس ہماری نجات و فلاح کے لیے کافی ہے۔ اور اس غرّے میں ایسے بدمست ہو گئے تھے کہ دنیا کی ہر برائی من حیث القوم ان سے وابستہ ہو کر رہ گئی تھی۔ اور اس حالت میں وہ دعویٰ کر رہے تھے کہ نؤمن بما انزل علینا۔ قرآن نے بتایا ہے کہ اگر یہی کچھ ایمان ہے جو زندگی کی ساری برائیوں کی تمہارے لیے گنجائش پیدا کرتا

قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۹۴﴾ وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًا بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿۹۵﴾ وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ ۚ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ يَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ ۚ وَمَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهٖ مِنَ الْعَذَابِ اَنْ يُّعَمَّرَ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۹۶﴾

ان سے کہو اے پیغمبر! اگر واقعی اللہ کے نزدیک آخرت[257] کا گھر تمام انسانوں کو چھوڑ کر صرف تمہارے ہی لیے ہے پھر تمہیں موت[258] کی تمنا کرنی چاہیے۔ اگر تم اپنے اس دعویٰ میں سچے ہو کہ آخرت صرف تمہارے ہی حصّے میں آتی ہے۔ یقین[259] مانو کہ یہ لوگ کبھی اپنی پیش رفت بدعملیوں کی وجہ سے اس کی تمنا نہ کریں گے۔ اللہ ان ظالموں کے حال سے خوب واقف ہے۔ اور پھر اتنا ہی نہیں بلکہ ان کو زندگی کا لوگوں میں سب[260] سے زیادہ حریص پاؤ گے حتیٰ کہ مشرکین سے بھی زیادہ۔ ان میں سے ایک ایک شخص یہ چاہتا ہے کہ کاش اسے ہزار[261] سال کی عمر مل جائے حالانکہ عمر کی درازی انہیں عذابِ آخرت سے نجات نہیں دلائے گی۔ اور اللہ ان کے اعمال کو دیکھ رہا ہے۔

ہے تو اس سے بدتر اور کیا چیز ہو سکتی ہے۔

بنی اسرائیل کو دعوتِ مباہلہ

دلائل کی ہر قسم پیش کرنے اور ان کے ایمان کے دعوے۔ نعرے کا پورے طور پر کھوکھلا پن کھلم کھلا ظاہر کر دینے کے بعد اب مرحلہ ایسا آگیا کہ قرآن نے ان کے ایمان کے دعویٰ کا آخری اور فیصلہ کن طریقہ استعمال کرنے کی نبوت کو ہدایت کی ہے اور یہ ہدایت بالکل اس نوع کی ہے جیسے اس سے پہلے قرآن کے کتابِ الٰہی ہونے کے لیے پیش کی تھی کہ

وَاِنْ كُنْتُمْ فِىْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ

اور دُنیا اس کے مقابلے میں نہ صرف یہ کہ خود ہی عاجز آ گئی تھی بلکہ قرآن نے دُنیا کے عجز کی یہ کہہ کر پیش گوئی کر دی کہ لَنْ تَفْعَلُوْا کہ تم ایسا ہرگز نہ کر سکو گے۔ ٹھیک ایسے ہی یہاں بھی جب قرآن نے ان کو سمجھانے کے لیے اقناعی اور الزامی جوابات دیے اور اس کے باوجود ان کے کفر میں سرمو کوئی فرق نہ آیا تو بات آخری منزل پر پہنچ گئی۔ بالکل آخر میں قرآن نے اپنے مخاطب بنی اسرائیل کو نبوت کی زبان سے مباہلہ کی دعوت دے دی۔ آؤ دلائل سے نہیں مانتے تو ایمان و یقین کی صداقت پر مباہلہ کر لو تاکہ جھگڑا ہمیشہ کے لیے ختم ہو کر دُودھ کا دُودھ اور پانی کا پانی ہو جائے۔ مباہلہ کا موضوع یہودیوں کا یہ دعویٰ تھا کہ پوری کائناتِ انسانی میں اللہ کے دوست صرف یہودی ہیں اور کوئی نہیں۔ وہ اللہ کے چہیتے ہیں اور اللہ کے دوست ہیں۔ وہی جنت میں جائیں گے اور کوئی نہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ دُعا اس پر ہونی تھی کہ جو بھی جھوٹا ہو وہ موت کی تمنا کرے یعنی اللہ سے اپنے لیے موت مانگے۔ اس چیلنج کے لیے قرآن نے فیصلہ کن انداز میں یہ بھی بتا دیا کہ وہ کبھی بھی اس مباہلہ کو تسلیم نہیں کریں گے اور موت کی ہرگز تمنا نہ کریں گے کیونکہ ان کو خوب معلوم ہے کہ وہ جھوٹے ہیں۔ ان کو ڈر ہے کہ کہیں اللہ ان کی دُعا کو قبول ہی نہ کر لے۔

ان آیات کی بیک وقت دو حیثیتیں ہیں۔ ایک یہ کہ آیات تحدی ہیں کیونکہ ان میں یہودیوں کو چیلنج کیا گیا ہے کہ اگر وہی خدا کے چہیتے ہیں اور جنت ان کے لیے مخصوص ہے تو وہ ہمت سے کام لیں اور مرنے کی تمنا کریں اور اللہ سے موت مانگیں۔ چونکہ جنت صرف مرنے کے بعد نصیب ہو سکتی ہے اور جن لوگوں کو اس کے ملنے کا یقین ہو وہ اس کے لیے جان دینے سے دریغ نہیں کر سکتے۔ لیکن باوجود اس کے کہ یہودی حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کے لیے ہر ممکن کوشش کرتے اور آرزوئے موت ان کے لیے ممکن تھی تاہم قرآن کی پیش گوئی پوری ہوئی اور آج تک کسی یہودی نے لقائے الٰہی کی آرزو میں جان نہیں دی۔

دوسرے یہ کہ آیات مباہلہ ہیں۔ کیونکہ ان آیات میں یہودیوں کو مباہلہ کی دعوت دی گئی ہے مگر انہیں مقابلہ کی جرأت نہ ہوئی۔ اس طرح ان کے جھوٹ کا بھانڈا چوراہے میں پھوٹ گیا۔

۲۵۷؎۔ یہود کہتے تھے کہ جنت میں ہمارے سوا کوئی نہ جائے گا اور ہم کو عذاب نہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر یقینی بہشتی ہو تو مرنے سے کیوں ڈرتے ہو۔[1]

---

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۱۸

بنی اسرائیل کے اس بنیادی عقیدہ کہ آخرت ان ہی کے لیے ہے کا ابتدائی خاکہ تو خود تورات میں موجود ہے مثلاً تم خداوند خدا کے فرزند ہو۔ (استثناء ۱۴-۱) تو خداوند اپنے خدا کے لیے مقدس قوم ہے اور خداوند نے تجھے چن لیا ہے۔ تاکہ سب قوموں کی بہ نسبت جو زمین پر ہیں تو اس کے لیے خاص قوم ہو (استثناء ۱۴-۲) رفتہ رفتہ یہ عقیدہ ترقی کرکے اس درجے تک پہنچ گیا کہ یہود اپنے سوا کسی کو جنت کا مستحق ہی نہیں سمجھتے تھے اور نجاتِ اخروی کو اپنا خاص حق سمجھنے لگے۔ اپنے کو خدا کا محبوب خدا کا لاڈلا اور چہیتا فرزند قرار دینے لگے تھے اور خیال یہ جما لیا تھا کہ خداوند خدا کا جو معاملہ ہماری قوم و نسل کے ساتھ ہے وہ دُنیا میں کسی اور کے ساتھ نہیں ہے۔

۲۵۸۔ تمہیں موت کی تمنا کرنی چاہیے۔ اصل میں فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ کا فقرہ آیا ہے۔ تمنّی کے معنے خیال باندھنے اور آرزو کرنے کے ہیں۔ امام راغبؒ کہتے ہیں کہ تمنّی کے معنے دل میں اندازہ کرنا اور اس کا خیال باندھنا۔ اس کے معنے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے موت کی دُعا مانگنے کے منقول ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ آؤ دونوں مل کر جھوٹے کے لیے موت کی دُعا کریں۔ اگر تم مقبولِ الٰہی ہو جیسا کہ تمہارا دعویٰ ہے تو اللہ تعالیٰ تمہاری دُعا قبول کرے گا۔ بعض نے فتمنوا الموت میں موت کی آرزو کرنے سے اپنی ہی موت کی آرزو مراد لی ہے اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ مومن موت سے خائف نہیں ہوتا مگر تم موت سے خائف ہو۔ اسی مطلب کی تائید میں مولانا عثمانیؒ فرماتے ہیں کہ اگر واقعی دل میں یہی یقین ہے اور اپنے دعوے میں سچے ہو تو پھر دُنیا کے مکدر عیش سے دل برداشتہ ہو کر محبوبِ حقیقی کے اشتیاق اور جنت الفردوس کی تمنا میں مرنے کی آرزو کیوں نہیں کرتے۔ جس کو یقیناً معلوم ہو جائے کہ میرا اللہ کے یہاں بڑا درجہ ہے اور کوئی خطرہ نہیں ہے وہ یقیناً مرنے سے خوش ہوگا۔ اس کے مقابلے میں ان مدعیانِ پارسائی اور مغرورینِ ولایت کا حال یہ ہے کہ ان سے زیادہ موت سے ڈرنے والا کوئی نہیں۔ وہ موت کا نام سن کر گھبراتے ہیں کیونکہ دُنیا کی حرص سے ان کا کبھی پیٹ نہیں بھرتا۔

اس معنے پر حافظ ابن کثیرؒ نے یہ شبہ پیش کیا ہے کہ کسی شخص کے اپنے دعویٰ میں صداقت کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ موت کی بھی تمنا کرے۔ موت کی تمنا اور یہودیوں کے مُنکر ہونے میں کوئی لزوم نہیں ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر نیک انسان موت کا متمنی ہو اور اس میں جواباً بھی کہا جا سکتا ہے کہ تم بھی تو حق پر ہونے کے باوجود صحت کی حالت میں متمنی نہیں ہو۔ علماء نے اس کے جوابات دیے ہیں اور اپنے اپنے مذاق پر دیے ہیں۔ کچھ آپ بھی سُن لیجیے۔

یہ مطالبہ ان یہودیوں سے تھا جو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں موجود تھے۔ ہر زمانے کے یہود سے یہ خطاب نہیں ہے [1]

حافظ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں کہ دراصل اس قسم کے شبہات کا سرچشمہ یہی موقف ہے۔ اگر آیت کی وہ تشریح اپنا لی جائے جو حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے پیش کی ہے پھر کوئی شبہ نہیں ہے۔ یہودیوں سے اس آیت میں یہ کہا گیا ہے کہ اگر تمہارا دعویٰ ہے کہ اللہ کے پیارے ہو اور کوئی نہیں۔ اور تم ہی جنتی ہو اور تمہارے سوا جنتی کوئی نہیں تو آؤ اس پر مباہلہ کر لو اور جھوٹے کے لیے مر جانے کی دعا کرو۔ مباہلہ سے ایسے حالات میں فیصلہ کن نتائج سامنے آجاتے ہیں۔

فیصلہ کی یہ صورت پیش کرنے سے دراصل یہ ثابت کرنا مقصود تھا کہ یہودی جان بوجھ کر ہٹ دھرمی سے کام لے رہے ہیں۔ قرآن نے جس قدر جوابات دیے ہیں ان میں سے کسی کا جواب بھی ان کے پاس نہ تھا۔ ان جوابات میں بیان شدہ حقائق کے خلاف وہ اپنے سارے علمی سرمائے میں ایسی کوئی چیز نہ پاتے تھے جس کی بنا پر یہ کہہ سکتے کہ قرآن کے بیان کردہ دلائل واقعات کے خلاف ہیں۔ انبیاء کی تکذیب، انبیاء کا قتل، گوسالہ پرستی، قومی زندگی میں اللہ کے حکم کے خلاف باغیانہ اقدامات میں سے کون سی بات حقیقت کے خلاف ہے۔ اور پھر تورات میں بشارتیں پڑھ کر دلوں میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا اقرار اور آپؐ کی پوری معرفت کے باوجود کفر و انکار۔ ان حالات میں جب ان سے کہا گیا کہ اچھا اگر تمہیں اپنی صداقت کا پورا یقین ہے تو آؤ ہمارے ساتھ مقابلے میں دعا کرو۔ جو جھوٹا ہو اس کو موت آجائے۔ چونکہ ان کو اپنے جھوٹے ہونے کا یقین تھا اس لیے مقابلہ کے لیے تیار نہ ہوئے۔ اس طرح یہ بات سارے عرب کے سامنے کھل گئی کہ یہودی علماء جو اپنے تقدس کا سانس سانس میں دعویٰ کرتے ہیں دراصل ایسا نعرہ، ایسا دعویٰ کر رہے ہیں جس کی صداقت پر خود ان کو اعتماد نہیں ہے۔

۲۵۹ ۔ یہ لوگ کبھی اپنی پیش رفت بدعملیوں کی وجہ سے موت کی تمنا نہ کریں گے۔ یعنی ان کا دل خود چور ہے۔ ان کا ضمیر اس پر ملامت کر رہا ہے اور جانتے ہیں کہ جو کرتوت کیے ہیں یہاں سے چھوٹتے ہی ان کی سزا میں پکڑے جائیں گے۔ غرض ان کے تمام افعال و اطوار سے روز روشن کی طرح واضح ہے کہ وہ ایک لمحہ کے لیے موت نہیں مانگ سکتے۔ حافظ ابن جریرؒ فرماتے ہیں کہ ہمیں

---

[1] معارف القرآن م ش ص ۲۰۸

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد پہنچا ہے کہ اگر یہود موت مانگ لیتے تو موت کا شکار ہو جاتے اور جہنم میں اپنے ٹھکانے دیکھ لیتے۔ اگر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلّم سے مباہلہ کرنے والے میدان میں آجاتے تو اپنے گھروں کو ان کی واپسی اس طرح ہوتی کہ نہ اولاد ہوتی نہ مال ہوتا۔

گویا قرآن نے حتمی طور پر یہ بھی بتادیا کہ وہ کبھی اس مباہلہ کو قبول نہ کریں گے۔ ایک تو وجہ اس کی یہ بیان کی گئی ہے کہ انہیں یہ معلوم ہے کہ جو کارنامے انہوں نے انجام دیے وہ ان کو آخرت کا مستحق نہیں بناتے۔ دوسری وجہ اس فقرے میں بتائی گئی ہے کہ واللہ علیم بالظالمین۔ اللہ ان ظالموں کے حال سے خوب واقف ہے یعنی ان لوگوں سے جو اپنے ہتھکنڈوں سے خود اپنے حق میں ظلم کرتے رہے ہیں۔

۲۶۰ ف۔ ان کو لوگوں میں زندگی کا سب سے زیادہ حریص پاؤگے۔ یہ مباہلہ کی دعوت قبول نہ کرنے اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلّم کے مقابلے پر نہ آنے کی تیسری وجہ ہے۔ یہودیوں میں مادیت کے غلبہ کی وجہ سے دُنیا پرستی مقصود بالذات بن گئی تھی۔ اس کے نتیجہ میں وہ آخرت کے ایمان و یقین سے محروم ہو چکے تھے۔

اصل میں عَلٰی حَیٰوۃٍ کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کے معنے ہیں کسی طرح کی زندگی۔ یعنی ان کو محض زندگی کی حرص ہے خواہ وہ کسی طرح کی زندگی ہو، عزّت و شرافت کی ہو یا ذلت اور کمینہ پن کی[1] ــــ اور تو اور مشرکین سے بھی زیادہ زندگی کے حریص ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ مشرکین سرے سے آخرت کی نعمتوں کے لذت شناس ہی نہیں۔ وہ اگر آخرت سے رُخ پھیر کر اپنا مرکزِ توجہ اور محورِ زندگی اسی مادی زندگی کو بنالیں تو حیرت کی بات نہیں ہے۔ غضب تو یہ یہود کر رہے ہیں جو اپنے آسمانی صحیفوں اور نبوت کی راہ سے آئی ہوئی ہدایات کے باوجود بھی مشرکوں سے بڑھ کر دُنیا سے لپٹے ہوئے ہیں[2]

۲۶۱ ف۔ کاش ہزار سال جیتے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب انسان کا آخرت پر یقین نہ ہو تو دُنیا کی طویل سے طویل زندگی بھی اسے تھوڑی معلوم ہوتی ہے۔ آخرت پر ایمان ایک نعمت ہے جس سے صرف مومن کا دل ہی فیضیاب ہو سکتا ہے۔ ہمیشگی کی زندگی کا دروازہ اپنے اوپر وہی بند کر سکتا ہے جو زندگی کی حقیقت سے بے خبر ہو لیکن کیا عمر کی درازی اللہ کی گرفت سے بچا سکتی ہے؟

---

[1] تفہیم القرآن ص ۹۶ [2] تفسیر ماجدی ص ۳۷

قرآن کہتا ہے کہ ہرگز نہیں۔
مطالب کی حد تک تو آیات کی تشریحات یہی ہیں جو پیش کردی گئی ہیں لیکن بعض مفسرین نے اس آیت پر ایک دوسرے پہلو سے بھی غور کیا ہے وہ بھی سن لیجئے۔
دراصل اس آیتِ قرآنی میں تمام ایمان کے مدعیوں سے یہ کہا جارہا ہے کہ ایمان کی صداقت اور اس کے خلاف واقعہ ہونے کا معیار یہ ہے کہ ہر مدعیٔ ایمان کو اپنے ایمان کا امتحان اس طرح لینا چاہیے کہ وہ دیکھے کہ اس کے دل میں اللہ کی راہ میں تکالیف و مصائب برداشت کرنے کی تمنا کتنی ہے کیونکہ یہی ایمان کی حقیقی کسوٹی ہے۔ کتنے اسرائیلی ہیں جو آخرت کی زندگی اور جنت کو اپنی میراث سمجھتے ہیں اور ان کے دلوں میں اللہ کی راہ میں جان کھپانے اور مرمٹنے کی تمنا ہے۔ ان کے علماء واحبار کا جائزہ لیجئے کہ ان میں اللہ کی خاطر سرفروشی اور جان نثاری کی آرزو کہیں جھلکتی نظر آتی ہے اور وہ لوگ اللہ کی راہ میں قربانیاں کرنے کی تمنا کیوں کریں گے جو زندگی کی آسائشوں اور نعمتوں اور مال حرام کے منافع سے استفادہ کررہے ہوں، نہ استفادے کو برا سمجھتے ہوں اور نہ زندگی کی منفعتوں سے باہر نکلنا چاہتے ہوں۔ جو لوگ باطل افکار و اقدار کی خدمت کرنے اور ان سے نفع حاصل کرنے کے بعد محض اپنے خاندان میں انبیاء ہونے کی بنا پر اپنے تئیں نجات کا مستحق سمجھتے ہوں اور جنت کو اپنے نام الاٹ کراچکے ہوں ان کو کیا پڑی ہے کہ اللہ کی خاطر جان و مال کی قربانیاں دینے کی تمنا کریں اور حق کی تبلیغ و اشاعت کے لیے تکلیفیں اور مصیبتیں برداشت کرنے کی تمنائیں کریں۔ اللہ کے لیے قربانیاں کرنے کا جذبہ تو اس جماعت میں پیدا ہوسکتا ہے جو موت کو ایک پُل سمجھے جو دوست کو دوست سے ملنے کا ذریعہ ہے اور جو خالص لقائے الٰہی اور جنت کی خاطر موت کی تمنا کرے۔ اس کے افعال اور حرکات خود گواہی دیتے ہیں کہ اللہ کی راہ میں قربان ہوجانا ان کو دُنیا کی تمام لذتوں سے زیادہ لذیذ ہے۔
حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے لوددت ان اقتل فی سبیل اللہ ثم احیٰ ثم اقتل۔ میری تمنا ہے کہ اللہ کی راہ میں قتل کیا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں پھر قتل کیا جاؤں۔ اللہ کی راہ میں قربانیاں کرنے وقت موت کے لیے ان کی سرشاریوں کی کیفیت کا اندازہ کرنا ہو تو رومیوں سے جنگ میں حضرت عبداللہ بن رواحہ کے یہ اشعار پڑھیے۔

یا حبذا الجنۃ واقترابہا طیبۃ وبارد شرابہا

والروم روم قددنا عذابہا

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيلَ فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلَىٰ قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللَّهِ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَهُدًى وَبُشْرَىٰ لِلْمُؤْمِنِينَ ﴿٩٧﴾ مَن كَانَ عَدُوًّا لِّلَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَرُسُلِهِ وَجِبْرِيلَ وَمِيكَالَ فَإِنَّ اللَّهَ عَدُوٌّ لِّلْكَافِرِينَ ﴿٩٨﴾

اے پیغمبر ان سے کہہ دو کہ جو بھی جبریل[۲۶۲] سے عداوت رکھتا ہے اسے معلوم ہونا چاہیے کہ جبریل ہی نے اللہ کے حکم[۲۶۳] سے یہ قرآن تمہارے قلب پر اتارا ہے اور یہ اس کلام کی تصدیق و تائید کرتا ہے جو اس[۲۶۴] سے پہلے نازل ہو چکا ہے۔ اس میں ان لوگوں کے لیے جو ایمان رکھتے ہیں ہدایت اور بشارت ہے۔ اگر جبریل[۲۶۵] سے ان کی عداوت کا سبب یہی ہے (تو بتا دو کہ) جو اللہ، اس کے فرشتوں، اس کے رسولوں اور جبریل و میکائیل کا دشمن ہے تو اللہ ان کافروں کا دشمن ہے۔

جنگ صفین میں حضرت عمار بن یاسرؓ کی ولولہ انگیز تمنا یہ تھی۔

غدا نلقی الاحبۃ — محمدًا و صحبہ

حضرت حسنؓ نے حضرت علیؓ کو دیکھ کر فرمایا کہ یہ سپاہیوں اور فوجیوں کی وردی نہیں۔ کیا بات ہے جواب میں فرمایا بیٹا تیرے باپ کو اس کی پروا نہیں ہے کہ وہ موت پر گرتا ہے یا موت اس پر پڑتی ہے یعنی مجھے تو بس اللہ کی راہ میں جان دینے کا شوق ہے۔

بس یہی ایمان کے سچے اور جھوٹے ہونے کا معیار ہے۔ پہلا طبقہ ایمان کا، نجات کا، جنت کا اور آخرت کا جھوٹا مدعی ہے۔ اور دوسرا طبقہ کے ایمان میں صداقت ہے۔

اس تشریح کو آیت کی تفسیر تو نہیں کہا جا سکتا لیکن یہ آیتِ قرآنی کا مدلول ضرور ہے۔ اور اس میں ہمارے لیے بہت بڑی عبرت ہے۔ اس وقت میرے حافظہ میں ابوداؤد کی وہ حدیث گھوم رہی ہے جس میں آپؐ نے فرمایا۔ قریب ہے کہ تم پر قومیں حملہ آور ہوں اور حملہ کرنے کے لیے ایک دوسرے کو اس طرح پکاریں گے یعنی تم پر متحدہ حملہ کریں جس طرح کھانے والے کھانے کے پیالے پر گرتے ہیں۔ حاضرین میں سے ایک نے دریافت کیا یا رسول اللہ کیا یہ اس لیے کہ اس زمانے میں ہماری تعداد کم ہو جائے گی۔ فرمایا نہیں بلکہ تمہاری تعداد ان دنوں سے زیادہ ہو گی لیکن تم ایسے ہو جاؤ گے جیسے سیلاب کی سطح پر کف

اور خس وخاشاک ہوتا ہے کہ سیلاب ان کو بہا کرلے جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ تمہارے دشمنوں کے دلوں سے تمہارا رُعب ہٹا دے گا اور تمہارے دلوں میں کمزوری ڈال دے گا۔ کسی نے پوچھا یا رسول اللہ وہ کمزوری کیا ہوگی؟ فرمایا دُنیا اور فوائدِ دُنیا کی محبت اور موت سے کراہت۔ موجودہ دُنیائے اسلام کی پیش نظر تاریخ میں کیا حرف بحرف اس کی تصدیق نہیں ہے؟ اور کیا یہ صورتِ حال ولتجدنھم احرص الناس علی حیوۃ کی واقعاتی تفسیر نہیں ہے ــــ انا للہ فالی اللہ المشتکیٰ!۔

فرشتوں سے دُشمنی

جب یہودیوں کے ترکش میں میدان جیتنے کے لیے دلیل کا کوئی تیر نہ رہا اور قرآن نے ان کے ہر غدر لنگ پر ان کو ان کے گھر سے دلائل دے کر رگید ا تو کھسیانی بلی کھمبا نوچے کے انداز پر بول پڑے کہ جو فرشتہ جبریل نامی آپ پر وحی لے کر آتا ہے چونکہ یہ ہمارا دُشمن ہے اس لیے ہم نہ آپ کو مانیں گے اور نہ قرآن پر ایمان لائیں گے۔ اس پر تمام اہلِ علم کا اتفاق ہے جیسا کہ ابن جریرؒ سے حافظ ابن کثیرؒ نے نقل کیا ہے کہ یہ یہودیوں کے اسی اعتراض کا جواب ہے۔

مسند ابی داؤد طیالسی میں ہے کہ ایک بار چند یہودی خدمتِ اقدس میں آئے اور کہا کہ ہم آپ سے چند باتیں دریافت کرنا چاہتے ہیں جن کا جواب پیغمبر کے سوا کوئی اور نہیں دے سکتا۔ آپؐ نے فرمایا جو چاہو پوچھو۔ لیکن یہ وعدہ کرو کہ جوابات صحیح ہونے کی صورت میں اسلام قبول کرنا ہوگا۔ انہوں نے کہا کہ ہاں ہم کو یہ شرط منظور ہے۔ آپؐ نے فرمایا پوچھو جو کچھ پوچھنا چاہتے ہو۔

یہودی عالم: حضرت یعقوب علیہ السلام نے تورات اترنے سے پہلے جو کھانا اپنے اوپر حرام کیا تھا اس کا واقعہ کیا ہے؟

حضور انورؐ: ایک بار سخت بیمار ہوتے انہوں نے نذر مانی کہ اگر میں اچھا ہو گیا تو کھانے اور پینے کی جو چیز مجھے سب سے زیادہ پسند ہے وہ چھوڑ دوں گا۔ ان کو کھانے میں سب سے زیادہ پسند اونٹ کا گوشت اور پینے میں سب سے زیادہ اونٹ کا دودھ مرغوب تھا۔ چنانچہ صحت کے بعد انہوں نے دونوں چیزیں چھوڑ دیں۔

یہودی عالم: خدایا یہ سچ ہے۔

حضور انورؐ: اے اللہ گواہ رہ

یہودی عالم : یہ بتایئے کہ ایک ہی نطفہ کبھی نر اور کبھی مادہ کیونکر ہو جاتا ہے ؟
حضورِ انورؐ : میں تم کو اُس خدا کی قسم دیتا ہوں جس نے موسیٰ علیہ السلام پر تورات نازل کی تم کو یہ پتہ ہے کہ مرد کا نطفہ گاڑھا اور سفید ہوتا ہے اور عورت کا پتلا اور زرد ۔ ان میں جو جنس غالب ہوتی ہے وہ نطفہ ہی خدا کے حکم سے وہی ہو جاتا ہے اور اسی کے مشابہ ہوتا ہے ۔
یہودی عالم : خدایا دُرست ہے ۔
حضورِ انورؐ : اے اللہ گواہ رہ
یہودی عالم : تورات میں نبی اُمّی کی پہچان کیا بتائی گئی ہے ؟
حضورِ انورؐ : میں تم کو اُس خدا کی قسم دیتا ہوں جس نے موسیٰ علیہ السلام پر تورات نازل کی تم کو یہ معلوم ہے کہ اس نبی کی آنکھیں سوئیں گی اور دل نہیں سوئے گا ۔
یہودی عالم : خدایا ہاں
حضورِ انورؐ : اے اللہ گواہ رہ
یہودی عالم : یہ بتایئے کہ فرشتوں میں سے تمہارا دوست اور نگہبان کون ہے ؟
حضورِ انورؐ : میرا رفیق فرشتوں میں سے جبریل ہے ۔
یہودی عالم : پھر ہم آپ کے ساتھ نہیں ہو سکتے کیونکہ جبریل تو ہمارا دُشمن ہے ۔

۲۶۲ ۔ جو بھی جبریل سے عداوت رکھتا ہے ۔ جبریل عبرانی لفظ ہے جس کے لغوی معنے مردِ خدا کے ہیں ۔ لیکن اصطلاحِ شریعت میں اس فرشتے کا نام ہے جو خدا اور خاصانِ خدا کے درمیان پیامبری کی خدمت انجام دیتا ہے ۔ تورات اور انجیل میں بھی یہ نام اسی حیثیت سے استعمال ہوا ہے ۔ چنانچہ دانیال (۸-۱۶-۹-۲۱) میں اس کی پیامبری کا بیان ہے ۔ اسی طرح انجیل لوقا (۱-۱۹-۲۶) میں مذکور ہے کہ وہ حضرت زکریا علیہ السلام کے پاس حضرت یحییٰ علیہ السلام کی بشارت اور حضرت مریم علیہا السلام کے پاس حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بشارت لے کر آیا تھا ۔ یہاں قرآن نے بتایا ہے کہ وہ پیامبر جو حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کے اور اللہ سبحانہٗ کے درمیان وحیِ الٰہی کا ایلچی تھا وہ بھی جبریل تھا ۔ اور کہیں اسی کو الروح الامین سے تعبیر کیا ہے ۔ سورۂ نحل میں اس کو روح القدس کہا گیا ہے ۔ رسُول کا لفظ بھی اس کی شان میں استعمال کیا گیا ہے ۔ سورۂ تکویر میں اس رسُول کی متعدد صفات کا ذکر ہے اور سورۂ نجم میں اس کے کچھ اور اوصاف مذکور ہیں ۔ آغازِ وحی کے واقعہ میں حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم نے جبریل کے لیے لفظ ملک فرمایا ہے اور ورقہ نے اس کو ناموس

کے لفظ سے ادا کیا ہے۔

قرآن حکیم میں جبریل کا نام تین مقام پر آیا ہے دو دفعہ سورۂ بقرہ میں اور ایک دفعہ سورۂ تحریم میں۔ لیکن اس خصوصیت کے ساتھ کہ وہ وحی محمدی کے پیامبر اور قرآن کے حامل ہیں صرف اسی آیت میں آیا ہے۔ دوسری آیتوں میں قرآن نے حاملِ قرآن فرشتہ کی ذات کی تعبیر رُوح الامین، روح القدس اور رسُول کریم کے الفاظ سے کی ہے لیکن احادیث میں ان الفاظ کے بجائے جبریل ہی کا لفظ عام طور سے مستعمل ہوا ہے۔ ایک پیامبر کی حیثیت سے جبریل کی سب سے پہلی آمد اس وقت ہوئی جب آپؐ غارِ حرا میں معتکف تھے۔

یہود نے اپنی نادانی سے یہ خیال جما لیا تھا کہ جبریل ایک فرشتۂ عذاب ہے ان کا کام وحی لانا نہیں عذاب لانا ہے اور وحی لانا ایک دوسرے فرشتہ کا کام ہے۔ اپنے ان مفروضات کے بعد ان کو جناب رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم پر اعتراض تھا کہ یہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلّم اپنی وحی کے سلسلے میں جبریل کا نام کیوں لیتے ہیں؟ یہ اعتراض دراصل حضور انور صلی اللہ علیہ وسلّم پر نہیں بلکہ اللہ سبحانہٗ پر ہے۔ پہلے اللہ تعالیٰ پر یہ اعتراض کیا تھا کہ بنی اسرائیل کو چھوڑ کر بنی اسماعیل میں سے نبی کیوں بنایا ہے؟ اور اب یہ اعتراض ہو رہا ہے کہ نئے مدعیٔ نبوّت پر وحی جبریل نامی فرشتہ کیوں لاتا ہے بات کا پیرایہ مختلف ہے ورنہ رُوح دونوں کی ایک ہے اور وہ یہ کہ اللہ سبحانہٗ کو اپنی مرضی، اپنے صوابدید اور اپنے میلانِ طبع کے تحت کر کے فیصلہ کرانا چاہتے ہیں۔ اللہ اکبر ذاتِ کبریا اپنے بندوں پر کس قدر رحیم و شفیق ہے اور اندازِ دعوت بھی کیسا شفقت سے لبریز ہے پہلے اعتراض کے جواب میں نہایت شفقت سے سمجھایا کہ اس قسم کا اعتراض اللہ کی جناب میں بغاوت اور سرکشی ہے بندے کو یہ نہیں جچتا یہ اللہ کا کام ہے کہ ینزّل اللّٰہ من فضلہٖ علیٰ من یشاء من عبادہٖ۔ دوسرے اعتراض کے جواب میں ارشاد فرمایا کہ جبریل تو خود کچھ نہیں۔ وہ آپ پر وحی خود نہیں لاتے وہ تو اللہ کی جانب سے خدمتِ سفارت پر مامور ہیں۔

۲۶۳ - اس نے اللہ کے حکم سے تمہارے قلب پر قرآن اتارا ہے۔ وہ تو صرف اللہ کے حکم سے (باذن اللہ) وحی لانے کا کام کرتے ہیں۔ تمہیں تو بندے ہونے کی حیثیت سے اللہ کے حکم کو ماننا چاہیے۔ کون لاتا ہے کس کی وساطت سے آتا ہے یہ دیکھنا تمہارا کام نہیں ہے۔ یہاں قرآن نے یہ بتایا ہے کہ جبریل نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلّم کے قلب مبارک پر قرآن اتارا ہے۔ قرآن کی یہ تنزیل جبریل کی وساطت سے بذریعہ وحی ہوئی۔ وحی کیا ہے اور اس کا علمی ذرائع میں مقام کیا

ہے۔اس پر ہم یہاں چند اشارات کرتے ہیں۔اس کے تفصیلی مباحث کے لیے پچیسویں پارے کے انتظار کی زحمت گوارا کرنی ہوگی۔

علمی ذرائع میں وحی کا مقام

وحی علم کا ایک ذریعہ ہے جو اللہ سبحانہ کی جانب سے انبیاء کو عطا کیا جاتا ہے یہ نہ تخلیقی ہے اور نہ کسبی — عام انسانوں میں حواس اور مشاعر علم کا ذریعہ ہوتے ہیں لیکن انبیاء میں حواس اور مشاعر سے بالا وحی علمی ذریعہ ہوتا ہے۔

یوں سمجھو کہ مخلوقات میں جیسے علمی ذرائع کا ایک ارتقائی سلسلہ قائم ہے، جمادات بے حس ہیں لیکن نباتات میں قوتِ احساس موجود ہے، حیوانات میں احساسات کے ساتھ کچھ مشاعر بھی کارفرما ہیں۔ انسان احساس اور شعور کے کمالات کا نمونہ ہے۔ ایسے ہی انسانوں میں انبیاء کو حواس اور مشاعر سے بالا ایک ایسی قوت دی جاتی ہے جو عام انسانوں کو نہیں ملتی۔ حواس صرف مادیات کی دریافت کا ذریعہ ہیں۔ مشاعر مادیات سے آگے ذہنیات اور عقلیات کا ادراک کرتے ہیں اور وحی ذہنیات اور عقلیات سے بالا حقائقِ غیبیہ معلوم کرنے کا راستہ ہے۔

اس ذریعۂ علم میں غور و بحث منطقیانہ فکر و نظر اور ترتیبِ مقدمات کی ضرورت نہیں پڑتی۔ بلکہ حقائق اس طرح سامنے آتے ہیں جیسے وجدانیات، فطریات، بدیہیات اور محسوسات۔

چونکہ اللہ سبحانہ انبیاء کو ایک نئے ذریعہ سے علم عطا کرتا ہے اس لیے اس کا نام بھی عام ذرائع سے الگ وحی رکھا ہے۔ وحی کے معنے لغت میں اشارہ، لکھنا، پیغام دینا، دل میں ڈالنا، چھپا کر بولنا ہیں۔ وحی کے ان متفرق معنوں میں ایک مفہوم مشترک ہے اور وہ یہ ہے کہ منہ سے لفظ نکالے بغیر ایک شخص کا دوسرے شخص کو مفہوم سمجھا دینا۔ یہ گویا اللہ سبحانہ کا وہ اشارہ ہے جو نبوت پر حقائق غیبیہ کی راہ کھولتا ہے۔ اسے امام رازیؒ کی زبان میں ملکۂ نبوت، مجدد الف ثانیؒ کی اصطلاح میں نورِ نبوت اور علامہ اقبالؒ کی تعبیرات میں شعورِ نبوت کہتے ہیں۔ مجدد الف ثانیؒ فرماتے ہیں:۔

جیسے عقل کا مقام حواس سے بالا ہے کہ جن چیزوں تک رسائی ہم حواس کے ذریعے نہیں کر سکتے عقل کے ذریعے کر سکتے ہیں۔ ایسے ہی نبوت کا مقام عقل سے بالا ہے جہاں عقل کی رسائی نہیں ہوتی نورِ نبوت کے ذریعہ سے اس کا ادراک ہو سکتا ہے۔ اور اس کے ساتھ مجدد صاحبؒ نے یہ انکشاف بھی فرمایا ہے کہ جو شخص عقل و حواس ہی کو علمی ذریعہ مانتا ہے اور اس کے سوا کسی علمی ذریعہ کو نہیں

مانتا وہ درحقیقت منکرِ نبوّت ہے۔ علامہ اقبالؒ نے اسے اپنے مخصوص انداز میں یوں پیش کیا ہے کہ جسے ہم نے شعورِ نبوّت سے تعبیر کیا ہے اس کے معنے یہ ہیں کہ اس شعور کی موجودگی میں نہ تو افراد کو خود کسی چیز پر حکم لگانا پڑے گا نہ ان کے سامنے یہ سوال ہو گا کہ ان کی پسند کیا اور ناپسندیدگی کیا ہے؟ ان کو یہ بھی سوچنے کی ضرورت نہ ہو گی کہ وہ اپنے لیے کیا راہِ عمل اختیار کریں۔ یہ سب باتیں گویا پہلے ہی سے طے شدہ ہوں گی۔ یہ نہیں کہ ان کو اس بارے میں خود اپنے فکر اور انتخاب سے کام لینا پڑے گا۔ شعورِ نبوّت کو گویا کفایتِ فکر اور انتخاب سے تعبیر کرنا پڑا ہے[1]۔ ——— کیونکہ فی الواقع وحی عقلیت سے بالا ایک ایسے ذریعہ کا نام ہے جس میں وجدان نہیں بلکہ سرتاسر عرفان ہوتا ہے خواہ یہ بالواسطہ ہو یا بلاواسطہ۔ آواز کے ساتھ ہو یا بغیر آواز کے حصولِ علم کی حد تک نبوّت کے عرفان کی دُنیا ایسی ہی حقیقی اور واقعی ہوتی ہے جیسے ہمارے مشاہدات کی۔ اسے صرف اس لیے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ اس کی ابتدا ہمارے ادراک یا حس سے نہیں ہوتی ہے یہ کوئی غیر شعوری قسم کا وجدان نہیں بلکہ حقیقی اور واقعی عرفان کا نام ہے۔ امام غزالیؒ فرماتے ہیں:

آدمی کے اطوار میں سے جیسے عقل معقولات کے ادراک کا ایک ذریعہ ہے ایسے ہی نبوّت بھی ایک طور ہے جس کے نور سے صاحبِ نبوّت حقائقِ غیبیہ اور عقل سے بالا امور کا ادراک کر لیتا ہے[2]

حکیم الامت شاہ ولی اللہؒ کی ژرف نگاہی اس قسم کے مواقع پر بہت بڑی رہنمائی کا کام کرتی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ——— انسان کا مزاجی اعتدال صورتِ نوعیہ کے لحاظ سے معارفِ الٰہیہ کے بغیر پایۂ کمال کو نہیں پہنچ سکتا ہے۔ اس لیے حکمتِ الٰہی نے کچھ شخصیتوں کی عقلیت کو ایسا صاف، پاکیزہ اور بلند تر بنایا ہے کہ جن میں حقائق کے ادراک کی پوری پوری قابلیت رکھی ہے۔ یہ عظیم المرتبت شخصیت بارگاہِ الٰہی سے علوم کا فیضان لے کر آتی ہے اور انسانوں تک پہنچاتی ہے اس کی حیثیت انسانوں میں ٹھیک ٹھیک وہی ہے جو شہد کی مکھیوں میں یعسوب کی ہوتی ہے۔ اگر سلسلۂ وحی نہ ہوتا تو نوعِ انسانی اس درجۂ کمال کو نہ پا سکتی جو تقدیرِ الٰہی نے اس کے لیے مقرر کیا ہے۔ گویا انسانوں میں وحی نوعِ انسانی کے ارتقاء کی آخری کڑی ہے[3]

الغرض وحی کا مقام عقل سے بالا ہے اور جیسے وحی کا مقام عقل سے بالا ہے ایسے ہی نبوّت کا مقام ولایت سے بالا ہے۔ ولایت میں صرف وجدان ہوتا ہے اور اس میں غلطی کا احتمال ہے۔ اسی بنا پر ولی

---

[1] تشکیل جدید الٰہیات ص ۱۹۲　[2] المنقذ من الضلال۔　[3] حجۃ اللہ البالغہ

کا الہام دلیل وحجت کے طور پر پیش نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے برعکس نبوّت مقامِ عرفان پر گامزن ہوتی ہے جس میں غلطی کا کوئی احتمال نہیں ہوتا۔

وحی کی اگرچہ متعدد صورتیں ہیں اس کے تفصیلی مباحث تو پارہ ۲۵ سورۃ الشوریٰ میں انشاءاللہ بشرطِ حیات آئیں گے۔ ان صورتوں میں سے ایک صورت یہ ہے کہ فرشتہ مجسّم ہو کر آنکھوں کے سامنے نہ آئے بلکہ براہِ راست نبی کے قلب پر نزول کرے اور نبی کو قلب ہی سے فرشتہ کا اور اس کی آواز کا ادراک ہو۔ حواسِ ظاہرہ کو اس میں کوئی دخل نہ ہو۔ میرے خیال میں یہی صورت ہے۔ جیسے حدیثِ عائشہؓ میں :

یاتینی مثل صلصلۃ الجرس　　میرے پاس گھنٹے کی آواز کی طرح آتی ہے

سے تعبیر فرمایا ہے۔ اسی کو آپؐ نے فرمایا کہ یہ صورت مجھ پر بہت سخت ہوتی ہے۔ قرآن کی اس آیت میں فانہ نزلہ علی قلبک سے اسی طرف اشارہ ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ وحی اُترنے کی حالت میں آپؐ کو میں نے دیکھا کہ جب یہ کیفیت ختم ہو جاتی تھی تو سخت سردی کے زمانے میں بھی جبینِ مبارک عرق آلود ہو جاتی تھی[1] صحابہ کا بیان ہے کہ اس حالت میں جسم مبارک بہت بھاری ہو جاتا تھا۔ سواری کے اونٹ بیٹھ بیٹھ جاتے تھے[2] اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ جبریل سے عداوت رکھنے والے یہ سن لیں کہ جبریل کا کام اللہ پاک کی سفارت ہے۔ سفارت کے فرائض انجام دیتے ہوئے جبریل نے یہ قرآن حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم پر اتارا ہے۔ دیکھنا یہ چاہیے کہ کلام اور پیغام کس کا ہے۔ تو یہ اللہ کا کلام ہے اور اللہ کے حکم سے جبریل نے حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کے قلبِ مبارک پر اتارا ہے۔

آیت میں اس فقرے نے فانہ نزلہ علی قلبک یہ بات کھول دی ہے کہ حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک پر قرآنی علوم و معارف کے فقط معانی نہیں اتارے گئے کہ پیغمبر نے ان کو اپنے الفاظ کا جامہ پہنا دیا ہو بلکہ قرآن کی اصل عبارت آپؐ کے قلب مبارک پر نازل کی جاتی تھی۔ اگر قرآن صرف ایک انسانی (INSPIRED) کتاب ہوتی تو اس کے نزول کے لیے کسی زبان کی تخصیص نہ ہوتی۔ مگر قرآن نے اپنی اس تنزیل کے لیے عربیت کو بار بار دہرایا ہے یہ اس بات کی دلیل ہے کہ حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک پر عربی کے یہی الفاظ نازل کیے گئے تھے۔ اور یہ اس امر کی کھلی شہادت ہے کہ یہ محض ایک انسانی کتاب نہیں ہے۔ اسی بنا پر اصولیین نے قرآن کی یہ تعریف کی ہے۔

---

[1] صحیح بخاری　　[2] مسندِ احمد

ھواسم للنظم والمعنی جمیعاً ، قرآن نظم ومعنی دونوں کے مجموعہ کا نام ہے۔
فقہاء میں سے علامہ شامی لکھتے ہیں :
قرآن اس کتاب کا نام ہے جو عربی الفاظ میں اس خاص نظم وترتیب سے اتاری گئی ہے جو مصاحف میں ہے اور جو ہم تک تواتر کے ذریعے پہنچی ہے۔ (ردمحتار ج ۱ ص ۳۵۰)
فقیہ کبیر علامہ برہان الدین المرغینانی صاحب ہدایہ التجنیس میں لکھتے ہیں ۔
قرآن حکیم کو غیر عربی میں لکھنا بالاجماع ممنوع ہے کیونکہ ایسا کرنا قرآن کی حفاظت پر اثر انداز ہوگا۔ ہمیں قرآن کے الفاظ ومعنی دونوں کی حفاظت کا حکم ہے کیونکہ یہ دلیل نبوت ہے۔ (ردمحتار ج ۱ ص ۳۵)
قرآن مجید کے غیر عربی میں لکھنے کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کی عربی عبارت کو حذف کرکے پورے قرآن کو کسی اور زبان میں لکھا جائے۔ کسی عبارت کے ضمن میں ایک دو آیتوں کا ترجمہ لکھنا اور ان کو مجازاً آیت کہنا ہرگز منع نہیں ہے اور پورے قرآن کو غیر عربی میں لکھنا بھی اس وقت منع ہے جب اصل عبارت ساتھ نہ ہو۔ اگر اصل عربی رکھ کر اس کا ترجمہ یا تفسیر لکھیں تو کوئی حرج نہیں ہے ــــ محقق ابن الہمام لکھتے ہیں :
اگر کوئی شخص قرآن کو فارسی میں لکھنے کا ارادہ کرے تو اسے روک دیا جائے لیکن اگر الفاظ قرآن بھی ساتھ لکھتا جائے تو پھر اس کا ترجمہ کرنا اور دوسری زبان میں تفسیر کرنا جائز ہے۔ ہاں ایک دو آیت غیر عربی میں لکھ سکتا ہے ۔ (النفحۃ القدسیہ ص ۳۱)
ایک شخص نے شیخ ابو محمد بن فضل سے دریافت کیا تھا کہ ہمارے زمانے میں بچوں کو عربی پڑھنا دشوار ہے کیا ہمیں ان کو فارسی میں قرآن پڑھانے کی اجازت ہے۔ شیخ نے اس کا جو جواب اس پوچھنے والے کو دیا وہ قابل تشنید ہے۔ فرمایا کہ یہ شخص اللہ کی کتاب کو دنیا سے ناپید کرنے کے درپے ہے اور پھر فتویٰ لکھا کہ
جو شخص قرآن کو عربی کے سوا کسی اور زبان میں عمداً لکھے وہ یا زندیق ہوسکتا ہے یا مجنون۔ اگر دیوانہ ہے تو اس کا علاج کرایا جائے ، اور اگر زندیق ہے تو اس کو فوجداری کے سپرد کردیا جائے۔
اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ قرآن ہم جسے کہتے ہیں وہ نزلہ علیٰ قلبک ہے یعنی جسے جبریل آپ کے قلب مبارک پر لے کر اترے ہیں۔ یہاں سے بعض متنورین کی یہ غلطی بھی بے جان ہوکر رہ گئی کہ نماز میں قرآن اردو پنجابی میں ہونا چاہیے۔ نماز میں قرآن پڑھنے کا مطالبہ ہے اور قرآن نام ہے نظم ومعنی دونوں کے مجموعہ کا۔ کیونکہ جبریل نے جو چیز آپ کے قلب پر اتاری ہے وہ صرف

معنی نہیں ہیں بلکہ نظم و معنی دونوں ہیں۔ اس نظم و معنی کے مجموعہ ہی میں شانِ اعجاز ہے اور اسی میں شانِ تعبّد ہے۔ یہ بات نزلہ علیٰ قلبك کی رعایت سے یہاں ضمناً آگئی۔ اس بحث کا اصل مقام پارہ ۹ سورۂ اعراف ہے وہاں اس موضوع پر ان شاء اللہ تفصیل آرہی ہے۔

۲۶۴۔ یہ قرآن اس کلام کی تصدیق کرتا ہے جو اس سے پہلے نازل ہوچکا اور اس میں اہلِ ایمان کے لیے ہدایت اور بشارت ہے۔ اس میں قرآن کا چہرہ پیش کیا جارہا ہے کہ وہ خدائی پیغام ہے جو تمام اگلی کتابوں کی صداقتوں اور تعلیموں کا مصدق ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے بلکہ تمام انبیاء کی دعوت ہے۔ تمام رسولوں اور اُن کے صحیفوں کی تصدیق کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم یہ ہو کر حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک جتنے سچے مذاہب خدا کی طرف سے آئے وہ سب ایک تھے۔ چنانچہ قرآن اسی کا اعلان کرتا ہے۔ اسلام اسی دین کا نام ہے جو حضرت آدم علیہ السلام سے جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک باری باری پیغمبروں کے ذریعے ایک خدا کی جانب سے بذریعہ جبریل اترتا رہا ہے۔ اور انسانوں کو اس کی تعلیم دی جاتی رہی۔ مطلب یہ ہے کہ اصل میں دین ایک ہی ہے جو تمام انبیاء کا دین رہا لیکن وہ بعد کو ان کے پیروکاروں کی کتابوں میں تحریف و تصرف کی وجہ سے بگڑتا رہا اسی دینِ ازلی کو لے کر جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آئے اسی کا نام اسلام ہے۔ جو اپنے صحیفہ کے بقاء و حفاظت اور دین کی تکمیل اور نبوت کے اتمام کی وجہ سے ہمیشہ قائم و باقی رہے گا۔ اسی لیے قرآن بار بار تصدیق کو بنیاد بنا کر یہودیوں اور عیسائیوں کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ دوسری بات جو قرآن نے اپنے تعارف میں یہاں پیش کی ہے وہ یہ ہے کہ قرآن انسانی زندگی کو سعادت اور فلاح کی راہ بتانے والی کتاب ہے۔ قرآن کا یہ دعویٰ نہیں ہے کہ وہی ہدایت ہے اور اس کے سوا سب ضلالت ہے بلکہ یہ دعویٰ ہے کہ وہ ایک کامل ہدایت ہے اور بقیہ ادیانِ سابقہ موجودہ حالت میں ناقص ہیں یعنی وہ ابدی اور کامل ہدایت جس کی منادی سب انبیاء کرتے رہے اسے جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آخری نبیؐ کی حیثیت سے تشریف لائے اب یہ ہدایت ہمیشہ کامل رہے گی اور اہلِ ایمان کو ان کے اعمالِ نیک کی بشارت دیتی رہے گی۔

۲۶۵۔ اللہ، اللہ کے رسول، اللہ کے فرشتے اور فرشتوں میں جبریل و میکائیل، ان میں سے کسی ایک کی دشمنی سب کی دشمنی ہے یعنی اللہ کے رسولوں کی دشمنی اللہ کی دشمنی ہے۔ فرشتوں سے دشمنی بھی اللہ سے دشمنی ہے اور وہ سنگین کفر ہے جس کی عداوت کا اللہ نے یہاں اعلان کیا ہے۔

وَلَقَدْ أَنْزَلْنَآ إِلَيْكَ آيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ ۚ وَمَا يَكْفُرُ بِهَآ إِلَّا الْفٰسِقُوْنَ ﴿٩٩﴾ أَوَكُلَّمَا عٰهَدُوْا عَهْدًا نَّبَذَهٗ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ ۚ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿١٠٠﴾

اور ہم نے اے پیغمبر تمہاری طرف سچائی کی روشن آیات[۲۶۶] اتاری ہیں۔ اور ان کا کوئی انکار نہیں کر سکتا مگر صرف وہی لوگ جو[۲۶۷] فاسق ہیں۔ کیا ان کی تاریخ یہ نہیں ہے کہ کفران کی سرشت ہے اور جب[۲۶۸] بھی انہوں نے کوئی عہد کیا تو ان میں سے ایک گروہ نے اُسے پس پشت ڈال دیا اور حقیقت یہ ہے کہ ان کی اکثریت ایسی ہے جو نعمتِ ایمان سے محروم ہے۔

عہد شکنی کی عادت

روشن اور واضح دلائل جواب تک پیش کیے جا چکے ہیں ان کا انکار کوئی سلیم الفطرت انسان کر نہیں سکتا۔ ان روشن اور صاف دلائل کے باوجود بھی اگر یہ نہیں مانتے تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ آپ کی جانب سے ثبوت میں کوئی کمی ہے بلکہ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ ان کی طبیعتیں بے ایمانی، نافرمانی اور عہد شکنی کی عادی ہو چکی ہیں اور شرائع ربانی سے بغاوت ان کی طبیعتوں کا تقاضا بن چکا ہے۔ اب جو کچھ قرآن اور نبوت کے مقابلے میں یہ کافرانہ طرزِ عمل اختیار کر رہے ہیں اسی اُفتادِ طبع کے نتیجے میں کر رہے ہیں۔

۲۶۶ ۔ ہم نے تمہاری طرف روشن آیات نازل کی ہیں۔ آیات سے مراد آیاتِ تشریعی ہیں یعنی قرآن کی آیات اور روشن ہونے سے مراد یہ ہے کہ یہی ایک کتاب الٰہی ہے جو قانون و شریعت بھی ہے اور اخلاق و موعظت بھی۔ مخاطباتِ قلبی اور دعاؤں کا گنجینہ بھی اور پہلی تمام آسمانی کتابوں کی مجموعی صفتوں کی حامل بھی، خطابت بھی ہے اور استدلال و فکر بھی، اظہارِ غیب اور پیش گوئیوں سے لبریز بھی ہے اور دقائقِ حکمت و اسرارِ ایمان و عمل سے معمور بھی۔ اصولِ قانون، مبادیٔ اخلاق اور محاسن علم و عمل کا غلغلہ اس کی آیات کے ہر گوشہ سے بلند۔ اس سے زیادہ روشن اور کس کتاب کی آیات ہو سکتی ہیں۔ تورات قانون ہے لیکن اخلاق و موعظت نہیں ہے۔ انجیل اخلاق و موعظت ہے لیکن قانون نہیں ہے۔ زبور مخاطباتِ قلبی اور دعاؤں کا مجموعہ ہے لیکن دیگر صفات سے خالی۔ یہ صرف قرآن ہے جس کی آیات میں ہر پہلو کے لیے

وضاحت اور روشنی ہے، اس کے دلائل میں قوت ہے۔ اس کا جواب لانے کی دُنیا میں کسی کو طاقت نہیں ہے۔ ان آیاتِ بینات کا کوئی سلیم الفطرت انسان تو انکار نہیں کر سکتا ہے صرف وہی لوگ انکار کر سکتے ہیں جو قانونِ الٰہی کے توڑتے رہنے اور شرائع ربانی کی بغاوت کے خوگر ہو چکے ہیں ۔

حافظ ابن جریرؒ لکھتے ہیں کہ اے اللہ کے پیغمبر ہم نے آپ کی نبوت کے روشن دلائل آپ پر اتارے ہیں یعنی یہ کہ قرآن کی آیات میں ان تمام علوم کا ذخیرہ سمو دیا ہے جو یہودیوں کا سرمایۂ علم ہے۔ بنی اسرائیل کے گزشتہ احوال و وقائع اور وہ تمام حالات جن سے صرف یہودی علماء ہی باخبر تھے اور کتابِ الٰہی میں یہودی علماء کے تصرفات اور تحریفات سے قرآن نے آپؐ کو باخبر کیا ہے۔ ان کو سن کر ہر منصف مزاج انسان کے لیے یارائے تسلیم کے بغیر چارہ نہیں ہے۔ ان آیات کا ایک اُمّی سے سُن کر تصدیق نہ کرنا اور اس کی نبوت کو نہ ماننا جو اُمیوں ہی کی گودوں میں پلا اور پل کر جوان ہوا۔ اس نے ہوش سنبھالا تو گرد و پیش میں تاریکیوں اور ظلمتوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ علوم و فنون اور تہذیب و تمدن سے ایک عاری شہر اور عاری خاندان اور اس کے تمام وطن نوشت و خواند سے ناآشنا تھے۔ گزشتہ صحفِ انبیاء اور افکارِ عالیہ کا ایک حرف اس کے کان میں کبھی نہیں پڑا۔ علماء اور دانش وروں کی صحبت اس نے نہیں اُٹھائی۔ اُصولِ قانون اور مبادی اخلاق کی کوئی ظاہری تعلیم اس کو نہیں ملی۔ اس طرح وہ اپنی زندگی کے چالیس برس پورے کرتا ہے کہ دفعتًہ غارِ حرا میں علمِ نبوت اور علمِ قرآت کی تکوین ہوتی ہے اور غار کے دہانے سے باہر علوم و فنون اور تہذیب و تمدن کا چشمہ اُبلتا ہے۔ ظاہری نوشت و خواند کے نقوش و حروف کا طلسم ٹوٹ جاتا ہے صحفِ انبیاء اور افکارِ عالیہ کے اوراق اس کی زبان پر جلوہ گر ہو جاتے ہیں۔ ان کی اس روشنی میں اگر کسی کو حق نظر نہیں آتا ہے تو وہ آنکھوں کا اندھا ہے۔ غالبًا اسی بات کو سمجھانے کے لیے آیاتِ بینات سے پہلے الیک (تیری طرف) پر زور دیا ہے ۔

۲۶۷ - وہی لوگ فاسق ہیں۔ قرآن کا چہرہ اور قرآنی آیات کا مقام بتانے کے بعد اب اس آیت میں یہودیوں کے انکار کی وجہ پیش کرتے ہیں کہ اس کے باوجود اگر وہ نہیں مانتے تو یہ کفر و جحود کا ان کی جانب سے کوئی نیا مظاہرہ نہیں جس پر حیرت کی جائے۔ اس سے پہلے بھی اُن کا طرزِ عمل یہی رہ چکا ہے۔ اُن کی پوری تاریخ غداری، عہد شکنی، نافرمانی، سرکشی کی ایک مستقل تاریخ ہے۔ تورات کے صفحات اور انجیل کے ورق اسی سرگزشت سے لبریز ہیں۔ یہاں بتایا کہ انکار تو وہی کرتے ہیں جن کی بار بار کی نافرمانیوں او[illegible] [illegible]ں آنکھوں سے ہدایت کا نور بجھ چکا ہے۔ اور طبیعت میں حق کی طلب اور صداقت کی تلاش باقی نہیں رہی بلکہ اس کے برعکس باطل اور ضلالت پر جمود نمایاں ہو گیا۔ اس کا

انجام کفر کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے وما یکفر بھا الا الفاسقون۔ فاسق نافرمان اور طاعت سے نکل جانے کو کہتے ہیں قرآن کا عام اسلوب بیان یہ ہے کہ کوم اللہ سبحانہٗ کے ٹھہرائے ہوئے قوانین واسباب کو اسی انداز سے پیش کرتا ہے۔ مثلاً اس کا قانون یہ ہے کہ جو لوگ سمجھ بوجھ سے کام لینے کی جگہ رسُوم کے دلدادہ ہوتے ہیں اور ہر بات کو رسُوم کے پیمانے سے ناپتے ہیں اور اسی پر اڑے رہتے ہیں رفتہ رفتہ اُن کا نورِ قابلیت ختم ہو جاتا ہے اور ان کی عقلیں ماری جاتی ہیں۔ کتنی ہی صاف بات کہی جائے اُن کی سمجھ میں نہیں آتی۔ کتنی ہی ان کی بھلائی چاہو وہ اور زیادہ مخالفت کرتے ہیں۔ قرآن اس حالت کو فسق سے تعبیر کرتا ہے اور اس کی بنا پر کفر کا پیدا ہونا، ضلالت کا آنا اور ہدایت سے محروم ہو جانا اللہ کے ٹھہرائے ہوئے قانون کا قدرتی نتیجہ ہے جب کبھی کوئی یہ چال چلتا ہے اللہ کا مقررہ قانون مؤثر ہو کر اسے اپنے مقام پر پہنچا دیتا ہے۔

اسی بات کو حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے خالص علمی انداز میں اس طرح سمجھایا ہے۔

ہر فعل اپنی تاثیر کے لیے ایک فاعل یعنی مؤثر اور ایک مفعول یعنی متاثر چاہتا ہے اور متاثر وہی ہو سکتا ہے جس میں اثر پذیری کی قابلیت ہو۔ ہاں یہ ہوتا ہے کہ جیسے فاعل میں قوتِ تاثیری کم اور زیادہ ہوتی ہے ایسے ہی مفعول میں باعتبار اثر پذیری یعنی قابلیت قبول کم اور زیادہ ہوتی ہے۔ اور جیسے مفعول میں قابلیت نہ ہونا فاعل میں قوتِ تاثیر کے نہ ہونے کا سبب نہیں ہے۔ ٹھیک ایسے ہی فاعل میں تاثیر نہ ہونا مفعول میں قابلیت نہ ہونے کا سبب نہیں ہوتا ہے۔ اسے ایک مثال سے سمجھئے۔ روشنی پہنچانے میں آفتاب مؤثر ہے اور اس کے سامنے آئینہ ہو تو وہ متاثر ہے۔ آفتاب فاعل اور آئینہ مفعول ہے اور دونوں میں اثر اندازی اور اثر پذیری کی پوری قابلیت موجود ہے لیکن اگر آفتاب کے سامنے آئینہ نہیں بلکہ توا ہو یا پتھر تو آفتاب کی قوتِ فاعلی میں کوئی نقصان نہیں لیکن پتھر اور توے میں نورِ آفتاب سے اثر پذیری کی قابلیت نہیں۔ اسی طرح سمجھ لیجئے آفتابِ نبوت اور قرآن کی قوتِ فاعلی میں کوئی نقصان نہیں ہے وہ تو آیاتِ بیّنات کی صورت میں چمک رہی ہیں لیکن اس آفتاب کے سامنے پتھروں سے زیادہ سخت دل ہیں۔ ان میں قساوت، عدوان اور سرکشی کی وجہ سے یہ قابلیت نہیں ہے کہ آفتابِ نبوت کے انوار سے فیضیاب ہوں۔ قرآن میں ایسے تمام مقامات پر جہاں فاسقین کے لیے ضلالت، ہدایت کی محرومی، کفر، افتراء ثابت کیا گیا ہے وہاں یہی بتانا مقصود ہے کہ ان کے اندر کی روشنی بجھ چکی ہے مثلاً ما یضل بہ الا الفاسقین اور لا یکفر بھا الا الفاسقون اور ان اللہ لا یرضیٰ عن القوم الفاسقین اور واللہ لا یھدی القوم الفاسقین۔

۲۶۸ ۔ اور جب بھی انہوں نے کوئی عہد کیا۔ قرآن میں دوسری جگہ اس بات کو ان قوموں کے بارے میں جنہوں نے انبیاء کی تکذیب کی ایک ضابطہ عام کی صورت میں اس طرح پیش کیا ہے ۔

وَمَا وَجَدْنَا لِاَكْثَرِهِمْ مِّنْ عَهْدٍ وَاِنْ وَّجَدْنَا اَكْثَرَهُمْ لَفٰسِقِيْنَ ٥

ہم نے ان میں سے اکثر میں پاسِ عہد نہیں پایا اور ہم نے ان میں سے اکثر کو فاسق ہی پایا ہے ۔

ان کی عادت قدیم ہے کہ جب اللہ یا رسول یا کسی شخص سے کوئی عہد مقرر کرتے ہیں تو ان ہی میں ایک جماعت اس عہد کو پسِ پشت ڈال دیتی ہے بلکہ بہت سے یہودی ایسے ہیں جو تورات پر ایمان ہی نہیں رکھتے ہیں ایسے کو عہد شکنی میں کیا باک ہو سکتا ہے[1]

یہاں عہد سے مراد وہ عہد ہے جو بنی اسرائیل نے تورات پر عمل کرنے کا اللہ سے یکے بعد دیگرے کیا تھا۔ یا وہ عہد مراد ہے جو یہودی مدینہ کی زندگی میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے کرتے رہے اور قدم قدم پر غداری اور بدعہدی کرتے رہے ہیں۔ یا عام زندگی میں جو وعدہ اور عہد کسی سے کرتے ہیں اس کو پورا نہیں کرتے۔ مطلب یہ ہے کہ ان کی پوری تاریخ گواہ ہے کہ غداری اور بدعہدی ان کا قومی نشان بن کر رہ گیا ہے۔ فاسقانہ زندگی کا عہد شکنی ایک ناگزیر نتیجہ ہے۔ جب زندگی میں نافرمانیاں اور اللہ سے سرکشی رونما ہو جاتی تو عبادت کا عہد، طاعت کا عہد اور ایمان کا عہد سب ختم ہو کر رہ جاتے ہیں۔ یہاں عہد کی تنکیر بتاتی ہے کہ ہر قسم کے عہد میں یہود کی غداری بتانی پیشِ نظر ہے۔ بتانا یہ ہے کہ جب بھی کوئی عہد من حیث الجماعت کرتے ہیں خواہ یہ سیاسی ہو یا اقتصادی، جنگی ہو یا معاشی۔ ان کی ایک جماعت اس کی دھجیاں اڑا دیتی ہے اور غداری کرتی ہے۔ عہد و میثاق کے معاملہ میں سب سے زیادہ اہم اور سب سے زیادہ نازک معاملہ جماعتوں کے معاہدوں کا ہے اور اسی میں اس کی آزمائش ہے ان میں بحیثیتِ قوم عہد شکنی اور بدمعاملگی بڑی دانشمندی سمجھی جاتی تھی ۔

آیت میں لفظ فریق سے یہ وہم ہوتا تھا کہ تھوڑے نے عہد شکنی کرتے ہوں گے اس لیے فرمایا نہیں بلکہ ان کی اکثریت ایمان نہیں رکھتی تھی ـــــ اور اگر مطلب یہ ہے کہ اس بنا پر ان کی اکثریت ایمان نہ لائے گی تو یہ قرآن کی پیش گوئی ہے۔ یہ امر واقعہ ہے کہ یہودیوں سے بہت کم حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے ہیں ۔

یہاں یہودیوں کے بارے میں بات کے خاتمہ پر ان کی بے ایمانی پر لا یؤمنون کہہ کر اعلان

---

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۱۹

وَلَمَّا جَاءَهُمْ رَسُولٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ نَبَذَ فَرِيقٌ مِّنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتٰبَ ۙ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَاءَ ظُهُورِهِمْ كَأَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ﴿١٠١﴾

اور دیکھو جب اُن کے پاس اللہ کی جانب سے عظیم الشان پیغمبر[269] اس کتاب کی تصدیق[270] و تائید کرتا ان کے پاس آیا تو اُن لوگوں[271] میں سے جن کو کتاب دی گئی تھی ایک گروہ نے کتابِ الٰہی کو اس طرح پسِ پشت ڈال دیا گویا وہ اسے جانتے ہی نہیں ہیں۔

کرنے کی ضرورت اس لیے پیش آئی ہے کہ یہودیوں نے سب سے زیادہ اہمیت زندگی کی رسموں اور رواجوں کو دے رکھی تھی۔ قرآن نے یہاں اسی طرف اشارہ کیا ہے کہ ایفائے عہد تو درکنار ان میں سے اکثریت یہی نہیں مانتی کہ کبھی اطاعت کا عہد و پیمان بھی ہوا تھا۔ گویا ایمان لا یؤمنون اپنے اصطلاحی معنے میں نہیں لغوی معنے میں ہے اور اگر اصطلاحی معنے میں ایمان ہو تو فقرے کا مطلب یہ ہوگا کہ ان لوگوں کی اکثریت دینی کتابوں پر ایمان نہیں رکھتی ہے۔ حاصل دونوں کا یہی ہے کہ ان میں پاسِ عہد نہیں ہے۔ حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے تو یہاں یہودیوں کی تین بستیاں تھیں۔ بنی قینقاع، بنی نضیر اور بنی قریظہ۔ حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے صلح و امن اور باہم دیگر اعانت کا معاہدہ کیا۔ معاہدہ کی ایک شرط یہ تھی کہ تمام جماعتیں متحد ہو کر رہیں گی اور کسی فریق پر اس کا دشمن حملہ آور ہوگا تو سب اس کی مدد کریں گے[1] ——— ابھی معاہدے کی سیاہی خشک نہیں ہوئی تھی کہ یہودیوں نے خلاف ورزی شروع کردی اور قریشِ مکہ سے مل کر مسلمانوں کی تباہی کی سازشیں کرنے لگے۔ قرطبی نے حضرت عطاء کے حوالہ سے بتایا ہے کہ اس آیت میں ان ہی معاہدات کا ذکر ہے۔

---

[1] سیرت ابنِ ہشام

نبوتِ محمدیہ اور یہود کی عہد شکنی

پہلی آیت میں ان کی عام زندگی میں عہد شکنی کا ذکر تھا۔ اس آیت میں اس خاص عہد شکنی کی نشاندہی کی جا رہی ہے جس کا تعلق نبوتِ محمدیہ سے ہے۔ تورات میں جہاں اللہ نے ان سے دوسرے عہد لیے تھے ایک خاص عہد یہ بھی لیا تھا کہ وہ اللہ کی جانب سے آنے والے رسول کی مدد کریں گے۔ اور اس کا احترام کریں گے۔ بلکہ آپ کی پیشین گوئی، علامتیں اور آپ پر ایمان لانے کی تاکید تورات میں درج تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی زندگی کی آخری وصیت جس پر اُن کی تورات اور اُن کے صحیفہ حیات دونوں کا خاتمہ ہو جاتا ہے بنی اسرائیل کو یہ فرمائی:

یہ وہ برکت ہے جو موسیٰ مردِ خدا نے اپنے مرنے سے پہلے بنی اسرائیل کو بخشی اور اس نے کہا کہ خداوند سینا سے آیا اور سعیر سے ان پر طلوع ہوا، اور فاران کے پہاڑ سے وہ جلوہ گر ہوا۔ دس ہزار مقدسوں کے ساتھ آیا اور اس کے داہنے ہاتھ میں ایک آتشیں شریعت ان کے لیے تھی۔ ہاں وہ اپنے لوگوں سے بڑی محبت رکھتا ہے۔ اس کے سارے مقدس تیرے ہاتھ میں ہیں اور وہ تیرے قدموں کے پاس بیٹھے ہیں اور تیری شریعت کو مانیں گے۔ (استثناء ۳۳-۱-۲-۳)

یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا آخری کلام ہے جس میں آخری نبوت کی خبر دی گئی ہے۔ بہرحال تورات میں اس قسم کی بشارتیں اور بھی موجود ہیں۔ (دیکھو استثنا ۱۸-۱۷ اور ۲۲-۲۱ وغیرہ)

۲۶۹ - آیت میں رسول سے مراد حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ ابن جریرؒ رقمطراز ہیں، جب عُلمائے یہود کے پاس حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے۔ ابن کثیرؒ، قرطبیؒ بھی ابن جریرؒ کے ہم زبان ہیں کہ رسول سے مراد حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی ہے۔

رسول سے مراد حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ما معھم سے تورات اور کتاب اللہ سے بھی تورات ہی مراد ہے۔ یعنی جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے حالانکہ وہ تورات کے معتقد تھے تو یہودیوں کی ایک جماعت نے خود تورات کو پسِ پشت ڈال دیا کہ گویا جانتے ہی نہیں ہے کہ یہ کیا کتاب ہے اور اس میں کیا کیا حکم ہیں لہٰذا جب اُن کا اپنی کتاب ہی پر ایمان نہیں ہے تو ان سے اور کیا توقع ہو سکتی ہے۔[1]

---

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۱۹

۲۷۰ ـ پہلی آیت میں تصدیق و تائید قرآن کے تعارف میں آئی تھی اور یہاں یہی بات نبوت کی تعریف میں دُہرائی گئی ہے۔ یعنی یہ پیغمبر تمہارے خدا کی جانب سے آئے ہوئے علمی سرمایہ کی تصدیق و تائید کے لیے آئے ہیں۔ اس کے مختلف مطلب ہو سکتے ہیں۔

ایک یہ کہ میری تعلیم تمہارے نوشتوں کے خلاف نہیں ہے بلکہ سرتاسر مصدق و مؤید ہے۔ اس لیے تمہیں میری دعوت کو قبول کر لینا چاہیے۔

دوسرے یہ کہ تمہارے مقدس نوشتوں میں پیغمبر آخرالزمان کے آنے کی خبر دی گئی ہے اور اس کی علامات بتائی گئی ہیں۔ میری آمد تمہارے مقدس نوشتوں میں اس پیش کی ہوئی خبر کی عملی تصدیق و تائید ہے۔ گویا اب تک تورات میں جو بات ایک نظریہ تھی میری آمد اسی نظریہ کی عملی شہادت ہے تمہیں تو خوش ہونا چاہیے کہ میری آمد سے تمہاری کتاب کی تصدیق ہو گئی۔

تیسرے یہ کہ میرا یہ کہنا کہ تورات اللہ کا وہ کلام ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اترا۔ یہ میری جانب سے تورات کے کلامِ الٰہی ہونے کی تصدیق ہے۔

چوتھے یہ کہ دین کے جو اصول اور توحید کے جو ضوابط تورات میں پیش کیے گئے ہیں میں ان کا منکر نہیں بلکہ مصدق و مؤید ہوں۔

سوال یہ ہے کہ اللہ کی جانب سے جب ان کے پاس عظیم الشان رسول آیا جو ان کی کتاب تورات کا منکر نہیں بلکہ مصدق و مؤید تھا تو اُن لوگوں نے کیا کیا؟ قرآن نے اسی سوال کا جواب آگے دیا ہے۔

۲۷۱ ـ اُن لوگوں نے کتابِ الٰہی کو پس پشت ڈال دیا۔ اصل ارشاد میں نبذ آیا ہے۔ عربی میں پھینکنے اور ڈالنے کو نبذ کہتے ہیں۔ اسی سے اُفتادہ بچے کو منبوذ کہتے ہیں۔ اور جب پانی میں کھجور یا کشمش ڈال دی جائے تو اُسے نبیذ کہتے ہیں۔ ابنِ کثیرؒ نے ابوالاسود کا ایک شعر اس کی تائید میں پیش کیا ہے۔

نظرت الی عنوانہ فنبذتہ کنبذک نعلاً اخلقت من نعالکا

مطلب یہ ہے کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تورات کی بشارتوں کے مطابق تشریف لائے تو ان کینہ پرور یہودیوں نے اس حسد میں کہ نبوت بنی اسماعیل میں کیوں آئی ہے خود تورات کے احکام کو ہی پس پشت ڈال دیا۔ اور طرہ یہ ہے کہ اسے کتاب اللہ جانتے ہوئے اور خود اہلِ کتاب ہوتے ہوئے انہوں نے یہ کام کیا۔ پس پشت ڈالنے کا یہاں یہ مطلب نہیں ہے کہ انہوں نے تورات کے کتاب اللہ ہونے کا انکار کر دیا تھا یا ساری تورات سے بے رُخ ہو گئے

وَاتَّبَعُوا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ ۚ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ
الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ ۗ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ
هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ ۗ وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَآ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ ۗ
فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ ۗ وَمَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ
اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۗ وَيَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ ۗ وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ
مَا لَهٗ فِى الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ۗ وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ ۗ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿١٠٢﴾

اور کتاب اللہ کی پیروی چھوڑ کر اُن غیروں کے پیروکار بن گئے جو شیاطین[۲۷۲] سلیمانؑ کے دورِ حکومت کا نام لے کر پیش کرتے تھے حالانکہ سلیمانؑ[۲۷۳] نے کفر نہیں کیا بلکہ کفر کے مرتکب[۲۷۴] تو شیاطین تھے جو لوگوں کو جادوگری[۲۷۵] کی تعلیم دیتے تھے۔ اور وہ پیروکار بن گئے ان چیزوں کے جو بابل میں ہاروت اور ماروت نامی دو فرشتوں پر اتاری گئیں۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ وہ جو کچھ بھی کسی کو بتلاتے تھے یہ کہہ کر بتلاتے تھے کہ ہمارا وجود تو ایک آزمائش ہے تم کفر میں مبتلا نہ ہو۔ اس کے باوجود لوگ اُن سے وہ عمل سیکھتے تھے جن کے ذریعے شوہر اور بیوی میں جدائی ڈال دیں حالانکہ وہ اللہ کے حکم کے بغیر کسی شخص کو نقصان نہیں پہنچا سکتے تھے لیکن اس کے باوجود ایسی باتیں سیکھتے ہیں جو ان کو سرتاسر نقصان رساں ہیں اور کسی درجہ میں ان کے حق میں نفع بخش نہیں ہیں اور ان کو خوب معلوم ہے کہ جو شخص کتابِ الٰہی چھوڑ کر جادو کا خریدار بن جاتا ہے اس کے لیے آخرت کی زندگی میں کوئی حصہ نہیں[۲۸۱] ہے۔ افسوس ان کے اس کاروبار پر کتنی بُری ہے وہ متاع جس کے عوض انہوں نے اپنے آپ کو بیچ ڈالا۔ کاش اُن کو حقیقتِ حال کا علم ہوتا۔

تھے بلکہ مطلب یہ ہے کہ انہوں نے تورات کی ان آیات کو جن میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کی بشارتیں تھیں، آپؐ کی علامات تھیں، آپؐ پر ایمان لانے اور آپؐ کی پیروی کا حکم تھا پس انداز کر دیا تھا۔ یہاں ان آیات کے عملی تقاضے پورے نہ کرنے کو اس شخص سے تشبیہہ دی ہے جو کسی چیز کو پس پشت ڈال دیتا ہے اور اس سے بے رُخ ہو جاتا ہے۔ اس طرح دلوں سے وحی کا احترام اٹھ جاتا ہے اور انسان دلیر ہو جاتا ہے اور کتاب اللہ کے ساتھ ان کا معاملہ یہ ہو گیا کہ گویا وہ کتاب الٰہی کو جانتے ہی نہیں ہیں " کانھم لا یعلمون " یعنی انہوں نے اسے اس طرح پس پشت ڈالا ہے کہ گویا ان کو یہ پتہ نہیں ہے کہ یہ اللہ کی کتاب ہے۔ کتاب اللہ سے ان کی بے رُخی اور بے توجہی پر طنز مقصود ہے ایسے ہو گئے جیسے ان کو خبر ہی نہیں ہے کہ یہ اللہ کا حکم ہے اور اللہ کی کتاب ہے۔ اس انداز بیان میں بھی ایک لطیف اشارہ ہے کہ اگر کوئی شخص طبیعت کی غلط اُفتاد سے یا ماحول کے دباؤ سے یہ جانتے ہوئے کہ یہ اللہ کا حکم ہے نافرمانی کا کوئی قدم اٹھا لیتا ہے تو اس سے واپسی کی توقع ہوتی ہے کہ جب طبیعت کی اُفتاد صحیح ہو گی توبہ کے لیے آمادگی رونما ہو جائے گی۔ لیکن اگر ایک شخص اصل سے ہی بے خبر ہو جائے اور کتاب الٰہی کو کتاب الٰہی نہ جانے تو پھر اس سے واپسی کی کوئی توقع نہیں ہے۔ اس کی حیثیت بالکل اس گنہگار کی ہے جو گناہ کو نیکی کا لباس پہنا کر کرے۔ جیسے اس کو گناہ سے توبہ کی توفیق نہیں ہوتی ایسے ہی اس شخص کو بھی کسی کتاب الٰہی پر عمل کی توفیق نہ ہو گی جو کتاب کو کتاب اللہ ہی نہیں جانتا ہے۔

کتاب اللہ کو چھوڑ کر جادوگری سے دلچسپی

جب یہودیوں پر اخلاقی و مادی انحطاط کا دور آیا اور غلامی، جہالت، نکبت و افلاس اور ذلت و پستی نے اُن کے اندر کوئی بلند حوصلگی، اور اولوالعزمی باقی نہ چھوڑی تو اُن کی توجہات جادو ٹونے، اور طلسمات و نیرنجات عملیات اور تعویذ گنڈوں کی طرف مبذول ہونے لگی۔ اور بجائے اللہ کی کتاب کے ان کے فکر و نظر اور ان کے مطالعہ و جستجو کا مرکز یہ چیزیں بن گئیں۔ وہ ایسی تدبیریں ڈھونڈنے لگے جن سے کسی مشقت کے بغیر محض ٹونوں، ٹوٹکوں، پھونکوں اور منتروں کے زور سے سارے کام بن جائیں۔

اس دورِ انحطاط میں ایسی تخصیصوں کی ہمیشہ اُمتوں میں رونمائی ہو جاتی ہے جو بقول علامہ اقبال انحطاط خویش را تہذیب گفت۔ انحطاط کی ساری صورتوں کے لیے حسین لبادے تلاش کر لیے ہیں چنانچہ

ان ہی شیطانی ہستیوں نے معاشرے میں اپنے کردار کی یہ توجیہ پیش کی کہ سلیمان علیہ السلام کی حکومت کا سارا کاروبار اور اُن کی تمام حیرت انگیز طاقتیں، جادو، منتر اور نقش کا نتیجہ تھیں۔ قوم کی قوم بہکاتے میں آگئی اور نعمتِ غیر مترقبہ سمجھ کر ان چیزوں پر ٹوٹ پڑے۔ پھر نہ کتاب اللہ سے ان کو کوئی دلچسپی رہی اور نہ کسی داعی کی آواز کا ان پر کوئی اثر ہوا۔ گویا اب قرآن نے یہود کے فردِ جرم میں ایک اس عنوان کا بھی اضافہ کر دیا کہ یہ لوگ وحئ الٰہی کی اتباع کی جگہ ایک دوسرے سفلی علم پر فریفتہ ہو گئے اور اس ضمن میں قرآن بعض اہم تاریخی اور علمی حقیقتوں کو خاص طور پر پیش کر رہا ہے۔ فنِ سحر و کہانت یہود کی تاریخ میں مسلّم ہے۔ ان کے اکابر اور مشاہیر اس کا برابر اعتراف کرتے آئے ہیں۔ پروفیسر مارگولیند آنجہانی اپنی انگریزی سیرتِ رسولؐ میں یہودِ مدینہ کے بارے میں رقم طراز ہے کہ یہ لوگ فنِ سحر کے ماہر تھے اور بجائے میدانِ جنگ میں آنے کے سفلی عملیات کو ترجیح دیتے تھے۔

۲۷۲

۵۔ ان چیزوں کے پیروکار بن گئے جو شیطان سلیمان کے دورِ حکومت کا نام لے کر پیش کرتے تھے۔

شیاطین سے شیاطین الانس اور شیاطین الجن دونوں مراد ہو سکتے ہیں۔ امام محمد بن جریر طبریؒ فرماتے ہیں کہ عربی زبان میں ہر سرکش شیطان ہے۔ جنات میں سے ہو یا انسانوں میں سے یا چوپایوں میں سے ہو غرض ہر شے سے شیطان ہو سکتا ہے۔

اس کے بعد قرآن نے شیاطین کا یہ کردار پیش کیا کہ وہ سلیمان کے دورِ حکومت کے بارے میں کچھ افسانے بیان کرتے اصل ارشادِ عربی الفاظ یہ ہیں تتلوا علیٰ ملکِ سلیمان۔ حافظ ابنِ جریرؒ نے یہاں علیٰ کو فی کے معنے میں بتایا ہے لیکن حافظ ابنِ کثیرؒ کو ان کے اس خیال سے اختلاف ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ علیٰ اپنے ہی معنے میں ہے اور معنویت یہ ہے کہ اس کے آنے کی وجہ سے تلاوت میں جھوٹ کے معنے کی جان پڑ گئی ہے اور پورے فقرے کا مطلب ابنِ کثیرؒ یہ بتاتے ہیں کہ یہ یہودی کتاب اللہ سے بے رُخ ہو کر اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت میں سرگرم ہو کر ان افسانوں، کہانیوں اور روایتوں کے پیروکار بنے ہوئے ہیں جو سرکش قسم کے لوگوں نے حضرت سلیمان کے زمانۂ حکومت کے بارے میں بنا رکھے ہیں اور جن کی تاریخ میں کوئی حقیقت نہیں ہے۔ یعنی نبوت کی ہدایات پر چلنے کے بجائے سفلی مشغلوں میں پڑے ہوئے ہیں۔ خبر نہیں لوگ اس سیدھے سادے مطلب کے ہوتے ہوئے علیٰ کو فی کے معنے میں لے کر آیت کا مطلب یہ کیوں بتاتے ہیں کہ یہود کے باپ دادا حضرت سلیمان کے زمانے میں شیطانی مشغلوں میں لگے رہے ہیں۔ حضرت شیخ الہندؒ فرماتے ہیں کہ :

یعنی ان احمقوں نے کتابِ الٰہی تو پسِ پُشت ڈال دی اور شیطانوں سے جادو سیکھا اور ان کی متابعت کرنے لگے[1]

قرطبیؒ نے بھی آیت کا یہی مطلب بتایا ہے کہ یہ ان لوگوں کے بارے میں اللہ سبحانہٗ کی جانب سے انکشاف ہو رہا ہے جو کتابِ الٰہی کو پسِ پشت ڈال کر جادو کے پیچھے پڑ گئے تھے۔

سلیمان علیہ السلام

۲۷۳ سلیمان بن داؤد (۹۹۰ تا ۹۳۹ قبل مسیح) سلسلۂ اسرائیلی کے نامور پیغمبر گزرے ہیں حضرت داؤد کی وفات کے بعد اُن کے جانشین ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے آپ کی ذات بابرکات میں نبوّت اور حکومت دونوں کو مکمل طور پر جمع فرمایا۔ شام و فلسطین کے علاوہ آپ کے حدودِ حکومت مشرق کی سمت میں عراق میں دریائے فرات کے ساحل تک اور مغرب میں سرحدِ مصر تک وسیع تھے۔ آپ کی شوکت و عظمت پر دوست و دُشمن سب کا اتفاق ہے حضرت سلیمان کو نبی ماننے والی دو قومیں اسلام سے پہلے موجود تھیں۔ یہ دونوں یہود و نصاریٰ ہیں۔ ان دونوں کے اکابر نے ستم ظریفی کا کمال یہ دکھایا ہے کہ ایک طرف تو ان کی عظمت اور پیغمبری کے قائل ہیں، دوسری طرف آپ کے نامۂ اعمال میں گندے سے گندے جرائم بھی ڈال دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ کفر و شرک سے بھی اُن کے دامن کو آلودہ کر دیا۔ یہودی قصص و حکایات اور عیسائی آثار و روایات میں نہیں بلکہ بائیبل کے عہدِ عتیق کے صحائف میں یہود اور عیسائی دونوں کا ایمان ہے۔ اس میں یہ تصریحات موجود ہیں؛

۱۔ جب سلیمان بوڑھا ہوا اس کی جوروں نے اس کے دل کو غیر معبودوں کی طرف مائل کر دیا۔ اور اس کا دل اپنے خدا کی طرف کامل نہ تھا۔ (سلاطین ۱۱۔۴۔۹۔۱۰)

۲۔ سو ازبس کہ اس کا دل خداوند اسرائیل کے خدا سے برگشتہ ہوا۔ اس لیے خداوند سلیمان پر غضب ناک ہوا کہ اس نے اسے حکم دیا تھا کہ وہ اپنی معبودوں کی پیروی نہ کرے پر اُس نے اپنے خداوند کے حکم کو یاد نہ رکھا (سلاطین ۱۱، ۹۔۱۰) معاذ اللہ اللہ کا پیغمبر اور کفر و شرک جیسے سنگین جرائم میں مبتلا۔ اللہ اکبر ہزارہا سال تک دُنیا اس معصوم پیغمبر کو یہودیوں کی ان تحریفات کا شکار ہو کر مشرک و کافر سمجھتی رہی۔ یہاں تک کہ قرآن آیا اور اس نے اعلان کیا کہ سلیمان کو کافر کہتے ہو وہ تو کفر کے قریب ہی نہیں گیا ماکفر سلیمان[2]

---

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ [2] تفسیر ماجدی ص، ۴۰

زمانۂ نبوت ہی میں علمائے یہود کو یہ کہتے سُنا گیا جیسا کہ ابنِ جریرؒ اور ابنِ کثیرؒ نے لکھا ہے کہ محمد رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھو کہ سلیمان کو اللہ کے نبی کی حیثیت سے پیش کر رہے ہیں۔ حالانکہ بخدا وہ نبی نہیں وہ تو ایک جادوگر تھا۔ ذہن کی اس گندگی اور عقیدے کے اسی فساد کے جواب میں قرآن نے ماکفر سلیمان کہا ہے۔

ف ۲۷۴۔ بلکہ کُفر کے مرتکب تو شیاطین تھے۔ یہ شیاطین انسان ہوں یا جن۔ قیاس یہی ہے کہ انسانوں کی بات ہو رہی ہے۔ آج بھی یہ سارا کام اگر انسان ہی کر رہے ہیں تو اُس وقت انسانوں کو اس میں کیا تکلف تھا۔ بہر حال کافرانہ کردار شیاطین کا تھا۔ یہ شیاطین اپنے اس کافرانہ کردار کا شجرہ نسب حضرت سلیمانؑ سے ملاتے تھے۔ آج بھی ہم میں جو اس قسم کی خرافاتی بیماریوں میں مبتلا ہیں وہ بھی ان بُرائیوں پر نیکیوں کا چربہ چڑھانے کے لیے ان کی نسبت گزرے ہوئے بزرگوں کی طرف کرتے ہیں۔ اس قسم کی سینکڑوں بُرائیاں ہیں جن کے گناہ کا وزن ہلکا کرنے یا ان کو نیکی کا لباس پہنانے کے لیے ان کا نسب نامہ ہم نے بزرگوں سے ملا رکھا ہے وہ بھی اپنے اس کافرانہ طرزِ عمل کو عوام میں مقبول بنانے کے لیے یہ شہرت دیتے تھے کہ ہم تو جو کچھ کر رہے ہیں ان کی رضامندی اور اُن کے اشارے سے کر رہے ہیں۔

ف ۲۷۵۔ وہ لوگوں کو جادو کی تعلیم دیتے تھے۔ اس فقرے کے ذریعے یہ بات کھول دی کہ اُن کا کافرانہ کردار کیا تھا۔ فرمایا کہ وہ جادو کی تعلیم کا کام تھا۔

سِحر کیا ہے؟ لغت میں سحر کے معنے امرِ خفی اور پوشیدہ چیز کے ہیں۔ چنانچہ صبح کے اوّل وقت کو سحر کہتے ہیں کیونکہ ابھی دن کی روشنی پوری طرح نمودار نہیں ہوتی۔ قدرے تاریکی ہوتی ہے اور علمی اصطلاح میں ایسے عجیب و غریب کاموں کا نام ہے جن کے وجود کے اسباب نظر سے اوجھل ہوں اور بادی النظر میں محسوس نہ ہوتے ہوں۔ امام رازی رقم طراز ہیں۔

لفظ سحر اصطلاحِ شریعت میں ایسی ہر حالت اور کام کو کہتے ہیں جن کا سبب پوشیدہ ہو اور اصل حقیقت کے خلاف نظر آئے۔

سحر کی کچھ حقیقت ہے یا محض نظر کا دھوکا ہے۔ اس کے متعلق جمہور علماء کی رائے یہی ہے کہ سحر واقعی ایک فن ہے اور نقصان دہ اثرات رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمتِ بالغہ اور مصلحتِ کاملہ کے پیشِ نظر اس میں نقصان دہ اثرات رکھ دیے ہیں جس طرح زہر اور دوسری اشیا ہیں۔ یہ نہیں ہے کہ سحر قدرتِ الٰہی سے بے نیاز ہو کر خود مؤثر بالذات ہے۔ لیکن ابوبکر، جصاص رازی، ابو اسحاق السفرائینی، حافظ ابن حزم ظاہری اور معتزلہ کہتے ہیں کہ سحر کی حقیقت شعبدہ، نظر بندی اور فریبِ خیال کے علاوہ اور کچھ نہیں

ہے۔ ایک باطل اور بے حقیقت شے ہے۔

ابوبکر جصاص کہتے ہیں:

جب سحر کو بلا قید بولا جائے تو اس کے معنے دھوکہ، باطل، ملمع کاری اور بے حقیقت چیز کے ہوتے ہیں۔

اور حافظ عماد الدین ابن کثیرؒ فرماتے ہیں:

ابو عبداللہ قرطبی فرماتے ہیں کہ ہمارے نزدیک سحر حقیقت ہے اور اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے معتزلہ اور ابو اسحاق اسفرائنی کا خیال ہے کہ سحر محض فریب نظر اور خیال بندی کا نام ہے۔

علامہ ابن خلدون نے مقدمہ میں یہ تعریف کی ہے۔

استعداد کی ایسی کیفیت جاننے کا نام ہے جس کے برتنے پر انسان عالم عناصر میں اثر انداز ہو سکے۔ اس کی دو صورتیں ہیں۔ کبھی آسمان کے کواکب وغیرہ کی مدد سے ہوتا ہے کبھی بغیر مدد کے۔ پہلے کو سحر اور دوسرے کو طلسمات کہتے ہیں۔

حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں:

سحر کے بارے میں اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ وہ صرف فریب نظر اور بے حقیقت ہے۔ یہ ابوبکر رازی، ابوجعفر شافعی اور ابن حزم ظاہری کا خیال ہے اور نووی کہتے ہیں کہ صحیح یہ ہے کہ سحر میں واقعیت ہوتی ہے۔ جمہور اور عام علماء کا یہی مسلک ہے۔

حافظ ابوحیان اندلسی لکھتے ہیں:

سحر کی حقیقت کیا ہے اس بارے میں مختلف خیالات ہیں۔ اوّل یہ کہ واقعیت اور حقیقت ہے جیسے ہوا میں اڑنا اور ایک رات میں مسافتوں کا قطع کر لینا۔ دوم یہ کہ دھوکہ بازی، بازی گری اور ملمع سازی ہے اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ سوم یہ کہ اس میں حیلہ و تدبیر سے نظر بندی ہو جاتی ہے۔ حیلہ گروں، شعبدہ بازوں میں اس طرح کی چیزیں ہوتی ہیں۔ کتاب الدک والشعوذہ، ایضاح الشک اور کتاب ارخاء الستور میں اس طرح کی چیزیں مذکور ہیں۔

چہارم یہ کہ جنات کی ایک قسم ایسی بھی ہے جو یہ کام کرتے ہیں۔ انہوں نے اسے اپنے جسم کی جنس لطیف اور اس کی کیفیات سے نکالا ہے۔ اسی لیے سحر دقیق، لطیف اور مخفی ہوتا ہے۔

پنجم یہ کہ اس کی ترکیب ان اجسام سے ہوتی ہے جن کو جلایا جاتا ہے اور ان کی راکھ بنا کر ان پر نام اور عزائم پڑھے جاتے ہیں۔ اور پھر جہاں سحر کی ضرورت ہوتی ہے وہاں ان کو استعمال کرتے ہیں۔

ششم یہ کہ اس کی اصل طلسمات اور نیرنجات ہیں جو ستاروں کی خاصیت کی تاثیر پر بنائے جاتے ہیں

جیسے فرعونی لاٹھیوں کے بارے میں دھوپ کی تاثیر تھی۔

ہفتم یہ کہ یہ کلمات کفریہ سے مرکب ہوتا ہے۔ ہمارے ایک معاصر کا بیان ہے کہ یہ سب اقوال جو سحر کی حقیقت کے بارے میں بیان کیے جاتے ہیں سحر کی قسموں میں سے کچھ قسمیں ہیں۔ اس نے ان کے ساتھ دوسرے انواعِ شعبدہ، نیز نیرنجات، اوفاق، عزائم اور رومالوں کا ڈالنا اور اختلال حواس کو بھی شمار کیا ہے[1]

جو علماء سحر کی حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں ان کے درمیان پھر یہ اختلاف رائے ہے کہ کیا واقعی سحر میں یہ تاثیر ہے کہ وہ حقائق اور ماہیات کو تبدیل کردے۔ ایک چھوٹے گروہ کی یہ رائے ہے کہ اس میں انقلاب کی تاثیر ہے لیکن جمہور علماء کا خیال ہے کہ اس میں یہ تاثیر نہیں ہے اور سحر کے ذریعے کسی بھی ماہیت کا انقلاب نہیں ہوسکتا۔ بلکہ اس مرحلہ پر وہ محض نظر بندی اور قوتِ متخیلہ کی شعبدہ بازی کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ چنانچہ حافظ ابنِ حجر اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

لیکن محلِ نزاع یہ بات ہے کہ سحر سے ذات کا انقلاب ہوجاتا ہے یا نہیں۔ جو شخص یہ کہتا ہے کہ یہ محض خیال بندی ہے وہ انقلابِ حقیقت کو نہیں مانتا۔ اور جو سحر کو واقعی اور حقیقت کہتے ہیں وہ اس میں مختلف الخیال ہیں کہ کیا سحر کی تاثیر صرف یہی ہوتی ہے کہ مزاج میں ایسا تغیر پیدا کردے جیسا تغیر بیماری میں ہوجاتا ہے اور یہ بھی ایک بیماری کے درجہ میں ہے یا اس کی تاثیر اس سے زیادہ ہوتی ہے کہ ایک چیز کی حقیقت ہی کو بدل ڈالے مثلاً گھوڑے کو آدمی اور آدمی کو گدھا بنادے۔ جمہور پہلی بات کے مدعی ہیں اور دوسری بات مرجوح ہے[2]

علامہ مرتضیٰ زبیدی نے تاج الدین السبکی کے حوالے سے بتایا ہے کہ سحر، کہانت اور نجوم، رمل، جفر وغیرہ سب ایک ہی ہیں[3]

سحر اور اعجاز میں فرق

یہاں یہ بحث بے حد اہمیت رکھتی ہے اور اس میں اہمیت کی وجہ یہ ہے کہ اگر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ سحر میں واقعیت اور حقیقت ہے تو پھر معجزہ اور سحر میں کیا فرق ہے؟ ایک شخص یہ کیسے اندازہ لگائے کہ یہ نبی اور رسول کا معجزہ ہے یا ساحر کا سحر، اس کی تفصیل کا یہ محل نہیں ہے۔ مباحث میں بہت زیادہ پھیلاؤ ہے۔ حافظ ابن تیمیہؒ نے النبوات میں شیخ محمد سفارینی نے شرح عقیدہ سفارینی میں علمی دلائل

---

[1] البحر المحیط ج ۱ ص ۳۲۷　[2] فتح الباری ج ۱ ص ۱۸۴　[3]

اور براہین کا انبار لگا دیا ہے لیکن موضوع کا تقاضا ہے کہ کچھ مختصر اشارات یہاں پیش کر دیے جائیں۔ تفصیل انشاء اللہ بشرطِ حیات پارہ ۱۶ سورۃ طٰہٰ میں آئے گی۔

بنیادی طور پر یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ سحر بھی من جملہ دیگر فنون کے ایک فن ہے اور جس طرح دُنیا میں دوسرے فنون انسانوں میں وہبی نہیں کسبی ہیں اسی طرح سحر بھی کسبی ہے۔ اور یہ کام بھی ایک فن کار ہی کر سکتا ہے۔ دُنیا میں جس قدر علوم و فنون ہیں قانون و حکمت، اخلاق و موعظت، فلسفہ و کلام، بلاغت و ادب، نثر و نظم، تاریخ و جغرافیہ، سب کسبی ہیں۔ ان میں مہارت اور فنکار بننے کے بعد ہر شخص امام بن سکتا ہے۔ یقیناً ایک قانون داں بیرسٹر قانون پر، ایک حکیم و ڈاکٹر بیماری کے لیے دواؤں پر، ایک نفسیات کا پروفیسر علم النفس کی باریکیوں پر، ایک فلاسفر فلسفہ کے رموز پر، ایک متکلم کلامی موضوعات پر، ایک ادیب بلاغت کے اطوار پر، ایک شاعر عروض قافیہ پر اور ایک مورخ گزری ہوئی دُنیا کے وقائع پر اور بالآخر ایک نجومی، ایک رمّال، ایک جفار اور ایک مسمریزر اپنے اپنے علم کے موضوعات پر اپنے فن کے سہارے اپنی قابلیت کے جوہر دکھا سکتا ہے لیکن معجزہ کو ان سے جو چیز ممتاز کرتی ہے وہ یہ اور صرف یہ کہ

۱۔ معجزہ قدرت کا فعل اور ایک آیت ربّانی ہوتا ہے اور اسباب کی دُنیا سے بے نیاز ہو کر رونما ہوتا ہے۔ ساحر کا سحر اپنا کرتب اور اپنا فن ہوتا ہے۔

۲۔ معجزہ نبی کے اپنے فن تو درکنار اپنے ارادہ کے بھی تابع نہیں ہوتا کہ وہ جب چاہے دکھا سکے۔ برخلاف ساحر کے سحر اور دوسرے فن کاروں کے کہ ان کا سحر اپنے ارادہ کے تابع ہوتا ہے اور اپنے فن میں فنکار ہونے کی وجہ سے جب چاہیں دکھا سکتے ہیں۔

اس لیے نبی کے اعجاز اور ساحر کے سحر میں کوئی اشتباہ اور التباس نہیں ہے۔ معجزہ تو کہتے ہی اس کو ہیں کہ

۱۔ جس کے وجود میں اسباب کا کوئی تعلق نہ ہو۔
۲۔ صاحبِ معجزہ کی اپنی کسی قوت کا اس میں کوئی دخل نہ ہو۔
۳۔ مدعیٔ رسالت اس کے ساتھ یہ دعویٰ کرتا ہو کہ اللہ تعالیٰ یہ کام کر دے گا۔
۴۔ مدعیٔ رسالت اس کو اپنی رسالت کے لیے بطور دلیل پیش کرے۔
۵۔ مقابلہ میں کوئی شخص اس جیسا عمل نہ دکھا سکے۔

اسی بنا پر جب کہنے والوں نے حضرت موسیٰؑ کو فنکار ساحر سمجھا تو ان کا مقابلہ کرنے کے لیے جادو

کے فن کاروں کو بلایا گیا۔ جب ساحرین نے مقابلہ پر یہ جان لیا کہ موسیٰ فن کار نہیں ہیں بلکہ اس کا کارنامہ طاقتِ بشری سے بالا ہے۔ تو وہ فوراً رب موسیٰ و ہارون پر ایمان لے آئے اور اس فیصلہ میں کوئی وقت بھی نہیں لگا۔ اعجاز و سحر کا آمنا سامنا ہوتے ہی دونوں ممتاز ہو گئے اور معلوم ہو گیا کہ یہ فن کاری ہے اور یہ قدرتِ الٰہی کی جلوہ نمائی ہے۔

۲۷۶ - اور پیرو کار بن گئے جو بابل میں ہاروت ماروت دو نامی فرشتوں پر اتاری گئی۔ اس فقرے میں یہ باتیں تشریح طلب ہیں۔

۱۔ بابل کیا ہے؟

۲۔ ہاروت و ماروت کون ہیں؟

بابل ایک عظیم الشان شہر کا نام ہے جو قدیم زمانے میں فرات کے دونوں جانب واقع تھا اور دریائے فرات اس کے درمیان سے گزرتا تھا۔ آج بھی فرات کے دونوں طرف اس کے کھنڈرات موجود ہیں۔ عراق کا پایۂ تخت یہی رہا ہے۔ موجودہ بغداد سے کوئی ۶۰ میل جنوب میں ہے۔ شہر بہت بڑا تھا۔ رقبہ میلوں کا تھا۔ اپنے زمانۂ عروج میں بڑا سرسبز و شاداب، خوشحال و مہذب و متمدن رہ چکا ہے۔ نہروں، پانی کے نلوں، شاہی قصر و ایوان، زبردست قلعوں کے آثار اب بھی موجود ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں ماہر انجینئروں کی کمی نہ تھی۔ سلطنت کے عروج کا زمانہ ۶۰۰ھ قبل مسیح بتایا جاتا ہے۔ شہر کی خاص شہرت علومِ سحر، سفلی عملیات اور جنتر منتر میں بہت زیادہ تھی۔ اس کی عظمت اور عظمت کے ساتھ اس شہر کی برائیوں اور تباہ کاریوں کا تذکرہ یہودیوں اور عیسائیوں کی کتابوں میں موجود ہے۔ بائیبل میں ہے۔ تیرے سوداگر زمین کے امیر تھے۔ تیری جادوگری سے زمین کی ساری قومیں گمراہ ہو گئیں۔ اور نبیوں، مقدسوں اور زمین کے اور سب مقتولوں کا خون اس میں بہایا گیا (مکاشفہ ۱۸ : ۲۳ - ۲۴) پرانے کتبے اور نوشتے جو دریافت ہوئے ان کی گواہی بھی یہ ہے کہ بابلی مذہب کا خیر و اعظم سحر و کہانت، منتر اور ٹونے ٹوٹکے تھے۔ ایک اور فاضل کی تحقیق ہے کہ یہ سحر پیشہ و کہانت دوست قوم جب ۵۳۸ھ قبل مسیح میں تاجدارِ ایران کے ہاتھوں برباد و منتشر ہوئی تو جہاں جہاں گئی اپنے ساتھ اپنے فنونِ سحر و کہانت کو بھی لیتی گئی۔ تاریخ کا بیان ہے کہ یہ لوگ جہاں بھی گئے اپنے ان علوم کو اپنے ساتھ لیتے گئے۔ ان کی تعلیم دیتے رہے اور ضعیف العقیدہ لوگ ان کو ہاتھوں ہاتھ لیتے گئے۔

ہاروت و ماروت کون ہیں؟ دو فرشتوں کے نام ہیں۔ دونوں اپنی اصلیت کے لحاظ سے فرشتے

تھے۔ لیکن جب ایک غرضِ خاص کے ساتھ انسانوں کے درمیان رہنے بسنے کے لیے روانہ کیے گئے تو ان کی شکل وشباہت، رنگ وروپ، جسم و قالب انسانوں کا دیا گیا اور اُن کی عادتیں اور جذبات بھی بالکل بشری ہوتے[1]

اصل ارشاد میں عربی ملکین ہے۔ اس کو دو طرح سے پڑھا گیا ہے لام کے زبر کے ساتھ اور لام کے زیر کے ساتھ دونوں صحیح ہیں۔ زبر کی صورت میں ملک فرشتے کو کہتے ہیں اور زیر کی صورت میں ملک بادشاہ کو کہتے ہیں۔ یہ دونوں بادشاہ جادوگر تھے۔ حسن بصریؒ کہتے ہیں دو عجمی جادوگر تھے کیونکہ فرشتے سحر سے واقف نہیں ہوتے۔ آئیے اب ارشاد پڑھئے۔ ما انزل علی الملکین ببابل ھاروت و ماروت ایک ترجمہ تو وہی ہے جو آپ پڑھ چکے کہ جو کچھ اتارا گیا دو فرشتوں ہاروت و ماروت پر بابل میں اس صورت میں ما موصولہ ہے اور ہمارے مفسرین کو یہی پسند ہے اور اس کے نتیجہ میں وہ ہاروت وماروت کو آسمانی فرشتہ بتاتے ہیں اور اس کے پسِ منظر کے لیے کچھ توجیہات پیش کرتے ہیں۔

مثلاً یہ کہ جب بابل کی سرزمین میں عملیاتِ سفلہ اور سحری فنون کا زور حد سے بڑھ گیا اور عوام کے ذہن میں ہادیانِ حق انبیائے کرام اور اولیائے صالحین کی حیثیت خلط ملط ہو گئی اور دُنیا کا ہنر، شعبدہ بازوں کی ہو کر رہ گئی تو مشیتِ الٰہی، حکمتِ ربانی نے حق و باطل کے ان دو گروہوں کے درمیان نمایاں فصل و امتیاز کرانے اور لوگوں کی اصلاحِ خیال کی خاطر دو فرشتوں کو انسانی صورت و قالب میں روانہ کیا[2]

یہ بھی بتایا گیا ہے کہ

ایک زمانہ میں جس کی پوری تعیین میں کوئی محققانہ رائے اس وقت سامنے نہیں۔ دُنیا میں اور خصوصاً بابل میں جادو کا بہت چرچا تھا اور اس کے عجیب اثرات کو دیکھ کر جاہلوں کو اس کی حقیقت اور انبیائے کرام کے معجزات کی حقیقت میں اختلاط ہو گیا اور بعض لوگ جادوگروں کو بزرگ، مقدس اور قابلِ اتباع سمجھنے لگے اور بعض لوگ جادو کو نیک کام سمجھ کر اس کو سیکھنے لگے۔ اللہ تعالیٰ نے اس اشتباہ اور غلطی کو دُور کرنے کے لیے بابل میں دو فرشتے ہاروت وماروت روانہ کیے کہ لوگوں کو سحر کی حقیقت اور اس کے شعبوں سے مطلع کر دیں تاکہ اشتباہ جاتا رہے[3]

---

[1] تفسیر ماجدی ص ۱۴۲ لغات القرآن ج ۱ ص ۲۲ [2] تفسیر ماجدی ص ۱۴۱۔
[3] بیان القرآن و معارف م س ص ۲۱۵۔

جس زمانے میں بنی اسرائیل کی پوری قوم بابل میں قیدی اور غلام بنی ہوئی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے دو فرشتوں کو انسانی شکل میں ان کی آزمائش کے لیے بھیجا جس طرح قومِ لوط کے پاس فرشتے خوبصورت لڑکوں کی شکل میں گئے تھے۔ اسی طرح ان اسرائیلیوں کے پاس وہ پیروں اور فقیروں کی شکل میں گئے ہوں گے۔ وہاں ایک طرف انہوں نے بازارِ ساحری میں اپنی دکان لگائی ہوگی۔ دوسری طرف وہ اتمامِ حجت کے لیے خبردار کر دیتے ہوں گے کہ دیکھو ہم تمہارے لیے آزمائش ہیں۔ اپنی عاقبت خراب نہ کرو۔ مگر اس کے باوجود لوگ ان کے پیش کردہ عملیات اور نقوش اور تعویزات پر ٹوٹے پڑتے ہوں گے[1]

یہ دو فرشتے تھے شہر بابل میں بصورتِ آدمی رہتے تھے۔ ان کو علمِ سحر معلوم تھا، جو کوئی طالب اس کا جاتا اوّل اس کو روک دیتے کہ اس میں ایمان جاتا رہے گا۔ اس پر بھی باز نہ آتا تو اس کو سکھا دیتے۔ اللہ تعالیٰ کو ان کے ذریعے بندوں کی آزمائش منظور تھی سو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ایسے علموں سے آخرت کا کچھ فائدہ نہیں ہے بلکہ سراسر نقصان ہے اور دُنیا میں ضرر ہے۔ اور بغیر حکم خدا کے کچھ نہیں کر سکتے اور علمِ دین اور علمِ کتاب سیکھتے تو اللہ کے ہاں ثواب پاتے[2]

یہ تمام داستان اس لیے سنائی گئی ہے تاکہ آپ جان لیں کہ ما انزل علی الملکین میں جو لوگ ما کو موصولہ بتاتے ہیں ان کا موقف کیا ہے؟

آئیے اب ان کی بھی کچھ سُنیے جو آیت میں ما کو موصولہ نہیں بلکہ نافیہ قرار دیتے ہیں وہ ترجمہ اس طرح کرتے ہیں کہ بابل میں ہاروت ماروت نامی شخصوں پر کچھ نہیں اُتارا گیا ہے اور اس صورت میں آیت کا مطلب یہ ہے کہ قرآن یہودیوں کی بُرائی کر رہا ہے کہ انہوں نے کتاب اللہ کو چھوڑ کر ان افسانوں اور روایات کو اپنایا ہے جو شیاطین الانس سلیمانؑ کے دورِ حکومت کے بارے میں من گھڑت اور بناوٹی بیان کرتے اور پیش کرتے ہیں۔ حالانکہ سحر کفر ہے اور سلیمانؑ کا دامن کفر کے دھبے سے پاک ہے نہ اس سحر کی جو شیاطین پیش کرتے ہیں۔ سلیمان کی طرف نسبت درست ہے اور نہ یہ دعویٰ درست ہے کہ سحر اللہ نے دو فرشتوں پر اتارا ہے۔ یہ دونوں باتیں جھوٹ اور غلط ہیں۔ بابل میں بھی یہ شیاطین ہی کام کرتے تھے اور ان کا نام ہاروت و ماروت تھا۔ بلکہ امرِ واقعہ یہ ہے کہ لوگ ان دونوں حضرات سے عملیات سیکھتے تھے۔

علامہ قرطبیؒ فرماتے ہیں کہ آیت میں ما نافیہ ہے اور اس کا عطف ما کفر سلیمان پر ہے۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ یہودی کہتے تھے کہ اللہ نے جبریل و میکائیل کے ذریعے سحر کو نازل فرمایا ہے۔ اللہ نے

[1] تفہیم القرآن ص ۹۸ [2] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۲۰

ان کے اس زعم فاسد کی تردید کی ہے اصل عبارت یوں ہے ماکفر سلیمان وما انزل علی الملکین ولکن الشیاطین کفروا یعلمون الناس السحر ببابل ھاروت وماروت یعنی نہ سلیمان نے کفر کیا اور نہ دو فرشتوں پر سحر اتارا گیا بلکہ یہ کافرانہ کام شیاطین یعنی بابل میں ہاروت ماروت نامی دو شخص کرتے تھے۔ وہ لوگوں کو جادو کی تعلیم دیتے تھے۔ آیت کی یہی بہترین تفسیر ہے اور اس آیت کی تشریح میں اب تک جو کچھ کہا گیا ہے اس میں سب سے زیادہ اچھی تشریح یہی ہے۔ اس کے علاوہ کوئی تشریح قابل التفات نہیں ہے[1]

حافظ ابن کثیرؒ کو بھی امام قرطبیؒ کی تشریح پسند ہے۔ انہوں نے اسی کو اپنایا ہے اور حافظ ابن جریرؒ کے اس موقف کو کہ ما موصولہ ہے غریب قرار دیا ہے بذالذی مسلکہ غریب جداً[2] اور ابن کثیرؒ نے عبداللہ بن عباسؓ کا یہ تشریحی نوٹ بھی سپرد قلم فرمایا کہ ما انزل علی الملکین میں ما نافیہ ہے اور مطلب یہ ہے کہ اللہ نے کوئی جادو نہیں اتارا۔

لیکن صاحب روح کو امام قرطبی کی اس تشریح سے اتفاق نہیں ہے اور صرف اختلاف ہی نہیں بلکہ ان کو قرطبی پر غصہ بھی ہے اور غصہ میں وہ اس امام التفسیر پر یہ پھبتی کس گئے ہیں مفاسد قلۃ البضاعۃ لاتحصی یعنی علمی بے مائگی جن خرابیوں کو جنم دیتی ہے وہ اَن گنت ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ امام قرطبیؒ اس میدان میں علم کی نعمت سے تہی دامن ہیں۔ لیکن یہ بہت بڑی زیادتی ہے۔ اگر قرطبیؒ کا بتایا ہوا مطلب بقول علامہ آلوسی کتاب اللہ کو مسخ کر دینے کے مترادف ہے تو اس میدان میں قرطبی تنہا نہیں ہے اور بھی ارباب تفسیر قرطبی کے ہم خیال ہیں۔

شاید آلوسی جیسے حضرات کی قرآن کی اس آیت کی تشریح میں انتہا پسندانہ پالیسی سے گھبرا کر دائرۃ المعارف الاسلامیہ کے مصنفین آیت کی تشریح کے متعلق یہ کہنے پر مجبور ہو گئے۔

و ترکیب ہذہ الآیۃ غامض، و ثمۃ عدۃ مواضع فی ترجمتہا غیر محققۃ۔

دراصل ان بزرگوں نے قرآن میں سحر کی بات پڑھ کر یہ خیال کر لیا ہے کہ قرآن تاریخ سحر بیان کر رہا ہے۔

تفسیر حقانی کے مصنف نے بھی امام قرطبیؒ کی ہمنوائی کی ہے وہ فرماتے ہیں:

ان آیات میں اللہ تعالیٰ یہود کو ایک تاریخی واقعہ سے الزام دیتا ہے کہ یہ لوگ علم دین اور احکام تورات چھوڑ کر لغو باتوں میں مصروف ہو گئے یعنی وہ جو شیاطین سلیمان کے عہد حکومت میں جادو

---

[1] الجامع لاحکام القرآن ج ۲ ص ۵۰۔ [2] ابن کثیر ج ۱ ص ۱۳۷

سکھایا کرتے تھے اور اس کو سلیمان کی طرف منسوب کرتے تھے اور دراصل سلیمانؑ اس کفر کے مرتکب نہیں ہوتے تھے بلکہ وہی شیاطین اس کفر کے مرتکب ہوئے جو لوگوں کو جادو سکھایا کرتے تھے۔ یہ لوگ اس کے تابع اور معتقد ہوگئے اور اس پر بھی بس نہ کی بلکہ جب بخت نصر کے زمانے میں یہ لوگ بابل شہر میں گئے تو بجائے اس کے کہ اپنے گناہوں سے توبہ کرتے، نادم ہوتے، شریعت کو یاد کرتے اُلٹے وہاں کے شعبدہ بازیوں میں مصروف ہوگئے یعنی وہاں ہاروت و ماروت جو دو شخصوں کو سحر معلوم تھا اسی کے سر ہوگئے۔ اور اسی کو سیکھ کر اپنی دینی اور دُنیوی ترقی کا باعث سمجھنے لگے[1]

اس تفصیل سے میرا مقصد تصویر کے دونوں رُخ آپ کے سامنے پیش کرنا نہیں ہے بلکہ یہ بتانا ہے کہ عام طور پر مفسرین نے یہ بات تسلیم کر لی ہے کہ

۱۔ آیت کے پہلے حصہ میں شیاطین سے جنّات مراد ہیں اور قرآن یہاں تاریخ سحر بیان کر رہا ہے فرق صرف یہ ہے کہ یہودی اسے سلیمانی کارنامہ سمجھتے تھے اور قرآن تاریخی طور پر اسے زمانۂ سلیمان میں جنّات کا کارنامہ بتا رہا ہے۔

۲۔ یہودی کہتے تھے کہ سحر اللہ کی جانب سے جبریل و میکائیل کے ذریعے نازل ہوا ہے اور قرآن تاریخ سحر بیان کرتے ہوئے یہودیوں کے اس بیان کی صرف اس قدر تصحیح کرتا ہے کہ سحر نازل تو فرشتوں کے ذریعے ہوا ہے لیکن تم نام غلط بتا رہے ہو۔ ان کے اصلی نام ہاروت اور ماروت ہیں۔ ان پر بابل میں سحر نازل کیا گیا تھا۔

اس بارے میں استدلال کسی صحیح روایت سے نہیں بلکہ صرف قیاس اور رائے سے کیا جاتا ہے جیسا کہ بزرگوں کی زبانی پیش کردہ پس منظر میں دیکھ چکے ہیں۔ لیکن قیاس رائے سے پہلے ہمیں غیر جانبدار مبصر کی حیثیت سے اس مقام پر غور کرنا چاہیے کہ کیا فی الحقیقت قرآن سحر کی تاریخ بیان کر رہا ہے یا بنی اسرائیل کے کردار کا تذکرہ کر رہا ہے اور کیا فی الواقع قرآن کو فرشتوں کے موضوع پر یہودی افسانہ نویسوں سے ناموں میں اختلاف ہے اور بس

حقیقت یہ ہے کہ قرآن میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جس سے یہ ثابت ہو لیکن یہ تکلف صرف اس لیے کیا جا رہا ہے کہ اسرائیلی روایات کے ذریعے جو جراثیم پھیل چکے ہیں کسی نہ کسی طرح ان کے مطابق قرآن کے مطالب ڈھل جائیں۔ غور فرمائیے کہ زمانۂ سلیمان میں جنّات کے ذریعے معاشرے

---

[1] تفسیر حقانی ج ۱ ص ۵۶

کو سحر کی تعلیم و تلقین اور نشر و اشاعت کی یہ معصومانہ اور مبارک کوشش کیوں کی جارہی ہے؟ صرف اس لیے کہ یہودیوں کی حضرت سلیمان کے مبارک زمانے کے بارے میں خرافات موجود ہیں اور ان خرافات نے ہماری تفسیر کی کتابوں میں روایات کی صورت اختیار کر لی ہے۔ حافظ ابن کثیر نے ان روایات کو تفسیر میں یکجا کر دیا ہے اور آخر میں لکھ دیا ہے لا تعارض بین السیاقات علی اللبیب الفہیم ۔

اب غور کرو یہاں جو واقعہ بیان کیا گیا ہے وہ خود قرآن کے صاف صاف لفظوں میں کیا ہے؟

یہودی اخلاقی اور مادی انحطاط میں مبتلا ہیں، غلامی جہالت، نکبت و افلاس اور ذلت و پستی نے ان کی توجہات جادو ٹونے ٹونکے، طلسمات عملیات اور تعویز گنڈوں کی طرف لگا دی تھی اور اپنی اس بُرائی پر پردہ ڈالنے اور اس کو نیکی کا مقدس جامہ پہنانے کے لیے اُن کے رہنما، اُن کے علماء اور ان کے لیڈروں کا دعویٰ تھا کہ یہ عملیات منزل من اللہ اور شہر بابل میں فرشتوں کے ذریعے ان کا نزول ہوا تھا۔ اور یہ کہتے تھے کہ سلیمان علیہ السلام کی حیرت انگیز حکومت کی طاقتیں اسی کے سہارے تھیں۔

اب قرآن ان کی ذہنیت اور اُن کے علم کی تردید کرنا چاہتا ہے۔ عام مفسرین کہتے ہیں کہ قرآن نے یہودیوں سے صرف سلیمان کی ذات اور فرشتوں کے ناموں میں اختلاف کیا ہے۔ باقی سحر کے فرشتوں پر نازل ہونے اور زمانہ سلیمان میں جادوگری کے ہونے میں قرآن کا نقطہ نظر یہودیوں سے مختلف نہیں ہے۔

خود قرآن جو کچھ کہتا ہے یہ ہے کہ

> یہودیوں نے کتابِ الٰہی کی تعلیم فراموش کر کے جادوگری کے ان مشرکانہ عملوں کی پیروی کی جنہیں شیطان صفت لوگ سلیمان کی عہد کی طرف منسوب کر کے پڑھا کرتے تھے۔ حالانکہ سلیمان نے کبھی کُفر نہیں کیا۔ دراصل یہ انہی شیطانوں کا کُفر ہے کہ لوگوں کو جادو سکھاتے تھے اور یہ بھی دُرست نہیں ہے کہ بابل میں دو فرشتوں ہاروت و ماروت پر اس طرح کی کوئی بات نازل ہوئی ہے جیسا کہ ان لوگوں میں مشہور ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ جو کچھ بھی کسی کو سکھاتے تھے تو یہ کہے بغیر نہیں سکھاتے تھے کہ دیکھو ہمارا وجود تو ایک فتنہ ہے پھر تم کیوں کُفر میں مبتلا ہوتے ہو یعنی جادوگری کی باتوں کا بُرا ہونا ایک ایسی مانی ہوئی بات ہے کہ جو لوگ اس کے سکھانے والے تھے وہ بھی تسلیم کرتے تھے کہ یہ بات خدا پرستی کے خلاف ہے لیکن اس پر بھی لوگ ان سے ایسے عملیات سیکھتے۔

قرآن صاف کہہ رہا ہے کہ یہ شیاطین صفت انسان جادو کے متعلق زمانۂ اقتدارِ سلیمان کے بارے میں افتراء پردازیاں کرتے تھے۔ یہ غلط ہے، جھوٹ ہے نہ یہ کام سلیمان نے کیا ہے اور نہ سلیمان کے زمانۂ اقتدار میں ہوا ہے۔

دوسری بات یہ بتائی ہے کہ یہ بھی غلط ہے کہ سحر فرشتوں پر اللہ کی جانب سے نازل کیا گیا ہے۔ ہاروت و ماروت پر ایسی کوئی چیز نازل نہیں ہوئی یہ محض افتراء ہے اور اپنی بدکرداری کے لیے غلط سہارا ہے۔

تیسری بات یہ کہ ہاروت ماروت نامی اشخاص بابل میں جادو کے معلم ضرور تھے لیکن جادو کی قباحت کے پیش نظر وہ اس سے لوگوں کو ضرور روکتے تھے لیکن اس کے باوجود لوگ سیکھتے تھے۔

لہٰذا یہودیوں کا یہ خیال کہ جادو اللہ کی جانب سے نازل ہوا ہے، سلیمانؑ بھی جادو کرتے تھے یا سلیمان کے زمانے میں جادو کا کاروبار ہوتا تھا بالکل بہتان ہے۔ صرف اتنی سی بات ہے کہ بابل میں ہاروت و ماروت دو نامی شخص یہ کام کرتے تھے لیکن لوگوں کو وہ بھی اس کے سیکھنے سے روکتے تھے۔ اس میں نہ خدا کی رضا ہے نہ خدا کے نبیوں کا یہ کام اور نہ ان کے مبارک عہد میں یہ ہوا ہے اور نہ اللہ نے اسے نازل کیا ہے۔ یہ تو سرتاسر کفر ہے اور اسے وہ قومیں اپناتی ہیں جو ناخدا شناس بلکہ خدا کی کھلم کھلا باغی ہوں اور جن کے زندگی میں نبوت کے لائے ہوئے علم و عمل سے روابط ٹوٹ چکے ہوں۔

ہمارے خیال میں قرطبیؒ کی تفسیر عام تشریحات سے زیادہ بہتر ہے کیونکہ عام تفسیر کے مطابق ماکو بمعنی الذی مان کر یہ مطلب لینا کہ بابل میں ہاروت و ماروت دو فرشتے بنی اسرائیل کی آزمائش کے لیے اللہ تعالیٰ کی جانب سے نازل ہو کر سحر سکھاتے اور ساتھ ہی یہ تنبیہ بھی کرتے جاتے تھے کہ ہم سے یہ علم نہ سیکھو کافر ہو جاؤ گے بے وجہ متعدد اشکالات کو دعوت دینا اور سحر اور ما انزل کو بے دلیل ایک ہی چیز ماننا ہے۔

دراصل قرآن نے اس واقعہ کو جس غرض سے بیان کیا ہے وہ تو صرف یہ ہے کہ بنی اسرائیل کا حضرت سلیمان اور سلیمان کے دورِ حکومت کی جانب جادو منسوب کرنا بہتان اور افتراء ہے۔ یہ کام شیاطین کا ہے۔ حضرت سلیمان کا دامن دونوں حیثیتوں سے اس سے پاک ہے۔ ذاتی حیثیت سے بھی اور سربراہِ مملکت ہونے کی حیثیت سے بھی۔ اور یہ کہ بابل میں دو شخص نامی ہاروت اور ماروت جادوگر تھے۔ یہ فرشتے نہ تھے۔ فرشتوں پر اللہ نے جادو بالکل نازل نہیں کیا ہے۔ یہ ابنِ کثیر اور امام قرطبی کی تفسیر ہے۔ اس کی تائید بعض دوسرے محققین نے بھی کی ہے جس میں شیخ الاسلام ابنِ تیمیہؒ اور ابوحیان اندلسی خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔

۲۷۷ـــہ ۔ وہ جو کچھ بھی کسی کو بتلاتے تھے یہ کہہ کر بتلاتے کہ ہمارا وجود تو ایک آزمائش ہے تم کفر میں مبتلا نہ ہو یعنی وہ جادو سکھاتے تو بنی اسرائیل کی مذہبی زندگی پر طعن کرتے ہوئے یہ کہتے جاتے کہ دیکھو اگر تم نے ہم سے یہ سحر سیکھا تو تم کافر ہو جاؤ گے مگر بنی اسرائیل کی گمراہی کا یہ عالم تھا کہ وہ اس پر بھی باز نہ آتے تھے اور اس میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ جادو کی برائی اس قدر کھلی ہوئی ہے کہ جو

اس کے فن کار اور معلّم تھے وہ بھی جانتے تھے کہ یہ بات خدا پرستی اور ایمان کے خلاف ہے۔ اس میں بھی بنی اسرائیل کے ایمان پر لطیف طنز ہے۔ المراغی نے یہاں ایک لطیف نکتہ لکھ دیا کہ ان کا عوام اور طلبگاروں سے ایسا کہنا دراصل عقیدت کو قائم رکھنے اور دکانداری کے نقطہ نظر سے تھا۔ آج کل بھی دجاجلہ اپنے کاروبار کو چمکانے کے لیے ایسے ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں - اور یہ انداز اپنے فن کی مقبولیت بڑھانے کے لیے اختیار کیا جاتا ہے -

جن لوگوں نے اس کو فرشتوں کا کردار بتایا ہے ان کو یہاں بھی پریشانی کا سامنا کرنا پڑا کہ ملائکہ اور سحر کا سبق اور درس معاذاللہ استغفراللہ - لاچار تاویل کرنی پڑی اور تعلیم کو اپنے اصلی معنے سے ہٹانا پڑا اور کہنا پڑا کہ تعلیم یہاں اعلام کے معنے میں ہے یعنی وہ آگاہ کرتے تھے، بتلا دیتے اور جتا دیتے۔ لیکن جو مطلب ابنِ کثیر اور قرطبی نے بتایا ہے اس کے لیے کسی تاویل کی ضرورت نہیں ہے -

ف ۲۷۸ - اس کے باوجود لوگ ایسے عمل سیکھتے جن کے ذریعے میاں بیوی میں جُدائی ڈال دیں۔ مطلب یہ ہے کہ اس منڈی میں سب سے زیادہ جس چیز کی مانگ تھی وہ یہ تھی کہ کوئی ایسا عمل یا تعویز مل جائے جس سے ایک آدمی دوسرے کی بیوی کو اس سے توڑ کر اپنے اوپر عاشق کرے۔ یہ اخلاقی زوال کا وہ انتہائی درجہ تھا جس میں وہ لوگ مبتلا ہو چکے تھے۔ پست اخلاقی کا اس سے زیادہ نیچا درجہ کوئی نہیں ہو سکتا کہ ایک قوم کے افراد کا سب سے زیادہ دلچسپ مشغلہ پرائی عورتوں سے آنکھ لڑانا یا پرسکون زندگی میں رگ پھڑکانا ہو جائے [1]

قرآن نے اس فقرے کے ذریعے یہودیوں کے تذکرے میں اشارتاً سمجھایا ہے کہ ان کا ایمان سے محروم ہو جانا اور کتاب اللہ پر عمل چھوڑ دینا دراصل ان کے اُن اعمال کا نتیجہ تھا -

خوشتراں باشد کہ سرِ دلبراں　　　گفتہ آید در حدیثِ دیگراں

آج ہم اپنی حالت پر نظر ڈالیں اور غور کریں کہ کیا ہم بھی ٹھیک طلسمات، نیرنجات، عملیات اور تعویز گنڈوں کے معاملہ میں بنی اسرائیل کے قدم بہ قدم نہیں چل رہے ہیں اور کیا عملیات، طلسمات کی یہ تمام صورتیں کسی نہ کسی بھیس میں یہاں بھی کام نہیں کر رہی ہیں۔ اناللہ وانا الیہ راجعون -

یہ صرف قرآن ہی نہیں کہہ رہا ہے بلکہ خود بیسویں صدی کے علمائے یہود کا بھی یہودیوں کے بارے میں یہی اقرار ہے کہ سحر کی سب سے زیادہ عام اور متداول صورت اس نقش کی تھی جو عشق و محبت کے لیے

[1] تفہیم القرآن ج ۱ ص ۹۹

دیا جاتا تھا۔ خاص کردہ نقش جو ناجائز آشنائیوں کے لیے لکھا جاتا تھا اس قسم کے فن کی ماہر عورتیں زیادہ ہوتی تھیں۔ چنانچہ ذکر ہی سحر اور حرام کاری کا ساتھ ساتھ آیا ہے۔ جیوز انسائیکلو پیڈیا ص ۲۵۵ [1]

قرآن نے یفرقون بین المرء وزوجہ کہہ کر اس طرف اشارہ کر دیا ہے کہ تفریق بہت بڑا سنگین جرم ہے اور اللہ کے نزدیک بے حد ناپسندیدہ ہے۔ سحر کے ذریعے ہو یا ہمزاد کے اور نقش و تعویز کے ذریعے ہو یا وظیفہ اور ورد کے، سب حرام ہے۔ اور اس موضوع پر مسلمانوں میں کبھی دو رائیں نہیں ہوئی ہیں۔

ف ۲۷۹ ۔ وہ اللہ کے حکم کے بغیر کسی کو کوئی نقصان نہیں دے سکتے۔ یعنی اسباب سے بالا۔ ان کے پاس کوئی غیبی قوت نہیں ہے، اگر کسی کو کوئی نقصان ہوتا ہے تو ان اسباب کے تحت ہی ہو رہا ہے جو اللہ کے قانونِ مشیت کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ اسلام کے بنیادی مقاصد میں سے توحید کو اوّلین مقصد کی حیثیت حاصل ہے۔ ارشاد ہے کہ مؤثر اور فاعل حقیقی اللہ کی ذات ہے۔ جہاں جو کچھ ہے جتنا کچھ اور جیسا کچھ ہے اس کی حیثیت سبب اور بہانہ سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ قرآن کسی موقعہ پر صرف ضرورت ہی کے تحت نہیں بلکہ معمولی سے مناسبت کے تحت بھی اس بنیادی مسئلہ کو بیان کر دیتا ہے۔ کیونکہ واقعات کی آغوش میں احکام کے بیان ہونے سے مسائل اعتقادی دل میں بیٹھ جاتے ہیں اور ہر قسم کی تاویل و تحریف کے احتمال سے بالا ہوتے ہیں۔ زہر کا اثر ہے گناہوں کی ہلاکت، کافروں کے ہاتھوں سے انبیاء اور اولیاء کی اہانت جس قانونِ تکوینی اور ارادۂ الٰہی کے تحت ہوتی ہے اسی کے زیر اثر سحر بھی اپنا اثر دکھاتا ہے۔

ف ۲۸۰ ۔ اس کے باوجود وہ ایسی باتیں سیکھتے ہیں جو ان کے لیے نفع بخش نہیں ضرر رساں ہیں۔ یہ بدبخت بنی اسرائیل ان علوم و فنون کے سیکھنے میں اپنی قوتیں کیسے ضائع کر رہے ہیں جو ان کے حق میں نافع نہیں ضرر رساں ہیں۔ کیونکہ یہ لوگوں کی ایذاء رسانی کا ذریعہ بن رہی ہیں اور لوگوں کی ایذاء رسانی بہر حال حرام ہے۔ آخرت میں اس عمل کے نتیجہ سے یقیناً دوچار ہونا ہے۔ چونکہ نقصان رساں چیز میں کسی درجہ میں نفع کا پہلو ضرور ہوتا ہے اور کبھی منفعت بہ نسبت مضرت کے زیادہ ہوتی ہے اس یہ بتانے کے بعد کہ ضرر رساں ہے کھول کر بتا یا کہ کسی درجہ میں نفع بخش اور سودمند نہیں ہے۔ علامہ نسفی نے یہاں یہ نکتہ آفرینی کی ہے کہ اس سے علوم سحریہ کے ساتھ ان علومِ عقلیہ کے سیکھنے کی بھی ممانعت نکل آئی جن کا انجام ضلالت، غوایت اور گمراہی ہو۔

---

[1] تفسیر ماجدی ص ۴۲

اللہ کے سوا جن غیبی اسباب وعلل یعنی سحر وطلسم جنات وشیاطین اور ارواح خبیثہ اور دوسری قسم کی قوتوں کی غیبی قدرت ونصرت کا اعتقاد لوگوں میں رائج ہے اور ان سے بچنے کے لیے ان کی دھائی دی جاتی ہے نذر چڑھائی جاتی ہے۔ قربانی کی جاتی ہے قرآن کی اس آیت نے ان تمام خرافات کا قلع قمع کر دیا اور خدا کے سوا تمام دوسری مخفی اور پوشیدہ قوتوں کا ڈر انسانوں کے سینوں سے ہمیشہ کے لیے نکال دیا۔ اور دُعا، و کلماتِ الٰہی کے علاوہ ہر نوع کی جھاڑ پھونک، منتر، تعویز، گنڈے ٹوٹکے جن میں کسی غیر خدا سے غیبی استمداد یا شرک کا کلمہ ہو کفر قرار دیا۔ بعض صحابہ نے ان مکار جادوگروں کے قلع قمع کے لیے ان کے قتل تک کا حکم دے دیا تاکہ انسانوں کے دلوں میں ان کا جو خوف وہراس بیٹھا ہوا ہے وہ دُور ہو اور ان کے اس عاجزانہ قتل ہونے سے یہ بات ثابت ہو جائے کہ ان میں کوئی غیر معمولی طاقت نہیں ہے وہ بالکل بے بس ہیں۔ مسلم میں ہے کہ ایک صحابی نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں عرض کی کہ یا رسول اللہ ہم جاہلیت میں جھاڑ پھونک کیا کرتے تھے۔ اب آپ کیا فرماتے ہیں۔ ارشاد فرمایا کہ تم اپنے منتر ہمارے سامنے پیش کرو۔ اگر ان میں شرک کی کوئی بات نہ ہو تو کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ ایک اور صحابی روایت کرتے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا ہے کہ

ان الرقی والتمائم والتولہ شرك۔ جھاڑ، گنڈا اور میاں بیوی کے لیے تعویز شرک ہیں نہایہ میں ہے کہ عرب چند منکے لے کر اپنے بچوں کے گلوں میں نظر گزر کے خیال سے ڈال دیا کرتے تھے۔ ان کا گمان تھا کہ اس عمل سے نظر نہیں لگتی۔ قرآن چونکہ وہم پرستی کی بنیاد اُکھاڑنے آیا تھا اس لیے اس خیال کی بھی تردید کی اور بتایا کہ ایک مخلوق کو دوسری مخلوق میں بالذات کوئی تاثیر نہیں ہے۔ تولہ بھی اسی کی دوسری شکل تھی۔ ان کا خیال تھا کہ اس عمل سے تقدیر اُلٹ پلٹ جاتی ہے۔ اس طرح اس بے بنیاد جھاڑ پھونک کا مقصد ہونا وہم پرستی ہے۔

غرض قرآن کی یہ آیت اپنی معنوی جامعیت کی وجہ سے زندگی کے تمام گوشوں پر حاوی ہے۔

۲۸۱ ۔ ان کو خوب معلوم ہے کہ جو شخص جادو کا خریدار ہوتا ہے اس کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے۔

یہ علم ان کو خود اپنے مذہبی نوشتوں کے ذریعے حاصل ہے اور وہ خوب جانتے ہیں کہ سحر وساحری کیسی بُری چیز ہے۔ توراۃ نے ان کو اس سے منع کیا تھا۔ آج بھی توراۃ میں یہ ممانعت موجود ہے۔

دیکھو خروج ۲۲: ۱۸ احبار ۱۹: ۲۶ استثنا ۱۸: ۱۰) یعنی ان کو پتہ ہے کہ جو شخص اُصولِ دین اور احکامِ الٰہی کو چھوڑ کر اس کو اختیار کرے گا اس کا آخرت کی زندگی میں کوئی حصہ نہ ہوگا۔

وَلَوْ أَنَّهُمْ آمَنُوا وَاتَّقَوْا لَمَثُوبَةٌ مِّنْ عِندِ اللَّهِ خَيْرٌ ۖ لَّوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ ﴿١٠٣﴾

اور اگر وہ ایمان و تقوٰی کی راہ اختیار کرتے تو اللہ کے یہاں اس کا جو بدلہ ملتا وہ ان کے لیے زیادہ بہتر اور اچھا تھا، کاش ان کو پتہ ہوتا۔

اور ان کا یہ علم آنے والی آیت لو کانوا یعلمون کے منافی نہیں ہے۔ کیونکہ علم کے دو درجے ہوتے ہیں ایک علم تفصیلی یعنی حقیقت کا شعور و ادراک اور اس کی وجہ سے عائد ہوتے والی ذمہ داریوں کا احساس دوسرا علمی اجمالی ذہن میں رسمی نقوش۔ اس میں بروقت تحریف و تاویل ہو سکتی ہے اور اس میں عمل کے انگیخت کا کوئی سامان نہیں ہوتا۔

وہ اسی علم اجمالی کے ذریعے سُود اور رشوت کو تاویل کر کے حلال سمجھتے ہیں۔ لیکن اگر ان کو علم تفصیلی ہوتا اور حُرمت کی علت سے واقف ہوتے اور دل سے یقین ہوتا کہ اس کا ارتکاب آخرت میں کیسے سنگین نتائج پیدا کرے گا اور عمل کے وقت میں ان کو اس کا احساس ہوتا کہ محرمات کی حد تک ذمہ داری کیا ہے تو ان کا یہ کردار نہ ہوتا لیکن وہ علم تفصیلی سے اور اس کی حقیقت کے شعور سے بالکل بیگانہ ہو چکے تھے۔ گویا پہلی آیت میں ان کے علمِ تصوری کا اثبات ہے اور دوسری آیت میں علم تصدیقی کا انکار ہے۔

ایمان و تقوٰی کی راہ

چونکہ سُورت کا اصل موضوع اجتماعی تقوٰی کی ضرورت ہے اس لیے بنی اسرائیل کی قومی اور ملی تاریخ میں ان وقائع اور احوال و ظروف کی نشاندہی فرمانے کے بعد جن سے اجتماعی تقوٰی کی زندگی ان میں ختم ہو کر رہ گئی تھی۔ یہاں اچانک ان کو خبردار کیا اور آگاہ کیا کہ اگر ان کی زندگی تقوٰی کی نعمت سے مالا مال ہوتی تو جو کچھ ہو چکا کچھ بھی نہ ہوتا اور جس اخلاقی و روحانی انحطاط سے تہی دامن ہو کر وہ جہالت نکبت و افلاس اور ذلت و پستی کا شکار ہوئے ہیں ان میں سے کوئی بات نہ ہوتی۔

یاد رہے کہ یہاں ایمان و تقوٰی لغوی معنے میں نہیں خالص نبوت کی زبان میں اصطلاحی معنے میں

استعمال ہوا ہے۔ اجتماعی زندگی میں ایمان و تقویٰ کی حیثیت بس کی گانٹھ اور ریڑھ کی ہڈی کی ہے۔ ان کی درستگی پر پورے انسانی تمدن، پوری معاشرتی زندگی، پوری اخلاقی اور تہذیبی زندگی اور پوری معاشی اور سیاسی زندگی کی درستگی اور ان دونوں کی خرابی پر ہر قسم کی زندگی کی خرابی کا مدار ہے۔ ایمان و تقویٰ درحقیقت اُمت کی حیات کی جڑ ہے۔ لہٰذا وہ قوم بدترین مفسد ہے جو اس درخت کی جڑ پر تیشہ چلاتی ہو جس کے قیام پر خود اس کا اور پوری اجتماعی زندگی کا قیام و بقا موقوف ہے۔

۲۸۲ . اگر وہ ایمان و تقویٰ کی راہ اختیار کرتے۔ ایمان ایک نبوی اصطلاح ہے۔ جب تک تصدیق کے ساتھ التزام طاعت اور انقیادِ قلبی نہ ہو ایمان حاصل نہیں ہوتا۔ انقیاد باطن، التزام طاعت، عہدِ وفاداری ایمان کے وہ اوصاف ہیں جن کے بغیر تصدیق صرف علم ہی کا ایک مرتبہ ہے۔ اس علم کے لیے ضروری ہے کہ یہ ایسی صفتِ نفس بن جائے کہ قلب اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دینے پر مجبور ہو جائے۔ اگر ایک شخص صرف تصدیق رکھتا ہے مگر عہدِ وفاداری نہیں کرتا وہ مومن نہیں کہلا سکتا اور اسی طرح اگر فرمانبرداری کے لیے تو آمادہ ہے مگر قلب و زبان سے تصدیق کے لیے تیار نہیں تو وہ بھی مومن نہیں ایمان صرف اس صورت کا نام ہے کہ زبان و قلب تصدیق سے مزین ہوں اور شریعت پر عمل پیرا ہونے کا عزم بھی مصمم ہو۔

دُنیا میں انسانوں کی دو قسمیں ہیں۔ خدا پرست اور مادہ پرست۔

مادہ پرست تمام عالم کو صرف اپنے دائرہ محسوسات میں محدود تصوّر کرتا ہے۔ اس کے نزدیک کسی اور عالمِ بالا کا تصوّر صرف ایک وہم پرستی، مذہبی خوش اعتقادی سے زیادہ نہیں ہے۔ اس لیے وہ دعوتِ انبیاء میں ایمان کا نام سنتا ہے تو بے ساختہ اس کا مذاق اڑاتا ہے کیونکہ وہ ایمان کو صرف ایک جہالت یا جبری انقیاد سمجھتا ہے۔

اس کے مقابلے پر دوسری قسم خدا پرستوں کی ہے۔ ان کے نزدیک موجودات کو محسوسات کے دائرے میں محدود سمجھنا، ایک بنیادی غلطی ہے۔ وہ انبیاء کی فہم و فراست اور ان کی امانت و صداقت پر اعتماد کر کے عالمِ بالا پر ایمان لے آنا عین تقاضائے عقل سمجھتے ہیں۔

ایمان کی تمام روح صفتِ یقین ہے اور یقین اسی صورت قابلِ اعتماد ہے جبکہ عالمِ غیب پر ہو ورنہ مشاہدات پر یقین کرنا ایمان نہیں کہلاتا۔

خدا پر یقین، خدا کے رسُولوں کا یقین، خدا کی کتابوں پر یقین، خدا کے فرشتوں پر یقین، اعمال کی جزا و سزا پر یقین۔ یہ تمام وہ حقائق ہیں جن پر دل سے یقین کرنا، زبان سے اقرار کرنا اور عہدِ وفاداری کرنا

ضروری ہے۔ اس یقین کے بغیر عمل خالص نہیں ہو سکتا۔

اللہ تعالیٰ پر یقین کہ وہ اس دُنیا کا تنہا خالق اور مالک ہے اور ظاہر و باطن سے آگاہ ہے تاکہ وہی ہمارے کاموں کا قبلہ مقصود بن سکے۔ اسی کی رضا جوئی اسی کی مرضی کی تعمیل ہمارے اعمال کی تنہا غرض ہو اور ہم جلوت کے سوا خلوت میں بھی گناہوں سے بچ سکیں ——————— اور ہر بُرائی سے اس لیے بچیں کہ اس سے ہمارے مالک و مولیٰ نے منع کیا ہے۔ جس طرح ہمارے جسمانی اعضا گناہوں سے پاک ہوں ہمارا دل بھی ناپاک خیالات اور وسوسوں کی آمیزش سے پاک ہو۔ اس کے احکام اس کے پیغام کی سچائی پر دل سے ایسا یقین ہو کر ہمارے ناپاک خیالات، ہمارے غلط استدلالات، ہماری گمراہ خواہشیں بھی اس یقین میں شک و تذبذب پیدا نہ کرسکیں۔

خدا کے رسُولوں پر ایمان لانا ضروری ہے کہ خدا کے ان احکام اور ہدایات اور اس کی مرضی کا علم ان ہی کے واسطے سے انسانوں کو پہنچا ہے۔ اگر ان کی صداقت کو کوئی تسلیم نہ کرے تو پیغامِ ربّانی اور احکامِ الٰہی کی صداقت اور سچائی بھی مشکوک و مشتبہ ہو جاتے اور انسانی زندگی کے سامنے نیکی، نزاہت اور معصومیت کا کوئی نمونہ موجود نہ رہے جو انسانوں کے قوائے عملی کی تحریک کا باعث بن سکے۔ پھر اچھے بُرے، صحیح، غلط کے درمیان ہماری عقل کے سوا جو ہمارے جذبات کی محکوم ہے۔ کوئی اور چیز ہمارے سامنے ہماری رہنمائی کے لیے نہ رہے گی۔

خدا کے فرشتوں پر ایمان لانا ضروری ہے کہ وہ خدا اور اس کے رسُولوں کے درمیان قاصد اور سفیر ہیں۔ مادیت اور روحانیت کے مابین واسطہ ہیں۔ مخلوقات کو قانونِ الٰہی کے مطابق چلاتے ہیں۔

خدائی احکام و ہدایات جو رسُولوں کے ذریعے انسانوں تک پہنچے ہیں ان کو کتاب اور صحیفہ کہتے ہیں۔ اُن کی صداقت پر اور اُن میں جو کچھ ہے اس کی سچائی پر ایمان لانا ضروری ہے۔

اعمال کی بازپُرس اور جوابدہی کا خطرہ نہ ہو اور اس کے مطابق جزا و سزا کا تصوّر نہ ہو تو دنیوی قوانین کے باوجود دُنیا کے انسانیت سراپا درندگی اور بہیمیت بن جائے۔ یہی وہ عقیدہ ہے جو انسانوں کو خلوت و جلوت میں ان کی ذمّہ داری کا احساس دلاتا ہے اور اسی لیے روزِ جزا اور یومِ آخرت پر ایمان رکھے بغیر انسانیت کی صلاح و فلاح ممکن نہیں ہے اسی بنا پر انبیاء نے اپنی تعلیمات میں اس پر زور دیا ہے۔

یہی پانچ باتیں ایمان کے اصلی عناصر ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ پر ایمان، اس کے تمام رسُولوں پر ایمان، اس کی کتابوں پر ایمان، اس کے فرشتوں پر ایمان، روزِ جزا پر ایمان۔ آیئے ان عقائدِ خمسہ کو بنی اسرائیل

کی اس زندگی میں دیکھئے جو سورہ بقرہ میں اب تک پڑھ چکے ہیں تاکہ آپ کو قرآن کے اس فقرے لو انھم آمنوا کاش وہ ایمان لے آتے واقعاتی طور پر مشاہدہ ہو جائے ۔

ایمان باللہ کا حال یہ ہے ۔

لن نؤمن لک حتی نری اللہ جہرۃً

ایمان بالرسول کا حال یہ ہے

ففریقاً کذبتم وفریقاً تقتلون

ایمان بالکتاب کا حال یہ ہے

افتؤمنون ببعض الکتاب وتکفرون ببعض

ایمان بالملائکہ کے بارے میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ

من کان عدواً للہ وملائکتہ ورسلہ وجبریل ومیکائیل فان اللہ عدو للکافرین

ایمان بالیوم الآخر کی داستان یہ ہے کہ

لن تمسنا النار الا ایاماً معدودۃ

قرآن نے یہاں لفظ ایمان بول کر تمام ایمانیات مراد لی ہیں بلکہ اس میں اشارۃً یہ بھی بتا دیا ہے کہ جب ان کے ایمان ہی کی زمین بنجر تھی تو اعمالِ صالحہ کے کسی پودے کا وہاں کوئی امکان ہی نہ تھا ۔ کیونکہ اعمال کے پودے تو ایمان کی زمین پر لگتے ہیں۔ قرآن حکیم نے اپنے بلیغ انداز میں ایمان کو درخت سے تشبیہ دی ہے ۔

کلمۃ طیبۃ کشجرۃ طیبۃ اصلھا ثابت وفرعھا فی السماء تؤتی اکلھا کل حین باذن ربھا ۔

کلمہ طیبہ اس پاکیزہ درخت کی طرح ہے جس کی جڑ مضبوط ہے اور اس کی شاخیں بہت اونچی ہیں وہ اپنا پھل ہر وقت اللہ کے حکم سے دیتا رہتا ہے ۔

آیت میں ایمان کو ایک درخت سے تشبیہ دی ہے مگر اس درخت سے نہیں جس پر پھل اور پھول کی رونق نہ ہو ۔ یا بہار آئے تو سال میں ایک بار آئے بلکہ اس درخت سے تشبیہ دی ہے جو سدا بہار ہو اور اس پر کبھی خزاں نہ آئے ۔ وہ دوسرے درختوں کی طرح سال میں صرف ایک ہی بار پھل نہ لائے ۔ بلکہ موسم کی قید سے بے نیاز ہو کر پھولوں اور پھلوں سے لدا رہے ۔ قرآن کہتا ہے کہ

بنی اسرائیل کے ایمان کے درخت پر ہمیشہ خزاں ہی طاری رہی ، اعمالِ صالحہ کا کوئی پھول اور پھل تو در کنار سبز پتہ بھی نہ اُگا ۔

آیت کا دوسرا لفظ واتقوا ہے جس کے معنے ہیں کاش وہ تقویٰ کی راہ اختیار کرتے۔ تقویٰ بھی نبوت کی اصطلاحی زبان کا لفظ ہے۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ بندہ اللہ اور یوم آخرت پر یقین رکھتے ہوئے اللہ کی ناراضی اس کی پکڑ، آخرت کے عذاب اور پکڑ سے ڈرتے ہوئے فکر اور بچاؤ کی زندگی گزارے۔ ایمان کے بعد انبیا نے جس چیز کی دعوت زیادہ اہمیت کے ساتھ دی ہے اور جس کو گویا انسان کی فلاح و سعادت کا مدار بتایا ہے وہ تقویٰ ہے۔

انبیا کی دعوت میں دو چیزوں کو بنیاد کی حیثیت حاصل ہے۔ عبادت اور تقویٰ۔ عبادت اگر فضائل کی بہم رسانی اور اوامر کی پابجائی ہے اور سب سے ہٹ کر سب سے کٹ کر اپنے نیازمندانہ اعمال کا رُخ صرف اللہ کی طرف پھیر دینے اور ہر بندگی اور ہر پرستش اسی کی کرنے کا نام ہے تو تقویٰ اسی عابدانہ زندگی میں بُرائیوں سے اور محرمات سے بچنے کو کہتے ہیں۔ قرآن کا مطالعہ کرو حضرت نوحؑ سے لے کر حضرت عیسیٰؑ تک کی قوموں میں پکار ان دو کے گرد گھوم رہی ہے۔ ہر نبی کی زبان پر یاقوم اعبدواللہ ہے یا پھر الاتتقون اور واتقواللہ ہے۔ یہی بات جو بنی اسرائیل کے بارے میں اس آیت میں کہی گئی سورۂ مائدہ اس سے زیادہ بلیغ انداز میں فرمائی گئی ہے۔

ولوان اھل الکتاب آمنوا واتقوا لکفرنا عنھم سیاٰتھم ولادخلناھم جنّٰت النعیم۔ اگر یہودی اور عیسائی ایمان و تقویٰ کی راہ اختیار کرتے تو ضرور ہم ان سے ان کی بُرائیوں کو ہٹا دیتے اور ان کو نعمت کی جنتوں میں داخل کر دیتے۔

سورۂ اعراف میں اسے قانون عام کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔

ولو ان اھل القریٰ آمنوا واتقوا لفتحنا علیھم برکات من السماء والارض

اگر بستیوں والے ایمان و تقویٰ کی راہ اختیار کرتے تو ہم زمین و آسمان سے ان پر برکتوں کے دروازے کھول دیتے۔

یعنی اگر کسی ملک اور علاقہ کے لوگ اجتماعی زندگی میں ایمان اور تقویٰ والی زندگی اختیار کرلیں تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر برکتوں کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں۔ پھر جن نعمتوں کا تعلق آسمان سے ہے وہ ان پر آسمان سے برستی ہیں اور جن کا تعلق زمین سے ہے وہ زمین سے ان کے لیے اُبلتی ہیں۔

قرآن نے یہاں تقویٰ بول کر پورا انظام رذائل مراد لیا ہے یعنی وہ تمام اخلاقِ ذمیمہ جن کو اللہ تعالیٰ ناپسند فرماتا ہے اور جن سے بچنے کا اس نے اپنے بندوں کو حکم دیا ہے جن کے کرنے والے اس کے حضور میں گنہگار رہوتے ہیں۔ جن کی بُرائی ہر عقل مند آدمی جانتا ہے اور جن کی بدولت افراد اور جماعتوں کو نقصان

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لَا تَقُولُوا۟ رَٰعِنَا وَقُولُوا۟ ٱنظُرْنَا وَٱسْمَعُوا۟ ۗ وَلِلْكَٰفِرِينَ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿١٠٤﴾

اے اہلِ ایمان تم راعنا[283] نہ کہا کرو بلکہ انظرنا[284] کہا کرو اور پھر وہ جو کچھ فرمائیں اسے جی لگا کر سنو[285] اور یاد رکھو کہ ان کافروں[286] کے لیے دردناک عذاب ہے۔

پہنچتا ہے اور ان کی معاشرت تباہ ہو جاتی ہے بلکہ جب وہ کسی قوم میں عام ہو جاتے ہیں تو پوری قوم کی قوم تباہ ہو جاتی ہے یعنی اس کی دینی، دنیوی ترقی کی راہیں مسدود ہو جاتی ہیں۔ ان رذائل میں سے قرآن نے جن کی بنی اسرائیل کے وقائع میں یہاں تک نشاندہی کی ہے ان کی اجمالی فہرست یہ ہے۔

شرک، کفر، اللہ کی آیات کا کاروبار، حق و باطل کی ملاوٹ، کتمانِ حق، عملی زندگی میں خود فراموشی، ظلم، بے ادبی و گستاخی، فسق و نافرمانی، فساد، عِصیان، عُدوان، قانون کی زد سے بچنے کے لیے حیلہ گری، عمل سے گریز کے لیے باریک بینی اور دقت سنجی، کتاب اللہ سے عام شہریوں کی ناواقفیت، اپنی باتوں اور اپنے افکار کی اللہ کے نام پر تشہیر، نسلی برتری کا گھمنڈ، اپنے نجات یافتہ ہونے کا غرور، غریب سے بدسلوکی، یتیم پر ظلم اور والدین کا عقوق، عام انسانوں سے بات چیت میں زبان کی تلخی، باہم خونریزی اور اپنے بھائیوں کو شہر بدر کرنا، انبیاء کی تکذیب اور ان کا قتل، خیالات میں جمود، نفسانی خواہشوں کی پرستش، حسد، ملائکہ سے عداوت، دُنیا اور اس کے مفادات کی حرص، کتابِ الٰہی کو پسِ پشت ڈالنا، مشرکانہ عملیات کا مشغلہ، اور عملیات میں عشق و محبت اور ناجائز آشنائیوں کے لیے جھاڑ پھونک، تعویز گنڈوں کی تلاش۔ ان میں سے کوئی ایک نہیں بلکہ قرآن کا بیان ہے کہ یہ سارے رذائل ان کی قومی اور ملی تاریخ کا حصہ تھے۔ ان کو ذہن میں رکھ کر اب قرآن کی آیت پڑھئے اور بلاغتِ قرآنی کا مزہ لیجئے۔

ولو انہم آمنوا واتقوا کاش وہ ایمان و تقویٰ کی راہ اختیار کرتے۔

اگر یہ راہ اختیار کرتے تو اُن کو کیا ملتا۔ قرآن نے بتایا ہے لمثوبۃ من عند اللہ خیر۔ ان کے لیے اللہ کی بارگاہ میں بہترین اجر تھا یعنی علم دین اور علمِ کتاب حاصل کرتے تو اللہ کے ہاں ثواب پاتے۔ اللہ اکبر کیا حد ہے اس رحمت و شفقت کے انداز کی۔

شانِ نبوت میں گستاخی

بنی اسرائیل کے جرائم کی فہرست میں من جملہ دوسرے جرائم کے ایک سنگین جرم انبیاء کی شان میں گستاخی اور بے ادبی ہے۔ اس آیت میں قرآن ان کی اسی مجرمانہ ذہنیت کو بتانا چاہتا ہے۔ لیکن چونکہ یہاں اُن کی گستاخی کا نشانہ خود ذاتِ نبوت ہے اس لیے قرآن نے عنوان بدل دیا پہلے سے اندازِ بیان یہ آرہا ہے کہ تم نے ایسا کیا تم نے یوں کیا تم نے خون بہایا، تم نے انبیاء کی تکذیب کی وغیرہ وغیرہ۔ اور اب عنوان بدل کر بات کو اس طرح پیش کیا کہ اے اہلِ ایمان تم راعنا نہ کہا کرو۔ یعنی جناب نبوت میں گستاخی اتنا سنگین جرم ہے کہ اس کا مرتکب اللہ کے لیے قابلِ خطاب بھی نہیں ہے۔ یہاں ان کی گستاخی کیا تھی۔ شاہ عبدالقادر صاحبؒ فرماتے ہیں کہ یہود پیغمبر کی مجلس میں بیٹھتے اور حضرت کلام فرماتے بعضی بات جو نہ سنی ہوتی چاہتے کہ پھر تحقیق کریں تو کہتے راعنا یعنی ہماری طرف بھی متوجہ ہوں۔ ان سے مسلمان بھی کسی وقت یہ کلمہ کہتے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا کہ یہ لفظ نہ کہو اگر کہنا ہو تو اُنظرنا کہو اس کے معنے بھی یہی ہیں اور آگے سنتے رہو کہ پوچھنا ہی نہ پڑے۔ یہود کے اس کہنے میں دغا تھی اس کو زبان دبا کر کہتے تو راعینا ہو جاتا یعنی ہمارے چرواہے اور ان کی زبان عبری میں احمق کو بھی کہتے تھے۔ قرآن میں دوسری جگہ بہ تصریح کہ راعنالیا بالسنتھم یعنی راعنا کا لفظ اپنی زبان کو مروڑ کر کہتے یعنی راعنا کو راعینا کہتے۔ بات پہلے سے مسلسل چلی آرہی ہے۔ پہلے بھی یہودیوں کی شناعتوں کا تذکرہ ہے۔ یہاں بھی ان کی اس خاص شرارت کا ذکر ہے۔ مولانا عثمانی فرماتے ہیں۔ یہود حضورؐ کی خدمت میں آتے تو راعنا کہتے اس کے بھی دو معنے ہیں ایک اچھے اور دوسرے بُرے۔ اچھے معنے تو یہ کہ ہماری رعایت کرو اور بُرے معنے یہ کہ یہود کی زبان میں یہ کلمہ تحقیر ہے یا زبان دبا کر راعینا کہتے۔ یعنی تو ہمارا چرواہا ہے اور یہ ان کی شرارت تھی۔ آیت میں ان کی شرارت اور گستاخی ہی کو بیان کرنا مقصود ہے۔

۲۸۳۔ راعنا۔ تو ہماری رعایت کر، ہمارا خیال کر، ہماری طرف کان لگا۔ اس صورت میں یہ مراعات سے امر بنا ہے جس کے معنے کسی کی بات پر کان رکھنے اور دوسرے کے حق کی رعایت کرنے کے ہیں۔ دراصل بنی اسرائیل حضور انورؐ کی مجلس میں اپنے سلام اور کلام میں ہر ممکن طریقہ سے اپنے دل کا بخار نکالنے کی کوشش کرتے تھے۔ ذو معنی الفاظ بولتے۔ زور سے کچھ کہتے اور زیرِ لب کچھ اور کہہ دیتے۔ اور ظاہری آداب برقرار رکھتے ہوئے درپردہ آپ کی توہین کرنے میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھتے تھے۔ اس خاص لفظ کے استعمال سے مسلمانوں کو روکا گیا ہے۔ کیونکہ یہ ایک ذو معنی لفظ تھا۔ اس لفظ کا ظاہری مفہوم

توریہ تھا کہ ذرا ہماری طرف توجہ کیجئے یا ہماری بات سن لیجئے۔ مگر اس میں کئی احتمالات اور بھی تھے۔ مثلاً عبرانی میں اس سے ملتا جلتا ایک لفظ تھا جس کے معنے تھے سن تو بہرہ ہو جائے اور خود عربی میں راعن کے معنے صاحب رعونت اور جاہل واحمق کے بھی تھے۔ اور گفتگو میں یہ ایسے موقعہ پر بولا جاتا تھا جب یہ کہنا ہو کر ہماری بات سنو تو ہم تمہاری سنیں اور ذرا زبان کو لچکا دے کر راعینا بھی بنا لیا جاتا تھا جس کے معنے اے ہمارے چرواہے کے تھے۔ اس لیے مسلمانوں کو حکم ہوا کہ تم اس لفظ کے استعمال سے پرہیز کرو[1]

۲۸۴ ۔ بلکہ اُنظرنا کہا کرو۔ یعنی راعنا کے بجائے اُنظرنا کہا کرو۔ اس کے معنے بھی وہی ہیں۔ قرطبی نے لکھا ہے کہ مسلمانوں کو حضور انورؐ کو عزت واکرام سے مخاطب کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم پر منظر فرمائیے اور ہماری طرف توجہ فرمائیے۔ پہلے لفظ میں ذو معنی ہونے کی وجہ سے توریہ ہو سکتا ہے اور اس میں توریہ نہیں ہو سکتا۔ توریہ بلاغت کی اصطلاحی زبان میں یہ ہے کہ متکلم ذو معنے لفظ بولے متکلم کی مراد کچھ اور ہو اور مخاطب کچھ اور سمجھے اور بات میں جھوٹ نہ آنے پائے مثلاً ہجرت کے موقعہ پر حضرت ابو بکرؓ اور حضورؐ دونوں سفر میں تھے۔ راستہ میں ایک شخص ملا۔ ابو بکرؓ نے بات چیت کی، بات چیت ہی کے دوران ملنے والے شخص نے حضورؐ کی طرف اشارہ کر کے پوچھا کہ یہ کون ہیں۔ ابو بکرؓ یہ راز اس پر کھولنا نہ چاہتے تھے اس لیے ایسے ذو معنی الفاظ بولے کہ مخاطب کو جواب مل گیا اور راز ظاہر نہ ہوا۔ فرمایا رجل یهدینی السبیل مجھے راہ بتانے والا شخص ہے۔ راہ سے مراد ابو بکرؓ کی راہ نجات تھی اور سمجھنے والے نے سمجھا کہ اس سفر میں راستہ کا کوئی واقف کار ہے۔ اس قسم کی تعبیر کو بلاغت کی زبان میں توریہ کہتے ہیں۔ حافظ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں کہ بنی اسرائیل راعنا بطور توریہ حضور انورؐ کی شانِ اقدس میں استعمال کرتے تھے۔ حافظ ابن تیمیہؒ کہتے ہیں کہ یہودی راعنا سے رعونت کے معنے مراد لیتے تھے۔ گفتگو میں یہ الفاظ بولتے اور باہم ایک دوسرے کو دیکھ کر ہنستے۔ سعد بن معاذؓ اس حرکت کو تاڑ گئے۔ بول پڑے۔ بخدا اب اگر تم میں سے کسی کو یہ لفظ بولتے سنا تو گردن اڑا دوں گا[2]

۲۸۵ ۔ پھر جو کچھ کہیں کان لگا کر سنو۔ یعنی ابتداء ہی سے متوجہ ہو کر سنو تاکہ مکرر پوچھنا نہ پڑے۔ یعنی رسولؐ کے ارشادات ادب وتعظیم کے ساتھ توجہ سے سنو۔ یہودیوں کو تو بار بار یہ کہنے کی ضرورت اس لیے پیش آتی ہے کہ وہ نبی کی بات توجہ سے نہیں سنتے مگر تمہیں اللہ رسولؐ کی بات غور سے سننی چاہیے۔

---

[1] تفہیم القرآن ج ۱ ص ۱۰۰ [2] الصارم المسلول ص ۲۳۳

آیت کا حاصل یہ ہوا کہ جناب نبوّت میں راعنا نہ بولو کہ یہ ذو معنے لفظ ہے۔ اس سے علاّمہ ابوبکر ابن العربی نے یہ بات خوب سمجھی ہے کہ جن الفاظ میں اہانت اور بے ادبی کا احتمال بھی ہو بارگاہِ رسالت میں ان کے استعمال سے بھی پرہیز کرنا چاہیے۔ قرطبی بھی یہ بات کہنے میں ابن العربی کے ہم زبان ہیں۔ اور حافظ ابن تیمیہؒ اس سے دو قدم آگے بڑھ کر فرماتے ہیں کہ دل میں رسالت کی تصدیق بالذات استخفاف واستہانت سے مانع ہے۔ الفاظ کا ایسا پیمانہ جس سے نبوّت کی جناب میں گستاخی کو بُو بھی آتی ہو ایمان سے خارج کر دیتا ہے۔

اس آیت سے علاّمہ قرطبی نے اسلامی آئین کی وہ دستوری دفعہ بھی معلوم کی ہے جس پر بہت سے اسلامی زندگی کے قوانین کا مدار ہے اور اسلامی مملکت میں جس کی اساس پر قانون سازی کی جاتی ہے آئینِ اسلامی کی اس دستوری دفعہ کو سدِ ذرائع کے نام سے پکارتے ہیں۔ اس پر تفصیلی بحث پارہ ۸ سورۂ انعام میں آئے گی۔ یہاں چند اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

ذرائع کی حقیقت یہ ہے کہ اگر اسلام کسی کام کی لوگوں پر ذمہ داری ڈالتا ہے تو اس کے حصول کے تمام وسیلے مطلوب ہوں گے اور ایسے ہی اگر اسلام کسی کام سے روکتا ہے تو ہر وہ راستہ جو اس کے کرنے میں معاون و مددگار ہو حرام ہو گا۔ یہ اسلام میں قانون سازی کی اہم دفعہ ہے۔ احناف، مالکیہ اور حنابلہ نے اس پر کافی اعتماد کیا ہے۔ اس کی روشنی میں اگر کوئی امر اسلام میں مطلوب ہے تو دوسرے درجہ میں اس کے حصول کا ذریعہ بھی مطلوب ہو گا اور ہر ناجائز چیز کے حصول کا ذریعہ بھی ناجائز اور حرام ہو گا۔ اس لیے یہ ذریعہ یا وسیلہ مامور بہ یا منہی عنہ، چیز تک رسائی کا سبب بن سکتا ہے۔ قرطبی فرماتے ہیں کہ

یہ آیت بتا رہی ہے کہ لفظ راعنا کا استعمال چونکہ جنابِ نبوّت میں گستاخی اور بے ادبی کا ذریعہ ہے اس لیے اس لفظ کے استعمال پر اللہ سبحانہٗ کی جانب سے قدغن قائم کر دی گئی ہے بعض معاصر مفسرین کی حسِ توحید اس قدر تیز ہے کہ انہوں نے اس لفظ سے بُوئے شرک سونگھ کر یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ

اس لفظ سے یہودیوں کا مقصد مسلمانوں میں غیر اللہ کے حافظ و ناصر ہونے کا خیال ڈالنا تھا تاکہ مسلمانوں میں غیر شعوری طور پر شرک کا عقیدہ رائج ہو جائے تو اللہ تعالیٰ نے ایسے موہم شرک لفظ سے منع کر دیا۔ شرک کی قباحت اپنی جگہ مسلم ہے لیکن اس آیت میں تاویل و توجیہہ کا یہ انداز نہ صرف یہ کہ منقول نہیں ہے بلکہ آیت کے مطالب کو مضحکہ خیز بنانے کے مترادف ہے۔ آیت میں راعنا کے استعمال

سے جس بنیاد پر رد کا گیا ہے وہ ابہام شرک نہیں بلکہ ذریعہ استخفاف شانِ نبوت ہے۔ قرطبی لکھتے ہیں :
لانہ ذریعۃ للسب، کیونکہ یہ لفظ حضور کی شان میں گستاخی کا ذریعہ ہے۔ آلوسی فرماتے ہیں و نھی المومنون سد الباب۔ نبوت کی شان میں گستاخی کے دروازے بند کرنے کے لیے راعنا کے استعمال سے منع کیا ہے۔ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں نھی المومنین عن مشابھۃ الکافرین قولاً و فعلاً اللہ نے مومنین کو گفتار و کردار میں کافروں کی کاپی کرنے سے منع فرمادیا ہے۔ حافظ ابن جریر رقم طراز ہیں۔ درست یہی ہے کہ اللہ پاک نے اہلِ ایمان کو راعنا کے لفظ استعمال کرنے سے اس لیے روکا ہے کہ اللہ کو اپنے نبی کے لیے یہ گوارا نہ تھا۔ ابوحیان اندلسی نے جمہور مفسرین کی طرف منسوب کرکے لکھا ہے کہ راعنا کے استعمال سے اس لیے روکا گیا ہے کہ اس میں بہت بڑا مفسدہ ہے۔ یہ مفسدہ کیا ہے سب کا فیصلہ یہی ہے کہ شانِ نبوت میں گستاخی۔ بہرحال بتانا یہ ہے کہ چونکہ اس لفظ کا استعمال ذریعہ ہے۔ شانِ نبوت میں گستاخی کا اور نبوت کا مقام اتنا ارفع اور اتنا اعلیٰ اور اولیٰ ہے کہ گستاخی تو درکنار ان کی جناب میں آواز کا بلند کرنا بھی تمام اعمالِ حیات کو اکلوت کر دیتا ہے۔ حافظ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں ۔

حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ گرامی میں بے ادبی بنیادی طور پر اللہ کے دین کے منافی ہے بے ادبی سے احترام اور تعظیم پامال ہو جاتا ہے۔ احترام نہیں تو جو کچھ نبوت لے کر آئی ہے اس کا بھی کوئی مقام نہیں رہتا ہے۔ پورا دین، پورا ایمان حرف غلط ہو کر رہ جاتا ہے۔ اسی بنا پر ان کی مدح سرائی، آپ کی تعریف، آپ کی تعظیم، آپ کی توقیر سے بھی سارے دین کا قیام وابستہ ہے اور اس سے محرومی درحقیقت پورے دین سے محرومی ہے ۔[1]

اور یہ بھی لکھا ہے کہ

یہ ناممکن ہے کہ جس قلب میں آپ کا احترام ہو اس کی زبان پر گستاخی اور بے ادبی ہو۔ احترام اور توہین کبھی یکجا نہیں ہو سکتے ہیں ۔

بہرحال بتانا یہ ہے کہ رسالت کی ذات سے محبت، آپ کی تعظیم ایمان کا لازمہ ہے۔ شانِ نبوت میں بے ادبی بقول حافظ ابن تیمیہؒ کفرِ ابلیس سے زیادہ سنگین جرم ہے ۔ قرآن اسی جرم کی طرف جانے والے ذریعہ پر پابندی لگا رہا ہے۔ ذرائع کا یہ زرّیں اصول اسلام کی قانون سازی میں بے حد قیمتی ہے۔ اس کی کچھ قیمت کا اندازہ کرنا ہو تو اعلام میں حافظ ابن القیم کا یہ بیان پڑھیے :

---

[1] الصارم المسلول ص ۴۰۲

اس میں شبہ نہیں کہ مقاصد تک پہنچنے کے ذرائع اور راستے ضرور ہوتے ہیں اور ان کا حکم بھی مقاصد ہی کا ہوتا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ معاصی اور محرمات سے روک دیتا اور گناہ کی طرف جانے والے راستے کھلے رکھتا تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ ایک طرف معاصی سے روکا اور دوسری طرف معاصی پر آمادہ کرنے والی چیزوں کو بحال رکھا۔ اور اس طرح تحریم کے حکم کو توڑ دیا۔ ظاہر ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی حکمتِ کاملہ اور اس کے علمِ محیط کے سراسر منافی ہے۔

اس موضوع پر ابن القیم نے اعلام میں سیر حاصل بحث کی ہے اور اغاثۃ اللهفان میں مختصر۔ اور عملی زندگی میں اسلامی قانون میں سے چن چن کر مثالیں پیش کی ہیں۔ آپ بھی کچھ مثالیں سن لیجئے۔

فتنہ و فساد کے زمانہ میں اسلحہ جنگ بیچنا حرام ہے اس لیے کہ ایسے موقع پر ان کا فروخت کرنا شر کی توسیع کا ذریعہ ہے کیونکہ جب فساد ممنوع ہے تو اس کے ذرائع بھی ممنوع ہیں۔

معاشیات کے طالبعلم یہ سُن کر حیران ہوں گے کہ اسی اصل کی بنا پر امام احمدؒ نے یہ فتویٰ دیا ہے کہ اگر کوئی شخص کھانے پینے کا ضرورت مند ہے اور یہ چیزیں اس کے پڑوسی کے پاس موجود ہیں اور وہ دیتا نہیں ہے یہاں تک کہ وہ بھوک اور پیاس سے مرجاتا ہے تو کھانے یا پانی کے مالک پر اس کا خون بہا واجب ہوگا حالانکہ اس نے غلطی سے یا عمداً قتل نہیں کیا ہے مگر چونکہ اس کی ذخیرہ اندوزی ایک شخص کی موت کا ذریعہ بنی ہے اس لیے اس پر دیت واجب ہوگی۔

امام احمد اس تاجر سے خریدنا ناجائز سمجھتے تھے جو اپنے پڑوسی تاجر کو نقصان پہنچانے کے لیے قیمت گھٹا کر فروخت کرے۔ یہ فتویٰ اسی اصل پر مبنی ہے۔

اگر کسی جائز کام سے دوسروں کو ناجائز کاموں کی گنجائش ملتی ہو تو یہ جائز فعل بھی ناجائز ہوگا۔

۲۸۶
۵۔ ان کافروں کے لیے دردناک عذاب ہے۔ آلوسی کہتے ہیں کہ لام عہد کے لیے اور کافرین سے مراد وہ یہودی ہیں جنہوں نے شانِ نبوت میں گستاخی کی ہے۔ اصول کے مطابق بات کا اندازہ تو یہ ہونا چاہیے کہ ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔ لیکن ارشاد یہ ہوا ہے کہ ان کافروں کے لیے دردناک عذاب ہوگا۔ اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ شانِ نبوت میں گستاخی اور بے ادبی اتنا سنگین کفر ہے کہ جس کا نتیجہ عذاب الیم ہے۔ حافظ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں،

حضور انورؐ کی شان میں گستاخی کا درجہ ہرگز وہ نہیں ہے جو اُمت کے اہلِ ایمان کی گستاخی کا ہے۔ کیونکہ آپؐ کی ذات گرامی اُمت کے تمام افراد سے حقوق میں ایک نمایاں امتیاز رکھتی ہے۔ آپؐ کی شان میں گستاخی کفر ہے جب کہ دوسرے اہلِ ایمان میں سے کسی

مَا يَوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتٰبِ وَلَا الْمُشْرِكِينَ أَنْ يُنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ خَيْرٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۗ وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۗ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿۱۰۵﴾

نبوت کے منکر اہلِ کتاب ہوں یا مشرکین اُن کو یہ بات پسند نہیں ہے کہ تمہارے پروردگار کی جانب سے تم پر وحیِ الٰہی کی خیر و برکت نازل ہو۔ لیکن اللہ کا قانون یہ ہے کہ وہ جسے چاہتا ہے اپنی رحمت کے لیے خاص کر لیتا ہے اور اللہ بہت ہی بڑے فضل والا ہے۔

مومن کی بے ادبی صرف گناہ ہے اور قانون میں سزائیں جرائم کے مطابق ہوتی ہیں۔ (الصارم المسلول)
گستاخی تو بڑی بات ہے شانِ نبوت میں تعریض بھی کفر ہے۔ حافظ ابن تیمیہؒ نے عذابِ الیم کی تشریح کرتے ہوئے دُنیا میں گستاخِ نبوت کی سزا اس کے وجود سے زمین کو پاک کرنا بتایا ہے۔ اس پر تو ائمہ کا اتفاق ہے۔ احناف، موالک، شوافع اور حنابلہ سب ایک زبان ہیں۔ اختلاف اس میں ہے کہ حضور انورؐ کے گستاخ کو یہ سزا کفر کی بنا پر دی جا رہی ہے یا یہ حضورؐ کی شان میں گستاخی کی قانونی سزا یہی ہے اس کی تفصیلات ان شاء اللہ پارہ ۲۶ سورۂ حجرات میں آئیں گی۔

کفر پر یہودیوں اور مُشرکین کی یونین

یہودیوں کی بُرائیوں کے سلسلے میں بتایا جا رہا ہے کہ شانِ نبوت میں اُن کا یہ گستاخانہ انداز اس لیے نہ تھا کہ نبوت کی ذات اپنی زندگی کے کسی پہلو میں کوئی کمی رکھتی ہے۔ آپؐ کی کتابِ زندگی کے اوراق کھلے ہوئے ہیں۔ اس پر آج تک آپؐ کے معاصر مخالفین میں سے کسی نے کبھی کوئی نکتہ چینی نہیں کی ہے آپؐ کی ذات سب کے نزدیک جملہ اخلاقِ فاضلہ سے محلّی، اور اخلاقِ رذیلہ سے معرّیٰ، جوانی میں عفت و عصمت کے مثالی نمونہ، پیری میں وفا اور رُعب کا پیکر، بال بال سے حسن ٹپکتا، بات بات سے پھول جھڑتے،

روئیں روئیں سے فہم وفراست ٹپکتی، سب سے زیادہ راست گو، سب سے بڑھ کر امانتدار، احبار و رہبان یہود آپؐ کے نبی موعود ہونے پر متفق، مشرکین عرب آپؐ کی صفات کے معترف۔ اس کے باوجود اگر آپ کی مجلس میں آنے والے یہودی بے ادبی کرتے ہیں تو کیوں؟ فرمایا اس لیے اور صرف اس لیے کہ آپؐ کی نبوّت کی وجہ سے چاہے یہودی ہوں یا عیسائی اور یا پھر مشرکین ان میں سے کسی کو یہ بات پسند نہیں کہ وحیِ الٰہی کی خیر و برکت آپؐ کے پاس ہو۔ تمہارے پاس وحی کے نہ ہونے میں ان سب کا ایکا ہے اور سب نے یونہی بنا رکھی ہے۔ اس آیت میں قرآن نے اسی سوال کا جواب دیا ہے۔

ف۲۸۷۔ پسند نہیں ہے اصل ارشاد میں مایود ہے ود سے بنا ہے اس کے معنے چاہت، پسند اور ہونے کی آرزو کے ہیں۔ الذین کفروا سے نبوّت اور قرآن کے منکر مراد ہیں۔ چاہے یہ کفر کسی قسم کا ہو۔ قرآن کا انکار بھی کفر ہے اور قرآن میں بیان شدہ مضامین میں سے کسی ایک بات کا انکار بھی کفر ہے اور جیسے قرآن کا انکار کفر ہے ایسے ہی رسولؐ کی شخصیت کا انکار بھی کفر ہے اور رسولوں میں سے کسی ایک رسول کا انکار بھی کفر ہے۔ قرآن اور رسول کی شخصیت تک ایمان کی حدود میں تفریق بھی کفر ہے۔ قرآن کے بتائے رسول کے مقامات کا انکار کرنا رسول کے انکار کے مترادف ہے۔ الغرض اس میں ہر قسم کا کفر داخل ہے۔ نبوّت کے منکروں کے دو طبقے زمانۂ نبوّت میں پیش پیش رہے۔ ایک اہلِ کتاب دوسرے مشرکین۔ اہلِ کتاب سے مراد تورات و انجیل کے ماننے والے ہیں۔ یہ دونوں توحید و نبوّت کے قائل تھے اور خدا کی وحی اور آخرت پر ایمان کے مدعی تھے معنوی تاویلات اور لفظی تحریفات کر کے نبیوں کی تعلیمات مسخ کر چکے تھے۔ آلوسی لکھتے ہیں کہ یہاں اہلِ کتاب لاکر دونوں پر تعریض کی گئی ہے کہ اُن کی کتاب تو اُن سے کہہ رہی ہے کہ حق کی آواز پر لبیک کہو مگر ان کا کفر رکاوٹ بنا ہوا ہے اور کفر اب جرثومہ خبیث ہے کہ جس زمین میں یہ پیدا ہو جاتا ہے چاہے وہ زمینِ علم ہی کیوں نہ ہو اس کو بھی پامال کر دیتا ہے کیونکہ کفر حسد کو جنم دیتا ہے اور حاسد خیر کا بیری اور دشمن ہوتا ہے۔ علمائے یہود اس بیماری کے مریض رہے ہیں۔

ف۲۸۸۔ تمہارے پروردگار کی جانب سے تم پر خیر نازل کی جائے۔ خیر سے مراد یہاں اللہ کی وحی ہے، مطلب آیت کا یہ ہے کہ یہودی ہوں یا عیسائی اور یا مشرکین ان کو یہ کسی درجہ میں پسند نہیں ہے کہ تم اللہ کی وحی کی نعمت سے مالا مال ہو۔ یہود تو اس لیے نہیں چاہتے کہ ان میں عرب کے خلاف تعصب ہے اور وہ اس سے جلتے ہیں کہ دُنیا کی امامت و قیادت اللہ کی جانب سے ان کو کیوں ملی ہے اور مشرکین اس لیے کہ اُن کے رؤسا کا اقتدار و بالادستی اس کے نتیجے میں ختم ہو رہا ہے اور

اگر خیر سے صرف وحی نہیں بلکہ اس سے ہر قسم کی فلاح دُنیوی و اُخروی مراد لی جائے اور اس کے تحت میں علم و حکمت نصرتِ غیبی، فتوحاتِ ملکی اور سیاسی برتری کو شامل کر لیا جائے تو مطلب یہ ہے کہ چاہے وہ اہلِ کتاب ہوں یا مشرکین اُن کو یہ کسی طرح گوارا ہی نہیں ہے بلکہ اُن پر یہ بات شاق گذر رہی ہے کہ مسلمانوں پر خیر و برکت کا نزول ہو۔ قاضی شوکانی فرماتے ہیں کہ وہ مسلمانوں پر کسی نوعِ خیر کا نزول دیکھنا گوارا نہیں کرتے ہیں۔

یہاں خیر نکرہ ہے اور نفی کے تحت آیا ہے اور نفی میں مبالغہ کے لیے اس کی پیشانی پر مِنْ لگا ہے۔ پہلی آیت نے بتایا تھا کہ اُن کا نبوت کے ساتھ معاملہ گستاخانہ ہے۔ اس آیت نے یہ بات کھول دی کہ اس گستاخی اور بے ادبی کی وجہ یہ ہے کہ یہ سب کُفر کی برادری ہے اور اس برادری میں مشرک اور کتابی کی کوئی تمیز نہیں۔

اس موضوع پر ان سب کا ایکا ہے اور ان میں یہ ذہن بنی ہوئی ہے کہ وہ اسلام اور مسلمانوں کی برتری کو کسی درجہ پسند نہیں کرتے۔ اور جب ان کو تمہاری عزت، تمہارا علم، تمہاری سیادت، تمہاری سیاست، تمہارا نظامِ زندگی، تمہارے نظریات اور تمہارے اعمال و اخلاق پسند نہیں ہیں اور اس ناپسندیدگی کا باعث اُن کا کُفر ہے تو پھر ان سے بارگاہِ نبوت میں ادب و احترام کی کیا توقع ہو سکتی ہے اور کُفر کی اس برادری میں یہودی ذہن تو یہ ہے کہ یہ نبوت تم سے چھین کر ان کو ملے اور خدا کی جانب سے آنے والی خیر ان کے مشورے سے تقسیم ہو اور تقسیم بھی ایسی کہ اُن کے سوا کسی کو نہ دی جائے۔

۲۸۹ ۔ اللہ کا قانون یہ ہے کہ وہ جسے چاہتا ہے اپنی رحمت کے لیے خاص کر لیتا ہے: یہود یہ تمنا کرتے تھے کہ نبی آخر الزماں بنی اسرائیل میں پیدا ہو لیکن یہ تو اللہ کے فضل کی بات ہے کہ اُمّی لوگوں میں نبی آخر الزماںؐ پیدا فرمایا[1]

یعنی یہود کو اصل حسد اس کا تھا کہ نعمتِ نبوت اور نبوت کے نام پر اللہ کی جانب سے اُترنے والی ہر خیر کے تو ہم حقدار ہیں۔ اہلِ عرب کو کہ بنی اسماعیل ہیں یہ نعمت کیوں ملی ہے۔

اس آیت میں اللہ سبحانہٗ نے یہودیوں کے اسی مزعومہ کا یہ جواب دیا ہے کہ یہ یہودیوں کی انتہائی عداوت اور طبیعت کے فساد کی نشانی ہے کہ وہ تقسیمِ رحمت پر اللہ سے ناراض اور اس پر اعتراض کر رہے ہیں۔ لیکن اللہ کو نہ کسی کی ناراضگی نقصان پہنچاتی ہے اور نہ کسی کا حسد اللہ کا کچھ بگاڑتا ہے۔ اس کا قانون یہی ہے کہ جب چاہتا ہے اور جسے چاہتا ہے اپنی نعمتوں سے نوازتا ہے۔ رحمت و فضل دونوں کے تذکرے میں لفظِ اللہ خاص طور پر لائے ہیں۔ بتانا یہ ہے کہ یہ دونوں بالذات اللہ کا حق ہیں بندوں میں سے

---

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۲۰

مَا نَنۡسَخۡ مِنۡ اٰيَةٍ اَوۡ نُنۡسِهَا نَاۡتِ بِخَيۡرٍ مِّنۡهَاۤ اَوۡ مِثۡلِهَا ؕ اَلَمۡ تَعۡلَمۡ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ ﴿۱۰۶﴾ اَلَمۡ تَعۡلَمۡ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلۡكُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ وَمَا لَكُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ مِنۡ وَّلِىٍّ وَّلَا نَصِيۡرٍ ﴿۱۰۷﴾

ہم اپنے احکام میں جس حکم کو بھی منسوخ[۲۹۰] کرتے ہیں یا بھلا[۲۹۱] دیتے ہیں تو ہم اس کی جگہ اس سے بہتر[۲۹۲] یا اسی جیسا حکم لاتے ہیں۔ کیا تم جانتے[۲۹۳] نہیں ہو کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ کیا تم نہیں جانتے کہ زمین[۲۹۴] و آسمان کی سلطنت اللہ کی ہے اور اس کے سوا کوئی نہیں جو تمہارا مددگار اور حمایتی ہو۔

کسی کو یہ حق نہیں ہے کہ اس کی داد و دہش یا اسکی روک اور ممانعت پر کسی طرح اثر انداز ہو سکے۔ اللّٰھم لامانع لما اعطیت ولا معطی لما منعت۔

قرآن میں فضل و رحمت کا کیا مفہوم ہے۔ اس پر کچھ اشارات فاتحہ کی تفسیر میں گزر چکے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ فضل سے ہدایت اور رحمت سے انعام مراد ہوتا ہے۔ قرآن میں آغاز بقرہ میں اتقیا کے بارے میں اس خیر اولٰئک علیٰ ھدی من ربھم واولٰئک ھم المفلحون۔ کا یہی مطلب ہے کہ اس جماعت پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت ہوئی ہے۔ قرآن کے اوصاف میں یہ دو لفظ ہدایت اور رحمت بار بار آتے ہیں ھدی ورحمۃ لقوم یومنون، ھدی ورحمۃ وبشری للمسلمین، ھدی ورحمۃ للمومنین۔ فضل ہو یا رحمت یہ اللہ کی صفت عطاء سے تعلق رکھتا ہے اور اس کے مقابلے میں اضلال اور عذاب اس کی صفت منع سے اپنی دینے اور اپنی نہ دینے میں ہر قسم کے تصرف کا صرف وہی مالک ہے۔ اس کی حکمت بالغہ، ملکیت تامہ اور علم محیط کے تحت سب کچھ ہوتا ہے کوئی نہیں جو اس پر قدغن قائم کرے۔

نسخ شرائع یا نسیان شرائع

یہ ایک خاص شبہ کا جواب ہے جو یہودی مسلمانوں کے دلوں میں ڈالنے کی کوشش کرتے تھے ان کا اعتراض یہ تھا کہ اگرچہ پچھلی کتابیں بھی اللہ سبحانہٗ کی جانب سے آئی ہیں اور یہ قرآن بھی خدا ہی کی طرف

سے ہے تورات کے بعض احکام کی جگہ دوسرے احکام اس میں کیوں دیے گئے ہیں؟ یہودیوں کو یہ اعتراض نماز میں سمتِ قبلہ بنی اسرائیل کی ربّانی مسجد بیت المقدس کی جگہ ابراہیمی خانہ کعبہ کے مقرر ہونے اور خانہ کعبہ کا حج فرض ہونے پر ہوا کہ یہ دونوں باتیں یہودیوں میں نہ تھیں۔ یہ اعتراض وہ تحقیق کی خاطر نہیں بلکہ اس لیے کرتے تھے کہ مسلمانوں کو قرآن کے من جانب اللہ ہونے میں شک ہو جائے۔ ان آیات میں یہودیوں کے اسی اعتراض کا جواب ہے۔ قرآن نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ نسخ کے معنے کسی حکم کو اس کے غلط ہونے یا غیر مفید ہونے کی بنا پر ہٹانے کے نہیں ہیں بلکہ صرف احکام کی جگہ پر اصل احکام دوبارہ نازل ہونے اور دُنیا کے حسبِ حال ناقص کی جگہ کامل اور کامل کے بدلے کامل تر تعلیمات لانے کے ہیں۔ قرآن کے ناسخ کتب اور اسلام کے ناسخ یہودیت و عیسائیت ہونے کے معنے ان کے مٹا دینے کے نہیں بلکہ ان کی تکمیل کرنے کے ہیں۔ مذاہب کی تاریخ جب سے شروع ہوئی ہے ہر مذہب اور اس کی کتاب انسانی عروج و ترقی کی ایک ایک منزل ہے۔ اور اسلام اس سلسلۂ ارتقا کی وہ کامل ترین انتہائی منزلِ مقصود ہے جس کے بعد تکمیلِ دین کی سرحد ختم ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ خود اسلام کا دعویٰ ہے اور اس دعویٰ میں کوئی اور دین اس کا شریک نہیں ہے۔ اس لیے تمہیں اس پر یقین کرنا چاہیے۔ کہ آدم سے لے کر حضرت عیسیٰ تک ایک ہی پیغام تھا جو آتا رہا، ایک ہی دین تھا جو سکھایا جاتا رہا۔ اور ایک ہی حقیقت تھی جو دُہرائی جاتی رہی۔ لیکن وہ بار بار انسانوں کے نسیان و تغافل اور تصرف و تحریف سے بدلتی رہی، گم ہوتی رہی اور آخری بار دُنیا کے کمالِ بلوغ کے زمانے میں وہ پوری حفاظت کے وعدہ کے ساتھ محمد رسول اللہ کے ذریعہ سے مفصل اور کامل ہو کر نازل ہوئی ہے۔ اور قیامت تک محفوظ رہے گی۔ گویا قرآن یہ بتانا چاہتا ہے کہ ایک شریعت کے بعد دوسری شریعت اس لیے آتی ہے کہ یا تو نسخ کی حالت طاری ہوئی یا نسیان کی۔ نسخ یہ ہے کہ ایک بات پہلے سے موجود تھی لیکن موقوف ہو گئی۔ اور اس کی جگہ دوسری بات آگئی۔ نسیان کے معنے بھول جانے کے ہیں۔ بعض حالات میں ایسا ہوا کہ پچھلی شریعت کسی نہ کسی شکل میں موجود تھی لیکن انسانی زندگی کے احوال و ظروف بدل گئے تھے یا اس کے پیرو کاروں کی عملی رُوح معدوم ہو گئی تھی اس لیے ضروری ہوا کہ نئی شریعت ظہور میں آئے۔ بعض حالتوں میں ایسا ہوا کہ امتدادِ زمانہ سے پچھلی تعلیم بالکل فراموش ہو گئی اور اصلیت میں سے کچھ باقی نہ رہا۔ اس لیے تجدیدِ ہدایت ضروری ہوئی۔ سنۃ الٰہی یہ ہے کہ نسخِ شرائع ہو یا ان کا نسیان۔ لیکن ہر نئی تعلیم پچھلی تعلیم سے بہتر ہو گی یا اس جیسی ہو گی۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ کمتر ہو کیونکہ مقصود تکمیل و ارتقا ہے اور بس۔

---

۲۹۰ - اپنے احکام میں سے جس حکم کو بھی ہم منسوخ کرتے ہیں۔ اصل ارشاد میں ما ننسخ من آیۃٍ

ہے۔ نسخ کے معنے عربی زبان میں ہٹا دینے کے ہیں، یہ ہٹانا چاہے بالذات ہو، جیسے بولتے ہیں سُورج نے سایہ کو ہٹا دیا نسخت الشمس الظل یعنی ایک جگہ سے سایہ کو دوسری جگہ ہٹا دیا۔ کتاب کو نقل کرنے کو بھی نسخت الکتاب اس وقت کہتے ہیں جب کتاب بعینہٖ نقل کی جائے یعنی ایک جگہ سے ہٹا کر دوسری جگہ لائی جائے اور اس میں ابدال کے معنے ہیں۔ نیز اس کے معنے مٹانے کے بھی ہیں۔ جیسے نسخت الریح الاثر ہوا نے نشان مٹا دیا۔ اس طرح عربی میں نسخ کے تین معنے ہوئے۔ ہٹانا، بدل دینا اور مٹا دینا۔ آیت کے معنے میں عربی زبان میں بڑی گنجائش ہے۔ لکھی ہوئی آیت کو بھی آیت کہتے ہیں، نبی کے معجزہ اور نبوت کی دلیل کو بھی آیت کہتے ہیں۔ لکھی ہوئی آیت میں بھی عموم ہے۔ قرآن کی آیت بھی آیت ہے اور کُتب سابقہ کی آیات بھی آیات ہیں۔ یہاں تک تو مطلب صاف ہے کہ ہم جب بھی کسی آیت کو مٹاتے، ہٹاتے یا بدل دیتے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ آیت سے یہاں کیا مراد ہے، دلائل، معجزات، کتبِ سابقہ کی آیات، یا قرآن کی آیات۔

دلائل و معجزات اگر مراد ہوں تو پھر بھی بات میں کوئی گنجلک نہیں ہے اور اس میں کوئی کلام نہیں کہ نبوت کو ثابت کرنے کے لیے دلائل و معجزات کی بارش ہوتی رہتی ہے لیکن جس سیاق و سباق میں یہ بات کہی وہ اس کا محل نہیں ہے۔

کتبِ سابقہ کی آیات مراد ہوں تو اس میں بھی بات واضح ہے کہ اللہ کی سنت یہ رہی ہے کہ ہر قوم کی زمانی و مکانی خصوصیات کی وجہ سے احکام و آیات بدلتے رہے ہیں۔ اب آخری بار انسانیت کے کمال کے زمانہ میں قرآن کی صورت میں احکام نازل ہوئے۔

اگر آیاتِ قرآنی مراد ہوں جیسا کہ جمہور مفسرین کا خیال ہے تو اہلِ سنت میں اس موضوع پر کبھی دو رائیں نہیں ہوئی ہیں۔ امام رازی نے یہ بات بڑی پتے کی لکھی ہے اجتمع الجمہور من المسلمین علی جواز النسخ ووقوعہ۔ اس کو مانتے ہوئے یہاں سوال یہ اُبھرتا ہے کہ قرآن کی اس آیت میں کون سا نسخ بیان کیا جا رہا ہے ہماری رائے میں آیت میں اصلاً نسخ شرائع اور ضمناً نسخ احکامِ قرآنی کا ذکر ہے۔ اصلاً قرآن میں احکام و آیات کے نسخ کو پارہ ۱۴ میں بیان کیا گیا ہے۔ یہاں معترض یہودی ہیں۔ ان کے اعتراض کا جواب دیا جا رہا ہے۔ یہودی نسخ کے قائل نہ تھے۔ نسخ کیا ہے؟ کہاں ہوتا ہے؟۔ اس کے لیے ہم مولانا رحمت اللہ کیرانوی کی کتاب اظہارِ الحق، سے ناظرین کی ضیافتِ طبع کے لیے ایک اقتباس پیش کرتے ہیں۔

لغت میں نسخ کے معنے زائل کر دینا، مٹا دینا ہیں۔ مسلمانوں کی اصطلاح میں کسی عملی حکم کی مدت کی انتہا بیان کرنا جو تمام شرائط کو جامع ہو نسخ کہلاتا ہے۔ کیونکہ ہمارے نزدیک واقعات و قصص

میں نسخ نہیں ہوتا۔ نیز اُمورِ قطعیہ میں نسخ ممکن نہیں ہے۔ مثلاً یہ کہ خداوندِ عالم موجود ہے اس کا نسخ نہیں ہوسکتا اسی طرح اُمورِ حسیہ میں نسخ نہیں ہوسکتا۔ مثلاً دن کی روشنی، رات کی تاریکی، اسی طرح دُعاؤں میں اور ان احکام میں جو اپنی ذاتی حیثیت سے واجب ہیں۔ مثلاً آمنوا۔ لا تشرکوا، اسی طرح ان احکام میں بھی نسخ نہیں جو دائمی اور ابدی ہیں جیسے لا تقبلوا لھم شھادۃ ابداً اور ان احکام میں جن کا وقت مقرر ہے۔ اس وقت معین سے پہلے نسخ کا امکان نہیں ہے جیسے فاعفوا واصفحوا حتی یاتی اللہ بامرہ۔ بلکہ نسخ صرف ان احکام میں ہوسکتا ہے جو عملی ہوں اور وجود و عدم دونوں کا احتمال رکھتے ہوں نہ دائمی ہوں اور نہ کسی وقت کے ساتھ مخصوص کیے گئے ہوں۔ ایسے احکام کو احکامِ مطلقہ کہا جاتا ہے۔ ان میں یہ بھی ضروری ہے کہ زمانہ اور مکلف اور صورت متحد نہ ہو بلکہ تینوں میں اختلاف ہو یا بعض میں مطلب یہ ہے کہ جس زمانہ میں جس شخص کو جس صورت کے ساتھ ایک کام کا حکم دیا گیا ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ اسی زمانے میں اسی شخص کو اسی صورت میں منع کر دیا جائے بلکہ نسخ میں یا زمانہ بدلے گا یا وہ شخص یا صورت یا تینوں۔

نسخِ اصطلاحی کے یہ معنے ہرگز نہیں ہیں کہ پہلے خدا نے کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کا حکم دیا۔ مگر اس کا انجام اللہ کو معلوم نہ تھا۔ پھر خدا کی رائے اس کے خلاف قائم ہوئی۔ اس لیے پہلے حکم کو ختم کر دیا کہ نعوذ باللہ خدا کا جاہل ہونا لازم آئے یا پہلے کسی کام کے کرنے نہ کرنے کا حکم دیا پھر اس کو تینوں باتوں میں اتحاد کے باوجود منسوخ کر دیا۔ اگر ہم یہ کہیں کہ خدا کو انجام معلوم نہیں تب بھی اس سے خدا کی شان میں قباحت لازم آتی ہے۔ العیاذ باللہ۔ چنانچہ ایسا نسخ ہمارے نزدیک جائز نہیں ہے۔ اللہ کی شان اس عیب سے بلند و بالا ہے بلکہ نسخ کا مطلب صرف یہ ہوتا ہے کہ اللہ کو پہلے سے یہ بات معلوم تھی کہ یہ حکم انسانوں پر فلاں وقت تک باقی رہے گا پھر منسوخ کر دیا جائے گا۔ پھر جب وہ وقت آجاتا ہے تو اللہ تعالیٰ دوسرا حکم جس سے کمی بیشی یا بالکل کسی حکم کا ختم ہونا معلوم ہو جاتا ہے۔ تو درحقیقت یہ صرف پہلے حکم کی مدت کا بیان ہوتا ہے مگر چونکہ بندوں کے سامنے پہلے حکم میں مدتِ حکم کو بیان نہیں کیا گیا تھا اس لیے دوسرا حکم لوگ اپنی کوتاہی فہم کی بنا پر خیال کر لیتے ہیں کہ حکم میں تبدیلی ہوئی ہے[1]

خلاصہ یہ ہے کہ نسخ کے معنے صرف یہ ہیں کہ کسی حکم کے بدلے یہ اعلان ہو کہ اس حکم کی مدت ختم ہو چکی ہے یا اس میں عموم و اطلاق کا زمانہ ختم ہو گیا ہے اور بس۔

---

[1] اظہار الحق ج ۲ ص ۹۷-۹۸-۱۹۹۔

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی نے مسئلہ نسخ کو اپنے مخصوص حکیمانہ انداز میں اس طرح پیش فرمایا ہے۔
اللہ کے احکام میں اگر تبدیلی خلافِ عقل ہے تو بلاشبہ ارادہ خداوندی میں بھی تبدیلی خلاف عقل ہے حکم کی تبدیلی میں اگر یہ خرابی ہے کہ اللہ پاک کی طرف غلط فہمی کی نسبت ہوگی تو ارادے کے بدلنے میں بھی خرابی ہے۔ ارادہ کا بھی حکم ہی کی طرح سمجھ سے تعلق ہے۔ حکم دیتے وقت بھی دل میں کچھ سوچ لیتے ہیں۔ ارادہ بھی کسی کام کا اسی وقت ہوتا ہے جب پہلے دل میں سمجھ لیا جائے۔ اگر صورتِ حال یہی ہے تو پھر پیدا کرنے کے بعد ناپید کرنا، زندگی دینے کے بعد مارنا، عطائے صحت کے بعد بیمار بنانا اور آرام کے بعد تکلیف میں ڈال دینا بھی اللہ سے ممکن نہ ہونا چاہیے کیونکہ صحت اگر بارادہ خداوندی ہے تو بیماری بھی اسی کے ارادے سے ہے۔ ایک ارادے کے بعد دوسرا ارادہ اگر شانِ خداوندی کے خلاف نہیں ہے اور اس سے اس کے علم و فہم پر کوئی اثر نہیں پڑتا تو اسی اللہ کے ایک حکم کے بعد دوسرے حکم سے اس کے علم و فہم پر کیوں حرف آتا ہے۔

بالفاظِ دیگر جس طرح موسموں کے بدلنے میں کبھی سردی کبھی گرمی، کبھی خزاں کبھی بہار، دن رات کی تبدیلی اور انسان کے روزمرہ حالات کے تغیر و تبدل میں تنگدستی و دولتمندی، صحت اور بیماری میں آپ کو کبھی حیرت نہیں ہوتی ہے اور آپ مانتے ہیں کہ اس میں اللہ کی بے شمار حکمتیں اور مصلحتیں ہیں۔ پھر آپ کو شریعتوں کے بدلنے اور احکام کے تغیرات میں حیرت کیوں ہے؟ جیسے وہاں خدائی حکمتیں اور مصلحتیں ہیں ایسے ہی یہاں بھی مکلفین اور زمان و مکان کے حالات کے پیشِ نظر اللہ کی حکمتیں اور مصلحتیں ہیں۔

حکمت اور مصلحت کے تحت قادرِ مطلق بندوں کے احوال و ظروف کے مطابق احکام نازل کرتا ہے۔ ان میں تبدیلی کرتا ہے۔ لیکن اس کی جانب سے یہ تبدیلی غلطی یا بے خبری کی وجہ سے نہیں ہے یہ تبدیلی کیوں ہے؟ اس کا جواب بھی مولانا محمد قاسم کی زبانی سُنیے، فرماتے ہیں۔

حکم اوّل کہیں بوجہ غلطی بدلا جاتا ہے اور کہیں بوجہ تبدّلِ مصلحت تبدیل کیا جاتا ہے۔ طبیب کبھی تشخیص میں غلطی کرتا ہے اور اس وجہ سے بعد اطلاعِ غلطی نسخہ اول کو بدل دیتا ہے اور کبھی بیمار کے حالات کی تبدیلی کے پیشِ نظر، یا دوا کا وقت ختم ہونے کی بنا پر پہلی دوا کو تبدیل کرتا ہے۔ اثنائے بخار میں اگر سرسام ہو جاتے تو بیمار کی حالت بدل جانے کی وجہ سے نسخہ تبدیل کیا جاتا ہے اور منضج کی میعاد ختم ہونے پر جو مسہل لکھا جاتا ہے تو یہ پہلی دوا کا وقت ختم ہونے کی وجہ سے لکھا جاتا ہے۔ دونوں صورتوں میں حکم کی تبدیلی غلطی کا نتیجہ نہیں بلکہ مریض کی حالت تبدیل ہونے کے باعث

ہے۔ اللہ کے احکام میں تغیر و تبدل اسی قسم کا ہوتا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ ایک سمجھدار آدمی اس حکیم مطلق کے بارے میں جو اپنے قدیم ازلی وابدی علم کی بدولت اشیا کے سہارے اصول کو جانتا ہے یہ تصور کیسے کر سکتا ہے کہ حکم کی یہ تبدیلی بے خبری یا غلطی کا نتیجہ ہے۔

اسی بنا پر نسخ کا مسئلہ اُمت میں ہمیشہ اتفاقی رہا ہے۔ لوگوں کو غلط فہمی اس کے لغوی معنی سے ہوئی ہے وہ نسخ کے معنے مٹانا اور ہٹانا ہی سمجھتے ہیں لیکن یہ اس کے لغوی معنے ہیں۔ اصطلاحی معنے یہ نہیں ہیں۔ اصطلاحی معنے وہ ہیں جو مولانا کیرانوی کی زبانی آپ کے گوش گزار ہو چکے ہیں۔ حکیم الاُمت شاہ ولی اللہ نے اصطلاحی معنی میں بھی متقدمین اور متاخرین کی اصطلاحات کا فرق بتایا ہے۔

شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ صحابہ اور تابعین لفظ نسخ کو ایک سے زیادہ مطالب کے لیے استعمال کرتے تھے۔

الف ۔ آیت میں حکم کی مدت عمل ختم ہو جانا۔

ب ۔ آیت کو متبادر معنی سے ہٹا کر غیر متبادر معنے میں لینا۔

ج ۔ آیت میں کسی قید اتفاقی کا اضافہ کرنا۔

د ۔ آیت میں کسی عام کی تخصیص کرنا۔

ہ ۔ عادتِ جاہلیت کو ہٹانا

و ۔ سابقہ شرائع کو ہٹانا۔

ز ۔ آیت میں بیان شدہ منطوق اور اس سے مستنبط شدہ مسئلہ میں وجہ فاصل بتانا۔

صحابہ و تابعین ان سب مفہومات و مطالب کے لیے لفظِ نسخ استعمال کرتے تھے جب کہ متاخرین کے یہاں نسخ کا اس کے علاوہ اصطلاحی پیمانہ ہے۔

حجۃ اللہ البالغہ میں شاہ صاحب ہی نے ایک باب میں اس پر بحث کی ہے کہ ایسے دین کی ضرورت کیوں پیش آئی جو پہلے تمام ادیان اور تمام شریعتوں کا ناسخ ہو۔ اس کے بعد ایک باب میں اسلام کے قانون میں تکوینِ اُمت کے زمانہ میں نسخ کی صورتیں بیان فرمائی ہیں۔

فرماتے ہیں کہ اسلامی قانون میں نسخ دو قسم کا ہے۔ ایک یہ کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معاشرہ کے احوال وظروف کی خاطر اپنے اجتہاد سے قانون کی دفعہ پیش فرمائی لیکن اللہ سبحانہ نے اسے ہٹا کر اپنا فیصلہ فرما دیا۔ اس فیصلہ کا اعلان یا تو قرآن کے ذریعے ہوا اور یا جبریل کے ذریعے آپ کے

اجتہاد کو بدل کر۔ اس کی مثال بیت المقدس کی جگہ بیت اللہ کو قبلہ بنانا ہے۔

دوسری قسم یہ کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے مصالح اور مفاسد کے پیش نظر اولاً اُمت کو کسی کام کو کرنے کا حکم دیا یا کسی کام پر پابندی لگائی۔ وقت گزرنے پر مصلحت یا مفسدہ جس کے پیش نظر قانون بنا تھا موجود نہیں رہا۔ اس کے نتیجے میں حکم تبدیل ہوگیا۔ اس کی بہترین مثال مدینہ کی زندگی میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے خاص مصلحت کے پیش نظر مہاجرین کے درمیان مواخات ہے۔ قرآن نے اس مصلحت کو قائم رکھا اور اسی پر وراثت کی بنیاد رکھی اور ان لفظوں میں اس کا فائدہ بیان فرمایا۔

الا تفعلوہ تکن فی الارض وفساد کبیر۔

اگر تم ایسا نہ کروگے تو ملک میں فتنہ پیدا ہو جائے گا اور بڑا فساد ہوگا۔

یعنی اسی بھائی چارے پر تمہاری ساری کامیابیوں کا دار و مدار ہے۔ اس کے بعد جب حالات یکسر بدل گئے، مکہ فتح ہوگیا۔ مہاجرین کے رشتہ دار آملے۔ وراثت کا مسئلہ صاف کر دیا کہ وراثت کی تقسیم اب مواخات کی بنا پر نہیں بلکہ قرابتِ نسب کی بنا پر ہوگی۔

مکی زندگی میں نبوت دوسرے انبیاء کی طرح صرف ایک روحانی و اخلاقی نظام تھا۔ مدنی زندگی میں جب نبوت نے روحانی و اخلاقی نظام کے ساتھ ایک سیاسی و اجتماعی نظام کی حیثیت اختیار کر لی۔ تو اب دوسرے انبیاء کی شریعتوں کے برعکس مالِ غنیمت کی حلت کا اعلان ہوا۔ اسی نظامِ سیاسی کے تقاضوں کے پیشِ نظر فوجی نظام ظہور میں آیا اور مکی زندگی کا وہ حکم ختم ہوگیا جس میں کہا گیا تھا، کفوا ایدیکم اپنے ہاتھ روک لو۔ اب مدنی زندگی میں فوجی سرگرمیوں کی اجازت مل گئی۔

اس کے بعد شاہ صاحب نے زیرِ نظر آیت کے متعلق اسی قسم سے بتاتے ہوئے آیت کی یہ تشریح فرمائی ہے کہ

ہم جب بھی منسوخ کرتے کسی کو یا بھلاتے ہیں اس کو تو ہم اس کی جگہ اس سے بہتر یا اُس جیسی لے آتے ہیں۔ اس سے بہتر کا مطلب یہ ہے کہ پہلے آپ کی نبوت صرف روحانی و اخلاقی نظام کی حامل تھی اب اس کو سیاسی، اجتماعی نظام کا علمبردار بنا کر پہلے سے بہتر بنا دیا ہے اور اسی جیسی آیت کا مطلب یہ ہے کہ چونکہ مقاصد کے اختلاف سے احکام مختلف ہوتے ہیں اس لیے مقاصد کے پیشِ نظر اس جیسی آیت لے آتے ہیں۔

علامہ الشیخ محمد علی تھانوی نے کشافِ اصطلاحات الفنون میں نسخ پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ اور نسخ کی اصولی نقطۂ نظر سے جو تعریف فرمائی ہے وہ بے حد جامع ہے فرماتے ہیں:

ایسا حکمِ شرعی جس میں ابدیت اور وقت کی قید نہ ہو اس کے بعد میں آنے والے حکم کے ذریعے مدت بنا دینا قانون کی زبان میں نسخ کہلاتا ہے۔

یہ تعریف بے حد جامع ہے اور تمام اطراف وجوانب کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ علامہ موصوف نے اس کے فوائد وقیود بھی بتائے ہیں۔

یہاں یہ سوال بے حد اہمیت رکھتا ہے کہ تکوینِ اُمت اور تبلیغِ دعوت کے زمانہ میں تو اُمت کے احوال وظروف کے مطابق تبدیلیاں اور تغیراتِ اجتماعی، سیاسی، معاشرتی اور اخلاقی زندگی میں ناگزیر ہیں لیکن کیا اب بھی موجودہ صورت میں قرآن میں کچھ آیات ایسی ہیں جن کے بارے میں ہم کہہ سکیں کہ یہ منسوخ ہیں تو اصل اس باب میں یہی ہے کہ ہاں قرآن میں کچھ آیات ایسی ہیں جو اُمت کے احوال و ظروف تبدیل ہو جانے کے بعد اپنا قانونی مطالبہ نہیں رکھتی ہیں۔

متقدمین کے یہاں چونکہ نسخ کا معنوی دامن بے حد طول طویل تھا اس لیے ان کے یہاں بقول شاہ ولی اللہ ایسی آیات کی تعداد پانچ سو تک ہے لیکن متاخرین نے نسخ کی تعریف کا دائرہ بہت تنگ کر دیا ہے اس لیے ان کی تعداد بہت کم ہو گئی۔ ابوبکر بن العربی نے تعداد ۲۰ بتائی ہے لیکن شاہ صاحب نے ان بیس[۲] کو بھی گھٹا کر ۵ کر دی ہے۔ اور جن پانچ کو شاہ صاحب نے منسوخ کیا ہے ممکن ہے کہ آئندہ اس کے احوال و ظروف کا نقشہ بھی سامنے آجائے۔

۲۹۱ ۔ یا بھلا دیتے ہیں ہم اس کو۔ اصل ارشادِ عربی او ننسھا ہے۔ اس میں دو قرأتیں ہیں۔ ایک تو یہی ہے اور دوسری اس طرح ہے او ننسا ھا۔ دونوں کا مادہ نسیان ہے۔ پہلے کے معنی بھلا دینا اور دوسرے کے معنی بھول جانا ہے لیکن عبداللہ ابن عباسؓ سے بھول جانے کا مطلب چھوڑ دینا ہے اور یہ بتانا مقصود ہے کہ بعض آیات ایسی ہیں جن کو علی حالہ چھوڑ دیتے ہیں ان کو تبدیل نہیں کرتے اور بھلا دینے کا مطلب یہ ہے کہ ہم فراموش کرا دیتے ہیں یا اسے ترک کرنے کا حکم دیتے ہیں یا بقول امام بغوی یہ مطلب ہے کہ ہم بالکل ترک کرا دیتے ہیں یا خود ترک کر دیتے ہیں یعنی منسوخ حکم کے عوض کوئی جدید حکم بھی نازل نہیں کرتے۔ اس صورت میں نسخ سے مراد یہ ہو گی کہ ہم ایک حکم کو منسوخ کر کے اس کے عوض کوئی دوسرا جدید حکم نازل کر دیتے ہیں اور نسیان کا مطلب یہ ہو گا کہ ایسا نسخ جس کا عوض بھی نازل نہیں کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ مطلب دُرست نہیں ہے کیونکہ فاتِ بخیر منھا او مثلھا بتا رہا ہے کہ نسخ بالعوض ہو یا بلا عوض دونوں صورتوں میں بدل آنا ضروری ہے چاہے جدید قدیم سے بہتر ہو یا اسی کی طرح۔ اور ایک قرأت میں اسے ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے

یعنی ننسھا۔ اس کا مادہ نسیان نہیں بلکہ نسأ ہے اور اس کے معنے مؤخر کرنے کے ہیں۔ اس صورت میں مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ

نسخ سے مراد الفاظ اور حکم دونوں کو ہٹا دینا اور نسا سے مراد صرف الفاظ کو ہٹا لینا اور حکم کو باقی رکھنا اور مؤخر کر دینا۔ بہرحال اگر یہ نسیان سے ہے جیسا کہ ہم نے ترجمہ میں بتایا ہے تو اس کے معنے یہ ہی ہیں کہ نسخ آیت کی ایک صورت یہ ہے کہ وہ آیت ذہنوں ہی میں محفوظ نہ رہے۔

ف ۲۹۲ ۔ ہم اس کی جگہ اس سے بہتر یا اس جیسا حکم لے آتے ہیں۔ بہتر ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جب دوسرا حکم پہلے حکم کی مدت کا خاتمہ بتائے گا تو دوسرا ناسخ اور پہلا منسوخ کہلائے گا۔ ناسخ کے لیے ضروری ہے کہ اس میں کوئی ایسی مصلحت ہو جو پہلے حکم میں موجود نہ تھی۔ کیونکہ احکام میں تنوع اور بوقلمونی مصالح سے وابستہ ہے اور احکام کی تبدیلی کا مدار اصلی مصالح ہی کی تبدیلی ہے۔ اوقات، احوال بدلتے ہیں تو مصالح بدل جاتی ہیں مصالح تبدیل ہوتی ہیں تو احکام بدل جاتے ہیں لہٰذا دوسرا حکم یقیناً نفع میں پہلے حکم سے زیادہ بہتر اور اچھا ہونا چاہیے۔ الجصاص نے عبداللہ بن عباس رضؓ سے اس کی مثالیں نقل کی ہیں۔ پہلے یہ حکم تھا کہ ایمان کا خاصہ یہ ہے کہ ایک مسلمان دس دشمنوں پر بھاری ہو بعد میں اس میں تخفیف کر دی گئی کہ کم از کم اپنے دگنی تعداد کا مقابلہ کرو۔ ارشاد ہے الآن خفف اللہ عنکم۔ یہ تو آسانی میں خیر کی مثال ہے اور مثلیت میں آسانی و تسہیل کی مثال یہ ہے کہ پہلے نماز میں قبلہ بیت المقدس تھا بعد میں بیت اللہ کو قبلہ بنا دیا گیا۔

یاد رہے خیریت کا مدار صحابہ اور تابعین اور بعد میں آنے والے مفسرین میں صرف دو چیزیں ہیں ایک مصلحت دوسری سہولت۔ لیکن کسی کے نزدیک مدار خیریت تلاوت نہیں ہے یعنی یہ بات نہیں ہے کہ پہلی آیت کی تلاوت میں ثواب کم تھا اور آنے والی آیت میں ثواب زیادہ ہو گا۔ الجصاص لکھتے ہیں کہ یہ بات کسی نے نہیں کہی ہے۔ آلوسی نے بھی الجصاص کی یہ کہہ کر ہمنوائی کی ہے کہ خیریت اور مماثلت سے لفظ میں یہ خیریت مراد نہیں ہے۔

ف ۲۹۳ ۔ کیا تم جانتے ہو کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ یہود یہ کہتے تھے کہ قرآن میں کچھ آیات منسوخ ہوئی ہیں۔ اگر یہ کتاب اللہ کی طرف سے ہے تو جس عیب کی وجہ سے اب منسوخ ہوئی ہیں اس کی خبر کیا اللہ کو پہلے نہ تھی۔ اللہ تعالیٰ نے جواب میں فرمایا کہ عیب نہ پہلی آیت میں تھا نہ پچھلی میں لیکن اللہ حاکم ہے اور حاکم مناسب وقت دیکھ کر جو چاہے حکم کرے۔ اُس وقت وہی مناسب تھا اور اب دوسرا حکم مناسب ہے[1]

---

[1] حاشیہ شیخ الہند ص ۲۰

اس آیت میں مخاطب حضور انورؐ ہیں لیکن سنایا ان مسلمانوں کو جا رہا ہے جو یہودیوں کی باتیں سنتے تھے اور جن کے یہودیوں کے جال میں پھنس جانے کا اندیشہ تھا کہ احکام کی تبدیلی اور ان کے منسوخ کرنے پر اللہ کو پوری قدرت حاصل ہے اس کے دائرہ قدرت سے کچھ بھی باہر نہیں ہے۔ نسخ کا انکار کرنا قدرتِ الٰہیہ کے انکار کے مترادف ہے۔ علامہ آلوسی نے یہ لطیف نکتہ خوب بیان کیا ہے کہ احکام میں ردوبدل کرنا ان چیزوں میں ہے جو اللہ سبحانہ کی قدرت کے زیر نگیں ہیں جو شخص اللہ کے احاطہ قدرت اور اختیار کا مطیع کو مانتا ہے وہ احکام میں ردوبدل کے مسئلہ کو کس دلیل سے اللہ کی مقدورات اور مقہورات سے نکال سکتا ہے۔

۲۹۴ ۔ کیا تم نہیں جانتے کہ زمین و آسمان کی بادشاہت اللہ کی ہے۔ یعنی میں مالک ہوں، میرے اختیارات غیر محدود ہیں۔ اپنے جس حکم کو چاہوں منسوخ کردوں اور جس چیز کو چاہوں حافظوں میں محو کردوں ۔[۱]

اس جواب میں بھی مخاطبوں کو درسِ توحید دیا جا رہا ہے کہ آسمانوں کی ایک ایک چیز اور زمین کا ایک ایک ذرہ اللہ کی مِلک ہے، اور یہاں جو کچھ، جتنا کچھ اور جیسا کچھ بھی ہے وہ اللہ کا مُلک ہے جب مِلک بھی اس کی اور مُلک بھی اس کا یعنی مالک بھی وہی اور شہنشاہ جہاں بھی وہی ہے تو پھر اسے اپنی مِلک میں پورا تصرف حاصل ہے اور اپنے مُلک میں حکم کے نافذ کرنے سے کون روک سکتا ہے؟ اعلانِ قدرت کے بعد اپنی شہنشاہیت کا اعلان یہ بتانے کے لیے ہے کہ بندوں کے نفع و نقصان کا رشتہ اسی کی قادر و توانا ذات کے ساتھ وابستہ ہے۔ اگر بندے کے اس اعتقاد میں کہیں کمزوری کو گھس آنے کا موقعہ مل جاتا ہے تو اس کا اللہ سے رشتۂ بندگی اتنا ہی کمزور ہو جاتا ہے۔ اور بندہ اب بندۂ خدا ہونے کی جگہ بندۂ اسباب ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس کی زبان پر اسباب ہی کا ذکر ہوتا ہے۔ اس کے دل میں اسباب ہی بس جاتے ہیں۔ اس کے تمام عواطف و میلانات کا رُخ اسباب کی طرف ہو جاتا ہے اور بالآخر نوبت یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ اللہ سے ایسی بیگانگی ہو جاتی ہے کہ اس کے تذکرے سے بھی کوئی لگاؤ نہیں ہوتا۔

ان مسلمانوں سے کہا جا رہا ہے جو اسباب کی دنیا میں یہودیوں سے حلیف ہونے کی بنا پر توقعات رکھتے ہیں کہ وما لکم من دون اللہ من ولی ولا نصیر

اور مسلمانو! تمہارا اللہ کے سوا کوئی مددگار اور حمایتی نہیں۔

---

[۱] تفہیم القرآن ص ۱۰۰

أَمْ تُرِيدُونَ أَنْ تَسْأَلُوا رَسُولَكُمْ كَمَا سُئِلَ مُوسَىٰ مِنْ قَبْلُ ۗ
وَمَنْ يَتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْإِيمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَاءَ السَّبِيلِ ﴿١٠٨﴾

کیا تم چاہتے ہو[295] اپنے رسولؐ سے بھی ویسے ہی سوالات کرو جیسے اس سے پہلے موسیٰؑ[296] سے کیے جا چکے ہیں۔ یاد رکھو جو کوئی بھی ایمان[297] کی نعمت پا کر پھر اُسے کفر سے بدل دے گا تو یقیناً وہ راہِ راست سے بھٹک جائے گا۔

تمہاری اُمیدوں کا مرکز اجتماعی، سیاسی اور معاشی زندگی میں اللہ ہونا چاہیے۔ یہی تمہارے ایمان کا ناگزیر تقاضا ہے۔

یعنی ادھر تو اللہ کی قدرت و ملکیت سب پر شامل اُدھر اس کے اپنے بندوں پر اعلیٰ درجہ کی عنایت۔ تو اب مصالح اور منافع بندوں کی اطلاع اور ان پر قدرت کس کو ہو سکتی ہے اور اس کے برابر بندوں کی خیر خواہی کون کر سکتا ہے![1]

کثرتِ سوال اور بارگاہِ نبوت

بات مسلسل ہے یہودیوں کی داستانِ شناعت تار تار کر کے منظرِ عام پر لائی جا رہی ہے لیکن چونکہ بات کا رُخ حضورِ انورؐ کی شانِ گرامی سے ہے اس لیے اندازِ خطاب بدل دیا ہے۔ بے ادب اور گستاخوں کو مخاطب نہیں کیا بلکہ ان یگانوں کو کہا جو باادب ہیں تاکہ وہ اس پُرخطر وادی میں محتاط ہو کر رہیں۔ اور ان کو گویا سکھایا جا رہا ہے کہ آدابِ رسالت کیا ہیں۔ پہلی آیت میں حضورؐ کی مجلس کے آداب میں یہ باتیں بتائی گئی تھیں کہ

۱. جنابِ نبوت میں باادب ہو کر رہو
۲. جو کچھ فرمائیں کان لگا کر پوری توجہ سے سنو۔

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۲۱

۳- توہین آمیز انداز، توہین آمیز لہجہ تو درکنار بات چیت میں وہ الفاظ بھی استعمال نہ کرو جو توہین کے تو نہ ہوں مگر ان میں اس کا احتمال ہو۔
۴- نہیں جو کچھ، جتنی کچھ اور جیسی کچھ خیر کی بھیک اللہ کے گھر سے ملی ہے یہ سب حضور انورؐ کی رسالت کا صدقہ ہے۔ اگر نبوت کے وفادار رہوگے تو اللہ کے فضل و رحمت کی کوئی کمی نہیں ہے۔
۵- آپؐ کی رسالت ہی کا یہ بھی صدقہ ہے کہ بنی اسرائیل کو ہٹا کر دُنیا کی امامت کا کام تم سے لیا جا رہا ہے۔
۶- نہیں بارگاہِ نبوت میں ضرورت سے زیادہ سوالات نہ کرنے چاہئیں۔ باریک بینی اور کاوشیں ایک سیدھے سادے معاملہ کو پیچیدہ بنا دیتی ہیں۔
یہودیوں کی تاریخ تمہارے سامنے ہے کہ راست بازی کی جگہ کٹ حجتیاں اور بارگاہِ نبوت میں بے ادب اور گستاخانہ طرز پر سوالات کی بہتات ایمان سے محرومی کا باعث بن چکی ہے۔
۲۹۵ ــــہ - یہودیوں کی باتوں پر ہرگز اعتماد نہ کرنا جس کسی کو یہودیوں کے شُبہ ڈالنے سے شُبہ پڑ گیا وہ کافر ہوگیا۔ اس کی احتیاط رکھو اور یہودیوں کے کہنے سے تم اپنے نبی کے پاس شُبہ نہ لاؤ جیسے وہ اپنے نبی کے پاس لائے[1]
مطلب یہ ہے کہ یہودی موشگافیاں کر کر کے طرح طرح کے سوالات مسلمانوں کے سامنے پیش کرتے تھے اور ان کو اکساتے کہ اپنے نبی سے یہ پوچھو اور یہ پوچھو۔ اس پر اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو متنبہ فرما رہا ہے کہ اس معاملہ میں یہودیوں کی روش اختیار کرنے سے بچو۔ اسی چیز پر خود جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی مسلمانوں کو متنبہ فرمایا کرتے تھے کہ قیل و قال سے اور بال کی کھال نکالنے سے پچھلی اُمتیں تباہ ہوچکی ہیں۔ تم اس سے پرہیز کرو۔ جن سوالات کو اللہ رسُولؐ نہیں چھیڑا ان کی کھوج میں نہ لگو۔ بس جو حکم تمہیں دیا جاتا ہے اس کی پیروی کرو اور جن اُمور سے منع کیا جاتا ہے اُن سے رُک جاؤ۔ دُور از کار باتیں چھوڑ کر کام کی باتوں پر توجہ صرف کرو[2]
اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں آیت میں مخاطب اہل ایمان اور مسلمان ہیں۔ ابن کثیرؒ نے اسی کو اپنایا ہے لیکن جو لوگ ہر آیت کو اس کے سبب نزول کے آئینے میں دیکھنے کے خوگر ہیں وہ اس جگہ کچھ پریشانی سے دوچار ہوگئے ہیں، کسی نے آیت کا مخاطب قریش کو اور کسی نے یہود کو بتایا لیکن

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۲۱ [2] تفہیم القرآن ج ۱ ص ۱۰۲

قرآن کا سیاق و سباق یہی بتا رہا ہے کہ خطاب اہلِ ایمان سے ہے۔ امام رازیؒ نے اسی کو اولیت دی ہے۔

۲۹۶ ۔ سوال اگر کسی مسئلہ کی سنجیدہ تحقیق کا ہو تو باعثِ رحمت ہوتا ہے لیکن جب ضد، نفسانیت اور شرارت سے ہو اور اعتراض محض اعتراض کی غرض سے ہو تو وہی سوالات ایک لعنت بن جاتے ہیں۔ حضرت موسیٰ سے جیسے جیسے گستاخانہ سوالات کیے گئے ان کے تذکرہ سے بنی اسرائیل کی تاریخ کے صفحات بھرے پڑے ہیں۔ قرآن کا اس کو اس طرح پیش کرنا بجائے خود اس کی دلیل ہے کہ اسرائیلی تاریخ کی گہرائیوں سے قرآن بھیجنے والا خوب واقف ہے۔ موسیٰ علیہ السلام سے بنی اسرائیل کے گستاخانہ سوالات کا تذکرہ خود قرآن میں جابجا ہے۔ پہلے آپ یہ مطالبہ بنی اسرائیل کی زبانی پڑھ چکے ہیں کہ

اے موسیٰ ہم اس وقت تک ایمان نہ لائیں گے جب تک خدا کو کھلم کھلا نہ دیکھ لیں۔

بنی اسرائیل نے فرعون کی غلامی سے نجات حاصل کرنے کے بعد وادیٔ سینا میں قیام کے دوران موسیٰ سے سوال کیا کہ

ہمارے لیے بھی ایسا ہی ایک معبود بنا دے جیسا کہ ان لوگوں کے لیے ہے۔

مطلب یہ ہے کہ مطالبات کی بوقلمونی اور نبوت کی لائی ہوئی ہدایت پر یقین سے محرومی اُن لوگوں کا شیوہ ہے جو حق کے طالب نہیں ہوتے ہیں اور جن کی طبیعتیں ناحق شناسی اور حق کی کھلم کھلا بغاوت کی خوگر ہوتی ہیں۔ یہ لوگ صرف ایسی درخواستیں کرتے ہیں جن سے صرف رسول پر اعتراض کرنا اور الٰہی مصلحتوں میں مزاحمت بھی مقصود ہوتی ہے۔

۲۹۷ ۔ ایمان کی نعمت پاکر پھر اسے کفر سے بدل دے گا۔ اس فقرے میں ایک ضابطہ کلیہ ارشاد ہو رہا ہے کہ مومن ہونے کے باوجود جو بھی یہودیوں کی کاپی کرے گا اور بارگاہ نبوت میں ان کی طرح بے ادب اور گستاخ ہو کر سوالات کرے گا تو ایسا اقدام ایمان کو برباد کرنے کے مترادف ہوگا اور اس کا شمار صراطِ مستقیم سے بھٹک جانے والوں میں ہوگا۔ حافظ ابن کثیرؒ نے اس ضابطہ کلی سے یہ نتیجہ خوب نکالا ہے کہ ایمان کا کفر سے تبادلہ کرنے والا شخص صراطِ مستقیم سے ہٹ کر جہالت و ضلالت کا شکار ہو جاتا ہے۔ اور اس کے وہ تمام لوگ مصداق ہیں جو زندگی میں نبوت کی تصدیق، پیروی اور طاعت سے گریز پا ہو کر نبوت کی مخالفت، تکذیب اور بلا ضرورت ضد او، کد میں سوالنامہ پیش کرتے ہیں۔ جن لوگوں کا نبوت کے ساتھ یہ معاملہ ہو کہ بقول علامہ زمخشری کہ ان کو بنی پر لائی ہوئی آیات اور احکام پر اعتماد نہ ہو اور اس بارے میں ان کے دل شک و تذبذب کے مریض ہوں۔ آیات منزلہ کو چھوڑ کر

وَدَّ كَثِيرٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يَرُدُّونَكُم مِّن بَعْدِ إِيمَانِكُمْ كُفَّارًا حَسَدًا مِّنْ عِندِ أَنفُسِهِم مِّن بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ ۖ فَاعْفُوا وَاصْفَحُوا حَتَّىٰ يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرِهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿١٠٩﴾

اہل کتاب[۲۹۸] میں سے اکثر لوگوں کی یہ خواہش ہے کہ تمہیں ایمان کے بعد پھر کافروں میں واپس لوٹا دیں۔ اگرچہ اُن پر حق ظاہر ہو چکا ہے لیکن اس حسد[۲۹۹] کی وجہ سے جو تمہارے خلاف اُن کے اندر ہے وہ ایسا ہی پسند کرتے ہیں۔ (فی الحال) تم عفو و درگزر[۳۰۰] سے کام لو یہاں تک کہ وحی کے ذریعہ اللہ کا فیصلہ[۳۰۱] آئے اور یقین کرو کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

اور آیات کا مطالبہ کرتے ہوں ان کے متعلق یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ وہ نبوت کے لائے ہوئے نظام کی تعمیر میں حصہ لیں گے۔ گویا آیت میں نبوت کی پیروی، طاعت اور تصدیق کو ایمان اور نبوت کو سوالات سے پریشان کرنے میں یہودیوں کی پیروی کو کفر قرار دیا ہے اور بتایا ہے کہ جو بھی یہودیوں کی پیروی کرے گا وہ صراطِ مستقیم سے نکل جائے گا۔ یہاں بنی اسرائیل ہی کی تاریخ کا تذکرہ ہے اس لیے یہودیوں کا ذکر ہے اور اس موضوع پر احادیث میں نبوت کا لب و لہجہ بے حد سنگین نظر آتا ہے۔ یہ تو صرف سوالات میں یہودیوں کی کاپی ہے لیکن ذرا وہ واقعہ مسند دارمی میں پڑھیے جو حدیث کی دوسری کتابوں میں بھی آیا ہے کہ

> عمر بن الخطابؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تورات کا ایک نسخہ لے کر آئے اور بولے یا رسول اللہ۔ یہ تورات کا نسخہ ہے۔ آپؐ خاموش ہو گئے۔ یہ ناگواری کی خاموشی تھی۔ عمرؓ اسے پڑھنے لگے اُدھر آپؐ کے چہرۂ مبارک کا رنگ بدلنے لگا۔ ابوبکرؓ نے کہا اے عمرؓ حضور انورؐ کے چہرۂ اقدس پر ناگواری کو تم نہیں دیکھتے؟ حضرت عمرؓ کی نگاہ چہرۂ اقدس پر پڑی تو فوراً بولے، میں خدا کے غصہ اور اس کے رسولؐ کے غصہ سے اللہ کی پناہ لیتا ہوں۔ ہم اللہ کو رب، اسلام کو دین اور محمد مصطفیٰؐ کو رسول مان کر راضی ہو چکے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے اگر آج موسیٰ کا بھی ظہور ہو جائے

اور مجھے چھوڑ کر تم ان کی پیروی کرنے لگو تو لضللتم عن سواء السبیل، تم سیدھی راہ سے بھٹک جاؤ گے۔

آپ نے دیکھا کہ معاملہ کس قدر سنگین ہے۔ یہودی تو مدینہ کی زندگی میں مسلمانوں کے حلیف ہیں۔ تو اُن کی پیروی، اُن کی ہمنوائی کی نبوّت کے مقابلہ میں اللہ کی بارگاہ میں کیا قیمت ہو سکتی ہے۔

اہل ایمان کو کافر بنانے کی خواہش

یہ بھی ایک اُٹھے ہوئے سوال کا جواب ہے۔ علمائے بلاغت کی زبان میں اسے استیناف بیانی کہتے ہیں۔ اس مرحلے پر پہنچ کر ہر قاری اور سامع کے ذہن میں یہ سوال ابھرتا ہے کہ بنی اسرائیل نے اہلِ ایمان میں یہ شک اندازی کی مہم شروع کیوں کر رکھی تھی۔ اُن کا اس سے مقصد کیا تھا اور اس سرگرمی کے پیچھے اُن کے عزائم کیا تھے۔ اسی سوال کا ان آیات میں جواب دیا ہے اور ان کے اندر کی بات کو بے نقاب کیا ہے کہ اُن کا حسد ان کو چین سے نہیں بیٹھنے دیتا اور ان کی ساری دسیسہ کاریوں کا واحد سبب اسلام اور مسلمانوں سے شدید جذبہ حسد ہے۔ اسی حسد کی بنا پر وہ چاہتے ہیں کہ مسلمان دوبارہ کافر ہو جائیں۔ ان سے نعمتِ ایمان چھن جائے اور اللہ سبحانہٗ کا فضل و انعام ان سے سلب کر لیا جائے۔ زمانۂ تنزیلِ قرآن میں یہ یہودی علماء کا خصوصی مشن تھا۔ شارحینِ قرآن نے ان یہودی علماء کے نام بھی بتائے ہیں۔ کعب بن الاشرف، حیی بن اخطب، ابو یاسر، پیچھے تشریحات میں ہم مدینہ کے مشاہیر علماء یہود کے نام حافظ ابنِ حجر عسقلانی کی زبانی بتا چکے ہیں۔

۲۹۸ ۔ اہلِ کتاب سے قرآن کی اصطلاحی زبان میں مراد وہ ہیں جو حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ کو مانتے ہیں اور آسمانی کتابوں تورات و انجیل کے حامل ہیں۔ توحید و رسالت ملائکہ آخرت جیسے بنیادی حقائق کو لفظاً مانتے ہیں اور عملاً و معنیً ان میں سے ہر حقیقت کو مسخ کر چکے ہیں اور اس کا اطلاق یہود و نصاریٰ پر ہوتا ہے۔ حضور انورؐ کی نبوّت کے انکار میں دونوں ایک پلیٹ فارم پر ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ بہت سے یہودیوں کو آرزو ہے کہ کسی طرح تمہیں اے مسلمانو! پھیر کر کافر بنا لیں۔ حالانکہ ان پر واضح ہو چکا ہے کہ مسلمانوں کا دین، ان کی کتاب، ان کا نبی سچے ہیں [1]

---

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۲۱

بعض یہود شب و روز مختلف تدبیروں سے دوستی اور خیر خواہی کے پردے میں مسلمانوں کو اسلام سے برگشتہ کرنے کی کوشش کرتے تھے اور باوجود ناکامی کے اپنی حرکتوں سے باز نہ آتے تھے۔ حق تعالیٰ نے اس پر متنبہ فرمایا کہ ان اہلِ کتاب میں بہت سے دل یہ چاہتے ہیں کہ تم کو تمہارے ایمان لائے پیچھے پھر کافر کر ڈالیں [1]

۲۹۹ - اس حسد کی وجہ سے یعنی یہ کوششیں اور سرگرمیاں اخلاص و خیر خواہی کی وجہ سے نہیں بلکہ رشک اور حسد سے پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ اور حسد بھی کسی شبہ یا حق کی غیرت کی بنا پر نہیں بلکہ ذاتی خباثت، فسادِ اخلاق اور باطل پر جمود جو ان کی طبیعتوں کا خاصہ بن گیا ہے وہ اس کا منبع ہے۔

مفسرینِ قرآن نے اس آیت میں اہلِ کتاب سے مراد علماء یہود لی ہے لیکن لفظ قرآنی عام ہے اور یہود و نصاریٰ دونوں اس کے مفہوم میں داخل ہیں۔ یہودیوں اور نصرانیوں کی جانب سے جو کھلا ہوا منظم پروپیگنڈا اسلام کے خلاف سیاسی، معاشرتی، تاریخی اور جغرافی تحریروں کے ذریعے سے جاری ہے وہ سب اسی کے مظاہر ہیں۔ غایت ان سب سرگرمیوں کی یہ اور صرف یہ ہے کہ مسلمان اسلام کی طرف سے بدگمان اور برگشتہ ہو جائیں۔ یہ بھی قرآن کا اعجاز ہے کہ وہ اس کارنامہ کے لیے اہلِ کتاب کی ایک بڑی تعداد کو کہہ رہا ہے اور اس کارگزاری کا پس منظر سیاسی، معاشی، مذہبی مفاد نہیں بلکہ خالص حسد کو بتا رہا ہے۔ یہ موضوع قرآن کے مہمات معارف میں سے ہے۔ اس پر تفصیل کا تو یہ محل نہیں لیکن ضروری ہے کچھ اجمالی اشارات کر دیے جائیں تاکہ ناظرینِ قرآن کے اعجاز کا کچھ اندازہ کر سکیں۔ اس وقت یہودی اور مسیحی دنیا اسلام کے خلاف علمی میدان میں جس انداز سے مسلمانوں کو اسلام سے برگشتہ کرنے کی منظم تحریک چلا رہی ہے۔ ان کی علمی ذہنیت کی یہ کیسی مکمل تعبیر ہے جو چند لفظوں میں یہاں بیان کر دی گئی ہے۔

ودّ کثیر من اھل الکتاب لو یردونکم من بعد ایمانکم کفارًا حسدًا من عند انفسھم

نزولِ قرآن کے وقت یہودی دنیا کے علماء کا یہی حال تھا اور اب بھی دیکھ لو یہودی اور مسیحی علماء کا یہی حال ہے۔ مسلمان نوجوانوں، مسلمان حکمرانوں، مسلمان سیاست کاروں اور مسلمان طالب علموں کے دماغ میں اسلام کے ماضی کی طرف سے بدگمانی، اس کے حال کی طرف سے بیزاری، اس کے مستقبل کی طرف سے مایوسی اسلام، پیغمبرِ اسلام اور اسلام کے علمی سرمایہ کے بارے میں شکوک و شبہات

---

[1] معارف القرآن م ش ص ۲۳۱

پیدا کرنے میں بہت بڑا ان یہودی اور مسیحی علماء کا ہاتھ ہے جنہوں نے اسلامیات کے مطالعہ کے لیے اپنی زندگیاں وقف کی ہیں اور ان کو عام طور پر مستشرقین کہا جاتا ہے جو اپنے علمی تحقیقی انہماک اور مشرقیات کی گہری واقفیت کی بنا پر مشرق و مغرب کے علمی حلقوں میں بڑی عظمت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں [1]

فتنۂ استشراق

اس فتنہ کی تاریخی قدامت کی تو اصل میں قرآن کی یہ آیت نشاندہی کر رہی ہے کہ اصل میں اس کا شجرہ نسب زمانۂ نزولِ قرآن میں مدینہ کے اُن علمائے یہود سے ملتا ہے۔ لیکن ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی نے اس موضوع پر جو مقالہ سپردِ قلم فرمایا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ مغربی دُنیا میں اس کا آغاز اس وقت ہوا ہے جب ۹۹۹ھ میں فرانسیسی پادری مسٹر جیبرٹ TERBERT بطور پاپائے روم منتخب ہوئے۔ اس کے بعد ۱۰۹۲ھ میں جناب پطرس اور ۱۱۴۰ھ میں جناب جرار دی کریمون ردم پہنچے ہیں۔ ان لوگوں نے عربی ثقافت اور عرب علماء کی تصانیف کو موضوع بنا کر اس مہم کا آغاز کیا۔ اور یہ سلسلہ اٹھارہویں صدی تک برابر آہستہ آہستہ آگے بڑھتا رہا۔ اٹھارہویں کا زمانہ یورپ کے استعماری دور کا نقطۂ آغاز ہے۔ اس زمانہ میں متعدد علمائے مغرب نے منظم طریقہ پر اس کام کو ہاتھ میں لیا اور ممالکِ اسلامیہ میں عموماً اور عربی ممالک میں خصوصاً عربی مخطوطات پر شب خون مارا۔ نادان مالکوں سے کتابیں خرید کے اور پبلک لائبریریوں سے چوری کر کے عربی مخطوطات یورپ پہنچائے گئے۔ انیسویں صدی کے آغاز تک ان مخطوطات کی تعداد بارہ ہزار پانچ سو کتابوں تک پہنچ گئی۔ انیسویں صدی کے آخر میں پیرس میں ۱۸۷۳ھ میں اس موضوع پر سب سے پہلی کانفرنس منعقد ہوئی۔

میدانِ استشراق

اس کا آغاز تو عربی زبان اور اسلام پر تحقیقات کے نام سے ہوا لیکن انجام میں اس کی آغوش میں اگرچہ مشرق کے سارے مذاہب، مشرقی تمدن، جغرافیہ، تاریخ اور مشرقی زبانیں تک آگئیں

---

[1] اسلام اور مغربیت کی کشمکش ص ۱۷۸ ؟

لیکن اصلی پیش نہاد اور سطح نظر عربی ادب، اسلامی تمدن اور اسلام رہا اور اب تک ہے۔ مستشرقین کی بڑی تعداد اصلاً پادری ہے ان میں سے ایک بڑی تعداد نسلاً اور مذہباً یہودی ہے:

استشراق کے محرکات

استشراق کے محرکات دینی بھی تھے۔ سیاسی استعماری اور اقتصادی بھی اور کم سے کم تر علمی بھی۔ دینی محرک واضح ہے۔ اس کا آغاز پادریوں سے ہوا ہے اور تاحال وہ ہی یہ کام کر رہے ہیں ان کے پیش نظر صرف یہ مقصد ہے کہ اسلام کی ایسی تصویر پیش کی جائے جس سے اس کے محاسن کو بُری سے بُری شکل میں پیش کیا جائے اور اسلامی حقائق میں تحریف کی جائے، تاکہ نئے تعلیم یافتہ اصحاب اور نئی نسل میں اسلام بیزاری کے جراثیم پھیل سکیں اور لوگوں کا یہ ذہن بن سکے کہ اسلام میں انسانی زندگی میں پھیلنے کی کوئی صلاحیت نہیں ہے۔ اور مسلمان ایک خونریز ا ور ڈاکوؤں، قزاقوں کا وہ گروہ ہے جس کی منزل اخلاق و روحانیت نہیں بلکہ صرف جسمانی لذت ہے۔ دینی محرک کی نوعیت کا اندازہ کرنا ہو تو ایک مصری فاضل ڈاکٹر محمد البہی کا وہ بیان پڑھیے جو انہوں نے اپنی مایۂ ناز کتاب الفکر الاسلامی الحدیث[1] میں پیش کیا ہے اور جو اکثر و بیشتر مستشرقین کی کتابوں کا قدر مشترک اور ان کے خیالات کا عکس ہے۔

اسلامی تعلیمات کا نافذ نہ کر سکنا اجتماعی ضرورت کا عین تقاضا ہے اور بر بنیجہ ہے۔ روز بروز بدلتی ہوئی زندگی کے ان حالات کا جن کو اسلام اپنی تعلیمات کی روشنی میں اپنے مطابق نہیں بنا سکا اور ان کے اور اسلامی تعلیمات کے درمیان ہم آہنگی نہیں پیدا کر سکا۔ اسلامی تعلیمات پر عمل کرنے پر زور دینے کے معنی اس زمانے میں اس کے سوا کچھ اور نہیں ہیں کہ زندگی سے کنارہ کشی اختیار کر لی جائے۔ تمدن جدید کے وسائل سے فائدہ اٹھانے میں دُنیا سے پیچھے رہ جائیں۔ مسلمان ممالک میں غربت، بیماریوں اور جہالت کو بخوشی گوارا کیا جائے جیسا کہ اس وقت سعودی حکومت میں حال ہے۔ یہ وہ تنہا اسلامی ملک ہے جس نے سرکاری طور پر عمل کیا ہے اس لیے وہ اس بات کا نمونہ ہے کہ اسلام پر عمل کرنے سے کیا نتائج پیدا ہو سکتے ہیں[1]

دیکھیے کہ ہاتھ کی کیسی شاندار صفائی ہے اور کس خوبصورت طریقہ پر مسلمانوں کے ذہن میں اسلام کے

---

[1] الفکر الاسلامی الحدیث ص ۱۸۴

خلاف باغیانہ میلانات پیدا کیے جا رہے ہیں ۔

سیاسی محرک یہ ہے کہ عالم اسلامی اور عربی ممالک کی آزادی کے بعد ان اسلامی اور عربی ملکوں میں مغربی حکومتوں کی جانب سے جو سفارتخانے کھولے جاتے ہیں ان میں سیکرٹری کے درجے کے لوگ وہ ہوتے ہیں جو عربی زبان پر پورا عبور رکھتے ہیں تاکہ وہ اس ملک کے مفکرین، صحافیوں اور سیاسی لیڈروں تک رسائی حاصل کر سکیں۔ یہ گویا مغربی حکومتوں کا ہراول دستہ ہوتے ہیں۔ مغربی حکومتوں کو علمی کمک اور رسد پہنچانا ان کا کام ہے۔ وہ ان مشرقی اقوام و ممالک کے رسم و رواج، طبیعت و مزاج، طریق بود و باش اور زبان و ادب بلکہ جذبات و نفسیات کے بارے میں صحیح اور تفصیلی معلومات بہم پہنچاتے ہیں تاکہ ان میں مغربی حکومتوں کو اپنے جراثیم فساد پھیلانا آسان ہو۔ عربی ممالک کی باہمی آویزش اور اسلامی ملکوں کی شکر رنجی اسی دسیسہ کاری کا نتیجہ ہے۔

استعماری محرک یہ ہے کہ ماضی میں صلیبی جنگوں کا انجام عیسائیت کی شکست پر ہوا تھا۔ اس ہزیمت کے بعد پوری صلیبی دنیا نے ان عربی اور اسلامی ملکوں کے حالات کا ہر پہلو سے جائزہ لینا شروع کیا تاکہ اس کے ذریعے ان پر اہلِ مغرب کو حکومت کرنا آسان ہو اور اس کے ساتھ ان حالات اور تحریکات، عقائد، خیالات کا توڑ کر سکیں جو حکومتوں کے لیے دردِ سر بنے ہوئے ہیں اور ایسی ذہنی اور علمی فضا پیدا کرنے کی کوشش کریں جس میں مغربی استعمار کی مخالفت کا خیال نہ پیدا ہو۔ اس کے بالمقابل ان کی تہذیب کی عظمت اور ان کی خدمات کی وقعت پیدا ہو۔ اور اپنے ملک کی اصلاح و ترقی اور ان کو مغرب کے نقشِ قدم پر لے چلنے کا ایسا جذبہ پیدا ہو کہ ان مغربی حکومتوں کے ہٹ جانے پر بھی ان کا ذہنی اور تہذیبی اقتدار قائم رہے۔

اسی بنا پر مغربی حکومتوں نے مستشرقین کی اہمیت و افادیت کو پوری طرح محسوس کیا ہے اور ان کے سربراہوں نے ان کی پوری سرپرستی کی اور اسی مقصد کے تحت مختلف رسائل و مجلات شائع کرتے ہیں جن میں عالمِ اسلام کے مسائل اور رجحانات پر مبصرانہ تبصرہ اور ماہرانہ مضامین شائع ہوتے ہیں۔ مٹی ہوئی قوموں کی تاریخ مرتب کرنا، عربوں کی زبان اور نظریہ کی وحدت پر قومیں صرف کرنا، مصر میں فرعونیت کا شام، لبنان، فلسطین میں فینیقیت کا اور عراق میں آشوریت کا احیا صرف اسلامی اُمت کو پارہ پارہ کرنے کی خاطر کیا جاتا ہے۔ اور اسی مقصد کی خاطر مختلف ممالک کے مستشرقین عالمِ اسلام سے متعلق مختلف رسائل اور مجلات شائع کرتے ہیں۔ جن میں عالمِ اسلام کے مسائل اور رجحانات پر مبصرانہ اور ماہرانہ مضامین شائع کیے جاتے ہیں۔ اس وقت بھی رسالہ مشرقِ اوسط

اور مجلہ عالمِ اسلامی امریکہ سے اور فرانس سے نکل رہے ہیں۔

ان دینی، سیاسی اور استعماری دواعی اور محرکات کے علاوہ استشراق کا ایک محرک اقتصادی بھی ہے۔ بہت سے فضلاء اس کو ایک کامیاب کاروبار کے طور پر اختیار کرتے ہیں۔ بہت سے ناشرین اس بنا پر کہ ان کتابوں کی جو مشرقیات اور اسلامیات پر لکھی جاتی ہیں۔ یورپ اور ایشیا میں بڑی منڈی ہے۔ اس کام کی ہمت افزائی اور سرپرستی کرتے ہیں اور بڑی تیزی کے ساتھ یورپ اور امریکہ میں ان موضوعات پر کتابیں شائع ہوتی ہیں جو بڑی مالی منفعت اور ترقی کا ذریعہ ہیں۔

بالکل آخری درجہ پر بعض فضلاء اسلامیات اور مشرقیات کو اپنے علمی ذوق و شغف کے تحت بھی اختیار کرتے ہیں اور اس کے لیے محنت، تن دہی اور جانفشانی سے کام لیتے ہیں لیکن اوّلاً یہ بہت کم ہیں اور ثانیاً یہ اس دسیسہ کاری سے محفوظ ہیں جو عام مستشرقین میں پائی جاتی ہیں۔ ان کی مساعی سے بہت سی کتابیں زیورِ طباعت سے آراستہ ہوئی ہیں۔

استشراق کے مقاصد

اس علمی اعتراف کے باوجود مستشرقین اہلِ علم کا وہ بدقسمت اور کم نصیب گروہ ہے جس نے قرآن وحدیث، سیرتِ نبویؐ، فقہ اسلامی اور اخلاق و تصوف کے سمندر میں بار بار غوطے لگائے اور بالکل خشک دامن اور تہی دست واپس آئے بلکہ اس سے اس کے عناد، اسلام سے دُوری اور حق کے انکار کا جذبہ بڑھ گیا۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ نتائج ہمیشہ مقاصد کے تابع ہوتے ہیں۔

عام طور پر ان مستشرقین کے مقاصد یہ ہوتے ہیں۔

ان کا اوّلین اور بنیادی مقصد یہ ہوتا ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوّت کے بارے میں اپنے مخاطبوں کے ذہن میں زیادہ سے زیادہ تشکیکی مواد فراہم کریں اور اللہ کی وحی کو طاقتور دلائل کے ذریعے مشتبہ بنائیں۔ ان کی رائے عامہ نہ حضورؐ کو نبی مانتی ہے اور نہ یہ اللہ کی وحی تسلیم کرتی ہے۔ وحی آنے کے ان مظاہر کو جو کبھی صحابہ کے مشاہدے میں آتے نہایت مہیب صورت میں پیش کرتے ہیں۔ وحی الٰہی کو کبھی مرگی کا نام دیتے ہیں، کبھی حضورؐ کے ذہنی تخیلات بتاتے ہیں اور کبھی نفسیاتی مرض کہہ ڈالتے ہیں۔ اور سارے معاملہ کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ گویا نبوّت کا یہ معاملہ دُنیا میں کہیں نہیں ہوا۔ اور محمد عربی نے دُنیا میں کوئی نرالا دعویٰ کیا ہے۔ اور طرہ یہ ہے کہ یہ کہنے والے یہودی اور مسیحی ہیں جو نبوّت کے، وحی کے اور کتابِ الٰہی کے قائل ہیں۔ اور یہ بھی مانتے ہیں کہ تاریخ

تاثیر اور نبوّت کے مبادی میں ان کا مقام محمد رسول اللہ سے کم سے کمتر ہیں۔ لیکن اس کے باوجود وہ تمام صلاحیتوں کو معقول اور غیر معقول طریقہ پر ان کمزوریوں کی نشان دہی اور ان کو نہایت بھونڈی شکل میں پیش کرنے میں لعنت، تعصب اور اس حسد کی وجہ سے صرف کرتے ہیں جس کا قرآن نے اس آیت میں آج سے چودہ سو سال پہلے انکشاف کیا حسدًا من عند انفسھم اور مقصد یہ نہیں ہوتا کہ مسلمان، یہودی یا مسیحی ہو جائیں بلکہ یہ اور صرف یہ مقصد ہوتا ہے کہ ایمان سے ہٹ کر کسی طرح مسلمان کفر کی سڑک پر آجائیں۔ اللہ اکبر یہ قرآن کا کتنا بڑا اعجاز ہے کہ عالم الغیب نے چودہ سو سال پہلے اُمّی کی زبان سے یہ انکشاف پیش فرمادیا کہ یردونکم من بعد ایمانکم کفارًا

رائی کا پربت بنانا ان کا ادنیٰ کام ہے۔ وہ خورد بین سے دیکھتے ہیں اور اپنے قارئین کو دُور بین سے دکھاتے ہیں۔ وہ پہلے طے کر لیتے ہیں کہ قرآن اللہ کی کتاب نہیں ہے۔ پھر اس کے لیے رطب و یابس، مذہب و تاریخ، افسانہ و شاعری مستند و غیر مستند ذخیرے سے مواد فراہم کرتے ہیں اور جب قرآن کے کتابِ الٰہی ہونے کے ثبوت میں وہ تاریخی حقائق ان کے راستہ میں آڑ بنتے ہیں۔ جن کا انکشاف ایک اُمّی کے ذریعے ہوا تو ان کے مُنہ میں زمانۂ جاہلیت کی زبان آجاتی ہے اور بول پڑتے ہیں کہ یہ معلومات تو آپ نے فلاں سے حاصل کیں۔ گویا جاہلیت کی پُرانی روح استشراق کے قالب میں آکر کہتی ہے انما یعلمہ بشر اور جب ان کو قرآن کے علمی حقائق کا حوالہ دیا جاتا ہے تو یہ کہہ کر طرح دے جاتے ہیں کہ حضور انور بہت سمجھدار، ذکی، ذہین ہیں۔ داد دیجئے اس سبک دستی اور ہنر مندی کی کہ اپنے تعصب و عناد اور کینہ و حسد پر ذکاوت، ذہانت اور فطانت کا پردہ ڈال دیتے ہیں۔

وحی و نبوّت کی بنیادیں ہلا دینے کے بعد اب بڑی آسانی سے قاری کے ذہن میں یہ بات اتارنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں کہ اسلام الٰہی دین نہیں ہے بلکہ یہودیت اور مسیحیت کے سرمایۂ علمی کا مالِ مسروقہ ہے۔

ایک طرف وحی، نبوّت اور اسلام پر حملہ آور ہوتے ہیں تو دوسری طرف اسلام کے سرمایہ علمی میں ایک ایک کو اپنے جرح و تنقید کے تیروں سے زخمی کرتے ہیں۔ تفسیرِ قرآن، سیرۃ نبویؐ، حدیثؐ، فقہ و کلام، صحابہ و تابعین، ائمہ مجتہدین، محدثینِ فقہا کرام، مشائخ و صوفیہ، رواۃ حدیث، فن جرح و تعدیل، اسماء الرجال، حدیث کی حجیت، تدوین، حدیث، فقہ اسلامی کے ماخذ، فقہ اسلامی کا ارتقاء ان میں سے ہر موضوع کے متعلق مستشرقین کی کتابوں اور تحقیقات میں اتنا تشکیکی مواد پایا جاتا ہے جو ایک ایسے ذہین و حساس آدمی کو جو اس موضوع پر وسیع اور گہری نظر نہ رکھتا ہو پورے اسلام

سے منحرف کر دینے کے لیے کافی ہے۔

السباعی کی زبان میں مستشرقین کی دعوت کا خلاصہ یہ ہے۔

۱۔ نبوت، وحی، قرآن، حدیث، قانون کی حد تک مسلمانوں کے ذہنوں میں شکوک و شبہات پیدا کرنا۔

۲۔ مسلمانوں کو اپنے ماضی سے بدگمان، اپنے حال سے بیزار اور مستقبل سے مایوس کرنا۔

۳۔ اسلام کے علمی سرمایہ سے مسلمانوں کا اعتماد ہٹانا۔

۴۔ مسلمانوں میں اخوت کی روح کو کمزور کرنا اور ان میں زمانۂ جاہلیت کی قومیتوں کو جنم دینا۔

مقاصد کے حصول کے وسائل

ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے وہ جن ذرائع اور وسائل کو اپناتے ہیں وہ صرف ایک نہیں بلکہ ان میں تعدد بھی ہے اور تعدد کے ساتھ تنوع بھی ہے۔

۱۔ اسلام، قرآن، نبوت، وحی جیسے موضوعات پر ان کا راہوار قلم میدان تصنیف میں خوب جولانیاں دکھاتا ہے۔ اس میدان میں اُن کا کمال یہ ہے کہ وہ اکثر ایک بُرائی بیان کرتے ہیں اور اُس کو دماغوں میں بٹھانے کے لیے بڑی فیاضی کے ساتھ اپنے ممدوح کی دس خوبیاں بیان کرتے ہیں تاکہ پڑھنے والے کا ذہن اُن کے انصاف، وسعتِ قلب اور بے تعصبی سے مرعوب ہو کر اس ایک بُرائی کو قبول کرے۔ اکثر مستشرقین اپنی تحریروں میں زہر کی ایک خاص مقدار رکھتے ہیں اور اس کا اہتمام کرتے ہیں کہ وہ تناسب سے زیادہ نہ ہونے پائے اور اُن کے قاری کو متنفر نہ کرے۔

۲۔ اسلام، اسلامی اقوام، اسلامی ممالک کے موضوعات پر ماہانہ رسالے جاری کرتے ہیں۔

۳۔ اسلامی ملکوں میں مشنریاں روانہ کرتے ہیں۔ یہ مشنریاں شفاخانے، سکول، کالج، یتیم خانے، مہمان خانے، اور کلب قائم کرتے ہیں اور ان کے ذریعے مسلمانوں میں کفر کے وہ سارے جراثیم نہایت خوش اسلوبی سے پھیلاتی ہیں جو ان کو یہ مستشرقین فراہم کرتے ہیں۔

۴۔ علمی مجلسوں اور کالجوں میں اس کے لیکچروں کا انتظام کیا جاتا ہے۔ السباعی نے یہ بات نہایت افسوس اور درد سے بتائی ہے کہ عربی اور اسلامی یونیورسٹیوں اور کالجوں میں ان کو مدعو کیا جاتا ہے اور اسلام کے موضوع پر اُن کے خطابات ہوتے ہیں۔ اس میں قاہرہ، دمشق، بغداد، رباط، کراچی، لاہور، علی گڑھ سب برابر کے حصہ دار ہیں۔

۵۔ یہ مستشرقین مقامی اخبارات میں اسلامی موضوعات پر مضامین لکھتے ہیں اور جن اخباروں میں ان کے مضامین آتے ہیں ان کو کافی تعداد میں بصرف زر کثیر خرید تے ہیں۔ بلکہ بسا اوقات مقامی اخبارات پر زر کی طاقت سے پورا قبضہ کر لیتے ہیں۔

ڈاکٹر عمر فروخ اور مصطفےٰ خالد نے اپنی مشہور اور معرکۃ الآراء تصنیف میں ان مستشرقین کی استعماری خدمات کو بے نقاب کیا ہے۔ ان کا یہ بیان پڑھیے کہ

مشنریاں کھلم کھلا اعلان کرتی ہیں کہ مسیحیت کی نشر و اشاعت کے لیے دوسرے اسلامی ملکوں کے مقابلے جس قدر دسترس ہمیں مصری صحافت پر ہے اور کہیں نہیں۔ مصر کے ان گنت جرائد میں ان کے مقالات شائع ہوتے ہیں۔ مفت بھی اور اُجرت دیکر بھی۔

۶۔ کسی موضوع پر عام بحث کے لیے مختلف علاقوں میں کانفرنسیں منعقد کرتے ہیں ۱۷۸۳ء سے ان کانفرنسوں کا سلسلہ شروع ہوا ہے۔

۷۔ خاص اسلامی انسائیکلو پیڈیا، دائرۃ المعارف کی اجتماعی تالیف ان کا کارنامہ ہے۔ مختلف زبانوں میں اس کے تراجم ہوتے ہیں۔ اس میں اُن مستشرقین جن اہل قلم کی خدمات حاصل کی گئی ہیں وہ اسلام دشمنی میں ممتاز حیثیت کی مالک ہیں۔ وہ ایک بات پہلے طے کر لیتے ہیں کہ یہ ثابت کرنا ہے اور اس کے بعد اس مقصد کے لیے ہر اچھا بُرا مذہب، تاریخ، ادب، افسانہ، شاعری کے مستند و غیر مستند ذخیرے سے مواد فراہم کرتے ہیں۔ اور جس سے ذرا بھی ان کی مطلب برآری ہوتی اس کو بڑی آب و تاب سے پیش کرتے ہیں۔

میرے کتب خانہ میں اسی دائرۃ المعارف الاسلامیہ کا مصر سے آیا ہوا عربی ایڈیشن ہے۔ ابھی میرے پاس اس کی پندرہ جلدیں آئی ہیں۔ اس کا مطالعہ قاری کو بتاتا ہے کہ اسلام پر اُن کا مطالعہ کتنا بودا اور اُن کی تحقیقات میں کس قدر چھچھورا پن ہے۔ اور یہ بڑے درد کی بات ہے کہ ہمارے حلقوں میں اس کی حیثیت با اعتماد علمی ذریعہ کی ہے اور اس کی شخصیت استدلالی تصور کی جاتی ہیں اور پاکستان میں اسی کو بنیاد بنا کر عربی اور اُردو میں منتقل کیا جا رہا ہے [۱]

ڈاکٹر محمد البہی نے المبشرون والمستشرقون وموقفہم فی الاسلام کے عنوان سے ایک یونیورسٹی میں ایک بہت بڑے علمی اجتماع میں ایک مقالہ پیش کیا تھا۔ اس مقالہ میں انہوں نے مستشرقین کے

---

[۱] الاستشراق والمستشرقون ص ۱۵، ۳۰

اخبارات ورسائل، کتابوں اور اُن کے مشاہیر کی فہرست دی ہے۔ اور ڈاکٹر مصطفیٰ السباعی نے اپنی بیش قیمت کتاب الاستشراق والمستشرقون میں اس کو بسط کے ساتھ نقل کیا ہے۔ ہم یہاں اس تفصیل کو بالارادہ چھوڑتے ہیں۔

مولانا ابوالحسن علی میاں نے اسلامیت اور مغربیت میں کشمکش نامی کتاب میں جس کا عربی ترجمہ بھی شائع ہوچکا ہے اس کے چہرے سے پورے درد وسوز کے ساتھ نقاب اٹھایا ہے۔ نوجوان طلبہ کے لیے اس کتاب کا مطالعہ بے حد مفید ہے۔

افسوس کہ تفسیر معالم القرآن کے صفحات اس سے زیادہ تفصیل کے متحمل نہیں ہوسکتے۔ اس لیے ہم یہاں قلم کو روکتے ہیں اور اس کی مزید مباحث انشاء اللہ چوتھے پارے میں آئیں گے۔

۳۰۰ھ ۔ تم عفو ودرگزر سے کام لو۔ یعنی جب تک ہمارا حکم نہ آئے اس وقت تک یہود کی باتوں پر صبر کرو۔ سو آخر کو حکم آ گیا کہ یہود کو مدینہ کے گرد سے نکال دو۔[1]

عفو ودرگزر سے کام لینے کا مطلب یہ ہے کہ ان کے عناد اور حسد کو دیکھ کر مشتعل نہ ہوں۔ ان سے بحثیں نہ کرو اور مناظرے اور جھگڑے میں اپنے قیمتی وقت اور اپنے وقار کو ضائع نہ کرو۔ صبر کے ساتھ دیکھتے رہو کہ اللہ کیا کرتا ہے۔ فضولیات میں اپنی قوتیں صرف نہ کرو۔[2]

اس وقت کے حالات کا یہی تقاضا تھا۔ پھر حق تعالیٰ نے اس وعدہ کو پورا فرمایا اور جہاد کی آیات نازل ہوئیں، جس کے بعد یہود کے ساتھ قانونی برتاؤ کیا گیا۔ اور ناشائستہ افراد سے حسب حیثیت اُن کے فساد کے بدلے قتال، جلاوطنی یا جزیہ پر عمل کیا گیا۔[3]

چونکہ یہ مدینہ کی ابتدائی زندگی تھی۔ ابھی تک طاقت کے ذریعے مسلمانوں کو فساد کے مٹانے اور دشمن کو جواب دینے کی اجازت نہ آئی تھی۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ مسلمان کمزور رہے، قرآن کی آیت فاعفوا واصفحوا خود بتا رہی ہے کہ مسلمان کمزور نہ تھے بلکہ طاقتور تھے۔ اگر کمزور ہوتے تو عفو ودرگزر کا حکم نہ ہوتا بلکہ صبر کی تلقین ہوتی۔ عفو ودرگزر کا مطالبہ تو طاقتور ہی سے ہوسکتا ہے۔ گویا یوں کہا جارہا ہے کہ مسلمانو! تمہیں اہل کتاب کی عددی کثرت سے دھوکا نہ ہوجائے کیونکہ تم عددی قلت کے باوجود ان سے زیادہ طاقتور ہو۔ لہٰذا تمہیں اس وقت ان کے ساتھ طاقتور عادل کا معاملہ کرنا چاہیے۔ اور اہل کتاب کو عددی کثرت کے باوجود کمزور اور اہل ایمان کو عددی قلت کے باوجود طاقتور کہہ کر

---

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۱۲ [2] تفہیم القرآن، [3] معارف القرآن م ش ص ۲۳۲

اس طرف اشارہ کیا ہے کہ اہلِ حق کے ساتھ عددی قلت کے باوجود اللہ کی بے پایاں عنایات کی تائید ہوتی ہے اور عزت و وقار ان ہی کا حصہ ہے جب تک ان کے قدم حق پر جمے رہیں اور حق و باطل کے معرکے میں مٹنا باطل کا حصہ ہے۔ باطل کی عمر ہمیشہ اہلِ حق کی حق سے بے رُخی کا نتیجہ ہوتی ہے۔

۱۰۱ ـــہ - یہاں تک کہ اللہ کا فیصلہ آئے۔ یعنی صبر کے ساتھ دیکھتے رہو اللہ کیا کرتا ہے۔ اکثر مفسرین نے فیصلہ کی تفسیر جہاد و قتال سے کی ہے اور امر کو اوامر کا واحد بنایا ہے اور اسی بنا پر کچھ نے اسے منسوخ بھی قرار دے دیا ہے۔ لیکن اگر اسے اوامر کی بجائے اُمور کا واحد مانا جائے اور مطلب یہ ہو کہ تم عفو و درگزر سے اس وقت تک کام لو جب تک اللہ کی غیبی مدد اور نصرت ہم رکاب نہ ہو جائے اور اللہ حق کو فتح مند کر کے بتلا دے کہ کون حق پر تھا اور کس کی جگہ باطل پر بنی تھی۔ نصرت و اعانت کے اسی وعدہ کی وجہ سے آیت کے آخر میں ان اللہ علیٰ کل شیءٍ قدیر آیا ہے۔ اگر جنگ و قتال کی بات اس کی غایت ہوتی تو ان اللہ لقوی عزیز جیسی کوئی تعبیر ہوتی۔ قتال تو اللہ کی شانِ حکیمی کا مظہر ہے نہ کہ اس کی شانِ قدیری کا۔ شانِ قدیری کے اظہار کے مواقع پر اللہ کے اوامر نہیں اللہ کے اُمور کا ذکر ہوتا ہے اور شانِ حکیمی کے تذکرے میں اللہ کے اُمور و شئون نہیں بلکہ اللہ کے اوامر و احکام کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

آیت کی تشریح ختم ہو چکی ہے لیکن اہلِ کتاب کی جانب سے پیروانِ اسلام کو اسلام سے ہٹانے اور کفر میں لوٹانے کی یہ ساری کوششیں تگ و دو محمد رسول اللہ کے بارے میں اُن پر حق ظاہر ہونے کے باوجود ہو رہی ہے۔ قرآن کا یہ فقرہ اعجازی فقرہ ہے من بعد ما تبین لھم الحق باوجودیکہ ان کے لیے حق نمایاں ہو چکا۔ اس فقرے کا اعجاز آج بھی ہم آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ بیگانوں کو چھوڑ کر بیگانوں کی زبانی سنیے کہ ان کے سامنے حق کی نمائش کیونکر ہوئی ہے۔

گبن لکھتا ہے:

"ایک منصف شخص یقین کرے گا کہ محمدؐ کے اصل ارادے خالص اور اصلی خیر خواہی کے تھے، ۱۰
آپ شاہی شان و شوکت کو حقیر سمجھتے تھے، گھر کے ادنیٰ ادنیٰ کام کرتے تھے، آگ سلگاتے، جھاڑو دیتے، دودھ دوہتے، اپنی جوتیاں گانٹھتے، کپڑوں میں اپنے ہاتھ سے پیوند لگاتے، جو کی روٹی کھاتے، مہمانوں کو اچھا کھلاتے، مگر آپ کے گھر اکثر مہینوں آگ نہ سلگتی۔ دودھ اور شہد بہت بھاتا تھا۔ معمولی خوراک کھجوریں اور پانی۔"

گلمن اپنی کتاب "تاریخ اسلام" میں لکھتا ہے:

"کیا ہم اس حالت کو تصور میں لا سکتے ہیں جو عربوں کی ہوتی، جب انہوں نے سنا کہ رسول اللہ ۲۰

صلی اللہ علیہ وسلّم نے انتقال کیا، ہم بتا سکتے ہیں کہ اُن کی اور اُن کی رسالت کی بابت وہ دل میں کیا کچھ خیال کرتے تھے، دس برس تک مدینہ کے لوگوں کے سامنے چلتے پھرتے رہے اور پھر وہ ان کی زندگی کے ہر بھید سے واقف تھے۔ اُن کے سادہ لباس سے، ان کی سادہ خوراک سے، نمود نہ کرنے کی عادت سے ان کی پرہیزگاری سے، ان کے تقویٰ سے، اُن کے روزے نماز سے، ان کے نیک مشوروں سے، ان کے حلم و تحمل سے، خوش صحبتی سے بخوبی واقف تھے۔ انہیں یاد تھا کہ کس طرح اپنی دائی حلیمہ کے ساتھ جب وہ ان کی جوانی میں آئی تھی، مہربانی کی تھی اور کس طرح اپنی والدہ ماجدہ حضرت آمنہ کی قبر پر روتے تھے۔ جبکہ مکہ سے آتے ہوئے ان کی قبر کے قریب سے گزرے تھے۔ آپؐ بچوں کو سمجھاتے تھے کہ اپنے ماں باپ سے محبت کرو، ان کی عزت کرو اور ان سے نرمی سے پیش آؤ، ماں کے پاؤں کے نیچے بہشت ہے۔ آپؐ کس کس طرح سے سمجھاتے تھے کہ زن و شوہر کے ایک دوسرے پر برابر حقوق ہیں، محبت اور اُلفت کرنے۔ عورتوں کی عزت افزائی کی، اس ذلیل حالت سے نکال کر جو اُن سے پہلے تھی، اور تعدادِ ازدواج کی حد مقرر کر دی۔ عرب جو بُت پرستی میں مبتلا تھے اُنہیں ایسی خُدا پرست قوم بنا دیا اور انہیں بتا دیا کہ خدا ایک ہے کوئی اس کا شریک نہیں، کیا وہ ان کی معزز اور وجیہہ صورت کو بھول سکتے تھے۔ جب وہ بازاروں میں سے گزرتے تھے یا مسجد میں آتے تھے ان کی غمخوار سیاہ آنکھ جو ایک ہی ملاقات میں مسحر کر لیتی تھی، وضعدار مسکراہٹ یا مسکرانے کی ادا، بڑی ہلتی ہوئی داڑھی، تیز اور غواص منظر ان کے آبرو کا مل کیا یہ سب باتیں ان کے دل پر نقش نہ تھیں، ان کی دینداری ٹکسالی تھی۔ کیا ہم محمدؐ میں یہ نقص نکال سکتے ہیں کہ اس نے اللہ کو کریم و رحیم بتایا اور عرب کے سینکڑوں بُتوں کے مقابلے میں خدا کو وحدہٗ لاشریک جتایا، کیا اس سے محمدؐ کی بزرگی اور عظمت ظاہر نہیں ہوتی کہ اس نے ایسا اعلیٰ درجہ کا خیال ظاہر کیا، کیا اس سے اس کی سچائی ثابت نہیں ہوتی کہ مرنے دم تک اپنی تمام زندگی کے اس بڑے اعلیٰ خیال پر مستقل طور سے جما رہا۔"

موریس اپنی کتاب "مذاہب الدنیا" میں لکھتا ہے کہ:

3. "محمدؐ نے ایک بکھری ہوئی قوم کو جس کا صدیوں سے کوئی خاص معبد یا دارالحکومت نہ تھا جس کو تمام قومیں نفرت اور حقارت کی نظروں سے دیکھتی تھیں، اتحاد کی رسی میں باندھ کر ایک کر دیا تھا اور ان کو ایسا کر دیا تھا کہ وہ اپنا مال و جان تک اس کی مدد کو قربان کرنے کو تیار تھے۔ کیونکہ ان کے دل میں یہ بات اُتر گئی کہ خدا ہی نے ہم کو اس کام کا حکم دیا ہے۔"

ڈاکٹر اوگسٹ ویل لکھتا ہے:

۴۔ "بطورِ مصلحِ قوم کے جوکہ اصل میں محمدؐ تھا اور ہونا چاہیے تھا، وہ ہماری تعریف و توصیف کا مستحق ہے، وہ رسُول کے نام کا سزاوار ہے۔"

ای اے فری مین اپنی تاریخ فتوحاتِ اسلام میں لکھتا ہے:

۵۔ "اس میں کوئی شک نہیں کہ سوائے سچے راست باز کے ارادوں کے جوکہ اُن کے دل میں تھے، محمدؐ ہرگز اس قدر مستقل استوار اور ثابت قدم نہیں رہ سکتے، کہ ان کے قدم کو کبھی لغزش نہیں ہوئی۔"

جان ڈیون پورٹ اپنی کتاب "اپالوجی فور محمدؐ" میں لکھتا ہے کہ،

۶۔ "محمدؐ کی صداقت اور خلوص کا یہ پکا ثبوت ہے کہ سب سے اوّل جو ایمان لانے والے ہیں وہ اس کے گھر والے اور اس کے ہمدم دوست ہیں۔ یہ سب ان کے خانگی طریق زندگانی سے بخوبی اور پورے پورے واقف تھے۔ اگر ان میں خلوص نہ ہوتا تو وہ ضرور ان اختلافات پر گرفت کرتے جو ہمیشہ کم و بیش ریاکار فریبی نبیوں کے دعووں اور ان کے خانگی کاموں میں ہوا کرتے ہیں۔"

سر ولیم میور لکھتے ہیں کہ:

۷۔ "کتب مقدسہ سماویہ میں انبیائے بنی اسرائیل میں سے کوئی نبی بھی بجز ایک کے آپ سا عالی مرتبہ اور جلیل الشان معلوم نہیں ہوتا۔"

سیل "مقدمہ ترجمہ قرآن" میں لکھتا ہے کہ،

۸۔ "میں نے کبھی کسی کتاب میں نہیں پڑھا کہ خدیجہؓ کو محمدؐ کی رسالت کے دعوے میں کبھی شبہ ہوا ہو۔"

ٹامس کارلائل لکھتا ہے کہ،

۹۔ "صحرا کا غواص طبیعت والا باشندہ (محمدؐ) اپنی چمکتی ہوئی کالی آنکھوں اور کھلی صاف ملنسار اور وسیع رُوح کے ساتھ بلند نظری اور سواد ہوس کے نہیں بلکہ کچھ اور ہی خیال رکھتا تھا، کم سخن، گمبھیر، اعلیٰ درجے کی رُوح، وہ ضرور نہایت سرگرم پُرجوش لوگوں میں سے تھا، جن کو خدا ہی نے خلوص اور صداقت کے ساتھ پیدا کیا ہے۔"

باسورتھ سمتھ رقمطراز ہے:

۱۰۔ "وہ ریاست اور مذہب کے سربراہ تھے وہ بیک وقت قیصر اور پوپ دونوں تھے۔ لیکن نہ ان میں پوپ کی جھوٹی مشیختیں تھیں نہ قیصر کی جیوش و عساکر ان کے پاس تھے۔ نہ کوئی حراس اور پاسبانوں کا گروہ تھا، نہ کوئی محل تھا اور نہ کوئی مقررہ آمدنی تھی، اگر کبھی کسی انسان کو حکومت کرنے کا خدائی حق،

نصیب ہوا ہے تو وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تھے کیونکہ اگرچہ ان کو اقتدارِ مطلق حاصل تھا مگر اسی کی ظاہری اشکال اور مادی سہارے مفقود تھے۔"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے فرانسیسی مورخ لامارٹن (LAMARTIN) اپنی کتاب تاریخ ترکیہ جلد اوّل (صفحات ۲۷۶ - ۲۸۰ ,(HISTOIRE DE LA TURKIE, TOME I (PP. 276 - 80) بحوالہ کتاب ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی کتاب (LE PROPHET DE L'ISLAM, TOME II PP. 668 - 669) میں رقمطراز ہے:

"دُنیا میں کسی انسان نے محمدؐ کے نصب العین سے بلند نصب العین اپنے سامنے نہیں رکھا، یہ عظیم الشان نصب العین کیا تھا، خدا اور بندے کے درمیان توہمات کے پردے اُٹھا دینا، خدا کو انسان کے قلب میں رچا دینا، انسان کو خدائی صفات کے رنگ میں رنگ دینا اور صدہا باطل خداؤں کی بجائے خدا کا منزّہ اور مقدس تصور پیش کرنا، آج تک کبھی کسی انسان نے اتنے بڑے کام کا بیڑا نہیں اُٹھایا جس کے وسائل اور ذرائع اس قدر محدود ہوں اور مقصد اتنا دُشوار اور اُس کی قدرت سے باہر ہو۔ نصب العین کی بلندی، وسائل کی کمی اور پھر نتائج ایسے درخشاں حاصل کرنا، اگر یہ انسان کی غیر معمولی قابلیت کا معیار ہیں تو کون ہے جو اس میدان میں محمد (صلعم) کے مقابلہ میں کسی دوسرے انسان کو پیش کرنے کی جرأت کر سکتا ہے۔ دُنیا کے اور بڑے بڑے انسانوں نے صرف اسلحہ، قانون یا سلطنتیں پیدا کیں۔ وہ زیادہ سے زیادہ مادّی قوتوں کی تخلیق کر سکے جو اکثر اوقات خود ان کی آنکھوں کے سامنے راکھ کا ڈھیر ہو کر رہ گئیں۔ لیکن اس انسان کے صرف جیوش و عساکر، مجالسِ قانون ساز، وسیع سلطنتوں، قوموں اور خاندانوں کو ہی حرکت نہیں دی بلکہ ان کروڑوں انسانوں کے قلوب کو بھی جو اس زمانہ کی آباد دُنیا کے ایک تہائی حصہ میں بستے تھے اور اس سے بھی زیادہ اس شخصیت نے قربان گاہوں، دیوتاؤں، مذاہب و مناسک، تصورات اور معتقدات بلکہ رُوحوں تک کو ہلا دیا۔۔۔۔ اُس نے ایسی قومیت کی بنیاد رکھی جس نے دُنیا کی مختلف نسلوں اور زبانوں کے امتزاج سے ایک اُمتِ واحدہ پیدا کر دی۔ یہ لافانی اُمت اور باطل خداؤں سے سرکشی اور تنفر اور ایک خدائے واحد کے لیے والہانہ عشق۔۔۔۔ اُس نے تمام باطل خداؤں کی عبادت گاہوں کو ڈھا دیا اور ایک تہائی دُنیا میں آگ لگا دی۔

اُس کی پاک زندگی، اس کی توہم پرستی کے خلاف جنگ، مکّی دَور میں طرح طرح کے مصائب کا حیرت انگیز استقلال اور صبر سے مقابلہ کرنا، پھر اُس کی ہجرت اور دعوتِ رُشد و ہدایت، خدا کی راہ

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ۭ وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۱۱۰﴾

زکواۃ ۔ مال ۔ نماز

اور مسلمانو! تم نماز قائم کرو۔ اور زکوٰۃ دو۔ جو خیر بھی تم اپنے لیے آگے روانہ کرو گے اللہ کے ہاں اُسے موجود پاؤ گے۔ تم جو کچھ بھی کرتے ہو اللہ اُسے دیکھ رہا ہے ۔

میں غیر منقطع جہاد، اپنے مقصد کی کامیابی پر یقین محکم اور نامساعد حالات میں اس کی مافوق البشر جمعیتِ خاطر، فتح و کامرانی میں تحمل و عفو، کسی سلطنت سازی کے لیے نہیں بلکہ خالص خدائی مقاصد کی کامیابی کے واسطے۔

"اُس کی شبانہ روز نمازیں، دُعائیں، اپنے معبود سے راز و نیاز کی باتیں، اس کی حیات، اس کی رحلت اور بعدِ وفات اس کی مقبولیت یہ تمام حقائق کس قسم کی سیرت کی گواہی دیتے ہیں؟ عظیم مفکر، بلند پایہ خطیب، پیغامبر، مقنن، سپہ سالار، نہ صرف اجسام بلکہ اذہان و قلوب پر غلبہ پانے والا، صحیح نظریہ حیات کو علی وجہ البصیرت قائم کرنے والا، بہت سی سلطنتیں اور اُن سب پر آسمانی بادشاہی کا بانی .... یہ ہیں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)

ان تمام معیاروں کو اپنے ساتھ لاؤ جس سے انسان کی عظمت اور بلندی کو ناپا اور پرکھا جا سکتا ہے، اس کے بعد بتاؤ کہ کیا دُنیا میں اس سے بزرگ تر اور کوئی انسان کبھی ہوا ہے؟"

اہلِ ایمان کی قوت کا حقیقی ذریعہ

یہ بات فرمانے کے بعد کہ یہودیوں سے لڑ جھگڑ کر اپنا وقت ضائع نہ کرو۔ اس معاملہ میں عفو و درگزر سے کام لو اور دیکھو کہ اللہ کیا کرتا ہے اور حق کی فتح مندی کا سامان کیسے کرتا ہے۔ وہ کام کرو جس سے جماعت میں معنوی استعداد نشو و نما پاتی ہے اور طاقتور ہوتی ہے۔ یعنی قلبی اور مالی عبادت کی سرگرمی کا نماز اور زکوٰۃ کے ذریعہ اجتماعی مظاہرہ کرو۔ جس جماعت میں یہ سرگرمی ہوتی ہے وہ نہ

تو دین سے برگشتہ ہو سکتی ہے نہ اس کی اجتماعی قوت میں کمزوری ہو سکتی ہے۔ اقامت صلوٰۃ وایتائے زکوٰۃ سے قرآن کا مقصد وہ حالت پیدا کرنا ہے جب مختلف کارکن قوتیں کسی ایک مقام، ایک مرکز، ایک سلسلے میں ایک وجود ایک طاقت اور ایک فردِ واحد میں اپنی قدرتی اور مناسب ترکیب و ترتیب کے ساتھ یکجا ہو جاتی ہیں۔ اور تمام مواد، قویٰ، اعمال اور افراد پر ایک اجتماعی اور انضمامی دَور آجاتا ہے۔ اس طرح کہ گویا ہر قوت اٹھی ہر عمل باہم دگر جڑا ہوا۔ ہر چیز بندی ہوئی اور سمٹی ہوئی۔ ہر فرد زنجیر کی کڑیوں کی طرح ایک دوسرے سے متحد و متصل ہو جاتا ہے۔ کسی چیز، کسی گوشے اور کسی عمل میں علیحدگی نظر نہیں آتی۔ جدائی، انتشار اور الگ الگ جُز جُز، فرد فرد ہو کر رہنے والی حالت نہیں ہوتی۔ یہی حالت جب اعمال و افعال پر طاری ہوتی ہے تو خیر کہلاتی ہے۔ جب انسانی جسم میں آتی ہے تو اس کا نام تندرستی ہے۔ یہی حالت جب قومی اور جماعتی زندگی کی قوتوں اور عملوں پر طاری ہوتی ہے تو اس کا نام اقامتِ صلوٰۃ ہے اور اس کا ظہور جماعتی اقبال و ترقی اور نفوذ و تسلط میں دُنیا دیکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن اقامتِ صلوٰۃ اور ایتاءِ زکوٰۃ کو اسلامی زندگی کی سب سے بڑی بنیاد قرار دیتا ہے اور اس کو اخوت، ولایت، کا اوّلین مادہ تکوینِ اُمت فرمایا ہے اور اسی بنا پر نبوت نے اپنی تعلیمات میں نماز کو حیاتِ ملّی کے خطِ بنایا ہے، گویا اسلام میں اقامتِ صلوٰۃ اور ایتاءِ زکوٰۃ ہی کا نام جماعت ہے۔ نماز میں جماعت کے لیے التزام پر زور دینا اور اگرچہ امام نااہل ہو لیکن التزام رکھنے میں بھی حقیقت کام کر رہی ہے کہ مسلمان کی اصلی زندگی اللہ سے جانی اور مالی تعلقات استوار کرنے کا نام ہے۔

۳۰۲ ـ یعنی ان کی ایذا پر صبر کرو اور عبادات میں مشغول رہو۔ اللہ تعالیٰ تمہارے کاموں سے ہرگز غافل نہیں ہے تمہاری کوئی نیک بات ضائع نہیں ہو سکتی۔ [1]

یہاں نماز اور زکوٰۃ کو اسلامی زندگی کے مرکز کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ بلکہ نماز کا عمل تو قرآن کی نظر میں ایک ایسا عمل ہے کہ اسے ایمان کہا ہے۔

ماکان اللہ لیضیع ایمانکم

اللہ تمہارے ایمان کو ضائع نہیں کرے گا

ایمان سے نماز ہی مراد ہے۔ اسلام کا یہ قانونِ مرکزیت زندگی کے ہر حصّہ میں صاف صاف دیکھا جا سکتا ہے۔ حرکت و حیات کی بلندیوں سے لے کر زندگی کے چھوٹے چھوٹے گوشوں پر ایک

---

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۲۱

منظر ڈالیں۔ ہر جگہ زندگی اور بقا اسی قانون سے وابستہ منظر آئے گی۔ اسلام فی الحقیقت سنۃ اللہ اور فطرت اللہ ہی کا دوسرا نام ہے۔ اگر نوعِ انسانی کی سعادت و ارتقا کے لیے قانونِ اسلام اسی فاطر السماوات والارض کا بنایا ہوا ہے جس نے تمام کائنات کے لیے قانونِ حیات بنایا ہے تو ضروری ہے کہ دونوں میں اختلاف نہ ہو۔ قرآن نے جابجا یہ حقیقت واضح کی ہے کہ جس طرح تمام اجسام و اشیاء کی زندگی اپنے مرکزوں سے وابستہ ہے اسی طرح نوعِ انسانی اور اس کی جماعت و افراد کا معنوی بقا بھی قانونِ مرکزیت پر موقوف ہے جس طرح ستاروں کی زندگی اور حرکت کا مرکز اللہ کا امر ہے اسی طرح نوعِ انسانی کی سعادت کا مرکز اللہ کی عبادت ہے۔

مولانا محمد قاسم نانوتوی فرماتے ہیں:

> جیسے دھوپ کو اپنے بقا میں آفتاب کی ہر دم ضرورت ہے ایسے ہی انسان کو اپنے وجود و بقا میں ہر دم اپنے مالک کی جانب روئے نیاز کی ضرورت ہے۔ انسان کا فرض ہے کہ اپنے قدرت کو طاقت کو اس کی قدرت سے مستعار سمجھ کر اسی کے کاموں کے لیے روکے رکھے۔

اور فرماتے ہیں کہ:

> مدارِ طاعت صرف تین باتیں ہیں۔ نفع و راحت کی اُمید، نقصان و مضرت کا اندیشہ، اور یا محبت۔ نوکر اپنے آقا کی طاعت نوکری کی اُمید پر کرتا ہے اور رعیت اپنے حاکم کی اطاعت تکلیف کے اندیشہ سے دب کر کرتی ہے۔ اور عاشق اپنے محبوب کی اطاعت بتقاضائے محبت کرتا ہے۔

چونکہ اللہ سبحانہ، کی دو شانیں ہیں۔ ایک شان ان کی محبوب ہونے کی اور ایک شان ان کے حاکم ہونے کی۔ حاکم ہونے کی حیثیت میں وہ نفع و نقصان کا مالک ہے۔ حدوث و بقا اس کے قبضہ میں ہے اس لیے قرآن نے مسلمانوں کی تکوینِ مرکزیت کے لیے سب سے پہلے نماز اور زکوٰۃ پر زور دیا تاکہ اللہ کے بندوں کا اللہ سے حاکم ہونے کی حیثیت سے پہلے تعلق مضبوط ہو جائے۔ اسی بنا پر نماز کی اقامت پر زور دیا ہے۔ یہ دونوں عمل اللہ کے شاہی دربار سے تعلق رکھنے والے اعمال ہیں۔ نماز میں سکون و اطمینان سے باوقار طریقہ پر آنا، اچھا اور شاندار لباس پہن کر آنا اور جنابِ الٰہی میں ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو جانا بتا رہا ہے کہ خدمت کے لیے ایستادہ ہیں۔ جو حکم ہوگا کریں گے۔ اور اس کی عظمت کے احساس سے دب کر بدن کا جھکا دینا اور اس کے علوِ مراتب کے اعتقاد کے بعد اپنی پستی کے خیال سے پیشانی خاک آلود کر لینا اللہ کی شانِ جلال کا مظہر ہے۔ یہ گویا پوری زندگی میں اپنے دل کی امنگوں، اپنے دماغ کے

نظر یوں، اپنی عقل کی کاوشوں اور اپنے اعضاء و جوارح کی حرکتوں کو اللہ کے لیے وقف کرنے کا ایک چھوٹا سا مظاہرہ انقیاد ہے۔ اس کی روزانہ مشق اس انقیاد کی تجدید کرتی ہے۔ گویا نماز کے ذریعے اللہ کی طاعت و انقیاد، فرماں برداری کی رُوح پیدا کی جاتی ہے۔ یہ اپنی جان کی حد تک پیمان و عہد ہے۔ جان کے بعد وہ مال ہے جس پر انسان جان کھپاتا ہے، محنت کرتا ہے۔ نماز کے ذریعے بندگی کی مشق اور زکوٰۃ دے کر اس کی مشق کرائی گئی کہ بندہ یہ یقین کرے کہ جو کچھ میرے پاس ہے وہ اللہ کی ملک ہے، میں اس میں ایک نائب کی حیثیت سے تصرف کر رہا ہوں۔ نماز تو سراپا پیمانۂ عبادت ہے لیکن زکوٰۃ اصل میں نیابت ہے اور اس لحاظ سے عبادت ہے کہ حکم کی پابجائی ہو رہی ہے۔

گویا یوں کہا گیا ہے کہ مسلمانو! تم طاقتور ہو، جوش میں نہ آؤ، عفو و درگزر سے کام لو اور پہلے عبادت اور نیابت کے اوصاف اپنے اندر خوب پختہ کر لو۔

ف ۳۰۲۔ اور جو خیر بھی تم اپنے لیے آگے روانہ کرو گے۔ اس میں بتایا جا رہا ہے کہ نماز، زکوٰۃ وہ طاقتور اسباب ہیں جن کے ذریعے دُنیا میں فلاح اور آخرت میں سعادت حاصل ہو گی لیکن اس بات کو الگ کر کے ایک ضابطہ اور قانون کی صورت میں پیش کیا جا رہا ہے کہ جو کچھ بھی نیکی کا سرمایہ تمہارے دامن میں ہمیشگی فراہم ہو جائے گا مستقبل میں اس کے ثمرات ضرور ظاہر ہوں گے۔ خیر ہر وہ عمل جو اللہ کی رضا کا ذریعہ ہو۔ نماز اور زکوٰۃ اعمالِ خیر میں سب سے زیادہ طاقتور اعمال ہیں۔ جس طرح مادیات میں اشیا جسمِ انسانی کو بہت زیادہ طاقت بخشتی ہیں اور تم ان کے حصول کے درپے ہوتے ہو، ایسے ہی عمل معنویات میں بھی جاری ہے۔ نماز اور زکوٰۃ کے اعمال معنوی اعمال ہیں۔ نماز سے اعمال میں بلندی، نیت میں صفائی، نگاہ میں پارسائی اور اخلاق میں طہارت و نزاہت نشو و نما پائے گی۔ جب کہ زکوٰۃ سے نظامِ جماعت قائم ہو گا باہم ہمدردی، ایک دوسرے کی امداد و اعانت کے جذبات ابھریں گے۔

نماز اور زکوٰۃ کے باہمی ارتباط کی ایک اور وجہ بھی ہے۔ اسلام کی تنظیمی زندگی صرف دو بنیادوں پر قائم ہے۔ جن میں سے ایک روحانی اور دوسری مادی ہے۔ اسلام کا نظامِ روحانی نماز با جماعت سے جو کسی مسجد میں ادا ہو قائم ہوتا ہے اور نظامِ مادی زکوٰۃ سے جو کسی بیت المال میں جمع ہو کر تقسیم ہو مرتب ہوتا ہے۔ اسی لیے یہ دونوں اسلام میں ایک ساتھ نظر آتی ہیں۔

زکوٰۃ کو اسلام میں نماز کی طرح اہمیت حاصل ہے۔ اگرچہ لفظ خیر دونوں کے لیے جامع ہے لیکن قرآن میں اگر خیر کے اطلاقات پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کا اطلاق زیادہ مال پر ہوا ہے

مثلاً ان ترک خیراً الوصیۃ للوالدین

اور انہ لحب الخیر لشدید

اور ما تنفقوا من خیر یوف الیکم

اور ما تنفقوا من خیر فلانفسکم

اس سے پتہ لگتا ہے کہ یہاں ان نیکیوں کی طرف متوجہ کرنا مقصود ہے جو مال کے ذریعے کی جائیں۔

مال کے بارے میں قرآن نے سب سے پہلے یہ بنیادی حقیقت بتلائی ہے کہ مال و دولت دراصل اللہ کا عطیہ اور اُس کی امانت ہے اور حقیقتہً اللہ کی ملکیت ہے۔ اس لیے اللہ کی چیز اور اللہ کے دیے ہوئے مال کو اللہ کے راستہ میں خرچ کرنا انسان کا فریضہ اور اس کی سعادت ہے۔

انسان اس دولت میں اللہ کا نائب اور اس کا امین ہے اس لیے مالکِ حقیقی کے حکم و اشارے سے اسے خرچ کرنے میں کیا پس و پیش ہو سکتا ہے۔

انسان کا اپنے مال سے جو تعلق ہے وہ قرآن میں کسب کے لفظ سے بیان کیا گیا ہے۔ یعنی انسان اس کا حقیقی مالک نہیں بلکہ کاسب ہے۔ پھر اس کسب کے بارے میں قرآن کہتا ہے کہ اس میں بھی تمہاری دانش و حکمت اور ہنرمندی و محنت کو دخل نہیں ہے بلکہ خدا کی رہنمائی اور اس کی بخشی ہوئی دانائی اور اس کی کاوکشائی ہی نے تم سے یہ کسب کرایا ہے۔ لیکن اس کے باوجود قرآن انسان کے کسبِ حلال میں اس کے شرعی توارث اور انتقالِ ملکیت کے جائز طریقوں کو تسلیم کرتا ہے اور اس بنا پر وہ انسان کی ملکیت کو صحیح سمجھتا ہے۔ اور گاہے اس کا اندازِ تعبیر ایسا ہوتا ہے جس سے انسان کے مالک ہونے کی رہنمائی ملتی ہے۔ مثلاً وہ کہتا ہے

لا تؤتوا السفہاء اموالکم التی جعل اللہ لکم قیاماً

ترجمہ:- بیوقوفوں کو اپنے وہ مال نہ دو جن کو اللہ نے تمہاری زندگی کا سہارا بنایا ہے۔

لیکن قرآن انسان کو ایسا دائمی یتیم اور سفیہ نہیں سمجھتا جس کی ملکیت و دولت مستقل طور پر کسی دوسرے کے انتظام و تولیت میں ہو اور اس کو اپنی ملکیت میں کسی قسم کے تصرف کا کوئی حق نہ ہو۔ اس کے نزدیک انسان کے مرتبہ کمال اور شرفِ انسانیت کے شایانِ شان یہی ہے کہ انسان آزاد اور مختار ہو کر اپنے مال میں جائز تصرف کر سکے۔ ایک طرف نہ وہ انسان کو اتنا بے دست و پا بناتا ہے کہ اس سے ایک بے جان مشین اور بے عقل جانور کی طرح محنت لی جائے اور اس کو مال و دولت استعمال کرنے کی صحیح اجازت بھی نہ دی جائے اس لیے کہ یہ اس کے مرتبہ انسانیت

کے منافی ہے اور یہ انسان کا جامداتی تصور ہے۔ اس سے کسب معیشت کے محرکات میں افسردگی آجاتی ہے۔ اور کسب کا وہ فطری جوش ونشاط اور زندگی کا تنوع جو تمدن کے لیے ضروری ہے مردہ ہوجاتا ہے۔ دوسری طرف وہ انسان کو اپنے مال میں تصرف کرنے، ان کے استعمال کرنے میں بالکل آزاد بھی نہیں کرتا۔ اس کے لیے اس نے بڑے وسیع جو قانونی انتظامات کیے ہیں ان کی نوعیت یہ ہے۔

۱۔ سب سے پہلے اس نے یہ یقین پیدا کیا کہ انسان مال ودولت کا حقیقی مالک نہیں ہے مالک حقیقی اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ وہ اس مال میں اللہ کا امین اور نائب ہے۔

۲۔ یہ اعتقاد پیدا کرتا ہے کہ اس زندگی کے بعد دوسری زندگی ہے جس میں اس کو زندگی کے تمام مال ودولت کا حساب دینا ہے اور یہ دیکھا جائے گا کہ اس نے مال میں حقِ امانت و نیابت ادا کیا ہے یا نہیں؟۔

۳۔ اس نے بہت قوت کے ساتھ یہ ذہن بنایا ہے کہ دُنیا عیاشی کی جگہ نہیں بلکہ امتحان گاہ ہے یہاں مال ودولت اور سامان آرائش وراحت سب آزمائش کے لیے ہے۔ یہ زندگی فرصتِ عمل ہے یہ مال و دولت آخرت کی جنس ثواب اور رضائے الٰہی حاصل کرنے کا زرِ مبادلہ ہے۔

۴۔ اس نے یہ بھی ضروری قرار دیا ہے کہ مال جائز، پاک اور عادلانہ طریقوں سے کمایا جائے۔ اس کے لیے کسب پر بھی کچھ قانونی اور اخلاقی پابندیاں عائد کیں۔ مسلمان کو اجازت نہیں دی گئی کہ وہ دھوکہ، چوری، قمار بازی، سنگدلی اور شقاوت سے مال پیدا کرے، خیانت، غصب، فریب دہی، غش و غرور، سٹہ بازی جیسے تمام ذرائع کو حرام قرار دیا گیا۔

۵۔ تجارت کو جائز بتایا لیکن سُود کو مطلقاً حرام کر دیا۔

۶۔ اپنے مال میں خواہ وہ کتنی کثیر مقدار میں ہو اسراف اور تبذیر کو حرام قرار دیا۔

۷۔ دولت کے ذرائع ہیں دُنیا میں سونا اور چاندی ہے۔ اس کے استعمال پر بطور زیور مرد پر اور زیور کے علاوہ اس کے سارے استعمالات پر مرد وعورت کے لیے پابندی لگادی۔

۸۔ روپیہ جمع کرنے اور اللہ کی راہ میں خرچ نہ کرنے کو سنگین سزا کا مستحق قرار دیا۔

۹۔ انفاق فی سبیل اللہ، غم خواری، مواسات و ایثار و ہمدردی کی بکثرت و شدت ترغیب دی گئی ہے۔

۱۰۔ یہ تصور پیدا کیا کہ ہر فرد کی ملکیت سے جماعت اور اُمت کے کچھ حقوق ومنافع وابستہ ہیں اس لیے نتیجۃً ہر انفرادی ملکیت اجتماعی ملکیت ہے۔ اس کے ضائع ہونے سے جماعت کی حق تلفی

وَقَالُوا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ؕ تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ ؕ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۞ بَلٰى ۚ مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۪ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۞

اور اہلِ کتاب کہتے ہیں کہ جنت میں یہودیوں اور عیسائیوں کے علاوہ ہرگز کوئی نہ جائے گا یہودیوں کے خیال کے مطابق یہودیوں کے سوا اور عیسائیوں کی رائے میں عیسائی کے سوا۔ یہ اُن کی امنگیں[۳۰۵] اور ولولے ہیں نہ کہ امرِ واقعہ۔ تم ان سے کہو کہ اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو دلیل پیش کرو۔ یہ آرزوئیں بالکل غلط ہیں۔ امرِ واقعہ یہ ہے کہ جنت میں صرف وہ شخص[۳۰۶] جائے گا جو زندگی میں اپنا رُخ اللہ کی طرف رکھے گا اور اس فرمانبرداری کی زندگی میں جو حُسنِ عمل کی سوغات[۳۰۷] بھی لے کر آئے گا تو اس کے لیے اس کے رب کے حضور میں اس کا اجر ہے اور اس کے لیے نہ کسی طرح کا اندیشہ ہے نہ کسی طرح کی غمگینی۔

ہوتی ہے۔

۱۱۔ آخر میں قانونِ وراثت کے ذریعہ ہر چھوٹی سے چھوٹی دولت اور ہر معمولی سے معمولی ملکیت کو بھی بہت سے لوگوں میں تقسیم کردیا جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہر شخص جو اثاثہ اور املاک چھوڑ کر مرے وہ اس کے وارثوں میں حصّہ رسد تقسیم ہوتا ہے۔ اس طرح یہ ناممکن ہے کہ کوئی دولت اور ملکیت ایک نسل سے زیادہ قائم رہے۔

۱۲۔ افراد کی دولت اور ان کے سرمایہ کو جماعت کے لیے نفع بخش بنانے کی سب سے آخری اور حتمی تدبیر یہ کی کہ ہر شخص جس کے پاس اس کے ضروری مصارف سے زائد $52\frac{1}{2}$ تولہ چاندی کی مقدار یا اس کی رائج الوقت قیمت جمع ہوجائے۔ ایک سال گزرجانے پر اس میں چالیسواں حصّہ یعنی $2\frac{1}{2}$ فی صد راہِ خدا

میں نکالے اس کا نام قرآن حکیم کی اصطلاحی زبان میں زکوٰۃ ہے۔

یہ زکوٰۃ اسلامی نظام کی اہم دفعہ ہے بلکہ اسلام کا ایمان کے بعد دوسرا رکن ہے۔ قرآن مجید مخاص کے متعلق جو اُصول بتائے ہیں اور اس کی حکمتوں کی طرف جو اشارات کیے ہیں اس پر انشاءاللہ اس تفسیر میں آئندہ تفصیلی کلام کریں گے۔

اس موقعہ پر خاص طور پر یہ ارشاد کہ جو کچھ بھی نیکی اپنے لیے آگے روانہ کرو گے اللہ کے پاس اُسے پاؤ گے۔ اس میں اشارا ہے کہ زکوٰۃ ہی پر اکتفا نہ کرو بلکہ اس میدان میں خیر کا ہر اقدام اللہ کی رضامندی کا ذریعہ اور مستقبل میں ثمرہ آور اور منیجہ خیز ہو گا بلکہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے خاص طور، خاص انداز میں لوگوں کو سمجھایا ہے۔

> تم میں سے کون ہے؛ جسے اپنے مال کی نسبت اپنے وارث کے مال سے زیادہ محبت ہو؛ صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ کوئی نہیں۔ سب کو اپنے ہی مال سے محبت ہوتی ہے؛ حضورؐ نے فرمایا تمہارا مال وہ ہے جو تم نے آگے روانہ کر دیا اور تمہارے وارث کا مال وہ ہے جو تم چھوڑ کر مر گئے۔

راہِ نجات صرف اسلام و احسان ہے

اس آیت میں پہلے اہلِ کتاب کے دین کے معاملے میں غرور کا تذکرہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ ان کو غرہ یہ ہے کہ جنت ان ہی کے لیے ہے اور نجات ان کے نام الاٹ ہو چکی ہے۔ یہ بھی اہلِ کتاب کی شناعتوں میں سے ایک شناعت ہے اور آج تک وہ اسی خود فریبی کا شکار ہیں۔ یہودی کہتے تھے کہ جب تک کہ ایک انسان یہودی گروہ بندی میں داخل نہ ہو نجات نہیں پا سکتا۔ عیسائی کہتے تھے جب تک عیسائی گروہ بندی میں داخل نہ ہو نجات نہیں مل سکتی۔ قرآن کہتا ہے کہ نجات کا مدار یہودیت اور عیسائیت نہیں بلکہ اس کا مدار ایمانِ صحیح اور عملِ صالح ہے۔ ایمان صحیح یہ ہے کہ اللہ کی عبادت میں بھرپور خلوص ہو اور اس میں کسی درجہ میں شرک کا شائبہ نہ ہو اور نبوت و رسالت پر ایمان تفریق بین الرسل سے آلودہ نہ ہو۔ یہ دونوں مدعیانِ جنت ان دونوں خوبیوں سے محروم ہیں۔ اس آیت کے ذریعہ قرآن نے اس نجات کو جو فرقوں، قوموں، نسلوں کی مِلک ہو کر رہ گئی ہے سب کے لیے بلاتمیز رنگ و نسل اور فرقہ و طبقہ عام کر دیا۔ اور نجات کو پوری انسانیت کا اشتراکی سرمایہ بنا دیا۔ چاہے انسان امیر ہو یا غریب،

اونچی ذات کا ہو یا نیچ کا، رنگ کا کالا ہو یا گورا، سب کے لیے شاہراہِ نجات ایک ہے اور ہمیشہ سے ایک ہی رہی ہے اور وہ صرف اسلام واحسان کی راہ ہے۔ اس پر گامزن ہونے والا نہ مستقبل کے بارے غمگین ہو سکتا ہے اور نہ ماضی کا کوئی اندیشہ رکھ سکتا ہے ان کو اپنے پروردگار کے حضور ضرور جزا ملے گی۔

۳۰۴ ۔ اہل کتاب کہتے ہیں۔ اگرچہ یہودی اور عیسائی دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اس لیے اصل عبارت یوں ہونی چاہیے تھی قالت الیھود لن یدخل الجنۃ الا من کان ھودا و قالت النصاریٰ لن یدخل الجنۃ الا النصاریٰ۔ لیکن قرآن نے بلیغ اختصار کے ذریعے دونوں کو یکجا کر دیا اور بتا دیا کہ دونوں اپنی اپنی نجات کے مدعی ہیں اور مزہ یہ ہے کہ دونوں باہم ایک دوسرے پر نجات کا دروازہ بند کر رہے ہیں قرآن کا اندازِ تعبیر بتا رہا ہے کہ قرآن کو اس یہودیت اور نصرانیت پر اعتراض نہیں ہے جو حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ کی نبوت سے وابستہ ہونے کی وجہ سے رونما ہوئی ہے کیونکہ یہودیت کا نام حضرت موسیٰ کی اس دعا انا ھدنا الیک سے وابستہ ہے جب کہ نصاریٰ کا لقب عیسائیوں کو نحن انصار اللہ سے ملا ہے۔ اور یہ دونوں نام قرآن میں مقامِ مدح میں بھی آئے ہیں۔ دراصل قرآن کو یہاں جس چیز پر اعتراض ہے وہ لن یدخل الجنۃ الا من کان ھودا او نصاریٰ۔ کے پس منظر میں پوشیدہ ہے اور وہ یہ کہ نبوت سے تعلق رکھتے ہوئے اللہ پر ایمان کا دعویٰ کرتے ہوتے، کتاب الٰہی کو مانتے ہوئے وہ اس نعرہ سے تفریق بین الرسل کا اقرار کر رہے ہیں اور اعلان کر رہے ہیں کہ عیسائی ہو کر محمد رسول اللہ کو نہ مان کر جنت مل سکتی ہے اور یہودی ہو کر حضرت عیسیٰ اور محمد رسول اللہ کو نہ مانتے ہوتے بھی جنت مل سکتی ہے۔ قرآن کو ان کے عیسائی یا یہودی ہونے پر اعتراض نہیں ہے بلکہ عیسائی ہوتے ہوئے محمد رسول اللہ کو نہ ماننے پر اور یہودی ہوتے ہوئے حضرت عیسیٰ اور محمد رسول اللہ کے نہ ماننے پر اعتراض ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے اگر وہ اس نعرے کے پردے میں تفریق بین الرسل جیسے سنگین جرم کے مرتکب نہ ہوتے اور عیسائی ہوتے ہوئے محمد رسول اللہ کی نبوت کو اور یہودی ہوتے ہوئے حضرت عیسیٰ اور محمد رسول اللہ کی نبوت کو تسلیم کرتے تو قرآن کو ان کے نام پر کوئی اعتراض نہ ہوتا۔ قرآن انبیاء سے رشتہ توڑنے نہیں جوڑنے آیا ہے۔

دراصل یہاں راہیں صرف دو ہیں۔ ایک ایمان کی دوسری انکار کی۔ ایمان کی راہ یہ ہے کہ بلا تفریق سب کا اقرار کیا جائے اور سب کو مانا جائے اور انکار کی راہ یہ ہے کہ سب کا یا کسی ایک کا انکار کر دیا جائے۔ انکار کی راہ خالص کفر کی راہ ہے۔ قرآن چونکہ سب انبیاء کی تصدیق کا منادی بن کر

آیا ہے اس لیے اس کے نزدیک اس نعرے کی قیمت ولولہ سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔

۳۰۵ ۔ یہ ان کی امنگیں اور ولولے ہیں۔ نجات و سعادت کے فیصلے امنگوں اور آرزوؤں سے نہیں ہوتے ہیں۔ اصل ارشاد میں اَمانی آیا ہے۔ یہ اُمنیت کی جمع ہے۔ اس کے معنے جھوٹی آرزوئیں، خیالی اندازے اور من گھڑت اُمیدیں ہیں۔ چونکہ ان کے اس دعوے کی پشت پر ایک آرزو نہیں بلکہ آرزوؤں کا ایک جمگھٹا تھا۔ جنت میں جانا، عذاب نہ ہونا، اپنے مخالفوں کے لیے جنت سے محرومی اور ان کے لیے عذاب، حساب و کتاب سے اپنی بے نیازی وغیرہ وغیرہ۔ اس لیے بجائے آرزو کے آرزوئیں ولولے جمع کے لفظ میں لائے۔ اور ان ولولوں کی پشت پر چند خوش فہمیاں کام کر رہی ہیں مثلاً یہ کہ ہم اللہ کے چہیتے ہیں، ہم انبیا زادے ہیں۔ ہمارے نسب نامے میں بزرگ ترین ہستیاں ہیں۔ یہ بزرگ ہستیاں ہمارے بغیر جنت میں نہ جائیں گی۔ محض بزرگ زادگی اور نسلی و نسبی شرافت کے غرے میں اُن کا دعویٰ تھا کہ جنت بس ہمارے نام الاٹ ہو چکی ہے۔

۳۰۶ ۔ اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو دلیل پیش کرو۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب ہے۔ کہ آپ ان سے کہیے کہ خالی زبانی دعوؤں سے کیا ہوتا ہے۔ اگر حقانیت کے مدعی ہو تو اپنی تائید میں دلیل عقلی یا نقلی پیش کرو۔ یہ بات کہہ کر قرآن نے اہل ایمان کو ایک ایسا قانون بنا دیا جو دوسری کسی آسمانی کتاب میں موجود نہیں ہے یعنی یہ کہ کسی کی کوئی بات دین کی زندگی میں خواہ وہ کتنی اچھی ہو بغیر دلیل کے قابلِ قبول نہیں ہے اور صرف دعویٰ کی بنیاد پر کسی بات کا فیصلہ نہیں ہو سکتا۔

جن لوگوں سے قرآن دلیل کا مطالبہ کر رہا ہے۔ وہ فکری آزادی اور معاملہ کو دلائل کی کسوٹی قوت سے جانچنے کی نعمت سے قطعاً بیگانہ ہیں۔ وہ انسانیت کی فکری نابالغی کے زمانہ کی مخلوق ہیں۔ وہ صرف اسی کے مکلف ہیں کہ جو کچھ کہا جاتا ہے کرو۔ لیکن قرآن نے اپنی دعوت اپنے مخاطبوں کے سامنے یہ کہہ کر پیش کی۔

قل ھذہٖ سبیلی ادعوا الی اللہ علیٰ بصیرۃ انا و من اتبعنی ۔

اے پیغمبر تم کہہ دو میری راہ یہ ہے کہ میں لوگوں کو اللہ کی طرف بصیرت کی بنا پر بلاتا ہوں۔ اور یہی روش میرے پیروکاروں کی بھی ہے۔

بصیرت کے معنے واضح اور صاف دلیل کے ہیں۔ گویا قرآن نے ھاتوا برھانکم کہہ کر اپنے مخاطبوں کو تعلیم دی ہے کہ ہمیشہ بات کو دلیل کی ترازو میں تول کر قبول کریں۔ قرآن نے ایمانیات اور اعمال

سب کے لیے دلیل کا پیمانہ رکھا ہے۔ ایمانیات میں اللہ کی قدرت، اللہ کا علم، اللہ کی حکمت اور اللہ کی عبادت پر آیات کونیہ سے استدلال کیا ہے اور اعمال میں مصالح اور مفاسد کو اس کی بنیاد قرار دیا ہے۔ یہ قرآن کی دعوت حجت و برہان کا اثر ہے کہ اسلام میں اجتہاد و استنباط کی اجازت ملی ہے۔ جبکہ پہلی اُمتیں ہمیں اس سے محروم نظر آتی ہیں لیکن چونکہ فکرِ انسانی جذبات کا محکوم ہے اس لیے تعقل، تدبّر کے ساتھ مشورے کا بھی حکم ہے۔

۲۰۷
۵ - جنّت میں صرف وہ شخص جائے گا جو زندگی میں اپنا رُخ اللہ کی طرف رکھے گا۔

اصل ارشاد میں اسلم وجهه لله کے الفاظ ہیں۔ لغت میں اسلام کے معنے اپنے آپ کو کسی کے سامنے جھکا دینے اور ذلیل بنا دینے کے ہیں۔ یہاں دل کے اللہ کے سامنے سراپا نیاز ہونے اور اللہ ہی کو مقصود و مطلوب بنانے کو اسلام وجہ کہا ہے۔ وجہ کے معنے چہرہ کے ہیں لیکن محاورے میں اکثر ذات مراد ہوتی ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے اسی حالت کو حضرت ابراہیمؑ کی دُعا میں توجیہہ وجہ یکسو ہو کر رُخ اس کی طرف کر لینا کہا ہے۔ انی وجهت وجهي للذي فطر السمٰوات سے سب سے یکسو ہو کر اپنا رُخ اس اللہ کی طرف کر لیا۔ کیونکہ انسان مقصد کی طرف جب متوجہ ہوتا ہے تو اس کا چہرہ مقصد کی طرف ہوتا ہے۔ یہاں اسلام وجہ سے مراد یہ ہے کہ بندہ اپنے مالک و مولیٰ کے سامنے اس طرح جھک جائے کہ اس کے سوا اس کا رُخ کسی اور طرف نہ ہو۔ یہ جھکنا اور ذلیل ہونا دراصل ایک عمل ہی کا نام ہے۔ اور ایمان دل کی تصدیق کو کہتے ہیں۔ تصدیق اسی طرح دل کا ایک عمل ہے جیسے اقرار زبان کا۔ جب دل کی گہرائیوں میں تصدیق ہوگی تو زندگی کے مختلف گوشوں میں اس کے سامنے جھکنا اور ذلیل ہونا ایک طبعی تقاضا ہوگا۔ مگر باریک سا فرق ہے کہ ایمان ایک علم ہے اور اسلام عمل ہے لیکن یہاں عمل علم کے تابع ہے سو اس سے ایمان اور اسلام کا باہمی ربط سمجھنے میں آپ کو آسانی ہوگی۔

کیا اسلام بلا ایمان اور ایمان بلا اسلام پایا جا سکتا ہے۔ امام سبکی فرماتے ہیں کہ اسلام اگرچہ ظاہری فرمانبرداری اور طاعت کا نام ہے مگر ایمان باطن اس کے لیے شرط ہے۔ اسی طرح ایمان اگرچہ اندرونی فرمانبرداری کو کہتے ہیں مگر انقیاد ظاہری اس کے لیے ضروری ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایمان بلا اسلام اور اسلام بغیر ایمان شرعاً معتبر نہیں ہے۔ اتحاف السادۃ المتقین میں علامہ زبیدی نے اس تلازم پر اشاعرہ اور احناف کا اتفاق نقل کیا ہے۔ بتانا یہ چاہتا ہوں کہ قرآن میں ایمان و اسلام یا تو ایک ہی چیز کے دو نام ہیں ورنہ کم از کم لازم و ملزوم ضرور ہیں۔

حافظ ابن تیمیہؒ نے قرآن حکیم کی اس آیت سے ایک لطیف استنباط فرمایا ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔

کہ اس آیت میں اسلام اور احسان پر جو وعدہ کیا گیا ہے دوسری آیت من امن باللہ والیوم الاخر وعمل صالحاً فلھم اجرھم میں بھی وعدہ ایمان اور عمل صالح پر کیا گیا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ ایمان و اسلام لازم و ملزوم ہیں۔

ابو طالب مکی نے ایمان و اسلام کے اس باہمی تعلق کو خوب وضاحت سے سمجھایا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ایمان و اسلام کی مثال شہادتین جیسی ہے۔ کہنے کو شہادتِ الوہیت اور شہادتِ رسالت دو الگ الگ چیزیں ہیں مگر ان میں باہم گہرا تعلق ہے کہ بلحاظِ حکم گویا دونوں ایک ہی ہیں۔ رسالت کے بغیر شہادتِ وحدانیت کارآمد نہیں ہوتی اور شہادتِ وحدانیت بلا شہادتِ رسالت کے بیکار رہتی ہے۔ ایک شخص کے لیے جس طرح قلب کی ضرورت ہے اسی طرح جسم کی ضرورت بھی ہے۔ نہ کوئی قالب بلا قلب کے زندہ رہ سکتا ہے نہ قلب بلا قالب کے سیر کر سکتا ہے خیمے کے دو حصے ہوتے ہیں ایک اوپر کا کپڑا اور دوسرا اندرونی چوب۔ نہ کپڑا بلا چوب کے تنہا رہ سکتا ہے اور نہ صرف چوب بلا کپڑے کے خیمہ کہلائی جا سکتی ہے۔ صرف اعمالِ ظاہرہ بلا اعتقادِ باطن کھلا ہوا نفاق اور محض اعتقادِ باطن بدونِ اعمال کے کفر کا مظاہرہ ہے۔ اسلام یا ایمان کو اسی وقت معتبر کہا جا سکتا ہے جب کہ اعمالِ ظاہر کے ساتھ تصدیقِ باطن ہو اور تصدیقِ باطن کے ساتھ اعمالِ ظاہر بھی ہوں۔ قرآن نے کفر کو اسلام و ایمان دونوں کا مدِ مقابل قرار دیا ہے۔

کیف یھدی اللہ قوما کفروا بعد ایمانھم

جو لوگ مومن ہونے کے بعد کفر کرتے ہیں اللہ ان کو ہدایت کیسے دے گا۔

اور

ایامرکم بالکفر بعد اذ انتم مسلمون

کیا تم کو وہ مسلم ہونے کے باوجود کفر کا حکم دے گا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان و اسلام ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے۔

آیت میں اسلم وجھہ للہ سے مراد یہ ہے کہ عابدانہ زندگی میں ہر قسم کی آمیزش سے الگ ہو کر پوری توحید کا قائل ہو۔ زندگی میں اللہ کی مرضی پر چھوڑ رکھنا یہی ہے کہ عقائد و اعمال میں پوری فرمانبرداری کرے
۳۰۸ ے۔ اور اس فرمانبرداری کی زندگی میں حسن کار بھی ہو۔ یعنی ایمان و اسلام یا اعتقاد و اعمال میں وہ حسن کار ہو۔ اصل ارشاد میں وھو محسن آیا ہے۔ یہ احسان سے بنا ہے۔ احسان کے معنے ہماری زبان اور محاورے میں کسی کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کے ہیں۔ لیکن یہاں جس احسان کا ذکر ہے

وہ اس کے علاوہ ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے احسان کی یہ تعریف فرمائی ہے :

احسان یہ ہے کہ تم اللہ کی بندگی اس طرح کرو گویا اس کو دیکھ رہے ہو کیونکہ اگرچہ تم اس کو نہیں دیکھتے ہو تو وہ تو تمہیں دیکھ ہی رہا ہے۔

آیت میں حضورؐ کی اس تشریح کی رُو سے احسان کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے لیے فرمانبرداری کی زندگی افکار و اعمال میں اس طرح کی جائے کہ گویا اللہ سبحانہٗ ہمارے سامنے ہے اور ہماری ہر حرکت و سکون کو دیکھ رہا ہے۔ یعنی اللہ سے زندگی کے سارے گوشوں میں عابدانہ تعلقات اس طرح رکھنا چاہیے کہ وہ قہار و قدوس اور ذوالجلال و جبروت ہماری آنکھوں کے سامنے ہے اور گویا ہم اس کو دیکھ رہے ہیں۔

اسے ایک مثال سے سمجھو۔ غلام ایک تو اپنے آقا کے احکام کی تعمیل اس وقت کرتا ہے جبکہ وہ اس کے سامنے موجود ہو اور اس کو یقین ہو کہ وہ مجھے اچھی طرح دیکھ رہا ہے اور ایک رویہ اس کا اس وقت ہوتا ہے جبکہ وہ آقا کی غیر موجودگی میں کام کرتا ہے۔ عموماً ان دونوں وقتوں کے طرزِ عمل میں فرق ہوتا ہے۔ اور عام طور سے یہی ہوتا ہے کہ جس قدر دلی دھیان اور محنت اور خوبصورتی کے ساتھ وہ آقا کی آنکھوں کے سامنے کام کرتا اور حسن خوش اسلوبی سے اس وقت وظائفِ خدمت کو انجام دیتا ہے مالک کی عدم موجودگی اس کا وہ حال نہیں ہوتا۔ یہی حال بندوں کا اپنے مولائے حقیقی کے ساتھ ہوتا ہے۔ جس وقت بندہ یہ محسوس کرے کہ میرا مولا حاضر و ناظر ہے۔ میرے ہر کام بلکہ میری ہر حرکت اور ہر ہر سکون کو دیکھ رہا ہے تو اس کی ایک خاص کیفیت اور اس کی بندگی میں ایک خاص شانِ نیازمندی ہو گی جو اس وقت نہیں ہو سکتی جبکہ اس کا دل اس تصور اور احساس سے خالی ہے تو احسان یہی ہے کہ اللہ کی بندگی اس طرح کی جائے گویا وہ ہماری آنکھوں کے سامنے ہے اور ہم اس کے سامنے اور وہ ہمیں دیکھ رہا ہے۔

آیت کا خلاصہ مطلب یہ ہے کہ دین کی رُوح دو چیزیں ہیں

ایک یہ کہ بندہ دل و جان سے اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کر دے اس کی اطاعت و فرمانبرداری کو اپنا عقیدہ سمجھے۔

دوسری بات یہ ہے کہ جنت میں جانے کے لیے صرف یہی کافی نہیں ہے کہ کوئی شخص اپنے دل سے تو اللہ کی فرمانبرداری کا ارادہ کرے مگر طاعت و فرمانبرداری کے طریقے اپنی رائے سے بنالے اور اس کے لیے اللہ کے رسُول کی رہنمائی کو نہ اپنائے۔

پہلی بات من اسلم سے اور دوسری ھو محسن سے معلوم ہوتی ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ آخرت کی نجات کے لیے صرف ارادہ طاعت کافی نہیں ہے بلکہ حسنِ عمل بھی ضروری ہے۔

وَقَالَتِ الْيَهُودُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَيْءٍ ۖ وَّقَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُودُ عَلٰى شَيْءٍ ۙ وَّهُمْ يَتْلُونَ الْكِتٰبَ ؕ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ ۚ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۱۱۳﴾

اور یہود کہتے ہیں کہ عیسائیوں کا دین کچھ نہیں اور عیسائی کہتے ہیں کہ یہودیوں کا دین کچھ نہیں ہے۔ حالانکہ اللہ کی کتاب دونوں پڑھتے ہیں۔ اور اسی قسم کی بات ان لوگوں نے کہی ہے جن کے پاس کتاب اللہ کا علم نہیں ہے۔ بس اللہ ہی ان کے اختلاف کا روزِ قیامت فیصلہ فرمائے گا۔

قرآن کی اصطلاح میں حسنِ عمل یہ ہے کہ نبوت کے اُسوۂ حسنہ کے مطابق ہو۔
لقد کان لکم فی رسول اللہ اُسوۃٌ حسنۃٌ۔

اس موقعہ پر مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نے یہ خوب فرمایا ہے کہ،
جو شخص ان بنیادی اُصولوں میں سے کسی بھی اُصول کو چھوڑ دے خواہ یہودی ہو یا نصرانی اور یا مسلمان۔ اور پھر محض قومیت کے زعم میں اپنے آپ کو جنّت کا ٹھیکیدار سمجھ لے تو یہ صرف اس کی خود فریبی ہے۔ جس کا حقیقت سے دُور کا بھی واسطہ نہیں۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک کوئی بھی ان ناموں کا سہارا لے کر نہ قربِ الٰہی حاصل کر سکتا ہے اور نہ مقبول جب تک اس میں ایمان و عملِ صالح کی رُوح موجود نہ ہو۔

اُصولِ ایمان تو تمام انبیاء کا اشتراکی سرمایہ ہے اور ہر نبی کی شریعت میں مشترک ہے۔ البتہ عملِ صالح کی صورتیں بدلتی رہی ہیں۔ زمانۂ تورات میں حسنِ عمل یہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ کے اُسوہ کے مطابق زمانۂ انجیل میں حسنِ عمل یہ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کے اُسوہ کے موافق ہو جب کہ زمانۂ قرآن میں حسنِ عمل یہ ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے اُسوۂ حسنہ کے مطابق ہو۔ ہر نبی کا اُسوہ اپنے زمانہ میں وحی کی اس روشنی پر ہوتا ہے جو اس پر نازل ہوتی ہے۔ حضرت موسیٰؑ کا اُسوۂ تورات کا نقش ہے حضرت عیسیٰؑ کا اُسوۂ انجیل کا عکس ہے اور محمد رسول اللہؐ کا اُسوہ قرآن کی روشنی ہے۔

صداقت کے خلاف بغاوت

یہ بتلانے کے بعد کہ ہر گروہ اپنی پاکبازی، پارسائی اور نجات کا مدعی ہے۔ اب یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ہر گروہ دوسرے کو سچائی سے محروم سمجھتا ہے۔ اور ان میں باہم ایک دوسرے کے خلاف انتہائی تعصب ہے۔ اور صداقت کے خلاف یہ بغاوت اس وقت ہے جبکہ دونوں اللہ سے تعلق کا دم بھرتے ہیں۔ کتابِ الٰہی یعنی تورات دونوں کے سامنے ہے بایں ہمہ ان کی بدکرداری کا نتیجہ یہ ہے کہ باہم دگر مخالف اور مکذب جتھے قائم ہو گئے ہیں ہر طبقہ دوسرے طبقہ کو جھٹلا رہا ہے اور ہر ایک صرف اپنے کو نجات کا مستحق سمجھتا ہے۔ یعنی جب امتوں کا نبوت کے لائے ہوئے علم وعمل سے رشتہ ٹوٹ جاتا ہے اور دین کی زندگی چند اوہام اور چند رسوم تک محدود ہو کر رہ جاتی ہے، تو یہ صورتِ حال پیدا ہو جاتی ہے۔ حیرت اس پر ہے کہ وہ ایک خدا اور ایک کتاب کو مانتے ہوئے بھی یہ طرزِ عمل اختیار کیے ہوئے ہیں۔ یاد رہے کہ عہدِ عتیق کو دونوں مانتے ہیں

۳۰۹۔ یہودیوں نے تورات پڑھ کر سمجھ لیا کہ جب نصرانیوں نے حضرت عیسٰیؑ کو خدا کا بیٹا قرار دیا تو بے شک وہ کافر ہو گئے۔ اور عیسائیوں نے انجیل میں صاف دیکھ لیا کہ یہودی حضرت عیسٰیؑ کی نبوت کا انکار کر کے کافر ہو گئے [1]

اور بعض نے یہی بات اس طرح پیش کی ہے کہ

یہودی قوم عقیدتاً بہرحال موحد تھی، نصرانیت کا شرک اور اس کی تثلیث برداشت ہی نہ کر سکتی تھی۔ اور نہ اس کی قائل ہو سکتی تھی کہ ایسے گھڑے ہوئے دین میں کچھ بھی صداقت ہو سکتی ہے۔ [2]

ہمیں افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ یہودیوں اور عیسائیوں کی صداقت گیری اور حق پسندی کا قرآن اس آیت میں اعلان نہیں کر رہا ہے۔ ان بزرگوں کی تشریح سے یہ تاثر ملتا ہے کہ یہودی عیسائیوں پر کفر کا فتویٰ دیتے اور عیسائی یہودیوں کو برا کہنے میں حق بجانب تھے اور ان کا موقف بالکل شرعی اور قانونی طور پر درست تھا۔ بتانا یہ چاہتا ہوں کہ اگر یہودی عیسائیوں کو تثلیث اور شرک کی بنا پر کافر کہتے تھے اور ایسے ہی عیسائی یہودیوں کو انکارِ مسیح اور انکارِ انجیل کی بنا پر کافر کہہ رہے تھے تو ان کا ایسا کہنا قابلِ مدح ہے نہ کہ قابلِ مذمت۔ لیکن قرآن یہاں ان کی مدح سرائی نہیں بلکہ مذمت

---

[1] حاشیہ شیخ الہند ص ۲۲ [2] تفسیر ماجدی ص ۴۴

خلاف کر رہا ہے۔ ان بزرگوں کی تشریح سے قرآن کی مذمت واضح نہیں ہوتی۔ حافظ ابن کثیرؒ نے اس تشریح کو یہ کہہ کر رد کر دیا ہے کہ

آیت کی یہ تشریح یہودیوں اور عیسائیوں کے موقف کی تصدیق کرتی ہے لیکن قرآن ان کی اس کہنے کی مذمت کر رہا ہے۔

آیت کا صاف اور واضح مطلب وھم یتلون الکتاب کی قید سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ خدا کی جانب سے آئی ہوئی سچائی کے دونوں پاس ہے لیکن دونوں نے سچائی سے انحراف کیا ہے۔ اصل کے اعتبار سے دونوں سچے ہیں لیکن عمل کے اعتبار سے دونوں جھوٹے ہیں۔ دونوں کتاب اللہ کے خلاف کر رہے ہیں تورات میں آنے والے نبی کی بشارت تھی آیا اور وہ ایمان نہیں لائے اور انجیل تورات ہی کی تکمیل کے لیے آئی تھی۔ لیکن انہوں نے اس کو تورات کا مخالف سمجھ لیا اور اعلان کر دیا کہ آدمی شریعت (تورات) کے اعمال سے نہیں بلکہ صرف یسوع پر ایمان سے راستباز ٹھہرتا ہے۔ دونوں کتابوں میں اصل اور فرع کی نسبت تھی۔ ان کا دین ایک ہی تھا۔ ایک نے اصل کو پکڑ لیا اور دوسرے نے فرع کو۔ ایک نے سارا زور علم پر صرف کر دیا اور دوسرے نے سارا وزن عمل پر ڈال دیا اور حقیقت دونوں کے خلاف ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ دونوں سچائی سے دور جا نکلے ہیں۔ اور دور بھی تھوڑے نہیں بلکہ اتنے دور ہو چکے ہیں کہ موجودہ حالت میں ان میں اور بے کتاب قوموں میں کوئی فرق نہیں رہا ہے۔

۳۱۰۔ اور اسی قسم کی بات ان لوگوں نے کہی ہے جن کے پاس کتاب اللہ کا علم نہیں ہے۔ گویا جہالت اور نادانی میں سب کا وزن برابر ہو رہا ہے۔

یعنی یہود و نصاریٰ ایک دوسرے کو گمراہ جانتے ہیں اسی طرح بت پرست بھی اپنے سوا سب فرقوں کو گمراہ اور بے دین بتلاتے ہیں۔ اصل ارشاد کذالک قال الذین لا یعلمون ہے یعنی ایسے ہی ان لوگوں نے کہا جو جاہل ہیں ان ہی جیسی بات۔ اس میں تشبیہ کے لیے ایسے ہی اور ان ہی جیسی ڈبل تعبیرات آئی ہیں۔ بعض شارحین قرآن نے دوسری کو پہلی کی تاکید بتایا ہے لیکن کچھ شارحین قرآن نے اس میں بھی نکتہ آفرینی فرمائی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ تشبیہیں دو ہیں اور دونوں الگ الگ ہیں۔ ایک تشبیہ یہ بتلانے کے لیے ہے کہ دونوں کی بات میں ہم آہنگی ہے اور دوسری تشبیہ کا منشا یہ ہے کہ جیسے اہل کتاب بغیر کسی دلیل کے اپنی اپنی نجات کا محض ہوائے نفس اور عداوت کی بنا پر دعویٰ کر رہے ہیں ایسے ہی مشرکین بھی بے دلیل دعویٰ

کر رہے ہیں لے

یہودیوں اور عیسائیوں کی باہمی تفضیل اور ایک دوسرے کے بارے میں یہ تصور کہ وہ کچھ نہیں۔ اتباعِ ہویٰ اور فسادِ اخلاق کی بدترین مثال ہے۔ اگر یہودی انتظار کے باوجود تورات پڑھ کر حضرت عیسیٰؑ کا انکار کر سکتے ہیں اور اگر عیسائی حضرت مسیحؑ کو مان کر تورات کو پس انداز کر سکتے ہیں تو ان دونوں سے حضور انورؐ کی نبوت کے لیے تصدیق و ایمان کی کیونکر توقع ہو سکتی ہے؟

یہودیوں اور عیسائیوں کے اختلاف کی یہ داستان قرآن میں سنانے کا مقصود مسلمانوں کو متنبہ کرنے کے لیے ہے کہ کہیں وہ بھی اسی بیماری میں مبتلا نہ ہو جائیں کہ ایک کتاب، ایک نبی، ایک قبلہ، رکھنے کے باوجود اختلاف کے شکار ہو جائیں اور ایک دوسرے کو کافر کہنے لگیں۔ اس پر تفصیلی بحث پارہ ۴ میں آئے گی

۱۱۳ ۔ قرآن نے اس اختلاف کے بارے میں یہ فیصلہ سنایا ہے کہ پس اللہ ہی روزِ قیامت ان کے اختلاف کا فیصلہ فرمائے گا۔ اس کا وہاں کیا فیصلہ ہوگا اس کا علم اللہ ہی کو ہے۔ لیکن جہاں تک دُنیا میں فیصلے کا تعلق ہے وہ قرآن نے پہلی آیت میں یعنی بلی من اسلم وجھہ للہ وھو محسن ؒ میں کر دیا ہے اور بتا دیا ہے کہ قرآن کی دعوت اسی اختلاف کو ختم کرنے کے لیے ظہور میں آئی ہے اب تک اصولِ ایمان میں تمام انبیاء یک زبان رہے ہیں لیکن قوموں کے احوال و ظروف کے مختلف ہونے کی وجہ سے شریعت و منہاج میں اختلاف ہوتا رہا ہے۔ اب جب کہ انسانیت کمالِ بلوغ کو پہنچ چکی ہے ضروری ہے کہ دین کا رشتہ بھی علم و عمل میں سب کا ایک ہو۔ سب کی بندگی و نیاز کے لیے ایک ہی معبود کی چوکھٹ ہو اور سب کی گردنوں میں ایک ہی معبود کا رشتۂ عبودیت ہو۔ سب کا رب معبود رب العالمین، سب کی کتاب نذیراً للعالمین اور سب کا نبی رحمۃ للعالمین ہو۔ کوئی وطن ہو، کوئی نسل ہو، کوئی قومیت ہو کسی درجے اور کسی حلقہ سے تعلق ہو سب کی نجات کا ضابطہ ایک ہو۔ اگر تم سب نے اس دعوت کو قبول کر لیا تو یہ آسمانی رشتہ تمہارے تمام دینی اختلافات مٹا دے گا۔ سب کے بچھڑے ہوئے دل ایک دوسرے سے جُڑ جائیں گے۔ سب محسوس کریں گے کہ پوری دُنیا ان کا وطن ہے، ساری نسلِ انسانی ان کا گھرانہ ہے۔

قرآن کریم میں یہودیوں اور عیسائیوں کے اس اختلاف کا ذکر مسلمانوں کو خبردار کر رہا ہے کہ

لے حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۲۲

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِيْ خَرَابِهَا ۭ اُولٰۗىِٕكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْهَآ اِلَّا خَاۗىِٕفِيْنَ ڛ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝

اور اس شخص سے بڑھ کر ظالم[312] کون ہے؟ جو مساجد میں اللہ کے نام کی یاد کو روکے اور ان کی بربادی میں کوشاں[313] رہے۔ ایسے لوگ اس قابل[314] ہیں کہ خدا کی عبادت گاہوں میں قدم نہ رکھیں اور اگر وہاں جائیں بھی، تو ڈرتے ہوئے جائیں۔ اُن کے لیے دُنیا میں رُسوائی ہے اور آخرت میں عذابِ عظیم ہے۔

کوئی شخص محض دعوے سے مسلمان نام درج کرانے سے یا مسلمان زادگی یا مسلمانوں کے شہر میں پیدا ہونے سے یا مسلمان قوم کا فرد ہونے سے مسلمان نہیں بنتا بلکہ مسلمان ہونے کے لیے ضروری ہے کہ اس میں اسلام و احسان دونوں موجود ہوں۔

عبادت گاہوں میں اللہ کو یاد کرنے پر قدغن

اس سے پہلی آیت میں یہود و نصاریٰ کی نظریاتی کشمکش کا تذکرہ کیا تھا اور بتایا کہ نظریاتی طور پر ایک خدا کے پرستار ہونے اور ایک کتاب سے وابستہ ہونے کے باوجود ان میں اتنے فاصلے ہیں کہ ایک دوسرے کی دینی حیثیت کو بھی باہم یہ کہہ کر چیلنج کرتے ہیں کہ یہودیوں کے پاس کیا دھرا ہے اور عیسائیوں کا دین کچھ نہیں ہے۔ ان میں سے ہر ایک نظریات کے لحاظ سے اپنی سچائی کا مدعی ہے۔ یہی نظریاتی کشمکش ترقی کر کے عملی زندگی میں اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ ان کی عبادت گاہیں تک الگ الگ ہو گئی ہیں۔ اور باوجودیکہ دونوں ایک خدا کے نام لیوا اور ایک شریعت کے حامل ہیں لیکن ممکن نہیں ہے ایک یہودی مذہب کا پیرو عیسائی کی بنائی

ہوئی عبادت گاہ میں جاکر اللہ کا نام لے لے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ ان میں سے ہر گروہ صرف اپنی عبادت گاہ کو اللہ کی عبادت گاہ سمجھتا ہے۔ دوسرے گروہ کی عبادت گاہ کا اس کی نظروں میں کوئی احترام نہیں ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ اس سے بڑھ کر اور ظلم کیا ہو سکتا ہے کہ اللہ کے بندوں کو اللہ کی یاد سے روکا جائے اور صرف اس لیے روکا جائے کہ اس سے منظریاتی اختلاف ہے۔ یا ایک عبادت گاہ کو ڈھا دیا جائے اور اس لیے ڈھائی جائے کہ وہ ہماری بنائی ہوئی نہیں ہے۔ اس آیت میں اُن کی اسی انتہا پسندی کا تذکرہ ہے۔ جن لوگوں کی طبیعتیں آیاتِ قرآنی کے مطالب کے لیے پس منظر کی تلاش و جستجو کی خوگر ہو چکی ہیں۔ وہ اس آیت کی تشریح میں مختلف ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ بخت نصر نے بیت المقدس حملہ کیا اور عیسائیوں نے بختِ نصر کی مدد کی تھی اور یہ کہتے ہوئے جیسا کہ ابوبکر الجصاص نے لکھا ہے اتنا بھی نہیں سوچتے کہ بختِ نصر کلدانی شہنشاہ کا وجود ہی ۶۳ سنہ قبل مسیح ہے۔ ابھی عیسائیوں کا وجود ہی نہ تھا وہ اس کا ہاتھ بٹانے کہاں سے آگئے۔ اور کوئی کہتا ہے ٹائیٹس رومی کے زمانے میں رومی مشرکین نے یہودیوں کو بیت المقدس سے روک دیا تھا اور کسی کی رائے ہے کہ آیت کا تعلق مشرکینِ مکہ سے ہے۔ انہوں نے حضور انورؐ اور صحابہؓ کو حدیبیہ کے عمرہ میں مکہ سے روک دیا تھا اور کسی نے پسِ منظر سے ہٹ کر آیت کو پیشِ منظر سے وابستہ کرنے کی کوشش کی کہ اس میں آئندہ ہونے والے واقعہ کا ذکر ہے کون سا واقعہ؟ کسی نے بتایا کہ عیسائیوں کے ہاتھوں مسجدِ اقصیٰ کی اس تباہی کا ذکر ہے جو مسلمانوں کے زمانے میں ہوئی اور کسی نے قرامطہ کے حادثہ سے آیت کا ناطہ جوڑ دیا۔ حالانکہ آیت یہودیوں اور عیسائیوں کی عملی زندگی میں افتراق کے مظاہر و نقوش پیش کرنے کے لیے آئی ہے اور بتانا صرف یہ ہے کہ ان کی منظریاتی کشمکش کا ان کی عملی زندگی میں ظہور ہو رہا تھا۔

۳۱۲ھ ۔ اس کے شانِ نزول نصاریٰ ہیں کہ انہوں نے یہود سے مقابلہ کر کے توراۃ کو جلایا اور بیت المقدس کو خراب کیا۔ یا مشرکین مکہ کہ انہوں نے مسلمانوں کو محض تعصب و عناد سے حدیبیہ میں مسجدِ حرام میں جانے سے روکا تھا۔ باقی جو شخص کسی مسجد کو ویران کرے وہ اسی حکم میں داخل ہے[1]۔

حضرت شیخ الہندؒ کی یہ تشریح ان ہی روایات کی بنا پر ہے جو مفسرین نے شانِ نزول کے نام پر اس آیت کے تحت درج کی ہیں۔ ورنہ آیت اپنی تشریح میں کسی روایت کی

---

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۲۲

محتاج نہیں ہے۔ آیت کے مطالب اپنے سیاق و سباق سے بالکل واضح اور صاف ہیں۔
بہر حال حکم عام ہے سبب نزول کچھ بھی ہو حکم کو کسی خاص مسجد یا خاص زمانہ سے مخصوص کرنا درست نہیں ہے۔ یہاں مساجد کا لفظ جمع کی صورت میں آیا ہے اس میں جمعیت کے معنے اسی وقت باقی رہ سکتے ہیں جب یہ حکم عام ہو۔ ابو بکر ابن العربی نے یہ بات بڑی اچھی لکھی ہے کہ مساجد کا لفظ جمع ہے اس میں کسی مسجد یا کسی زمانہ کی قید لگانا محال ہے۔ یہاں قرآن میں مساجد اپنے لغوی معنے میں سجدہ گاہ یا عبادت گاہ کے معنے میں ہے عمارت کی وہ خاص قسم جس کا نام مسجد ہے اس کا اطلاق قرآن میں مسجدِ حرام، مسجدِ اقصیٰ پر ہوا ہے۔ ان دو کے علاوہ باقی تمام مسجدوں کو مساجد ہی کے نام سے پکارا ہے۔ یہاں قرآن نے مساجد اللہ کی تعبیر اختیار کر کے اس طرف اشارہ کر دیا کہ جس جگہ کو مسجد بنا دیا جائے اس کے مسجد ہونے کی بنیادی شرط یہ ہے کہ اس سے بندوں کے مالکانہ حقوق منقطع ہو جائیں۔ پاتال سے لے کر عنانِ سماء تک اس کی ملکیت کا کوئی دعویدار نہ ہو۔ ایک دوسرے موقعہ پر ان المساجد للہ کی تعبیر بھی آئی ہے۔ اس کا مقصد بھی یہی ہے کہ اللہ کے علاوہ کسی کی ملک نہ ہو۔ دُنیا اور دُنیا کی ہر چیز اللہ سبحانہٗ کے قبضہ قدرت میں ہے اور سب کا وجود اسی کی شانِ قدیری کا مظہر ہے۔ دُنیا کا کوئی ذرہ ایسا نہیں ہے کہ اللہ کا نہیں ہے لیکن جس کو اللہ خود فرماتے کہ یہ "میرا" ہے۔ اس کی قسمت کے کیا کہنے ہیں۔ اس کی عزت و قبولیت اپنا ایک خاص مقام رکھتی ہے۔ انہی میں یہ جگہیں بھی ہیں جن کو ہم مسجد کے مختصر لفظوں سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان کی اضافت اللہ نے اپنی طرف فرمائی ہے۔ یہ اضافت شرف و اختصاص کا کام بھی دیتی ہے اور ملک کا بھی۔ اضافت چونکہ ملک کو ظاہر کرتی ہے اس لیے اس سے تمام مخلوقات کے مالکانہ حقوق منقطع ہو کر صرف اللہ کا حق ملکیت باقی رہتا ہے اور اضافت چونکہ شرف و اختصاص کے لیے ہے اس لیے مساجد کا احترام مساجد کا ادب اس کا ناگزیر تقاضا ہے۔ احترام مسجد میں جہاں اور باتیں ہیں ان میں یہ بھی ہے کہ مسجد میں جو مال لگایا جائے وہ پاک اور حلال کمائی کا ہو۔ مالِ حرام اپنا ایک اثر رکھتا ہے جو کبھی نہ کبھی فتنہ و فساد کا مرکز بن جاتا ہے جیسے زہر اگر فوری طور پر کچھ نہ بھی کرے تو بھی مطمئن نہ رہنا چاہیے۔ پھر یہ مال جب مسجد جیسی مقدس جگہ پر صرف ہو رہا ہو — یہ دربارِ الٰہی ہے اور اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہے۔ اس میں ناپاک کی ذرہ برابر گنجائش نہیں ہے۔ حدیث میں ہے ان اللہ طیب لا یقبل الا الطیب

مالِ حرام کہیں بھی جائز نہیں ہے پھر مسجد میں اگر کوئی لگاتا ہے تو وہ دین پر ظلم کرتا ہے۔
اور مساجد اللہ کی تعبیر سے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ دنیا کی تمام مساجد آدابِ مسجد کے لحاظ سے مساوی ہیں جیسے مسجدِ حرام کی بے حرمتی ظلمِ عظیم ہے اسی طرح دوسری تمام مساجد کے متعلق بھی یہی حکم ہے۔ اگرچہ تینں مساجد مسجدِ حرام، مسجدِ اقصیٰ اور مسجدِ نبوی کا خاص شرف اپنی جگہ مسلم ہے لیکن حرمت اور ادب کے معاملہ میں سب مساجد مساوی ہیں [1]
خاص طور پر قرآن میں ظلم جس بات کو کہا ہے وہ مساجد میں اللہ کو یاد کرنے سے روکنا ہے۔ اس سے اشارۃً یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مساجد کا مقصدِ وجود اللہ کا ذکر ہے۔ حدیث میں ہے انما بنی المسجد لذکر اللہ مسجد تو ہے ہی اللہ کو یاد کرنے کے لیے
مسجد کے داخلہ میں اذنِ عام نہ ہونا بھی روکنے کے مفہوم میں داخل ہے۔ غالباً اسی بنا پر اسلام کے قانون دان طبقہ نے اذنِ عام کو مسجد کے مسجد ہونے کی شرط بتایا ہے۔ آیت میں منع فعل متعدی ہے جس کے دو مفعول ہیں، مساجد اللہ اور ان یذکر اللہ، معنے یہ ہوں گے کہ ذکر اللہ سے مسجد میں روک دیا جائے۔ لہٰذا اگر مسجد کے سامان اور اسباب ضائع ہونے کا اندیشہ ہو تو مسجد کا دروازہ بند کرنا اس ممانعت میں داخل نہیں ہے۔ فقہا اور محدثین دونوں اس کے قائل ہیں لیکن اوقاتِ نماز میں دروازہ کھلا رکھا جائے گا کیونکہ اس وقت بند کرنا اللہ کو یاد کرنے سے روکنے کے مترادف ہے۔ چوری کے خوف سے دروازہ بند کرنا بُرا نہیں ہے اور اس آیت کے تحت میں داخل نہیں ہے کیونکہ وہاں ذکر سے روکنا ہے اور یہ ذکر سے روکنا نہیں بلکہ چوری سے روکنا ہے۔
یہاں ایک سوال یہ بھی ہے کہ ابوداؤد میں حدیث ہے کہ
"اپنی عورتوں کو مسجد سے نہ روکو، البتہ ان کے گھر ان کے لیے بہتر ہیں"
بلاشبہ آغازِ اسلام میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کو مسجد میں جانے سے نہیں روکا تھا اور عورتیں زمانۂ نبوت میں مسجد میں باجماعت نماز پڑھتی تھیں، عیدین کے موقعہ پر ان کو عیدگاہ بھی جانے کا حکم ہوا تھا۔ مگر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان سے اظہارِ شوکت شاید مقصود تھا تاکہ مسلمانوں کی تعداد کا مظاہرہ ہو مگر وہ علت اب نہیں ہے۔ اگر تمام

---

[1] معارف القرآن م ش ص ۲۴۲

احادیث کو پیش نظر رکھ کر آپ غور کریں گے تو آپ محسوس کریں گے کہ حضور انورؐ نے ترغیب اس کی ہی دی ہے کہ عورتوں کا مسجد نہ جانا بہتر ہے۔ اجازت کے ساتھ یہ اعلان بھی نبوت نے کیا تھا کہ

"عورت کی نماز اندر گھر میں دالان کی نماز سے بہتر ہے اور عورت کی نماز گھر کی بخاری میں گھر کے کمرہ سے افضل ہے"۔ (ابوداؤد)

اس کا کھلا ہوا مطلب یہ ہے کہ عورت کی وہی نماز بہتر ہے جو زیادہ پردے میں ہو۔ دراصل اس موضوع پر دو قسم کا روکنا آمنے سامنے ہو گیا ایک اللہ کی یاد سے روکنا اور دوسرے اس برائی سے روکنا جو معاشرے میں عورتوں اور مردوں کے اختلاط سے جنم لیتی ہے۔ پہلی بات ایک مصلحت ہے جبکہ دوسری بات ایک مفسدہ ہے اور ایسے مواقع پر جہاں مصلحت اور مفسدہ کا آمنا سامنا ہو جائے، برائیوں کو دور کرنا قرآن کی نظر میں مقدم ہے کیونکہ یہ تقویٰ ہے۔ اس بنا پر افضل یہی ہے کہ عورت گھر میں نماز پڑھے۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ عورتیں افضل کو ترک کر دیں اور غیر افضل پر عمل کریں۔ یہ اگرچہ بہتر نہیں ہے مگر چونکہ مسجد خانہ خدا ہے اور وہ دربارِ الٰہی میں اللہ کی یاد کی خاطر جا رہی ہے اس لیے اسے روکا کیونکر جائے۔ اسی وجہ سے فرمایا:

لا تمنعوا نساءکم المساجد و بیوتھن خیر لھن

عورتوں کو مساجد سے نہ روکو لیکن ان کے گھر ہی ان کے لیے بہتر ہیں۔

مسئلہ صاف ہو کر سامنے آ گیا کہ گو ان کو ذکرِ الٰہی کی خاطر مساجد میں آنے سے روکا نہیں جا سکتا مگر معاشرتی مفاسد کی خاطر ان کے حق میں بہتر یہی ہے کہ گھر میں نماز پڑھیں۔ عقلی طور پر بھی یہ بات سمجھی جا سکتی ہے۔ سب جانتے ہیں کہ ماہ میں چند دن عورتوں پر ایسے گزرتے ہیں جن میں ان کو نماز پڑھنے کی اجازت نہیں ہے ان دنوں یہ مسجد کی حاضری سے معذور ہے اور یہ دن عورت کے لیے راز کے دن ہوتے ہیں۔ کوئی شریف عورت اس راز کو ظاہر کرنا گوارا نہیں کرتی اور مسجد کی حاضری میں اس راز کا کھل جانا یقینی ہے۔

اور پھر اللہ کے پیغمبرؐ نے عورتوں کو مسجد میں آنے کا غیر مشروط پروانہ نہیں دیا ہے بلکہ عورت کے مسجد میں آنے پر کچھ شرطیں بھی لگا دی ہیں

اوّل یہ کہ بناؤ سنوار کر کے مسجد نہ آئیں، ابوداؤد میں ہے

عورتیں مسجد میں آئیں تو بے زینت ہو کر آئیں

دوسرے یہ کہ خوشبو لگا کر نہ آئیں۔ مسلم میں ہے

جب تم میں سے کوئی عورت مسجد میں آئے تو خوشبو نہ لگائے۔

ان شرائط کے ساتھ اجازت ہونا خود اس بات کی دلیل ہے کہ عورت کی حد تک نبوّت کے پیشِ نظر مسجد میں آکر خدا کو یاد کرنے کی مصلحت کے مقابلے میں اس مفسدہ کی زیادہ اہمیت ہے جو معاشرہ میں عورتوں اور مردوں کے اختلاط سے رونما ہوتا ہے۔

شاید حضرت عائشہ صدیقہؓ نے جو نبوّت کے مزاجِ قانون کی بہت زیادہ رازداں ہیں آپؐ کے فوراً بعد اس مفسدہ کو محسوس کر لیا اور فرمایا کہ

جو اطوار و حالات عورتوں میں رونما ہو گئے ہیں اگر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے مشاہدے میں آتے تو بلا شبہ بنی اسرائیل کی عورتوں کی طرح اپنی امّت کی عورتوں کو بھی مسجد آنے سے روک دیتے۔ (صحیح مسلم ج ا ص ۱۸۳)

حضرت عائشہ کا یہ تاثر غالباً اموی دورِ حکومت کے بارے میں ہے کیونکہ حضرت عائشہ کا سالِ وفات ۵۸ھ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت عائشہؓ کی نظر مصلحت پر نہیں بلکہ اس مفسدہ پر تھی جس کا مشاہدہ خود انہوں نے امویوں کے دورِ حکومت میں کیا۔ اور فقہاء صحابہؓ میں جن کی نظر میں مصلحت کا وزن زیادہ تھا وہ عورتوں کو مسجد میں جانے سے نہ روکتے تھے۔

چنانچہ عاتکہ بنت زید سے حضرت عمرؓ نے اپنی شادی کے لیے رشتہ بھیجا تو عاتکہ نے شادی کے لیے یہ شرط پیش کی کہ ہمیں مسجد جانے سے نہ روکا جائے۔ روایات میں تصریح ہے کہ حضرت عمرؓ اس شرط پر بکراہت تیار ہوئے۔ حضرت عمرؓ کے انتقال کے بعد عاتکہ بنت زید نے حضرت زبیرؓ سے نکاح کیا اور ان کے ساتھ بھی یہی شرط پیش کی وہ راضی تو ہو گئے لیکن ایک دوسری ترکیب سے انہوں نے عاتکہ کا مسجد جانا بند کر دیا۔ حضرت عاتکہ کا نکاح کے ساتھ ایسی شرط کرنا اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ حضور انور کے صحابہ میں جو قانون کے مزاج سے واقف تھے وہ عموماً اپنی عورتوں کو مسجد میں جانے سے روکتے تھے۔ فقہاء نے صحابہ کرام کے فیصلہ ہی کے پیشِ نظر لکھا ہے کہ عورتوں اور خصوصاً جوان عورتوں کو مسجد میں نہ جانا چاہیے۔

جن احادیث میں مسجد جانے کی اجازت کا ذکر ہے۔ ان کا درجہ اجازت اور رُخصت کا ہے حکم اور عزیمت کا ہرگز نہیں ہے۔ ارشاد ہے

جب تم میں سے کسی کی بیوی مسجد جانے کی اجازت مانگے تو اس کو منع نہ کرو۔

یہاں بھی عورت کو مسجد جانے کی جو اجازت ملی ہے اسی انداز میں ملی ہے۔ یہ کہیں نہیں

ہے کہ ان کو بھی مسجد میں آنے کا حکم ہے اور تم اسے مسجد جانے پر مجبور کرو بلکہ عموماً اجازت دی ہے تو اسی طرح کہ جب وہ تقاضا کریں تو ان کو روکا نہ جائے۔ چونکہ یہ حق ایک شرعی حق بن جاتا ہے اس لیے رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے زبردستی ان کو روکنا نہیں چاہا مگر مشورہ یہی دیا ہے کہ نہ جائیں تو اچھا ہے بلکہ نہ جانے کی ترغیب بھی دی ہے۔ اجازت کی حدیث کو سامنے رکھ کر جن علماء نے عورت کو مسجد جانے کا پروانہ دیا ہے انہوں نے بھی متعدد قیدیں لگا دی ہیں۔
امام نووی لکھتے ہیں:

> عورتوں کو مسجد میں جانے سے اس وقت نہ روکا جائے جب کہ وہ ان قیود و شرائط کی پابندی کریں گی جو احادیث میں مذکور ہیں۔ مثلاً کپڑوں میں خوشبو نہ لگائیں، بن سنور کر نہ نکلیں۔ ایسا پازیب جس سے آواز پیدا ہو نہ پہنیں۔ مردوں سے اختلاط نہ ہونے پائے۔ جوان نہ ہو جس سے کسی طرح کے فتنہ کا اندیشہ ہو اور ہر طرح کے مفسدہ سے بے خوف ہوں[1]

الغرض آیت سے ممانعت کے مفہوم میں عورتوں کو مسجد میں جانے کی ممانعت داخل نہیں ہے۔ چونکہ آیت کا اصل مقصود یہ ہے کہ مساجد میں اللہ کی یاد سے روکنا سب سے بڑا ظلم ہے۔ اس سے اللہ کی یاد سے مساجد میں روکنے کی تمام صورتیں اس آیت کی رُو سے ناجائز و حرام ہوں گی۔ چاہے یہ رکاوٹ بالذات ہو یا بالواسطہ۔ بالذات تو روکنا یہی ہے کہ کسی کو مسجد جانے سے یا مسجد میں اللہ کو یاد کرنے سے روکا جائے۔ اور بالواسطہ یہ کہ مسجد میں شور و شغب کر کے نمازیوں کی نماز میں خلل ڈالا جائے یہ بھی مسجد میں ذکر اللہ سے روکنے کے مفہوم میں داخل ہے۔ اس کی چند مثالیں سن لیجئے۔

گمشدہ کی تلاش

اسی بنا پر گمشدہ چیز کی تلاش کا اعلان مسجد میں جائز نہیں ہے کہ یہ مسجد کی مقصدی رُوح کے منافی ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

> جو شخص کسی کو سنے کہ وہ مسجد میں گمشدہ چیز کی تلاش کر رہا ہے تو چاہیے

[1] شرح مسلم النووی ج ۱ ص ۱۸۳

کہ کہہ دے کہ خدا کرے تجھے نہ ملے۔ کیونکہ مسجد اس کام کے لیے نہیں بنائی گئی ہے[1]
اس حدیث میں صرف گم شدہ چیز کی تلاش ہی کو نہیں روکا ہے بلکہ اس میں اس پر زجر و توبیخ بھی ہے اور ساتھ ہی اس کی وجہ بھی بتادی ہے۔ اس زمانہ میں خصوصیت سے اس ارشادِ نبوت کا مفہوم عام مسلمانوں کے ذہن نشین ہو جائے۔ لیکن اس وقت کوئی حرج نہیں جب چیز مسجد ہی میں گم ہو جائے۔ باقی جو چیز مسجد سے باہر گم ہوتی ہے اس کا اعلان اور اس کی تلاش کسی طرح مسجد میں مناسب نہیں ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب کسی کو مسجد میں گم شدہ چیز تلاش کرتے دیکھو تو کہو ــــــ وہ تجھے نہ ملے جس کام کے لیے مسجد بنائی گئی ہے اسی کے لیے ہے[2]

شعر خوانی

مسجد میں بالواسطہ ذکرِ الٰہی سے روکنے کی ایک صورت مسجد میں اشعار کا پڑھنا ہے۔ حدیث میں ہے کہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مساجد میں اشعار پڑھنے اور خرید و فروخت سے منع فرمایا ہے۔　　(ابوداؤد باب المساجد)

معلوم ہوا کہ مسجد میں خرید و فروخت کی بھی اجازت نہیں کہ اس سے مسجد کے مقصودِ اصلی، یذکر فیہا اسمہ، میں رکاوٹ ہوتی ہے۔ اوروں کا پتہ نہیں مگر میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ امام اعظمؒ کی قانونی نکتہ سنجی نے جو یہ فیصلہ فرمایا ہے کہ مسجد میں بلند آواز سے قرأتِ قرآن اور ذکر بالجہر جائز نہیں ہے تو اس کی بنیادی طور پر قرآن کی یہی آیت ہے یعنی یہ بھی چونکہ ایک ذریعہ ہے مسجد میں لوگوں کو یادِ الٰہی سے روکنے کا اس لیے ناجائز ہے۔

بچوں اور پاگلوں کی ممانعت

بچے اور دیوانے دونوں کو مسجد میں آنے کی ممانعت ہے ارشاد ہے:

اپنے مسجدوں کی حفاظت کرو بچوں اور پاگلوں سے

---

[1] [2] مسلم ج ۱ ص ۲۱۰

اس کا پس منظر بھی اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ عقل سے بیگانہ ہونے کی وجہ سے یہ شور و شغب کریں گے اور ان کی ہنگامہ آرائی لوگوں کو یادِ الٰہی سے روکنے کا ذریعہ بن جائے گی ۔

اسی بنا پر حدود کا اجراء بھی مسجد میں ناجائز ہے ۔ ابن ماجہ میں اس موضوع پر مستقل عنوان ہے اور اس عنوان کے تحت انہوں نے دو ارشادِ نبوت پیش کیے ہیں کہ مسجدوں میں حدود نہ قائم کیے جائیں ۔ اور ـــــ مسجد میں سزا کے کوڑے لگانا بھی منع ہے ۔ بلکہ اسی بنا پر مسجد میں جھگڑا کرنا ، کھلا ہتھیار لے کر چلنا ، ہتھیار کو تیز کرنا ، مسجد کو راستہ بنانا منع ہے ابن ماجہ میں ارشادِ نبوت ہے :

چند چیزیں مسجد میں کرنے کی نہیں ہیں ۔ اس کو نہ راستہ بنایا جائے نہ ان میں ہتھیار تیز کیے جائیں ، نہ کمان پکڑی جائے ، نہ تیر پھیلائے جائیں ، نہ کچا گوشت لے کر گزرا جائے نہ حد ماری جائے ، نہ قصاص لیا جائے اور نہ اسے بازار بنایا جائے ۔

مفاسد سے بچنے کی خاطر ممانعت

جن لوگوں کا نامسلمان ہونا ثابت ہو جائے اور بالخصوص وہ لوگ جو دین کی کھلی حقیقتوں کا انکار کر کے مسلمانوں سے کٹ چکے ہوں ۔ ان کو مساجد میں آنے سے روکنا اس آیت کی زد سے باہر ہے ۔ اس لیے کہ معاشرہ کو مفاسد سے محفوظ رکھنا خود مقصودِ قرآن ہے ۔ قرآن کی زبان میں مفاسد ہی کو منکر اور فتنہ کہا جاتا ہے ۔ اگر ایک طبقہ اپنی نمایاں خصوصیات کی وجہ سے مساجد میں فتنہ و فساد کا باعث ہوتا ہے تو اس مفسدہ کو ختم کرنا مقدم ہو گا اور اس کی اوّلین حیثیت ہو گی ۔ حافظ ابن کثیرؒ نے تفسیر میں اور علامہ آلوسیؒ نے روح المعانی میں ابن ابی حاتم اور طبرانی کی اوسط کے حوالہ سے عبداللہ بن عباسؓ کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ

ایک جمعہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ کے لیے کھڑے ہوئے ۔ اُٹھتے ہی آپؐ نے نام لے کر کہا کہ کھڑے ہو جاؤ ، مسجد سے نکل جاؤ تم منافق ہو ۔ اس طرح آپؐ نے متعدد آدمیوں کو نام لے کر پکارا اور مسجد سے نکال دیا ۔

اور بعض روایات میں ان کی تعداد بھی ۳۶ بتائی ہے ۔ اس لیے ایسے لوگوں کو مساجد میں آنے سے روک دینا اس آیت کے خلاف نہیں ہے ۔ سید انور شاہؒ اپنے دور کی علم میں ایک مثالی شخصیت ہیں ۔ اکفار الملحدین میں اپنا واقعہ لکھتے ہیں کہ ایک بار میرے سے ایک ملحد نے کہا ہمارا تو اس قرآن

پر ایمان ہے جس میں یہ آیت ہے۔

من اظلم ممن منع مساجد اللہ ان یذکر فیہا اسمہ

شاہ صاحب نے فوراً جواب دیا کہ جی ہاں ہم بھی اس قرآن پر ایمان رکھتے ہیں جس میں یہ آیت ہے: من اظلم ممن افتری علی اللہ کذباً او قال اوحی الی ولم یوح الیہ شیٔ

اس سے بڑا ظالم کون ہوگا جو اللہ پر جھوٹا بہتان لگائے یا کہے کہ میرے پاس وحی آتی ہے حالانکہ اس کے پاس وحی نہیں آتی۔

تمام منافقین، تمام ملحدین اور تمام زنادقہ کا یہی حکم ہے۔

۳۱۴
۵ - اور ان کی بربادی میں کوشاں ہیں۔ الجصاصؒ نے لکھا ہے کہ جیسے مسجد کی آبادکاری دو طرح سے ہوتی ہے کہ ایک حسی دوسرے معنوی۔ حسی یہ کہ مسجد بنائی جائے اور معنوی یہ کہ مسجد میں حاضری دی جائے۔ ایسے ہی مسجد کی بربادی بھی دو قسم کی ہوتی ہے۔ حسی یہ کہ اس کو منہدم کر دیا جائے۔ یہ مسجد کی ظاہری تخریب ہے اور معنوی یہ کہ اس میں عبادت اور ذکر اللہ پر قدغن لگا دی جائے۔ یہ مساجد کی معنوی تخریب اور باطنی ویرانی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مساجد کو ویران کرنا سب کے نزدیک برا کام ہے لیکن یہود و نصاریٰ اس برائی میں کھلم کھلا مبتلا ہیں۔

فقہا نے لکھا ہے کہ جس طرح اللہ کے ذکر سے مسجد آباد ہوتی ہے۔ ممنوعات اور بدعات سے مساجد کی بربادی ہوتی ہے اور وہ تمام امور جو نمازیوں کی اور مسجد کی ویرانی کا باعث ہوں اس آیت میں داخل ہوں گے۔ [1]

مسجد کی ویرانی کی جتنی صورتیں ہیں سب حرام ہیں۔ اس میں جس طرح کھلے طور پر مسجد کو منہدم کرنا داخل ہے اسی طرح ایسے اسباب پیدا کرنا بھی اس میں داخل ہے جن کی وجہ سے مسجد ویران ہو جائے اور مسجد کی ویرانی یہ ہے کہ وہاں نماز کے لیے لوگ نہ آئیں یا کم ہو جائیں۔ کیونکہ مسجد کی تعمیر و آبادی دراصل در و دیوار یا ان کے نقش و نگار سے نہیں بلکہ ان میں اللہ کا ذکر کرنے والوں سے ہے۔

اسی لیے حدیث میں ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قرب قیامت میں مسلمانوں کی مسجدیں بظاہر آباد ہوں گی مگر واقع میں برباد ہوں گی کہ ان میں حاضر ہونے والے نمازی کم ہو

[1] تفسیر ماجدی ص ۴۵

جائیں گے[1]

۱۱۴ے ۔ ایسے لوگ اس قابل ہیں کہ اللہ کی عبادت گاہ میں قدم نہ رکھیں۔ یعنی ان کے لائق یہی تھا کہ مساجد میں خوف و تواضع اور ادب و تعظیم کے ساتھ داخل ہوتے۔ بے حرمتی صریح ظلم ہے۔ یا یہ مطلب ہے کہ اس ملک میں حکومت اور عزت کے ساتھ رہنے کے لائق نہیں ہیں چنانچہ یہی ہوا کہ ملک شام اور مکہ اللہ نے مسلمانوں کو دلوادیا اور وہ دُنیا میں مغلوب ہوئے قید میں پڑے[2]

مطلب یہ ہے کہ بجائے اس کے کہ عبادت گاہیں اس قسم کے ظالم لوگوں کے قبضہ و اقتدار میں ہوں اور یہ ان کے متولی ہوں۔ ہونا چاہیے کہ خداترس لوگوں کے ہاتھ میں اقتدار ہو اور وہی عبادت گاہوں کے متولی ہوں تاکہ یہ شریر لوگ اگر وہاں جائیں بھی تو انہیں خوف ہو کہ شرارت کریں گے تو سزا پائیں گے ۔ یہاں ایک لطیف اشارہ کفارِ مکہ کے اس ظلم کی طرف بھی ہے کہ انہوں نے اپنی قوم کے ان لوگوں کو جو اسلام لا چکے تھے بیت اللہ میں عبادت کرنے سے روک دیا تھا[3]

مسجد کے آداب

اس آیت میں ان یدخلوھا الا خائفین کی تعبیر میں بڑی گہری معنویت ہے۔ اس سے یہ اشارہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مسجد کی عظمت کا تقاضا یہ ہے کہ ان میں جو شخص بھی داخل ہو ہیبت و عظمت اور خشوع کی کیفیت کے ساتھ داخل ہو۔ مسجد جاتے ہوئے یہ خیال رہے کہ ہم مالک الملک کے گھر جارہے ہیں اس لیے رفتار میں پورا وقار، اعتدال اور سکینت نمایاں ہو۔ ایسی رفتار ہرگز اختیار نہ کی جائے جس سے دیکھنے والا ہلکا پن محسوس کرے اور عام نظروں میں مضحکہ خیز ہو۔ نگاہ نیچی دل میں محبت و خشیت اور اُمید و بیم کی کیفیت طاری ہو۔ چہرے پر تواضع اور خوف کے آثار ظاہر ہوں ہوں۔ ارشادِ نبوّت ہے کہ

جب تم اقامت سنو تو نماز کے لیے اس طرح آؤ کہ تم پر سکینت و وقار ہو اور دوڑو مت!

---

[1] معارف القرآن م ش ص ۲۴۳ [2] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۲۲ [3] تفہیم القرآن ص ۱۰۴

وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا
فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ

اور دیکھو مشرق[۳۱۵] اور مغرب اللہ ہی کے لیے ہے، جہاں کہیں بھی تم رُخ کرو گے اللہ کی ذات وہیں ہے۔ بلاشبہ اللہ بڑی وسعت والا اور سب کچھ جاننے والا ہے[۳۱۶]

عبادت میں قبلہ پر اختلاف

ان کے منظریاتی اختلاف کے نتیجے میں عمل میں اختلاف کا ایک مظاہرہ عبادت گاہوں کی صورت میں پہلے بیان ہو چکا ہے۔ اس آیت میں ایک دوسرا مظہر پیش کیا جا رہا ہے کہ یہودیوں اور عیسائیوں میں ایک شریعت کو ماننے کے باوجود قبلوں کا بھی اختلاف تھا۔ آگے چل کر تحویلِ قبلہ کے مسئلہ میں آپ یہ تصریح پڑھیں گے (مابعضھم بتابع قبلۃ بعض) ان میں سے ایک گروہ دوسرے کے قبلہ کو نہیں مانتا ہے۔ یہود کا قبلہ بیت المقدس تھا جبکہ عیسائی کسی سمت یا مکان کو نہیں بلکہ سمتِ مشرق کو قبلہ بنائے ہوئے تھے اور عجب نہیں کہ اس وقت اندرونی اختلافات اور بھی ہوں۔ نسفی نے مدارک میں، زمخشری نے کشاف میں، شوکانی نے فتح القدیر میں تصریح کی ہے کہ ان میں باہم قبلہ کے موضوع پر اختلاف تھا اور سب کی تصریحات سے مقدم قرآن کی تصریح ہے۔ یہ بھی یاد رہے کہ مدینہ میں بیت اللہ یعنی خانہ کعبہ مشرق و غرب میں نہیں بلکہ مشرق و مغرب کے درمیان یعنی جنوب واقع تھا جب کہ بیت المقدس مغرب میں تھا۔ شوکانی نے لکھا ہے (ھو فی جھۃ الغرب) یعنی مغرب میں بیت المقدس تھا۔ اور اس کی تائید ترمذی کی اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جو بحوالہ ابوہریرہؓ ان الفاظ میں آئی ہے کہ حضور انورؐ نے فرمایا کہ مابین المشرق والمغرب قبلۃ مشرق و مغرب کے درمیان قبلہ ہے۔ سمت پرستی دونوں کے مزاجِ عبادت کا حصہ بن چکی تھی۔ مسیحی مذہب چونکہ عقائد و عبادات میں دونوں میں رومی مذہب سے متاثر تھا اس لیے وہ تو کھلم کھلا مشرق پرستی میں مبتلا ہو گیا۔ یہودی اس سے محفوظ نہ رہ سکے

ان کے بعض فرقے مغرب کے تقدس کا کلمہ پڑھتے تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ اگر مشرق خطہ حیات ہونے کی وجہ سے مقدس ہے تو مغرب خطہ موت و دیارِ ہلاکت ہے۔ چنانچہ اس ذہن کے ساتھ دونوں سمتیں خوب بچی ہیں۔ قرآن میں ان کی اسی فکری آوارگی اور عملی گمراہی کا ذکر ہوا ہے اور بتا رہا ہے کہ ان دونوں میں فکر وعمل کی یہ گمراہی اور گمراہی ہیں ان کا اختلاف ان کے پارسائی کے نعروں کے کھوکھلا ہونے کی دلیل ہے۔

سیاق وسباق قرآن پر غور کرنے سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت بھی اہلِ کتاب ہی کی تاریخ ملی کا ایک ورق پیش کر رہی ہے، اور آیت نمبر ۱۱۸ تک　　ایک موضوع مسلسل ہے اور بتایا جا رہا ہے کہ جنت کے ان مدعیوں کا حال یہ ہے کہ ایک کتاب کو شریعت ماننے کے باوجود

جنت کو ایک دوسرے پر بند کر رہے ہیں۔

ایک دوسرے کے دین کو بے حقیقت بتا رہے ہیں۔

ایک دوسرے کی عبادت گاہوں کو عبادت گاہ تصور نہیں کرتے۔

ایک دوسرے کے عبادت میں مرکز توجہ قبلہ کو تسلیم نہیں کرتے۔

اگر پسِ منظر میں کوئی روایت نہ ہو تو آیت اپنے مطالب کی حد تک بالکل صاف ہے۔

۱۱۵ ۔ مشرق ومغرب اللہ ہی کے لیے ہے۔ یہ بھی یہود ونصاریٰ کا جھگڑا تھا۔ ہر کوئی اپنے قبلہ کو بہتر بتاتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اللہ مخصوص کسی سمت میں نہیں بلکہ ہر سمت وجہت سے پاک ومنزہ ہے۔ البتہ اس کے حکم سے جس طرف مُنہ کر و گے وہ متوجہ ہے، تمہاری عبادت قبول کرے گا۔ اس کی رحمت سب جگہ عام ہے۔ ایک مکان کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ اور اللہ بندوں کے مصالح اور ان کی نیتوں کو اور ان کے اعمال کو خوب جانتا ہے کہ بندوں کے حق میں کون سی چیز مفید ہے اور کون سے مضر اسی کے موافق حکم دیتا ہے اور جو اس کی موافقت کرے گا اس کو جزا اور مخالف کو سزا دے گا[1]

مطلب یہ ہے کہ اللہ کی ذات نہ شرقی ہے نہ غربی۔ وہ تمام سمتوں اور مقاموں کا مالک ہے مگر خود کسی سمت یا مقام میں مقید نہیں ہے۔ لہٰذا اس کی عبادت کے لیے کسی سمت یا کسی مقام کو مقرر کرنے کے معنے یہ نہیں ہیں کہ اللہ وہاں یا اس سمت میں رہتا ہے۔ نہ یہ

---

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۲۲

کوئی جھگڑا اور اختلاف کرنے کی بات ہے [1]

مشرق و مغرب اسی کی مملوک اور مخلوق ہیں اور ان پر ہی کیا موقوف ہے ہر سمت اور ہر جہت اللہ کے لیے یکساں ہے وہ سب کا یکساں خالق مالک اور حاکم ہے۔ کسی خاص سمت میں کوئی بھی خاص تقدس کوئی بھی شائبۂ الوہیت، کوئی شانِ حق نمائی نہیں ہے۔ مذاہبِ جاہلی کی تاریخ انسانی حماقتوں، جہالتوں، وہم پرستیوں کی ایک مسلسل تاریخ ہے۔ ایک مشترک گمراہی یہ رہی ہے کہ اللہ کی ذات چونکہ متمکن ہے اس لیے ضروری ہے کہ اس کی ہستی کسی نہ کسی مقررہ سمت یا جہت میں ہو اور اس تلبس کی بنا پر خود وہ سمت یا جہت مقدس ہے۔ مصری، ہندی، رومی تمام مشرک قوموں نے اللہ سبحانہ، کو کسی نہ کسی جہت میں فرض کر کے خود اسی جہت کو مقدس مانا ہے اور چونکہ سُورج دیوتا کا مرتبہ مذاہبِ شرکیہ میں عموماً اہم اور مقدم رہا ہے اس لیے شاہ خاور کے طفیل سمت مشرق ہی مقدس سمجھی گئی۔ بعض قوموں نے مشرق کے جوڑ پر مغرب کے تقدس کا نعرہ لگایا۔ [2]

آیت میں گویا الہیات کے باب میں ایک قاعدہ اور ضابطہ پیش فرمادیا ہے کہ اللہ سبحانہ، کے بارے میں کیا عقیدہ ہونا چاہیئے؟ فرمادیا کہ اس کی ذات عالی نہ کسی جہت میں محدود ہے اور نہ کسی مکان میں مقید ہے۔ وہ لا مکان ہے۔ مساجد و معابد میں اس کی عبادت کا انحصار نہیں ہے۔ سمتوں اور جہتوں کو اس کے قرب سے کوئی واسطہ نہیں ہے؟ اس کی ذات گرامی نہ جسم ہے نہ عرض ہے، کمیت اور کیفیت سے بالا ہے۔ یہ تو سچ ہے کہ اللہ کی ہستی موجود ہے لیکن کیسی ہے، اس کے ادراک سے عقلِ انسانی عاجز و درماندہ ہے۔ فلاسفہ اور حکما نے بزورِ عقل صرف یہ بتایا ہے کہ خدا یہ نہیں، یہ نہیں یہ نہیں لیکن کیا ہے؟ اس کا جواب وہ تسلی بخش نہ دے سکے۔ انسان موجود ہے محدود اور ذوجہۃ ہے، اس کا تصور کسی ایسے موجود کا متلاشی ہے جسے وہ خوف و ہراس میں پکارے، عیش و نشاط میں یاد کرے۔ یہ گرنے لگے تو وہ اسے سہارا دے۔ یہ بھوکا ہے تو وہ اسے کھلائے، یہ پیاسا ہو تو وہ اسے پانی پلائے، یہ بیمار ہو تو وہ شفا دے۔ خلاصہ یہ کہ انسان کے ماضی اور مستقبل کے تینوں زمانوں کی زندگیاں اس کی منظرِ رحمت سے پھلتی اور پھولتی رہیں۔

---

[1] تفہیم القرآن ص ۱۰۵ [2] تفسیر ماجدی

اسی حیرت و سراسیمگی میں یہ تنزیہہ و تشبیہہ کے دوراہے پر کھڑا تھا۔ اگر وہ نہیں نہیں سے قدم آگے بڑھا کر اپنے محسوسات کا جلوہ اس میں دیکھتا ہے تو تشبیہہ کے دلدل میں گر پڑتا ہے اور اگر نہیں نہیں کی گردان کیے جاتا ہے تو اللہ کا تصور ایک سلبی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ قرآن حکیم نے اس عقدہ کو حل کیا اور بتایا کہ خدا کی ہستی اس تنزیہہ اور اس تشبیہہ کے درمیان ہے۔ اس کے لیے صفات ہیں مگر ایسی نہیں جن کا ہم ادراک کر سکیں۔ اس لیے اسے ان تمام صفات سے یاد کرو مگر کسی مثال و تشبیہہ کی پرچھائی بھی خیال میں نہ آنے دو لیس کمثلہ شیئ۔ الغرض قرآن نے انسان کی تسلی کے لیے نماز میں رُخ مقرر کر دیا ہے لیکن اس کی ساتھ یہ فرمائش کر دی کہ اللہ کا وہ مسکن نہیں ہے۔ وہ کسی سمت اور جہت میں محدود نہیں ہے اور مشرق و مغرب سے اس کے مکیں ہونے کے نہیں بلکہ خالقانہ اور مالکانہ تعلقات ہیں۔

۲۱۶ ۔ اللہ بڑی وسعت والا اور سب کچھ جاننے والا ہے یعنی اللہ سبحانہٗ خود تمام جہات اور اشیا کو محیط ہے۔ جس طرح کا احاطہ اس کی شان کے لائق ہے لیکن باوجود محیط ہونے کے پھر بھی جہتِ عبادت کو اس لیے متعین فرماتا ہے کہ وہ کامل العلم ہے اور ہر چیز کے مصالح کو خوب جانتا ہے[1]

گویا وہ تو خود ہی بے پایاں وسعتوں والا ہے۔ بڑی سے بڑی وسعت خود اس کے اندر شامل ہے اُسے بھلا اپنے اندر لے سکتا ہے۔ اس کی سمائی کس بڑے سے بڑے ظرف میں ہو سکتی ہے، ہر سمت اور ہر جہت تو خود اس کی مخلوق ہے، مملوک ہے، وہ لا محدود کسی محدود سمت اور جہت میں کس طرح گھر کر سکتا ہے[2]

یعنی اللہ تعالیٰ محدود، تنگ دل، تنگ نظر اور تنگ دست نہیں ہے۔ جیسا تم لوگوں نے سمجھ رکھا ہے بلکہ اس کی خدائی بھی وسیع ہے اور اس کا زاویہ نظر اور دائرۂ فیض بھی وسیع اور وہ یہ بھی جانتا ہے کہ اس کا کون سا بندہ کہاں کس وقت اور کس نیت سے پکار رہا ہے اور اسے یاد کر رہا ہے[3]

آیت کی تشریح ختم ہو چکی ہے مگر ایک نہایت کار آمد اور مفید بات باقی رہ گئی ہے۔ اس آیت سے صحابہ و تابعین نے متعدد مسائل استنباط فرمائے ہیں۔

---

[1] معارف القرآن م ش ص ۲۴۰ [2] تفسیر ماجدی ص ۲۵ [3] تفہیم القرآن ص ۱۰۵

وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۙ سُبْحٰنَهٗ ؕ بَلْ لَّهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ﴿۱۱۶﴾ بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاِذَا قَضٰۤى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۱۱۷﴾

اور وہ کہتے ہیں کہ اللہ نے بیٹا[۳۱۷] بنا لیا ہے حالانکہ اللہ کی ذات اس سے پاک[۳۱۸] ہے۔ اس کا کسی مخلوق سے والد ہونے کا نہیں بلکہ مالک ہونے کا تعلق ہے کیونکہ زمین و آسمان کی تمام موجودات[۳۱۹] اس کی ملک ہیں۔ سب کے سب اس کے مطیع فرمان ہیں۔ وہ[۳۲۰] آسمانوں اور زمین کا بغیر مادے اور نمونے کے بنانے والا ہے۔ وہ جب[۳۲۱] کسی کام کا فیصلہ کر لیتا ہے تو بس وہ حکم ہی دیتا ہے کہ ہو جا ویسا ہی ظہور میں آ جاتا ہے۔

عبداللہ بن عمرؓ سواری پر سوار ہو کر نفلی نماز میں قبلہ رو ہونے کو ضروری نہ سمجھتے تھے اور قرآن کی اسی آیت سے استدلال کرتے ہیں۔

ایسے مواقع پر جہاں لوگوں کو صحیح طور پر سمت قبلہ معلوم نہ ہو اور رات کی تاریکی کی وجہ سے سمت متعین کرنا دشوار ہو اور کوئی بتانے والا بھی نہ ہو۔ تو وہاں اگر تخمینہ اور اندازے سے لوگوں نے نماز ادا کر لی تو نماز سب کی ہو جائے گی۔ اس کے جواز پر صحابہ اسی آیت سے استدلال کرتے تھے۔

امام مجاہد اس آیت سے دُعا کا قبلہ استنباط فرماتے تھے اور کہتے تھے کہ دُعا کے لیے کوئی سمت نہیں جس طرف بھی رُخ کر و وہی قبلۂ دُعا ہے

صحابہ اور تابعین کا مسائل میں قرآن سے استدلال کرنا آیت کا سبب نزول نہیں ہوتا۔

شاہ ولی اللہؒ نے الفوز الکبیر میں تصریح کی ہے کہ محدثین قرآنی آیات کے ذیل میں بہت سی ایسی باتیں درج کرتے ہیں جو واقع میں سببِ نزول نہیں ہیں۔ اور اس کی مثال بھی شاہ صاحب نے صحابہ کے استشہادات سے دی ہے۔ باقی رہی عبداللہ ابن عباسؓ کی وہ روایت جو ابنِ کثیرؒ نے عطاء، علی ابن ابی طلحہ کے حوالہ سے نقل کی ہے اس کا اس آیت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس کا تعلق دوسرے پارے میں آنے والی آیت قل للہ المشرق والمغرب یھدی من یشاء الی صراط مستقیم۔ سے ہے اس پر انشاءاللہ اسی مقام پر تفصیلی بحث آئے گی۔

اہلِ کتاب کا کتابِ الٰہی سے انحراف

اس سے پہلی آیت میں اہلِ کتاب کا قبلہ میں اختلاف، عبادت گاہوں میں ایک دوسرے کو رد کرنے کا تذکرہ تھا اس آیت میں ان کے کتابِ الٰہی کو مانتے ہوئے ان کی ناخدا شناسی اور خدا کی کھلم کھلا بغاوت کی داستان کا بیان ہو رہا ہے اور بتایا جا رہا ہے کہ خدا کو مانتے ہوئے یہ خدا کے مقام رفیع سے اپنے باغیانہ میلانات کی بنا پر اتنے ناآشنا ہو گئے تھے کہ اللہ کے بندوں کو اللہ کے بیٹے بنا رہے تھے اور اس میں دونوں شریک تھے یہودی بھی اور عیسائی بھی۔ اگرچہ عام یہودیوں کا یہ اعتقاد نہیں لیکن مدینہ کے ان یہودیوں کا جو اس سورت میں قرآن کے مخاطب ہیں یہ اعتقاد ضرور ہے کہ عزیرؑ اللہ کے بیٹے ہیں۔ چنانچہ عبداللہ ابنِ عباسؓ سے مروی ہے کہ سلام بن مشکم، نعمان بن اوفی، ابوانس، شاس بن قیس اور مالک بن صیف کہ زو سائر یہود میں سے تھے۔ حضور انورؐ کے پاس آئے اور کہا کہ ہم آپ کی کس طرح پیروی کر سکتے ہیں جبکہ آپ نے ہمارے قبلہ کو ترک کر دیا اور عزیرؑ کو ابن اللہ نہیں مانتے۔ جب اُمتوں کا نبوت کے لائے ہوئے علم و عمل سے زندگی میں رشتہ ٹوٹ جاتا ہے تو اللہ کے مقدس بندوں کے بارے میں ایسے خیالات کہ وہ خدا ہی ہیں یا خدا کے بیٹے ہیں پیدا ہی ہو جاتے ہیں۔ اس میں تعجب اور حیرت کی کوئی بات نہیں ہے۔ آخر ہم میں بھی تو غالیوں کی زبان پر یہ شعر آ ہی جاتا ہے

جو مستوی عرش تھا   مدینہ میں آ گیا مصطفےٰ ہو کر

یا احد اور احمد میں کوئی فرق نہیں صرف میم کی گھنڈی ہے۔ اور بس

حالانکہ جاننے والے جانتے ہیں کہ یہ کفرِ خالص ہے اور وہ مشرکانہ ذہن ہے جس کی قرآن

نے تردید کی ہے۔

عیسائیوں میں حضرت مسیح کی ابنیت کا عقیدہ کوئی ثانوی درجہ یا فرعی حیثیت نہیں رکھتا۔ مسیحیت کی رُوح اور جان یہی عقیدہ ہے۔ اور پھر طرہ یہ کہ اس میں راہیں الگ بنا رکھی ہیں۔ ایک عزیر کو خُدا کا بیٹا مانتا ہے تو دوسرا حضرت مسیح کو۔

۱۱۷ ۔ وہ کہتے ہیں کہ اللہ نے بیٹا بنا لیا ہے۔ یہود حضرت عزیر کو اور نصاریٰ حضرت عیسٰی کو خدا کا بیٹا کہتے تھے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس کی ذات سب باتوں سے پاک ہے بلکہ سب کے سب اس کے مطیع اور مخلوق ہیں[1]

اللہ کے بیٹا ہونا ممکن ہی نہیں ہے کیونکہ بیٹا یا اللہ کی جنس سے ہوگا یا غیر جنس سے۔ اگر لڑکا غیر جنس کا ہوگا تو نا جنس اولاد ہونا تو عیب ہے اور اللہ کی ذات عیب سے پاک ہے اور اگر ہم جنس ہوگا تو یہ اس لیے محال ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی ہم جنس نہیں ہے کیونکہ صفات کمال جو اللہ کے لیے لوازم ذات کی حیثیت رکھتی ہیں وہ اللہ ہی کے ساتھ مخصوص ہیں اور غیر اللہ میں معدوم ہیں۔ اس لیے اللہ کے علاوہ کوئی واجب الوجود نہیں ہو سکتا۔ اور واجب الوجود ہونا خود عین حقیقت یا لازم حقیقت ہے۔ لہٰذا کوئی بھی اللہ کے سوا اللہ کے ساتھ حقیقت میں شریک نہیں ہو سکتا۔[2]

اتخذ اللہ ولدا کا صحیح ترجمہ لے رکھا ہے اس نے ایک بیٹا، بنا رکھا ہے۔ ایک بیٹا یہاں یہ نہیں فرمایا کہ خدا کے ایک بیٹا ہے بلکہ یہ کہ خدا نے ایک بیٹا بنا لیا ہے۔ اتخذ اللہ ولدا کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ نے گویا کسی کو متبنّٰی کر لیا ہے۔ مسیحوں میں ایک فرقہ کا عقیدہ متبنّٰی کا ہے۔ اس عقیدے کا خلاصہ یہ ہے کہ مسیح خلقۃً خدا پیدا نہیں ہوتے وہ خدا شروع سے بنے بنائے اور خود بخود نہیں ہے بلکہ اصلاً و خلقۃً انسان ہی تھے۔ البتہ اقنوم ثالث یعنی رُوح القدس کا فیضان ان پر شروع سے ہونے لگا تھا۔ اس لیے وہ قدوسیت کے ایسے اوج کمال تک پہنچ گئے اور رُوحِ الٰہی ان کے اندر ایسی حلول کر گئی کہ اقنوم اوّل یعنی اللہ نے انہیں اپنا شریکِ الوہیت کر لیا اب وہ ربوبیت، مالکیت وغیرہ جملہ صفاتِ الٰہی میں شریک ہیں۔ اس عقیدے کے وجود کی شہادت تاریخ میں ۱۸۵ھ میں ملتی ہے۔ آٹھویں صدی عیسوی میں پاپائے روم نے اسے الحاد و زندقہ قرار دیا۔ بارہویں صدی میں اس نے پھر زور پکڑا اور پھر یہ لوگ زندیق

---

[1] حاشیہ شیخ الہند ص ۲۲ [2] معارف القرآن م ش ص ۲۴۶

قرار پائے لے

ممکن ہے کہ ایسا ہی ہو جیسا مولانا دریابادی فرما رہے ہیں لیکن دل نہیں مانتا کہ قرآن نے یہ تعبیر مسیح کی ابنیت کی تاریخ بتانے کے لیے اختیار کی ہے۔ قرآن کوئی تاریخ مذاہب کی کتاب نہیں ہے جہاں تک لفظ اتخاذ کی بات ہے تو اپنا ذوقِ عربیت تو یہ کہتا ہے کہ یہ تعبیر یہ جتانے کے لیے آئی ہے کہ مسیح کی ابنیت کی کہانی ان کی اپنی بناوٹ ہے ورنہ اس کا حقیقت سے دُور کا بھی تعلق نہیں ہے۔ قرآن ایسی تمام باتوں کے لیے جن کا حقائق سے کوئی رشتہ نہ ہو اور لوگوں نے بطورِ خود بنا لی ہوں ایسی تعبیر اختیار کرتا ہے۔ قرآن میں اس کی بے شمار مثالیں ہیں۔

۳۱۸ ۔ حالانکہ اللہ کی ذات پاک ہے۔ اصل ارشاد ہیں سبحانہٗ ہے یعنی اللہ کی ذات گرامی تمام عیبوں، تمام کمزوریوں، تمام کوتاہیوں سے پاک ہے۔ گویا جو شخص اللہ کی معرفت رکھتے ہوئے یہ کہتا ہے کہ اس کا بیٹا ہے اس کے گمان کا بنایا ہوا گھروندا ہے ورنہ فی الواقع اللہ کی ذات اس سے پاک ہے کہ اس کا بیٹا ہو۔ متکلمین کی زبان میں جسے تنزیہہ اور تقدیس کہتے ہیں قرآن میں اس کو تسبیح کہتے ہیں لیکن یاد رہے کہ قرآن کی تسبیح بمعنے تنزیہ ضرور ہے لیکن بمعنی تعطیل نہیں ہے۔ تنزیہہ یہ ہے کہ جہاں تک انسانی عقل کا تعلق ہے اللہ کی صفات کو مخلوقات کی مشابہت سے پاک رکھا جائے اور تعطیل کے معنے یہ ہیں کہ تنزیہہ کے درجہ کو اس قدر اونچا کیا جائے کہ فکرِ انسانی کے لیے اللہ کی ذات کے بارے میں کوئی بات ہی باقی نہ رہے۔ قرآن کی تسبیح تنزیہہ کی تکمیل ہے تعطیل کی ابتدا نہیں ہے۔ جیسے صفات کا اثباتی پہلو تشبیہہ کی طرف لے جاتا ہے اسی طرح صفات کا انکاری پہلو تعطیل کے لیے راہ ہموار کرتا ہے اور دونوں غلط ہیں۔ اگر تشبیہہ حقیقت سے ناآشنا کرتی ہے تو تعطیل عقیدے کی رُوح سے محروم کر دیتی ہے۔ لہذا ضروری ہے کہ افراط و تفریط دونوں سے بچ کر رہے اور تشبیہہ و تعطیل دونوں کے درمیان رہے۔ قرآن نے دو نقطوں میں جو راہ اختیار کی ہے وہ دونوں راہوں کے درمیان ہے ارشاد ہے

لیس کمثلہ شیئ و ھو السمیع البصیر

شیخ اکبر فرماتے ہیں کہ

الٰہی تجلیات کا مشاہدہ کرنے والے دو نسبتوں سے خالی نہیں ہیں۔ ایک طرف خدائی تنزیہہ

لے تفسیر ماجدی ص

کی نسبت دوسری طرف تشبیہہ کی انعکاسی نسبت پہلی نسبت لیس کمثلہ شیئٌ میں اور دوسری کو وھو السمیع البصیر میں بیان کیا ہے۔

انجیل میں باپ اور بیٹے کی حقیقت

عیسائیوں کی انجیل میں خدا کے لیے باپ اور حضرت مسیح کے لیے بیٹے کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اس کی حقیقت اور اللہ پر اس کے اطلاق سے کیا مقصود ہے؟ گوشت و پوست اور مادیت سے لبریز لفظ کا اللہ پر اطلاق کہاں تک دُرست ہے؟ اور اس سے کہاں تک غلطیاں پھیلی ہیں۔ ان باتوں کو چھوڑ کر یہ دیکھئے کہ یہ خدا کی جمالی صفات کی نہایت ناقص اور مادی تعبیر ہے۔ عیسائیت میں فلسفہ کی آمیزش نے اختراعی عقیدے کو مسئلہ صفات کے پردے میں چھپا لیا اور یہ تاویل کی کہ باپ خدا بیٹا حضرت عیسیٰ اور روح القدس حیات خلق اور علم تین صفتوں کا نام ہے۔ باپ حیات، بیٹا، خلق اور روح القدس علم ہے اور یہ تینوں ایک ہیں اور تینوں وجود میں الگ الگ ہیں۔ اس تشریح سے صفاتِ الٰہی میں تجسم نے راہ پالی اور ایک خدا کئی خداؤں کا مجموعہ بن گیا۔

قرآن نے تشبیہہ و تعطیل سے ہٹ کر انسانوں کے سامنے تسبیح و تنزیہہ کی راہ پیش کی۔ ایک انسان کو بیٹا کی بجائے عبد اور خدا کو باپ کے بجائے رب کہا ہے۔ اَب اور رب ابن اور عبد ان دونوں لفظوں کا باہمی معنوی مقابلہ کرو تو معلوم ہوگا کہ عیسائیوں کا تصور قرآن کے مطمح نظر سے کتنا پست ہے۔ آب یعنی باپ کا تعلق اپنے بیٹے سے ایک خاص حالت کی بنا پر ایک خاص لحظہ میں قائم ہوتا ہے مگر یہ تعلق حد درجہ ناقص اور ادنیٰ ہوتا ہے۔ ربوبیت، اس تعلق کا نام ہے جو آغاز سے انجام تک پیدائش سے وفات تک بلکہ ابد تک قائم رہتا ہے جو ایک لمحہ کے لیے بھی منقطع نہیں ہوتا ہے جس کے تمہارے پر دُنیا اور دنیا کی تمام مخلوقات کا وجود ہے وہ گہوارۂ عدم سے لے کر فنائے محض کی منزل تک ہر قدم پر ہر موجود کا ہاتھ تھامے رہتا ہے۔ انسان ذرہ ہو یا بصورت غذا، قطرۂ آب ہو یا قطرۂ خون، مضغہ گوشت ہو یا مشتِ استخوان، شکم مادر ہو یا اس سے باہر بچہ ہو، جوان، ادھیڑ ہو یا بوڑھا، کوئی آن، کوئی لمحہ رب کے مہر و کرم اور لطف و محبت سے مستغنی اور بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ باپ اور بیٹے کے الفاظ سے مادیت، جسمانیت، ہم جنسی اور برابری کا جو تخیل پیدا ہوتا ہے وہ سرتا سر تشبیہہ ہے۔ اللہ کی ذات

اس سے یک قلم پاک ہے۔ اس آیت میں سبحانہٗ کا یہی مطلب ہے۔

۳۱۹

ـــہ ۔ زمین وآسمان کی ساری موجودات اس کی مِلک اور مطیع فرمان ہیں۔ یہ جواب ہے ان کا جو اللہ کے لیے صاحبزادہ بناتے چکر میں ہیں۔

اس جواب میں اندازِ تعبیر ایسا اختیار کیا گیا ہے کہ اس میں مختلف پہلو نمایاں ہیں۔

۱۔ بیٹا ہونے کے لیے ضروری ہے کہ باپ کی جنس ہو۔ کوئی بھی مخلوق اللہ کی جنس کیونکر ہو سکتی ہے جب کہ وہ مخلوق ہے۔ خالق اور مخلوق، صانع اور مصنوع، عمارت اور معمار، نقش اور نقاش میں کبھی ہم جنسی نہیں ہو سکتی ہے۔ وہ قدیم ہے یہ حادث، وہ غنی ہے یہ محتاج ہے۔ وہ باقی ہے یہ فانی ہے۔ قدیم اور حادث میں ہم جنسی ہو انسان کی عقل یہ کیسے باور کر سکتی ہے اس کا وجدان پکارتا ہے کہ ایسا ہونا ممکن نہیں ہے۔

۲۔ بیٹا ہونے کے لیے ضروری ہے کہ اس کی مملوک نہ ہو۔ آقا اور غلام میں تعلق مالک و مملوک کا ہوتا ہے باپ بیٹے کا نہیں ہوتا ہے۔ جو مملوک ہے وہ عبد تو ہو سکتا ہے لیکن بیٹا نہیں ہو سکتا۔ فرزندیت وعبدیت میں تنافی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی قانون میں اگر کوئی شخص اپنے بیٹے کا مالک ہو جائے تو وہ فوراً آزاد ہو جاتا ہے۔ جب انسانوں میں فرزندیت اور عبدیت جمع نہیں ہو سکتے تو بارگاہِ خداوندی میں کیسے جمع ہو سکتے ہیں۔

۳۔ مخلوق کا رشتہ اپنے خالق کے ساتھ صرف ملکیت ومملوکیت مطلقہ کا ہے نہ کہ فرزندی وعبدیت وغیرہ خرافات کا۔ اور جب ساری مخلوقات کا یہ حال ہے تو کسی ایک کو اس کا فرزند بنانا پرلے درجہ کی حماقت اور جہالت ہے۔

۴۔ ساری کائنات آسمانی یا زمینی اللہ کی مطیع وفرمانبردار ہے اور طاعت کا یہ دائرہ اتنا وسیع ہے کہ ہر چیز اپنے موجود ہونے، باقی رہنے اور مختلف احوال واطوار سے گزرنے میں زبانِ حال سے اس کی طاعت کے ترانے گا رہی ہے۔ گویا ہر چھوٹی بڑی چیز فنی یا تنقی بافتہ کس مخلوق کی مجال ہے جو اللہ کے بنائے ہوئے دن اور اللہ کی بنائی ہوئی رات کے ۲۴ گھنٹوں کے علاوہ ایک گھنٹہ ایک منٹ ایک لمحہ اپنے لیے پیدا کر سکے۔ بڑے سے بڑے ماہرینِ سائنس میں سے کس کے امکان میں ہے کہ اللہ کی مقرر کی ہوئی فضا سے کائنات سے باہر ایک گز ایک فٹ ایک انچ جگہ اپنے لیے تلاش کر سکے؟ کون ایسا ہے کہ اللہ نے زمان ومکان کی جو حدیں مقرر کی ہیں ان سے قدم باہر نکال سکے؟ کون ایسا ہے

کہ اللہ کے قانونِ حرارت، برودت، رطوبت و یبوست سے بے نیاز رہ سکے۔ کون ایسا ہے جو اس کے باندھے ہوئے قانونِ کششِ اجسام سے بغاوت کر سکے۔ عدد ووزن کے جو ضابطے خدا نے مقرر کر دیے ہیں کس میں ان سے انحراف کی ہمت ہے؟ سب کے سب اس کی تابعداری کر رہے ہیں۔ اس لیے طاعت کا یہ دم بھرتے ہوئے اللہ کا شریک وسہیم یا اللہ کا بیٹا ہونا کیونکر ممکن ہے۔ سب کے سب اس کے محکوم، اس کی مخلوق، اس کے قوائے تکوینی کے تابع و مسخر ہیں۔ کل لہ قانتون [1]

۳۲۰۔ بغیر مادے اور بغیر نمونے کے آسمان و زمین بنانے والا۔ اصل ارشاد لفظ بدیع آیا ہے۔ شارحینِ قرآن کا خیال ہے کہ مبدع کے معنے میں ہے۔ ابداع کے معنے عدم سے بغیر کسی مثال یا نمونہ اور بغیر کسی مادے کے وجود میں لے آنا ہے۔ اس لیے بدیع وہ ہے جو اپنے بنانے میں کسی آلہ کا محتاج ہو نہ کسی مسالہ نہ مقام و مکان کا پابند، نہ زمان و وقت میں مقید نہ کسی نمونہ کا محتاج اور نہ استاد کا بغیر کسی کی اعانت وشرکت کے وجود میں لانے والا۔ بدیع کا لفظ ان لوگوں کے رد میں ہے جو خدا کا بیٹا بناتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جو ذات تنہا تمام آسمان و زمین بدونِ کسی نمونہ اور توسطِ آلات وغیرہ کے ایسے انوکھے طرز پر پیدا کرتا ہے اسے بیٹے کا سہارا تلاش کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ سورۃ انعام میں اس فقرے کے بعد یہ بلیغ فقرہ لائے ہیں انی یکون لہ ولد ولم تکن لہ صاحبۃ یعنی جب وہ آسمانوں اور زمین کا موجد ہے تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کوئی اس کا بیٹا ہو جبکہ اس کی کوئی بیوی نہیں ہے۔ یعنی حیرت ہے کہ جب تم کسی مخلوق کو اللہ کا بیٹا قرار دو گے تو اس بچے کی ماں کسے بناؤ گے اور اس ماں کا تعلق اللہ سے کیسا بتاؤ گے۔ آج تک عیسائی جو حضرت مسیح کو خدا کا بیٹا کہتے ہیں یہ جسارت نہیں کر سکے کہ مریم صدیقہ کو خدا کی بیوی قرار دیں۔ جب تمہارا وجدان یہ باور نہیں کرتا تو پھر مریم کے پیٹ سے پیدا ہونے والا بچہ خدا کا بیٹا کیونکر بن گیا۔ دنیا کے دوسرے بچوں کو بھی خدا ان کی ماؤں کے پیٹوں سے پیدا کر رہا ہے وہ معاذ اللہ خدا کی اولاد نہیں کہلاتے۔ اس سے ابوت اور بنوت کا مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ اسباب ہوں یا خوارق سب کو خدا ہی نے پیدا کیا ہے۔ وہ پیدائش میں اسباب کا محتاج نہیں کیونکہ اس کی

---

[1] تفسیر ماجدی ص ۴۶

وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوْ تَاْتِيْنَآ
اٰيَةٌ ؕ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ ؕ تَشَابَهَتْ
قُلُوْبُهُمْ ؕ قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ﴿۱۱۸﴾

اور بے علم[۳۲۲] لوگ کہتے ہیں کہ خدا ہم سے خود بات[۳۲۳] کیوں نہیں کرتا ہے یا ہمارے[۳۲۴] پاس کوئی نشانی نہیں آتی ہے؟ بالکل ایسی ہی باتیں وہ لوگ بھی کہہ چکے ہیں جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں۔ اس موضوع پر پہلوں اور پچھلوں کے دل ایک جیسے[۳۲۵] اور ملے جلے ہیں۔ یقین والوں[۳۲۶] کے لیے ہم ایک نہیں متعدد نشانیاں صاف صاف نمایاں کر چکے ہیں۔

شان یہ ہے کہ

۳۲۱ ۔ جب کسی کام کا فیصلہ کر لیتا ہے تو بس حکم دیتا ہے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ جو چاہے اور جس طرح چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔ اس کی قدرت کی حد بندی نہیں ہے ایک کام کا ارادہ کیا اور ہو گیا نہ مادے کا محتاج نہ اسباب کا پابند[۱]

'کہتا ہے' کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ ہماری آپ کی طرح دو حرفی لفظ کن بولتا ہے مقصود صرف اس قدر ہے کہ ادھر حق تعالیٰ کا ارادہ ہوا اور ادھر معاً بلا توسط و توقف اس کا ظہور ہو گیا[۲]

شیخین نے ابو موسیٰ اشعری کے حوالہ سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا ہے "تکلیف دہ بات سن کر اللہ سے زیادہ تحمل کرنے والا کوئی نہیں۔ لوگ اس کے لیے بیٹا تجویز کرتے ہیں وہ اس پر بھی ان کو روزی اور صحت دیتا ہے۔

---

[۱] حاشیہ شیخ الہندؒ ص [۲] تفسیر ماجدی ص ۴۶

اللہ کی ذات پاک کسی کی ایذا دہی سے بالاتر ہے مگر جب مخلوق اپنی جانب سے ایذادہی کے سامان کرتی ہے تو وہ اس کی اطلاع دیتا ہے کہ میں اس سے بے پروا نہیں ہوں کہ تم مجھے بُرا بھلا کہہ رہے ہو لیکن اس کے باوجود وہ عافیت و رزق کا دروازہ بند نہیں کرتا۔ اگر وہ اس کے سوا دوسرے جواب کا ارادہ کرے تو ساری دُنیا ویرانہ بن کر رہ جائے۔ ہماری پستی اور اس کی بلندی، ہماری تنگ ظرفی اور اس کی فراخ حوصلگی، ہماری بغاوت اور اس کے تحمل کا یہ نقشہ قیامت تک یونہی جاری رہے گا۔ قرآن چاہتا ہے کہ اپنے حلقہ بگوشوں کو فردائے قیامت میں رُسوائی سے بچالے۔

انکار میں عالم و جاہل کا نظریاتی اتحاد

اہلِ کتاب کی تاریخ ملی سے انکار و سرکشی بیان فرمانے کے بعد اس موقعہ پر خاص طور پر ان لوگوں کے انکارِ نبوت کا حوالہ دیا ہے اور بتایا ہے کہ جس طرح انسانی سچائی کا مزاج ہمیشہ ایک طرح کا ہوتا ہے اسی طرح انسانی گمراہی کا مزاج بھی ایک ہی جیسا ہوتا ہے۔ نبوت کے انکار میں جو صورت مکہ میں پیش آئی تھی بالکل وہی صورت مدینہ میں پیش آ رہی ہے۔ فرق ہے تو صرف یہ کہ مکہ میں نبوت کی مخاطب ان پڑھ اور علومِ نبوت سے ناآشنا قوم تھی۔ اور مدینہ میں نبوت کا روئے سخن علومِ نبوت کے جانکاروں کی طرف تھا۔ لیکن علم اور جہالت کے فرق کے باوجود دونوں جگہ منکرین نے سچائی کو ایک ہی طریقہ پر جھٹلایا ہے اور ایک ہی طرح کی صدائیں بلند کی ہیں۔ انکار میں دونوں کے نظریات میں ہم آہنگی ہے۔ وہ انکار کرتے تھے بے خبر ہو کر اور یہ انکار کر رہے ہیں باخبر ہو کر۔ نبوت سے انکار میں دونوں میں نظریاتی اتحاد ہے۔ ایک جاہل معاند ہے اور معاندانہ اعتراضات کر رہا ہے۔ دوسرا عالم معاند ہے اور عناد کی وجہ سے سرکشی اور انکار کی راہ اختیار کیے ہوئے ہے اور یہاں کی خصوصیت نہیں ہے بلکہ ہر زمانے میں گمراہی کا مزاج ایک ہی رہا ہے۔

۳۲۲ ۔ بے علم لوگ کہتے ہیں یعنی اہلِ کتاب اور بُت پرستوں میں جو جاہل ہیں وہ سب کہتے ہیں[۱]۔ یہ بے علم کون لوگ ہیں؟ شارحینِ قرآن میں سے قتادہ کہتے ہیں کفارِ عرب ہیں،

[۱] حاشیہ شیخ الہند ص ۲۲

مجاہد کہتے ہیں کہ عیسائی ہیں اور عبداللہ ابن عباس فرماتے ہیں کہ یہودی ہیں۔ لیکن قرآن کے الفاظ بالکل عام ہیں اور ان لوگوں کے لیے استعمال ہوئے ہیں جو مقدس نوشتوں اور علومِ نبوت سے بالکل بے بہرہ تھے۔ یہ تعبیر قرآن میں ان لوگوں کے علاوہ کے لیے آتی ہے جو اہلِ کتاب یعنی یہودی اور عیسائی نہ ہوں۔ ابھی چند آیات پیشتر قرآن میں یہودیوں اور عیسائیوں کے مقابلے میں یہ تعبیر ایسے ہی لوگوں کے لیے آئی کذالک قال الذین لایعلمون مثل قولھم اس میں سب کہتے ہیں کہ علم سے آیت میں آسمانی کتاب کا علم مراد ہے۔ یہ کہنے والے سب کے نزدیک مشرکینِ عرب اور پھر ایسے مذہب کے پیرو جس کی بنیاد کسی آسمانی کتاب پر نہ ہو۔ کوئی وجہ نہیں کہ دونوں آیتوں میں عنوان کی ہم آہنگی کے باوجود معنون میں اختلاف پیدا کیا جاتے اور یہ کہا جائے کہ پہلی آیت بے علموں سے مراد دُنیا بھر کے عام کفار ہیں اور اس آیت میں یہودی یا عیسائی ہیں۔ نبوت کی زندگی کے واقعات بھی اس کی تائید نہیں کرتے کیونکہ اس آیت میں جس بات کو ان کی طرف منسوب کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ اللہ ہم سے براہِ راست بات کیوں نہیں کرتا یا ہمارے پاس کوئی نشانی کیوں نہیں آتی ؟ سیرتِ نبوت کی تاریخ بتاتی ہے کہ سینکڑوں یہودی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلّم کی خدمتِ اقدس میں آئے۔ امتحانات لیے لیکن ان کا امتحان یہ تھا کہ وہ آپ کے اَخلاق کی آزمائش کرنے۔ صحفِ انبیائے بنی اسرائیل کے سوالات دریافت کرتے، آپ کی تعلیم کا گہرا مطالعہ کرتے ان میں سے کسی نے آپ سے خارقِ عادت معجزہ کا مطالبہ نہیں کیا۔ کیونکہ ان کو معلوم تھا کہ آیات وخوارق نبوت کی باطنی اور اندرونی علامات نہیں ہیں۔ آنے والے نبی کی بشارتیں تورات اور انجیل دونوں میں ہیں لیکن ان میں سے کسی میں بھی صاحبِ خوارق ہونا آپ کی صفات نہیں بتائی گئی تھی۔ سینکڑوں یہود ونصاریٰ آپ کی خدمت میں آئے اور انہوں نے آپ کی نبوت کا امتحان لیا مگر امتحان کے پیچھے میں مادی معجزات کا سوال نہ تھا بلکہ عام علمی اور مذہبی معلومات کی نسبت استفسار تھا۔ قرآن میں ان کا ایک سوال بے شبہ ایسا مذکور ہے جس سے خیال ہوتا ہے کہ اہلِ کتاب بھی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلّم سے کسی مادی معجزے کی خواہش رکھتے تھے وہ آیت یہ ہے ۔

یسالك اھل الکتاب ان تنزل علیھم کتاب من السماء۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ یہودیوں کی معجزہ طلبی نہ تھی بلکہ چونکہ تورات کے متعلق ان

کا یہ خیال تھا کہ اس کی چند لوحیں خود اللہ تعالیٰ نے لکھی تھیں۔ اس لیے وہ اسی تخیل کے مطابق قرآن کے من جانب اللہ ہونے کے لیے اس کے نزول کو بھی اسی طرح چاہتے تھے۔

اب اس زمانے کے عیسائیوں میں قیصرِ روم کے دربار، نجاشی کے دربار اور وفدِ نجران کی مدینہ میں آمد کے واقعات کو پڑھ لیجئے۔ مختلف سوالات کیے۔ اسلام کی تعلیمات کا ہر طرح امتحان کیا لیکن دعویٰ کے ثبوت میں انہوں نے کوئی آیت نہیں مانگی۔

اس لیے اس آیت میں بھی پہلی آیت کی طرح الذین لا یعلمون سے قریشِ مکہ ہی مراد ہو سکتے ہیں۔ یہ ان کا ہی مطالبہ ہے۔

۳۲۳ ۔ خدا ہم سے خود کیوں بات نہیں کرتا۔ یعنی خواہ فرشتوں کے بغیر جیسے خود فرشتوں سے کلام کرتا ہے یا فرشتوں کے واسطے سے جیسے انبیاء سے بطورِ وحی بات کرتا ہے اور اس طرح یا تو خود ہم کو احکام بتا دیں کہ رسول کی ہمیں ضرورت ہی نہ رہے یا کم از کم اتنا ہی کہہ دیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے رسول ہیں تو ہم ان کی رسالت کے قائل ہو کر ان کی بات مان لیں گے[1]

ان کا مطلب یہ تھا کہ خدا یا تو خود ہمارے سامنے آ کر کہے کہ یہ میری کتاب ہے اور یہ میرے رسول ہیں۔ تم لوگ ان کی پیروی کرو[2]

گویا اعتراض یہ تھا کہ خدا اگر اپنے فلاں فلاں بندے سے بقول ان کے کلام کر سکتا ہے اور کرتا ہے تو آخر ہم سے کیوں نہیں کرتا ہم بھی تو انسان ہیں۔ احمقوں کے نزدیک اللہ سے ہمکلامی کے لیے گویا صرف انسان ہونا کافی تھا[3]

قرطبی فرماتے ہیں کہ مطلب یہ ہے کہ آپ کی نبوت کے بارے میں اللہ ہم سے بالمشافہ بات کیوں نہیں کرتا کہ ہمیں آپ کے نبی و رسول ہونے کا پتہ لگ جاتے۔ ابنِ کثیرؒ کہتے ہیں کہ قرطبی کی بات سیاقِ قرآن کے مطابق ہے۔ شوکانی نے بھی اسی کو اپنایا ہے۔ علامہ آلوسی نے کہنے کا یہ پسِ منظر بتا کر اسے زیادہ وزنی بنا دیا ہے کہ ان میں یہ احساسِ برتری تھا کہ ہم بھی انبیاء اور ملائکہ کے ہم پلہ ہیں۔

۳۲۴ ۔ یا ہمارے پاس کوئی نشانی کیوں نہیں آتی۔ اصل ارشاد میں لفظ آیت آیا ہے

---

[1] معارف القرآن م ش ص ۲۴۸ [2] تفہیم القرآن ص ۱۰۶ [3] تفسیر ماجدی ص ۴۶۔

آیتہ کے لغوی معنے نشان کے ہیں۔ یہ لفظ قرآن مجید میں بکثرت معجزے کے معنے میں آیا ہے۔ اور یہاں بھی مراد ہے اور معجزہ سے مراد وہ واقعہ ہے جو معمولِ عام سے ہٹا ہوا ہو اور بلا اسبابِ ظاہری اس کا ظہور تائیدِ رسول کے لیے ہو۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت پر معنوی دلائل و شواہد تو کثرت سے موجود تھے۔ لیکن مشرکین کی طرف سے پیہم فرمائشیں ہوتی رہی ہیں کہ کوئی حیرت انگیز حسی معجزہ دکھایا جائے جس کے بعد چون وچرا کی کوئی گنجائش نہ رہے[1]

دراصل یہ منکرینِ حق کی خاص گمراہی رہی ہے کہ سچائی کو خود سچائی میں نہیں ڈھونڈتے۔ انہوں کرشموں کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ جو آدمی سب سے زیادہ عجیب قسم کی باتیں کر دکھاتے۔ وہی سب سے زیادہ سچائی کی بات بتانے والا ہے۔ گویا ان کے نزدیک سچائی اس لیے سچائی نہیں ہوتی کہ وہ سچائی ہے بلکہ اس لیے کہ عجیب عجیب طرح کے کرشمے اس کے پیچھے کھڑے ہیں۔ ان کی یہ فرمائشیں حجت و برہان کے طلب میں نہ تھیں بلکہ محض سرکشی اور ہٹ دھرمی کی باتیں تھیں جو اس لیے کہی جاتی تھیں کہ کوئی نہ کوئی بات کہہ کر اپنے انکار کے لیے سہارا پیدا کیا جائے۔

۳۲۵ ۔ اس موضوع پر پہلوں اور پچھلوں کے دل ایک جیسے ہیں۔ یعنی انکار و سرکشی کرنے والوں کا ہمیشہ انبیاء کے مقابلے میں طرزِ عمل ایک رہا ہے۔ گویا جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ مشورے سے کہہ رہے ہیں۔ سورۃ طور میں اسی حالت کی طرف اشارہ ہے اتواصوا بہ کیا انہوں نے مشورہ کرکے یہ کام شروع کیا ہے اور شاید الکفر ملۃ واحدۃ اسی کی تعبیر ہے۔ ان سے جب سچائی کی بات کہی جاتی ہے تو اسے ماننے کے لیے ہمیشہ معجزوں کی فرمائش ان کی طبیعت بن گئی ہے۔ ان کے یہ مطالبات اپنی سرکشی اور انکار کی خاطر ہوتے ہیں۔ وہ پہلے سے طے کر لیتے ہیں کہ کبھی نہیں مانیں گے۔ پھر کوشش کرتے ہیں کہ نہ ماننے کے لیے کوئی بہانہ بنائیں۔ وہ طرح طرح کی باتیں اِدھر اُدھر کی نکالتے ہیں اور نکالتے رہتے ہیں۔ کبھی ایک بات کبھی دوسری بات اور اسی طرح سلسلہ قائم رکھیں گے۔ ہر حال میں یہ کوشش کریں گے کہ نہ ماننے کے لیے کوئی بات نکال لیں۔ پہلے کسی ایک بات پر زور دیں گے کہ اس کا کیا جواب ہے۔ جب اس کا جواب مل جائے گا تو دوسری بات لے آئیں گے اور کہیں گے کہ تمہارے پاس اس کا کیا جواب ہے

---

[1] تفسیر ماجدی ص ۶۴

تمہارے پاس کوئی نہیں ہے یہاں تک کہ اگر تم ان کی ساری کٹ حجتیوں کا جواب دے دو اور ساری شرطیں اور فرمائشیں پوری کر دو جب بھی وہ کوئی نہ کوئی بات پیش کر دیں گے اور راست بازی کی راہ پر کبھی نہ چلیں گے ۔ قرآن نے جا بجا منکروں کی اس حالت کا ذکر کیا ہے اور واضح کیا ہے کہ وہ ماننے والے نہیں ہیں اگر ماننے والے ہوتے تو اس طرح کی روش کبھی اختیار نہ کرتے ۔

قرآن یہاں بتانا یہ چاہتا ہے کہ

آج کے گمراہوں نے کوئی اعتراض اور کوئی مطالبہ ایسا پیش نہیں کیا ہے جو ان سے پہلے کے گمراہ پیش نہ کر چکے ہیں ۔ قدیم زمانہ سے انکار و سرکشی کا مزاج ایک ہی رہا ہے اور وہ بار بار ایک ہی قسم کے شبہات ، اعتراضات اور سوالات دہراتے رہے ہیں[1]

مطلب یہ ہے کہ ان کی یہ فرمائشیں اور ان کے یہ مطالبات کوئی انوکھے اور نرالے نہیں ہیں ۔ نادانوں نے ہر دور اور ہر ملک میں اس قسم کی فرمائشیں پیش کی ہیں ۔ ان سب کا کردار ایک ہے اور کردار کی ہم آہنگی کی وجہ یہ اور صرف یہ ہے کہ تشابھت قلوبھم ان کے دل ایک جیسے اور ملے جلے ہیں ۔ ان کی ذہنیتیں ایک جیسی ہیں ۔

۳۲۶ ۔ یقین والوں کے لیے ایک نہیں بلکہ متعدد نشانیاں صاف صاف نمایاں کر چکے ہیں ۔ یہ بات کہ خدا خود آکر ہم سے کیوں بات نہیں کرتا اس قدر مہمل تھی کہ اس کا جواب دینے کی حاجت ہی نہ تھی ۔ جواب صرف اس بات کا دیا گیا ہے کہ ہمیں نشانی کیوں نہیں دکھائی جاتی ۔ اور جواب یہ ہے کہ نشانیاں تو بے شمار موجود ہیں مگر جو ماننا چاہتا ہی نہ ہو اُسے آخر کون سی نشانی دکھائی جا سکتی ہے[2]

جواب یہ ہے کہ اہلِ یقین کے لیے صداقت کی تمام نشانیاں ظاہر کر دی گئی ہیں ۔ خود یہ دعوت اور پیغام ہی آیت و نشانی ہے اور اہلِ بصیرت کے لیے معجزہ ہی ہے اور آپ کا اُمی ہو کر ایک ایسی کتاب اور ایسی تعلیم پیش کرنا جس کی صداقت کو علماءِ بنی اسرائیل بھی جانتے اور سمجھتے ہیں ۔ کیا یہ معجزہ جہلائے قریش کی تسلی کے لیے کافی نہیں ہے ۔

اولم یکن لھم آیۃ ان یعلمہ علماء بنی اسرائیل

کیا ان کے لیے یہ نشانی کافی نہیں ہے کہ علماءِ بنی اسرائیل اسے جانتے ہیں ۔

---

[1] تفہیم القرآن ص ۱۱۶　[2] تفہیم القرآن ص ۱۰۶

مقصود یہ ہے کہ نبوّت کی حقیقت معجزہ نہیں ہے بلکہ اصل اس کی دعوت اور اس کی تعلیمات ہیں۔ لیکن اس کے معنے یہ نہیں ہیں کہ نبوّت کا دامن ظاہری آیات اور مادی نشانات سے خالی ہوتا ہے۔ تمام انبیاء کی سیرتیں بیک زبان اس کی تصدیق کرتی ہیں کہ باطنی آیتوں کے ساتھ ان کو ظاہری آیتوں کا حصّہ بھی ملتا ہے۔ قرآن حکیم نے اکثر انبیاء کے سوانح و واقعات کے ضمن میں ان کے ظاہری آثار و دلائل کو بھی بہ تفصیل بیان کیا ہے بلکہ کہنا یہ ہے کہ یہ مادی اور ظاہری نشانات نبوّت کی اصل حقیقت سے خارج ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ متعدد مقامات پر کفّار کی مادی نشانیوں کی طلب پر قرآن نے آپ کی طرف سے یہ الفاظ کہے ہیں کہ

هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا

میں تو صرف ایک انسان رسُول ہوں۔

معجزات بہر حال کسی نہ کسی زمانہ اور مخصوص وقت میں ظاہر ہوتے ہیں اور پھر دُنیا کے دوسرے حوادث کی طرح فنا ہو جاتے ہیں۔ اس بنا پر اگر ہر معاند کے سوال پر نبوّت معجزہ ہی دکھاتی رہے تو یہ تسلسل شاید کبھی ختم نہ ہو۔ اور پیغمبر کی زندگی اچنبوں کی زندگی ہو کر رہ جاتی اس لیے ظاہری معجزہ طلب کرنے والوں کو دائمی اور مسلسل معجزہ کی طرف طمئنت ہونے کی تاکید ہوتی ہے۔ اس بنا پر اس آیت میں آیات سے آیاتِ قرآنی مراد ہیں اور مطلب یہ ہے کہ قرآن کی ایک ایک آیت کو ہم کھول کر پیش کر چکے ہیں۔

سرکش معجزے سے بھی مطمئن نہیں ہوتے۔

نفسیاتِ انسانی کا خاصہ ہے کہ جب کسی کی طرف سے اس کے جذبات مخالفانہ ہوتے ہیں تو وہ اس کی کسی بات کو حسنِ ظن پر محمول نہیں کرتا اور اس کو اس کی ہر شے کے اندر شر، خبث اور بدی نظر آتی ہے۔ جلی سے جلی اور واضح سے واضح بُرہان بھی اس کے دل کے ریب اور قلب کے شک کو دُور نہیں کر سکتے۔ معاندین جو انبیاء کے مکارمِ اخلاق، حسنِ تعلیم اور دیگر علمی و عملی تلقینات کو باور نہیں کرتے اور ان کے کھلے اور بدیہی دعووں کو بھی تسلیم کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہوتے۔ اور ہر قسم کی دلیلوں کو سننے کے بعد بھی وہ اپنے لاعلاج مرض شک سے نجات نہیں پاتے تو آخر الحیل کے طور پر وہ انبیاء سے خارقِ عادت معجزوں کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اور چونکہ ان کو بدگمانی سے یہ یقین ہوتا ہے کہ ہماری طرح کا ایک مدعی انسان کبھی ایسی عجیب و غریب چیز پر قدرت نہیں رکھتا۔ اس لیے وہ کبھی کوئی عادت کے

خلاف پیش نہ کرے گا اور اس طرح اس کی رُسوائی عالم آشکارا ہو جائے گی۔ لیکن قدرتِ الٰہی آخری حجت کے طور پر ان کے سامنے معجزات بھی پیش کر دیتی ہے۔ ان کو دیکھ کر بھی معاندانہ رُوح ان کے دلوں میں نبوّت کی سچائی کا اعتبار نہیں پیدا ہونے دیتی اور بدگمانی انہیں یہ بتاتی ہے کہ گو اس خرقِ عادت کے ظہور میں تو شک نہیں مگر یہ خُدائی قوّت کا کرشمہ نہیں بلکہ شیطانی عمل اور سحر و جادو کی قوّت سے پیدا ہوا ہے۔ اور چونکہ بظاہر معجزہ اور سحر میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا اس لیے ان کے بدگمان قلب کو اس سے بھی تسلی نہیں ہوتی۔ کفارِ قریش حضور انور صلی اللہ علیہ وسلّم سے معجزوں کے مطالبہ کرتے تھے مگر جب معجزے دیکھتے تو جادوگر اور کاہن کہنے لگتے۔

چونکہ معاند حق و باطل کی قوّتِ تمیز سے محروم ہوتا ہے اور یقین کی قسمت سے اس کا دامن خالی ہوتا ہے اس لیے بڑی سے بڑی نشانی بھی اس کو شک و شبہ کے گرداب سے باہر نہیں نکال سکتی۔ وہ کبھی اسے بخت و اتفاق کہتا ہے۔ کبھی جادو سمجھ کر تکذیب کرتا ہے اس لیے معجزات سے بھی اس کو ہدایت نصیب نہیں ہوتی۔ ان تمام منازل کے بعد جب معاندین پر حجت تمام ہو جاتی ہے اور پھر طلبِ معجزہ کے لیے ان کے پیہم اصرار الحاح اور طلب کی کوئی پرواہ نہیں کی جاتی۔ اس کے جواب میں ان کو نبوّت کی اصل حقیقت کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے اس آیت کی روشنی سے یہ حقیقت واضح اور نمایاں ہو جاتی ہے کہ قرآن کی نظر میں ان ظاہری معجزات کی چنداں وقعت نہیں ہے۔ وہ لوگوں کو ہمیشہ اصل روحِ نبوّت کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ یہ آیتِ قرآنی بتاتی ہے کہ نبوّت اور ظاہری معجزات میں کوئی تلازم نہیں۔ اور یہ آثار و دلائل اصل نبوّت سے خارج امور ہیں۔ نبوّت کے اصل لوازم وحی، مخاطبہ الٰہی تزکیہ، تعلیم اور ہدایت ہیں۔ اس بنا پر جب معاندین نے معجزہ کا مطالبہ کیا تو قرآن نے اس کے جواب میں اصل حقیقت ان کے سامنے پیش کر دی کہ قد بینا الایات لقوم یوقنون۔ حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ پہلے لوگوں نے بھی ایسی ہی جہالت کی باتیں کہی تھیں۔ یہ نئی بات نہیں ہے۔ اور جو یقین لانے والے ہیں ان کے لیے ہم نے نبی کے برحق ہونے کی نشانیاں بیان کر دی ہیں اور جو ضد اور عداوت پر اڑ رہے ہیں وہ انکار کریں تو یہ محض عناد ہے ان کا۔[1]

---

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۲۳

یقین کی دولت ایمان کی رُوح ہے

یہاں یوقنون کی تعبیر میں بڑی گہری معنویت ہے۔ مسند احمد اور ترمذی میں حضرت صدیق اکبرؓ کے حوالہ سے جناب رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد آیا ہے کہ یقین کے بعد عافیت سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں ہے۔ امام بیہقی نے شعب الایمان میں ایک ارشاد نقل کیا ہے کہ اس اُمت کی سب سے پہلی اصلاح دولتِ یقین سے ہوئی ہے۔ یقین ایمان کی رُوح ہے خدا تعالیٰ کی جتنی نعمتیں ہیں وہ اس دولتِ یقین سے کمتر ہیں۔ صحیح بخاری میں عبداللہ بن مسعودؓ کا ارشاد ہے کہ الیقین الایمان کلہ، یقین ہی ایمان کی رُوح ہے۔ بیہقی نے کتاب الزہد میں ان الفاظ کو مرفوعاً بھی نقل کیا ہے۔ مگر حافظ ابن حجرؒ نے اس کو ضعیف کہا ہے۔ مسند امام احمد میں عبداللہ بن مسعودؓ کی یہ دُعا منقول ہے۔ اللّٰھم زدنا ایماناً و یقیناً و فقھاً۔ اے اللہ ہمارے دل میں ایمان یقین اور ہم میں دین کی سمجھ بڑھا دے۔ سنن ترمذی میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلسی دُعا میں مذکور ہے و اقسم لنا من الیقین ما تھون بہ علینا مصائب الدنیا اے اللہ ہمارے حصہ میں اتنا یقین لگا دے کہ اس کی وجہ سے ہمیں دُنیا کی مصیبتیں جھیلنا آسان ہو جائے۔ سفیان ثوری فرماتے ہیں کہ اگر یقین پوری حقیقت کے ساتھ دل میں سما جائے تو جنت کے اشتیاق اور دوزخ کے خوف کے مارے دل اڑنے لگے۔ جب یقین کی نعمت حاصل ہو جاتی ہے تو رُخ عالمِ مادیت کے بجائے عالمِ قدس کی طرف ہو جاتا ہے۔ اسباب بے حقیقت بن جاتے ہیں، منفعت و مضرت کا سوال منظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ ایک مرتبہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے زید بن حارثہؓ سے دریافت کیا کہ ہر چیز کی ایک حقیقت ہوتی ہے۔ تم بتاؤ تمہارے ایمان کی حقیقت کیا ہے۔ انہوں نے عرض کیا کہ مجھے عرشِ رحمان کا ایسا یقین حاصل ہے جیسے اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔ ۱/۲۱

(حجۃ اللہ البالغہ) از شاہ ولی اللہ

دلائل کی بنیاد پر یقین کی تعمیر کرنا صفتِ ایمان نہیں ہے۔ ایمان کی صفت یہ ہے کہ یقین کی بنیاد پر دلائل کی عمارت اٹھائی جائے۔ جب کسی حقیقت تک رسائی حاصل ہو جاتی ہے تو پھر دلائل کا راستہ خود بخود مختصر ہو جاتا ہے۔

إِنَّآ أَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيرًا وَّنَذِيرًا ۙ وَّلَا تُسْـَٔلُ عَنْ أَصْحٰبِ الْجَحِيمِ ﴿١١٩﴾

اے پیغمبر بلاشبہ ہم نے ہی تمہیں دینِ حق[۳۴۷] دے کر روانہ کیا ہے (اور اس لیے بھیجا ہے) کہ تم لوگوں کو ایمان[۳۴۸] و عمل صالح کی برکتوں کی بشارت دو اور انکارِ حق کے نتائج سے آگاہ کرو۔ جو لوگ آپ کی دعوت سے سرکشی کر کے دوزخ[۳۴۹] میں جائیں گے ان کے بارے میں اللہ کے حضور آپ جوابدہ نہیں ہوں گے۔

رسالتِ عامہ اور اُس کے فرائض

بنی اسرائیل یعنی یہودیوں کے تفصیلی حالات بیان فرمانے کے بعد آخر میں اولاً عیسائیوں اور پھر پوری دُنیا کے بے علم منکروں کا خاص طور پر تذکرہ بطورِ تمہید پیش کیا گیا۔ اصل مقصد وہ ہے جو اس آیت میں پیش کیا جا رہا ہے، پہلی آیات میں تفصیلی طور پر بتایا کہ آپ کی تشریف آوری کے وقت دُنیا کی کیا حالت تھی پہلے ان لوگوں کے حالات پر ناقدانہ تبصرہ کیا جن سے دُنیا کی آبادی اور اصلاح کی سب سے زیادہ اُمید ہو سکتی تھی، جو سام کی اولاد میں سب سے پہلے وحی الٰہی کے امانت دار تھے اس لیے قرآن نے ان سے کہا کہ لا تکونوا اول کافر۔ مگر یہ قوم سخت جان ہونے کے ساتھ سنگدل بھی ثابت ہوئی۔ قرآن نے ان کو طعنہ دیا کہ قست قلوبکم۔ انہوں نے مختلف زمانوں میں انبیاء کو جھٹلایا۔ ان کو تکلیفیں دیں بلکہ اُن کو قتل تک کر ڈالا۔ حضرت موسیٰ اور ان کے بعد کوئی پیغمبر ان میں ایسا نہ آیا جس نے ان کی سنگدلی کا ماتم نہ کیا ہو۔ ان کو اپنے محبوبِ خدا ہونے اور نجات یافتہ ہونے پر اتنا غرور تھا کہ وہ کہتے تھے کہ ہم کچھ کریں ہم سے کوئی باز پُرس نہ ہوگی۔ وہ سمجھتے تھے کہ جنت کی نعمتیں صرف ان ہی کے لیے ہیں۔ وہ خیال کرتے تھے کہ نبوّت و رسالت صرف ان کے گھر کی چیز ہے

کسی دوسرے کا اس میں کوئی حق نہیں۔ جو ان میں پڑھے لکھے تھے وہ خدا کے احکام کو اپنے منشا اور دولت مندوں کی خوشنودی کے لیے اپنی باطل تاویلوں سے بدلتے رہتے تھے۔ جو ان میں ان پڑھ تھے، جاہل تھے، وہ اپنے سنے سنائے قصوں پر ایمان رکھتے تھے۔ احکام الٰہی میں سے جو آسان اور ضرورت کے مطابق ہوتا اس کو قبول کرتے، دوسرے احکام کو پس پشت ڈال دیتے۔ آپس میں قتل و خونریزی کا بازار ان میں گرم تھا۔ ایک طاقتور قبیلہ دوسرے کمزور قبیلہ کو گھر سے بے گھر کر دیتا اور پھر کوئی گرفتار ہو جاتا تو فدیہ دے کر اس کو چھڑا بھی لیتے، مال و دولت کی حرص کی وجہ سے ان میں ہر قسم کا لالچ اور اخلاقی کمزوریاں پیدا ہو گئی تھیں۔ اوہام خرافات پر ان کا ایمان تھا۔ تعویز، گنڈا جادو اور عملیات پر فریفتہ تھے اور سمجھتے تھے کہ یہ حضرت سلیمان کی تعلیم ہے۔

چھٹی صدی عیسوی کے خاتمہ پر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے دو چار سال بعد عیسائی اپنے زوال کے پست ترین نقطہ تک پہنچ گئے تھے۔ عام سیاسی و اخلاقی حالت سے قطع نظر کر کے جب ہم مذہبی پہلو پر نظر کرتے ہیں تو وہ باپ بیٹا روح القدس اور مریم کی خدائی کے معتقد تھے۔ حضرت عیسٰی اور مریم روح القدس کی شخصیت اور مرتبہ کی تعیین سے بیسیوں فرقے پیدا کر دیئے تھے جن میں زبانی مناظروں سے گزر کر جنگ و جدل کی نوبت آگئی تھی۔ یہاں تک کہ ۵۱۴ھ میں خود عیسائیوں کے دو گروہوں کے درمیان ایک عظیم الشان مذہبی جنگ چھڑی جس میں ۶۵۰۰۰ عیسائیوں کو خارج البلد ہونا پڑا۔ جنگ عظیم کے علاوہ ہمہ وقت ہر فریق دوسرے فریق کے خون کا پیاسا رہا کرتا تھا۔ اور بارہا چھوٹی چھوٹی باتوں پر کشت و خون کی نوبت آجاتی۔ مورخین کا بیان ہے کہ تیسری صدی سے لے کر ساتویں صدی مسیحی تک مسیحیت کی جو حالت رہی ہے وہ اس کے لیے باعث ننگ ہے۔ مشرکانہ رسوم نے مذہب کی جگہ لے لی تھی۔ اصل رومی بت پرستانہ عقیدوں نے مسیحی مذہب کا روپ بھر لیا تھا۔ اسی زمانے میں ایک گروہ مریمی پیدا ہو گیا تھا جو حضرت مریم کو شریک الوہیت کر کے اقانیم ثلاثہ کی جگہ اقانیم اربعہ کا عقیدہ رکھتا تھا۔

یہ تو ان اہل کتاب کا حال تھا جو نبوت کے علوم کے حامل تھے۔ ان کے علاوہ باقی دنیا جن کو قرآن نے الذین لا یعلمون کہا ہے ان کا کیا حال تھا۔ اس کی تفصیل کا یہ محل نہیں ہے لیکن اسی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جب جانکاروں کا یہ حال تھا تو نادانوں کا کیا حال ہو گا۔

پوری دُنیا ملائکہ کی الوہیت، جنات کی الوہیت، بُت پرستی، اشخاص پرستی، آثار پرستی اور مظاہر پرستی کا گہوارہ بنی ہوئی تھی۔ خرافات واوہام، رسوم اور انسانی غلامی کی گود بنی ہوئی تھی۔ حالات یہ تھے۔ ان حالات کا ناگزیر تقاضا تھا کہ پوری دُنیا کی اصلاح کی خاطر ایسی کامل ترین، محبوب ترین نبوت کا ظہور ہو جو تمام عالم کے لیے ابد تک کافی رہے۔

الم البقرہ کے قاری کے ذہن میں یہاں پہنچ کر یہ سوال خود بخود چٹکیاں لینے لگتا ہے کہ اگر حالات یہ ہیں تو ان کا حل کیا ہے۔ اسی اٹھتے ہوئے سوال کا پیشِ منظر آیت میں دیا گیا ہے گویا علمائے بلاغت کی زبان میں یہ استیناف بیانی ہے۔ چونکہ عام شارحین قرآن کی نظر اس پہلو پر نہ تھی اس لیے ان کو یہ آیت بے جوڑ اور بے ربط نظر آئی۔ کسی نے کہہ دیا کہ یہ جملہ معترضہ ہے۔ اور کسی نے بتایا کہ اس کے ذریعے حضور انورؐ کو تسلی دی جارہی ہے۔ اور کسی کی زبان پر آیا کہ اور نشانیوں کا کیا ذکر سب سے بڑی نشانی آپ کی ذات گرامی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ آیت نہ تسلی ہے، نہ جملہ معترضہ ہے نہ آیات میں سے کسی آیت کی تعین کے لیے آئی بلکہ یہ ایک اٹھتے ہوئے سوال کا جواب ہے۔

۳۲۷ ـ بلاشبہ ہم نے تمہیں دینِ حق دے کر روانہ کیا ہے۔ یعنی ہم نے تمہیں ان حالات کی اصلاح کی خاطر عقائد اور شرائع کا وہ سرمایہ دے کر روانہ کیا ہے جو سرتاسر حق ہے۔ عربی میں اس کا خاصہ ثبوت اور قیام ہے یعنی جو بات ثابت، اٹل، المنٹ ہو اسے حق کہیں گے باطل ٹھیک ٹھیک اس کی نقیض ہے۔ ایسی چیز جس میں ثبات اور قیام نہ ہو، ٹل جانے والی مٹ جانے والی قرآن میں ہے۔ بالحق یعنی آپ کو جو کچھ دے کر روانہ کیا گیا ہے وہ ایک قائم اور ثابت حقیقت ہے۔ اسے اختیار کر کے ہر شخص دُنیا وآخرت کی سعادتیں حاصل کر سکتا ہے جو قوتیں اسے مٹانا چاہیں گی ضرور مٹ جائیں گی۔ یہ باقی اور قائم رہنے والی حقیقت ہے۔ اس کا بقاء وقیام خود ہی اپنی حقیقت کا اعلان ہے۔ اور یہ الحق کسی خاص طبقہ، کسی خاص قوم، خاص ملک، خاص نسل اور خاص رنگ کے لیے نہیں بلکہ پوری انسانیت کے لیے، چنانچہ ارشاد ہے،

قل یاایھا الناس قد جاء کم الحق من ربکم

قرآن کے نزول کو بھی الحق کہا گیا ہے

وبالحق انزلناہ وبالحق نزل

یعنی قرآن کا انزال اور نزولِ حق کے ساتھ ہے۔ اور ان تینوں باتوں میں کہ حق آگیا، اور آپ کی رسالت حق کے ساتھ ہے، قرآن کا نزولِ حق کے ساتھ ہوا ہے اس طرف اشارا ہے کہ اس کے مقابلے پر جو کچھ ہے وہ حق نہیں سرتاسر باطل ہے اور باطل مٹنے کے لیے ہے۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم دینِ حق کو لے کر آئے اور اسے دُنیا میں قائم کرنے کے لیے بھیجے گئے۔ یہ آیت گرامی مدینہ کی زندگی کے بالکل ابتدائی دور میں نازل ہوئی ہے اور اس کا سیاق وسباق بتارہا ہے کہ یہ اس دور کی داستان ہے جبکہ تینوں طاقتیں نبوت کے مقابلے میں پوری جوانی کا مظاہرہ کررہی تھیں۔ نیک دل اور حقیقت شناس تو سننے اور دیکھنے کے ساتھ قبول کرنے پر آمادہ ہوگئے لیکن وہ بھی جن کے دل کے آئینے زنگ آلود تھے۔ پیغام کی سچائی وحی کی تاثیر، نبوت کی پُراثر دعوت، اعجازِ معصومیت اور اخلاق کے پرتو سے صاف وشفاف ہوتے گئے، اور حق کا نُور روز بروز زیادہ صفائی اور چمک کے ساتھ عرب کے افق پر درخشاں اور تاباں ہوتا چلا گیا یہاں تک کہ ۲۳ برس کی مدت میں ایک ایمان پر مبنی اُمت، ایک قرآن پر مبنی نظامِ حکومت، ایک جامع اخلاقی نظام، ایک کامل قانون، ایک مکمل شریعت، ایک ابدی مذہب اور عملی جماعت، خدا پرستی، اخلاق، ایثار، تقویٰ، ایمانداری اور راستی کا ایک مجسم عہد یعنی حق کا ایک نیا سماں پیدا ہوگیا۔

۳۲۸ ـ تم لوگوں کو ایمان وعمل صالح کی بشارت دو اور انکارِ حق کے نتائج سے آگاہ کرو۔ جو حق آپ کو دے کر اللہ نے روانہ کیا ہے اس کو لوگوں تک پہنچانے کا بھی طریقہ اللہ نے آپ کو بتایا ہے کہ اسے پہنچانے کے لیے طریق کار یہ ہے کہ لوگوں میں ترغیب اور ترہیب سے دعوت کا کام کیا جائے۔ اچھے کاموں پر اللہ سبحانہٗ کے وعدوں کی بشارت سنائی جائے اور بُرے کاموں پر اللہ کی سزا سے ڈرایا جائے۔

ان دو لفظوں بشیر اور نذیر میں معانی کا ایک سمندر پنہاں ہے۔

کسی شخص کا بطورِ خود ایمان اور عمل صالح پر اچھے انجام کی بشارت دینا اور کفر و بدعملی پر بُرے انجام سے ڈرانا اور بات ہے اور نبی کا اللہ کی طرف سے بشیر ونذیر بنا کر روانہ کیا جانا دوسری بات ہے۔ جو شخص اللہ کی جانب سے یہ مقام لے کر آتا ہے وہ اپنی بشارت اور انذار کے پیچھے لازماً ایک اقتدار رکھتا ہے جس کی بنا پر اس کی بشارتوں اور اس کی تنبیہوں کو قانونی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ اس کا کسی کام پر بشارت دینا یہ معنے رکھتا ہے کہ جس

احکم الحاکمین کی طرف سے وہ روانہ کیا گیا ہے ۔ وہ اس کام کے پسندیدہ ہونے اور مستحق اجر ہونے کا اعلان کر رہا ہے لہٰذا وہ یقیناً فرض واجب یا مستحب ہے اور اس کا کسی کام کے بُرے انجام کی خبر دینا یہ معنی رکھتا ہے کہ قادرِ مطلق اس کام سے منع کر رہا ہے لہٰذا وہ ضرور گناہ اور حرام ہے اور یقیناً اس کا مرتکب سزا پائے گا۔ یہ حیثیت رسُول کے سوا کسی اور شخص کو کبھی حاصل نہیں ہو سکتی ۔[1]

اس میں اشارہ ہے کہ بشیر ہونے کی حیثیت میں میں دینِ حق کے اوامر لے کر آیا ہوں اور نذیر ہونے کی حیثیت میں میں دینِ حق کے نواہی لے کر آیا ہوں۔ دینِ حق یعنی عقائد، اعمال اور اَخلاق پر مشتمل نظامِ زندگی چونکہ اللہ کی جانب سے ہوتا ہے اور انسانوں کے سامنے اسے اللہ کا رسُول پیش کرتا ہے اور اس میں رسُول اللہ پاک کی حاکم ہونے کی حیثیت میں نمائندگی کرتا ہے اس لیے حاکم ہونے کی حیثیت میں اوامر اور نواہی حکومت کا ناگزیر تقاضا ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ انسانی علم تو انسانی زندگی کے صرف ایک ایک شعبہ کی ہدایت کرتے ہیں اور وہ بھی نامکمل اور نبوت انسانی زندگی کے ہر شعبہ کے متعلق ہدایت لے کر آتی ہے اور مکمل ہدایت۔ گویا عالم کو اپنے نظام کے لیے جن مختلف قابلیتوں کے مختلف انسانوں کی ضرورت ہوتی ہے وہ سب قابلیتیں بیک وقت اعلیٰ سے اعلیٰ طریق پر نبوّت کے دامن میں موجود ہوتی ہیں۔ معاشی، معاشرتی، تہذیبی، تمدّنی، سیاسی، اجتماعی، دیوانی، فوجداری، اَخلاقی اور ایک فرد کی خانگی زندگی میں تنہائیوں تک کے لیے نبوّت اپنی آغوش میں ہدایات رکھتی ہیں۔ وہ عفت و پارسائی کو بتاتی ہے تو بشیر ہے زنا سے روکتی ہے تو نذیر ہے منافع اور مصالح کو ابھارتی ہے تو بشیر ہے مضار اور مفاسد کو مٹاتی ہے تو نذیر ہے اللہ کی جانب سے دُنیا اور آخرت کا پورا کارخانہ بشیر و نذیر کے عنوان کے تحت نبوّت کے زیرِ نگیں کر دیا گیا ہے۔ اسی بنا پر نبی کے اقوال، اَفعال، اَخلاق انسانوں کے لیے صحیح معیار نیز ان کا کام دیتے ہیں ۔

آیت میں یہ بات بتائی گئی ہے کہ اللہ نے تم کو رسُول بنا کر روانہ کیا ہے اور اس لیے روانہ کیا ہے کہ تم دینِ حق کو انسانوں میں بشارت اور انذار کے ذریعے قائم کرو۔ اس آیت

---

[1] تفہیم القرآن ج ۴ ص ۱۰۸

وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ؕ قُلْ اِنَّ
هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ؕ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ الَّذِیْ
جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّلَا نَصِیْرٍ ﴿۱۲۰﴾

اور حقیقت یہ ہے کہ آپ ان تینوں میں سے یہود و نصاریٰ کی خاطر اس اُمید پر کہ وہ اہل کتاب ہیں کیسی ہی محنت کریں لیکن یہ دونوں یعنی یہود و نصاریٰ آپ[۳۴۰] سے اس وقت تک ہرگز خوش نہ ہوں گے جب تک آپ اُن کے طریقے پر نہ چلیں گے ان سے صاف صاف کہہ دو کہ رہنمائی تو صرف[۳۴۱] اللہ ہی کی رہنمائی ہے نہ کہ تمہاری خود ساختہ رہنمائی۔ اور بلاشبہ اگر تم نے ان کی خواہشوں[۳۴۲] پر مبنی رہنمائی کی پیروی کی باوجودیکہ تمہارے پاس علم آچکا ہے تو آپ کے لیے اللہ[۳۴۳] کی دوستی اور مددگاری کا دروازہ بند ہو جائے گا۔

میں ارسال کو اگرچہ بے قید رکھا گیا ہے لیکن جس مقام پر یہ آیت آئی ہے اور جن سے مخاطبہ میں یہ آیت آئی ہے یعنی یہودیوں، عیسائیوں اور کفار سے اس بات کی کھلی شہادت ہے کہ یہ آپ کی عموم رسالت کے ساتھ رسالت کی ابدیت کا اعلان ہے

ف ۳۲۹۔ جو لوگ آپ کی دعوت سے سرکشی کر کے جہنم میں جائیں گے آپ ان کے بارے میں اللہ کے حضور جواب دہ نہیں ہیں۔ یعنی کسی کی تکذیب آپ کا کچھ نہ بگاڑے گی۔ تکذیب کرنے والا اگر تکذیب کرتا ہے تو اس کی سزا اسی کو بھگتنا ہے۔ آپ کی حیثیت مسیطر و جبار کی نہیں بلکہ معلم و ہادی کی ہے اس لیے آپ کا کام لوگوں تک پیغام پہنچانا ہے۔ منوانا آپ کی ذمہ داری میں داخل نہیں ہے۔ اگر کوئی نہ مانے گا تو اس کی ذمہ داری آپ پر نہیں ہے۔ مکی سورتوں میں چونکہ آپ کو اس کام میں جان کھپانے اور بہت بڑی محنت کرنے کا حکم دیا گیا تھا وجاھدھم بہ جھادا کبیرا

قرآن سے ان پر بڑے زور سے محنت اور کوشش کیجئے اس لیے اس موقعہ پر یہ فرماکر لاتسأل من اصحاب الجحیم۔ آپؐ کو تسلی دی گئی ہے کہ محنت کے باوجود اگر کوئی حق کو نہ مانے گا تو اس کی ذمہ داری آپ پر نہیں ہے۔ حضرت شیخ الہندؒ فرماتے ہیں یعنی تجھ پر الزام نہیں کہ ان کو مسلمان کیوں نہیں کیا[1] مطلب یہ ہے کہ منکرین کے انکار کی ذمہ داری آپ پر نہیں ہے۔ آپ کیوں اس قدر فکر و تشویش میں مبتلا ہوتے ہیں۔ آپ کا فرض تو پیغام پہنچانے پر ختم ہو جاتا ہے آگے کی ذمہ داری آپ پر ذرہ برابر نہیں ہے[2]

اہل کتاب سے کوئی توقع نہیں

بُری بات اور بُرے کام سے رنجیدہ ہونا طبیعت ہے۔ اور اگر بُرائی اُن کی جانب سے ہو جن سے اس کی توقع نہ ہو تو اس رنج میں اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔ یہودی اور عیسائی علومِ نبوت کے جانکار، آخرت کو ماننے والے اور نسلِ انبیا سے تعلق رکھنے والے تھے۔ ان سے نبوت کو توقع تھی کہ نبوت کے کام میں مددگار ہوں گے اور ہاتھ بٹائیں گے لیکن خلافِ توقع ان کی جانب سے شدید مخالفت ہوئی، اور صرف مخالفت ہی نہیں بلکہ ان کی مخالفت نے مکابرہ، انکار اور عداوت کی شکل اختیار کر لی۔ اس آیت میں قرآن نے حضورؐ کو بتایا ہے کہ ان سے اس کام میں مدد ملنے، اور ہاتھ بٹانے کی کوئی توقع نہ فرمایئے اور ان سے اپنی توجہ گرامی کو بالکل ہٹا لیجئے۔ آپ کی خواہش یہ ہے کہ حق کو قبول کر لیں اور ان کی خوشی اس میں ہے کہ آپ اُن کے راستہ پر چلیں۔ ان کے نزدیک دین کی سچائی، آخرت کی نجات اور حق و باطل کا معیار یہودی اور عیسائی ہونا ہے۔ ایمان اور عمل کوئی چیز نہیں ہے۔ ان کا خیال ہے کہ دین کی سچائی صرف ان کے ہی حصے میں آئی ہے۔ باقی تمام انسانی برادری اس سے محروم ہے۔ قرآن نے حضورِ انورؐ کو بتایا ہے اور حضورِ انورؐ کے واسطہ سے اُمت کو آگاہ کیا ہے کہ یہ لوگ اتباع ہویٰ کر رہے ہیں اور تم اتباع ہُدیٰ کر رہے ہو۔ اور یہ دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ یعنی جو متبع ہویٰ ہے وہ متبع ہُدیٰ نہیں ہو سکتا۔ اور جو آسمانی ہدایت کا متبع ہے وہ متبع ہویٰ نہیں ہو سکتا۔ یعنی

---

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۲۲ [2] تفسیر ماجدی ص ۴۷

اتباعِ ہُدیٰ کے لیے ضروری ہے کہ وہ اتباعِ ہویٰ کو چھوڑے۔ لیکن یہودی اور عیسائی اس کے لیے آمادہ نہیں ہیں کہ وہ اتباعِ ہویٰ کو ترک کر دیں۔ بلکہ ان کی خواہش یہ ہے کہ آپ بھی ان کی خواہشات کے بنائے ہوئے راستہ پر چلیں اور اللہ کے بنائے ہوئے راستہ کو چھوڑ دیں۔ اس لیے اس راہ میں ان سے توقع نہ رکھیے۔

سبق ۲۳۰۔ یہودی اور عیسائی آپ سے اس وقت تک راضی نہ ہوں گے تا آنکہ آپ ان کے طریقہ کی پیروی کر لیں۔ یہ دونوں دوسرے کا فروں کے مقابلے میں علومِ نبوت سے آشنا ہیں ان میں گمراہی بے علمی سے نہیں بلکہ علم کی بے راہ روی سے آئی ہے اور جو گمراہی علم کی راہ سے آتی ہے اس کا نتیجہ انتہائی خطرناک ہوتا ہے۔ یہ گمراہی تاریکی کی گمراہی نہیں بلکہ روشنی کی گمراہی ہے جہل کی نہیں علم کی گمراہی ہے۔ اس لیے یہاں اسبابِ ہدایت سب بے کار ہیں۔ نہ کان سنتے ہیں، نہ آنکھیں دیکھتی ہیں اور نہ عقل سوچتی ہے، حق فہمی، حق بینی کی کوئی صلاحیت نہیں ہے۔ ان سے ہدایت اور توبہ کی کوئی توقع نہیں ہے۔ دین کے نام پر یہ گھروندے ہویٰ کی اساس پر بنے ہوئے ہیں۔ ان سے منسلک ہو جانے کے بعد انسان میں حق پسندی اور حق بینی کی جگہ گروہ پرستی کی رُوح پیدا ہو جاتی ہے۔

یعنی یہود و نصاریٰ کو حق سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ اپنی ضد پر اڑے ہوئے ہیں۔ وہ کبھی آپ کا دین قبول نہیں کریں گے۔ بالفرض اگر تم بھی ان کے تابع ہو جاؤ تو خوش ہو جائیں گے اور یہ ممکن نہیں تو آپ کو ان سے موافقت کی اُمید نہ رکھنی چاہیے[1]

مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کی ناراضی کا سبب یہ تو نہیں ہے کہ وہ سچے طالبِ حق ہیں۔ اور تم نے ان کے سامنے حق کو واضح کرنے میں کچھ کمی ہے وہ تو اس لیے تم سے ناراض ہیں کہ تم نے اللہ کی آیات اور اس کے دین کے ساتھ وہ منافقانہ اور بازی گرانہ طرزِ عمل کیوں اختیار نہ کیا۔ خدا پرستی کے پردے میں وہ خود پرستی کیوں نہ کی۔ دین کے اُصول و احکام کو اپنے تخیلات اور خواہشات کے مطابق ڈھالنے میں اس دیدہ دلیری سے کیوں کام نہ لیا۔ وہ ریا کاری، گندم نمائی جو فروشی کیوں نہ کی جو خود ان کا اپنا شیوہ ہے۔ لہٰذا انہیں راضی کرنے کی فکر چھوڑ دو۔ کیونکہ جب تک تم ان کے سے رنگ ڈھنگ اختیار نہ کر لو۔ دین کے ساتھ وہی معاملہ نہ کرو جو

---

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۲۳

خود یہ کرتے ہیں اور عقائد و اعمال کی انہیں گمراہیوں میں مبتلا نہ ہو جاؤ جن میں یہ مبتلا ہیں۔ اس وقت تک ان کا تم سے راضی ہونا امرِ محال ہے[1]

۳۲۱

۵۔ کہہ دو کہ رہنمائی تو صرف اللہ ہی کی رہنمائی ہے۔ یعنی ان کے سامنے صاف صاف اعلان کر دو کہ ہدایت تو صرف وہ ہی ہے جو اللہ کی جانب سے میں لے کر آیا ہوں، تمہاری آراء اور نفسانی خواہشوں کا بنایا ہوا پیمانہ اللہ کی ہدایت نہیں ہے۔ اس آیت میں الھدیٰ کو اللہ کی ہدایت بنایا گیا ہے یہ الھدیٰ کیا ہے؟ قرآن بتاتا ہے کہ یہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی وہ ہدایت ہے جو آپ پر اللہ نے بذریعہ وحی نازل فرمائی ہے۔ اور بلا تفریق و امتیاز نوعِ انسانی کے لیے ہے۔ اس میں نہ تو نسل و قوم کا امتیاز ہے نہ زمان و مکان کی قید ہے وہ سب کے لیے اور ہمیشہ کے لیے ہے اور اس جملہ کا قصر بتا رہا ہے کہ اس ایک ہدایت کے سوا اور جتنی ہدائتیں بھی انسانوں نے سمجھ رکھی ہیں سب انسانی بناوٹ کی راہیں ہیں۔ خدا کی بنائی ہوئی راہ صرف یہی ایک راہ ہے۔

اسی لیے وہ ہدایت کی ان تمام صورتوں سے یک قلم انکار کرتا ہے جو اس اصل سے منحرف ہو کر طرح طرح کے ناموں اور متخالف منظریوں میں بٹ گئی ہے۔ ہدایت کی راہ تو یہی عالمگیر اور ابدی ہدایت کی راہ ہے۔ اسی کو وہ الدین القیم، الاسلام، الصراط المستقیم، سبیل اللہ سے پکارتا ہے۔ یہی وہ اصل عظیم ہے، نبوت کی دعوت کی سب سے پہلی بنیاد ہے۔ وہ جو کچھ بھی بتلانا چاہتی ہے تمام تر اسی اصل پر مبنی ہے۔ اگر اس سے نظر ہٹا لی جائے تو نبوت کا تمام کارخانہ درہم برہم ہو جاتے۔ اسی کو قرآن نے دوسری جگہ مقصدِ رسالت قرار دیا ہے۔ ارشاد ہے۔

> ھو الذی ارسل رسولہ بالھدیٰ و دین الحق لیظھرہٗ علی الدین کلہ ولو کرہ المشرکون۔
>
> وہی ہے جس نے اپنے رسول کو الھدیٰ اور سچے دین کے ساتھ روانہ کیا ہے تاکہ اس دینِ حقیقی کو تمام بناوٹی دینوں پر برتر کر دے۔

یہاں بناوٹی دینوں سے مقصود زندگی کے وہ نظام ہیں جو دین کی نوعیت رکھتے ہیں۔ قرآن میں یہ اعلان اسی عنوان سے تین بار کیا گیا ہے کہ اللہ نے اپنے رسول کو الھدیٰ اور

۴۰۹

[1] تفہیم القرآن ج ۱ ص ۱۰۷

دین حق دے کر اس لیے روانہ کیا ہے کہ اسے دین کی نوعیت کے تمام نظاموں پر غالب کر دے۔ یہودیوں کے تذکرے میں سورۃ براۃ میں، مشرکین کے تذکرہ میں سورۃ فتح میں اور عیسائیوں کے تذکرے میں سورہ الصف میں۔ آیت بالا ۹ھ میں نازل ہوئی جبکہ سورۃ فتح والی آیت ۶ھ میں اور سورۃ الصف والی آیت ۳ھ میں نازل ہوئی جبکہ اسلام اور نبوّت کی دعوت صرف مدینہ تک محدود تھی۔ مسلمانوں کی تعداد چند ہزار سے زیادہ نہ تھی۔ اس آیت قل ان ھدی اللہ ھو الھدیٰ کا زمانۂ نزول مدنی زندگی کا بالکل ابتدائی زمانہ ہے۔ اس لیے اگر یہ کہہ دیا جائے کہ اس کا نزول ۱ھ یا ۲ھ میں ہوا تو بجا نہیں ہے۔ اپنے مقام اور اپنے مضمون کے لحاظ سے اس آیت کو جس قدر اہمیت حاصل ہے اتنا ہی زیادہ شارحینِ قرآن کی نگاہوں نے اس کی تشریح سے اعراض کیا ہے۔ حتیٰ کہ کہا جا سکتا ہے کہ آج قرآن کی کوئی آیت بھی دنیا کی نظروں سے اتنی پوشیدہ نہیں جس قدر یہ آیت۔

۲۳۲ ۔ اگر تم نے ان کی خواہشوں کی پیروی کی باوجودیکہ تمہارے پاس العلم آچکا ہے۔ اندازِ خطاب بظاہر حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلّم سے ہے لیکن دراصل بات اُمت کو سنائی جارہی ہے۔ کیونکہ یہ پیروی حضورِ انورؐ کے لیے محال ہے اللہ سبحانہٗ نے آپ کو عصمت کی نعمت سے مالامال کیا ہے۔ اہوار سے مراد یہودیوں اور عیسائیوں کے رایوں اور خیالات کے ذریعے بنایا ہوا نظامِ زندگی ہے۔ جو علم و حقیقت کی جگہ نفسانی خواہشوں پر مبنی ہے۔ قرآن نے بنی اسرائیل کی بنیادی گمراہی یہی بتائی ہے کہ وہ متبع ہوٰی ہیں۔ اور اتباعِ ہوٰی ان میں اس قدر سرایت کر چکی ہے کہ اس کے خلاف ان کے لیے اتنا ہی مشکل ہے کہ وہ انبیاء کی جانوں سے کھیل جاتے ہیں۔ ان کی تکذیب کرتے ہیں مگر اتباعِ ہوا کو چھوڑنا گوارا نہیں کرتے۔ قرآن نے جیسے اس آیت میں یہودیوں کی اہواء پر مبنی نظام کی پیروی سے منع کیا ہے ایسے ہی ان لوگوں کی پیروی سے بھی روکا ہے جو اہلِ کتاب کی طرح علم نہیں رکھتے

ثم جعلناک علی شریعۃٍ من الامر فاتبعھا ولا تتبع اھواء الذین لا یعلمون۔

ہم نے آپ کو اس نظامِ حق کی کھلی شاہراہ پر قائم کر دیا ہے۔ اسی پر چلتے رہو اور بے علموں کی خواہشوں کی پیروی نہ کیجئے۔

گویا نبوّت کی لائی ہوئی ہدایت کے سامنے جو کچھ بھی ہے چاہے وہ یہودیت کے نام پر ہو

یا عیسائیت کے نام پر یہ سب انسانوں کی خواہشوں، ان کے میلانات اور ان کے رجحانات کا بنایا ہوا سرمایہ ہے اور اس کے مقابلے پر نبوّت الھدیٰ کے نام پر جو کچھ لے کر آئی ہے وہ العلم ہے، جس کی اساس وحیٔ الٰہی ہے نہ کہ انسانی رائے اور خیال۔

حضرت شیخ الہندؒ فرماتے ہیں کہ یہ بات بطریق فرض ہے یعنی اگر بالفرض آپ ایسا کریں تو قہرِ الٰہی سے کوئی نہیں بچا سکتا۔ بایں طور تنبیہہ سے اُمت کو کہ اگر کوئی مسلمان ہو کر قرآن کو سمجھ کر دین سے پھرے گا تو اس کو عذاب سے کوئی نہ بچا سکے گا۔ لہ

گویا ایک سرے پر العلم ہے حقیقت سے تمام تر لبریز اور دوسرے سرے پر اہواء، حقیقت سے تمام تر خالی۔ استدلالِ قرآن کی منطقی شکل گویا یوں ہوئی۔

۱۔ یہود و نصاریٰ کی رضا طلبی کے لیے ضروری ہے کہ آپ ان کا دین اختیار کریں لیکن ان کا دین سرتاسر محرف و باطل ہے۔ اس لیے ان کی رضا طلبی کے لیے ان کے دین کا اختیار کرنا ضروری ہے۔

۲۔ جو رحمتِ خداوندی سے مالا مال اور توفیقِ الٰہی سے سرفراز ہیں اس کے لیے باطل کی پیروی امرِ محال ہے۔ آپ رحمتِ خداوندی سے مالا مال اور توفیقِ الٰہی سے سرفراز ہیں اس لیے پیرویٔ باطل محال ہے۔

۳۔ جب آپ کے لیے پیرویٔ باطل محال ہے تو ملتِ یہود و نصاریٰ کی پیروی بھی محال ہے۔[۲]

۳۳ ۔ تو اللہ کی دوستی اور مدد کا دروازہ بند ہو جائے گا۔ یعنی اگر اس الھدیٰ اور العلم کے مقابلے میں کسی اور نظام کی پیروی مسلمانوں نے کی تو وہ کبھی کامیاب نہ ہوں گے اور اللہ کی محبت اور نصرت سے محروم ہو جائیں گے۔ خوب یاد رہے کہ یہ بات رسول اللہ کو مخاطب کر کے مسلمانوں کو کہی گئی ہے۔ ابن کثیرؒ نے تصریح کی ہے الخطاب للرسول والامر لامتہ۔

اس سے معلوم ہوا کہ جیسے مسلمانوں کا نبوت کے لائے ہوئے الھدیٰ اور العلم سے وابستہ ہونا اور اس کی پیروی کرنا اللہ کی نصرت اور دوستی کا ذریعہ ہے ایسے ہی نبوت کے علم و ہدیٰ سے ہٹ کر مسلمانوں کا زندگی میں دوسرے نظاموں سے وابستہ ہونا اور ان کی پیروی کرنا اللہ کی محبت اور دوستی اور اس کی مدد سے محروم ہونے کا سبب ہے۔

لہ حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۲۲ ۲ہ تفسیر ماجدی ص ۴۷

اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ یَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖؕ اُولٰٓىٕكَ یُؤْمِنُوْنَ بِهٖؕ وَ
مَنْ یَّكْفُرْ بِهٖ فَاُولٰٓىٕكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۱۲۱﴾

وہ لوگ جن کو ہم نے کتاب[۳۳۴] دی ہے وہ اسے پڑھتے ہیں جیسا کہ اسے[۳۳۵] پڑھنے کا حق ہے۔ وہ ہی اس پر[۳۳۶] ایمان رکھتے ہیں۔ اور جو اس کا[۳۳۷] انکار کریں گے وہ ہی اصل میں نقصان اٹھانے والے ہیں۔

اُمت کی بعثت

یہ بھی اس موقعہ پر ذہنوں میں اٹھتے ہوئے سوال کا جواب ہے۔ یہ بات معلوم ہو جانے کے بعد کہ اس وقت کی دُنیائے علم یعنی اہلِ کتاب سے اس کام میں ہاتھ بٹانے کی کوئی توقع نہ کیجیے اور ان سے کوئی اُمید نہ رکھیے۔ کیونکہ وہ اتباع ہویٰ کے سنگین جُرم کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ ان کی گمراہی تاریکی کی گمراہی نہیں روشنی کی گمراہی ہے۔ جہل کی نہیں علم کی گمراہی ہے۔ اس بات کے سننے اور پہلی آیت میں جو بات کہی گئی ہے اس کے سمجھنے کے بعد کہ آپ کو اللہ نے دینِ حق دے کر روانہ کیا ہے پوری انسانیت کے لیے ہے اور ہمیشہ کے لیے ہے ذہن میں یہ سوال خود بخود چٹکیاں لینے پر مجبور ہوتا ہے کہ اگر ان سے توقع نہیں تو یہ عظیم اور پوری انسانیت کی اصلاح کا اجتماعی کام صرف انفرادی محنت سے کیونکر بروئے کار آئے گا۔ اگر کام صرف ایک علاقہ کی اصلاح کا یا صرف ایک وقت محدود کا ہوتا تو یہ ممکن ہوتا کہ انفرادی کوشش نتیجہ خیز ہو جاتی۔ لیکن اس قدر اونچے اور بڑے کام کے لیے عمل کی انفرادی فیاضی اور دریا دلی خواہ کتنی زیادہ ہو ناکافی ہے۔ اس آیت میں اسی سوال کا جواب ہے کہ اس کام میں ہاتھ بٹانے کے لیے ہم نے ایسی جماعت آپ کی ہمرکابی میں دی ہے جس میں مقصد کی لگن اور نصب العین کا عشق ہے۔ جو قرآن کی داعی ہے اور قرآن سے ان میں ایسی شدید محبت ہے کہ اس کے لیے کوئی قربانی نہیں جو ان کو ناگوار ہو۔ اس کی محبت ان کے دلوں میں اس قدر راسخ ہو چکی ہے کہ اس کے اوامر و نواہی پر عمل کرنا اور فرائض کو بجا لانا ان کے ایمان و

یقین کا تقاضا بن چکا ہے۔

عام مفسرینِ قرآن نے اس آیت کو بھی سیاق و سباق سے الگ کر کے جملہ معترضہ قرار دیا ہے اور بتایا ہے کہ اس میں اہلِ کتاب کے صالح عنصر کی طرف اشارہ ہے ان کے خیال میں آیت میں کتاب سے مراد تورات اور جن کو دی گئی ہے سے مراد یہود و نصاریٰ ہیں، لیکن اس تشریح کی وجہ سے اس کے بعد آنے والے فقرے کی نشست بالکل بے محل ہو کر رہ گئی۔ نہ بہ کی ضمیر کا مرجع درست ہوا اور نہ اس فقرے میں مسندالیہ کی تقدیم سے جو حصر بتانا مقصود تھا وہ باقی رہا ہے۔ اگر یہودیوں کے چند افراد کو جو ایمان لائے تھے مثلاً عبداللہ بن سلام، اس آیت کا مصداق قرار دیا جائے اور مطلب یہ بتایا جائے کہ تورات کو بس یہی مانتے ہیں اور کوئی نہیں مانتا اور تورات کو پڑھنے کا حق بھی ادا کر رہے ہیں اور کوئی نہیں کرتا۔ تو اس میں کوئی خاص معنویت نہیں ہے۔ اس باب میں ہمیں حضرت قتادہ کی تشریح موقعہ و مقام کے زیادہ مناسب اور برمحل معلوم ہوتی ہے کہ جن کو کتاب دی گئی ہے سے صحابہ کرام اور کتاب سے قرآن عزیز مراد ہے۔ اب مطلب بالکل واضح اور صاف ہے کہ صحابہ کرام قرآن کی تلاوت اس طرح کرتے ہیں جو اس کا حق ہے اور ان کا ہی اس پر ایمان ہے۔ ان کے علاوہ جن سے کام میں ہاتھ بٹانے کی توقع کی جا رہی ہے ان کا ایمان نہیں ہے اور ظاہر ہے کہ نبوت کے کام میں ہاتھ بٹانے کے لیے ایسے لوگوں کی ضرورت ہے جو اپنی زندگی کی بنیادیں قرآن پر استوار کریں اور اس پر ایسا ایمان رکھیں جس کا ضمیر مشن کی ولولہ انگیزیوں اور جنون نوازیوں سے تیار ہو۔ جس میں ایثار و قربانی اور سرفروشیوں کی ایک دنیا آباد ہو۔ اور جس میں افراد کی شخصی نجات کا نہیں بلکہ عالمِ انسانیت کی نجات کا تصور اور جذبہ کارفرما ہو۔ یہ گویا حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے ساتھ آپ کی اُمت کی بعثت کا اعلان ہو رہا ہے۔ حکیم الامت شاہ ولی اللہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں اس طرف اشارہ فرمایا ہے کہ۔

اعظم الانبیاء شاناً من لہ نوع آخر من البعثۃ۔

نبیوں میں سے اونچی شان والا نبی وہ ہے جس کی نبوت کے پیشِ منظر میں ایک جدید قسم کی بعثت بھی ہو۔ (ج ۱ ص ۸۴)

اس کے بعد فرماتے ہیں کہ آپ کی نبوت سے اللہ پاک کے دو بنیادی مقصد ہیں ایک یہ کہ آپ کی ذات لوگوں کے لیے ذریعۂ ہدایت اور روشنی کا سبب ہو۔

دوسرے یہ کہ آپ کی اُمت بہترین اُمت ہو اور اسے لوگوں کی اصلاح کے لیے روانہ کیا گیا ہو۔
اس معنے کے اعتبار سے آپؐ کی بعثت کے آغوش میں ایک اور بعثت ہے یعنی اُمت کی اجتماعی بعثت ۔ یہ مقام قرآن کے مہمات معارف میں سے ہے۔ اس کے تفصیلی مباحث انشاء اللہ دوسرے پارے میں آرہے ہیں ۔ دُعاءِ ابراہیم میں بھی اُمۃ مسلمہ سے اس کی طرف اشارہ آرہا ہے۔

۳۴ ۔ یہود میں تھوڑے آدمی منصف بھی تھے کہ اپنی کتاب کو پڑھتے تھے۔ سمجھ کر اور قرآن پر ایمان لے آئے جیسے عبد اللہ بن سلام اور ان کے ساتھی۔ یہ آیت انہی لوگوں کے بارے ہے یعنی انہوں نے تورات کو غور سے پڑھا، انہی کو ایمان نصیب ہوا اور جس نے انکار کیا کتاب کا یعنی اس میں تحریف کی وہ خائب و خاسر ہوا[1] حضرت شیخ نے آیت کا یہ مطلب عام شارحین قرآن کے مطابق پیش فرمایا ہے۔ اس مطلب کی موجودگی میں اور تو اور آخری فقرے من یکفر بہ میں کوئی خاص معنویت نہیں رہی۔ قرآن مستقبل کے بارے میں اعلان کر رہا ہے کہ جو اس نبوت کا، نبوت کے ذریعے آئے ہوئے العلم کا اور الکتاب کا کفر کرے گا وہ خائب و خاسر ہے اور اس تشریح کو لے کر جو عام مفسرین بیان کرتے ہیں مطلب یہ ہوگا کہ جو تورات میں تحریف کرے گا حالانکہ صرف تورات ہی تو ان کے ہاتھوں میں ہے ۔ یہ گویا قرآن کا اعتراف ہوگا کہ تورات میں ابھی تک کوئی تحریف نہیں ہوئی ہے ۔ اب جو تحریف کریں گے وہ کافر ہوں گے ۔ حالانکہ قرآن نے کتاب کی حد تک ان پر تین قسموں پر مشتمل فردِ جرم لگائی ہے ۔ حافظ ابن القیم فرماتے ہیں اللہ سبحانہ نے یہودیوں کو تین باتوں پر ملعون کیا ہے تحریف، تلبیس اور کتمان، تحریف کا قرآن میں متعدد مواقع پر تذکرہ ہے۔

۳۵ ۔ وہ اسے پڑھتے ہیں جیسا کہ اسے پڑھنے کا حق ہے۔ یہ صیغہ مضارع ہے اس کے معنے یہ ہیں کہ وہ قرآن کی تلاوت کرتے ہیں جیسا کہ اس کا حق ہے ۔ عکرمہ فرماتے ہیں کہ یہاں تلاوت بمعنے اتباع ہے اور مطلب یہ ہے کہ جو لوگ اس قرآن کا اتباع کرتے ہیں جو اتباع کا حق ہے یعنی اس کے اوامر کی پابجائی کرتے ہیں اور اس کے نواہی سے بچتے ہیں اس کے حلال کو حلال اور اس کے حرام کو حرام گردانتے ہیں، فاروق اعظم فرماتے ہیں کہ مطلب

---

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۲۳

یہ ہے کہ جب قرآن میں نماز جنت کا ذکر پڑھتے ہیں تو اللہ سے اُسے مانگتے ہیں اور دوزخ کی ہولناکیوں کے تذکرے پڑھتے ہیں تو دوزخ سے پناہ کی اللہ سے درخواست کرتے ہیں۔
مطلب یہ ہے کہ وہ قرآن کے اَسرار سمجھتے ہیں، اس کی قانونی اور دستوری حکمت کے رازداں ہیں، اور انسان کی ذمہ داری کے وزن سے واقف ہیں۔ گویا تلاوتِ حق تلاوت کی تعبیر فہم و تدبّر کے لیے اختیار کی گئی ہے اور یہ بتانا مقصود ہے کہ تلاوتِ کتاب اللہ کا بنیادی مقصد کتاب اللہ کو سمجھنا، اس پر غور و فکر کرنا، اس کے مدلولات کو معلوم کرنا اور زندگی کے مختلف گوشوں میں اسے برتنا ہے۔ یعنی وہ صرف تعبد کی خاطر تلاوت نہیں کرتے بلکہ تعبد کے ساتھ تدبّر کے لیے تلاوت کرتے ہیں۔

۱۲۶ ۔ وہی اس پر ایمان رکھتے ہیں۔ اس سے پہلے الحق، الکتاب اور العلم کا ذکر، الحق وہ نظامِ زندگی جو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم لے کر تشریف لائے، الکتاب اس نظامِ زندگی کا ہدایت نامہ جو بذریعہ وحی قرآن کی صورت میں آپ نے پیش کیا اور العلم وہ سرمایۂ علم جو قرآن نے آپ کو دیا۔ ان تینوں میں چاہے کسی کو مرجع بنا لو مطلب ایک ہی ہے بشرطیکہ کتاب سے قرآن مراد ہو۔ مولانا تھانوی اور شاہ عبدالعزیز نے دینِ حق اور العلم کو ضمیر مرجع بتایا ہے۔

۱۲۷ ۔ جو بھی اس کا انکار کرے گا۔ یعنی اس دینِ حق اور اس العلم کا جو قرآن کے ذریعے اللہ کی جانب سے آپ کو ارزانی ہوا ہے۔ اس کا انکار و سرکشی دُنیا اور آخرت میں سراسر گھاٹا اور خسارہ ہے۔ آلوسی نے اس کی وجہ ایمان دے کر کفر کو اپنانا بتایا ہے۔ حافظ ابن کثیر نے یہاں صحیح مسلم اور مسند احمد کی اس حدیث کا ذکر کیا ہے جس میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے کہ کوئی یہودی اور کوئی عیسائی اگر مجھ پر ایمان لائے بغیر مرجائے گا وہ بلا شبہ دوزخی ہے۔
مطلب یہ ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان لانا سب پر یکساں فرض ہے۔ یہود و نصاریٰ کا خاص طور پر اس لیے ذکر کیا ہے کہ وہ اہلِ کتاب تھے، جب ان کی نجات نہ ہو گی تو دوسروں کی نجات کیسے ہو سکتی ہے۔

يٰبَنِيٓ اِسۡرَآءِيۡلَ اذۡكُرُوۡا نِعۡمَتِيَ الَّتِيۡٓ اَنۡعَمۡتُ عَلَيۡكُمۡ وَاَنِّيۡ فَضَّلۡتُكُمۡ
عَلَى الۡعٰلَمِيۡنَ ۝ وَاتَّقُوۡا يَوۡمًا لَّا تَجۡزِيۡ نَفۡسٌ عَنۡ نَّفۡسٍ شَيۡـًٔا
وَّلَا يُقۡبَلُ مِنۡهَا عَدۡلٌ وَّلَا تَنۡفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا هُمۡ يُنۡصَرُوۡنَ ۝

اے بنی اسرائیل! میری وہ نعمتیں[۳۲۸] یاد کرو جن سے تمہیں سرفراز کیا۔ میں نے تمہیں دُنیا کی قوموں[۳۲۹] پر برگزیدگی عطا فرمائی تھی۔ اور دیکھو اُس دن سے ڈرو جب کوئی کسی کے ذرا کام نہ آئے گا۔ نہ کسی سے فدیہ قبول کیا جائے گا اور نہ کوئی سفارش سُود مند ہو گی اور نہ اُن کو مدد پہنچے گی۔

اُمتِ مسلمہ کی تاسیس

تمام شارحینِ قرآن کا یہ خیال ہے کہ یہ دونوں آیتیں مکرر تاکید و تنبیہہ کی خاطر لائی گئی ہیں اور کچھ کہتے ہیں کہ تکرار بات کو خوب ذہن نشین کرنے کے لیے ہے۔ اس موضوع پر ملے جلے خیالات ہی ہیں لیکن اصل بات یہ ہے کہ اس پارے کے آغاز میں جہاں پوری انسانیت کو نبوتِ محمدیہؐ کے ماننے کی یہ کہہ کر دعوت دی گئی تھی ان کنتم فی ریب مما نزلنا علی عبدنا فاتوا بسورۃ من مثلہ وہاں نبوت کی ضرورت پر آدم علیہ السلام کی تخلیق اور خلافت سے استدلال کر کے بتایا تھا کہ جو ہدایت آپ لے کر آئے ہیں وہ کوئی انوکھی نہیں ہے۔ اس ہدایتِ ربانی کی آمد کا سلسلہ تخلیق آدم سے شروع ہو گیا تھا اور قرآن اسی سلسلہ ہدایت کی کڑی ہے۔ اس موقعہ پر بنی اسرائیل کو اس لیے مخاطب کیا گیا کہ وہ اس ہدایت ربانی کی تاریخ میں اللہ کی ہدایت کے حامل ایک عرصہ دراز تک رہ چکے تھے۔ وہاں حضور انورؐ کی نبوت کا تذکرہ تھا۔

اب یہاں نبوت کے ساتھ پوری اُمت کی بعثت اور اُمتِ مسلمہ کی تاسیس کا تذکرہ شروع ہونے والا ہے اور اس کا بنیادی تعلق حضرت ابراہیم کی ذاتِ گرامی سے ہے۔ اور بنی اسرائیل بھی

حضرت ابراہیم کے تین فرزند { ۱- اسحاق بن سارہ ۲- مدیان بن قطورا ۳- اسماعیل بن ہاجرہ

حضرت ابراہیم سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کو چونکہ منصب سے معزول کیا جارہا ہے اور ان کی جگہ اُمتِ محمدیہ کو باقاعدہ نبوت کے کام کے لیے منتخب کیا جارہا ہے۔ اس لیے یہ آیت ان کو یہ یاددہانی کے لیے لائی گئی کہ تم پر ہمارے انعامات کی بارشیں بے پایاں تھیں لیکن چونکہ تم اس بزرگی اور فضیلت کو اپنے نسلی غرور، بزرگی کے نشے اور بدعملیوں کے نتیجے میں کھوچکے ہو۔ اس لیے اب یہ نعمت تم سے چھینی جارہی ہے اور اس کام کے لیے دوسروں کو منتخب کیا جارہا ہے۔

یاد رہے کہ نبوت اور امامت قرآن کی تشریح کے مطابق حضرت ابراہیم کی اولاد کے لیے مخصوص ہوچکی تھی۔ قرآن میں ہے

وجعلنا فی ذریته النبوة والكتاب واتيناه اجره فی الدنيا

اور ہم نے ابراہیم کی اولاد میں نبوت اور کتاب رکھ دی تھی

مولانا عثمانی فرماتے ہیں حضرت ابراہیم کے بعد بجز اُن کی اولاد کے کسی کو کتاب آسمانی اور نبوت نہ دی جائے گی اسی لیے ان کو ابوالانبیاء کہا جاتا ہے۔

ایک دوسرے موقعہ پر ہے

لقد ارسلنا نوحاً وابراهيم وجعلنا فی ذريتهما النبوة

ہم نے نوحؑ اور ابراہیمؑ کو روانہ کیا اور ٹھہرادی دونوں کی اولاد میں نبوت

اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ پیغمبری اور نبوت کے لیے ان کو منتخب کیا یعنی ان کی نسل کو ان کے بعد یہ دولت ان کی ذریت سے باہر نہ جائے گی۔

ان دوسروں کا انتخاب بھی چونکہ حضرت ابراہیم کی اولاد ہی سے ہورہا ہے اس لیے اس گفتگو کا آغاز آئندہ آیت میں حضرت ابراہیم سے کیا ہے۔

حضرت ابراہیم کے تین بیٹے تھے۔ حضرت اسحاقؑ، ان کی والدہ کا نام سارہ ہے انہوں نے شام اور فلسطین میں حکومت کی۔ مدیان، ان کی والدہ کا نام قطورا ہے۔ یہ حجاز کے پاس بحرِ احمر کے ساحل پر آباد ہوتے۔ حضرت اسماعیلؑ، ان کی والدہ کا نام ہاجرہ ہے جو اپنے بھائی مدیان سے کسی قدر آگے بادیہ فاران میں آکر آباد ہوئے۔

حضرت اسحاق کے دو بیٹے تھے، یعقوب جن کا لقب اسرائیل ہے اور جو بنی اسرائیل کے مورث ہیں۔ یہ پہلے کنعان میں تھے بعد ازاں حضرت یوسف کے پاس مصر پہنچ گئے۔ جہاں ان کی اولاد کئی سو برس تک مصر کی غلامی میں رہ کر حضرت موسیٰ کے زمانہ میں پھر فلسطین واپس آئی

وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ۭ قَالَ اِنِّىْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ
اِمَامًا ۭ قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِىْ ۭ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِى الظّٰلِمِيْنَ ۝

اور یاد کرو جب ابراہیم کو اس کے رب نے چند باتوں[۳۴۰] میں آزمایا اور وہ ان سب میں[۳۴۱] پورا اُتر گیا تو اللہ نے فرمایا کہ میں تجھے پوری انسانیت کی پیشوائی[۳۴۲] دینے والا ہوں۔ ابراہیم نے عرض کیا کہ کیا میری اولاد[۳۴۳] سے بھی یہی وعدہ ہے فرمایا کہ میرا وعدہ[۳۴۴] ظالموں سے متعلق نہیں ہے۔

دوسرے بیٹے کا نام عیشاؤ ہے اور لقب ادوم تھا۔ یہ شمالی عرب کے کوہ سروات میں ادومی قبائل کا جدِ اعلیٰ تھا۔

حضرت اسماعیلؑ کے بارہ بیٹے تھے جو تورات کی پیشین گوئی کے مطابق خاندان کے بارہ رئیس تھے۔ ان ہم نسب اقوام و قبائل کا باہمی رشتہ حسب ذیل شجرہ سے واضح ہوگا۔

ابراہیم

اسحاق		اسماعیل	مدین
یعقوب اسرائیل	عیشاؤ ادوم	قیدار۔ ثابط	
پدر بنی اسرائیل	ایوبؑ	پدر قریش، پدر اصحاب الحجر وانصار	
و ابنائے اسرائیل			

۳۴۸ھ۔ میری نعمت یاد کرو۔ یعنی بنی اسرائیل کو اللہ نے نبوّت کی نعمت عطا فرمائی تھی۔ یہی وہ نعمت ہے جس سے اللہ نے ان کو نوازا تھا۔ لیکن اس نعمت کی انہوں نے قدر نہیں کی چنانچہ پچھلے دس رکوعوں میں ان کی ناقدری کی پوری تاریخ بیان فرمائی ہے اور ان کو بتا دیا ہے کہ تم اس نعمت کی بے حد ناقدری کر چکے ہو، اب یہ آیت یہ بتانے کے لیے آئی ہے کہ چونکہ تم میں اس کام کی اہلیت نہیں ہے اور اللہ کا وعدہ ہے کہ نبوّت نسلِ ابراہیم میں رہے گی۔ بے شک تم نسلِ ابراہیم

سے ہو لیکن تم نے اس کا حق ادا نہیں کیا بلکہ تم حق اور راستی سے پھر گئے ہو اور اس نعمت کی اہلیت پوری طرح کھو چکے ہو لہٰذا تمہیں اس منصب سے ہٹا کر نسلِ ابراہیم کی دوسری شاخ بنی اسماعیل میں یہ نعمت منتقل کی جا رہی ہے ۔

۲۳۹ ۔ تمہیں دوسری قوموں پر سرفراز کیا تھا۔ اس کی تشریح گزر چکی ہے۔ یہاں مناسب مقام یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ یہ سرفرازی اسی نعمتِ نبوت کی بنا پر تھی۔ پوری دُنیا نبوت کے علم و عمل سے بیگانہ تھی صرف یہی قوم سلسلۂ نبوت کی قائل و حامل تھی ۔

حضرت ابراہیمؑ کی امامت

بنی اسرائیل کو اپنا انعام اور ان کی سرفرازی یاد کرانے کے بعد اس بنیاد کی نشاندہی فرمائی ہے جس پر ان کی بزرگی اور سرفرازی کی پوری عمارت کھڑی ہے ۔ یہ حضرت ابراہیم کی ذاتِ گرامی ہے ۔ آپ بنی اسرائیل اور بنی اسماعیل دونوں سلسلوں کے بانی ہیں۔ اب نبوت کی نعمت نسلِ اسرائیل سے اس کی مسلسل نافرمانیوں کی پاداش میں چھین کر ایک اسماعیلی پیغمبر کے واسطہ سے پوری دُنیا کے لیے عام ہونے کا اعلان ہو رہا ہے ۔ ضرورت ہے کہ ابراہیمی شخصیت اور ان کے ضمن میں اسماعیلی شخصیت کی مرکزیت اور اہمیت سے دُنیا کو روشناس کیا جائے اور بتایا جائے کہ وہ ذاتِ گرامی جس کو پوری انسانیت کے لیے بشیر و نذیر بنایا گیا ہے وہ کیا ہے ؟ اس کی نبوت کی تاریخ کیا ہے ؟ کیا یہ تاریخ کا کوئی اچانک حادثہ ہے یا قدرت کا روزِ اوّل ہی سے سوچا ہوا منصوبہ ہے ۔

۲۴۰ ۔ جب ابراہیم کو اس کے رب نے چند باتوں میں آزمایا۔ یعنی اللہ سبحانہ نے حضرت ابراہیم کو چند باتوں میں آزمایا۔ ابتلا سے ابتلی بنا ہے اور ابتلا بلا سے ۔ اصل میں کپڑے کے پرانا ہونے کو کہتے ہیں اور اس کے معنے آزمانا اس لیے آتے ہیں کہ گویا آزمائش اسے مانجھ کر پرانا کر دیتی ہے۔ غم اور تکلیف کو بھی اسی لیے بلاء کہتے ہیں اور چونکہ اللہ سبحانہٗ کی آزمائش کبھی تکلیف سے اور کبھی راحت و خوشی سے اس لیے انعام کو بھی بلاء اور تکلیف کو بھی بلاء کہتے ہیں۔ قرآن میں ہے بلونا ھم بالحسنات والسیئات ۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں بلینا بالضراء فصبرنا و بلینا بالسراء فلم نصبر۔ ابتلا و آزمائش کے دو مقصد ہوتے ہیں ایک یہ کہ امتحان لینے والا اس کی لیاقت و صلاحیت سے باخبر ہونا چاہتا ہے دوسرے یہ کہ لیاقت کا تو امتحان لینے والے کو علم ہوتا ہے

مگر اوروں کی نظر میں اس کے کمال کی نمائش منظور ہوتی ہے۔ یہاں ابتلاء سے مقصود حضرت ابراہیم کے کمال کا ظاہر کرنا ہے۔ قرآن نے لفظ رب لاکر اس طرف اشارہ کردیا کہ یہ امتحان اللہ تعالیٰ کی ربوبیت سے تعلق رکھتا ہے جس کے معنے یہ ہیں کہ ابراہیم کو یکے بعد دیگرے اللہ نے اس طرح کے حالات کے مطابق نشوونما دی کہ ابراہیم اپنے درجہ کمال کو پہنچ کر لوگوں کے سامنے نمودار ہوئے اور اللہ کی جانب سے حضرت ابراہیم کے ساتھ یہ سارا معاملہ محبت و شفقت کے ساتھ ہوا کیونکہ جو عمل محبت و شفقت کے عاطفہ سے خالی ہو ربوبیت نہیں ہو سکتا۔ گویا ابراہیمی کمالات کے مقررہ نظام کے تحت ظہور وشہود کو یہاں ابتلاء سے تعبیر کیا ہے۔

ربوبیت کا یہ مقررہ نظام کیا ہے جس کے ذریعے ابراہیم کے کمالات منظرِ عام پر آئے۔ قرآن نے اس کے لیے کلمات کی تعبیر اختیار فرمائی ہے۔ عام شارحین قرآن نے ان کی تشریح و تفسیر میں متعدد خیالات پیش کیے ہیں۔ اور علامہ آلوسی نے ان خیالات کی تعداد ۱۳ بتائی ہے۔

دراصل اللہ سبحانہ نے ابتداء ہی سے حضرت ابراہیم کا نظامِ تربیت کچھ اس طرح مقرر فرمایا کہ بچپن ہی میں رُشد و صلاحیت کی نمائش شروع ہوگئی تھی۔ رُشد کے مرتبہ سے گزر کر نبوت کے درجہ تک پہنچے اور مرتبۂ نبوت سے گزر کر مقامِ خلت پر جا پہنچے۔ رُشد و نبوت اور خلت کے مقامات سے گزر جانے پر اللہ کے مقررہ نظامِ ربوبیت کا تقاضا ہوا کہ ابراہیم کے فضل و کمال کی ملائکہ عِلوی اور سفلی میں نمائش ہو اور ابراہیم کا جلوہ حسن منظرِ عام پر آئے۔ اس کے لیے اللہ نے ایسے ہی چند کلمات کو منتخب فرمایا جیسے آدم کے فضل و کمال کو ظاہر کرنے کے لیے اَسماء کو انتخاب فرمایا تھا کیونکہ اللہ کی یہ سنت ہے کہ محض اپنے علم کی بنا پر اس وقت تک کسی کو کوئی منصب اور مقام نہیں عطا فرماتے جب تک اس کے فضل و کمال کی علی رؤس الاشہاد نمائش نہ ہو جاتے۔ حضرت آدم کو مقامِ خلافت دینے کے لیے ان کے فضل و کمال کا مظاہرہ فرشتوں کے سامنے ہوا اور اَسماء کے ذریعے ہوا اور حضرت ابراہیم کے مقامِ امامت دینے کے لیے ان کے فضل و کمال کا مظاہرہ فرشتوں اور انسانوں کے سامنے ہوا اور کلمات کے ذریعے ہوا۔ اور جو فرق اَسماء و کلمات میں ہے وہی فرق آدم اور ابراہیم کی انسانی قدروں اور صلاحیتوں میں ہے۔ آدم کا دور دورِ مفردات ہے اور ابراہیم کی انسانی قدروں کا دور دورِ مرکبات ہے۔

یہ کلمات کیا ہیں؟ ہمارے پاس اس کے جاننے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ اس موضوع

پر اب تک جو کچھ کہا گیا ہے ان میں سے کسی ایک بات کو جزم و یقین کے ساتھ قرآن کی مراد نہیں کہا جا سکتا۔ حافظ ابنِ کثیر نے فیصلہ فرما دیا ہے کہ اس موضوع پر ہمارے سرمایۂ علمی میں کوئی بات بھی تاریخی ثبوت کی طاقت نہیں رکھتی ہے۔

۱۴۴ ہے۔ اور وہ ان سب باتوں میں پورا اُتر گیا۔ نہ تو قرآن نے کلمات کو متعین فرمایا ہے اور نہ یہ بتایا ہے کہ پورا اُترنے کی کیفیت کیا تھی بلکہ صرف یہ کہا ہے کہ حضرت ابراہیم نے دل و جان سے کمال مسرت و بشاشت کے ساتھ بغیر کسی کمی بیشی کے ان تمام کلمات کو بتمام و کمال پورا کر دکھایا جس سے ان کی علمی و عملی قوت کا کمال روح کی صفائی و نورانیت، ظاہر و باطن کی طہارت و نظافت خوب واضح ہو گئی۔ قرآن میں ان کی سیرت کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ روحانی زندگی کی سب سے بڑی قوت ان کی فضیلت ہے۔ اس فضیلت کی موجودگی نے ان کے لیے فتح و کامرانی کے دروازے کھول دیے تھے۔ دُنیا کے سارے سمندر اور پہاڑ اس کی راہ میں حائل ہو جائیں پھر بھی اس کی رفتار میں فرق نہ آئے گا۔ حوادث و واقعات اس پر قابو نہیں پا سکتے۔ احوال و ظروف اس پر غالب نہیں آ سکتے۔ افراد اور جماعتوں کی کوششیں اسے مسخر نہیں کر سکتیں۔ اس کے لیے ہر حال میں کامیابی ہے۔ اس کے لیے ہر گوشہ میں فتح مندی ہے، اس کے لیے ہر طاقت پر فرماں روائی ہے۔ وہ نبوت اور خلت سے گزر کر کلمات کی امتحان گاہ میں صرف اس لیے لائے گئے ہیں کہ سربلند ہوں۔

حضرت ابراہیم کا ظہور سرزمینِ دجلہ و فرات میں ہوا تھا۔ انہوں نے وہاں سے ہجرت کی اور کنعان یعنی شام میں آباد ہو گئے۔ تورات میں ہے کہ انہوں نے یہ علاقہ وحی سے منتخب کیا تھا۔ جب حضرت ابراہیم یہاں مقیم ہو گئے تو وقتاً فوقتاً ان کو اور بشارتیں ملتی رہی ہیں۔ ان تمام بشارتوں کا ماحصل یہ ہے کہ اللہ نے انہیں اُمتوں کا پیشوا، نسلوں کا مورث بنایا ہے

سب سے پہلی بات جو حضرت ابراہیم کی زندگی میں سامنے آتی ہے وہ روحانی صداقت اور مادی ترغیبات کا مقابلہ ہے لیکن حضرت ابراہیم کے علم و عمل اور وحیِ الٰہی کے فیضان نے وقت کی تمام مادی فضیلتوں کو مسخر کر لیا۔ ان کی زندگی سراسر قربانی ہی قربانی تھی۔ انہوں نے ہر محبوب چیز کو اللہ پر قربان کر دیا۔ حتیٰ کہ اپنی جان، اپنی اولاد، اپنے وطن اور اپنے اَملاک اور اپنے باپ کو بھی اللہ پر قربان کر دیا۔ درد و غم کی انتہا ہے مگر ابراہیم پر استقامت کی روح چھائی ہوئی ہے اور اس طرح چھائی ہوئی ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ درد و غم کے طوفان اُٹھ رہے ہیں لیکن حضرت ابراہیم کی استقامت و عزیمت سے ٹکرا کر رہ جاتے ہیں۔

قرآن کی معجزانہ بلاغت یہ ہے کہ وہ داستان سرائی نہیں کرتا۔ ایک جملے میں ابراہیم کی ساری زندگی کی طویل داستان کو سمیٹ کر دریا کو کوزے میں بند کر دیا اور فرمایا فاتمھن، ابراہیم نے ان کو پورا کر دیا۔

۳۴۲ھ۔ اللہ نے فرمایا کہ میں تجھے پوری انسانیت کی پیشوائی دینے والا ہوں یعنی اللہ نے ابراہیم کو پوری انسانی زندگی میں سارے عالم کے روحانی اقدار میں قیادت کا منصب مرحمت فرمایا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تمام انبیاء تیری متابعت پر چلیں گے[1] اس میں حضرت ابراہیم کو پوری انسانیت کی امامت کی بشارت دی گئی ہے۔ امام اسے کہتے ہیں جس کی پیروی کی جائے تورایت میں یہ وعدۂ امامت ان الفاظ میں ملتا ہے۔

"اور میں تجھ کو ایک بڑی قوم بناؤں گا۔ تجھ کو مبارک اور تیرا نام بڑا کروں گا اور تو ایک برکت ہوگا اور ان کو جو تجھے برکت دیتے ہیں برکت دوں گا اور ان کو جو تجھ پر لعنت کرتے ہیں لعنت کروں گا اور دُنیا کے سارے گھرانے تجھ سے برکت پائیں گے (پیدائش ۱۲ : ۲، ۱)

پورے عالم کی دینی قیادت و امامت آج تک آپ کے حصے میں چلی آرہی ہے اور اسلام کے سوا دوسرے مذاہب یعنی یہودیت و نصرانیت وہ آپ کی امامت پر متفق و متحد ہیں۔ ایک نامور انگریز فاضل بیسویں صدی کے ثلثِ اوّل میں آپ کا تعارف ان الفاظ میں کراتا ہے۔ ابراہیم کی ہستی کسی بدوی سردار کی نہ تھی۔ ان کی اصلی اہمیت مذاہب کے دائرے میں ہے وہ فی الواقع مورثِ اعلیٰ کسی نسل کے نہیں، وہ امامِ ربّانی مذہبی تحریک کے تھے۔ محمدؐ کی طرح جو ان کے دو ہزار سال بعد پیدا ہوئے وہ سامی اور قبیلوں کے رہنما کی حیثیت رکھتے تھے اور توریت کی روایت کے مطابق وہ اسرائیلی مذہب کے بانی تھے۔ (انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا ج ا ص ۲) یورپ کی زبان سے اللہ کے حبیب اور اللہ کے خلیل کے درمیان مماثلث کا یہ اعتراف بڑی بات ہے[2]

لیکن اس حسن کے ساتھ جو لطیف طریق پر یورپ کے اس اسلام دشمن نے خاص انجکشن لگایا ہے وہ اس حسن سے زیادہ خطرناک ہے یعنی یہ کہ وہ مورثِ اعلیٰ کسی خاص نسل کے نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ حضرت ابراہیم سے محمد رسول اللہ اور ان کے خاندان کا کوئی نسلی تعلق نہیں ہے۔ یہ ان لوگوں کا خاص کمال یا ان کے ہاتھ کی صفائی ہے کہ اپنی تحریروں میں زہر کی ایک

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۲۳ [2] تفسیر ماجدی ص ۴۸

خاص مقدار رکھتے ہیں اور اس کا اہتمام کرتے ہیں کہ وہ تناسب سے بڑھنے نہ پائے اور پڑھنے والے کو متنفر اور بدگمان نہ کر دے۔ ان کی تحریریں زیادہ خطرناک ہوتی ہیں اور ایک متوسط آدمی کا ان کی زد سے بچ کر نکل جانا مشکل ہے۔ ابو بکر الجصاص رازی نے اس سے یہ فقیہانہ نکتہ آفرینی کی ہے کہ دین کی زندگی میں احکام کی تعمیل کا اس آیت سے سبق ملتا ہے کیونکہ امام کہتے ہیں اسے جس کی دین کی زندگی میں اقتدا کی جائے۔ امام کے امام ہونے کے لیے اہتمام یعنی اقتدا ضروری ہے۔ دینی زندگی کا ہر داعی مقامِ امامت میں ہے درجات کے لحاظ سے اگرچہ اونچا درجہ انبیاء کا ہے لیکن انبیاء کے صدقہ میں خلفاء، علماء اور عدلیہ میں بیٹھ کر فیصلہ کرنے والے قاضی اور وہ تمام لوگ جن کی اقتدا ناگزیر ہے اپنے اپنے ظرف اور اپنی اپنی حیثیت کے مطابق آیت کے مفہوم میں داخل ہیں۔

حکیم الامت شاہ ولی اللہ نے دین کی زندگی میں امامت کے اسی تقاضے کے تحت غالباً ائمہ اربعہ کے بارے میں حافظ ابن حزم کو جواب دیتے ہوئے یہ مفید نصیحت لکھ دی ہے کہ ہمارا کسی فقیہ و مجتہد پر یہ ایمان نہیں ہے کہ اللہ نے اس پہ فقہ کی وحی فرمائی اور اللہ نے ہم پر اس کی طاعت فرض کی ہے اور یہ کہ وہ معصوم ہے۔ ہم اگر امام اجتہاد و فقہ کی اقتدا کرتے ہیں تو صرف اس فکر اور علم کے تحت کرتے ہیں کہ وہ اللہ کی کتاب اور اس کے رسولؐ کی سنت سے واقف ہیں اور بس[1]

۳۴۴ ـ ابراہیم نے عرض کیا کہ کیا میری اولاد سے بھی یہی وعدہ ہے۔ عالم کی پیشوائی اور بشارت پاکر حضرت ابراہیم کا دل قدرتی طور پر باغ باغ ہو گیا اور اس جوشِ مسرت میں یہ سوال کر دیا کہ اس بخشش و انعام میں میری نسل اور اولاد کا بھی حصہ ہے۔ ذریت کے معنے اولاد اور اولاد در اولاد کے ہیں۔ اس میں سارا سلسلۂ نسل آگیا اور یہ سلسلہ اسرائیلی اور اسماعیلی دونوں شاخوں کو شامل ہے[2]

گویا ابراہیم علیہ السلام نے یہ درخواست کی کہ میری ذریت میں سے بھی ائمہ بنائے جائیں، اس سے معلوم ہوا کہ مسرت و نعمت میں اپنی اولاد کو شریک کرنا نہ صرف طبعی ہے بلکہ سنتِ انبیاء بھی ہے اور حضرت ابراہیم کا بارگاہِ مولیٰ میں ادب ملاحظہ فرمائیے کہ مِن تبعیضیہ لاکر امامت

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ ص ۱۵۶ [2] تفسیر ماجدی

سوال ساری نسل کے لیے نہیں فرمایا بلکہ کچھ کے لیے فرمایا۔ کیونکہ سب کی امامت امکان سے خارج تھی۔ دُعا کے آداب و شرائط میں سے یہ بھی ہے کہ نہ نظامِ فطرت کے خلاف اللہ سے کچھ مانگے اور نہ نظامِ شریعت کے خلاف۔ اگر خلافِ سننِ الٰہی اور خلافِ شریعت کوئی اللہ سے کچھ مانگتا ہے تو یہ جنابِ الٰہی میں بے ادبی ہے۔

۳۴۴ہ ۔ فرمایا کہ میرا وعدہ ظالموں سے متعلق نہیں ہے۔ الجصاص نے لکھا ہے کہ اس اندازِ تعبیر کے ذریعے حضرت ابراہیم کو اولاد میں امامت ہونے کی بشارت دی ہے اور بشارت کے ساتھ یہ شرط لگا دی ہے کہ امامت تو تیری ہی نسل میں رہے گی لیکن یہ امامت صرف تمہاری نسل کی بنا پر نہیں بلکہ اس وقت ملے گی جبکہ تمہاری نسل سے ہونے کے ساتھ ظالم نہ ہو بلکہ عادل ہو یعنی ایمان اور عملِ صالح کی نعمت سے مالا مال ہو۔ اور اس میں اشارہ فرمادیا کہ نسلِ ابراہیم میں دونوں قسم کے لوگ ہوں گے کچھ صالح و مطیع اور کچھ ظالم و نافرمان۔ صالحین کو امامت کی بشارت مل گئی، اور ظالم اس سے محروم ہو گئے۔

بنی اسرائیل اس پر بہت مغرور تھے کہ ہم اولادِ ابراہیم میں ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم سے وعدہ کیا ہے کہ نبوت و بزرگی تیری اولاد میں رہے گی اور ہم حضرت ابراہیم کے دین پر ہیں اور ان کے دین کو سب مانتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو سمجھایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا جو وعدہ تھا وہ ان سے تھا جو نیک راہ پر چلیں۔ اس آیت میں ان کے اس شبہ کو دُور کیا کہ بنی اسرائیل اپنے کو سارے عالم کا امام اور متبوع اور سب سے افضل سمجھ کر کسی کی اتباع نہ کرتے تھے[1]

مطلب آیت کا یہ ہے کہ یہ وعدہ تمہاری اولاد کے اس حصے سے تعلق رکھتا ہے جو صالح ہو ان میں سے جو ظالم ہوں گے ان کے لیے یہ وعدہ نہیں ہے اس سے یہ بات خود بخود ظاہر ہو جاتی ہے کہ گمراہ یہودی اور مشرک بنی اسماعیل اس وعدے کے مصداق نہیں ہیں[2]

پچھلے دس رکوعوں میں بنی اسرائیل کو خطاب کر کے قدم قدم پر یہ جتایا ہے کہ تم ظالم ہو وانتم ظالمون ۵۱ ، ظلمتم انفسکم ۵۴، ولکن کانوا انفسھم یظلمون ۵۷، الذین ظلموا ۵۹ ، وانتم ظالمون ۹۲، واللہ علیم بالظالمین ۹۵، من اظلم من منع ۱۱۴۔ گویا ان کی تاریخی فردِ جرم سرتاسر ظلم ہی ہے۔ اب ان کو بتایا ہے کہ تم ابراہیم کی نسل سے ضرور ہو لیکن اپنے ظلم کی وجہ

---

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۲۴ [2] تفہیم القرآن ج ص

سے اب منصبِ امامت کے اہل نہیں رہے لہٰذا انہیں امامت کے منصب سے معزول کیا جاتا ہے اور اب ذریتِ ابراہیم کی اس شاخ کو یہ امامت سپرد کی جاتی ہے جس سے محمد رسُول اللہ کا تعلق ہے۔

فقہا نے اس آیت سے یہ مسئلہ نکالا ہے کہ امام کے لیے ضروری ہے کہ عدل و احسان اور فضل کے زیور سے آراستہ ہو۔ ظالم و فاسق امامت کا اہل نہیں ہے۔ قرطبی نے خویز منداد کے حوالہ سے بتایا ہے کہ ظالم نہ خلیفہ ہو سکتا ہے نہ حاکم نہ مفتی نہ نماز کا امام، نہ اس کی روایت قابلِ قبول نہ اس کی شہادت قابلِ پذیرائی۔

لفظ ظالم ایک لفظِ مشترک ہے۔ شرک پر بھی ظلم بولا گیا ہے ان الشرك لظلم عظيم اور کفر کو بھی ظلم کہا گیا ہے والكافرون هم الظلمون اور فسق پر بھی اس کا اطلاق ہوا ہے۔ فانزلنا على الذين ظلموا رجزا من السماء بما كانوا يفسقون جن لوگوں نے امامت سے مراد قیادت و زعامت لی ہے۔ انہوں نے قیادت کی ہر نوع کے لیے یہ شرط لگائی ہے کہ اس کا دامن شرک کفر اور فسق کی آلودگیوں سے داغدار نہ ہو۔ لیکن علامہ آلوسی فرماتے ہیں کہ آیت میں ظلم کی فرد کامل ہے یعنی کفر و شرک۔ اس لیے اس آیت سے فاسق کی امامت کے عدمِ جواز پر استدلال نہیں ہو سکتا۔ الجصاص نے اس پر طول طویل بحث کی ہے۔ ان کا دعویٰ یہ ہے کہ آیت بتا رہی ہے کہ اسلامی زندگی میں ہر وہ شخص جو مقامِ قیادت میں ہو اس کے لیے بنیادی شرط یہ ہے کہ اس میں عدالت اور صلاحیت ہو۔ ان کے خیال میں آیت میں عہد سے مراد اللہ کی جانب سے آئی ہوئی اوامر و نواہی کی صورت میں قانونی ذمہ داریاں ہیں۔ اگر ایک شخص اپنی زندگی میں ان قانونی ذمہ داریوں کی پابجائی نہیں کرتا تو وہ ظالم ہے۔ اور ظالم کو منصبِ قیادت نہیں مل سکتا۔ نہ وہ حاکم ہو سکتا ہے نہ وہ شہادت کا اہل ہے اور نہ اس کی روایت قابلِ قبول ہے۔ نہ مفتی ہونے کی حیثیت میں اس کے فتویٰ کو پذیرائی ہے اور نہ اسے نماز میں امامت کی اجازت ہے [1]

یہ اسلامی سیاسیات کا اہم مسئلہ ہے۔ اس کے تفصیلی مباحث کا یہ محل نہیں ہے۔ اجمالاً عرض کرتا ہوں کہ اسلام نے اس موضوع پر نظامِ عمل یہ مقرر کیا ہے کہ امامت خواہ زندگی کے کسی شعبہ سے متعلق ہو اس کے لیے امام کے انتخاب کا حق اُمت کو ہے اور اس انتخاب میں

---

[1] احکام القرآن ج ا ص ۸۰

اُمت کا فرض ہے کہ جسے منتخب کیا جائے وہ ظالم نہ ہو بلکہ صالح اور عادل ہو۔ لیکن اگر اُمت کو انتخاب کا موقع نہ ملے اور کوئی شخص خود ہی طاقت کے زور سے امامت پر قبضہ کر لے اور اس کی حکومت جم جائے تو دونوں صورتوں میں مسلمانوں پر واجب ہے کہ اسی کو خلیفہ تسلیم کریں اور اس کے سامنے گردن جھکائیں صرف اس بنا پر اس سے روگردانی کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں ہے کہ نظام شرعی کے تحت اس کا انتخاب نہیں ہوا ہے۔ اگر اس بنا پر امامت تسلیم نہ کی جائے اور اس کے خلاف خروج کی اجازت دی جائے تو پھر دائمی کشت وخون، جنگ و قتال، دعووں میں تصادم، قوتوں میں تزاحم، ہمیشگی کی بدامنی، کبھی نہ ختم ہونے والی طوائف الملوکی اور انارکی، اُمت کی تباہی، ملکوں کی خرابی، جماعتی اختلال، احکام شریعت کا تعطل، مسلمانوں کے جان و مال کی بدامنی، اندرونی خانہ جنگی کی وجہ سے دشمنوں کا حملہ و تسلط اور اسی طرح کی بے شمار ہلاکتوں اور بربادیوں کا سیلاب اُمنڈ آئے گا۔ اس موضوع پر اُمت میں دو رائیں نہیں ہیں۔ اسلام مصالح کے امکان پر مفاسد کے وقوع کی اجازت نہیں دیتا۔ لیکن یہاں یہ سوال بے حد اہمیت رکھتا ہے کہ امامت قانونی ہو یا غیر قانونی۔ اس کے دامن میں اگر منکرات ہوں اور ظلم کا وجود پروان چڑھ رہا ہو تو حکم کیا ہے۔ ظالم کو ظلم سے منع کرنا، عدل و احسان کی تلقین کرنا یا حالات کے غلط بہاؤ میں خود بہہ جانا، یا پھر خاموش تماشائی بن جانا۔ اس موضوع پر حافظ ابن حزم نے الملل والنحل میں لکھا ہے کہ امام احمد بن حنبل کا مذہب یہ ہے کہ دل سے بُرا جانے لیکن امامت کے مقابلے میں خواہ ظالم ہی کیوں نہ ہو ظلم کو مٹانے کے لیے ہاتھ اُٹھانا جائز نہیں ہے۔ ابن حزم نے لکھا ہے کہ یہی بالاتفاق شیعہ کا بھی مذہب ہے۔ ہاں دوسرا طبقہ جس میں اہل سنت کا بھی ایک گروہ شامل ہے اور تمام معتزلہ اور خارجی اور زیدیہ سب کا مذہب یہی ہے کہ امامت کے دامن میں جب ظلم کا وجود رونما ہو تو اس کا ازالہ اسلامی فریضہ ہے اور ازالہ کی صورت اگر تلوار نکالنے کے سوا کوئی نہ ہو تو اس وقت طاقت کے زور سے ظلم کا ازالہ فرض ہو جاتا ہے بشرطیکہ باطل کے مقابلے میں کامیابی کا گمان غالب ہو لیکن ضعف کی وجہ سے اگر کامیابی کی توقع نہ ہو تو اس وقت طاقت سے ظلم کے ازالہ کی فرضیت ساقط ہو جاتی ہے۔ ابن حزم کا بیان ہے کہ امام ابو حنیفہ، امام مالک، امام شافعی کا یہی مذہب ہے اور اسی کو ترجیح دی ہے۔ اہل سنۃ میں فقہی طور پر اس مسئلہ کو امام ابو حنیفہ نے منقح کیا ہے۔ اسی لیے ان پر محدثین نے تعجب کا اظہار بھی کیا۔ لیکن بقول الجصاص کہ ان ہی کمزوریوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ فساق و فجار کے ہاتھوں میں امامت چلی گئی اور پھر کفار نے حکومت چھین لی۔ مسلمانوں کی حکومت کمزور ہو گئی۔ مسلمانوں کی آبادیاں کھنڈر بن گئیں، دین بھی رخصت

وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا ؕ وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ
اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ؕ وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ
لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ﴿۱۲۵﴾

اور دیکھو ہم[۳۴۵] نے اس گھر کو لوگوں کے لیے مرکز[۳۴۶] اور امن[۳۴۷] کی جگہ قرار دیا تھا اور لوگوں کو حکم دیا تھا کہ ابراہیم کے کھڑے ہونے کی جگہ کو ہمیشہ کے لیے نماز کی جگہ بنا لو اور ابراہیم و اسماعیل[۳۴۸] کو حکم دیا تھا کہ میرے اس گھر کو طواف، اعتکاف، رکوع و سجود کرنے والوں کے لیے ہمیشہ[۳۴۹] پاک رکھنا۔

ہو گیا اور دُنیا بھی ختم ہو گئی۔ زندقہ، الحاد، بے دینی، خیالات میں انتہا پسندی، مجوسی عقائد، بابک خرمی کے نظریات اور مزدک مشہور اشتراکی کے ہم نوا دُنیا پر چھا گئے[له]

مرکزِ دعوت

تبدیلِ امامت کا اعلان ہونے کے ساتھ ہی قدرتی طور پر تحویلِ قبلہ کا اعلان ہونا بھی ضروری تھا۔ جب تک بنی اسرائیل کی امامت کا دور تھا۔ بیت المقدس مرکزِ دعوت رہا اور وہی قبلۂ اہلِ حق بھی رہا۔ خود نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے پیرو بھی اس وقت تک بیت المقدس ہی کو قبلہ بنائے رہے مگر جب بنی اسرائیل اس منصب سے باقاعدہ ہٹا دیے گئے تو بیت المقدس کی مرکزیت آپ سے آپ ختم ہو گئی۔ اور چونکہ توفیقِ الٰہی نے پیروانِ دعوتِ قرآن کو خدمتِ حق کے لیے چن لیا ہے اور اقوامِ عالم کی ہدایت کا سررشتہ ان کے سپرد کیا جا رہا ہے اس کے لیے ضروری تھا کہ پہلے دعوتِ قرآن کے ظہور کی معنوی تاریخ بیان کر دی جائے۔ چنانچہ یہاں معبدِ کعبہ کی تعمیر اور حضرت ابراہیم کی دُعا

له احکام القرآن ج ۲ ص ۲۴۷

کا ذکر اسی تقریب میں آیا ہے کہ آنے والے بیان کے لیے ایک قدرتی تمہید بن جائے۔

۳۴۵ ھ ۔ ہم نے اس گھر کو اصل ارشاد میں لفظ بیت آیا ہے۔ بیت کے لفظی معنی اس گھر کے جہاں رات بسر کی جائے البیت سے متنفقہ طور پر بیت الحرام یا خانہ کعبہ مراد ہے۔ شہر مکہ کے اندر کی یہ عمارت روئے زمین پر خدائے واحد کی عبادت کا قدیم ترین مکان ہے اور قرآن نے اس حقیقت کا اعلان کھلے لفظوں میں کر دیا ہے۔ مسیحیت کو کعبہ کی تقدیس کے ساتھ کعبہ کی یہ قدامت بھی بہت شاق ہے لیکن انکار قدامت پر کوئی دلیل ہر ممکن کوشش کے باوجود آج تک قائم نہ ہو سکی بلکہ انیسویں صدی عیسوی کے ربع آخر میں انگریز مصنف باسورتھ سمتھ کو لکھنا پڑا۔ یہ وہ معبد ہے جس کی قدامت عہدِ تاریخ سے پرے ہے (محمد اینڈ محمدنزم ص ۱۶۶) پھر آگے مشہور قدیم رومی مورخ جس کا زمانہ خود حضرت مسیح سے ایک صدی قبل کا ہے اس کے حوالہ سے لکھا ہے کہ اس وقت بھی یہ معبد قدیم ترین تھا اور ساری نسلِ عرب کا نہایت مقدس مرجع تھا[1]

پولوس پال ایک خط میں جو گلیتوں کے نام ہے لکھتا ہے کہ :

> یہ لکھا ہے ابرہام کے دو بیٹے تھے۔ ایک لونڈی ہاجرہ سے دوسرا آزاد سارہ سے پھر وہ جو لونڈی سے تھا جسم کے طور پر پیدا ہوا اور جو آزاد سے تھا سو وعدہ کے طور۔ یہ باتیں تمثیلی بھی مانی جاتی ہیں اس لیے کہ یہ عورتیں دو عہد ہیں ایک تو سینا پہاڑ پر سے جو ہوا وہ نرے منتجی ہیں۔ یہ ہاجرہ ہے کیونکہ ہاجرہ عرب کا کوہ سینا ہے اور اب کے یروشلم کا جواب ہے اور بھی اپنے لڑکوں کے ساتھ غلامی میں ہے۔ پر اوپر کا یروشلم آزاد ہے (گلیتوں کے نام ۲۲، ۲۶ باب ۴)

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسیحیت کا بانی پولوس بھی اس معبد سے واقف تھا کہ یروشلم اور بیت اللہ (یا عرب کا کوہ سینا) ایک دوسرے کا جواب ہیں۔ اب کے یروشلم سے ظاہر ہوتا ہے کہ یروشلم نیا ہے اور بیت اللہ پرانا۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دونوں عورتیں دو عہد کا نام ہیں یعنی ان کی اولاد کے متعلق اللہ نے دو وعدے کیے تھے۔ ہاجرہ کا وعدہ کوہ سینا پر ہوا تھا جب وہ حضرت ابراہیم کے ساتھ مصر سے آرہی تھیں اور راستہ میں کوہ سینا پڑتا تھا۔ اس وعدہ کے مطابق ہاجرہ کی غلام اولاد نے عرب میں عبادت کا ایک گھر بنایا تھا۔ اور یہ غلام اس پرانے مرکزی گھر کے

---

[1] تفسیر ماجدی ص ۴۸

متولی ہو گئے۔ یہ گھر بعد کو بنی اسرائیل کے نزدیک ان کے نئے مرکزی عبادت گاہ بیت المقدس کا پورا جواب تھا۔[1]

ف ۳۴۶ ۔ لوگوں کے لیے مرکز اصل عربی میں مثابۃً آیا ہے اور ظرف کے معنے میں استعمال ہوا ہے۔ مصدری معنے کسی چیز کا اپنی اصلی حالت کی یا حالتِ مقصودہ کی طرف لوٹ کر آنا۔ اور جب لوگ کسی مقام کی طرف لوٹتے ہیں تو اس مقام کو مثابۃ کہا جاتا ہے۔ اصل لفظ مثاب ہے ۃ اس میں مبالغہ کے لیے لگا دی گئی ہے جیسے علامۃ اور نسابۃ۔ گویا مثابۃً کے معنے ہیں وہ مقام جس کی طرف انسان بار بار پلٹ کر آئے اور پھر بھی جی نہ بھرے۔ یہ معنے ابنِ عباس، مجاہد سے منقول ہیں۔ اور بیت اللہ کا یہ وصف تو نگاہوں کے لیے ایک دلکش نظارہ ہے، لوگ حج پر حج اور عمرہ پر عمرہ کرتے جاتے ہیں اور اس سے اکتاتے نہیں ہیں۔ صرف حجاز یا ملکِ عرب ہی کے ہر حصے سے نہیں بلکہ روئے زمین کے ہر خطہ اور ہر علاقے سے زمانۂ ابراہیم یعنی تقریباً چار ہزار سال سے قائم ہے۔

ف ۳۴۷ ۔ اور امن کی جگہ قرار دیا۔ یہ مامونیت صرف عمارتِ کعبہ یا مسجدِ حرام سے خاص نہیں بلکہ تمام حرم کا حکم یہی ہے۔ حرم وہ علاقہ ہے جہاں انسان کی جان تو درکنار جانور تک شکار جائز نہیں ہے۔ قرآن کی دوسری آیات سے اس کی تشریح ہوتی ہے۔ مثلاً قربانی کے بارے میں حکم ہے کہ اگر حالتِ احرام میں شکار کیا تو دو معتبر آدمیوں سے اس کی قیمت لگوائیے پھر اسی قیمت کا جانور خرید کر مثلاً گائے، بکری وغیرہ کعبہ کے پاس یعنی حرم میں پہنچا کر ذبح کرے۔ قرآن میں ہے

هدياً بالغ الكعبة　　　قربانی کا جانور بطورِ نیاز کعبہ میں پہنچایا جائے۔

آیت میں کعبہ آیا ہے لیکن مراد حرم ہے کیونکہ کعبہ اور مسجد میں قربانی نہیں کی جاتی ہے۔

ایسے ہی قرآن میں ہے:

انما المشركون نجس فلا يقربوا المسجد الحرام

مشرکین ناپاک ہیں مسجد حرام کے قریب نہ جائیں۔

اس آیت میں مسجدِ حرام سے علاقہ حرم ہی مراد ہے۔ قرآن ہی میں پورے شہر کو امن گاہ کہا ہے۔ اجعل هذا بلدا آمناً

---

[1] سیرۃ النبی ص ۱۵۴

اس آیت میں جو بات فرمائی گئی ہے اس کا درجہ صرف خبر کا نہیں ہے بلکہ یہ اللہ کی جانب سے حکم ہے اور مطلب یہ ہے کہ حرم کا علاقہ امن گاہ ہے۔ اس میں ہر شخص کو بلکہ ہر جاندار کو مامون ہونا چاہیے۔ کسی کی جان سے اس علاقہ میں کھیلنا درست نہیں ہے۔ الجصاص نے لکھا ہے کہ حرم کا یہ تقدس زمانۂ ابراہیم سے آج تک قائم ہے۔ اس کے تفصیلی مباحث انشاء اللہ سورۂ مائدہ میں آئیں گے۔ یہاں بطورِ خلاصہ صرف یہ معلوم کر لیجئے کہ

زمانۂ جاہلیت میں بھی عربوں کے ہاتھ میں ملتِ ابراہیمی کے جو کچھ آثار باقی رہ گئے تھے، ان میں یہ بھی تھا، حرم میں اپنے باپ اور بھائی کا قاتل بھی کسی کو ملتا تو انتقام نہیں لیتے تھے۔ اور عام جنگ و قتال کو بھی حرم میں حرام سمجھتے تھے۔ شریعتِ اسلام میں بھی یہ حکم اسی طرح باقی رکھا گیا۔

دو مسئلے یہاں مزید ہیں۔ ایک یہ کہ اگر کوئی شخص حرم کے اندر ہی کوئی ایسا جرم کرے جس پر حد و قصاص اسلامی قانون کی رُو سے عائد ہوتا ہو تو حرم ایسے شخص کو امن نہیں دے سکتا۔ بلکہ اس پر باجماعِ اُمّت حد و قصاص نافذ ہوگی۔ دوسرا یہ کہ اگر کوئی شخص باہر سے جرم کر کے پناہ لے لے تو اس کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے گا۔ اس میں بعض آئمہ اس پر بھی حدودِ حرم میں حد و قصاص نافذ کرنے کا حکم دیتے ہیں۔ اور امام اعظم ابوحنیفہ کے نزدیک اس کو حدودِ حرم میں تو سزا نہ دی جائے گی لیکن اسے سزا کے بغیر بھی نہ چھوڑا جائے گا۔ اسے مجبور کیا جائے گا کہ وہ حرم سے باہر نکلے۔ وہاں سے نکلنے کے بعد اسے سزا دی جائے گی[1]

اور لوگوں کو حکم دیا تھا کہ ابراہیم کے کھڑے ہونے کی جگہ ہمیشہ کے لیے نماز کی جگہ بنالو۔ یہ فقرہ بھی پہلے کے ساتھ ہی ہے اور مطلب یہ ہے کہ ہم نے بیت اللہ کو لوگوں کے لیے مرکز اور امن گاہ مقرر کیا تھا اور ہم نے اسی وقت یہ بھی کہہ دیا تھا کہ ابراہیم کے کھڑے ہونے کی جگہ کو نماز کی جگہ بناؤ۔ یہاں عبارت سے یہ فقرہ کہ ہم نے کہہ دیا تھا۔ اصل ارشاد میں ہٹا دیا گیا ہے اور اس لیے ہٹایا گیا ہے کہ زمانۂ نزولِ قرآن میں مخاطبوں میں سے ہر ایک قرآن کے قاری اور سامع کے ذہن میں ماضی کا استحضار ہو جائے گویا فنی طور پر ماضی کو حاضر بنا کر پیش فرمادیا۔ یہ اندازِ تعبیر زیادہ موثر ہے۔ اس سے مخاطب یہ تاثر لیتا ہے کہ اس حکم کی آغوش میں ہمارا بھی

---

[1] معارف القرآن م ش ص ۲۶۵

وہی مقام ہے جو حضرت ابراہیم کے اوّلین مخاطبوں کا ہے اگر اس فقرے کا مسلمانوں کو مخاطب بنایا جائے تو بات صرف مسلمانوں تک رہ جائے گی اور جو مطلب میں نے عرض کیا ہے اس صورت میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ اُس وقت بھی یہ حکم تھا اور آج بھی یہی حکم ہے۔ مقام ابراہیم کیا ہے؟ یہ قیام سے ظرف مکان ہے۔ اس کی تعیین میں اختلاف ہے۔ عبداللہ بن عباس، مجاہد اور عطاء کہتے ہیں کہ اس سے حرم کا پورا علاقہ مراد ہے۔ اور اس سے مراد وہ پتھر بھی لیا گیا جس پر حضرت ابراہیم کے قدم مبارک کا بطور اعجاز نشان پڑ گیا تھا اور جس کو بیت اللہ کی تعمیر کے موقعہ پر آپ نے استعمال کیا۔
مقام ابراہیم کو مصلّی بنانے کا مطلب خود حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عمل سے حجۃ الوداع میں یہ بتایا ہے کہ آپ نے طواف سے فراغت کے بعد اس جگہ دو رکعت نماز پڑھی جہاں وہ پتھر تھا اور قرآن کی یہی آیت تلاوت فرمائی۔ اس سے معلوم ہوا کہ طواف کے بعد دو رکعتیں ادا کرنا مقام ابراہیم کو مصلّی بنانا ہے۔ اگر مصلّی بنانے کا یہی مطلب ہے تو بلا شبہ طواف کی دو رکعتیں واجب ہیں۔ لیکن ان دو رکعتوں کا مقام ابراہیم پر ادا کرنا سنت ہے اگر وہاں ادا نہ کر سکے تو پھر حرم کے علاقہ میں جہاں چاہے ادا کرے۔

۳۴۸۔ اور ہم نے ابراہیم و اسماعیل کو حکم دیا تھا۔ حضرت اسماعیل حضرت ابراہیم کے فرزند اکبر ہیں۔ مستشرقین کو حضرت اسماعیل کا ذکر حضرت ابراہیم کے ساتھ پسند نہیں ہے۔ کبھی وہ اپنے مخاطبوں کو یہ کہہ کر بھلاتے ہیں کہ ابراہیم کسی نسل کے مورث اعلیٰ نہیں ہیں اور کبھی اسماعیل کی والدہ ہاجرہ کو کنیز بنا کر ان کی کمزوری دکھلاتے ہیں۔ اور کبھی یہ کہہ کر لوگوں کو دھوکا دیتے ہیں کہ قرآن کی مکی سورتوں میں اسماعیل کا ابراہیم کے ساتھ کوئی رشتہ نظر نہیں آتا۔

حضرت اسماعیل کی والدہ کنیز نہیں

یاد رکھئے حضرت ابراہیم ۲۰۷۴ء قبل مسیح میں پیدا ہوئے۔ آپ کی عمر توریت میں ۱۷۵ سال بتائی گئی ہے۔ آپ کے بارہ فرزند ہوئے اور ان سے بارہ نسلیں چلی ہیں۔ توریت میں ان بارہ فرزندوں کے نام درج ہیں اور یہ تصریح ہے کہ یہ اپنی اُمتوں کے بارہ رئیس تھے۔ عرب کا مشہور عالی نسب قبیلہ قریش آپ کی ہی نسل ہے اس لیے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضرت اسماعیل مورث اعلیٰ ہیں۔

حضرت اسماعیل کی والدہ کا نام ہاجرہ ہے۔ یہ لفظ اصل میں عبرانی لفظ "ہاغار" ہے جس کے معنے بیگانہ اور اجنبی کے ہیں۔ اصل میں ان کا وطن مصر ہے۔

بنی اسرائیل کہتے ہیں کہ ہاجرہ سارہ کی لونڈی تھیں اس لیے بنی اسرائیل اونچی ذات کے اور بنی اسماعیل نیچی ذات کے ہیں۔ بنی اسماعیل بنی اسرائیل کے برابر نہیں۔ اونچ نیچ کا مسئلہ بنانے اور بنی اسماعیل پر بنی اسرائیل کی مصنوعی برتری ثابت کرنے کے لیے ہاجرہ کے کنیز ہونے کا افسانہ بنایا گیا ہے۔ ذرا غور فرمایئے کہ مصر میں حکمران قوت عرب کی ایک سامی قوم تھی جس سے حضرت ابراہیم کے نہایت قریبی نسبی تعلقات تھے۔ لفظ ہاجرہ کا عبرانی ہونا بھی اس کی ایک مستحکم دلیل ہے۔ اس بنا پر فرعون کا ہاجرہ کو حضرت ابراہیم کی خدمت میں دینا خود اس بات کی قوی دلیل ہے کہ درحقیقت اس ازدواج سے نسبی تعلق کا استحکام مقصود تھا۔ اس تاریخی حقیقت کی یہودی روایات سے تصدیق ہوتی ہے۔ سفر الیشار، جو یہودیوں کی ایک معتبر تاریخ ہے۔ اس میں تصریح ہے کہ حضرت ابراہیم کے زمانہ میں مصر کا بادشاہ حضرت کا ہم وطن تھا۔ توراۃ کا ایک مفسر تکوین ۱۶-۱ کی تفسیر میں لکھتا ہے:

> ہاجرہ فرعون کی بیٹی تھی۔ فرعون نے جب سارہ کی کرامات دیکھیں تو کہا کہ اس کے گھر میں لونڈی بن کر رہنا دوسرے کے گھر میں بی بی بن کر رہنے سے بہتر ہے۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ بڑی بیوی ہونے کی حیثیت سے وہ سارہ کی خادمہ تھیں اور یہ خود ہماری حدیث کی کتابوں میں بھی مذکور ہے۔ چنانچہ صحیح بخاری میں ہے واخدمہا ھاجرۃ سارہ حضرت ابراہیم کی پہلی بیوی تھیں مگر ان سے کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی۔ الیعزر نام ایک دمشقی خانہ زاد گھر کا مالک تھا۔ حضرت ابراہیم نے فرزند کے لیے اللہ سے دعا مانگی، مقبول ہوئی اور حضرت ہاجرہ حاملہ ہوئیں۔ سارہ کو یہ دیکھ کر رشک ہوا اور وہ ہاجرہ کو ستانے لگیں۔ ہاجرہ نے گھر چھوڑ کر کہیں اور جانے کا ارادہ کیا۔ وہ ایک چشمہ تک جو شور کی راہ میں واقع ہے آکر ٹھہر گئیں۔ اس وقت ایک فرشتہ نے ہاجرہ کے سامنے آکر کہا۔

> ہاجرہ اپنی بی بی کے گھر واپس جا۔ میں تیری نسل کو اتنا بڑھاؤں گا کہ وہ کثرت سے گنی نہ جائے گی۔ تو حاملہ ہے، تو ایک بیٹا جنے گی تو اس کا نام اسماعیل رکھنا کہ خدا نے تیرا دکھ سنا۔ وہ ایک بدو آدمی ہوگا اس کے سب خلاف اور سب کا ہاتھ اس کے خلاف ہوگا۔ وہ اپنے سب بھائیوں کے سامنے سکونت کریگا۔ (تکوین ۱۶-۱)

یہ مقام جہاں کنواں واقع تھا قادش اور برد کے درمیان ہے۔ ہاجرہ نے اس کوئیں کا نام زندہ نظر آنے والا کنواں رکھا۔ گھر واپس آکر ہاجرہ کے بیٹا ہوا اور حسب تعلیم الٰہی اس کا نام اسماعیل

رکھا گیا۔ اس وقت حضرت ابراہیم کی عمر ۸۶ برس تھی۔ اسماعیل عبرانی میں شماع ایل ہے۔ شماع (سماع) سننا اور ایل اللہ۔ لفظی معنے خدا کا سننا۔ اللہ نے چونکہ ابراہیم کی دُعا اور ہاجرہ کی فریاد سُنی اس لیے بچہ کا نام شماعیل رکھا گیا۔ حضرت ابراہیم نے اللہ کے حضور دعا کی کہ اے کاش اسماعیل تیرے حضور زندہ رہے۔

اللہ سبحانہٗ نے جواب دیا کہ

اسماعیل کے حق میں میں نے تیری سنی۔ دیکھ میں اسے برکت دوں گا۔ اسے برومند کروں گا اور اس کو بہت بڑھاؤں گا اور اس سے بارہ سردار پیدا ہوں گے اور میں اس کو بڑی قوم بناؤں گا۔ ۱۸-۲۰) [1]

اس موضوع پر مولانا عنایت رسُول چڑیاکوٹی کا رسالہ النصوص الباہرہ فی حریت ہاجرہ، بہترین ہے۔

علمی بددیانتی

اس وقت میرے پیشِ نظر دائرہ المعارف الاسلامیہ ہے۔ اس میں جس دیدہ دلیری سے حضرت اسماعیل کو حضرت ابراہیم سے توڑنے کی ناپاک کوشش کی گئی ہے وہ علمی بددیانتی کی بدترین مثال ہے۔

اس جگہ حضرت اسماعیل کا بناء کعبہ میں حضرت ابراہیم کے ذکر برداشت نہ کر سکے۔ دائرۃ المعارف کے مصنفین نے ونسنک کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ سب سے پہلے اسپر نگر نے یہ دعویٰ کیا کہ قرآن میں ایک عرصہ تک حضرت ابراہیم کی شخصیت کعبہ کے بانی اور دینِ حنیف کے ہادی کی حیثیت سے روشنی میں نہیں آئی، البتہ عرصہ دراز کے بعد ان کی شخصیت کو ان صفات کے ساتھ ظاہر کیا گیا ہے۔ اور ان کی ذات کی خاص اہمیت نظر آتی ہے چونکہ یہ دعویٰ اپنی اجمالی تعبیر کے لحاظ سے ابھی تشنہ تکمیل تھا اس لیے ایک طویل زمانے کے بعد اسپر نگر کے اس دعوے کو سنوک ہیکر ونفہیہ نے بڑے شرح وبسط سے پیش کیا۔ اس نے کہا کہ قرآن پاک میں جس قدر مکی آیات ہیں ان میں کسی ایک مقام پر اسماعیل کا ابراہیم کے ساتھ رشتہ نظر نہیں آتا۔ ان کے تذکرے میں ایک آیت بھی ایسی نہیں ملتی جو ان کو مؤسس کعبہ

---

[1] ارض القرآن ج ۲ ص ۴۰ تا ۴۱

اسماعیل کا باپ عرب کا پیغمبر ظاہر کرتی ہو۔ البتہ جب محمد کی مدنی زندگی شروع ہوتی ہے تو مدنی سورتوں میں حضرت ابراہیم کے ذکر کے وقت یہ تمام خصوصیات نمایاں ہوتی ہیں۔[1]

یہ ہے وہ دعویٰ اور اس کی دلیل جو ان مستشرقین کی جانب سے صرف اس لیے بنائی گئی ہے کہ اس قسم کی لچر بنیادوں پر مسیحیت کی برتری کی عمارت قائم کی جائے اور حضرت ابراہیم کے بارے میں یہ ثابت کیا جا سکے کہ ان کا عرب کے ساتھ نہ نسلی تعلق ہے اور نہ دینی۔ لیکن جب ایک مورخ اور نقاد ان کے اس دعویٰ پر پیش کردہ دلائل کو صرف تاریخی اور تنقیدی حیثیت سے دیکھتا ہے تو یہ حقیقت بے نقاب ہو کر سامنے آجاتی ہے کہ جو گھروندا بنایا گیا ہے اس کی بنیاد حقائق و واقعات پر نہیں بلکہ عداوت اور بغض و عناد کے سرمایہ پر ہے۔

سب سے بڑی بات جو کہی گئی ہے یہ ہے کہ مکی سورتوں میں کسی ایک مقام پر اسماعیل کا ابراہیم سے رشتہ منظر نہیں آتا۔ یہ سرتاسر غلط بلکہ بالارادہ علمی بددیانتی ہے۔ قرآن میں جو سورت خود حضرت ابراہیم کے نام نامی پر ہے اور جو مکہ میں نازل ہوئی ہے اس کا ایک سرسری مطالعہ ہر قاری کو بتا سکتا ہے۔

۱۔ حضرت ابراہیم عرب حجاز میں قیام پذیر ہیں اور رسول خدا ہونے کی حیثیت میں خود کو اور اپنی اولاد کو بت پرستی سے بچنے اور اس مقام کو امن عالم کا مرکز بنانے کی دعا کر رہے ہیں۔

رب اجعل ھذا البلد آمنا واجنبنی و بنی ان نعبد الاصنام

اے پروردگار اس شہر کو امن کا گہوارہ بنا دے اور مجھ کو اور میری اولاد کو بت پرستی سے بچالے۔

۲۔ حضرت ابراہیم اقرار کرتے ہیں کہ سرزمین حجاز جو عرب کا قلب ہے ان ہی کی اولاد سے آباد --- اور انہوں نے ان کو بسایا ہے اور وہی اس چٹیل میدان میں کعبہ کے بانی ہیں۔

ربنا انی اسکنت من ذریتی بواد غیر ذی زرع عند بیتک المحرم

پروردگارا بے شک میں نے اپنی کچھ اولاد کو اس بن کھیتی کی سرزمین میں تیرے مقدس گھر کے پاس بسایا ہے۔

۳۔ حضرت ابراہیم حضرت اسماعیل، اور حضرت اسحاق کے والد ہیں اور اسماعیل بڑے صاحبزادے

[1] دائرۃ المعارف الاسلامیہ

ہیں اور یہی اہلِ عرب کے باپ ہیں۔

الحمد للہ الذی وھب لی علی الکبر اسماعیل واسحاق ان ربی لسمیع الدعاء

سب تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں جس نے مجھے بڑھاپے میں اسماعیل واسحاق عطا فرمائے۔
بلاشبہ میرا پروردگار دعا قبول کرنے والا ہے۔

یہ خالص مکی سورت کی آیات ہیں قرآن نے حضرت ابراہیم کا دلکش چہرہ پیش کیا ہے۔ ان آیات کا مطالعہ کرنے کے بعد کیا کوئی شخص یہ کہنے کی جرأت کر سکتا ہے کہ اسماعیل کا ابراہیم کے ساتھ رشتہ مکی آیات میں نظر نہیں آتا۔ جسے مستشرقین اپنی جہالت کی وجہ سے علمی تنقید کا عنوان بتاتے ہیں۔ کیا یہ آیات مکی نہیں ہیں اور کیا ان سے وہ سب کچھ ثابت نہیں ہوتا جو مدنی آیات میں ہے۔

ان مدعیانِ علم کو تعصب نے اتنا اندھا بنا دیا ہے کہ قرآن اور محمد رسول اللہ پر اعتراض کرتے وقت ان کو یہ بھی خیال نہیں رہتا ہے کہ اس قسم کے دعووں سے ہم صرف قرآن ہی کی نہیں بلکہ بائبل کی بھی تکذیب کر رہے ہیں۔

۳۴۹ - میرے اس گھر کو طواف، اعتکاف، رکوع وسجود کرنے والوں کے لیے پاک رکھنا۔
یعنی وہاں برا کام نہ کرے اور ناپاک اس کا طواف نہ کرے اور تمام آلودگیوں سے صاف رکھا جائے۔[1]

اس آیت میں بیت اللہ کو پاک رکھنے کا حکم ہے، جس میں ظاہری نجاست اور گندگی سے طہارت بھی داخل ہے اور باطنی نجاسات کفر و شرک اور اخلاقِ رذیلہ، بغض وحسد، حرص وہوا، تکبر وغرور، ریاء ونمائش سے پاکی بھی شامل ہے۔[2] پاک رکھنے سے صرف یہی مراد نہیں ہے کہ کوڑے کرکٹ سے اسے پاک رکھا جائے۔ خدا کے گھر کی اصل پاکی یہ ہے کہ اس میں خدا کے سوا کسی کا نام بلند نہ ہو۔ جس نے خانۂ خدا میں خدا کے سوا کسی دوسرے کو مالک و معبود، حاجت روا اور فریاد رس کی حیثیت سے پکارا اس نے حقیقت میں مسجد کو گندا کر دیا۔[3]

خانۂ خدا کی صفائی

آیتِ قرآنی اگرچہ خاص ہے مگر لفظ "بیتی" سے اشارۃً یہ بات سمجھ میں آرہی ہے کہ

---

[1] حاشیہ شیخ الہند ص ۲۴ [2] معارف القرآن م ش ص ۲۶۶ [3] تفہیم القرآن

باب احکام میں عام ہے اور مفسّرین نے اسی وجہ سے اس آیت کے ضمن میں لکھا ہے کہ مسجدوں کو ہر طرح سے پاک وصاف رکھنا ضروری ہے۔ ظاہری، باطنی، اعتقادی، معنوی ہر اعتبار سے پاکی کامل ہو۔ نہ انجاس و اصنام ہوں اور نہ عصیان وطغیان۔ ویسے تو ہر انسان طبعاً نفاست پسند ہے۔ ہر شخص چاہتا ہے کہ وہ خود بھی پاکیزہ رہے اور اس کا گھر بھی صاف ستھرا رہے اور اس کی ہر چیز سے نفاست ٹپکے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مسجد جو دربارِ الٰہی ہے اس کی صفائی کس قدر ضروری ہے۔ قرآن کی اس آیت میں مسجد کی صفائی کا بیان باوجود اختصار کے بہت کافی ہے۔

اس موضوع پر ایک سے زیادہ احادیث آئی ہیں۔ ایک بار حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

> میرے سامنے میری اُمت کے اعمال کی اجرتیں اور جزائیں پیش کی گئیں۔ ان میں وہ کوڑا کرکٹ بھی تھا جو کوئی شخص کسی مسجد سے نکالتا ہے[1]

اصل عربی لفظ حدیث میں قذاۃ آیا ہے۔ قذاۃ اس تنکے کو کہتے ہیں جو آنکھ میں گر جائے۔ آنکھ میں تنکے کے پڑنے سے جو تکلیف ہوتی ہے وہ سب جانتے ہیں اور اسے نکالنے کے لیے جس قدر تگ ودو کی جاتی ہے وہ بھی کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ اس لفظ کے استعمال میں بڑی گہری معنویت ہے اور اس طرف اشارہ ہے کہ عالمِ ارواح میں کوڑا مسجد میں ایسی اذیت اور تکلیف کا باعث ہے جیسے عالمِ اجسام میں آنکھوں کے لیے تنکا۔ اس لیے اسے جلد سے جلد صاف کیا جائے۔ دوسرے یہ بھی معلوم ہوا کہ معمولی سے معمولی گندگی بھی مسجد میں نہ ہونی چاہیے۔

اسی لیے مسجد میں تھوکنا گناہ ہے۔ حضور انورؐ کا ارشاد ہے کہ تھوکنا گناہ ہے۔ کسی سے نادانستہ ایسی غلطی ہو جائے تو اس کو چاہیے کہ اسے دفن کرے۔ نووی نے لکھا ہے کہ مسجد میں کہیں بھی تھوکا نہیں جا سکتا ہے بلکہ تھوکنا گناہ ہے اور قبلہ کی دیوار کا احترام نسبتاً زیادہ ہے اس کے اوپر تھوکنا اور بھی بُرا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ مسجد میں تھوکنے کی جرأت نہ کرے، نگلنا پڑے تو یہ کرلے مگر تھوکنا مناسب نہیں ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری میں ابوذر کے حوالے سے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بیان نقل کیا ہے کہ میں نے اپنی اُمت کے بُرے اعمال میں اس تھوک کو بھی پایا جو مسجد میں ڈالا گیا مگر صاف نہ کیا گیا ہو۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مسجد کے گندہ کرنے کا گناہ نامۂ اعمال میں ثبت ہوتا ہے اور قیامت کے دن حساب کتاب میں وہ بھی سامنے لایا

---

[1] مشکوٰۃ ج ۱ ص ۶۹

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ
مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ قَالَ وَمَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا ثُمَّ
اَضْطَرُّهٗۤ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝

اور پھر جب ایسا ہوا کہ ابراہیم نے دُعا مانگی اے میرے پروردگار اس[350] جگہ کو امن وامان والا شہر بنا دے اور یہاں کے بسنے والوں میں جو تجھ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھیں اُن کو ہر قسم کے پھلوں سے نواز دے۔ اس پر ارشادِ الٰہی ہوا کہ تمہاری دُعا قبول ہو گئی۔ اہلِ ایمان پر ضرور ہماری نوازش ہو گی اور ان کو بھی[351] جو ایمان کی جگہ کفر کی راہ اختیار کریں گے چند روزہ سامانِ زندگی دوں گا۔ پھر بالآخر ان کو عذابِ جہنم کی طرف لے جاؤں گا اور جہنم بدترین ٹھکانا ہے۔[352]

جائے گا۔ گناہ کی سنگینی کا اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مشکوٰۃ میں ہے حضرت سائب کہتے ہیں کہ ایک شخص نے امامت کی۔ اتفاق کی بات ہے کہ اس نے جانبِ قبلہ تھوک دیا، جسے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے بچشمِ خود دیکھ لیا۔ آپؐ نے لوگوں کو سختی سے منع کر دیا کہ اب اسے امام نہ بنانا۔ اس امام کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو دربارِ نبوی میں حاضر ہوا۔ آپ نے اس کی بات سنی اور فرمایا ہاں یہ دُرست ہے میں نے ہی روکا ہے اس لیے کہ تم نے مسجد میں تھوک کر اللہ اور اُس کے رسُول کو تکلیف دی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ مسجد کی بے ادبی کتنا سنگین جُرم ہے۔ یہ وہ جُرم ہے کہ اس جُرم کی پاداش میں کسی عہدہ دار کو عہدہ سے معزول کیا جا سکتا ہے۔

یہ سب کچھ اس لیے ہے کہ اللہ نے اپنے گھر کی تطہیر کا حکم دیا ہے اور ہر مسجد خانۂ خدا ہے۔ اس کے ساتھ مسجد کی تطہیر و تنظیف کرنے والے کو اللہ کے یہاں جو کچھ ملتا ہے وہ بھی سُن لیجئے۔ ابنِ ماجہ بابِ تطہیر المساجد میں ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:
جو شخص مسجد سے گندگی ہٹائے گا اللہ اس کے لیے جنت میں گھر بنائے گا۔

آیت کے آخر میں فرمایا ہے کہ طواف، اعتکاف، رکوع، سجدہ کرنے والوں کے لیے اس گھر کو پاک رکھو۔ اس میں طواف اور اعتکاف کا تذکرہ درمیان واو لاکر کیا ہے لیکن رکوع اور سجدے کو بغیر واو کے لائے ہیں۔ اس میں اشارہ ہے کہ طواف اور اعتکاف دو جداگانہ عبادتیں ہیں اس لیے طواف اور اعتکاف کو بذریعہ واو عاطفہ لائے ہیں۔ اور رکوع و سجود دونوں مل کر چونکہ عبادت ہیں اس لیے رکوع اور سجود بغیر واو کے ذکر کیا ہے۔

اہلِ مکہ کے لیے ابراہیمؑ کی دُعا

یہ بھی پچھلی بات کا تتمہ ہے۔ آنے والی بات کی تمہید کے لیے ایک طرف حضرت ابراہیم کی امامت میں خانۂ کعبہ کے بنانے کا تذکرہ فرمایا اور اس دُعائے خلیل کے ذریعے یہ بھی اشارہ فرما دیا کہ ابراہیم نے جس بے آب و گیاہ سنگلاخ زمین میں اللہ کے حکم کے مطابق اللہ کا گھر بنایا تھا وہاں ضروریاتِ زندگی تک میسر نہ تھیں۔ ابھی تک یہ زمین آباد نہ تھی۔ اسی بنا پر دُعا میں لفظ بلد نکرہ استعمال فرمایا ہے۔

حضرت ابراہیم نے اہلِ مکہ کے لیے اس آیت میں تین دُعائیں فرمائی ہیں۔

ایک یہ کہ اس بے آباد جگہ کو شہر بنا دے۔

دوسرے یہ کہ شہر بنانے کے بعد اسے امن کا گہوارہ بنا دے۔

تیسرے یہ کہ یہاں کے بسنے والوں کے لیے روزی کے دروازے کھول دے

قرآن نے بتایا ہے کہ اللہ نے ابراہیم کی تینوں دعائیں قبول فرمالی ہیں۔

۳۵۰ ۔ حضرت ابراہیم نے یہ دُعا کی کہ یہ میدان ایک شہر آباد اور با امن ہو۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا[1] دُعا کا آغاز رب سے کرکے دُعا مانگنے کا سلیقہ سکھایا ہے۔ اور سب سے پہلی یہ دُعا فرمائی کہ اس چٹیل وادی کو ایک شہر بنا دیں تاکہ یہاں کی بود و باش میں وحشت نہ ہو اور ضروریاتِ زندگی مدنیت سے بآسانی فراہم ہو سکیں۔ یہی دُعا سورۂ ابراہیم میں بھی آئی ہے لیکن تھوڑے سے فرق کے ساتھ یعنی هذا البلد آمنا لفظ بلد الف لام کے ساتھ ہے۔ دونوں تعبیروں میں باریک سا فرق ہے۔ پہلی تعبیر غالباً اس وقت کی ہے جب یہ جگہ بالکل بے آباد تھی۔ اس وقت لفظ بلد

---

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۲۴

بغیر الف لام استعمال فرمایا اور دوسری تعبیر اس وقت کی ہے جب یہاں شہریت کے آثار نمایاں ہو چکے تھے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ سورۃ ابراہیم والی دُعا کے بعد یہ الفاظ بھی حضرت ابراہیم نے فرمائے ہیں۔

الحمد للّٰہ الذی وھب لی علی الکبر اسماعیل و اسحاق

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ دُعا حضرت اسحاق کی پیدائش کے بعد کی ہے اور حضرت اسحاق، حضرت اسماعیل سے تیرہ سال بعد پیدا ہوئے ہیں[1]

۲۵۱ ہ۔ یہ حضرت ابراہیم کی دوسری دُعا ہے۔ اس میں حضرت ابراہیم نے اللّٰہ سے شہر کو امن والا شہر بنانے کی درخواست کی ہے۔ یعنی قتل و غارت گری اور دُشمنوں کے تسلط سے محفوظ رہے۔ حضرت ابراہیم کی یہ دُعا قبول ہوئی کہ جانور تک اس میں محفوظ و مامون ہیں۔ اس کا شکار نہیں کیا جا سکتا اور خونی بھی اگر خانۂ کعبہ کے اندر پناہ گزین ہو جائے تو اسے وہاں قتل نہیں کیا جا سکتا۔ شہر اور خانہ کعبہ کا یہ احترام جاہلیت نے اپنے زمانے میں محفوظ رکھا۔

تیسری دُعا یہ فرمائی کہ مکہ والوں کو پھل پھلاری کھانے کو ملتے رہیں۔ مکہ ایسی جگہ واقع ہے کہ ساری زمین یا سخت ریتلی ہے یا سخت پتھریلی۔ بارش بہت قلیل مقدار میں ہوتی ہے۔ غرض یہ کہ تازہ پھلوں اور درختوں کا کہیں نام و نشان ہی نہیں ہے۔ معمولی سے پھل پھول کے درخت بلکہ تازہ سبزہ و گھاس تک پیدا نہیں ہوتی۔ اور کاشت کاری و باغبانی کو تو کوئی جانتا ہی نہیں ہے۔ ایک بے آب و گیاہ سرزمین کہیں ریگستان کہیں گرم و خشک پہاڑیوں کے چٹان[2]

اس دُعا میں یہ بات بہت زیادہ جاذب نظر اور دلکش ہے کہ یہ نہیں فرمایا کہ مکہ اور اس کے ماحول کو قابلِ کاشت علاقہ بنا دو بلکہ یہ فرمایا کہ یہاں کے باشندوں کو ہر طرح کے پھل عطا فرما دو کہ پیدا کہیں ہوں اور پہنچیں یہاں۔ شاید حضرت ابراہیم نہیں چاہتے تھے کہ ان کی اولاد کاشت کاری اور باغبانی کے کاموں میں لگ جائے۔ سورۃ قصص میں جہاں اس دُعا کی قبولیت کا ذکر اہلِ مکہ پر بطور امتنان کیا ہے وہاں تصریح ہے کہ یجبی الیہ ثمرات کل شیٔ رزقا من لدنا حرم کی طرف ہر چیز کے ثمرات ہماری طرف سے بطور رزق کھینچے چلے آتے ہیں۔ اس میں ایک تو یہ تصریح ہے کہ خود مکہ میں پھل پیدا کرنے کا وعدہ نہیں ہے بلکہ دوسرے مقامات سے یہاں درآمد کیے جائیں گے دوسرے یہ کہ یہ نہیں فرمایا کہ ہر درخت کے پھل یہاں

---

[1] معارف القرآن م ش ص ۲۶۸ [2] تفسیر ماجدی ص ۵

آئیں گے بلکہ فرمایا کہ ہر چیز کے ثمرات یہاں درآمد ہوں گے۔ ثمرات کو اگر نتائج اور حاصل کے معنے میں لیں تو مطلب یہ ہے کہ زندگی کی ضرورت کا کل سامان یہاں پہنچتا رہے گا چاہے وہ درختوں کے پھلوں کی صورت میں ہو اور چاہے مشینی آلات کے نتیجہ اور حاصل کی شکل میں ہو سب کچھ یہاں آتا رہے گا [1]

۲۵۲ ۔ اور ان کو بھی جو ایمان کی جگہ کفر اختیار کریں گے۔ اللہ اکبر کس قدر ادب ہے، جب منصبِ امامت کے متعلق حضرت ابراہیم نے درخواست کی تھی کہ اس میں میری اولاد کا بھی حصّہ ہو تو ارشاد ہوا تھا کہ اس منصب کا وعدہ تمہاری اولاد کے صرف مومن وصالح لوگوں کے لیے ہے ظلم پیشہ اس میں داخل نہیں ہیں۔ اس کے بعد حضرت ابراہیم نے جب رزق کے لیے دُعا فرمانے لگے تو سابق فیصلے کے پیشِ نظر صرف اپنی اہلِ ایمان ہی کے لیے دُعا کی مگر اللہ تعالیٰ نے جواب میں حضرت ابراہیم کو بتایا کہ امامت اور چیز ہے اور رزقِ دُنیا اور چیز۔ امامت تو صرف اہلِ ایمان کو ملے گی۔ لیکن رزق اس دنیا میں سب کو دیا جائے گا۔ اس سے یہ بات خود بخود نکل آئی کہ اگر کسی کو رزقِ دُنیا میں فراوانی کے ساتھ مل رہا ہو تو وہ اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو کہ اللہ اس سے راضی ہے اور وہ ہی خدا کی طرف سے پیشوائی کا بھی مستحق ہے [2]

قلیلاً کچھ دن، چند روز سے مراد دنیوی زندگی ہے کہ آخرت کے مقابلے میں کچھ دن یا چند روز کی زندگی سے مطلب یہ ہے کہ جو فضلِ خداوندی اہلِ ایمان کے ساتھ خاص ہے اور جس سے اہلِ کفر محروم رہیں گے اس کا تعلق آخرت کی کامیابی اور دین کی امامت ہے۔ باقی رہے اس دنیوی زندگی کی آسائشیں اور منافع تو ان سے کافروں کو محروم نہ کیا جائے گا کہ یہ قانونِ ربوبیّت ہے۔ لیکن کفر کا انجام بہر حال خطرناک ہے اور اسی کے نتیجے میں کافر کشاں کشاں دوزخ میں لے جایا جائے گا۔ مستدرک حاکم میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے اور امام ذہبی نے اسے صحیح الاسناد لکھا ہے کہ

> اللہ دُنیا تو سب ہی کو دیتا ہے اس کو بھی جس سے محبّت کرتا ہے اور اس کو بھی جس سے محبّت نہیں کرتا ہے لیکن دین وایمان تو صرف اس کو عطا فرماتا ہے جس سے محبّت کرتا ہے۔

---

[1] معارف القرآن ص ۲۷۰　[2] تفہیم القرآن ص ۱۱۲

وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ ؕ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝

اور دیکھو وہ کیسی عظیم گھڑی تھی جب ابراہیم اور اسماعیل[۳۵۳] اس گھر کی بنیادیں اٹھا رہے تھے اور ان کی زبانوں پر یہ دعا تھی۔ اے ہمارے رب ہم سے یہ خدمت قبول فرما لے[۳۵۴]۔ بلاشبہ تو سب کی سننے والا اور سب کچھ جاننے والا ہے۔

انسان کی تمام شرافت و کمال اس کی نظری اور عملی قوتوں کے کمال پر موقوف ہے۔ ان کے سنور جانے کا نام ایمان ہے۔ آزادی انسان کی سب سے بڑی شرافت اور غلامی اس کے لیے بدترین داغ ہے۔ لیکن اگر آزادی کے ساتھ ایمان نہ ہو اور عبدیت کے ساتھ ایمان میسر آجائے تو حریت کی شرافت شرافت نہیں ہے اور عبدیت کا عیب عیب نہیں ہے۔ لہٰذا اسلام میں خدا کے دوست اور دشمن کی تقسیم کا مدار سرمایہ اور دولت نہیں ہے بلکہ ایمان و کفر ہے۔ دُنیا کی دولت دوست اور دُشمن سب کا اشتراکی سرمایہ ہے لیکن ایمان کی دولت صرف دوستوں کا حصّہ ہے۔

سرمد غم عشق بوالہوس را نہ دہند
سوزِ دلِ پروانہ مگس را نہ دہند

معبدِ کعبہ کی تعمیر

اس آیت میں کعبہ کی تعمیر کا منظر پیش کیا گیا ہے۔ اور اندازِ تعبیر اتنا دلکش ہے کہ پڑھنے والے کے سامنے تعمیرِ کعبہ کا نقشہ آجاتا ہے۔ اور صرف کام ہی سامنے نہیں آتا بلکہ کام کرنے والوں کا اللہ کی جناب میں اخلاص ان کے دلوں میں خشیت کی کیفیت کے سارے نقوش قاری کے ذہن میں اُبھر آتے ہیں۔ دُعا بھی ہے، دُعا کا دلکش منظر بھی ہے اور دُعا کا ماحول بھی ہے۔ جیسے کوئی متحرک واقعہ آنکھوں کے سامنے پیش آرہا ہو۔ یہ قرآن حکیم کی ایک عجیب اور دل کش

خصوصیت ہے کہ وہ آنکھوں سے اوجھل مناظر کو اس انداز میں پیش کرتا ہے جیسے وہ زندہ جاوید مجسم شکل میں سامنے موجود ہوں۔ یہ صحیح یہی فنی منظر نگاری صرف قرآن ہی کا حصّہ ہے۔ اندازِ بیان کی یہ کیسی عظیم بلاغت ہے کہ اولاً بیت اللہ کا لوگوں کے لیے مرکزِ اجتماع ہونے اور امن گاہ ہونے کا اعلان فرمایا، ثانیاً اس مادی انعام کے بعد معنوی انعام کا یہ کہہ کر اعلان کیا کہ ہم نے ابراہیم و اسماعیل کو حکم دیا تھا کہ اس گھر کو ہر قسم کی مادی اور معنوی گندگی سے پاک رکھنا، ثالثاً حضرت ابراہیم کے اسماعیل کی معیت میں بیت اللہ بنانے اور بناتے وقت ان کی مخلصانہ دعا کا ذکر کیا۔

۳۵۳۔ جب ابراہیم و اسماعیل اس گھر کی بنیادیں اٹھا رہے تھے۔ اس اندازِ بیان میں اُٹھا رہے تھے کا لفظ بہت زیادہ غور طلب ہے۔ اصل ارشاد میں یرفع ہے۔ بنیادیں اُٹھانے سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی بنی ہوئی چیز کو از سرِ نو اٹھایا جا رہا تھا، بلند کیا جا رہا تھا۔ حافظ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری میں ایک روایت نقل کی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ بیت اللہ کی سب سے پہلی اساس حضرت آدم کے ہاتھوں رکھی گئی اور فرشتوں نے ان کو وہ مقام بتا دیا تھا جہاں کعبہ کی تعمیر ہوئی تھی لیکن ہزاروں سال کے حوادث نے اس کو بے نشان کر دیا تھا۔ البتہ اب بھی وہ ایک ٹیلہ یا ابھری ہوئی زمین کی شکل میں موجود تھا۔ یہی وہ مقام تھا جسے وحیِ الٰہی نے ابراہیم علیہ السلام کو بتایا اور انھوں نے اسماعیل کی مدد سے شروع کیا تو سابق تعمیر کی بنیادیں القواعد نظر آنے لگیں۔ انہی بنیادوں پر بیت اللہ کی تعمیر کی گئی۔ لیکن قرآن نے بیت اللہ کی تعمیر کا معاملہ حضرت ابراہیم سے شروع کیا ہے اور اس سے پہلے کی حالت کا کوئی ذکر نہیں کیا۔

بیت اللہ کی قدامت

اس پر تفصیلی بحث تو انشاء اللہ پارہ چہارم کے آغاز میں آ رہی ہے۔ یہاں اتنا جان لینا ضروری ہے کہ خانہ کعبہ کی قدامت مسلمانوں اور یہودیوں میں یکساں مسلم رہی ہے۔ لیکن مسیحیوں کو خانہ کعبہ سے جو ضد اور اس کی قدامت سے جو کد ہے وہ بالکل ظاہر ہے لیکن اس کے باوجود حقیقت پھر حقیقت ہے۔ آفتاب کے وجود سے روزِ روشن میں انکار کیسے کیا جا سکتا ہے۔ مشہور مترجم جارج سیل اپنے انگریزی ترجمۂ قرآن کے مقدمہ میں لکھتا ہے کہ:

مکہ جسے بکہ بھی کہا گیا ہے اور یہ دونوں الفاظ مترادف ہیں اور ان کے معنے مقامِ اجتماع عظیم کے ہیں۔ یقیناً دنیا کے قدیم ترین شہروں میں سے ہے اور بعض کی رائے میں توریت کے

شہر میسا سے یہی مراد ہے۔ اور پھر وہی آگے لکھتا ہے۔ مکہ کا معبد اہلِ عرب کے درمیان مقدس اور ایک عبادت گاہ کی حیثیت سے بہت ہی قدیم زمانہ سے اور محمدؐ سے بہت سی صدیوں قبل سے چلا آتا ہے۔ باسورسمتھ سمتھ جو لیکچرز آن محمد اینڈ محمد نزم کے مصنف ہیں۔ وہ لکھتے ہیں: بناءِ کعبہ کا سلسلہ حسبِ روایت ابراہیم و اسماعیل تک پہنچتا ہے بلکہ شیث اور آدم تک اور اس کا نام بیت ایل خود اس پر دلالت کرتا ہے کہ اسے ابتدائی شکل میں کسی ایسے بزرگ قبیلہ نے تعمیر کیا ہے۔ ص ۱۶۶) سب سے بڑھ کر قابلِ لحاظ شہادت سر ولیم میور کی ہے، مکہ کے مذہب کی تاریخ بہت ہی قدیم ماننی پڑتی ہے۔ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ کعبہ ایک نامعلوم زمانہ سے ملک عرب کا مرکز چلا آتا ہے۔ جس مقام کا تقدس اتنے وسیع رقبے میں مسلّم ہو۔ اس کے معنے ہی یہ ہیں کہ اس کی بنیاد قدیم ترین زمانے سے چلی آتی ہے (لائف آف محمد مقدمہ ص ۱۰۳، ۲۰۲)[1]

تورات سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم سے پہلے یہ مکان موجود تھا۔ باقی مباحث کی تفصیلات کے لیے پارہ چہارم کا انتظار فرمایئے۔

۳۵۴ ۔ اے ہمارے رب ہماری یہ خدمت قبول فرمالے۔ اصل ارشاد میں تقبل آیا ہے۔ قبول اور تقبل میں فرق ہے۔ جو چیز اچھی ہو، لائق پذیرائی ہو وہاں لفظ قبول استعمال ہوتا ہے اور جو چیز ناقص ہو اور قابلِ پذیرائی نہ ہو وہاں لفظ تقبل استعمال کرتے ہیں۔ کیونکہ تقبل کے وزن پر آنے والے الفاظ کے معنی میں کچھ تکلف ہوتا ہے۔ اس مقام پر لفظ تقبل کا استعمال حضرت ابراہیم کے غایت عجز اور کمالِ تواضع کو بتا رہا ہے یعنی خداوندا عمل کی یہ حقیر سوغات سے کر تیری بارگاہِ اقدس میں حاضر ہوتے۔ تیری جناب رفیع اور تیری علوشان کے مقابلے میں تو یہ سوغات حقیر سے حقیر تر ہے لیکن اگر تیرے لطف وکرم اور فضل و رحمت سے قبول کا شرف حاصل کر لے تو کیا ہی کہنے ہیں یعنی اس کی قبولیت محض آپ کے فضل وکرم سے ہے

ذرا اندازہ فرمایئے کہ یہ کہنے والے خلیل اللہ ہیں جنہوں نے ملک شام کے ہرے بھرے خطہ کو چھوڑ کر مکہ کے تپتے ہوئے خشک پہاڑوں میں اپنے بیوی اور بچہ کو بسایا۔ اللہ کے گھر کی تعمیر میں اپنی پوری توانائی صرف کر دی۔ ایسے موقع پر اپنے عمل پر ناز اور اپنے کردار پر نظر ایک طبعی چیز ہے لیکن عمل کی سوغات پیش کرنے والے حضرت ابراہیم ہیں جو بارگاہِ رب العزت

---

[1] تفسیر ماجدی ص ۵۰

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ وَأَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا ۖ إِنَّكَ أَنتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ﴿١٢٨﴾

اے ہمارے پروردگار ہمیں ایسی[355] توفیق دے کہ ہم سچے مسلم یعنی تیرے حکموں کے فرمانبردار ہو جائیں اور ہماری نسل میں اپنے لیے ایک اُمتِ مسلمہ[356] بنا دے، اور اے اللہ ہمیں اپنی عبادت کے طریقے[357] بتا دے اور ہمارے قصوروں سے درگزر فرما بلاشبہ تیری ہی ذات معاف فرمانے والی ہے اور رحم کرنے والی ہے۔

کے عزت و جلال سے آشنا ہیں اور جانتے ہیں کہ کسی شخص سے اللہ سبحانہ کے شایانِ شان عبادت و اطاعت ممکن نہیں ہے۔ ہر شخص اپنی قوت و ہمت سے کام کرتا ہے۔
اس لیے کوئی شخص بھی بڑے سے بڑا عمل کر کے اس پر ناز نہیں کر سکتا بلکہ اس کا فرض ہے کہ الحاح وزاری کے ساتھ جنابِ الٰہی میں درخواست کرے کہ میرا یہ عمل قبول فرمالیجئے۔[1]

اُمتِ مُسلمہ کی تاسیس

نبوتِ محمدیہ کے تذکرے میں اُمتِ مسلمہ کی طرف پہلے اشارہ گزر چکا ہے۔ اب اس دُعا میں اس کی تصریح ہے اور سورۃ انبیاء میں اہلِ ایمان کو مخاطب کر کے بتایا ہے کہ تم ہی وہ اُمت ہو جس کے لیے ابراہیم نے دُعا فرمائی اور جس کا نام مسلم رکھا ہے۔ یہاں نبوت سے پہلے اُمت کا تذکرہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ وہ عظیم الشان نبوت ہے جس کے صدقے انفرادی نبوت کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند ہو کر اجتماعی نبوت کا دروازہ کھل رہا ہے۔ حکیم الامت شاہ ولی اللہ نے حجۃ اللہ البالغہ

[1] معارف القرآن م شفیع ص ۲۷۱

ہیں اس طرف اشارہ کیا ہے۔ حضرت موسیٰ نے اپنی زندگی کی آخری وصیت حضور انور کے ظہور کی بشارت دی تھی اس میں آپ کے ظہور کے ساتھ اُمت کے ظہور کی بھی بشارت ہے ۔"خداوند سینا سے آیا اور سعیر سے ان پر طلوع ہوا اور فاران کے پہاڑ سے وہ جلوہ گر ہوا دس ہزار مقدسوں کے ساتھ آیا۔ یہ ایک عجیب بات ہے کہ حضرت موسیٰ اس پیغمبر کے مقدس ساتھیوں کی تعداد دس ہزار بتاتے ہیں۔ فتح مکہ کے دن بعینہٖ یہی دس ہزار مقدسین تھے جو اس فاران سے آنے والے نورانی پیکر کے ساتھ شہرِ خلیل مکہ کے دروازے میں داخل ہوئے اور اس طرح حضرت موسیٰ نے جو کچھ کہا تھا وہ پورا ہو گیا۔

اور قرآن نے یہ بھی انکشاف کیا ہے کہ اس اُمتِ مسلمہ کی مثال انجیل و تورات میں مذکور ہے،

مثلهم فی التوراة ومثلهم فی الانجیل کزرع اخرج شطاٴه فآزره فاستغلظ فاستوی علی سوقه یعجب الزراع

ان کی مثال تورات وانجیل میں اس کھیتی سے دی گئی ہے جس نے ٹہنی نکالی ہو، پھر مضبوط ہوئی، پھر موٹی ہوئی، پھر اپنی ٹہنیوں پر سیدھی کھڑی ہو گئی۔ اس کی دلکشی کسانوں کو خوش کر رہی ہے۔

اسی سورۃ فتح میں حضور انور کی رسالت کا ذکر کرنے کے بعد جن کا چہرہ وضاحت سے پیش کیا گیا ہے وہ بھی 'اُمتِ مسلمہ' ہے

محمد رسول الله والذین معهٗ اشداء علی الکفار رحماء بینهم تراهم رکعاً سجداً یبتغون فضلا من الله ورضوانا، سیماهم فی وجوههم من اثر السجود

محمد اللہ کے فرستادے اور جو لوگ آپ کے ساتھ ہیں وہ کافروں پر بھاری ہیں باہم مہربان ہیں۔ تم ان کو دیکھتے ہو اللہ کے سامنے جھکے ہوئے اور سجدہ کرتے ہوئے۔ وہ خدا کی خوشی اور اس کی مہربانی کے جویا رہتے ہیں۔ ان کی پیشانیوں میں سجدہ کے اثر سے نور ہے۔

اس کی تفصیلات دوسرے پارے کے آغاز میں ملیں گی۔

۳۵۵۔ ہمیں توفیق دے کہ ہم سچے مسلم ہو جائیں۔ اسلام کیا ہے؟ اللہ کی رضامندی کی ایک بہترین دستاویز، اعتقادیات وعملیات کا کامل نقشہ۔ انسانی زندگی کے تمام گوشوں کے لیے غیر فانی دستور العمل۔ قرطبی نے لکھا ہے کہ یہاں اسلام سے ایمان و عمل کا مجموعہ مراد ہے۔ شوکانی

فرماتے ہیں کہ اسلام پر دوام اور اخلاص مراد ہے۔ ابن جریر فرماتے ہیں کہ مطلب یہ ہے کہ ہمیں ایسا مخلص فرمانبردار بنادے کہ ہم کسی درجہ میں تیری طاعت میں کسی کو شریک نہ کریں۔

یہ دُعا بھی اسی معرفت وخشیۃ کا نتیجہ ہے جو حضرت ابراہیم کو حاصل تھی کہ اطاعت و فرمانبرداری کے لیے مثالی کارنامے بجالانے کے باوجود اللہ سے درخواست کرتے ہیں کہ ہم دونوں کو اپنا فرمانبردار بنالے۔ اصل بات یہ ہے کہ جتنی زیادہ اللہ کی معرفت میں انسان کا قدم بڑھتا جاتا ہے اسی قدر اس کا یہ احساس تیز سے تیز تر ہوتا جاتا ہے کہ ہم حق وفاداری پورا نہیں ادا کر رہے ہیں[1]

قرب الٰہی کا کوئی مقام بھی ایسا نہیں ہے جہاں بندہ نیاز سے بیگانہ ہوکر ناز پر اتر آئے۔

۳۵۶ ھ۔ اور ہماری نسل میں سے ایک اُمت مسلمہ بنادے۔ قرطبی رقمطراز ہیں کہ ہر نبی نے اپنے لیے اور اپنی اُمت کے لیے دُعا فرمائی ہے لیکن ابراہیم علیہ السلام کی یہ خصوصیت ہے کہ آپ نے اس اُمتِ محمدیہ کے لیے دُعا فرمائی ہے من ذریتنا میں ضمیر جمع لاکر اشارہ کیا ہے کہ نسل سے ابراہیم واسماعیل کی نسل مراد ہے اور ان دونوں کی نسل صرف عرب میں ہے جبکہ ابراہیم واسحاق کی ذریت سے بنی اسرائیل مراد ہیں۔

ذریتِ ابراہیم واسحاق

حضرت اسماعیل کے ۱۲ بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ اللہ نے حضرت ابراہیم کو بشارت دی تھی اور اسماعیل کے حق میں میں نے تیری سُنی دیکھ میں اسے برکت دوں گا اور اُسے برومند کروں گا۔ اور اس کو بہت بڑھاؤں گا۔ اس سے ۱۲ سردار ہوں گے اور میں اس کو بڑی قوم بناؤں گا۔ (تکوین ۱۷-۲۲)

آخر یہ بشارت استجابت کو پہنچی اور اسماعیل کا گھرانہ آباد ہوا۔ حضرت اسماعیل کے ۱۲ بیٹوں کے نام یہ ہیں۔ بنایوط، قیدار، ادبائیل، ہرشام، مشماع، دوما، مشا، حدر، تیما، نفیش، قیدماہ، یہ بارہوں بیٹے اپنے خاندان کے بارہ سردار تھے۔ ان میں سب سے بڑا بنایوط اور ان سے چھوٹا قیدار ہے۔ اور یہی دونوں تاریخ میں نمایاں نظر آتے ہیں۔ یہ تمام باپ کے زمانے

[1] الجامع لاحکام القرآن فتح القدیر

میں اور ایک عرصہ تک حجاز ہی میں رہے اور اپنے چچازاد بھائیوں یعنی فرزندانِ مدین کے ساتھ مل کر یمن اور حجاز سے شام و مصر تک تجارتی قافلوں کے ساتھ سفر کیا کرتے تھے اور دیگر عرب تاجروں کی طرح خوشبودار چیزوں کا کاروبار کرتے تھے۔ (تکوین ۳۷-۲۶)

تاریخ میں بارہ بیٹوں میں سے دو بڑے بیٹوں بنایوط اور قیدار کا تذکرہ ملتا ہے۔ بنایوط کو اہلِ عرب عموماً نابت کہتے ہیں۔ ان کی روایات کے مطابق خانہ کعبہ کی تولیت حضرت اسماعیل کے بعد ان کے سب سے بڑے بیٹے نابط کے حصہ میں آئی[1]

انباطیین کی تاریخ کا مفصل تذکرہ یونانی اور رومی مورخین کرتے ہیں اور بنایوط پسر اسماعیل جس کا ذکر تورات میں ہے اور نابت بن اسماعیل جس کا عرب مورخین چہرہ پیش کرتے ہیں حقیقت میں تینوں ایک ہیں۔

انباط ایک مدت تک دیگر عرب قبائل کی طرح بحرِ احمر سے بحرِ فرات تک مستقل وادیوں میں بدویانہ زندگی بسر کرتے رہے۔ اس بدویت کا زمانہ دو ہزار قبل مسیح ہے۔ تورات نے بنایوط کا فرزندانِ اسماعیل کے ضمن میں ۲۰۰۰ قبل مسیح میں پہلی بار نام لیا ہے اور آخر اُخر قیال نبی نے بنایوط کا ذکر کیا ہے۔

انباط کی حکومت کے حدود اولاً وہ قطعہ زمین تھا جسے یونانی عرب سنگستان کہتے ہیں اور عبرانی ادوم اور سعیر یعنی خلیج عقبہ سے بحرِ احمر تک بوسیفوس جو پہلی صدی مسیحی میں تھا بیان کرتا ہے کہ اس عہد میں بنایوط عرب ریگستان تک پھیل گئے تھے اس کے خاص الفاظ یہ ہیں؛

> ملک بحرِ احمر سے نہر فرات تک اسماعیل کے ۱۲ بیٹوں کے قبضہ میں ہے جس کی وجہ سے اس کا نام ملک بناطینہ پڑ گیا ہے۔ اس کی سرحد مغرب میں مصر اور عرب سنگستان سے مل گئی ہے اور بہت سے بیابانوں اور بلند و فراز زمینوں کو شامل ہے جو مشرق کی طرف خلیج فارس تک منتہی ہے۔ عموماً اس ملک کے باشندوں کا نام بنایوط عرب ہے۔

ان شہادتوں سے ظاہر ہے کہ انباط کا ملک مغرب میں بحرِ احمر اور مشرق میں خلیج فارس تک پھیلا ہوا تھا۔

---

[1] الاخبار الطوال ص ۱۱ ابو حنیفہ دنیوری

اسی بنا پر لوطریا نابت بن اسماعیل کی دو شاخیں آلِ غسّان اور مدینہ کے اوس و خزرج ہیں۔ حضرت اسمٰعیل کا دوسرا بیٹا قیدار ہے۔ یہ شہرت اور اعزاز میں اپنے تمام بھائیوں سے زیادہ ممتاز ہے

قیدار بربنائے روایاتِ تورات دعرب حجاز میں آباد ہوا تھا۔ فارسٹر صاحب جن کی موافقانہ شہادت بہت کم ملتی ہے وہ لکھتا ہے:

اشعیا نبی نے قیدار کے جس ملک کا ذکر کیا ہے اس کو ہر شخص جو جغرافیہ عرب سے واقف ہے فوراً کہہ دے گا وہ عرب کے صوبہ حجاز کا صحیح نقشہ ہے جس میں مکہ اور مدینہ کے مشہور شہر واقع ہیں۔ عربوں کی قومی روایت بھی تاریخی مقام رکھتی ہے، جب ایک طرف اس کی تصدیق کتبِ مقدسہ سے ملتی ہے۔ جس سے قیدار کا اسی حصہ ملک میں ہونا ثابت ہوتا ہے اور دوسری طرف اریانوس، بطلیموس اور پلینی کے بیان سے ملتی ہے جو قیداری قوم کی اسی صوبہ میں موجودگی کی غیر مشتبہ شہادت دیتے ہیں۔

قیدار ابنِ اسماعیل علیہ السلام کی عظمت کیلئے یہ بات کافی ہے کہ اس کا نام تورات کے ورقوں میں اسیریا کے کتبات میں اور یونان کے جغرافیہ میں ہر جگہ موجود ہے لیکن اسے بھی عظیم الشان عزت اس کو یہ حاصل ہے کہ وہ نورِ الٰہی جو آدم و ابراہیم کو ودیعت ہوا تھا وہ اسماعیل کے بیٹے قیدار کی پشت سے دنیا میں جلوہ افروز ہوا۔ یعنی پیغمبرِ عالم خاتم النبیین جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نسلِ قیدار کی شاخ عدنان سے پیدا ہوئے۔

ایک قوم ہونے کی حیثیت سے قیدار کا نام سب سے پہلے ۱۰۰۰ قبل مسیح میں حضرت داؤد کی زبور میں آتا ہے۔ بنو قیدار اس زمانہ میں خیموں میں رہتے تھے۔ حضرت داؤد بادشاہی سے پہلے کافی عرصہ تک بنو قیدار کے خیموں میں رہتے تھے ۱۰۰۰ قبل مسیح میں حضرت سلیمان بھی اپنی غزل میں قیدار کے خیموں کا ذکر کرتے ہیں کہ وہ کالے رنگ کے ہوتے ہیں اور میں قیدار کے خیموں کی مانند سیاہ ہوں۔ یہ سیاہ خیمے کالے کملوں کے ہوتے تھے جو اب تک بدوی عربوں کے پیشے کا نشانہ ہیں۔ خود مکہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے چند پشت پہلے خیموں کا شہر تھا۔ پتھر یا مٹی کی کوئی عمارت موجود نہ تھی۔

اشعیا نبی جو تقریباً اسی زمانہ میں تھے وہ بیان کرتے ہیں کہ قیدار ایک بہادر شاندار قوم ہے۔ (۲۱، ۱۶) گاؤں میں ان کی بہت سے آبادیاں ہیں۔ ۴۲-۱۱) بھیڑ، بکری ان کی دولت ہے اسی کی وہ تجارت کرتے ہیں۔ ۶۰، ۷)

قیدار کے متفرق رؤسا میں سے عربوں کے نزدیک سب سے زیادہ مشہور عدنان ہے۔ قیدار کی نسل کی تمام شاخیں شجرہ انساب میں اسی عدنان تک منتہی ہوئی ہیں چھٹی صدی قبل مسیح میں بنو خدنذر جیسے عرب بخت نصر کہتے ہیں۔ اسیریا کے تخت پر جلوہ نما ہوتا ہے اور عراق سے لے کر شام، مصر اور عرب تک کی خاک اڑا دیتا ہے۔ اہلِ عرب کا بیان ہے کہ اس وقت عربوں کا رئیس کل معد بن عدنان تھا۔

اشعیا ۷۱۵ ق م خرقیال ۵۹۰ ق م اور برمیا ۵۸۶ ق م نبیوں نے خانوادۂ قیدار کو اس خونخوار اور سفاک بادشاہ کے خروج سے ہوشیار کیا ہے۔

اہلِ عرب کی روایت ہے کہ بخت نصر حملہ کرتا ہوا حجاز تک پہنچ گیا تھا۔ معد بن عدنان مقابلہ پر آئے۔ غیر منفصل جنگ کے بعد دونوں ایک دوسرے سے الگ ہو گئے۔ بعض روایتوں میں ہے کہ برمیا نبی نے معد کو بچا لیا اور شائد اس شکست سے بنو قیدار کو کچھ زیادہ صدمہ نہیں پہنچا۔ خرقیال نبی جو بخت نصر کی ان جہاں سوزیوں کے زمانے میں موجود تھے اور فلسطین سے قید ہو کر بابل گئے تھے، قیدار کے شہزادوں کا ذکر کرتے ہیں - عرب اور قیدار کے تمام شہزادوں نے بھیڑ، بکری کا تجربے بیوپار کیا۔ (۲۰، ۲۱) ان انبیاء کی معاصرانہ شہادتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ

قیداری قوم خیموں اور دیہات میں آباد تھی۔ بہادر اور شجاع تھی، قبائل کے سردار تھے۔ بدویانہ جاہ و جلال اور شان و شکوہ رکھتے تھے۔ تجارت ان کا پیشہ تھا۔

اور بعینہ یہی نقشہ ان کا زمانۂ اسلام تک تھا۔[1]

حضرت اسماعیل کی یہی اولاد قرآن کی اس آیت میں من ذریتنا کا مصداق ہے۔

اس آیت میں اُمتِ مسلمہ ہونے کی دُعا کی گئی ہے۔ شارحینِ قرآن نے یہ سمجھا ہے کہ اس دُعا کی حیثیت وہ ہے جو ایک باپ اپنی اولاد کے لیے کرتا ہے اور آیت کا مطلب یہ بتایا ہے کہ یا اللہ صرف ہمیں ہی اپنا تابعدار نہ بنا بلکہ ہماری اولاد کو بھی اپنا تابعدار بنا لے اور یہ مطلب بتا دینے کے بعد من ذریتنا کے من کو تبعیضہ قرار دیا ہے۔ لیکن جب یہ سوال اٹھا کہ یہ کوئی امامت تھوڑی ہے جس کے بارے میں اللہ نے حضرت ابراہیم کو لاینال عھد الظالمین کہہ کر بتا دیا تھا کہ ظالموں کو یہ مقام نہ ملے گا تو فوراً جواب دیا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کو بتا دیا تھا کہ ان میں ظالم ہوں گے۔

---

[1] ارض القرآن ج ۲ ص

اس لیے من تبعیضیہ دُعا میں لائے ہیں۔ حالانکہ اس دُعا میں ان باتوں میں سے کوئی بات نہیں ہے یہ تو حضرت ابراہیم و اسماعیل اُمتِ مسلمہ کے ظہور و وجود کی دُعا فرما رہے ہیں اور اس اُمتِ مسلمہ کے لیے اللہ سے یہ درخواست فرما رہے ہیں کہ اس کا نقطۂ آغاز اور مبدا ہماری ذریت ہو۔ چنانچہ اللہ نے ابراہیم و اسماعیل کی یہ دُعا قبول فرمائی اور اُمتِ مسلمہ کا ظہور ہوا اور اس کا نقطۂ آغاز حضرت ابراہیم و اسماعیل ہی کی ذریت ہوئی۔ مکہ میں قریش اگر عدنان کی وساطت سے حضرت اسماعیل کے بیٹے قیدار کی اولاد ہیں تو مدینہ میں انصار نابت ابنِ اسماعیل کی اولاد ہیں۔ یا پھر دوسرے عرب قبائل جیسے آلِ غسان آلِ جفنہ کہتے ہیں یہ بھی نابت ابنِ اسماعیل کی اولاد ہیں اور ان میں بیشتر عیسائی تھے۔ الغرض اُمتِ مسلمہ کا نقطۂ آغاز اور مبدا اس دُعا کے صدقے میں ذریتِ ابراہیم و اسماعیل بنی ہے۔ اسی اُمت کا نام مسلمان ہے۔ دُعا کی مقبولیت اسی سے ظاہر ہے کہ وہ اُمت آج تک اسی نام سے مشہور چلی آ رہی ہے۔ دوست دُشمن سب مانتے ہیں۔ حتیٰ کہ ایک اسلام دُشمن یہودی نے بھی اقرار کیا ہے کہ

> اسلام کی بنیاد تو فی الواقع اسماعیل کے ہاتھوں پڑی جو اہلِ عرب کے مورثِ اعلیٰ ہیں [1]

۳۵۷ ۔ اور ہمیں ہماری عبادت کے طریقے بتا دے۔ اصل ارشاد میں مناسک آیا ہے۔ یہ منسک کی جمع ہے۔ اعمالِ حج کو بھی مناسک کہتے ہیں اور مقاماتِ حج، عرفہ، منیٰ، مزدلفہ کو بھی، یہاں دونوں مراد ہو سکتے ہیں۔ دُعا کا حاصل یہ ہے کہ ہمیں اعمالِ حج اور مقاماتِ حج پوری طرح بتا دیجیے۔ اس کے لیے اَرِنَا کا لفظ آیا ہے جس کے معنے ہمیں دکھا دیجیے۔ دیکھنا آنکھ کا بھی ہوتا ہے اور دل کا بھی۔ شیخ ابن الہمام نے فتح القدیر کی کتاب الصوم میں تصریح کی ہے کہ مصدر اگر رؤیۃ ہو تو آنکھ کا دیکھنا اور اگر مصدر رائے ہو تو دل کا دیکھنا یعنی سمجھنا ہوتا ہے۔ یہاں دونوں کو اس طرح جمع کیا جا سکتا ہے کہ اولاً احکام سمجھا دیے گئے اور پھر حضرت جبریل کے ذریعہ عملاً دکھا بھی دیا گیا۔[2]

اور ہمارے قصوروں سے درگزر فرما۔ اصل ارشاد میں تب علینا ہے۔ اس کے معنے یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ ہمیں توبہ کرنے کی توفیق ارزانی فرما کہ ہم ہر حال میں بس تیری طرف لوٹیں۔ قرآن میں

---

[1] تفسیر ماجدی ص ۵۱ [2] معارف القرآن ص ۲۷۲

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ

وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ ۚ إِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿١٢٩﴾

اے ہمارے پروردگار! اور توان میں ان ہی میں سے ایک رسول[۳۵۸] برپا فرما۔ وہ ان کے سامنے تیری آیات[۳۵۹] تلاوت کرے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور اپنی پیغمبرانہ تربیت سے ان کو پاک کردے۔ بلا شبہ تو بڑے دبدبے والا اور بڑی دانائی والا ہے۔

ثم تاب علیھم لیتوبوا میں یہی معنے ہیں۔ اور یہ معنے بھی ہو سکتے ہیں کہ ہماری توبہ قبول فرما۔ اسی معنے میں زبان نبوت کا یہ ارشاد ہے ویتوب اللہ علی من تاب۔ اصل معنے لوٹنے کے ہیں۔ دونوں طرح بولا جاتا ہے تاب العبد الی ربہ بندہ اپنے رب کی طرف آیا۔ یعنی گناہ سے ہٹ گیا۔ اور توبہ کر لی۔ اور تاب اللہ علی العبد اللہ بندے پر لوٹ آیا۔ یعنی اللہ نے رحمت فرمائی اور بندے کی توبہ قبول فرما لی۔

توبہ کے بھی درجات ہیں جیسے نوکر کی توبہ، دوست کی توبہ، اولاد کی توبہ۔ توبہ کے مراتب میں بڑا اختلاف ہے ایسے ہی جناب الٰہی میں توبہ کرنے والوں کی توبہ بھی اپنے اپنے درجۂ معرفت کے لحاظ سے الگ الگ ہوتی ہے۔ یقیناً نبوت کی توبہ اپنے مقامِ معرفت کے لحاظ سے وہ نہیں ہوتی جو اولیاء اللہ کی ہوتی ہے اور اولیاء کی وہ نہیں ہوتی جو عامۃ مومنین کی ہوتی ہے۔

بعثتِ رسول کی دُعاء

حضرت ابراہیم و اسماعیل کی دُعا ابھی ختم نہیں ہوئی۔ بیت اللہ بناتے وقت دونوں نے تین دُعائیں فرمائی ہیں۔

۱۔ ہماری یہ خدمت قبول فرما۔

۳- یہ کہ اپنے لیے ایک اُمتِ مسلمہ مبعوث فرما جس کا مبداء ہماری ذریت ہو۔
۴- یہ کہ اس اُمتِ مسلمہ کی تعلیم و تربیت کے لیے ہماری ذریت میں سے ایک رسُول روانہ فرما۔
اس آیت میں آخری دُعا کا ذکر ہے۔ اس دُعا میں زیادہ غور طلب یہ حقیقت ہے کہ اس مختصر سے جملے میں رسُول کی بعثت کا ذکر اس انداز سے کیا گیا ہے کہ دُعا کا سارا وزن بجائے رسُول پر پڑنے کے اُمتِ مسلمہ اور ذریت پر صَرف ہو رہا ہے۔ ان کا ذکر دُعا میں پانچ بار کیا ہے۔ یعنی جس رسُول کے آنے کی انہوں نے دُعا کی ہے۔ اس کی خصوصیات یہ بتائی ہیں۔
۱- ان میں سے ہو، ۲- ان میں آئے، ۳- ان کے سامنے تیرے احکام پیش کرے، ۴- ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دے۔ ۵- اپنی تربیت کے ذریعے اَن کا اخلاقی تزکیہ کرے۔ ضمیر ھم کا مرجع ذریت اور اُمتِ مسلمہ دونوں کو بتایا گیا ہے اور حاصل دونوں کا ایک ہے۔
یعنی وہ کہ نسلِ اسماعیل علیہ السلام سے ہو۔ یہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ قیدار کے متفرق روسا میں سب سے زیادہ مشہور عدنان ہے۔ اسی کا بیٹا معد بن عدنان بخت نصر کے حملے کے وقت عربوں کا رئیسِ کل تھا۔ معد کے دو بیٹے تھے ایک کا نام نزار تھا۔ نزار کے پانچ بیٹے تھے۔ انمار، آباد، ربیعہ، قضاعہ، مضر۔ عرب کے تمام قیداری قبائل انہی کی شاخیں ہیں۔ یہ طول میں یمن سے شام تک اور عرض میں حجاز و نجد سے بحرین و عراق تک پھیلے ہوئے تھے۔ زمانۂ اسلام تک ان کا یہی نقشہ باقی تھا۔
مضر کی شاخ متعدد وسیع خاندانوں میں منقسم ہے۔ جن میں سے ایک قریش کا خاندان ہے۔ باقی خاندان کا نام فہر ہے۔ عدنان تک اس کا سلسلۂ نسب یہ ہے:
فہر بن مالک ابن نضر ابن کنانہ بن خزیمہ بن مدرکہ بن الیاس بن مضر بن معد ابنِ عدنان۔

نسبِ رسُولؐ

عدنان تک سلسلۂ نسب حرف بحرف صحیح اور قابل تمسک ہے، صحیح روایات سے ثابت ہے احادیث میں مروی ہے۔ اشعارِ عرب میں مذکور ہے۔ عدنان تک حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا سلسلۂ نسب یہ ہے:
ابوالقاسم محمد رسُول اللہ بن عبداللہ بن عبدالمطلب بن ہاشم بن عبد مناف بن قصی بن کلاب بن مرہ بن کعب بن لوی بن غالب بن فہر بن مالک بن نضر بن کنانہ بن خزیمہ بن مدرکہ بن

الیاس بن مضر بن نزار بن معد بن عدنان۔

۲۵۸ ۔ ایک رسُول ان میں سے، آیت بتصریح بتا رہی ہے کہ حضرت ابراہیم و اسماعیل نے مل کر اللہ کے حضور میں دُعا کی کہ اس شہر میں ہماری نسل سے ایک پیغمبر مبعوث فرما چونکہ مقامِ بعثت مقرر کیا گیا اور دُعا میں حضرت اسماعیل کی بھی شرکت تھی اس لیے اس میں کوئی شُبہ نہیں کہ اس دُعا کا مقصود یہ تھا کہ یہ پیغمبر نسلِ اسماعیل سے ہوگا۔ اور مکہ میں اس کی بعثت ہوگی۔ موجودہ تورات کی کتاب پیدائش باب ۱۶ کے آخر اور باب ۱۷ کے اوّل میں بھی کچھ اس کے اشارات ملتے ہیں۔

> اور ہاجرہ ابراہیم کے لیے بیٹا جنی اور ابراہیم نے اپنے بیٹے کا نام جو ہاجرہ جنی اسماعیل رکھا۔ (پیدائش ۱۶- ۱۵)

> جب ابراہیم ننانوے برس کا ہوا تب خداوند ابراہیم کو نظر آیا اور اس نے کہا کہ میں خدائے قادر ہوں تو میرے حضور میں چل اور کامل ہو اور میں اپنے اور تیرے درمیان عہد کرتا ہوں کہ میں تجھے نہایت بڑھاؤں گا تب ابراہیم منہ کے بل گرا اور خداوند اس سے ہمکلام ہو کر بولا کہ دیکھ میں جو ہوں تیرا عہد ہے، میرے ساتھ ہے۔ اور تو بہت قوموں کا باپ ہوگا۔ اور تیرا نام پھر ابرام نہ کہلایا جائے گا بلکہ تیرا نام ابرہام ہوگا کیونکہ میں نے تجھے بہت قوموں کا باپ ٹھہرایا ہے۔ اور میں تجھے بہت پھل دوں گا۔ اور قومیں تجھ سے پیدا ہوں گے اور بادشاہ تجھ سے نکلیں گے۔ میں اپنے اور تیرے درمیان اور تیرے بعد تیری نسل کے درمیان ان کے پشت در پشت اپنا عہد جو ہمیشہ کا عہد ہے کرتا ہوں کہ میں تیرا اور تیرے بعد تیری نسل کا خدا ہوں گا۔ اور میں تجھ کو اور تیرے بعد تیری نسل کو کنعان کا تمام ملک جس میں تو پردیسی ہے دیتا ہوں کہ ہمیشہ کے لیے ملک ہو اور میں ان کا خدا ہوں گا۔ (پیدائش ۱۷- ۱ تا ۸)

اللہ تعالیٰ کا یہ عہد حضرت ابراہیم سے اسماعیل کی پیدائش کے بعد ہی اور حضرت اسحاق کی ولادت سے پہلے ہوتا ہے جس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ یہ بشارت اسماعیل کے لیے ہے، اسحاق کے لیے نہیں ہے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت اسحاق کی بشارت دی حضرت ابراہیم کو وہم ہوا کہ اس نئی بشارت سے یہ مراد تو نہیں ہے کہ اسماعیل زندہ نہ رہیں گے اور وہ

عہد اسحاق کے ساتھ پورا ہوگا۔ فوراً بارگاہِ الٰہی میں عرض کیا کہ ـــ کاش اسماعیل تیرے حضور جیتا رہے (پیدائش ۱۷-۱۸) خدا نے جواب دیا۔ اور اسماعیل کے حق میں میں نے تیری سُنی دیکھ میں اسے برکت دوں گا۔ اور اسے باراور کروں گا اور اسے بہت بڑھاؤں گا اور اس سے بارہ سردار پیدا ہوں گے اور میں اسے بڑی قوم بناؤں گا (پیدائش ۱۷-۲۰)

حضرت ہاجرہ جب حاملہ ہونے کے بعد حضرت سارہ سے خفا ہو کر بیرسبع چلی گئیں تو فرشتہ نے آواز دی۔ میں تیری اولاد کو بہت بڑھاؤں گا۔ وہ کثرت سے گنی نہ جائے گی۔ اور خداوند کے فرشتہ نے اس سے کہا کہ تو بیٹا جنے گی، اس کا نام اسماعیل رکھنا کہ خدا نے تیرا دکھ سُن لیا (پیدائش ۱۶-۱۰)

موجودہ تورات میں حضرت اسماعیل کی پیدائش اور ان کی نسل کی برومندی کی بشارتیں مذکور ہیں اور ان سے قرآن مجید کے بیان کردہ دعائے ابراہیمی اور عہدِ الٰہی کی تائید ہوتی ہے۔ اسی بنا پر روایات میں آیا ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے فرمایا کہ میں تمہیں بتاؤں کہ میں کیا ہوں ؟ انا دعوۃ ابراھیم میں اپنے باپ ابراہیم کی دُعا ہوں،

۲۵۹ ـــ وہ ان کے سامنے تیری آیات تلاوت کرے۔ آیات سے آیات وحی مراد ہیں۔ آیت کے اس حصّے میں رسالت کے جن مقاصد کی نشاندہی کی گئی ہے وہ چار ہیں۔ تلاوت، تعلیم کتاب، تعلیم حکمت اور تزکیۂ نفوس۔

یہ دُعا حضرت ابراہیم اور ان کے بیٹے اسماعیل دونوں نے مانگی کہ ایک رسُول ان میں بھیج۔ جو ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دے اور ایسا نبی جو ان دونوں کی اولاد میں ہو بجز سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کوئی نہیں آیا۔ اس سے یہود کے خیال کا پورا پورا رد ہوگیا۔ علم کتاب سے مراد وہ معانی کتاب و مطالب ہیں جو عبارت سے واضح ہوتے ہیں اور حکمت سے مراد اسرار و لطائف ہیں[1]

تلاوت آیات سے مقصود قرآنی آیات کو لوگوں کے سامنے پیش کرنا ہے اور ہدایاتِ ربانی سے ان کو روشناس کرانا ہے۔

تعلیم کتاب سے مراد آیاتِ قرآنی کے معانی اور مطالب کی تشریح ہے اور احکام کی توضیح ہے

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ

گویا مقاصدِ رسالت میں جس طرح الفاظ وکلمات قرآن کی تبلیغ ہے اسی طرح اس کے معانی ومطالب کا بیان بھی مقاصدِ رسالت میں داخل ہے یعنی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم قرآنی پیغام اور ہدایاتِ وحی کے پیغام رساں ہونے کے ساتھ اس پیغام کے معلّم بھی ہیں ۔

تعلیم حکمت سے مراد احکامِ دین اَسرار اور شریعت کے مقاصد ہیں۔ حضور انورؐ نے اپنی سیرۃِ طیبہ کے ذریعے اُمت کو اس سے روشناس کیا ہے ۔ کچھ لوگوں نے حکمت سے سنت مراد لی ہے لیکن سنت کے دو معنے ہیں۔ ایک یہ کہ احکام وقوانین کی مصالح اور ان کے مقاصد کو سمجھنا، جسے یہ نعمت حاصل ہو جائے اس کے بارے میں ارشاد ہے من یوت الحکمۃ فقد اُوتی خیرا کثیرا"۔ اسلام کے صدر اوّل میں لفظ سنت اسی معنے میں استعمال ہوتا تھا۔ امام مالک اور امام محمد اس لفظ کو اسی معنے میں استعمال کرتے ہیں ۔

دوسرے محدثین واصولیین کے اصطلاحی معنے،

اگر حکمت سے سنت مراد بتانے والوں کا مقصد پہلے معنے میں ہو تو درست ہے اور اگر سنت سے مقصود محدثین کی اصطلاحی سنت ہے تو یہ قرآن میں حکمت کا مفہوم نہیں ہے۔ حضرت شیخ الہند نے یہاں حکمت کو پہلے معنے لیا ہے ۔

ابراہیم واسماعیل کو یہاں پہنچ کر احساس ہوا کہ اُمتوں کی فلاح وسعادت میں صرف علمی سرمایہ اور صرف دانش وبصیرت کی روشنی اس وقت تک کام نہیں دیتی اور ناکافی ہے جب تک علم ودانش کے ساتھ عملی تربیت کا مکمل نظام وجود میں نہ آئے اور کوئی محسوس اور مرئی اُسوۂ حسنہ سامنے نہ ہو۔ اس لیے فرمایا ویزکیھم یعنی رسالت کے مقاصد میں ایک مقصد یہ بھی ہو کہ وہ اُمت میں اَخلاقِ رذیلہ ہٹا کر اَخلاقِ فاضلہ پیدا کرے، اعمالِ سیئہ سے بچا کر اعمالِ حسنہ کا مالک بنائے ۔

دونوں باپ بیٹے نے دُعا تو کر لی لیکن ذہن میں ایک خلش ہوئی کہ جن باتوں کو اُمتِ مسلمہ کے لیے اللہ سے مانگا ہے۔ ان میں سے کسی بات کا بھی ان کی طبیعت، ان کی معیشت اور ان کے احوال وظروف ساتھ نہیں دیتے۔ وہ شہریت ومدنیت سے دور بدویانہ زندگی بسر کریں گے ۔ بدویت ان کی طبیعت ہوگی۔ علم وحکمت سے ان کو رابطہ نہ ہوگا، تہذیب وتمدن سے وہ ناآشنا ہوں گے ۔ ان میں شیرازہ بندی اور اجتماعیت کا نام ونشان نہ ہوگا۔ پس اسی احساس سے دب کر دونوں نے دُعا کو اس پر ختم کر دیا۔ انک انت العزیز الحکیم ۔

وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ ؕ وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا ۚ وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿١٣٠﴾ اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗۤ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿١٣١﴾

اور ان لوگوں کے سوا جنہوں نے اپنے آپ کو نادانی و سفاہت ہی کے حوالے کر دیا ہے کون ہے جو ابراہیم کے طریقہ سے روگردانی[۳۶۰] کرے؟ اور امرِ واقعہ یہ ہے کہ ہم نے اس وقت ہی اسے دنیا میں بھی برگزیدگی[۳۶۱] دی اور آخرت کی زندگی میں بھی اس کا شمار صالحین میں سے ہے جبکہ اس کے پروردگار نے کہا کہ مسلم[۳۶۲] ہو جا تو وہ بول پڑا میں مالکِ کائنات[۳۶۳] کے لیے مسلم ہو گیا۔

بے شک یہ سب کچھ ہے لیکن آپ کی ذات عزیز ہے اسباب پر آپ کی حکومت ہے۔ آپ جو چاہیں اور جیسے چاہیں کر سکتے ہیں۔ آپ چاہیں تو حیوانات کو علیم و حکیم بنا سکتے ہیں۔ آپ سے بالا کوئی نہیں۔ اور آپ حکیم ہیں۔ آپ کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں ہے۔

ملتِ ابراہیم ہی اسلام ہے

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسلام کی دعوت لے کر آئے ہیں وہ ان کا خود ساختہ اور تراشیدہ نہیں ہے بلکہ یہ حضرت ابراہیم کی میراث ہے اور اس کا علمی اور عملی شجرہ نسب حضرت ابراہیم سے ملتا ہے۔ اس کا انکار اس سے اعراض خود ابراہیم کا انکار اور ابراہیم کے پیش کردہ طریق زندگی سے اعراض ہے۔ اسلام کے لفظی معنے اپنے کو کسی دوسرے کے سپرد کر دینا اور طاعت و بندگی کے لیے گردن جھکا دینا ہے۔ حضرت ابراہیم کے اسی جذبے کو قرآن اسلام کہتا ہے۔ ملتِ ابراہیمی کی حقیقت بھی اسلام ہے کہ انہوں نے اپنے کو خدا کے ہاتھ میں سونپ دیا اور اس آستانہ پر اپنا سر جھکا دیا ہے۔ یہی اسلام کی حقیقت ہے۔

۳۶۰ ف ۔ اور ان لوگوں کے علاوہ جنہوں نے اپنے آپ کو نادانی کے حوالہ کر دیا ہے کون ہے جو ابراہیم کے طریقے سے روگردانی کرے ۔ یعنی ملّتِ ابراہیمی تو عین دینِ فطرت ہے۔ اس کی تعلیمات طبعِ سلیم کی ترجمان ہیں ۔ اس سے کنارہ کشی تو صرف وہ شخص اختیار کر سکتا ہے جس کی فطرت ہی سلیم نہ ہو۔ اس بات کی تصدیق ہر شخص جب چاہے اعتقاد سے نہیں آزمائش سے کرے۔ اسلام نے جماعت کا جو نظام قائم کیا ہے وہی بہترین نظامِ اجتماعی ہے۔ ہر فرد کے لیے جو ضابطۂ عمل بنا دیا ہے بہترین ضابطۂ شخصی ہے، عقل و جذبات، فرد و جماعت، دل و دماغ، جسم و رُوح، حریت و طاعت انسانی زندگی کے متضاد عناصر کی جس قدر باہمی رعایت اسلام نے ملحوظ رکھی ہے دُنیا کے کسی قانون میں اس کی کہیں نظیر نہیں ملے گی۔

قرآن کی یہ بلاغت بڑی معنے خیز ہے کہ دینِ اسلام کا شجرہ نسب حضرت ابراہیم سے جا ملایا ہے۔ مخاطب چونکہ یہودی، عیسائی اور مشرکینِ مکہ ہیں اور تینوں حضرت ابراہیم کے تقدس کا لوہا مانتے ہیں اس لیے اس اندازِ بیان کے ذریعے گویا ان کو جتایا جا رہا ہے کہ قرآن تمہیں کسی نئے دین کی دعوت نہیں دیتا بلکہ تمہارے ہی بزرگ و پیشوا ابراہیم کے دین کی طرف بلا رہا ہے اسے مان لینا ہی ملّتِ ابراہیم کو ماننا ہے

۳۶۱ ف ۔ ہم نے اس کو دُنیا میں برگزیدگی دی ۔ یہ گویا اس کی وجہ بیان کی جا رہی ہے کہ ملّتِ ابراہیم سے روگردانی بیوقوف ہی کر سکتا ہے۔ کیونکہ اس ملّت کی بزرگی اور شرف ہی کا نتیجہ ہے کہ حضرت ابراہیم کو اللہ کی جانب دُنیا میں برگزیدگی ملی۔ یعنی ابراہیم کو انسانیت کی پیشوائی اور امامت کا منصب ملا ہے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ کتاب و نبوت آپ کی میراث ہو گئی۔ یہ دُنیا میں حضرت ابراہیم کو اللہ کی دی ہوئی برگزیدگی ہے اب پوری دُنیا میں روحانیت، ہدایت، اَخلاق، ایمان اور عملِ صالح کا سرمایہ ابراہیم کے دامن کے سوا کہیں نہیں ہے اور نبوت، وحی کی نعمت کا ذریتِ ابراہیم سے الگ ہو کر کوئی تصور نہیں ہے۔ اور اسی ملّت پر عمل پیرا ہو کر اسی کی لوگوں کو دعوت دے کر اور اسی کے لیے محنت کر کے حضرت ابراہیم کو آخرت میں مقامِ صالحین ملا ہے۔ لہٰذا وہ ملّت جس نے ابراہیم کو اللہ کے یہاں یہ مقام دیا ہے اس سے روگردانی حماقت، جہالت کے سوا اور کیا ہے

۳۶۲ ف ۔ جب اس کے پروردگار نے کہا کہ مسلم ہو جا۔ مسلم وہ ہے جو خدا کے سامنے سرِ طاعت خم کر دے۔ خدا ہی کو اپنا مالک، آقا، حاکم اور معبود مان لے، جو اپنے آپ کو

وَوَصّٰى بِهَآ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ ؕ يٰبَنِىَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۲﴾ اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ ۙ اِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِىْ ؕ قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚۖ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۳﴾

اور اسی ملّت کی ابراہیم نے اپنے بیٹوں اور یعقوب نے اولاد کو یہ کہہ کر وصیت کی تھی کہ اے میرے بیٹو! اس دینِ اسلام[۳۶۵] کو اللہ نے تمہارے لیے پسند فرمایا ہے لہٰذا دُنیا سے تمہاری روانگی بس اسلام ہی پر ہو۔ کیا تم موجود تھے اس وقت جب[۳۶۶] یعقوب موت کے آغوش میں جا رہا تھا اور اس نے اپنے بیٹوں کو وصیت کرتے ہوئے ان سے دریافت کیا تھا کہ میرے بعد تم کس کی عبادت کروگے؟ انہوں نے جواب دیا کہ ہم اسی کی عبادت کریں گے جس کی تُو نے عبادت کی اور تیرے بزرگوں ابراہیم اور اسحاق[۳۶۷] نے عبادت کی اور ہم اسی کے فرماں بردار بن کر رہیں گے۔

بالکلیہ خدا کے سپرد کر دے اور اس ہدایت کے مطابق دُنیا میں زندگی بسر کرے جو خدا کی طرف سے آئی ہو۔ اس عقیدے اور طرزِ عمل کا نام اسلام ہے اور یہی تمام انبیا کا دین تھا[۱]

اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ملّتِ ابراہیمی کا بنیادی اُصول اور پوری حقیقت ایک لفظِ اسلام میں مضمر ہے جس کے معنے ہیں طاعتِ حق اور یہی خلاصہ ہے ابراہیم کے مذہب و مسلک کا۔ اور یہی حاصل ہے ان امتحانات کا جن سے گزر کر حضرت ابراہیم اس مقامِ بلند تک پہنچے ہیں اور

[۱] تفہیم القرآن ج ۱ ص ۱۱۳

طاعتِ حق یعنی اسلام ہی وہ چیز ہے جس کے لیے یہ سارا جہاں بنایا گیا ہے اور جس کے لیے انبیاءؑ تشریف لائے ہیں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ اسلام ہی تمام انبیاء کا دین ہے۔ اور حضرت آدمؑ سے لے کر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم تک ہر آنے والے رسول اور نبی نے اسی کی طرف دعوت دی۔ اسی پر اپنی اپنی اُمت کو چلایا[1]

۳۶۳ - میں مالکِ کائنات کے لیے مسلم ہوگیا۔ یہ جواب ہے اللہ کے اس ارشاد کا کہ مسلم ہوجا۔ حضرت ابراہیم نے جواب میں یہ نہیں فرمایا کہ میں آپ کے لیے مسلم ہوگیا بلکہ فرمایا کہ میں رب العالمین کے لیے مسلم ہوگیا۔ اس میں اولاً ادب کو ملحوظ رکھا ہے ثانیاً اس کے ذریعے اس بات کا اعلان کردیا کہ میری طاعت اور میرا اسلام اختیار کرنا اللہ کی ربوبیت کا تقاضا ہے۔ وہ رب العالمین یعنی سارے جہانوں کا پروردگار ہے اور سارے جہاں والوں کو اس کی طاعت کے سوا کوئی چارہ کار نہیں ہے۔ جس نے اطاعت اختیار کرلی اس نے اپنا فرض ادا کرکے اپنا نفع حاصل کیا۔

حضرت ابراہیم و یعقوب کی وصیت

اس سلسلے میں حضرت ابراہیم اور یعقوب کی وصیت پیش کی ہے، حضرت ابراہیم نے اپنی اولاد کو اور ان کے بعد حضرت یعقوب نے اپنی اولاد کو اسلام پر چلنے کی وصیت کی۔ حضرت یعقوب پوری زندگی اولاد کو اسلام پر جمے رہنے کی وصیت اور نصیحت فرماتے رہے۔ حتیٰ کہ آخری وقت میں بھی انہوں نے یہی نصیحت کی۔ اس منظر میں بتایا جارہا ہے کہ حضرت یعقوب کا وقت وفات قریب ہے۔ ان کے بیٹے ان کے پاس ہیں۔ اس وقت حضرت یعقوب کے دل میں کیا کھٹکا لگا ہوا ہے؟ کون سا ایسا عظیم معاملہ ہے جس سے وہ مطمئن ہونا چاہتے ہیں اور کون سی ایسی میراث ہے جس کو وہ اپنی اولاد تک بحفاظت پہنچانا چاہتے ہیں؟ یہ صرف اسلام ہے، یہی ان کی عظیم ترین میراث ہے، یہی ان کا بیش بہا خزانہ ہے۔

۳۶۴ - اسی ملت کی ابراہیم نے اپنے بیٹوں اور یعقوب نے اپنی اولاد کو وصیت کی یعنی جس ملت کا شرف بیان ہوچکا ہے اسی ملت کی وصیت حضرت ابراہیم و یعقوب نے اپنی اولاد

---

[1] معارف القرآن م ش ج ا ص ۲۸۶

کو فرمائی تو جو اس کو نہ مانے گا وہ ان کا بھی مخالف ہے۔ یہودی کہتے تھے کہ حضرت یعقوب نے اپنی اولاد کو یہودیت کی وصیت فرمائی وہ جھوٹے ہیں جیسے آگے آرہا ہے[1]

حضرت ابراہیم کے صاحبزادے آٹھ تھے۔ حضرت ہاجرہ مصری کے بطن سے حضرت اسمٰعیل[1] حضرت سارہ کے بطن سے حضرت اسحاق[2] اور حضرت قتورا کے بطن سے زمران[3]، یقسان[4]، مدان[5]، مدیان[6]، اسباق[7]، سوخ[8] (پیدائش ۲۵-۱-۲) یعقوب حضرت اسحاق کے صاحبزادے اور حضرت ابراہیم کے پوتے ہیں۔ اسرائیل آپ ہی کا لقب ہے۔ عمر حسب روایت تورات ۱۴۷ سال پائی۔ زمانہ غالباً ۲۰۰۰ قبل مسیح سے ۱۸۵۳ قبل مسیح ہے۔ ولادت کنعان (فلسطین) میں ہوئی۔ ۱۸۷۰ قبل مسیح میں اپنے نامور بیٹے یوسف کے پاس مصر میں منتقل ہو گئے۔ وفات یہیں ہوئی۔

حضرت یعقوب کے چار بیویوں سے بارہ فرزند تھے۔ ان کے نام توریت کی تصریح کے مطابق یہ ہیں، روبن، شمعون، لاوی، یہودا، اشکار، زبلون، یوسف، بنیامین، دان، نفتالی، جد، آشر، (پیدائش ۳۵-۲۴ ، ۲۶)

۳۶۵ ۔ اس دینِ اسلام کو اللہ نے تمہارے لیے منتخب فرمایا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ حضرت ابراہیم نے جو قومِ عرب اور نسلِ یہود دونوں کے مورثِ اعلیٰ ہیں۔ اور عیسائیوں کے بھی مقتدا ہیں اور حضرت یعقوب جو نسلِ اسرائیل کے جدِ امجد ہیں یہ دونوں اپنی اولاد کو اپنے اختیار کیے ہوئے اور خدا کے پسندیدہ دین منتقل کر کے دُنیا سے تشریف لے گئے اور فرما گئے کہ تمہیں دین کی تلاش میں حیران و سرگردان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ تمہارے لیے یہ اللہ کا بنایا ہوا اور اس کا بنایا ہوا دین ہے۔

دین یعنی طریقِ زندگی، نظامِ حیات، وہ آئین جس پر انسان دُنیا میں اپنے پورے طرزِ فکر اور طرزِ عمل کی بنا رکھے۔ وصیت نامہ یہ تھا کہ تمہاری رہنمائی اور ہدایت کے لیے اس دینِ اسلام کو منتخب کیا۔ اسی سے وابستہ رہنے، اسی کی حفاظت کرنا اور مخلصانہ اطاعت میں زندگی کے کسی مرحلہ پر ایک لمحہ بھی کمی نہ کرنا۔ اور اس درجہ اس پر کاربند رہنا کہ تمہارا دمِ واپسیں اسلام پر ہو یعنی تمہاری پوری زندگی بالکل سرتاسر اسلامی ہو۔ مطلب یہ ہے کہ ہمہ وقت مسلم بنے رہو۔ ہر لحظہ ایمان تمہارے دلوں کا مکیں رہے۔ دین کے مطالبات میں ایمان کا مطالبہ دائمی اور ہمہ وقتی

---

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۲۵

ہے۔ اعمال حالات کے تابع ہوتے ہیں اور حالات بدلتے رہتے ہیں۔ اس لیے عمل کے تقاضے بھی تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ دین کی زندگی کے لیے یہ کس قدر معنے خیز اور بلیغ فقرہ ہے۔ ان اللہ اصطفیٰ لکم الدین، فلاتموتن الا و انتم مسلمون۔ مطلب یہ ہے کہ اپنی زندگی میں اسلام اور اسلام کی تعلیمات پر پختگی سے عمل کرتے رہنا تاکہ اللہ تعالیٰ تمہارا خاتمہ بھی اسلام پر فرما دے۔ جیسا کہ بعض روایات میں آتا ہے کہ تم اپنی زندگی میں جس قسم کی حالت کو اپناؤ گے اسی حالت پر تمہاری موت ہو گی اور اسی حالت میں میدانِ قیامت میں حشر ہوگا اللہ سبحانہٗ کی سنّت یہی ہے کہ جو بندہ نیکی کا ارادہ کرتا ہے اور اس کے لیے اپنی بساط کے مطابق محنت کرتا ہے تو اللہ سبحانہٗ اس کو نیکی کی توفیق ارزانی فرما دیتے ہیں اور کام کو اس کے لیے آسان فرما دیتے ہیں۔

۳۶۶ ـ کیا تم موجود تھے اس وقت جب یعقوب موت کی آغوش میں جا رہا تھا۔ اس کے دو طرح معنے کیے گئے ہیں۔ ایک معنے تو وہی ہیں جو آپ پڑھ چکے ہیں اور ایک معنے یہ بھی کیا تم غیر حاضر تھے یا اس وقت موجود تھے جب یعقوب دمِ واپسیں میں اپنی اولاد سے کہہ رہے تھے۔ مطلب یہ ہے کہ حضرت یعقوب کی وصیت کے وقت موجود نہ تھے۔ انہوں نے تو دینِ انبیائے موصوفین اختیار کرنے کا حکم دیا تھا۔ بعد میں تم نے یہ کیا ہے کہ یہود اپنے سوا سب کو اور عیسائی اپنے سوا سب کو بے دین بتلانے لگے اور مذہبِ حق یعنی اسلام سے دونوں منحرف ہو گئے۔[1]

بائیبل میں حضرت یعقوب کی وفات کا حال بڑی تفصیل سے لکھا گیا ہے مگر حیرت ہے کہ اس وصیت کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ البتہ تلمود میں جو مفصل وصیت درج ہے اس کا مضمون قرآن کے بیان سے بہت مشابہ ہے۔ اس میں ہمیں حضرت یعقوب کے یہ الفاظ ملتے ہیں:

خداوند اپنے خدا کی بندگی کرتے رہنا۔ وہ تمہیں اسی طرح تمام آفات سے بچائے گا جس طرح تمہارے آباؤ اجداد کو بچاتا رہا ہے۔ اپنے بچوں کو خدا سے محبت کرنے اور اس کے احکام بجا لانے کی تعلیم دینا تاکہ ان کی مہلتِ زندگی دراز ہو۔ کیونکہ خدا ان لوگوں کی حفاظت کرتا ہے جو حق کے ساتھ کام کرتے ہیں اور اس کی راہوں پر ٹھیک ٹھیک چلتے ہیں۔ جواب میں ان کے لڑکوں نے کہا جو کچھ آپ نے ہدایت فرمائی ہے ہم اس کے مطابق عمل کریں گے۔ خدا ہمارے ساتھ ہو تب یعقوب نے کہا اگر تم

---

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۲۵

خدا کی سیدھی راہ سے دائیں یا بائیں نہ مڑو گے تو خدا ضرور تمہارے ساتھ رہے گا[1]

اس قرآنی وصیت کا خلاصہ یہ ہے کہ توحید عبادت کا عقیدہ اور دلی طاعت و اخلاص کی دولت ہمیشہ اللہ سبحانہٗ کے لیے رہنی چاہیے۔ آیات میں لفظ اسلام کا تکرار اسی حقیقت کو جتانے کے لیے ہے۔ قرآن کے مخاطبوں میں اہلِ عرب میں ایک دین کے دعویدار تھے اور اسی کو حق سمجھتے تھے اور بت پرستی کے باوجود ابراہیمی نسبت پر فخر کرتے تھے۔ یہودی اور عیسائی بھی دین کے علمبردار تھے اور اسی کو حق سمجھتے تھے۔ قرآن نے ان آیات میں ابراہیم و اسماعیل اور اسحاق و یعقوب سب کے رہنماؤں کا نام لے کر بتایا ہے کہ تمہارے یہ دعوے تمہارے گروہی تعصب کا سرمایہ ہیں ورنہ حقیقت میں اللہ کا دین تو ایک ہے اور اس کی روح انبیاء کی ہدایت کی روشنی میں ایک پروردگارِ عالم کی عبادت اور اس کی مخلصانہ اطاعت ہے۔ یہ انبیائے حق کے سہارے تم نجات کے خوش آئند خواب دیکھ رہے ہو۔ ان سب کی وصیت اپنی اولاد کو صرف یہ تھی کہ انسان کی نجات کا دارومدار ایمان و عمل پر ہے۔ قرآن کا ان سب سے مطالبہ یہ ا ور صرف یہ ہے کہ ایمان و اسلام کو اپناؤ۔ ایمان یہ کہ یگانہ پروردگار کی عبادت ہو اور شرک کی ہر نوع سے دامن پاک ہو اور اسلام یہ کہ زندگی کے تمام اعمال میں اللہ کی مخلصانہ اطاعت ہو۔

قرآن کی زبان میں اسلام کوئی لفظ جامد نہیں ہے جس میں کوئی معنویت نہ ہو بلکہ جمیع انبیاء کی اصطلاحی زبان کا بول ہے۔ اس کے معنے سراپا اطاعت و فرمانبرداری کے ہیں۔ اگر ایک شخص کی زندگی میں اللہ کی مخلصانہ اطاعت نہیں ہے تو انبیاء کی اصطلاحی زبان میں مسلم نہیں ہے۔ نہ اسلام کوئی جغرافیائی اور قومی اصطلاح ہے کہ اللہ کی ساری بغاوتوں کے ساتھ بھی یہ کسی سے چمٹا ہی رہے اور مردم شماری کے رجسٹر میں درج ہونے والا ہر شخص مسلم کہلائے۔

ان انبیاء کے اس اندازِ وصیت سے یہ بات بھی معلوم کی جا سکتی ہے کہ اولاد کی نظری عملی اور اخلاقی تربیت، برائیوں سے ان کو بچانے کی کوشش کرنا اولاد کی سچی محبت اور خیرخواہی ہے۔ یہ کوئی عقل کی بات نہیں کہ ایک انسان اپنے بچہ کو دھوپ کی گرمی سے بچانے کے لیے تو ساری توانائی خرچ کر دے اور دائمی عذاب سے بچانے کی کوئی فکر نہ کرے۔ اس کے جسم سے آلائش دُور کرنے کے لیے تو بے قراری اور بے تابی کا مظاہرہ کرے اور اللہ کی

---

[1] تفہیم القرآن ج ا ص ۱۱۴

تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُم مَّا كَسَبْتُمْ ۖ وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١٤١﴾

بہر حال یہ اُمت[۳۶۸] تھی جو گزر چکی ہے اس کے لیے وہ ہی تھا جو اپنے اعمال سے کمایا اور تمہارے لیے وہ کچھ ہے جو تم اپنے اعمال کماؤ گے۔ تم سے یہ نہ پوچھا جائے گا کہ ان کے اعمال کیا تھے؟

ناراضی سے بچانے کے لیے کبھی جنبش میں نہ آئے[۱]

۳۶۷ ۔ یہ نام پہلی بار آیا ہے۔ یہ حضرت ابراہیم کے دوسرے صاحبزادے ہیں۔ حرم اول حضرت سارہ والدہ ہیں۔ سالِ ولادت غالباً ۲۰۶ قبل مسیح ہے۔ سالِ وفات غالباً ۱۸۰۰ ق م ہے۔ توریت میں عمر ۱۸۰ سال بتائی ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ آپ کی ولادت کے وقت حضرت ابراہیم کی عمر ۱۰۰ سال ہے۔ آپ کی وفات کا منظر قصص الیہود میں یوں پیش کیا گیا ہے کہ

جب اسحاق نے دیکھا کہ ان کا وقت موعود آن پہنچا تو انہوں نے اپنے دونوں بیٹوں کو اپنے پاس بلا بھیجا اور کہا کہ میں تمہیں خدا تعالیٰ کا واسطہ دیتا ہوں جس کی صفات اعلیٰ عظیم قیوم و عزیز ہیں اور جو آسمان و زمین اور ان کے درمیان ہر چیز کا خالق ہے کہ تم اسی کا خوف رکھنا اور اسی کی عبادت کرنا۔ (جلد اول ص ۱۱۶)[۲]

ایمانی تصور اور جاہلی نقطۂ نظر

قرآن نے اپنے تینوں مخاطبوں یہودی، عیسائی اور مشرکین کے مسلم بزرگوں کا ذکر کرنے کے بعد سعادت و شقاوت، ہدایت و ضلالت اور نجات و ہلاکت کے بارے میں ایک بنیادی اور اصولی قانون کو پیش کیا ہے۔ یہودیوں کو یہ غلط فہمی تھی کہ ہم نسلِ انبیاء سے ہیں اور ان کی اولاد ہیں

[۱] معارف القرآن م ش ص ۲۹۲ - [۲] تفسیر ماجدی ص ۵۲

نسلی اور نسبی تعلق ہماری نجات کا ذریعہ ہو گا خواہ ہم کیسے ہی گناہ کر لیں ہمارا کچھ نہیں بگڑتا۔ عیسائی اس خوش فہمی میں تھے کہ حضرت عیسیٰ اپنے ماننے والوں کا مصلوب ہو کر کفارہ ہو چکے ہیں۔ اب ہماری بخشش میں کوئی کلام نہیں ہے اور مشرکین نے یہ ذہن بنا رکھا تھا کہ یہ اللہ کے بڑے چہیتے بڑے پیارے اور لاڈلے ہیں۔ ہم ان کو اپنے عابدانہ تعلقات سے اگر خوش رکھیں گے تو ہماری سفارش کر کے ہمیں پار کر دیں گے۔ قرآن نے یہاں تینوں کو مخاطب کر کے قانونِ نجات بتایا ہے اور ساتھ ہی سمجھا دیا ہے کہ جن بزرگوں کے نام لیے گئے ہیں وہ ایک اُمت ہیں اور تم دوسری اُمت ہو۔ وہ مومنین و صالحین کی جماعت ہیں اور تمہاری جماعت بدکاروں اور فاسقوں کی ہے۔ دونوں جماعتیں ضرور ہیں مگر الگ الگ ہیں۔ قرآنی تصور میں اُمت جن عناصر سے ترکیب پاتی ہے وہ ایمان و عمل صالح ہے جبکہ جاہلی نقطۂ نظر میں قوم، نسل، زبان اور وطن سے بنتی ہے۔ ایمان کا تصور یہ ہے کہ اہلِ ایمان ایک اُمت ہیں اور اہلِ کفر دوسری ملت ہیں۔ انبیاء کی پوری جماعت ایک اُمت ہیں کیونکہ ان کے ایمان و عمل میں وحدت ہے اور ایمان میں اتنی گہری معنویت ہے کہ اگر کسی دَور میں شخصِ واحد ہی معاشرہ میں ایمان کا علمبردار ہو وہ ہی اُمت ہے انّ ابراھیم کان اُمّۃً۔

قرآن کہتا ہے کہ نبوت کی رہنمائی میں ایمان و عمل والے ایک اُمت ہیں اور نبوت سے رُوگردان اور کفر کی آغوش میں رہنے والے ایک دوسری اُمت ہیں۔

۳۶۸ ۔ یہودیوں اور نصرانیوں کو یقین تھا کہ ماں باپ کے گناہوں میں اولاد گرفتار ہو گی اور ان کے ثواب میں بھی اولاد شریک ہو گی۔ یہ غلط ہے اپنا کیا اپنے آگے آتے گا بھلا یا بُرا[1]

اس آیت سے معلوم ہوا کہ باپ دادا کے نیک اعمال اولاد کے لیے کافی نہیں ہوں گے۔ جب تک وہ خود اپنے اعمال کو دُرست نہ کریں۔ اسی طرح باپ دادا کے بُرے اعمال کا وبال بھی اولاد پر نہ پڑے گا جبکہ اولاد اعمالِ صالحہ کی پابند ہو۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ مشرکین کی اولاد جو بالغ ہونے سے پہلے مر جاتے ان کو اپنے ماں باپ کے کفر و شرک کی وجہ سے عذاب نہیں ہو گا اور اس سے یہود کے اس عقیدے کی بھی تردید ہو گئی کہ ہم جو چاہیں

[1] حاشیہ شیخ الہند ص ۲۵

عمل کریں ہماری مغفرت تو ہمارے آباؤ اجداد کے اعمال سے ہو گی۔ اسی طرح آج کل کے بعض سید خاندان کے افراد اس خیال میں مگن ہیں کہ ہم اولادِ رسول ہیں ہم جو چاہیں گناہ کرتے رہیں ہماری مغفرت ہو ہی جائے گی۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

اے بنی ہاشم ایسا نہ ہو کہ قیامت کے روز لوگ تو اپنے اپنے اعمالِ صالحہ لے کر آئیں اور تم اعمالِ صالحہ سے غفلت برتو صرف میرے نسب کا بھروسہ لے کر آؤ اور میں تم سے اس روز یہ کہوں کہ میں تمہیں اللہ کے عذاب سے نہیں بچا سکتا۔

اور دوسری حدیث میں ارشاد ہے:

جس شخص کو اس کے عمل نے پیچھے کر دیا اس کو اس کا نسب آگے نہیں بڑھا سکتا۔[1]

آیت کا مطلب یہ ہے کہ اگرچہ تم ان کی اولاد سہی مگر حقیقت میں تمہیں ان سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ ان کا نام لینے کا تمہیں کیا حق ہے جبکہ تم ان کے طریقے سے پھر گئے ہو۔ اللہ کے یہاں تم سے یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ تمہارے باپ دادا کیا کرتے تھے بلکہ یہ دریافت کیا جائے گا کہ تم خود کیا کرتے رہے۔ اور جو یہ فرمایا کہ جو کچھ انہوں نے کمایا وہ ان کے لیے ہے اور جو کچھ تم کماؤ گے وہ تمہارے لیے ہے۔ یہ قرآن کا خاص اندازِ بیان ہے۔ ہم جس چیز کو فعل یا عمل کہتے ہیں قرآن اسے اپنی زبان میں کسب یا کمائی کہتا ہے۔ ہمارا ہر عمل اپنا ایک اچھا یا برا نتیجہ رکھتا ہے جو خدا کی خوشنودی یا ناراضی کی صورت میں ظاہر ہو گا وہی نتیجہ ہماری کمائی ہے۔ چونکہ قرآن کی نگاہ میں اصل اہمیت اسی نتیجہ کی ہے اس لیے اکثر وہ ہمارے کاموں کو عمل و فعل کے الفاظ سے تعبیر کرنے کے بجائے کسب کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے۔[2]

نجاتِ متوارث اور معصیتِ متوارث کا عقیدہ

اسلام کے طفیل اب یہ بات معمولی سی معلوم ہوتی ہے لیکن قرآن نے جب اس حقیقت کا اعلان کیا ہے اس وقت بہت ہی اہم اور گویا ایک نادر سی بات تھی۔ شخصی و ذاتی ذمہ داری اور انفرادی مسئولیت کی تعلیم اسلام کے خصوصیاتِ امتیازی میں سے ہے ورنہ مشرک تو

---

[1] معارف القرآن م ش ص ۲۹۴ [2] تفہیم القرآن ج ۱ ص ۱۱۴

مشرک یہود تک اس حماقت میں مبتلا ہو گئے تھے کہ ذاتی عمل کی کوئی ضرورت ہی نہیں ہے۔ مقبولانِ الٰہی کی جانب انتسابِ نسلی اور بزرگوں کی جانب نسبتِ نسبی بالکل کافی ہے۔ مسیحیوں کا گڑا ہوا مسئلہ معصیتِ متوارث سب کو معلوم ہے یعنی جو گناہ حضرت آدم سے سرزد ہو گیا تھا وہ ہر نسلِ آدم میں منتقل ہوتا چلا آ رہا ہے۔ یہود نے اس کے مقابل ایک عقیدہ نجاتِ متوارث کا وضع کر لیا تھا اور یہ سمجھ لیا تھا کہ خدا تعالیٰ اپنے اسم پاک کے طفیل میں اور بطور اپنے افضال کے باپ کی نیکیاں اولاد کی طرف منتقل کر دیتا ہے۔ توریت مروجہ میں ایک آیت اس مضمون کی ملتی ہے ـــــ میں خداوند تیرا خدا غیور ہوں جو باپ دادوں کی بدکاری کا بدلہ ان کی اولاد سے تیسری اور چوتھی پشت تک جو میرا کینہ رکھنے والے ہیں لیتا ہوں۔ (استثناء ۵ - ۹) بس اس کو رائی کا پہاڑ بنا لیا۔ کہ ہر نسل کو انتقالِ ثواب اوپر سے اور نیچے سے بھی یعنی اَسلاف و اَخلاف دونوں کی طرف سے ہوتا رہے گا۔ اور پھر اولادِ ابراہیم کو تو کوئی ڈر ہی نہیں ہے[1]

گویا قرآن کی یہ آیت بتا رہی ہے کہ قانونِ الٰہی یہ ہے کہ ہر فرد اور جماعت کو وہی کچھ پیش آتا ہے جو اس نے اپنے عمل سے کمایا ہے۔ نہ تو ایک کی نیکی دوسرے کو بچا سکتی ہے نہ ایک کی بدعملی کے لیے دوسرا جوابدہ ہو سکتا ہے۔ انسان کے لیے قدامت پرستی کا پھندا بڑا ہی سخت پھندا ہے اس کے بیچ سے وہ نکل نہیں سکتا وہ ہمیشہ ماضی کے افسانوں میں گم رہے گا اور ہر پرانے طور طریقہ کو تقدیس کی نظر سے دیکھے گا۔ لیکن قرآن کہتا ہے تلک اُمۃ قد خلت لھا ماکسبت ولکم ما کسبتم یہ ایک گروہ تھا جو گزر چکا اب اس کے پیچھے پڑے رہنے سے تمہیں کوئی فائدہ نہ ہو گا تم اپنی خبر لو ان کے اعمال ان کے لیے تھے۔ تمہارے اعمال تمہارے لیے ہیں[2]

دراصل یہ آیت حضرت ابراہیم، اسماعیل، اسحاق اور یعقوب کی اپنے اولاد کو وصیت کے تذکرے کے بعد بطورِ استدراک آئی ہے۔ ممکن ہے کسی کے ذہن میں یہ خلش ہو کہ جب ان ہمارے بزرگوں کا اللہ کے یہاں یہ مقام ہے تو پھر یہ ضرور روزِ قیامت ہمارے کام آئیں گے اور ان سے تعلقِ نسبی ہمارے لیے ذریعۂ نجات ہو گا۔ اسی خلش کو دور کرنے کے لیے فرمایا ہے کہ لھا ماکسبت ولکم ما کسبتم۔ جزا نسبت اور نسب پر نہیں بلکہ کسب و عمل پر ہو گی۔

---

[1] تفسیر ماجدی ج ا ص ۵۲　[2] ترجمان القرآن ص ۲۵۵

وَقَالُوا كُونُوا هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ تَهْتَدُوا ۗ قُلْ بَلْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا ۖ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿١٣٥﴾

اور یہودی کہتے ہیں کہ یہودی[369] ہو جاؤ ہدایت پاؤ گے اور عیسائی کہتے ہیں کہ عیسائی ہو جاؤ ہدایت پاؤ گے۔ ان سے کہہ دو کہ نہیں بلکہ آؤ اور ملّتِ ابراہیم کے پیروکار[370] بن جاؤ۔ ابراہیم سب سے کٹ ہوا اور صرف اللہ کا ہو رہا تھا۔ اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھا۔

امام غزالیؒ نے کیا اچھی بات فرمائی ہے کہ اگر اس عالم میں باپ کا روٹی کھانا بھوکے بیٹے کا پیٹ نہیں بھرتا، باپ کا پانی پینا پیاسے بیٹے کو سیراب نہیں کرتا ہے تو پھر باپ کی نیکی روزِ قیامت بیٹے کو عذاب سے بچا بھی نہیں سکتی۔
غرض یہ آیت دین کی زندگی میں بہترین رہنما اصول ہے۔

ہدایت ملّتِ ابراہیم کی پیروی میں ہے

پہلی آیات میں اہلِ کتاب اور مشرکین کو ملّتِ ابراہیم کی حقیقت سمجھائی ہے اور بتایا ہے کہ یہی سب نبیوں کی اجتماعی دعوت رہی ہے۔ اس موضوع پر قرآن کے واضح اور صاف دلائل سُن کر ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اہلِ کتاب ان سے متاثر ہوتے اور قبولِ حق پر آمادہ ہو جاتے لیکن بجائے اس کے ضد اور ہٹ دھرمی سے کام لے کر اُلٹے مسلمانوں کو یہودیت اور نصرانیت کی دعوت دینے لگے اور کہنے لگے کہ اگر ہمارے گروہ میں داخل ہو جاؤ تو تمہیں دُنیا کی فلاح اور آخرت کی نجات مل جائے گی۔ اس کے جواب میں قرآن نے ان کو اولاً ملّتِ ابراہیمی کی پیروی کی دعوت دی ہے۔

۳۶۹۔ مطلب یہ ہے کہ یہودی مسلمانوں کو کہتے ہیں کہ یہودی ہو جاؤ اور عیسائی کہتے ہیں کہ عیسائی ہو جاؤ تو تم کو ہدایت نصیب ہو۔ اس کے جواب میں قرآن نے حضور انورصلی اللہ

علیہ وسلم سے کہا کہ اس طرح کہو کہ تمہارا کہنا ہرگز منظور نہیں ہے بلکہ ہم موافق ہیں ملّتِ ابراہیم کے جو سب بُرے مذہبوں سے علیحدہ تھے اور اس فقرہ میں کہ وہ شرک کرنے والوں میں سے نہ تھے۔ بھی چوٹ ہے اہلِ کتاب کے دونوں فرقوں پر کہ تم دونوں شرک میں مبتلا ہو۔ مشرکینِ عرب بھی مذہب ابراہیمی کے مدعی تھے۔ اس میں ان کا بھی ردّ ہے۔ لہٰذا اب ان فرقوں میں بڑے انصاف کوئی بھی ملّتِ ابراہیم پر نہیں رہا۔ صرف اہلِ اسلام ملّتِ ابراہیم پر رہے ہیں[1]

۳۷۰ - یہ قرآن نے حضور انور کو بتایا ہے کہ ان کہنے والوں سے کہہ دو کہ ہمارا دین کوئی نیا دین نہیں ہے پرانا دین ہے اور وہ دین ہے جو حضرت ابراہیم کا تھا۔ ہم تمہاری نہیں بلکہ ملّتِ ابراہیم کی پیروی کریں گے

اس جواب کی لطافت سمجھنے کے لیئے دو باتیں ذہن میں رکھیئے۔

ایک یہ کہ یہودیت اور عیسائیت دونوں بعد کی پیداوار ہیں، یہودیت اپنے اس نام اور اپنی مذہبی خصوصیات اور رسوم و قواعد کے ساتھ تیسری چوتھی صدی قبل مسیح میں پیدا ہوئی۔ اور عیسائیت جن عقائد اور مخصوص مذہبی تصوّرات کے مجموعہ کا نام ہے۔ وہ تو حضرت مسیح کے بھی ایک مدت بعد وجود میں آئے ہیں۔ اگر یہودیت اور عیسائیت ہی معیارِ ہدایت ہیں تو پھر حضرت ابراہیم اور دوسرے انبیاء کے بارے میں کیا فیصلہ کیا جائے جو یہودیت اور عیسائیت کی تاریخ سے قبل ہو چکے ہیں۔

دوسرے یہ کہ یہود و نصاریٰ کی مقدس کتابیں اس پر گواہ ہیں کہ حضرت ابراہیم یکتا پروردگار کی عبادت کے علاوہ کسی کی پرستش اور اطاعت کے قائل نہ تھے۔ ان کا مشن ہی یہ تھا کہ اللہ کی صفات و خصوصیات میں اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرایا جائے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہودیت و عیسائیت دونوں اس راہِ ہدایت سے منحرف ہو چکے ہیں جس پر حضرت ابراہیم گامزن تھے کیونکہ ان دونوں میں شرک کی آمیزش ہے[2]

(حنیف کی علمی تحقیق)

اس آیت میں حضرت ابراہیم کے دو وصف بیان فرمائے ہیں۔ حنیف ہونا اور دوسرے ان کا مشرکین میں سے نہ ہونا۔ دوسری بات تو ظاہر ہے اور اس میں تعریض بھی ہے کہ تم کس منہ سے اپنے کو دینِ ابراہیم کی جانب منسوب کرتے ہو وہ تو شرک کے قریب ہو کر بھی

---

[1] حاشیہ شیخ الہند ص ۲۵ [2] تفہیم القرآن ص ۱۱۵

نہیں گزرے تھے اور تم تو کھلے شرک کا ارتکاب کرتے ہو۔ ابراہیم کی توحیدِ خالص پر یہود و نصاریٰ دونوں متفق ہیں۔

پہلی بات کہ حضرت ابراہیم حنیف تھے۔ حنیف کے معنے میں ہمارے شارحینِ قرآن کوئی ٹھوس رائے نہیں رکھتے۔ قرطبی فرماتے ہیں کہ ابراہیم کو حنیف اس لیے کہتے ہیں کہ حنیف کے معنے جھکنے اور مائل ہونے کے ہیں۔ اور ابراہیم چونکہ اللہ کے دین کی طرف جھکے ہوئے تھے اس لیے ان کو حنیف کہا گیا ہے۔ ابنِ جریر کہتے ہیں کہ حنیف بمعنی مستقیم ہے اور جس طرح لنگوں نیک کی خاطر اندھے کو بصیرا اور بچھو کاٹے کو سلیم کہتے ہیں اسی طرح لنگڑے کو احنف کہتے ہیں لہٰذا جو خدا کی فرمانبرداری میں مستقیم ہو وہ حنیف ہے۔

چونکہ ان بزرگوں نے لفظ حنیف کی تحقیق میں قرآن سے مدد نہیں لی اس لیے یہ صورت پیش آئی۔ یورپین مصنّف ہمیں بتاتے ہیں کہ سریانی میں حنیف کے معنے کافر کے ہیں اور عبرانی میں منافق کے ہیں اور طعنہ دیتے ہیں کہ مقدس پیروانِ محمدؐ نے اس کی لفظی تحقیق کی پرواہ نہیں کی۔ اور مشورہ دیتے ہیں کہ قبیلہ بنو حنیفہ کے جھوٹے پیغمبر مسیلمہ کے نام کو اس لفظ کا ماخذ بنائیں۔ یعنی یہ کہ مسیلمہ سے مسلم اور حنیفہ سے حنیف کا لفظ لیا گیا ہے۔

یورپ کے مشرقی تبحر کا ظرف بااین ہمہ دعویٰ وسعت بہرحال تنگ ہے۔

اصل یہ ہے کہ حنیف حنف سے مشتق ہے۔ عربی میں اس کے معنے مڑنے اور جھکنے کے ہیں اس لیے حنیف وہ شخص ہے جو ایک طرف جھک کر اور مڑ کر دوسری طرف جائے۔ یہ لفظ اچھے اور بُرے دونوں معنے میں مستعمل ہو سکتا ہے۔ اگر یہ فرض کیا جائے کہ اس نے اچھی بات کو چھوڑ کر بُری بات اختیار کی ہے تو حنیف کے وہ معنے ہو سکتے ہیں جس میں سریانی اور عبرانی زبان میں وہ مستعمل ہے یعنی کافر و منافق اور اگر یہ سمجھا جائے کہ بُرے کام کو چھوڑ کر اس نے کوئی اچھا کام کیا ہے تو اس کا مفہوم وہ ہو گا جس میں اہلِ عرب اس کو بولتے ہیں یعنی دیندار اور خدا پرست۔ اس بنا پر اچھے یا بُرے مفہوم کی تعیین موقعِ استعمال اور حرف صلہ سے ہو گی۔ اصل میں اس کا ابتدائی استعمال للّٰہ یا للدین کی تخصیص سے ہوتا تھا الحنیف للّٰہ اللہ کی طرف جھکنے والا۔ الحنیف للدین سچے مذہب کی طرف جھکنے والا، کثرتِ استعمال سے اس قید کی ضرورت نہیں رہی اور لفظ حنیف کے معنے اللہ کی طرف جھکنے والے کے ہو گئے۔ چنانچہ قرآن میں یہ لفظ دونوں طرح استعمال ہوا ہے۔ سورۂ حج میں حنیفاً للّٰہ آیا ہے جبکہ سورۂ بینہ میں مخلصین لہ الدین حنفاء آیا ہے۔

ہر زبان میں کثرت سے اس قسم کی مثالیں ملیں گی بلکہ اصطلاحات عموماً اسی طرح کی ہوتی ہیں مثال کے لیے حنیف کے ہم معنے لفظ مسلم کو لیجئے۔ مسلم کے اصلی معنے سونپنے والے کے ہیں کوئی شخص اپنے دوست کو کسی دشمن کے حوالہ کردے تو عربی میں اس کو مسلم کہیں گے اور یہ معنے مذموم ہیں۔ اس کا ابتدائی استعمال مسلم للہ اپنے کو خدا کے سپرد کر دینے والا تھا لیکن کثرت استعمال سے صرف مسلم رہ گیا اور معنے وہی مسلم للہ کے رہے۔ اب کسی کے دل میں وسوسہ بھی نہیں آتا کہ اس کا کوئی بُرا مفہوم بھی ہے۔

اصل یہ ہے کہ حضرت ابراہیم کی بعثت صابئی قوم میں ہوئی۔ حضرت ابراہیم نے علم و عمل دونوں طریق سے ان کے مذہب کی تردید کی۔ ان کی باطل پرستیوں سے سخت بیزاری کی اور اللہ برحق پر ایمان لائے اس لیے انہوں نے خود کو حنیف ظاہر کیا۔ یعنی ستارہ پرستی سے مڑ کر خدا پرستی کی طرف آنے والا۔ بعد کو بڑھتے بڑھتے اس لفظ کے معنے زاہد اور عابد دیندار کے ہو گئے۔ جاہلی شاعر جران العود کہتا ہے

وادرکن اعجازا من اللیل بعد ما　　　اقام الصلوٰۃ العابد المتحنف

حواریوں نے رات کے آخری حصّہ کو پالیا　　　جبکہ عابد دیندار اپنی نماز ادا کر چکا

جاہلیت کا مشہور شاعر ابوذویب کہتا ہے

اقامت بہ کمقام الحنیف　　　شھوی جادی و شھوی صفر

اس نے وہاں قیام کیا جس طرح دیندار حنیف جمادی کے دو مہینے اور صفر کے دو مہینے قیام کرتا ہے

یہ دونوں شعر لسان العرب ہیں۔

ایک باریک نکتہ

یہاں یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ جیسے لفظ صابی کے معنے عبرانی میں پاک اور طاہر کے ہیں لیکن عربی میں کافر کو کہتے ہیں ٹھیک اسی طرح حنیف کے معنے عبرانی اور آرامی میں کافر و منافق کے ہیں اور عربی میں موحد اور خدا پرست کے معنے میں ہے۔ معلوم ہوا کہ صابی اور حنیف یہ دونوں لفظ مقابل کے فرقوں کے نام ہیں اور ان کے اچھے اور بُرے مفہوم صرف مذہبی اتحاد و مخالفت پر مبنی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان خود کو حنفاء کہتے ہیں اور کفار ان کو صباۃ (صابی کی جمع) کا لقب دیتے تھے۔ الغرض صابی کے مقابلہ میں حنیفیت ابراہیم کا مذہب ہے اور ان کی یادگار کے طور پر ان کی نیک اولاد میں اس کا کسی قدر حصّہ باقی رہ گیا [1]

---

[1] ارض القرآن ٣١٩ / ٣٢٠

مسند احمد اور طبرانی میں حدیث ہے عبداللہ بن عباس کہتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا ای الادیان احب الی اللہ قال الحنیفۃ السمحۃ۔ سب دینوں میں اللہ کو کون سا دین پیارا ہے فرمایا دینِ ابراہیمی جو نہایت آسان اور سہل تھا۔ شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں الحنیفۃ وہ دین ہے جو ملت ابراہیمی کی طرح شعائر اللہ کے استحکام اور شعائر شرک کے استیصال اور رسومِ فاسدہ اور عقائدِ باطلہ کے ابطال پر قائم ہو اور السمحۃ وہ ہے جس کی تعلیم میں رہبانیت اور ناقابلِ برداشت مجاہدات نہ ہوں اور اس میں ایسی رخصتیں بھی موجود ہوں جو بوقتِ ضرورت بشری ضعف کو نباہ لیں۔ اور البیضاء کا مطلب یہ ہے کہ اس دین کی علتیں اور حکمتیں ایسی واضح اور صاف ہوں کہ ہر سمجھدار کی سمجھ میں بآسانی آسکیں [1]

شاہ عبدالعزیزؒ نے اپنی تفسیر میں چالیس احکام شمار کر کے ایسے تحریر فرمائے ہیں جو ان ہر دو ملتوں میں تقریباً مشترک ہیں گویا دینِ محمدی کی زمین ملتِ ابراہیمی ہے اس لیے اس لقب پانے کی سب سے زیادہ مستحق یہی ملت ہے۔ ناظرین کے سامنے ان احکام کی مختصر فہرست پیش کرنا خالی از بصیرت نہ ہوگا۔

۱۔ دشمنانِ خدا سے جہاد کرنا۔
۲۔ بت شکنی
۳۔ غیر اللہ کی منت نہ ماننا
۴۔ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی دوسرے کے نام پر ذبح نہ کرنا
۵۔ رزق، شفا اور موت کو صرف مسبب الاسباب کے قبضۂ قدرت میں تصور کرنا
۶۔ اپنی جان کو خدا کی راہ میں قربان کرنا
۷۔ کہانت باطل سمجھنا۔
۸۔ بد فالی کا قائل نہ ہونا۔
۹۔ کسی ساعت کو منحوس نہ سمجھنا۔
۱۰۔ کواکب پرستی کا انکار کرنا
۱۱۔ نجومیوں سے مستقبل کے واقعات دریافت نہ کرنا۔
۱۲۔ آدابِ قربانی
۱۳۔ خصالِ فطرت
۱۴۔ جملہ افعالِ حج
۱۵۔ کعبہ کا قبلہ ہونا۔
۱۶۔ مصیبت پر صبر کرنا۔
۱۷۔ نوحہ وغیرہ نہ کرنا۔
۱۸۔ تصویر کی حفاظت اور مصوری سے اجتناب کرنا۔
۱۹۔ ترکِ نکاح، ترکِ لذائذ، ترکِ لباس ونفائس اور گوشہ نشینی جیسے افعال اختیار نہ کرنا۔

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ ص ۱۲۸

قُولُوٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۖ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۶﴾

مسلمانو! تم کہو کہ ہمارا طریقہ تو یہ ہے[341] کہ ہم اللہ پر ایمان لائے ہیں اور قرآن پر ایمان لائے ہیں اور جو ہم پر نازل کیا گیا ہے اور ان تمام تعلیمات پر ایمان لاتے ہیں جو ابراہیم کو، اسماعیل کو، اسحاق کو، یعقوب کو اور اولادِ یعقوب پر نازل کی گئی ہیں۔ نیز ان کتابوں پر ایمان لائے ہیں جو موسیٰ، عیسیٰ کو دی گئیں۔ اور صرف اتنا ہی نہیں بلکہ ان تمام تعلیمات پر ایمان رکھتے ہیں جو دُنیا میں سارے انبیاء کو ان کے مالک و مولیٰ کی جانب سے ملی ہیں۔ ہم ان میں[342] سے کسی کے درمیان کوئی تفریق نہیں کرتے اور ہم اللہ ہی کے مسلم ہیں۔

۲۰۔ عبادت میں اتنی افراط سے اجتناب کرنا جس سے حقوق العباد تلف ہوں۔
۲۱۔ کسبِ معاش
۲۲۔ بلا ضرورت سوال نہ کرنا۔
۲۳۔ لباس صاف ستھرا رکھنا
۲۴۔ لہو ولعب سے احتراز کرنا۔
۲۵۔ والد کو اولاد اور اولاد کو والد کے جُرم میں گرفتار نہ کرنا
۲۶۔ حرمتِ زنا وغیرہ۔
۲۷۔ سترِ عورت۔
۲۸۔ ختنہ کرنا۔
۲۹۔ عقیقہ کرنا۔
۳۰۔ آدابِ ضیافت۔
۳۱۔ پوشش ولباس کے احکام۔
۳۲۔ عبادت کے وقت اچھی ہیئت کا خیال رکھنا۔
۳۳۔ اشہرِ حرام کا خیال رکھنا۔
۳۴۔ محرماتِ نکاح
۳۵۔ نکاح میں شاہدوں کا ہونا۔
۳۶۔ زکوٰۃ

۳۷۔ چاشت کی چار رکعتیں۔　　　　　　۳۸۔ تحریمہ میں رفع یدین کرنا۔
۳۹۔ رکوع کا سجدہ پر مقدم ہونا۔　　　　　۴۰۔ نماز کی ہر نقل وحرکت میں تکبیر کہنا۔[1]

ادیانِ دُنیا میں اسلام کا چہرہ

قرآن نے اس آیت میں یہودیت اور عیسائیت کے مقابلے میں اسلام کا جو چہرہ پیش کیا ہے اس میں یہ ضروری قرار دیا ہے کہ اہلِ قرآن قرآن کے ساتھ دوسری آسمانی کتابوں کی صداقت کو بھی مانیں۔ یعنی کوئی شخص اس وقت تک مسلمان نہیں ہوسکتا جب تک قرآن کے ساتھ دوسرے انبیاء کی کتابوں اور ان کے صحیفوں کو بھی من جانب اللہ تسلیم نہ کرے۔ حقیقت میں اسلام کا یہ چہرہ دُنیا کے مذاہب میں بالکل انوکھا اور نرالا ہے جس کا وجود کسی دوسرے مذہب میں نہیں ہے۔ یہ رواداری، بے تعصبی اور عام انسانی اخوت کی سب سے بڑی تعلیم ہے۔ یہودی اپنی کتاب کے علاوہ تمام دوسری آسمانی کتابوں کا انکار کرکے بھی نجات کا منتظر رہ سکتا ہے۔ عیسائی تورات اور تمام دوسرے صحیفوں کا انکار کرکے بھی آسمانی بادشاہت کا متوقع ہوسکتا ہے مگر مسلمان جب تک قرآن کے ساتھ تمام دُنیا کی آسمانی کتابوں کو من جانب اللہ تسلیم نہ کرے جنت کا مستحق نہیں ہوسکتا۔ بین الاقوامیت کی یہ شان اسلام کے علاوہ کسی دین میں نہیں ہے۔

تمام رسولوں اور ان کی کتابوں کی تصدیق کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ آدم سے لے کر محمد رسول اللہ تک جتنے انبیاء خدا کی طرف سے آئے تھے وہ ایک اکائی اور وحدت ہیں۔ اسلام اسی ایک دین کا نام ہے جو آدم سے محمد رسول اللہ تک باری باری انبیاء کے ذریعے اُتارا رہا اور انسانوں کو اس کی تعلیم دی جاتی رہی۔ وحدۃِ ادیان کا یہ راز سب سے پہلے محمد رسول اللہ کے ذریعے معلوم ہوا کہ دینِ الٰہی ہمیشہ سے ایک تھا، ایک رہا ایک رہے گا۔ نُورِ معرفت ایک ہے خواہ وہ کتنی ہی مختلف شکلوں کی قندیلوں میں روشن ہو۔ اصل دین میں تمام انبیاء کی تعلیم یکساں تھی۔ ایک ہی دین تھا جس کو لے کر اوّل سے آخر تک انبیاء آتے رہے۔ اس میں زمان ومکان کے تغیر کو کوئی دخل نہ تھا۔ وہ ہر زمانہ اور ہر قوم میں یکساں آیا ہے اور سب انبیاء نے یکساں

[1] فتح العزیز

تعلیم دی۔

یہ دائمی حقیقت اور یکساں تعلیم کیا ہے ؟

دین میں تین باتیں ہوتی ہیں۔

اوّل اُصولِ عقائد، دوم قواعد کلیہ شریعت، سوم احکامِ جزئیہ۔

اُصولِ عقائد یعنی خدا کی ہستی، اس کی توحید، اس کی صفاتِ کاملہ، نبوّت، جزا و سزا کا یقین، اللہ کی خالص عبادت، حقوقِ انسانی اور اخلاقِ فاضلہ، یہ وہ بنیادی اُمور ہیں جن پر تمام انبیاء کا اتفاق ہے۔ یہ احکام نہ منسوخ ہوتے ہیں اور نہ زمانہ کی رفتار سے بدلتے ہیں۔ اسی کا نام دین ہے۔

قواعدِ کلیہ شریعت، اسی کا نام ملّت ہے۔ یادِ الٰہی، جانی اور مالی عبادت، ان میں تفاوت کم ہوتا ہے لیکن بعض امور کسی قوم اور کسی زمانے کے لائق نہیں ہوتے ہیں تو ان میں تغیّر و تبدّل ہو جاتا ہے مثلاً حج کہ حضرت موسیٰ کی شریعت میں فرض نہ تھا کیونکہ یہودیوں میں اس کی صلاحیت نہ تھی وہ صرف اہلِ ظاہر تھے اسرارِ محبت سے ناآشنا تھے۔

قسم سوم احکامِ جزئیہ، اس میں تغیّر و تبدّل ہوتا رہا ہے۔ اس کو شریعت کہتے ہیں۔

اس لیے تمام نبیوں کا دین ایک ہے لیکن ملّت اور شریعت الگ الگ ہیں۔ محمد رسول اللہ اور حضرت ابراہیم کی ملّت بھی ایک ہے مگر شریعت جُدا ہے۔

یہ آیت بتاتی ہے کہ اللہ پر اور تمام نبیوں پر ایمان لانا اللہ کا دین ہے اور اسی کا نام اسلام ہے۔

۱۳۷ – یعنی یہ کہو کہ ہم سب رسُولوں اور سب کتابوں پر ایمان لاتے ہیں اور سب کو حق سمجھتے ہیں اور اپنے اپنے زمانہ میں سب واجب الاتباع ہیں اور ہم خدا کے فرماں بردار ہیں۔ ہمارا مشن احکامِ خداوندی کی پیروی ہے برخلاف اہلِ کتاب کے کہ اپنے دین کے سوا سب کی تکذیب کرتے ہیں۔ اور انبیاء کے احکام کو جھٹلاتے ہیں جو خدا کے احکام ہیں۔ ہر نبی کی دعوت میں تین باتیں ہوتی ہیں اوّل عقائد، جیسے توحید و نبوّت وغیرہ۔ اس میں سب دین والے شریک ہیں اختلاف ممکن ہی نہیں ہے۔ دوسرے قواعد کلیہ شریعت جن سے جزئیات و فروع حاصل ہوتے ہیں اور ملّت انہی اُصول و کلیات کا نام ہے۔ ملّتِ ابراہیمی اور ملّتِ محمدی کا توافق و اتحاد انہی کلیات میں ہے۔ تیسرے مجموعہ کلیات و فروع اور اُصول و جزئیات جس کو شریعت کہتے ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم اور حضرت ابراہیم کا دین و ملّت ایک ہیں اور شریعت جُدا جُدا ہے[1]

---

[1] حاشیہ شیخ الہند ص ۲۵

آیت میں عام مسلمانوں سے خطاب ہے کہ کہدو ہمیں نسلی یا قومی تعصب کسی سے نہیں ہے۔ ہمارا رشتہ اسماعیلی اور اسرائیلی دین سے بس اعتقاد و انقیاد کا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم مسلمان کسی پیغمبر کے بھی منکر نہیں ہیں۔ آیت میں خصوصیت سے اسماعیل و اسحاق کا تذکرہ خاص توجہ کا مستحق ہے۔ اسماعیل کا ذکر تو اس لیے ضروری تھا کہ اہلِ کتاب ان سے بغض رکھتے تھے اور اسحاق کا نام خود اس بات کی نشانی ہے کہ اسلام ایک بین الاقوامی دین ہے[1]

۳۷۲

ھ۔ ہم ان میں سے کسی کے درمیان کوئی تفریق نہیں کرتے۔ قرآن کی جانب سے یہ اسلام کے عالمگیر اور بین الاقوامی دین ہونے کی سب سے بڑی دلیل پیش کی گئی ہے۔ آج ہر شخص فیصلہ کر سکتا ہے کہ عالمگیر مذہب وہ ہو سکتا ہے جو ہر ملک، ہر قوم، ہر نسل اور ہر زمانہ کے پیغمبروں کی علانیہ تصدیق کر رہا ہے۔ یا وہ مذاہب ہو سکتے ہیں جو آسمانی ہدایت کو فلاں ملک، فلاں نسل، فلاں قوم کے ساتھ مخصوص کرتے ہیں۔

پیغمبروں کے درمیان تفریق نہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم ان کے درمیان اس لحاظ سے فرق نہیں کرتے کہ فلاں حق پر تھا اور فلاں حق پر نہ تھا یا یہ کہ ہم فلاں کو مانتے ہیں اور فلاں کو نہیں مانتے۔ ظاہر ہے کہ خدا کی طرف سے جتنے پیغمبر آئے ہیں سب کے سب ایک ہی صداقت اور ایک ہی راہِ راست کی طرف بلانے والے ہیں۔ لہٰذا جو شخص صحیح معنے میں حق پرست ہے۔ اس کے لیے تمام پیغمبروں کو برحق تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں۔ جو لوگ کسی پیغمبر کو مانتے اور کسی کا انکار کرتے ہیں وہ حقیقت میں اس پیغمبر کے بھی پیرو نہیں ہیں جسے وہ مانتے ہیں کیونکہ انہوں نے دراصل اس عالمگیر صراطِ مستقیم کو نہیں پایا ہے جسے حضرت موسیٰ یا عیسیٰ یا کسی دوسرے پیغمبر نے پیش کیا تھا بلکہ وہ محض باپ دادا کی تقلید میں ایک پیغمبر کو مان رہے ہیں۔ ان کا اصل مذہب نسل پرستی کا تعصب اور آباؤ اجداد کی اندھی تقلید ہے نہ کہ کسی پیغمبر کی پیروی ہے[2]

قرآن کی دعوت

اس آیت نے یہ حقیقت کھول دی ہے کہ قرآن کی دعوت کی اوّلین بنیاد یہ ہے کہ تمام

---

[1] تفسیر ماجدی ص ۵۳ ۔ [2] تفہیم القرآن ص ۱۱۶

انبیاء کی یکساں طور پر تصدیق کی جائے یعنی یقین کیا جائے کہ سب حق پر تھے۔ سب اللہ کے برگزیدہ نبی تھے۔ اسلام وہ دینِ قیم ہے جو ہمیشہ انبیاء کا دین رہا ہے اور قرآن یہود و نصاریٰ کی تحریفات و تصرفات اور فرقہ پروریوں کو مٹا کر اسی اسلام کی پکار ہے جس کی طرف انبیاء اپنے اپنے زمانوں میں ہمیشہ لوگوں کو بلاتے رہے ہیں۔ اس لیے اسلام یہ ہے کہ اس پر یقین کیا جائے کہ وحی کے آغاز سے آخر تک ایک ہی پیغام تھا جو آتا رہا۔ ایک ہی دین تھا جو سکھایا جاتا رہا۔ اور ایک ہی حقیقت تھی جو دہرائی جاتی رہی لیکن وہ باربار انسانوں کے نسیان و تغافل اور تصرف و تحریف سے بدلتی رہی گم ہوتی رہی اور آخری بار دنیا کے کمالِ بلوغ کے زمانہ میں وہ پوری حفاظت کے وعدے کے ساتھ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے مفصل اور کامل ہو کر نازل ہوئی اور قیامت تک باقی و محفوظ رہے گی۔

قرآن نے اس آیت میں اور متعدد موقعوں پر تفریق بین الرسل کو ایک بہت بڑی گمراہی قرار دیا ہے اور سچائی کی راہ یہ بتائی ہے کہ سب کی یکساں طور پر تصدیق کی جائے۔ قرآن کہتا ہے کہ ہر راست باز انسان کا جو سچے دین پر چلنا چاہتا ہے فرض ہے کہ بلا کسی امتیاز کے تمام رسولوں، تمام کتابوں اور تمام دعوتوں پر ایمان لائے اور کسی ایک کا بھی انکار نہ کرے۔ اس کا شیوہ یہ ہونا چاہیے کہ وہ سمجھے سچائی جہاں کہیں بھی ظاہر ہوتی ہے اور جس کی زبان پر بھی ماضی میں ظاہر ہوتی ہے سچائی ہے اور میرا اس پر ایمان ہے۔

غور کرو کہ قرآن نے لانفرق بین احد منھم میں جو بات کہہ دی ہے وہ انسان کی فکری گمراہیوں کی کتنی راہیں بند کر دیتی ہے بشرطیکہ لوگ اسے سمجھیں مگر مصیبت یہ ہے کہ لوگ ہمیشہ اسی کاوش کی پیروی کرتے رہے جو کونوا ھودا أو نصاریٰ سے ٹپک رہی ہے۔ وہ حقیقت نہ پا سکے جو لانفرق بین احد منھم میں پوشیدہ ہے۔ قرآن کے اس فقرے نے ہمیں یہ اصلِ عظیم بتا دی ہے کہ سچائی اور راستی نہ تو کسی خاص زمانہ سے وابستہ کی جا سکتی ہے نہ کسی خاص نسل و قوم سے اور نہ کسی خاص زبان سے۔ اگر مسلمان اس اصلِ عظیم پر عامل ہو جائیں تو ان کے کتنے ہی گمراہ کن جھگڑے ختم ہو کر رہ جائیں۔ ایمانِ صحابہ کی حد تک یہ آیت ہمیں بتاتی ہے۔ کہ تفریق بین اصحابِ محمدؐ سے انکار کیا جائے اور تمام صحابہ کے ایمان کو یکساں تسلیم کیا جائے۔ یعنی یقین کیا جائے کہ یہ سب مومن تھے، اللہ کے پیارے تھے۔ آئمہ میں اجتہاد کی حد تک سب کو مانا جائے اور کسی کے مقامِ اجتہاد کا انکار نہ کیا جائے۔ اور ولایت کے دائرے میں

فَإِنْ آمَنُوا بِمِثْلِ مَا آمَنتُم بِهِ فَقَدِ اهْتَدَوا ۖ وَّإِن تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا هُمْ فِي شِقَاقٍ ۖ فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللَّهُ ۚ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ

اس ایمانی پیمانہ پیش کرنے کے بعد اگر وہ بھی ایمان کی راہ ویسے ہی اختیار کر لیں جیسے تم نے اے مسلمانو اختیار کی ہے تو بس ہدایت پا جائیں اور اگر اس سے روگردانی کریں تو پھر سمجھ لو کہ وہ ضد اور ہٹ دھرمی میں ہیں۔ ان سے قطع نظر کر کے اپنے کام میں لگے رہو اور اطمینان رکھو کہ عنقریب اللہ ان کے مقابلے میں تمہاری حمایت کے لیے کافی ہے وہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔

سب کی ولایت کا اقرار کرے۔ کسی ایک کا انکار نہ کیا جائے۔ گویا لا نفرق بین احدٍ منھم نے ہمیں یہ اصول بنا دیا ہے کہ لا نفرق بین اصحاب محمد، اور لا نفرق بین الائمۃ المجتہدین اور لا نفرق بین اولیاء اللہ۔ اور جیسے لا نفرق بین احدٍ من رسلہ کا اعلان کر کے ایک پیغمبر کی فضیلت اس اعلان کے منافی نہیں ہے ایسے ہی کسی ایک صحابی کی فضیلت کا اعلان بھی ایمانِ صحابہ کے منافی نہیں ہے اور جیسے انبیاء میں ایک پیغمبر کا طاعت کے لیے انتخاب عدم تفریق بین الرسل سے نہیں ٹکراتا ہے ایسے ہی آئمہ مجتہدین میں سے کسی ایک کی اقتداء سب کے اقرار و اجتہاد کے خلاف نہیں ہے اور سب کی ولایت مان کر اصلاح کے لیے کسی ایک کا انتخاب دوسروں کی ولایت کا انکار نہیں ہے۔

شیعہ سُنّی اختلاف نے مسلمانوں کو دو مختلف اُمتوں میں متفرق کر دیا لیکن اس تمام اختلاف کا ماحصل اس کے سوا کیا ہے کہ ہم لا نفرق بین احد من اصحاب رسُول اللہ کے عظیم اُصول پر عمل نہ کر سکے اور ہم صحابہ کے ایمان سے پھسلنے لگے۔

دعوتِ ایمان

پچھلی آیت میں یہودیت اور عیسائیت کے مقابلے دعوت محمدی کا بین الاقوامی اور عالمگیر

ایمانی پیمانہ پیش کیا گیا تھا۔ اس آیت میں ان کو دعوتِ ایمان دی جا رہی ہے۔ اور ایمان کے لیے ان کے سامنے نمونہ پیش کیا جا رہا ہے۔ نمونہ کے لیے صحابہ کے ایمان کو پیش کیا گیا ہے۔ یاد رہے کہ کوئی چیز نمونہ اس وقت تک نہیں بنتی جب تک وہ ہر پہلو میں مکمل نہ ہو۔ یہاں صحابہ کا ایمان اگر کسی کمی کا حامل ہوتا تو اسے خدا کی جانب سے نمونہ کے طور پر نہ پیش کیا جاتا۔ انقیادِ باطن، التزامِ طاعت، عہد و وفاداری ایمان کے وہ اوصاف ہیں جن کے بغیر تصدیق صرف علم کا ایک درجہ ہے۔ ایمان کے لیے ضروری ہے کہ اس میں انقیادِ باطن اور التزامِ طاعت ہو۔ اگر ایک شخص صرف تصدیق رکھتا ہے مگر عہد و فاداری نہیں کرتا تو وہ مومن نہیں کہلا سکتا چہ جائے کہ اسے نمونہ بنا کر پیش کیا جائے۔ اسی طرح اگر فرمانبرداری کے لیے آمادہ ہے لیکن قلب و زبان سے تصدیق کے لیے آمادہ نہیں تو وہ بھی مومن نہیں ہے۔ ایمان صرف اس صورت کا نام ہے کہ قلب و زبان تصدیق سے مزین ہوں اور شریعت پر عمل پیرا ہونے کا عزمِ مصمم ہو۔ عبداللہ ابن عمرؓ سے دریافت کیا گیا کہ کیا رسول اللہ کے صحابہ ہنسا کرتے تھے۔ انہوں نے فرمایا جی ہاں لیکن ان کے دلوں میں ایمان پہاڑوں سے زیادہ بھاری موجود ہوتا تھا۔ (شرح السنہ) حافظ ابن کثیرؒ نے آیت ولو انا کتبنا علیھم ان اقتلوا انفسکم کی تفسیر کے ذیل میں امام اعمش سے نقل کیا ہے کہ آیت مذکورہ سن کر صحابہ کرام بول پڑے کہ اگر ہمارا رب ہمیں یہ حکم دیتا تو ہم بسر و چشم اس کام کو کرتے۔ حضور انورؐ کو جب صحابہ کی زبان سے نکلے ہوئے ان جاں نثاری کے کلمات کی اطلاع ہوئی تو فرمایا۔ ان اہلِ ایمان کے دلوں میں ایمان بڑے بڑے پہاڑوں سے بھی زیادہ پائیدار اور مستحکم ہے۔

۳۷ ۔ اس آیت میں صحابہ کے ایمان کو ایک مثالی ایمان قرار دے کر حکم دیا گیا ہے کہ اللہ کے نزدیک مقبول اور قابلِ اعتبار صرف اسی طرح کا ایمان ہے جو صحابہ نے اختیار کیا ہے اور جو ایمان اس سے سرِ مو مختلف ہوگا وہ اللہ کے یہاں قابلِ قبول نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جتنی چیزوں پر یہ حضرات ایمان لائے ان میں کوئی کمی نہ ہو اور جس اخلاص کے ساتھ ایمان لائے اس میں کوئی فرق نہ آئے کیونکہ وہ نفاق میں داخل ہے[1]

اس آیت میں ایمان پوری شریعتِ مطہرہ کو قبول کر لینے کا مختصر ترین اندازِ تعبیر ہے۔

[1] معارف القرآن ص ۲۹۷

اور اس لیے ایمانیات کی بہت سی دوسری باتیں جن کی تفصیل ہر موقع پر ضروری نہیں ہے۔ اس ایک لفظ کے تحت آتی ہے۔ کبھی اسے ایمان بما انزل الیک سے تعبیر کر دیا جاتا ہے اور مطلب یہ ہوتا ہے کہ جو کچھ قرآن میں علمی و عملی عقائد و عبادات و احکام مذکور ہیں ان سب کو بے کم و کاست تسلیم کیا جائے۔

اس آیت میں یہود و نصاریٰ کو ایمان قبول کرنے پر ہدایت کی بشارت دی گئی ہے اس کا مفہوم صاف یہ ہے کہ یہ دونوں گروہ اپنی موجودہ حالت میں ہدایت پر نہیں ہیں اور یہ معلوم ہوا کہ اسلام ہدایت تامہ ہے۔ یہی وہ دین ہے جسے یہود و نصاریٰ نے کھو دیا تھا۔ اور اب جس کو محمد رسول اللہ کے ذریعے صحابہ کو نمونہ بنا کر دنیا میں پیش کیا گیا ہے اس لیے جو ہدایت ان قوموں کے پاس تھی وہ ناقص تھی اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس کو لے کر آئے وہ کامل ہے۔ نیز یہ معلوم ہوا کہ جن آیتوں میں یہ کہا گیا ہے کہ

جو ایمان لایا اور جو یہودی ہوا اور نصرانی اور صابئی جو بھی خدا پر ایمان لایا اور یوم آخر پر ایمان لایا اور اس نے نیک کام کیئے اس کو کوئی خوف و غم نہ ہوگا۔

ان میں خدا پر ایمان لانے سے توحید کامل مراد ہے، اور اس کا ہرگز ہرگز یہ منشا نہیں ہے کہ یہود و نصاریٰ اپنے موجودہ گمراہ عقیدوں کے باوجود نجات کے مستحق ہیں۔ یہود و نصاریٰ تو در کنار مسلمان بھی اس توحیدِ کامل کے بغیر نجات کے مستحق نہیں ہیں جب تک مسلمان کا ایمان اور عملِ صالح ٹھیک اس تعلیم کے مطابق نہ ہو جو ان کے رسول کے ذریعے سے دنیا میں آئی ہے۔ یہ اصول ہر ایک کے لیے ہے خواہ وہ مسلمان ہو یا یہودی، عیسائی یا صابئی۔ غرض کسی نبی کی پیروی کا مدعی ہو۔

یہود و نصاریٰ اور پوری دنیا کو ایمان کی دعوت اسی ہدایت کے پانے کے لیے ہے جس کو محمد رسول اللہ لے کر تشریف لائے اب فلاح و نجات اس کے ماننے پر منحصر ہے۔ اس آیت کی رُو سے اسلام کو قبول کرنا تمام انسانوں پر اس لیے ضروری ہے کہ وہ تمام نبیوں کا دین ہے۔ اب وہ ہمیشہ محفوظ رہے گا کیونکہ اس کا نبی خاتم النبیین ہے۔ اس کا دین کامل دین اور اس کا صحیفہ تمام کتبِ الٰہیہ کی تعلیمات کا محافظ ہے اور قیامت تک خدا کی جانب سے اس کی حفاظت کا وعدہ کیا گیا ہے۔ یہ چاروں دعوے یعنی تکمیلِ دین، قرآن کا آخر ہونا، قیامت تک اس کا محفوظ رہنا اور ختمِ نبوت قرآن میں اپنے اپنے مقام پر آئیں گے۔

۳۷۴۔ اگر اس سے روگردانی کریں تو سمجھ لو کہ وہ ضد اور ہٹ دھرمی میں ہیں۔ یعنی ان کی

صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ۫ وَّنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ ﴿۱۳۸﴾

ہم نے تو اللہ کا رنگ قبول کر لیا ہے[۱۳۸] اور بتلاؤ کہ اللہ کے رنگ سے اچھا اور کس کا رنگ ہو سکتا ہے اور ہم تو صرف اسی کی بندگی کرنے والے ہیں ۔

دشمنی اور ضد سے مت ڈرو، اللہ ان کے شر اور مضرت سے تمہارا محافظ ہے وہ تمہارا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے۔ خدا سب کی باتوں کو سنتا اور سب کے حال اور نیتوں کو جانتا ہے[۱]

مطلب یہ ہے کہ اتنی واضح ہدایت پہنچ جانے کے بعد اگر اب بھی ایمان نہ لائیں تو اب جو ان کی مخالفت ہے وہ مخالفت ہی کی غرض سے ضد اور عداوت ہی کی بنا پر ہے اس لیے نہیں کہ حق کے حق ہونے میں کوئی کمی رہ گئی ہے یا کوئی ابہام اور پوشیدگی ہے۔ اصل بنائے فساد یہ ہے کہ وہ دین کو زندگی کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے اس لیے اسے سمجھنا ہی نہیں چاہتے ہیں ۔

ان حالات میں قرآن نے روئے سخن اللہ کے پیغمبر کی طرف کر لیا اور مستقبل میں پیش یا افتادہ اندیشوں کے پیش نظر آپ کو تسکین اور تسلی دی کہ آپ دشمنوں کی قوت اور مخالفین کی کثرت سے ذرا بھی تشویش نہ کریں۔ یہ حق کے مخالفین آپ کو اور آپ کے دین کو گزند پہنچانے میں ہرگز کامیاب نہ ہوں گے۔ اللہ آپ کا نگہبان ہے۔ نگہبانی اور نصرت کے وعدے میں اگرچہ مخاطب حضورؐ ہیں لیکن اللہ کی نصرت سارے اہلِ ایمان کے لیے عام ہے ۔

رسم اصطباغ

یہودیوں اور عیسائیوں میں ایک بڑی اہمیت کی خاص قسم کی رسم تطہیری غسل کی تھی جسے بپتسمہ یا اصطباغ کہتے ہیں ۔ دعوتِ ایمان کے بعد ان کی اس ظاہریت پر ارشاد ہے کہ اس رسمی اصطباغ میں کیا رکھا ہے ۔ یہ دراصل ایک یہودی رسم تھی جو اس وقت ادا کی جاتی تھی جب لوگ گناہوں سے

---

[۱] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۲٦

توبہ کیا کرتے تھے اور اس لیے فی نفسہ ایک رسم سے زیادہ اس کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ لیکن عیسائیوں نے اسے نجات وسعادت کی بنیاد سمجھ لیا ہے۔ جب تک ایک شخص حضرت مسیح کے نام پر اصطباغ نہ لے وہ نجات یافتہ انسان نہیں سمجھا جاتا۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ کیسی گمراہی ہے کہ انسانی نجات وسعادت جس کا دارومدار نبوت کے لائے ہوئے علم وعمل پر ہے محض ایک مقررہ رسم کے ساتھ وابستہ کر دی جائے۔ انسانوں کا یہ بنایا ہوا اصطباغ اللہ کا اصطباغ نہیں ہے۔ اللہ کا اصطباغ یہ ہے کہ تمہاری زندگی نبوت کے لائے ہوئے علم وعمل کے رنگ میں رنگ جائیں۔

۳۷۵ ۔ دعوتِ ایمان سن کر یہودی پھر گئے اور اسلام قبول نہ کیا اور عیسائیوں نے بھی انکار کر دیا اور شیخی میں آکر کہنے لگے کہ ہمارے یہاں ایک رنگ ہے جو مسلمانوں کے پاس نہیں ہے۔ عیسائیوں نے ایک زرد رنگ بنا رکھا تھا اور یہ دستور تھا کہ جب ان کے بچہ پیدا ہوتا یا کوئی ان کے دین میں آتا تو اس کو اس رنگ میں غوطہ دے دیتے اور کہتے کہ پاکیزہ نصرانی ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ مسلمانو! تم کہو کر ہم نے اس بناوٹی رنگ کی جگہ حقیقی رنگ یعنی اللہ کا دین قبول کر لیا ہے کہ اس میں آکر انسان ہر قسم کی ناپاکی سے پاک ہو جاتا ہے[1]

یہ بات کہ اسلام قبول کرنے کے بعد گناہ دھل جاتے ہیں قرآن نے ان الفاظ میں پیش کی ہے۔

قل للذین کفروا ان ینتھوا یغفر لھم ما قد سلف

اے پیغمبر جن لوگوں نے راہ کفر اختیار کی ہے ان سے کہہ دو کہ اگر وہ باز آجائیں اور ایمان کی راہ اختیار کریں تو جو کچھ ہو چکا ہے سب معاف کر دیا جائے گا۔

بلاشبہ جو دین تمام ادیان کو ایک دین اور تمام قوموں کو ایک امت بنانے کا عزم لے کر آیا ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ تمام اقوام کی سب سے زیادہ مشترک خواہش کو پورا کرنے کی ضمانت دے۔ یہ ظاہر ہے کہ دین کی تلاش صرف اس لیے ہے کہ بندہ کو اپنے خالق ومالک کے قہر سے نجات مل جائے اور فطرۃً بھی ایک گناہ گار کی خواہش ہونی چاہیے۔ اس لیے قرآن اس کا اعلان کرتا ہے کہ اگر اصطباغ کی رسم کو اس لیے نباہ رہے ہو کہ اس سے گناہ معاف ہوتے ہیں تو اس ظاہریت کو چھوڑ کر ایمان وعمل کا حقیقی اصطباغ اختیار کرو۔ اگر ایسا کرو گے تو ہر ملک وملت، ہر نسل ورنگ کا جو گناہ گار بھی ایمان وعمل کا بپتسمہ لے گا تو اسلام اس کے گناہوں کی مغفرت اور نجاتِ ابدی کا ضامن ہوگا۔

---

[1] حاشیہ شیخ الہند ص ۲۶

قُلْ اَتُحَآجُّوْنَنَا فِی اللّٰہِ وَھُوَ رَبُّنَا وَرَبُّکُمْ ۚ وَلَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَکُمْ اَعْمَالُکُمْ ۚ
وَنَحْنُ لَہٗ مُخْلِصُوْنَ ۝ اَمْ تَقُوْلُوْنَ اِنَّ اِبْرٰھٖمَ وَاِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ
وَالْاَسْبَاطَ کَانُوْا ھُوْدًا اَوْ نَصٰرٰی ؕ قُلْ ءَاَنْتُمْ اَعْلَمُ اَمِ اللّٰہُ ؕ وَمَنْ اَظْلَمُ
مِمَّنْ کَتَمَ شَھَادَۃً عِنْدَہٗ مِنَ اللّٰہِ ؕ وَمَا اللّٰہُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝ تِلْکَ
اُمَّۃٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَھَا مَا کَسَبَتْ وَلَکُمْ مَّا کَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْئَلُوْنَ عَمَّا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ۝

اے پیغمبر ان سے کہو لوگو! کیا تم اللہ کے بارے[۳۷۶] میں ہم سے جھگڑتے ہو حالانکہ ہمارا اور تمہارا پروردگار وہی ہے اور ہمارے لیے ہمارے اعمال اور تمہارے لیے تمہارے اعمال ہیں اور ہم اسی کی صرف بندگی کرنے[۳۷۷] والے ہیں۔ یا تمہارا یہ کہنا ہے کہ ابراہیم، اسماعیل، اسحاق اور یعقوب اور اولاد یعقوب یہودی اور عیسائی[۳۷۸] تھے، اے پیغمبر ان سے کہہ دو کہ کیا تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ[۳۷۹]؟ اگر اللہ ہی زیادہ جانتا ہے تو اس کی گواہی دیتے ہو تو تمہاری کتابوں میں موجود ہے اور تم اسے دانستہ چھپاتے ہو تو اس شخص سے زیادہ ظالم کون ہو سکتا ہے جس کے پاس اللہ کی گواہی[۳۸۰] ہو اور وہ چھپائے؟ یاد رکھو اللہ تمہاری حرکات سے غافل نہیں ہے۔ وہ کچھ لوگ تھے جو گزر چکے، ان کی کمائی ان کے لیے ہے اور تمہاری کمائی تمہارے لیے ہے اور تم سے ان کے اعمال کے بارے میں پوچھ گچھ نہ ہو گی[۳۸۱]۔

اس آیت کے دو ترجمے ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ ہم نے اللہ کا رنگ اختیار کر لیا۔ اس صورت میں فعل محذوف ہوگا صبغنا صبغۃ اللہ ہم اللہ کے رنگ میں رنگین ہو گئے یعنی ہمیں اللہ نے اپنے رنگ میں رنگ دیا۔ دوسرے یہ کہ اللہ کا رنگ اختیار کرو اس صورت میں الزموا فعل محذوف ہوگا۔ پہلی صورت میں جملہ خبریہ ہے اور اپنے خیال کا اظہار ہے اور دوسری صورت میں انشائیہ ہے خبر نہیں خدا کی جانب

سے علم ہے۔

منشأ اختلاف کیا ہے؟

رسم اصطباغ کے بے حقیقت ہونے اور ایمان و عمل کے رنگ میں رنگین ہونے کو بطورِ مقصود ظاہر فرمانے کے بعد اس آیت میں پوری قوت سے ان کے اس بنیادی شبہ کا ازالہ فرمایا ہے کہ یہ جو تم نے اپنی یہودیت اور نصرانیت کی محبوبیتِ خاصہ کا عذابِ آخرت سے محفوظیت کا اور عدمِ مسئولیت کا عقیدہ اپنے دل میں جما رکھا ہے یہ یوں ہی گڑھ لیا ہے یا اس کی کوئی دلیل بھی تمہارے پاس ہے؟ آخر اللہ سبحانہٗ سے تمہارے اس خصوصی تعلق کی بنا کیا ہے؟ مخلوق اور مربوب ہونے میں ہمارا اور تمہارا رشتہ اللہ سے ایک ہے۔ ہمارا بھی خالق ہے تمہارا بھی خالق ہے۔ معیارِ فضیلت اور قرب اگر ہو سکتے ہیں تو وہ اخلاق و اعمال ہیں۔ اس میں بھی ہم دونوں شریک ہیں۔ اگر ہمارے اعمال اچھے ہیں تو نتائج اچھے ہوں گے اور بُرے ہیں تو نتائج بُرے ہوں گے۔ اور یہی حال تمہارا ہے لیکن اس پہلو میں ہمارا مقام تم سے برتر ہے کیونکہ عملی زندگی میں ہمارے اعمال کا سارے کا سارا رُخ اللہ کی طرف ہے جبکہ تم پوری زندگی میں اخلاص کی نعمت سے محروم ہو کر انساب و احباب کے سہارے تلاش کر رہے ہو۔ اب تم ہی بتاؤ کہ تم خدا کی محبوبیت اور اللہ سے خاص تعلق کا کس بنیاد پر دعویٰ کرتے ہو؟ آخر ہم سے الگ تمہاری یہ امتیازی شان کیوں ہے۔ اس امتیاز کی یہ وجہ ہے یا یہ ہے کہ ابراہیم و اسماعیل اور یعقوب یہودی اور عیسائی تھے۔ اگر تمہارا یہ دعویٰ ہے تو اس کی اللہ تکذیب کرتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ نہ یہ ہے اور نہ وہ بلکہ نجات کی بنیاد تو صرف ایمان و عمل ہے اور اس سے تم محروم ہو۔ اب تم بتاؤ کہ جب صورتِ حال یہ ہے تو تمہارا مقام کیا ہے؟

ف ۲۷۶۔ یعنی اللہ کی نسبت تمہارا نزاع کرنا اور یہ سمجھنا کہ اس کی عنایت و رحمت کا ہمارے سوا کوئی مستحق نہیں لغویات ہے۔ وہ جب تمہارا رب ہے ہمارا بھی رب ہے۔ ہم جو کچھ اعمال کرتے ہیں خالص اس کے لیے کرتے ہیں، تمہاری طرح آباؤ اجداد کے سہارے تلاش نہیں کرتے اور نہ تعصب و نفسانیت سے کرتے ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ہمارے اعمال قابلِ پذیرائی نہ ہوں اور تمہارے مقبول ہوں[1] یعنی ہم بھی تو کہتے ہیں کہ اللہ ہی سب کا رب ہے اور اسی کی فرمانبرداری

---

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۲۶

ہونی چاہیے۔ کیا یہ بھی کوئی ایسی بات ہے کہ اس پر تم ہم سے جھگڑا کرو، جھگڑے کا اگر موقعہ ہے تو وہ ہمارے لیے ہے نہ کہ تمہارے لیے۔ کیونکہ اللہ کے سوا دوسروں کی بندگی کا مستحق تم ٹھہرا رہے ہو نہ کہ ہم [1]

گویا یوں کہا گیا ہے کہ اہل کتاب جب ہمارے تمہارے درمیان کوئی اختلاف پروردگار کے تعین میں نہیں۔ اوّل تو اس کی توحید پر قائم رہنا چاہیے اور تثلیث فی التوحید اور توحید فی التثلیث اور خدا کے فرزند بروز و مظہر قسم کے خرافات سے بالکل بچنا چاہیے۔ دوسرے جب اس کی صفات کمالیہ پر ایمان ہے تو وہ اپنی حکمت و ربوبیت سے جس نسل، جس فرد کو بھی چاہے نبوت و رسالت سے سرفراز کر دے وہ ہر طرح مالک و مختار ہے۔ اسرائیلی اور غیر اسرائیلی کسی خاص نسل کا اجارہ نہیں ہے [2]

۳۷۷ ۔ ہمارے لیے ہمارے اعمال اور تمہارے لیے تمہارے اعمال اور ہم صرف اسی کی بندگی کرنے والے ہیں۔ یعنی تم اپنے اعمال کے ذمہ دار ہو اور ہم اپنے اعمال کے۔ تم نے اگر بندگی کو تقسیم کر رکھا ہے اور اللہ کے ساتھ دوسروں کی بھی پرستش اور اطاعت بجا لاتے ہو تو تمہیں ایسا کرنے کا اختیار ہے اس کا انجام خود دیکھ لوگے۔ ہم تمہیں زبردستی اس سے روکنا نہیں چاہتے لیکن ہم نے اپنی بندگی و طاعت اور پرستش کو بالکل اللہ ہی کے لیے خالص کر دیا ہے [3]

مطلب یہ ہے کہ ہم اپنی عبادات میں ہر شرک ہر ضلالت سے پاک ہیں، رہے اعمال تو ہمارے اور تمہارے اعمال کا اثر آخرت میں تو تمہیں بھی نظر آجائے گا، آج جتنا چاہو اس پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرو کل کو دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو کر سامنے آجائے گا۔

۳۷۸ ۔ تمہارا یہ کہنا ہے کہ ابراہیم و اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور اولاد یعقوب یہودی یا عیسائی تھے یعنی کیا تمہارا یہ دعویٰ ہے کہ ان پیغمبروں، بزرگوں اور تمہارے مورثوں کے عقائد ذات و صفات کے بارے میں بجائے دین توحید کے یہودیت یا نصرانیت کے تھے۔ خطاب اہل کتاب خصوصاً یہود سے ہے اور لہجہ خطاب میں زجر اور دھمکی کا پہلو شامل ہے [4]

یہ خطاب یہود و نصاریٰ کے ان جاہل عوام سے ہے جو واقعی اپنے نزدیک یہ سمجھتے تھے کہ

---

[1] تفہیم القرآن ص ۱۱۷　[2] تفسیر ماجدی ج ۱ ص ۲۰۵　[3] تفہیم القرآن ص ۱۱۷
[4] تفسیر ماجدی ص ۲۰۵

یہ جلیل القدر انبیاء سب کے سب یہودی یا عیسائی تھے۔

۳۷۹ ھ۔ کیا تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ۔ یعنی ان بزرگوں کے دین و عقائد کے بارے میں تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ۔ اگر تم مانتے ہو اور تمہارے مقدس نوشتے بھی یہ کہتے ہیں کہ لوگوں کے لیے ملتِ ابراہیمی اللہ کی پسندیدہ ملت ہے تو پھر اس ملت کی وابستگی سے خود کیوں گریزاں ہو۔ اللہ کی شہادت یہ ہے کہ یہ سب توحیدِ خالص کے پیروکار تھے۔ نزولِ قرآن کے وقت بڑے بڑے عالم فاضل موجود تھے۔ ان سب کو چیلنج دے کر کہا جا رہا ہے کہ تم واقعات کو توڑ مروڑ کر، صداقتوں کا گلہ گھونٹ کر جو کچھ بھی کہے جاؤ لیکن واقعہ اور حقیقت یہ ہے کہ یہ سب حضرات خالص موحد اور توحید کے مبلغ ہوئے ہیں[1]

۳۸۰ ھ۔ یہ شہادت اسلام کے برحق ہونے، ابراہیم، اسماعیل، اسحاق اور یعقوب کے مومنِ کامل، مبلغِ توحید ہونے اور آخر زمانہ میں ایک رسُول برحق کے ظہور کی اس شہادت کو چھپانے والے یہودی عُلماء تھے اور یہ شہادت ان کی مسلم آسمانی کتابوں اور الہامی نوشتوں میں محفوظ ہے۔
یہ خطاب یہودیوں کے عُلماء سے ہے جو خود بھی اس حقیقت سے ناواقف نہ تھے کہ یہودیت اور عیسائیت اپنی موجودہ خصوصیات کے ساتھ بہت بعد میں وجود میں آئی ہے۔ مگر اس کے باوجود وہ حق کو اپنے فرقوں ہی میں محدود کرتے تھے اور عوام کو اس غلط فہمی میں مبتلا رکھتے تھے کہ انبیاء کے مدتوں بعد جو عقیدے، جو طریقے اور جو اجتہادی ضابطے اور قاعدے ان کے فقہا، متکلمین اور صوفیا نے وضع کیے، انہی کی پیروی پر انسان کی صلاح و فلاح اور نجات کا دارومدار ہے۔ ان عُلماء سے جب پوچھا جاتا کہ اگر یہی بات ہے تو حضرت ابراہیم، اسحاق، یعقوب وغیرہ آخر تمہارے ان فرقوں میں کس سے تعلق رکھتے تھے تو وہ اس کا جواب دینے سے گریز کرتے تھے کیونکہ ان کا علم اس کی اجازت نہ دیتا کہ ان بزرگوں کا تعلق ہمارے ہی فرقہ سے تھا۔ لیکن اگر وہ صاف الفاظ میں یہ مان لیتے کہ یہ انبیاء نہ یہودی نہ عیسائی تو پھر ان کی حجت ہی ختم ہو جاتی تھی[2]

۳۸۱ ھ۔ ان کے اعمال کے بارے میں تم سے سوال نہ ہوگا۔ یہی آیت عنقریب گزر چکی ہے مگر چونکہ اہلِ کتاب کے دل میں اپنی بزرگ زادگی کی وجہ سے یہ بات خوب جم رہی تھی کہ ہمارے

---

[1] تفسیر ماجدی ص ۴۵　　[2] تفہیم القرآن ص ۱۱۷

اعمال کیسے ہی ہوں بالآخر ہمارے باپ دادا ہمیں ضرور بخشوا لیں گے۔ اس لیے اس بیہودہ خیال کی تردید کے لیے تاکیداً یہ بات مکرر فرمائی ہے ــــ یا یوں سمجھو کہ یہی آیت اس سے پہلے اہلِ کتاب کو سمجھانے کے لیے آئی تھی اور اب دوبارہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت کو بتلانے کے لیے آئی ہے کہ اس بحرِ تخیل میں ان کا اتباع نہ کریں کیونکہ ایسی توقعات اپنے بزرگوں سے ہر شخص کے دل میں آہی جاتی ہیں جو سراسر بیوقوفی ہے[1]

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۝

مطالعہ کیا گیا ہے
تاریخ 31.3.1978

الحمد للہ اولاً و آخراً و ظاہراً و باطناً۔
خاک عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ۔
[illegible] حویلیاں۔ [illegible] ۱۲۔

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۲۶